اردو

کی منتخب تاریخوں کا

تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر غلام رسول ساجد

بغیر کسی تمہید اور مبالغہ آرائی کے میں یہ کہوں گا کہ تحقیقی کام اور وہ بھی مشکل ترین موضوع "اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ" صبر آزما اور دل گردے کا کام ہے۔ اور یہ کام ڈاکٹر غلام رسول ساجد صاحب نے بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔ اس موضوع پر اب تک کسی نے خاطر خواہ کام نہیں کیا ہے۔ دنیائے ادب میں اس کی کمی ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی۔ غلام رسول ساجد صاحب نے تقریباً ۵؍ سال طویل جانفشانی اور عرق ریزی کے بعد ایک حد تک یہ کمی پوری کر دی ہے۔ آپ کا یہ تحقیقی مقالہ اپنے اندر ایک دنیائے ادب کو سموئے ہوئے ہے۔

غلام ساجد کا یہ مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کے کئی جز ہیں اور ہر جز گوناگوں معلوماتی پہلوؤں کو لیے ہوئے ہے۔

باب اوّل میں "اردو کی ابتداء اور ارتقاء کے نظریات' روایات' تذکرے' جائزے اور مقاصد" ہیں۔ تو باب دوم میں "ابتدائی تاریخ" کے پُر مغز تبصرے ہیں۔

بقیہ فلیپ دیگر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رب زدنی علما

(اے اللہ میرے علم میں اضافہ فرما)

اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ

مصنف

ڈاکٹر غلام رسول ساجد برہانپوری

نام کتاب ـــــ اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ

صفحات ـــــ ۶۳۶

سنِ اشاعت ـــــ ۱۹۹۶ء

کتابت ـــــ عبداللطیف ندوی، مرزا سلیم بیگ

طباعت ـــــ فاطمہ آرٹ سائی ناکہ

تعداد ـــــ ۱۰۰۰

تدوین ـــــ امین اعجاز برادر مختار نشاط

قیمت ـــــ تین سو روپئے

تزئین ـــــ ڈاکٹر مصطفےٰ پنجابی، محمد فرید خان ایڈوکیٹ

تصحیح ـــــ ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولی

ترتیب ـــــ مرزا حفاظت بیگ، ڈاکٹر عبداللہ (ممبئی)

معاونین ـــــ سیٹھ عبدالرب انصاری (ذیل کمل فیبرکس) سید فرید، سیٹھ حفیظ الرحمٰن سحانیہ ہوٹل
شیخ یوسف، شیخ فاروق مشتاق دیشکھ (رشی میڈیکل اسٹورس برہانپوری)
مشتاق کریمی (جلگاوں) نعیم پہلوان، شیخ مجید (بھساول)

ملنے کا پتہ ـــــ 7/15 سی، بلاک ونوبھاوے نگر پائپ روڈ کرلا (ویسٹ) ممبئی ۷۰۰۰۴
رشید بک ڈپو، منڈی بازار برہانپور (مدھیہ پردیش) ۴۵۰۳۳۱
شیخ مشتاق کریمی، کانشافیل جلگاوں (مہاراشٹر)
انجمن ترقی اردو، اردو گھر ۲۱۲، روز ایونیو نئی دلی ۱۱۰۰۰۲

انتساب

- اس ذاتِ پاک کے نام

جو میری بقا اور فنا کا مالک ہے۔

- اس عظیم ہستی کے نام

جس کی بدولت ایمان کی دولت نصیب ہوئی

- ان شخصیتوں کے نام

جو دنیا میں میرے وجود کا ذریعہ ثابت ہوئیں۔

- اس ہمسفر کے نام

جس کی قربانیاں زندگی میں مددگار ثابت ہوئیں۔

- ان اساتذہ کے نام، جنہوں نے میرے شعور کو بیدار کیا۔
- ان دوستوں، عزیز و اقارب کے نام جو مجھ سے ہمدردی رکھتے ہیں۔
- ان افراد کے نام، جو سرزمین برہانپور اور جلگاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر غلام رسول ساجد

نذرِ عقیدت

کریم سالار اور عبدالغفار ملک جلگانوی

جن کی خدمات ادب و سماج کیلئے وقف ہیں۔

ڈاکٹر غلام رسول ساجد

تعارف

جب سے اعلا تدریسی سطح پر اساتذہ کے تقرر کے لیے پی ایچ۔ ڈی کو لازمی قرار دیا گیا ہے ہمارے ہاں دانشگاہوں میں تحقیق کا معیار بے حد پست ہو گیا۔ (مقام شکر ہے کہ یو.جی.سی نے اب یہ شرط ہٹا لینے کا فیصلہ کیا ہے) ایسے تحقیقی مقالوں کے ممتحن کی حیثیت سے مجھے بے شمار سطحی، خشک اور بے مقصد تھیسس دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان پوچ اور لچر مقالات کے ریگستان میں ڈاکٹر غلام ساجد کی تحقیق کا ثمرہ یعنی "اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ" ٹھنڈی ہوا کے نرم جھونکوں کی طرح تر و تازہ ہے۔ اس موضوع پر اردو میں توجہ بھی بہت کم دی گئی ہے۔ تذکروں پر تھوڑا بہت مواد مل جاتا ہے لیکن ادبی و لسانی تاریخ نویسی کے تنقیدی جائزے نہ ہونے کے برابر تھے۔ رشید حسن خاں نے ایک بار اس موضوع پر قلم اٹھایا تو ایک مستند ادارے کی جانب سے ماہرین کی تیار کردہ تاریخ ادب بعد اشاعت کالعدم قرار دی گئی اور لوگ اس طرح کے تحقیقی و تنقیدی کام سے خوف کھانے لگے۔ غلام ساجد نے واقعی ایک وقیع موضوع پر ریسرچ کا حق ادا کر دیا۔

مجھے بطورِ خاص مسرت اس بات کی ہے کہ یہ کارنامہ ایک ایسے نوجوان محقق نے انجام دیا ہے جس کا تعلق کھنڈوہ کی تحصیل برہان پور سے ہے اور کھنڈوہ میری جنم بھومی ہے۔"

مظفر حنفی

ڈاکٹر مظفر حنفی

(پروفیسر آف اقبال چیئر کلکتہ یونیورسٹی)

کلکتہ: ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۹۶ء

دیباچہ

انسانی زندگی میں تاریخ کی اہمیت مسلم و گوناگوں ہے۔ تاریخ فراموشی خود فراموشی کے مترادف ہے۔ قوم و ملک کی طرح ادب کی تاریخ بھی اہمیت رکھتی ہے، تاریخ نویسی بظاہر ایک آسان کام ہے لیکن اچھی تاریخ نویسی کے لئے معروضی مطالعۂ ادوار کی تقسیم، منصفانہ طرزِ فکر، اور سائنسی نقطۂ نظر کی ضرورت ہوتی ہے

اردو ادب کی تاریخ کی تدوین میں اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شروع سے شاعری پر زیادہ زور رہا ہے اس کے ابتدائی مؤرخین ادب نے تاریخِ ادب کو تاریخِ شعر ہی بنا دیا تھا۔ اردو کے ابتدائی تذکروں اور تاریخوں میں اس رجحان کی کارفرمائی رہی ہے۔ نثر کی طرف تو توجہ کافی بعد میں کی گئی۔

تذکروں کو مکمل تاریخ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ان سے تاریخ کے ابتدائی نقوش ضرور اجاگر ہوگئے ہیں۔ موجودہ دور میں تاریخ نویسی کا دائرہ کار بہت وسیع ہوگیا ہے معروضی نقطۂ نظر اور نئے نئے نظریوں کی روشنی میں آج کی تاریخ لکھی جارہی ہے لیکن تاریخِ ادب کی تدوین ابھی بھی ایک مشکل امر ہے

اردو ادب کی تاریخ نویسی کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اسکی ابتدائی تاریخیں بیشتر انگریزی میں لکھی گئی ہیں، اردو ادب کی پہلی تاریخ A HISTORY OF URDU LITERATURE ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے ۱۹۲۷ء میں لکھی ۱۹۲۷ء سے ۱۹۹۲ء تک کے طویل عرصے میں چھوٹی بڑی بہت سی تاریخیں لکھی گئیں ان میں "علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو" کے علاوہ باقی سب کوششیں انفرادی رہیں، علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو" ایک اجتماعی کوشش تھی لیکن پہلی جلد شائع ہوتے ہی نقد و نظر کی کسوٹی پر پوری نہ اترنے کے سبب اسے واپس لے لیا گیا اور یہ اجتماعی کوشش بھی نامشکور ہی رہی۔ ان تمام تاریخوں میں جہاں اچھی تاریخیں لکھی گئیں وہیں رطب و یابس کی بھی بھرمار رہی

عرصے سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ان تمام ادبی تاریخوں کا ایک منصفانہ

ناقدانہ جائزہ لیا جائے یہ مشکل لیکن اہم کام تھا، مقامِ مسرت ہے کہ غلام رسول ساجد نے اس اہم موضوع کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع بنایا۔ پانچ سال کے طویل عرصے میں انھوں نے تمام ممکنہ دستیاب تاریخوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، ضروری ماخذوں کو کھنگالا اور حسبِ استطاعت اس کام سے عہدہ برآ ہوگئے۔ اس مقالے پر بمبئی یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی۔

اس مقالے کا کینوس بہت وسیع ہے اور یہ سات ابواب پر مشتمل ہے جن میں اردو زبان کی ابتدا و ارتقا سے متعلق مختلف نظریات کا جائزہ، تذکرہ نویسی کی روایت و مقاصد، اہم تذکروں پر تنقیدی نظر، ادبی تاریخ کے نصب العین اور تاریخ نگاری کے مقاصد، ادبی، لسانی، تدریسی و دبستانی تاریخوں پر نقد و نظر، اردو سے متعلق تحریکات کا جائزہ اور اصنافِ ادب کی تاریخوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس عمل میں مقالہ نگار کی نظر سے دو سو تینتیس ۲۳۳ مستند کتابیں، پچیس ۲۵ رسائل، بیس ۲۰ مخطوطات و مقالات، چھبیس ۲۶ تذکرے گزرے ہیں جن سے انھوں نے استفادہ کیا۔

اس میں شک نہیں کہ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ ایک منفرد کوشش ہے اب تک اس اہم موضوع کی طرف دوسرے اہلِ قلم کی توجہ مبذول نہیں ہوئی تھی انھوں نے صحیح سمتِ رفتار متعین کر کے تمام متعلقہ کتابوں کو نقد و نظر کی میزان پر غیر جانبداری کے ساتھ پرکھا ہے اگر کہیں تنقید بھی کی ہے تو ان کا رویہ ہمدردانہ ہے، متعلقہ مواد کو ترتیب دے کر مناسب اندازِ بیان کے ساتھ سلیقے سے پیش کیا ہے۔

ان کی یہ تحقیقی کاوش اب کتابی شکل میں قارئینِ ادب کے سامنے آرہی ہے امید ہے کہ علمی و ادبی حلقے میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ممبئی ۵ نومبر ۱۹۹۶ء

(ڈاکٹر) خورشید نعمانی ردولوی
ریٹائرڈ پروفیسر مہاراشٹر دیانند کالج پریل ممبئی

پیش لفظ

اردو ادب سے ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد دل میں پی ایچ ڈی کرنے کی امنگ پیدا ہوئی۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے محسن و مشفق استاد محترم ڈاکٹر شیخ فرید ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی سے کیا آپ نے رضامندی ظاہر کی اور اس کام کیلئے مجھ میں حوصلہ پیدا کیا۔

مقالہ کا موضوع "اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ" متعین کر کے اس کی اہمیت اور غرض و غایت کو واضح کیا۔ اور اس مشکل موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے میری ہمت افزائی کی۔

ابھی تک اس اہم موضوع پر کسی صاحب قلم کی توجہ نہیں ہوئی تھی۔ اپنی بے بضاعتی کے باوجود میں نے اس وادئ پرخار میں قدم رکھ دیا۔ پانچ سال کی طویل مدت میں یہ مقالہ ڈاکٹر خورشید نعمانی کی رہنمائی میں پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ دراصل آپ نے اپنے بیش بہا تجربوں سے اس کام کو میرے لئے سہل بنا دیا۔

یہ مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) باب اوّل (الف) اردو زبان کی ابتدا اور ارتقاء سے متعلق مختلف نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے اور مخصوص لسانی نظریات کا تنقیدی جائزہ لے کر ان سے متعلق نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔

اسی باب کا جز (ب) تذکرہ نویسی کی روایت اور مقاصد سے متعلق ہے اور اردو میں تذکرہ نویسی کی ابتدا، اس کے مقاصد اور ان سے تاریخ نویسی کو کیا فائدہ پہنچا، ان تمام امور پر سیر حاصل بحث کر کے ان کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

باب اوّل جز (ج) "آبِ حیات" اور "گلِ رعنا" کو تذکرہ اور تاریخ کی بیچ کی کڑیاں قرار دیا گیا اور "آبِ حیات" کا تنقیدی جائزہ بھی تفصیل سے لیا گیا ہے۔

باب دوّم اردو ادب کی ابتدائی تاریخ کی کتب "خم خانۂ جاوید"، "گلِ رعنا" اور "شعر الہند" سے بحث کر کے ان کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کرتا ہے۔

باب سوم میں ادبی تاریخوں کے نصب العین سے بحث اور تاریخ نگاری کے مقاصد کو

واضح کیا گیا ہے۔ ان ہی مقاصد اور نصب العین کی روشنی میں ادبی تاریخوں پر روشنی ڈالی گئی ہے

باب چہارم (الف) اردو ادبی تاریخوں پر تنقید و تبصرہ کے ساتھ ساتھ ادب کی منتخب تاریخوں کی خوبیوں اور خامیوں سے بحث کی گئی ہے۔

جز (ب) میں لسانی تاریخوں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور ان کے محاسن و معائب کا جائزہ لیا گیا ہے۔

جز (ج) ادبی تاریخوں میں علاقائی رجحان پر عمومی تبصرہ کرتے وقت منتخب علاقائی تاریخوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

(د) اس جز میں تدریسی تاریخوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اور ان کے حسن و قبح پر بحث کی گئی ہے۔

جز (ہ) میں داستانی ادب پر بحث کرتے ہوئے اردو کے مختلف داستانوں اور ان سے متعلق تصانیف کا تنقیدی جائزہ شامل ہے۔

باب پنجم اردو سے متعلق مختلف تحریکات کا سیر حاصل جائزہ ہے۔ ان تحریکات سے ادب و سماج کس طرح متاثر ہوئے، ادب میں زبان و لہجہ کے اعتبار سے کیا تبدیلیاں آئیں ان تحریکات کی تاریخی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ان سے متعلق نمائندہ کتب کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب ششم "اصنافِ ادب کی تاریخوں" سے متعلق ہے۔ اس باب میں نثر و نظم کے بیشتر اصناف پر بحث کی گئی ہے۔ ان سے متعلق تصانیف (یا وہ مقالات جو ابھی منظرِ عام پر نہیں آسکے) ان پر عمومی تنقید و تبصرے کے ساتھ ان کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

ساتواں باب "کتابیات" پر مشتمل ہے۔

تحقیق میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوا کرتی اگر ہم کسی کام کو حرفِ آخر سمجھ بیٹھیں تو اپنے اوپر مزید تحقیق کے دروازے بند کر لیں گے۔ یہ کام ایک گرانقدر موضوع کیلئے ایک مبتدی کی کاوش ہے۔ مجھے اپنی کمزوریوں کا علم ہے۔ لیکن اس کتاب کی تیاری میں ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ اس کو خوب سے خوب تر پیش کر سکوں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں یہ تو اہلِ نظر کی نگاہیں طے کریں گی یعنی یہ فیصلہ اربابِ نظر کی صوابدید پر ہے۔

مجھے ایک خوشگوار فرض اور ادا کرنا ہے اس مقالہ کی تیاری میں عالیجناب ڈاکٹر
شیخ فرید کی رہنمائی اور ہمت افزائی شاملِ حال نہ ہوتی تو مقالہ کبھی پایۂ تکمیل تک پہنچتا
موصوف کا شکریہ ادا کرنے کیلئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ تاہم انکے لئے دل کی گہرائیوں سے
دعا ضرور نکلتی ہے۔ میں پروفیسر ڈاکٹر ظفر حنفی کا تہہ دل سے ممنون ہوں جنہوں نے اپنی
گرانقدر رائے سے اس مقالے کی اہمیت کو اجاگر کیا اور میری ہمت افزائی کی۔ آپ کے علاوہ
پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی اور پروفیسر ڈاکٹر آدم شیخ کا مشکور ہوں جن کے مفید اور گرانقدر
مشورے شاملِ حال رہے۔ کتابوں کی فراہمی میں بھی ان بزرگوں سے مدد ملی۔

میں اپنے عزیز دوست عارف احمد خان لائبریرین سیفیہ سائنس اور آرٹس کالج برہان پور
کا بھی ممنون ہوں جن کے توسط سے مجھے کافی کتابیں آسانی سے دستیاب ہوئیں۔

مقالہ کی کتابت کے سلسلے میں جناب مرزا حفاظت بیگ ماہر، میاں سلیم بیگ اور
عبداللطیف ندوی نے بھرپور تعاون کیا ان لوگوں کا بھی مشکور ہوں ان کی مدد کے بغیر
یہ کام بحسن وخوبی انجام پذیر نہیں ہو سکتا تھا اور ان حضرات کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں جو اس کتاب کی اشاعت میں معاون ہیں۔

میں اپنے والدِ محترم جناب عبدالمجید شاداںؔ کا بھی بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ آپ نے
خانگی پریشانیوں کے باوجود مجھے پڑھایا لکھایا اور علم و ادب کی روشنی دکھائی۔

میں ان تمام مصنفین کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی گرانقدر تصانیف میرے
لئے مشعلِ راہ رہی

آخر میں ایک بار پھر ڈاکٹر خورشید نعمانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے مقالہ کی تکمیل
کے ہر مشکل مرحلہ پر میری مشفقانہ رہنمائی کی اور مقالے کو منظرِ عام پر آنے تک مجھے اپنے گرانقدر
مشوروں سے نوازتے رہے اور یہ مشکل کام دلچسپ اور آسان بنا دیا

ڈاکٹر غلام رسول ساجدؔ

باب اوّل!

- اُردو زبان کی ابتدا کے مختلف نظریات کا جائزہ

اُردو زبان کے مختلف نظریات پر تبصرہ

- تذکرہ نویسی کی روایت کا جائزہ اور مقاصد

تذکرہ نویسی کی روایت، جائزہ، مقاصد پر ایک نظر

- تذکرہ اور تاریخ کے بیچ کی کڑی "آبِ حیات" ۱۹۰۰ء

- "آبِ حیات" کا تنقیدی جائزہ

آبِ حیات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

Hasnain Sialvi

اردو زبان اور ارتقاء کے مختلف نظریات کا جائزہ

اردو زبان کی ابتداء اور اس کے ارتقاء کا جائزہ لینے کے لیے تحقیقی مواد سے نتائج کا اخذ کرنا جوئے شیر لانا ہے۔ قیاسات کی بنیاد پر نتائج کی روشنی میں اصلیت کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ زبان کی ابتداء اور ارتقاء اخذ و ماخذ کے پردے میں کئی موڑ پر آنکھ مچولی کھیلتے ہیں، اور محققین کے لیے قدم قدم پر ایک سوال بن جاتے ہیں۔ کئی حقائق اپنی جگہ مستند ہوتے ہوئے مشکوک نظر آتے ہیں۔ کئی قیاسات غیر مستند ہوتے ہوئے حقیقت کا گمان پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین لسانیات کسی ایک نظریہ کی بنیاد پر اٹل فیصلہ کرنے سے معذور ہیں۔

محمد حسین آزاد کے زمانے سے آج تک لسانیات پر کافی کام ہوا ہے لیکن تمام ماہرین اپنے فیصلے کو مستحکم طور پر نافذ کرنے سے قاصر ہیں۔ صرف محمد حسین آزاد ہی ایک ایسے محقق ہیں جنہوں نے اپنا فیصلہ اعتماد کے ساتھ سنایا لیکن بعض تاریخی شہادتوں کی روشنی میں وہ فیصلہ بھی غلط ثابت ہو گیا۔ ان باتوں پر مستقل نظریات کی بنیاد رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ماہرین لسانیات کے لسانی نظریات پر گہری نظر ڈالی جائے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے محمد حسین آزاد کے لسانی نظریہ سے ابتداء کی جاتی ہے۔

محمد حسین آزاد دہلی اور دہلی کے قرب و جوار کی بولیوں، ہندوستان کی بیشتر زبانوں کے مختلف حالات پر بحث کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اردو زبان کی ابتداء برج بھاشا سے ہوئی ہے۔ اسی لیے آزاد مکمل اعتماد کے ساتھ زبان کی ابتداء اور ارتقاء کے باب میں پہلا جملہ یوں تحریر کرتے ہیں۔

"اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔"[1]

دوسرا اہم نظریہ حافظ محمود شیرانی نے پیش کیا جو پنجاب کو اردو کا مولد قرار دیتے ہیں۔[2]

---

[1] "آب حیات" محمد حسین آزاد صفحہ ۶ (مطبوعہ نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس لاہور سنہ ۱۹۰۷ء

[2] "پنجاب میں اردو" محمود شیرانی صفحہ ۱ تا صفحہ ۲۰۱

شیرانی "پنجاب میں اردو" میں مختلف ضمائر و افعال کو ہریانی اور پنجابی سے ملاتے ہوئے اردو کو پنجاب کا مولد قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان پنجاب میں داخل ہوئے اور پنجاب سے ہجرت کر کے دلی پہنچتے ہیں۔ جہاں وہ اپنے ساتھ ایک زبان لے کر جاتے ہیں اور یہی زبان دلی کے اثرات میں بنی ہے۔ اس نظریہ کی حمایت میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور تین اہم مراکز دلی، دکن اور گجرات قائم کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"زبان ہندوستانی کا ارتقا پنجاب ہی سے شروع ہو چکا تھا۔"[۱]

شیرانی کے نظریہ کی تائید برج موہن دتاتریہ کیفی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔

"اول اول ایک چوں چوں کے مربے کی سی ادھ کھچڑی بولی پنجاب میں شروع ہوئی ہوگی پھر پنجاب سے شمال مغربی ہند میں پھیلی۔"[۲]

ڈاکٹر زور اور کیفی مندرجہ بالا بیانات کے ساتھ آزاد کے لسانی نظریہ کو محمود شیرانی کی حمایت کرتے ہوئے رد کرتے ہیں۔

پروفیسر احتشام "اردو لسانیات کا خاکہ" میں آزاد کے لسانی نظریہ کو ان کی تمثیل نگاری سے منسوب کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری آزاد کے نظریہ کو یہ کہہ کر رد کرتے ہیں۔

"اردو کا ڈھانچہ برج بھاشا پر تیار نہیں کیا گیا۔"[۳]

ان تمام نظریات کو مسعود حسین خاں مختلف دلیلوں سے رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"شیرانی نے پنجابی اور اردو کی اہم مشترک خصوصیات "علامت مصدر" "نا" بتائی ہے۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ "نا" کی علامت مصدر پنجابی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قدیم زمانے سے ہریانی میں "ن" کے ساتھ "نا" بھی ملتا ہے۔"[۴]

"غیر زبان کے الفاظ کے آخر میں یائے کا اضافہ بھی پنجابی کی تنہا خصوصیت نہیں۔ برج بھاشا، قنوجی اور اودھی میں یہ عام طور سے پائی جاتی ہے۔ کانپور کی بولی میں "بعد" کو "بعدی" کہا جاتا ہے۔"[۵]

---

[۱] "ہندوستانی لسانیات" ڈاکٹر محی الدین قادری زور صہ۸۹ تا صہ۱۲
[۲] کیفیہ برج موہن دتاتریہ کیفی صہ۴۔ [۳] "داستان زبان اردو" ڈاکٹر شوکت سبزواری صہ۱۳۸
[۴] "مقدمہ تاریخ زبان اردو" مسعود حسین خاں صہ۲۴۴ [۵] مقدمہ تاریخ زبان اردو مسعود حسین خاں صہ۲۴۷

ڈاکٹر مسعود حسین خاں اس قسم کے مختلف ثبوت کی روشنی میں شیرانی کے نظریہ کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اردو کا ڈھانچہ برج بھاشا پر تیار نہیں کیا گیا ہے۔ قدیم اردو جمنا کی ہریانہ بولی سے قریب تر ہے۔ جدید اردو اپنی صرف و نحو کے اعتبار سے مراد آباد اور بجنور کے اضلاع کی دلّی سے قریب تر ہے۔ برج بھاشا نے بعد کو اردو کا معیاری لب و لہجہ متعین کرنے میں ضرور مدد دی ہے۔" [۱]

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے نیا لسانی نظریہ اس طرح پیش کیا ہے۔

"مذکورہ بالا تقابلی مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ قدیم اردو کی تشکیل براہ راست ہریانی کے زیر اثر ہوئی ہے۔ اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑتے ہیں اور جب پندرھویں صدی میں آگرہ دارالسلطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھگتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا عام اور مقبول ہو جاتی ہے تو سلاطین دہلی کے عہد کی تشکیل شدہ زبان کی نوک پلک برج محاورے کے ذریعہ درست ہو جاتی ہے۔" [۲]

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی رائے کے مطابق اردو زبان ہریانی کے زیر اثر ابتدائی شکل اختیار کرتی ہے اور کھڑی بولی کے اثرات قبول کرتی ہوئی برج بھاشا سے ارتقا پذیر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا یہ نظریہ کئی مضبوط دلیلوں کا نچوڑ ہے لیکن آزاد کے لسانی نظریہ کو رد کرنے کے بعد وہ زبان کے ارتقائی روپ کو برج بھاشا کے زیر اثر تسلیم کرتے ہیں

مسعود صاحب جہاں برج بھاشا کو اردو کا ارتقائی روپ کہتے ہیں، ہو سکتا ہے آزاد اس ارتقاء پذیر شکل کو اردو کی ابتداء مان کر اردو زبان کا تحقیقی مواد پیش کرتے ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے اظہار میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکے۔ اور اردو کی ابتدا کا نظریہ وضاحت سے ایک تحقیقی مقالہ میں تبدیل نہیں کر سکے کیوں کہ ان کا اصل موضوع بھی یہ نہیں تھا لیکن اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ محمد حسین آزاد کا

---

[۱] "مقدمہ تاریخ زبان اردو" مسعود حسین خاں ص ۲۱۹

[۲] "مقدمہ تاریخ زبان اردو" ڈاکٹر مسعود حسین خاں ص ۲۷۷ تا ص ۲۷۸

لسانی نظریہ بالغ نظری کا ثبوت ہے کیونکہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں بھی ارتقا پذیر زبان کو برج بھاشا کے زیرِ اثر ماننے پر مجبور ہیں۔

ان نظریات اور حقائق کی روشنی میں تاریخی اعتبار سے زبان کی ابتداء اور ارتقائی منازل کا تعین، زبان کی ہیئت کو پرکھنا اور کوئی اٹل فیصلہ صادر کرنا انتہائی مستند مواد کا متقاضی ہے۔ اس میدان میں ہم بھی قیاسات سے حقائق تک پہنچنے کے قائل نہیں لیکن تاریخ کے کئی موڑ زبان کے تعلق سے صحیح نتائج کی راہ گم کر دیتے ہیں جہاں محقق کو فطرتاً قیاس کی روشنی میں راہ بنانی پڑتی ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں رقمطراز ہیں۔

"دراصل اردو زبان کے ارتقا کے سلسلے میں دارالسلطنت آگرہ (۱۵۰۴ء تا ۱۶۴۸ء) اور برج بھاشا نے جو حصّہ لیا ہے، اس پر بہت زور دیا گیا ہے اردو زبان اس کے محاورے اور تلفظ کی نئی تشکیل ہے۔ جس کی تکمیل بعد کو دہلی جاکر ہوتی ہے"۔ [۱]

مسعود صاحب کے مندرجہ بالا بیان اور "مقدمہ تاریخ زبان اردو" کے اقتباس میں خود ایک تضاد کا پہلو نمایاں ہے۔ "مقدمہ تاریخ زبانِ اردو" میں موصوف اردو کو ہریانی کے زیرِ اثر مان کر تشکیل شدہ زبان (اردو) کی نوک پلک برجی محاورے کے ذریعہ درست کرتے ہیں لیکن "علیگڈھ تاریخ ادب اردو" کے "لسانی مقدمہ" جو موصوف کی پہلی تحقیق ہے۔ اس میں اردو زبان کو برج بھاشا کے محاورے اور تلفظ کی نئی تشکیل بتاتے ہیں۔ اس بات کو واضح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ محققین لسانیات اردو زبان کے ضمن میں کوئی مستقل فیصلہ کرنے سے کتنے معذور ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں کیوں کہ ہندوستانی باشندوں کے مزاج اور ماحول کے اعتبار سے اس زبان کا عکس اور جھلکیاں ہر علاقہ اور ہر خطّے میں اپنے مزاج اور ماحول کے اعتبار سے دکھائی دیتی ہیں۔ بلاقائی تلفظ زبان کی لکنت اور صوتی اظہار کی کمزوری کے کئی

---

[۱] علی گڑھ تاریخ ادب اردو "لسانیاتی مقدمہ" ص ۲۵ مسعود حسین خاں

ہو دیپ مختلف علاقوں میں مختلف مقامات پر ملتے ہیں۔ دکن، شمالی ہند اور گجرات پنجاب ہریانہ ہر مقام پر اسما ضمائر اور افعال سابقے اور لاحقے اور جمع بنانے کے قواعد علاقائی خصوصیت کے ساتھ پرانی اردو میں موجود ہیں۔ اس لئے اس زبان کو ہر دور میں مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے۔

صوفیائے کرام نے اس زبان کو ہندوی یا ہندی کہا ہے۔ امیر خسرو کی تصنیف "غرۃ الکمال" کے دیباچہ کا ایک جملہ بھی اس بات کا ثبوت دیتا ہے۔

"جزوے چند نظم ہندی نذر دوستاں کردہ است"

شیخ باجن نے "خزائن رحمت اللہ" میں اس کو کہیں زبان ہندی لکھا ہے اور کہیں پر زبان گجری۔ دکن کے صوفیوں شعراء اور ادباء نے دکنی، گجرات والوں نے گجری، شمالی ہند نے ہندی، ہندوی، دہلوی، اردوئے معلٰی اور ریختی کے ناموں سے اس زبان کو یاد کیا۔ ان شواہد سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ بزرگ ہستیاں اپنی تہذیب اور تمدن کے ساتھ اپنی موروثی زبانیں رکھتی تھیں۔ وہ زبانیں فارسی، عربی اور ترکی تھیں لیکن علاقائی باشندوں سے اظہار خیال کے لئے مقامی زبان کا استعمال اپنی زبانوں کے الفاظ ملا کر کرتے تھے۔ ان بزرگوں کو اپنی تہذیب معاشرت اور زبان سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہ جس علاقے میں رہتے وہاں کی زبان بولتے۔ لیکن علاقائی نسبت سے اس کا نام لیتے تھے۔ یہ ایک تاریخی سچائی کے ساتھ اپنی زبانوں سے انسیت کا مظاہرہ بھی تھا۔ اس لئے ہندوستانی (شمالی ہند خصوصاً دہلی) کی زبان بولتے تو اسے ہندی یا ہندوی، دہلوی کہتے۔ گجرات اور دکن میں ایسی زبان علاقائی نسبت سے دکنی اور گجری کہلاتی۔

ہمارے اسلاف نے اپنی زبانوں سے محبت کی بنا پر مقامی زبانوں کو اپنے لفظوں کے اشتراک سے مختلف ناموں سے پکارا اور جن علاقوں میں اپنی زبان کے دوسرے الفاظ ملانے میں کامیاب ہوئے لیکن اسے اپنی زبانوں کے رسم الخط میں لکھنے سے ناکام رہے۔ وہاں کی مقامی زبانوں میں اپنی زبانوں کے الفاظ اس قدر ملا جلا کر بولنے لگے کہ اس زبان کے اصل جاننے اور سمجھنے والے اپنی موروثی زبان کو دو ناموں

سے پکارنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ اس دور میں بنگالی، مرہٹی اور تلنگی، کنڑی ان
زبانوں میں فارسی، عربی، ترکی کے اتنے الفاظ شامل کرنے کا نتیجہ مقامی باشندوں کو
اپنی موروثی زبانوں کا استعمال دو ناموں سے کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ اپنی
بنگالی عربی فارسی ملی جلی زبان کو مسلمانی بنگالی کہتے تھے۔ یہی نہیں مسلمانی مرہٹی
مسلمانی تلنگی اور مسلمانی کنڑی کو بھی وہ یہی سمجھتے ہیں[١]

غرضکہ عربی فارسی ترکی کے لفظوں کی بہتات مقامی زبانوں میں ہونے سے میل جول
اور تعلقات کی استواری میں گھل مل کر رہنے کا نتیجہ اس طرح برآمد ہوا کہ ہر علاقہ
میں ایک تیسری زبان کا آغاز ہوا۔ ہندوستانی مزاج، ماحول اور علاقائی بولیوں کے
معقول اثرات ہندوستانی انداز میں نئی زبان کو جنم دینے لگے۔ اسی وجہ سے امیر خسرو
نے ایسی زبان کو ہندی اور دہلوی زبان کہا ہے۔ اسی طرح عہد شاہجہانی میں اردوئے
معلیٰ وجود میں آیا اور یہ زبان اس علاقہ میں سب سے زیادہ بولی جاتی تھی اسلئے
وہاں اس کو اردوئے معلیٰ کا نام دیا گیا۔

پہلی بار میر تقی میر نے ذکر میر میں لغوی طور پر اس نام کو اردو کی زبان لکھا ہے۔
ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اردوئے معلیٰ[٢]

یہاں یہ نام اصطلاح میں نہیں آیا ہے اور فطرتاً آدمی سہولت پسند واقع ہوا
ہے۔ وہ مشکل پسندی کے مقابل میں سہل پسندی کا جذبہ رکھتا ہے۔ چاہے کام کے
انداز میں ہو یا بات کے انداز میں ہو۔ صوتی اعتبار سے بھاری بھرکم لفظوں سے
گریز کرتا ہے۔ بڑے بڑے القاب و آداب میں تخفیف کا عمل جاری رکھتا ہے۔
جیسے "خواجہ معین الدین چشتیؒ" نہ کہتے ہوئے صرف خواجہ صاحب کہہ دینا۔ ایسا ہی
تخفیفی عمل اس زبان کے ساتھ بھی ہوا اور یہ زبان اردوئے معلیٰ سے اردو کی زبان
اور اردو کی زبان سے صرف "اردو" ہو کر رہ گئی۔ اسی لئے میر کے بعد انشاؔ نے دریائے

---

[١] معارف ١٩٣٣ء (جولائی) "اردو کیونکر پیدا ہوئی" سید سلیمان ندوی نقوش سلیمانی ص ٢٥٥
[٢] ذکر میر۔ میر تقی میر ص ٦٣

لطافت" میں اور مصحفی نے تحقیق تذکرہ میں اس زبان کو "اردو" کے نام سے پکارا ہے اور اردو کے بعد تخفیف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے اردو کے نام سے یہ زبان زندہ و جاوید ہے۔

یہ زبان دو اقوام اور مختلف طبقات کے معاشرتی اور تہذیبی اشتراک کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئی۔ اردو زبان کا تحفہ ہر علاقہ میں علاقائی زبان کے ساتھ مسلمانوں کی موروثی زبانوں کے اثرات کی دین ہے۔ زبانوں کے بننے بگڑنے کی تاریخ کے ذمہ دار ہر دور میں مختلف اقوام ہوتی ہیں۔ اس طرح ہندوستان میں مسلمان اور ہندوستانی اقوام کے خیالات اور احساسات ضروریات اور تعلقات میں جذبوں کی تسکین کے لئے اظہاری عمل نے اردو زبان کو پیدا کیا۔ اس کا سب سے اعلیٰ ثبوت یہ ہے کہ ہر علاقہ میں ایک ہی قوم (مسلمانوں) کی بود و باش اور ان کی موروثی زبانوں کے الفاظ مقامی زبانوں سے منسلک ہوتے رہے اور جہاں جہاں مسلمان پہنچے وہاں کی مقامی بولیوں اور زبانوں میں ضروریات کے مطابق گفت و شنید کا سلسلہ شروع کرتے۔ جہاں مفہوم کے اظہار میں مقامی زبان کے لفظوں کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے وہاں اسی مفہوم کا موروثی زبانوں کا لفظ استعمال کرتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر علاقہ میں علاقائی نسبت سے تیسری زبان کا آمیزہ تیار ہونے لگا۔ اس لئے علاقائی بنیاد پر مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے پرورش پاتی رہی۔

زبان کی تحقیق کے تعلق سے شوکت سبزواری لکھتے ہیں کہ

"زبان کا آغاز اور اس کا ارتقاء جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ان آوازوں کی تاریخ دریافت کی جائے۔" [۱]

دوسرا بیان اس طرح ہے۔

"اردو کے ارتقاء کے سلسلہ میں اسماء اور اعداد کی بڑی اصلیت ہے کچھ اسی لئے زبان کے کینڈے پر بحث کرتے ہوئے ان پر بھی نظر ڈالی جاتی ہے۔" [۲]

---

[۱] اردو زبان کا ارتقاء۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری ص ۱۲۴ [۲] ایضاً ص ۳۹۲

ڈاکٹر شوکت سبزواری کے دونوں بیانات اپنے پیچھے ایک تاریخ کے ساتھ سچائی کے مظہر ہیں۔

محمود شیرانی، مسعود حسین خاں جیسے محقق بھی صوتیات اور اسماء و اعداد کو لسانیات کی معلومات میں اہمیت دیتے ہوئے اپنے نظریات پیش کرتے ہیں محمد حسین آزاد کا اصل مقصد زبان کی تحقیق نہیں تھا۔ اس لئے انھوں نے سرسری بحث سے کام لیا لیکن ان کے اخذ کردہ نتائج کی بنیادی حیثیت نہ سہی ایک مستحکم نظریے کی دین ہے۔ کیوں کہ صوتیاتی اعتبار سے اور اسماء و اعداد، افعال اور قواعد اردو زبان کے ہندوستانی زبانوں سے مستعار ہیں۔ جمع اور واحد کے قواعد عربی، فارسی اور پنجابی سے وابستہ ہیں۔ افعال ایک طرف ہریانی دوسری طرف دکنی کھڑی بولی سے منسلک ہیں۔ اسی لئے ڈاکٹر مسعود حسین اردو کی ابتدا کے سلسلے میں ہریانی پر زور دے کر دہلی اور نواح دہلی کی تمام بولیوں کا تذکرہ کرتے ہیں [1]

اسی گمان کو محمود شیرانی نے پنجابی اور دکنی کی مماثلت سے منسوب کیا ہے۔[2] تشکیل شدہ اردو زبان کے تعلق سے ڈاکٹر مسعود صاحب ایک مقام پر یوں فرماتے ہیں۔

"اردو زبان کی تشکیل کا دوسرا پہلو یعنی ہندوستانی زبانوں میں فارسی عربی کی آمیزش کا رجحان کبیر کے زمانے میں اپنے شباب کو پہنچ چکا تھا"[3]

تمام بیانات کی روشنی میں ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ علاقائی حدود میں یہ زبان ہندوستانی مزاج اور ماحول سے متاثر ہو جاتی ہے۔ گو کہ مختلف زبانوں کی لفظوں کو جذب کرتی رہتی ہے۔ ہر زبان اور بولی کی سہل تراکیب قواعد اور اصول اپنا لیتی ہے اور اس دور میں برج بھاشا کھڑی بولی ہریانی، پنجابی، دکنی مزاجی حیثیت سے قریب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر محقق کو لسانیاتی قواعد اور تحقیق کی روشنی

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ص ۲
[2] "پنجاب میں اردو" ... محمود شیرانی
[3] مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ص ۱۴۷

میں خالص ایک نظریہ پیش کرنے میں کبھی پس و پیش کا اظہار کرنا پڑا ہے۔ اس کے
باوجود اصول اور ضوابط کے دائرے میں پانچ اہم زبانوں پر غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جاتے
صوتیاتی اسماء، افعال، جمع واحد کے قواعد، تمام آمیزوں میں اردو میں، پنجابی، ہریانی
دکنی، برج بھاشا، کھڑی بولی کا عکس کہیں صاف کہیں دھندلا دکھائی دیتا ہے اور ان
پانچوں زبانوں میں ارتقاء پذیر زبان اور پرانی زبان پر برج بھاشا کا اثر بہت زیادہ نظر
آتا ہے۔ اسی بنیاد پر محمد حسین آزاد اور مسعود حسین صاحب ایک اردو کی ابتداء، دوسرا
اردو کے ارتقاء کا ذریعہ برج بھاشا کو کہتے ہیں۔

لیکن اردو زبان مختلف علاقوں کے زبانی اور بولیوں کے اثرات قواعد اور ضوابط
کی روشنی میں لسانی حقائق کے زیر اثر خالص ہندوستانی زبان ہے۔ کیوں کہ اس میں خالص
ہندوستانی بولیوں اور زبانوں کی خصوصیات نظر آتی ہیں۔ عربی، فارسی اور ترکی پشتو
الفاظ کے ساتھ اپنی ذاتی خصوصیت برقرار رکھتی ہے۔ ہر زبان کے اثرات اور قواعد
کی پیروی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ زبان مختلف زبانوں کے زیر اثر ایک نئی زبان
کا روپ ہے۔ جس کے ارتقاء میں برج بھاشا اور کھڑی بولی کا ہاتھ ہے اور ابتداء
میں پنجابی، دکنی، ہریانی کے اثرات ممیّز ہیں۔

اس لئے ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان خالص ہندوستانی زبانوں میں
سے ایک ہے جس میں ہماری وراثتی زبانوں کا سرمایہ آبائی تہذیب کا رنگ ہندوستانی
معاشرت اور قومی اقدار کا عکس شامل ہے۔

اردو زبان کے مختلف نظریات پر تبصرہ

ہماری زبان کی ابتدائی نشو و نما اور ارتقاء کے مختلف نظریات اردو کی لسانی تاریخوں سے ماخوذ ماہرین لسانیات کے دو ٹوک فیصلے کے محتاج ہیں لیکن کسی زبان کے پھلنے پھولنے کی حقیقت کا سراغ تحقیقی دروازوں کو کھلا رکھنے کیلئے دو ٹوک فیصلے نہیں چاہتا۔ اس باب میں ہم نے مختلف ماہرین لسانیات کے نظریات سے بحث کی ہے۔ جن میں محمد حسین آزاد ... محمود شیرانی، محی الدین قادری زور، سید سلیمان ندوی، مسعود حسین خان، شوکت سبزواری خاص ہیں۔

سید احتشام حسین کے لسانی نظریے سے اس لیے چشم پوشی نہیں کی گئی۔ لیکن ترجیح کی انفرادیت اختراعی اہمیت نہیں رکھتی۔ ہمارے ماہرین لسانیات مختلف نظریات کے احاطے میں وسیع النظری کا مظاہرہ ضرور کرتے ہیں اور نقطہ نظر کے مطابق محدود ہو جاتے ہیں۔ لسانی تاریخوں میں پیش کردہ نظریات اپنے عہد میں اپنی اہمیت منوا لیتے ہیں۔ بعد کے محققین اپنی صلاحیتوں سے پچھلے نظریات کو رد کر کے اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے حقائق و قیاسات کے سہارے دنیا کے سامنے یا نظریہ رکھتے ہیں۔ ایسے محققین اپنے مواد کے ساتھ حقائق سے چشم پوشی نہیں کرتے۔ ٹھوس دلائل کی روشنی میں اپنے نظریات کی تبلیغ کرتے ہیں۔

مذکورہ ماہرین اپنے عہد کے مانے ہوئے لسانی محقق ہیں۔ خصوصاً جانفشانی و عرق ریزی سے جو مواد فراہم پہنچایا وہ قابل ستائش ہے اس مواد کے ذریعے ہم لسانیات کے نازک لسانی پہلوؤں کے لوچ دار حقائق و قیاسات سے روشناس ہو جاتے ہیں۔ ان نظریات کے عمیق مطالعے سے اگرچہ ہم کو یک ہی رہ یا منزل کا صحیح پتہ نہیں چلتا پھر بھی منزل پر پہنچنے کے نقوش صاف دکھائی دیتے ہیں۔ اور ان نقوش کی روشنی میں ہمارے تحقیقی کام کرنے والوں کو بہتر مواد فراہم ہو جاتا ہے۔ جہاں وہ ایک نظریے کے تعین میں حق بجانب نظر آتے ہیں۔

تذکرہ نویسی کی روایت کا جائزہ اور مقاصد

تذکرہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کو اہلِ زبان ذکر، دیل کا ڈبہ، یادداشت، دو بمعنی نصیحت کرنے کے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پروانۂ راہداری (پاسپورٹ) کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں[۱]۔ لیکن گیارہویں صدی کے ایرانی ادیبوں نے اصطلاحاً اس لفظ کا اطلاق اس کتاب پر کیا جس میں شعراء کے مختصر حالات اور ان کا انتخابی کلام درج کیا جائے ورنہ اس سے پہلے فارسی میں یادداشت و یادآوردن کی رعایت سے مختلف شخصیات کے حالات پر لفظ تذکرہ سے استفادہ کیا جاتا تھا۔

فارسی میں مولوی عبدالجبار خاں ...

ملکاپوری کی تصنیف "تذکرہ سلاطین دکن" "تذکرہ ادبیائے دکن" ، پنڈت کشن پرشاد کول کا مجموعۂ مضامین "ادبی اور قومی تذکرے" سے لغوی معنی کا یہ فائدہ مذکورہ ادیبوں نے اٹھایا۔ لیکن اس کے باوجود اصطلاحی معنی میں صرف وہی کتابیں "تذکرہ" کی تعریف میں شمار کی جاتی ہیں جن میں شعراء کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے موجود ہوں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کا اطلاق ادبی حیثیت سے تذکروں میں نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ تذکرہ نگار شعراء کے نام، تخلص، وطن اور جائے قیام علمی اور فنی استعداد کے علاوہ گروہی سلسلہ استادی و شاگردی کا رابطہ سیرت کے خدوخال تخلیقی کارہائے نمایاں کلام اور مذاق کے تعلق سے ابتدائی معلومات، منتخب اشعار یا اوقات، اصنافِ سخن کے اقتباسات، ترتیب ان بنیادی اصولوں کو پیشِ نظر رکھنے والی تصنیف کو تذکرہ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف نام اور تخلص کے ساتھ شاعروں کا کلام یا منتخب اشعار لکھ دیے جائیں یا لکھنے والے کے ذوقِ سلیم کے مطابق منتخب اشعار کی اجتماعی تصنیف کو بیاض کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا مرتب بقدرِ ضرورت اور ذوقِ سلیم کے تحت معلومات واشعار کا ذخیرہ فراہم کرتا ہے۔ اس کا مقصد کسی موضوع کی تشفی نہیں۔ اس لیے وہ نظم و ضبط کا پابند نہیں ہوتا۔

---

[۱] علامہ شبلی نے اپنی تصنیف "سفرنامہ مصر و روم و شام" میں تذکرہ کو صفحہ ۱۲، صفحہ ۲۲ پر پاسپورٹ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

بیاضوں میں عام طور پر منتخب کلام یا منتخب اشعار صاحبِ بیاض کے ذوق کے مطابق ہوتے ہیں۔[1] کبھی کبھی صاحبِ ذوق اپنی یادداشت کے لیے شاعر کا نام تخلّص کے ساتھ وطن اور سلسلۂ تلمّذ کا اظہار بھی کر دیتا ہے۔ لیکن بیاضوں میں تذکروں کی طرح شاعروں کا ترتیب وار تعارف نہیں ہوتا۔ یہ بنیادی فرق بیاضوں اور تذکروں کے بیچ ایک حدِ فاصل قائم کرتا ہے۔[2]

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے اس فرق کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے: "فرق درمیانِ بیاض و تذکرہ ہمیں باشد کہ بیاض تنہا اشعار شاعر دارد و تذکرہ احوال و اشعار ہر دو دارد۔"[3]

اس بیان کی روشنی میں یہ ظاہر ہے کہ بیاض کا دائرہ تذکرہ کی بہ نسبت محدود ہے۔

تاریخ ادب اور تذکرے: تاریخ ادب میں شعراء اور ادباء کے حالات، تصانیف و تخلیقات کا جائزہ تفصیل کے ساتھ لیا جاتا ہے ماحول کے اثرات اور تبدیلیوں پر بھی نظر رکھی جاتی ہے۔ لیکن تذکرہ نگار شعراء کے تعارف میں تفصیل کا قائل نہیں صرف کچھ ضروری معلومات پر اکتفا کرتا ہے، اس کے علاوہ وہ نثر نگاروں کی معلومات بھی فراہم نہیں کرتا۔ شعراء کے مختصر حالات اور منتخب کلام کا سرسری جائزہ لے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔

تذکرہ نگار کے فرائض: بیاض نویس اپنے مختصر بیان کا سہارا لے کر شعراء کے حالات درج کرتا ہے تاریخ ادب کا مورخ مفصّل بیان کی مدد سے شعراء اور ادباء کی تخلیقات کا جائزہ لیتا ہے لیکن تذکرہ نگار کو درمیانی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اس راہ میں تذکرہ نگار کو اعتدال اور توازن کے ساتھ قوتِ فیصلہ کی سخت آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔

اردو تذکرہ نویسی کا ابتدا میں غالب رجحان یہ رہا کہ تذکرہ نویسوں نے صرف شعراء کے حالات اور کلام کا جائزہ لیا لیکن نثر نگاروں کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ اور نہ ہی ان کا مختصر ذکر کیا۔[4]

۱؎ اردو تنقید کا ارتقاء صفحہ ۵۶ ڈاکٹر عبادت بریلوی

۲؎ شعرائے اردو کے تذکرے صفحہ ۲۳ ڈاکٹر حنیف نقوی

۳؎ خزانۂ عامرہ صفحہ ۱۱۵ آزاد بلگرامی ۴؎ شعرائے اردو کے تذکرے حنیف نقوی صفحہ ۲۴ تا صفحہ ۳۰

ایسی صورت میں عمیق مطالعہ، شعور کی تابناکی، ذہن و فکر میں وسیع النظری، اور
اظہار و ابلاغ کے ذرائع پر کامل قدرت کا ہونا ضروری ہے صرف نقل کے سہارے تذکرہ نگار اپنے مقصد میں کامیاب نہیں
ہو سکتا۔ شعر و ادب میں تخلیقی عناصر کے ساتھ تذکرہ نگار کو ماحول اس زمانے کی
تاریخ، علمی تحریکات، ذہنی محرکات و ثقافتی مجالس میں سرگرم افراد سے واقفیت رکھنا بھی ضروری ہے
سوسائٹی سے بیزار، تنہائی پسند فرد، شخصیات کے مطالعے اور دروں بینی کی
حقیقت سے بے بہرہ ہوتا ہے اس لیے وہ تذکرہ نگاری کا واجب حق ادا نہیں کر سکتا۔ حقیقتاً تذکرے
کے مرتب کو جامع اصول اور نظم و ضبط کا پابند ہونا ضروری ہے۔
تذکرہ نگار کا انداز بیان تحریری شکل میں واضح اور دلکش ہونا چاہیے۔ سلاست
اور روانی کے ساتھ فصاحت و بلاغت کے اصولوں سے واقفیت بھی ضروری ہے
شاعر کے کلام کا انتخاب اس کے فن کی خوبیوں اور خامیوں کا نمائندہ ہونا
چاہیے۔ معتبر ذرائع اور مستند نسخوں میں تضاد کے پہلو فنی شخصیات کو متاثر کر دیتے ہیں ساتھ مرتب
کی صلاحیت کا امتحان ہوتے ہیں۔ پست اور غیر معیاری اشعار مرتب کی سطحیت کا مذاق اڑاتے ہیں۔
غیر جانبداری اور انصاف پسندی سے اخلاق و عادات اور کلام کا انتخاب کرنا چاہیے
مرتب کی ذاتی پرخاش نفسیاتی اعتبار سے شاعر کے کلام اور ذاتی صفات کا جائزہ نہیں لے سکتی۔

اردو تذکرہ نگاری کی روایت: اردو تذکروں کا مطالعہ غور و فکر کی روشنی میں یہ کہنے
پر مجبور کرتا ہے کہ ہمارے تذکرے فارسی سے متاثر ہیں بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ فارسی کی نقل ہیں۔
تقلید[۱]، نقل[۲] یا تاثر[۳] اس بات کے گواہ ہیں کہ اردو میں تذکرہ نویسی کی بنیاد فارسی سے مستعار ہے
اس کے شاہد وہ تذکرے ہیں جو اردو شعرا پر فارسی میں لکھے گئے ہیں گویا تذکروں کی روایت
اردو کی اختراع نہیں بلکہ فارسی میں موجود صنف کو اردو والوں نے اپنا لیا ہے۔

۱؎ "شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن" ص[۱] از ڈاکٹر سید عبداللہ
۲؎ "اردو تنقید کا ارتقاء" ص ۹۵ از ڈاکٹر عبادت بریلوی
۳؎ "شعرائے اردو کے تذکرے" دیباچہ ص ج ص ۱۲۷ از ڈاکٹر حنیف نقوی

ابتدا میں کم و بیش اس کوئی تبدیلی نہیں کی گئی جو فارسی تذکروں کے مزاج سے مختلف ہوتی۔ یہاں تک کہ اردو تذکروں میں شعراء کے متعلق بیان میں فارسی زبان کا سہارا لینا پڑا۔

ہمارے تذکروں کی تاریخ میر کے فارسی تذکرہ "نکات الشعراء" سے باقاعدہ شروع ہوتی ہے۔ گارسں دتاسی[1] کے ۱۱۲ تذکروں کی فہرست میں صرف چھ تذکرے اردو زبان میں لکھے گئے ہیں ان کے علاوہ تمام تذکروں کی زبان فارسی ہے۔

دراصل تذکرے قومی اقدار، معاشرتی اقدار، تہذیب و تمدن کی نمائندگی کرتے ہیں اور تہذیب و تمدن سماجی قدروں کو متعین کرتے ہیں۔ جن کے اثرات زبان و ادب کو متاثر کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے عربی تذکرے کی روایت فارسی میں آئی اور فارسی سے اردو میں۔ یہ استفادہ قومی اور تہذیبی سطح پر پوری توانائی کے ساتھ رونما ہوا۔ یہ اثرات تذکروں ہی میں نہیں بلکہ ادب سے لے کر مذہب تک گہرے گہرے روایات کے ضمانت دار ہیں۔

تذکروں کا تاریخی جائزہ لینے پر کوئی تذکرہ نگار اپنی تالیف کو اولیت کا درجہ دیتے ہیں لیکن تحقیق کی روشنی میں مندرجہ ذیل تذکروں کی فہرست سنین کی روشنی میں اس طرح ترتیب دی جا سکتی ہے۔

[1] خطبات دتاسی ص ۹۱

تذکرہ کا نام	سن تالیف یا تصنیف	مصنف
۱۔ نکات الشعراء	سنہ ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۰-۵۱ء)	میر تقی میر
۲۔ ریختہ گویاں (گلزار ابراہیم کا ترجمہ)	سنہ ۱۲۱۵ھ تا سنہ ۱۲[illegible]۶ھ	فتح علی حسینی گردیزی
۳۔ تحفۃ الشعراء	سنہ ۱۱۶۵ھ	افضل بیگ خان قاقشال
۴۔ گلشن گفتار	سنہ ۱۱۶۵ھ	حمید اورنگ آبادی
۵۔ مخزن نکات	سنہ ۶۸ھ	قائم چاند پوری
۶۔ تذکرۂ حیرت	سنہ ۱۱۷۴ھ	حیرت
۷۔ چمنستان شعراء	سنہ ۱۱۷۵ھ تا سنہ ۱۱۷۶ھ	لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی
۸۔ تذکرۂ میر حسن یا شعرائے اردو	سنہ ۸۸ھ تا سنہ ۱۱۹۲ھ	میر حسن

تذکرہ کا نام	سن تالیف یا تصنیف	مصنف
۹۔ تذکرۂ شورش	سنہ ۱۱۹۳ھ تا سنہ ۱۲۰۸-۹ھ	غلام حسین شورش
۱۰۔ گلزار ابراہیم	سنہ ۱۱۹۸ھ سنہ ۱۷۸۳ء	ابراہیم خان
۱۱۔ گلشن ہند	سنہ ۱۲۱۵ھ (گلزار ابراہیم کا ترجمہ)	علی لطف
۱۲۔ عمدۂ منتخبہ	سنہ ۱۲۱۵ھ تا سنہ ۱۲۲۳ھ	اعظم الدولہ سرور
۱۳۔ عیار الشعراء	سنہ ۱۲۰۸ھ تا سنہ ۱۲۴۷ھ	خوب چند ذکاء
۱۴۔ مجموعۂ نغز	سنہ ۱۲۲۱ھ	حکیم قدرت اللہ قاسم
۱۵۔ ریاض الفصحا	سنہ ۱۲۲۱ھ تا سنہ ۱۲۳۲ھ	مصحفی
۱۶۔ طبقات الشعراء	سنہ ۱۲۰۱ھ	کریم الدین
۱۷۔ گلشن بے خار	سنہ ۱۲۴۸ھ تا سنہ ۱۲۵۰ھ	شیفتہ
۱۸۔ خلاصہ یا انتخاب صہبائی	سنہ ۱۲۶۰ھ	شیخ امام بخش صہبائی
۱۹۔ تذکرۂ ہندی	سنہ ۱۲۰۵ھ، سنہ ۱۷۹۴ء	مصحفی
۲۰۔ گلستان بے خزاں	سنہ ۱۲۷۱ھ	قطب الدین باطن اکبر آبادی
۲۱۔ تذکرۂ اختر		واجد علی شاہ
۲۲۔ خطبات گارساں دتاسی	سنہ ۱۸۷۷ء	گارساں دتاسی

تذکروں کی تاریخی ترتیب کے پیش نظر میر تقی میر کا تذکرہ "نکات الشعراء"[۱] کو اردو ادب کا پہلا تذکرہ کہہ سکتے ہیں۔ اور "گلزار ابراہیم" کا ترجمہ تذکرہ "ریختہ گویاں"[۲] جو گردیزی کی کاوش کا نتیجہ ہے اسے اردو کا دوسرا تذکرہ کہہ سکتے ہیں۔ "تحفۃ الشعراء" از مفضل بیگ قاقشال (۱۱۶۵ھ) اور "گلشن گفتار" از حمید اورنگ آبادی ۱۱۶۵ھ مذکورہ تذکروں کے بعد لکھے گئے۔

۱؎ "نکات الشعراء" میر تقی میر سنہ ۱۱۶۵ھ

۲؎ ریختہ گویاں گلزار ابراہیم کا ترجمہ سنہ ۱۲۱۵ھ تا سنہ ۱۲۱۶ھ فتح علی گردیزی

ابتدائی تذکروں میں شعرا کی تعداد کم پائی جاتی ہے لیکن زبان کی ارتقاء کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ شاعروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ "نکات الشعراء" میں ۱۰۳ شاعروں کا حال موجود ہے اور تذکرہ ریختہ گویاں میں شعراء کی تعداد ۱۱۰ ایک سو دس ہے اس اعتبار سے ہم... "نکات الشعراء" کو اردو کا پہلا تذکرہ ماننے میں حق بجانب ہیں۔

"تذکرۂ شورش" ۱۱۹۳ھ کے مرتب غلام حسین ۳۱۴ تین سو چودہ شعرا کا ذکر کرتے ہیں۔ "عمدہ منتخبہ" اعظم الدولہ سرور (۱۲۱۵ھ تا ۱۲۲۴ھ) ۱۲۰۰ بارہ سو کی روداد لکھتا ہے "عیار الشعراء" میں خوب چند ذکا (۱۲۴۷ھ) ۱۵۰۰ پندرہ سو شعراء کے حالات درج کرے ہیں۔ اس بیچ "تذکرۂ اختر" جس کو واجد علی شاہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ۵۰۰۰ پانچ ہزار شعراء (جس میں کچھ فارسی شعراء بھی ہیں) کا ذکر کرتا ہے۔

خطبات دتاسی (۱۸۷۷ء) میں گارساں دتاسی ص۹۱ پر شعراء کی تعداد کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"تین ہزار شعراء کے نام میری نظر سے گزرے ہیں جن میں سے میں نے اپنے تذکرے کے لیے چھ سو کا انتخاب کیا ہے۔"[1]

گویا ۱۸۷۷ء میں اردو شاعری زبان زد عام ہو چکی تھی مذکورہ حوالوں میں شعراء کی بڑھتی ہوئی تعداد اس بات کی شاہد ہے۔

دراصل شاعرانہ ذوق کی ذمہ دار بارہویں صدی ہجری کے سیاسی اور سماجی حالات بھی ہیں۔ دہلی کی مرکزیت ختم ہوئی اور مختلف مراکز کا قیام عمل میں آیا۔ شعراء اور دیار بھی گردش لیل و نہار کا شکار ہوئے اور ان میں سے بعض مالی منفعت اور بعض قدردانی کی تلاش میں محفوظ مقام پر پہنچ گئے۔ ریاستی ذمہ داروں کے ذوق اور شوق نے شعراء کی قدردانی و حوصلہ افزائی کی۔ اور ساتھ ساتھ انعام و اکرام، وظائف سے بھی نوازا۔ اس بنا پر شاعری کا شوق عوام میں بڑھتا گیا۔ یہ ذوق عیش پرستی اور کاہلی کا ذمہ دار بھی ثابت ہوا۔ ایسے دور

۱؎ خطبات دتاسی ۱۸۷۷ء ص ۹۱

میں مسلمانوں کے حالات کیا تھے۔ تاریخ شاہد ہے "خزانۂ عامرہ" صلا غلام علی آزاد لکھتے ہیں۔

"زیرکہ در ہندوستان است دیہیچ ولایت نیست بہ کثرتِ تمول مردم ایں ملک را از مشق ورزم باز داشتہ در عیش و عشرت بزم می اندازد۔" سلہ

اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عوام اور بادشاہوں میں شوق رزم کے بجائے شوق بزم میں مشاغل عیش پرستی کا جذبہ بیدار تھا۔ شعر بازی کی وبا نے ایک صدی کے اندر اتنے شاعر پیدا کیے کہ جن کا شمار تذکرہ نگاروں کے لیے بھی ایک مشکل امر بن گیا چنانچہ دتاسی لکھتا ہے کہ

"شاعر بہ معنی مصنف بھی لیا جاتا تھا۔ لہٰذا ہر مصنف کو فہرستِ شعراء میں شامل کر لیا جاتا تھا۔" سلہ

پروفیسر شیرانی لکھتے ہیں کہ

"مسلمان اور ہندو بلکہ فرنگی زادوں تک یہ ذوق سرایت کر گیا ہے۔ سلاطین و عمال، امراء و علماء، سپاہ و اہلِ دیوان کے علاوہ ہر طبقہ کے بیشہ وروں پر شاعری کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔" سلہ

چنانچہ صیقل گر، معمار، پارچہ باف، پارچہ فروش، آہن گر، فیل بان، مہاجن، دلال، بزاز، سنار، درزی، رفوگر، حجام، جراح، سقہ، خاکروب ہر پیشہ کا شاعر موجود ہے غرض کہ شاعری کا ذوق خاص و عام میں بیدار ہوا۔ اور مشاعروں سلہ کے رواج کی ابتداء ہوئی۔ مشاعرے اور مجالس ادبی اہمیت کے حامل تھے۔ ان مجالس میں اساتذہ، شاگرد، ان کے ساتھ موجود رہتے اور فنکاروں کو تنقیدی و تعمیری دونوں انداز سے دل کھول کر داد دیتے تھے۔ سلہ

سلہ "خزانۂ عامرہ" صلا غلام علی آزاد

سلہ "خطباتِ دتاسی" صلاا گارساں دتاسی

سلہ "مجموعۂ نغز" ص ج دیباچہ مرتبہ پروفیسر شیرانی

سلہ "اردو تنقید کا ارتقاء" از ڈاکٹر عبادت بریلوی ص۸۵

سلہ "شعرائے اردو کے تذکرے" از ڈاکٹر سید عبداللہ ص۷

گویا تنقیدی حساسیت سے فنکار کی صلاحیت ناپی جانے لگی۔ یہاں سے اساتذہ کی گروہی تقسیم کی بنیاد پڑی۔ تنقید کی زبانی ابتداء اور ان حالات نے شاعرانہ فن میں رائے دہی کے جذبے کی حوصلہ افزائی کی اور تذکرہ نویسی حسب روایت غزل اور فارسی ادبی قدروں کے تحت پروان چڑھنے لگی۔ اور یہ فن نویسی اہلِ ذوق کا تشفی کا ذریعہ بن گئی۔

تذکروں کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیانوں کا انتخاب تذکروں سے قوی نہیں ہے۔ اس حیثیت سے یہ فن زیادہ قابلِ قبول نہیں۔ حالانکہ تذکروں کی ہیئت بھی ایک جیسی نہیں ہے۔

محققینِ ادب نے تذکروں میں محفوظ کلام کا انتخاب شعراء کے حالاتِ زندگی کو تاریخی حقائق کی روشنی میں اور بیانات کے تضاد کو سامنے رکھ کر تذکروں کو تقسیم کیا ہے مختلف حوالوں کا اتفاق اور روایات کو قدار کی روشنی میں جانچ کر تذکروں کی تقسیم سے کچھ نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ تذکروں کو اس طرح تقسیم کرتے ہیں۔

"اوّل": وہ تذکرے جن میں صرف اعلیٰ شاعروں کے مستند حالات جمع کیے گئے ہیں۔ اور ضمناً کلام کا انتخاب بھی دیا ہے۔

"دوّم": وہ تذکرے جن میں تمام قابلِ ذکر شعراء کو جگہ دی گئی ہے اور مصنف کا مقصد جامعیت ہے۔

"سوم": وہ تذکرے جن کا مقصد تمام شعراء کے کلام کا عمدہ اور مفصل ترین انتخاب پیش کرنا ہے۔ اور حالات کے جمع کرنے کی زیادہ اعتنا نہیں کیا گیا اور مجموعے اسی صنف میں شامل ہیں

"چہارم" وہ تذکرے جن میں دولت شعری کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور تذکرے کا مقصد شاعری کا ارتقاء دکھانا ہے۔

"پنجم" وہ تذکرے جو شاعری کے ایک مخصوص دور سے بحث کرتے ہیں۔

"ششم" وہ تذکرے جو کسی وطنی یا ادبی گروہ کے نمائندے ہیں۔

"ہفتم" :- وہ تذکرے جن کا مقصد محض تنقیدِ سخن اور اصلاحِ سخن ہے" [1]

تذکروں کے درجات ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس طرح قائم کیے ہیں۔

۱۔ وہ تذکرے جو کسی بھی بڑے شاعر کے نتیجۂ قلم ہیں۔

۲۔ وہ تذکرے جن کے مصنف خود بڑے شاعر نہیں لیکن کسی بڑے شاعر کے گرویدہ شاگرد تھے۔

۳۔ وہ تذکرے جن کے مصنفوں کو سخن گو نہیں بلکہ سخن فہم کہا جا سکتا ہے۔[2]"

ڈاکٹر فرمان فتح پوری عام سرکاری درباری تالیفات کے حدود کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ تقسیم بنیادی طور پر دو قسم کے گروہوں میں منقسم ہوتی ہیں۔

۱ ــــ بیاضی تذکرے جن کا اصل مقصد انتخابِ اشعار ہے۔

۲ ــــ سوانحی تذکرے جن میں شعراء کے حالات جمع کرنے اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔" [3]

یہ گروہی یا درجاتی تقسیم اپنے اپنے معیار اور استعداد سے مطابقت رکھتی ہے کیونکہ تذکروں کی تاریخ میں، اردو کیا فارسی میں بھی کوئی ایسا تذکرہ موجود نہیں جس میں انتخابِ کلام کو ضمنی حیثیت دی گئی ہو۔ سوا "آبِ حیات" (محمد حسین آزاد) اور "گلِ رعنا" (عبدالحئی) کے۔ تاہم بیشتر ناقدینِ سخن ان تصانیف کو تذکروں کی فہرست میں شامل نہیں کرتے اس لحاظ سے ڈاکٹر سید عبداللہ کی تقسیم میں ترمیم کی گنجائش ہے۔

ہمارے تذکروں میں کلام پر تنقیدی کارکردگی اور اصلاح کے عمل کو نمایاں یا ضمنی حیثیت دینے والے تذکروں کی تقسیم بھی قابلِ اصلاح ہے۔ کیونکہ اصلاحِ سخن اور تنقیدِ کلام کو کسی تذکرہ نگار نے اساسی حیثیت عطا نہیں کی ہے۔

---

[1] "شعرائے اردو کے تذکرے" صفحہ تا صفحہ از ڈاکٹر سید عبداللہ

[2] "گلزارِ ابراہیم" مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مقدمہ صفحہ ۳۱-۳۲ پر

[3] "تذکروں کا تذکرہ نمبر صفحہ ۲۹ (نگار پاکستان، ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ڈاکٹر زور کی درجاتی حیثیت ان کی تحریر کے مطابق یوں ترمیم شدہ ہو جاتی ہے
قائم، مصحفی، میر حسن اور شیفتہ کے تذکروں کا شمار اول قسم میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان سب تذکروں میں غیر معروف شاعروں کے ذکر سے پرہیز کیا گیا ہے۔ اور حالات کو بہت کم اہمیت دی گئی ہے۔ زیادہ تر شاعری پر تنقید اور تبصرہ پر کوشش کی گئی ہے۔
ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تقسیم کا نقص اختصار اور جامعیت کی کوشش میں نمایاں خوبیوں سے دستبردار ہے۔
ڈاکٹر حنیف نقوی غرض و غایت اور معنوی امتیازی کی روشنی میں تذکروں کو اس طرح تقسیم کرتے ہیں۔
۱ ــــــ تعارفی تذکرے: وہ تذکرے جن کے مولفین نے علمی و ادبی ذوق یا جذبۂ قدر شناسی کے تحت شعراء کے حالات اور اشعار کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے اور بے جا تنقیص و تعریف سے دامن بچائے رکھا اس قسم کے تذکروں کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔
۲ ــــــ جوابی تذکرے: وہ تذکرے جن کے مولفین نے دوسرے تذکرہ نگاروں کی ضد میں قلم اٹھایا ہے۔ اور اپنی تمام تر صلاحیتیں حریف تذکرہ نگاروں کے بیانات کی تردید یا اپنے احباب کی تعریف و تحسین اور مخالفین کی تشہیر اور تضحیک پر صرف کر دی ہیں "قطب الدین باطن اکبر آبادی" کا "تذکرہ گلستانِ بے خزاں" اسی ضمن میں آتا ہے۔
۳ ــــــ انتخابی تذکرے: وہ تذکرے جن میں انتخاب کلام اور تدوین اشعار کے حالات کی تلاش و ترتیب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس قسم کے تذکروں کی مثالیں حیدر بخش حیدری کے "گلشن ہند" "تیلی نارائن کے" دیوان جہاں" اور شاہ کمال کے "مجمع الانتخاب" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔"[1] پھر تعارفی تذکروں کو دائرۂ عمل کے لحاظ سے یوں تقسیم کیا ہے۔

أ۔ عام تذکرے:
(الف) مرکزی تذکرے جن میں شعراء کے تعارف میں ذاتی واقفیت کی بجائے تحقیقی معلومات

---

[1] "شعرائے اردو کے تذکرے" ص ۴۲ از ڈاکٹر حنیف نقوی

ہے۔ مثلاً "مخزن نکات" "مسرت افزا" "گلزارِ ابراہیم" "تذکرۂ ہندی" "ریاض الفصحا" اور شمیم سخن۔

(ب) متوسط تذکرے: ان تذکروں میں ذوقِ علم کی بنا پر پیش رو تذکرہ نویسوں کی فراہم کردہ معلومات سے استفادہ کا تناسب کم و بیش برابر ہے۔ دیانت داری کے اصولوں کا پاس رکھا گیا ہے۔ مثلاً چمنستانِ شعراء "تذکرۂ میر حسن" "تذکرۂ بے جگر" اور گلشنِ بے خار وغیرہ۔

(ج) ذیلی تذکرے: وہ تذکرے جن کے مولفین نے صرف دوسرے تذکرہ نگاروں کے بیانات کی تلخیص اور کلام کے انتخاب پر قناعت کی ہے۔ اور ماخذ کا حوالہ دینے سے پرہیز کیا ہے۔ مثلاً تذکرہ ریختہ گویاں۔ ریاض حسنی وغیرہ۔

(۲) خاص تذکرے: وہ تذکرے جن میں تمام شعراء کے درمیان کسی مخصوص وحدت کو لازمی قرار دیا گیا ہے اس کی اقسام اس طرح ہیں۔

(الف) مخصوص بالعہد تذکرے: وہ تذکرے جن کا دائرہ کار مخصوص عہد تک محدود ہے۔ مثلاً غلام محی الدین مبتلا کا تذکرہ "طبقاتِ سخن" محمد شاہ کے عہد کے آغاز ۱۱۳۱ھ سے اکبر شاہ ثانی کے پہلے سال جلوس (۱۲۲۱-۲۲ھ) تک کے شاعروں پر مشتمل ہے۔

(ب) مخصوص بالمقام تذکرے: وہ تذکرے جن میں کسی خاص علاقے یا شہر کے شعراء کا تعارف ہے۔ مثلاً "مخزنِ شعراء" "تذکرہ شعرائے گجرات" مرتبہ فائق گجراتی "انتخاب یادگار" (تذکرہ شعرائے رام پور) مولفہ امیر مینائی اور محبوب الزمن "تذکرہ شعرائے دکن" مولفہ عبدالجبار ملکاپوری۔

(ج) مخصوص بالمذہب تذکرے: وہ تذکرے جو خاص مذہبی گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں مثلاً "آثار الشعرائے ہنود" از منشی دیبی پرشاد بشاش اور تذکرہ ہندو شعراء موسوم بہ بہار سخن از شیام سندر لال برق۔

(د) مخصوص بالحیثیت تذکرے: وہ تذکرے جن میں کسی خاص ادبی یا سماجی حیثیت کے حامل شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً "دستور الفصاحت" یکتا لکھنوی صرف قابل استاد شعراء کا تذکرہ ہے۔

(۵) مخصوص بالجنس تذکرے، جن میں جنسی فرق کی بنا پر کسی ایک ہی طبقے کے سخنوروں کو جگہ دی گئی ہے مثلاً "بہارستانِ ناز" مولفہ فصیح میرٹھی وغیرہ۔ ۔ ۔ ۔ صرف خواتین کے حالات اور کلام پر مشتمل ہے۔

(۶) مخصوص بالصنف تذکرے: وہ تذکرے جن میں بطور خاص کسی ایک صنف یا موضوعِ سخن پر طبع آزمائی کے نمونے پیش کیے گئے ہیں مثلاً عبدالغفور نساخ کا تذکرہ "قطعہ منتخب" صرف قطعہ گو شعرا کا تذکرہ ہے۔ اور "سراپا سخن" مولفہ محسن کاکوروی ۔ ۔ ۔ ان شعرا کا تذکرہ ہے جنہوں نے اپنی بعض غزلوں یا اشعار میں اعضائے جسمانی کے نام بطور ردیف استعمال کیے ہیں۔

اس تقسیم کے پیشِ نظر سب سے اہم مشکل یہ ہے کہ خالص تعارفی اور انتخابی تذکروں میں فرق کس بنیاد پر قائم کیا جائے۔ تقریباً سب ہی تذکروں میں تعارف اور انتخاب کے اجزا شامل ہیں۔[۵]

ادوار کے مطابق بے ترتیبی کو ترتیب میں لانا مشکل کام نہیں۔ لیکن روایات پر کھڑی حوالوں کی دیواروں کو کس طرح پختہ سمجھا جائے اس کے لیے کسوٹی یا پیمانہ کون سا مقرر کیا جائے۔ بیاضوں کے انتخابی کلام کو کس درجہ میں ادبی حیثیت کا حقدار بنایا جائے۔

ذیلی تذکرے اور متوسط تذکروں کا فاصلہ قائم کرنا بھی عمیق مطالعہ کا مستحق بھی ہے۔ اس کے باوجود مطالعہ کرنے والے کی استعداد اور ذہنیت کے پیشِ نظر یہ کام اتنی آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔

اس تقسیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ تحقیق کی بنیاد پر ادبی حدود کا تعین ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ ادب کے مزاج اور معیار کو بالائے طاق رکھ کر ۔ ۔ ۔ کسی کی تائید پر کس وثوق بھروسہ کر لیا جائے۔ "مخصوص بالمذہب" کسی زبان کے ادب میں مذہبی بنیاد پر کلام کی خصوصیات کو پرکھنے کا مشورہ قابلِ قبول نہیں۔

ادبی حیثیت اور سماجی حیثیت کے علاوہ کس تہذیب و تمدن کو سامنے رکھ کر متعین کیے جائیں۔ سماجی حیثیت ہر مذہب میں اپنی تہذیب اور تمدن کا آئینہ ہوتی ہے۔ دو مختلف اقوام شعرا میں کس بنیاد پر سماجی حیثیت کا پیمانہ بنایا جائے۔

---

۵ شعرائے اردو کے تذکرے۔ ص ۲۵ ڈاکٹر حنیف نقوی

بہر حال ہماری تذکرہ نویسی " کا ارتقائی سفر اس طرح شروع ہوتا ہے ۔

(۱) "نکات الشعراء" (۱۱۶۵ھ ۵۱-۱۷۵۰ء) از میر تقی میرؔ

اس تذکرے میں حسنِ بیان بے اعتدال ہو گیا ہے بعض مقامات پر سخت تنقید ذاتی پرخاش کا نتیجہ ہے جس کو میر کی صاف گوئی سے منسوب کیا گیا ہے ۔ حاتمؔ پر تلخ تنقید، ذاتی پرخاش کا مظاہرہ ہے ۔ انعام اللہ خاں یقینؔ پر طنزیہ تنقید وغیرہ ۔ لیکن اس کے باوجود میرؔ کا تذکرہ بے رنگ تنقید اور سیرت کا نمائندہ تذکرہ ہے جس کی پیروی میں کئی تذکرے لکھے گئے اور جواب میں بھی بیشتر تذکرے موجود ہیں ۔

(۲) "گلزارِ ابراہیم" (۱۱۹۸ھ ۸۴-۱۷۸۳ء) اس سے قبل اور تذکرے بھی ہیں جیسے "تحفۃ الشعراء" (۱۱۶۵ھ) فضل بیگ قاقشال ۔ "گلشنِ گفتار" (۱۱۶۵ھ) حمید اورنگ آبادی "مخزنِ نکات" (۱۱۶۸ھ) قائمؔ چاندپوری ۔ "تذکرۂ حیرت" (۱۱۷۴ھ) حیرتؔ "چمنستانِ شعراء" (۱۱۷۵ھ) لچھمی نرائن شفیقؔ اورنگ آبادی ۔ لیکن اس تذکرے سے تذکرہ نگاری میں جدید موڑ آیا ہے ۔ اس خصوصیات کی بنیاد پر "گلزار ابراہیم" کی اہمیت ادبی سطح پر نمایاں ہے ۔ کیونکہ اس میں شعراء کے حالات اور وفات کی تاریخوں کا تعین ہے شعراء کی زندگی کے واقعات کو جمع کرنے میں خط و کتابت کا سہارا لے کر مؤلف نے جانفشانی کا مظاہرہ کیا ہے ۔ معاصرین کے خطوط کے اقتباسات بطور ثبوت موجود ہیں کلام کے نمونے مفصل پیش کیے گئے ہیں ۔ اس لیے "گلزار ابراہیم" کی اہمیت ادبی حیثیت رکھتی ہے ۔ اسلوب میں جدید تدوین کا عکس جھلکتا ہے ۔ اس تذکرے کی یہ صفت بھی اہم ہے ۔

"طبقات الشعراء" (۱۲۰۱ھ) مولوی کریم الدین ۔ تذکرۂ شورشؔ (۱۱۹۳ھ) غلام حسین شورشؔ ۔ تذکرۂ شعرائے اردو (۱۱۸۸ھ تا ۱۱۹۲ھ) میر حسن وغیرہ بھی موجود ہیں ۔ لیکن اس تذکرے سے تذکرہ نگاری پر ایک گہرا اثر پڑا ہے ۔ کیونکہ تذکرۂ دتاسی کے برخلاف اس کی ترتیب ادوار اور طبقات کے اعتبار سے ہے شاید اس لیے مولوی صاحب نے اس کا نام بھی "طبقات الشعراء" منتخب کیا ہے ۔ ہجری اور عیسوی دونوں سنوات تحریر ہیں ۔ شروع میں ایک مقدمہ ہے ۔ جس میں تذکرہ اور تاریخ کے فرق کی وضاحت کی گئی ہے ۔ اردو اور ریختہ کی ابتداء دکنی اور برج زبانوں پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ تذکروں کی تنقید کے تعلق پر بھی لکھا گیا ہے ۔ مولوی صاحب اردو کی ابتدا تیمور کے

زمانے سے ثابت کرتے ہیں۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت تنقید تذکرہ[1] ہے۔ مولوی صاحب کے نزدیک تذکرہ اور طبقات فن تاریخ کی شاخیں ہیں۔

ان تذکروں کے علاوہ خصوصیات کی بنا پر تذکرۂ ریختہ گویاں (گلزار ابراہیم کا ترجمہ ۱۲۱۵ھ) فتح علی حسینی گردیزی۔ "مخزن نکات" (۱۱۶۸ھ) قائم چاند پوری ... "تذکرہ شعرائے اردو" (۱۱۸۸ھ تا ۱۱۹۲ھ) میر حسن دہلوی۔ "ریاض الفصحاء" (۱۲۲۱ھ تا ۱۲۲۶ھ) "تذکرۂ ہندی" مصحفی، میر تقی میر کی خصوصیات تذکرہ نگاری کی تقلید کرتے ہیں۔ اصلاح سخن اور واقعات میں اختصار پسندی۔ ان تذکروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے ردعمل میں "جامعیت" "بلحاظ اسماء و افراد" جواباً جامعیت کا نمائندہ "تذکرہ عیار الشعراء (۱۲۰۸ھ تا ۱۲۴۷ھ) خوب چند ذکاؔ ہے۔

عمدۂ منتخبہ (۱۲۱۵ھ ۱۲۲۴ھ) اعظم الدولہ سرورؔ، مجموعۂ نغز (۱۲۲۱ھ) حکیم قدرت اللہ قاسمؔ "گلشن بے خار" (۱۲۴۸ھ تا ۱۲۵۰ھ) شیفتہؔ "گلشن بے خزاں" ( ) ارباطن۔ ان تذکروں میں سوانح حیات کا رنگ غالب ہے۔ "ان میں گلزار ابراہیم" اور گلشن ہند (۱۲۱۵ھ) علی لطفؔ کو اولیت حاصل ہے ان تذکروں کے بعد گارساں دتاسی، کریم الدین اور صہبائیؔ کے تذکروں میں سوانح حیات کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے ارتقاء کا ذکر ملتا ہے۔

تحقیقی جائزہ اور زبان کی روشنی میں تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ "نکات الشعراء" اردو شعراء پر پہلا تذکرہ ہے۔ میر تقی میرؔ لکھتے ہیں:

"در فن ریختہ کہ شعرے است بطور شعرے فارسی بزبان اردوئے معلّیٰ شاہجہان آباد کتابے تا حال تصنیف نہ شدہ کہ احوال شاعران ایں فن بصفحۂ روزگار ماند"[2]

"مخزن نکات" میں قائم چاند پوری بھی اپنے تذکرے کو پہلا تذکرہ لکھتے۔ لیکن تاریخی حقائق محمد شاہ اور احمد شاہ کے دور میں لکھے گئے۔ (۱) "تذکرہ امام الدین خاں" (۲) "تذکرۂ خان آرزوؔ" (۳) "تذکرۂ سوداؔ" (۴) "معشوق چہل سالہ خود نوشتہ خاکسار" پر روشنی ڈالتے ہیں۔

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے۔ از ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۶۶ [2] "نکات الشعراء" میر تقی میر

صدے ہے کہ "خطبات دتاسی" میں دتاسی میر کے تذکرہ سے پہلے بہت سے تذکروں کا نام لکھتا ہے۔ میں "مخزن نکات" کو "نکات الشعراء" سے پہلے کا نہیں پاتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ

"مخزن نکات اپنے دعوے کے باوجود بعد کی تصنیف ہے اور ۶۸ اھ میں لکھا جاتا ہے۔"[۳]

گردیزی کی داخلی شہادتوں سے گمان غالب ہے کہ گردیزی نے میر کا نکات الشعراء ضرور دیکھا ہوگا۔ اس حالت میں میر کے نکات الشعراء کو اردو شاعری کا پہلا تذکرہ کہہ سکتے ہیں۔ "ریختہ گویاں" میر کا جواب ہے جو کہ اقسام ریختہ اور ریختہ کے بعد کے حالات میر سے ملتے جلتے ہیں۔ میر کی صاف گوئی، تیغ کلامی، صحیح کلام اور سیرت نگاری کا تاثر بزاروں مخالفت کے باوجود اپنے دور میں اور بعد کے تذکروں کو متاثر کرتا ہے مندرجہ ذیل تذکرے اس دعوے کے گواہ ہیں۔

(۱) "تذکرہ ریختہ گویاں" ۱۱۶۶ھ فتح علی حسینی گردیزی جواباً لکھا گیا۔

(۲) "مخزن نکات" قائم چاندپوری (۱۱۶۸ھ)

(۳) تذکرہ عبرت (۱۱۷۴ھ)

(۴) تذکرہ شورش (۱۱۹۳ھ)

(۵) "چمنستان شعراء" شفیق اورنگ آبادی (۱۱۷۵ھ)

(۶) "مجموعۂ نغز" قاسم میر کے تذکرے پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے تقلید کرتا ہے۔

(۷) "تذکرۂ میر حسن" (۱۱۸۸ھ ۱۱۹۲ھ) میر کے بعض اسالیب کی پیروی کرتا ہے غرض کہ تنقید، تنسیخ یا تقلید ہر لحاظ سے میر کی پیروی کرتے ہیں۔

مرحوم کلیم الدین احمد تذکروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"شاعر کی پیدائش اس کا خاندان، اس کی زندگی کے مختلف واقعات، اس کی تصنیفات اس کی تعلیم و تربیت، اس کا ماحول ان میں سے کسی کے متعلق کافی تشفی کا سامان نہیں تھا۔"[۴]

لیکن اس کے باوجود تذکروں سے بہت کچھ نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔

---

[۳] "شعرائے اردو کے تذکرے" ڈاکٹر سید عبداللہ صفحہ ۱۵۶

[۴] "اردو تنقید پر ایک نظر" صفحہ ۱۳ از۔ مرحوم کلیم الدین احمد

(۱) تذکروں کی مدد سے ہم کئی ایسے فنکاروں سے روشناس ہوئے جن کے کارنامے گردشِ لیل و نہار سے ہم تک نہیں پہنچ پائے۔ ان میں کئی ایسی ہستیاں بھی ہیں جنھوں نے نازک وقت میں شعر و سخن کی نمائندگی کی۔ جیسے غلام مصطفےٰ خاں یک رنگ، خان آرزو اور مظہر جانِ جاناں ان اساتذہ کا تخلیقی سرمایہ تذکروں کے توسط سے ہم تک پہنچا۔

(۲) شعراء کے تعارف میں اختصار پسندی سے حالات، زندگی کی عکاسی، سیرت اور شخصیت تخلیقی کاوشوں کے متعلق معلومات کا اہم ترین ذریعہ ہمارے تذکرے ہیں۔

(۳) کئی تذکروں میں ہمارے مؤلفین نے زمانی و مکانی قرب کی نوعیت پر ہم عصر شعراء کے بارے میں کارآمد معلومات پیش کی ہیں۔ جیسے دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

(۴) کئی تذکرہ نگار اپنے وقت کے بڑے شاعر ہیں انھوں نے دوسرے کے کلام کی خوبیوں اور خامیوں کو پیش کرنے کے بعد بعض اوقات اشعار میں لفظی ترمیم و تفسیر کے جاننے ان کے مطالعہ رجحان طبع اور نظریۂ فن کو سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے۔

(۵) تذکروں میں بعض ایسی کتابیں کے حوالے اور اقتباسات ملتے ہیں جو فنا ہو چکی ہیں جیسے میر حسن نے تذکرہ شعرائے اردو میں انعام اللہ خاں یقین کے ذکر میں "نکات الشعراء" کے حوالے سے ایک ایسا اقتباس نقل کیا ہے جو اس کے گمشدہ نسخے سے تعلق رکھتا ہے۔

(۶) تذکروں کے ذریعے ایسے اشعار بھی ہاتھ آئے مصنفین شاعر پست اور معیار سمجھ کر کلام سے خارج کر دیتے ہیں۔ غالب کے منسوخ کلام کا ایک اچھا خاصہ حصہ تذکروں سے دریافت ہو

تذکروں کی مدد سے نقاد اور محقق کو تنقیدی حاشیہ آرائی میں کافی مدد ملتی ہے

کسی شاعر کے کلام پر واضح تنقیدی مواد سے ایک نظریہ کا ارتقاء تذکروں کی دین ہے یہ بات اور ہے کہ اس مواد کو تلاش کرنے میں کافی دقت پیش آتی ہے۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ

"البتہ یہ اعتراض صحیح ہے کہ ان میں اعادہ و تکرار بہت ہے اور معلومات کے متلاشی کو ضروری باتوں کے جمع کرنے میں بڑی تکلیف پیش آتی ہے" [۱] ادب کے تاریخی مواد

میں تذکروں سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ [۱] شعرائے اردو کے تذکرے" ص ۱۰۹ ڈاکٹر سید عبداللہ

اس ضمن میں "آبِ حیات" مولانا محمد حسین آزاد (۱۸۸۰ء) کا ذکر بھی ضروری ہے کیونکہ "آبِ حیات" اور "گلِ رعنا" کو بیشتر محققانِ ادب تذکرے نہیں مانتے۔ لیکن "آبِ حیات" اپنی بعض خوبیوں کے سبب تذکرہ کہا جاسکتا ہے اور کچھ دوسری خصوصیات کی بناء پر "آبِ حیات" کو تذکروں کی صف میں نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس میں اردو زبان کے ارتقاء پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور ایک لسانی نظریے کی دریافت ہے۔ جو دوسرے تذکروں میں نہیں۔ اردو شعراء کا انتخاب کلام ہے۔ جو تذکروں کی صفت ہے۔ لیکن ان شعراء پر تقابلی تنقید اور تاثراتی تنقید کا مواد بھی موجود ہے۔ جیسے دوسرے تذکروں میں نہیں دیکھا جاسکتا۔ شعراء کی فہرست میں باقاعدہ ادوار کی تقسیم آبِ حیات میں موجود ہے لیکن جس حد بندی سے ادوار کی تقسیم کی گئی ہے وہ تذکروں میں نہیں ملتی انتخاب کلام میں اشعار پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ غزلوں کا انتخاب موجود ہے۔

اس کے باوجود خیالی اور تحقیقی مواد کی لچک "آبِ حیات" کو تذکروں سے قریب کر دیتی ہے۔

اس طرح محمد حسین آزاد کی اس تصنیف کو تذکرے اور تاریخ کے بیچ کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ "آبِ حیات" میں تاریخی اور تحقیقی مواد "تنقیدی زاویۂ فکر" تاریخی مقام رکھتے ہیں۔ اسلوب کے اعتبار سے "آبِ حیات" مکمل تذکرہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ تاریخ اور تنقید کی زبان کا اسلوب مختلف ہوتا ہے۔ انتخابِ کلام ذاتی پرخاش کے آئینہ میں "آبِ حیات" تذکروں کا تذکرہ بن جاتی ہے۔ عقیدت مندی کے سبب پھر تذکرہ ہو جاتی ہے۔ غرضکہ مواد کی روشنی میں "آبِ حیات" دونوں خوبیوں سے ممیز ہے۔ اس لیے اسے تاریخ اور تذکرہ کے بیچ کی ایک کڑی کہنا حق بجانب ہے۔

تذکرہ نویسی کی روایت جائزہ اور مقاصد پر ایک نظر

ہمارے تذکروں میں نکات الشعراء سے تذکرہ شعرائے اردو میر حسن تک قریب قریب اور مشہور تذکروں کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ ان تذکروں کی خامیوں اور کمزوریوں پر بھی اپنی رائے اور دوسروں کے نتائج قلم بند کر چکے ہیں۔ جن تذکروں کی زبان اردو نہیں ہے اور جن کا ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے جس کے لیے انجمن ترقی اردو ہند دہلی اورنگ آباد نول کشور پریس لکھنؤ اور لاہور قابل مبارکباد ہیں جن تذکروں کا تعلق ادبی تذکرہ نگاری سے قریب تھا ان تذکروں پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا گیا ہے۔ اردو میں تذکروں کی اہمیت اور انفرادیت کے تعلق سے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن یہ تذکرے اپنے اندر کم از کم تاریخی مواد رکھتے ہیں۔

ادب کا تاریخی مواد ہمیں جہاں سے ملے اور جس قدر ملے وہ قابل قدر ہے۔ ہمارے ادبی تذکرے اپنے جلو میں جو تاریخی مواد رکھتے ہیں ان سے ہمیں ادبی تاریخیں مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے ہمیں تذکروں کی اقسام سے درحقیقت کوئی سروکار نہیں، چونکہ سیاسی، سوانحی، جوابی، علمی و ادبی غرض یہ کہ ہر قسم کے تذکرے ہماری ادبی تاریخوں کو قیاسات سے حقائق کے تعین میں مددگار ہیں۔

ان تذکروں کی بحث میں ہم نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر سید عبداللہ ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر حنیف نقوی وغیرہ کی آراء سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ ہماری بحث کا نچوڑ تذکرہ نویسی کے فن کو قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھنا ہے۔ ہمارے تذکرے میر حسن تک اپنی اہمیت کو برقرار رکھتے ہیں۔ اور آب حیات، گل رعنا، خم خانۂ جاوید سے شعر الہند تک تذکرے کا اسلوب تاریخی جامہ پہن لیتا ہے۔ اسی لیے ہم نے اپنے موضوع میں ان کتابوں کو تاریخ اور تذکروں کے بیچ کی کڑیاں اور ابتدائی تاریخ کی کتب میں تسلیم کیا ہے۔

آبِ حیات

محمد حسین آزاد

"آبِ حیات" محمد حسین آزاد کی تصنیف ہے۔ آزاد نے اس تصنیف کا مقصد دیباچہ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں۔ انھیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں۔"[۱]

یہ حقیقت ہے کہ "آبِ حیات" سے پہلے زبان کا تاریخی و ادبی سرمایہ متفرق صورتوں اور تذکروں میں موجود تھا تذکروں کے بیانات، صحتِ زبان و روایات کی بندشوں میں بھی مشکوک تھے۔ اس لیے موصوف نے اردو کی لسانی تاریخ اور زبان کے ادبی ارتقاء کا خاکہ مختلف ادوار کا جائزہ لے کر مرتب کیا ہے۔ دیباچہ کے بعد "زبان کی تاریخ" سے تصنیف کا آغاز کیا ہے زبان کی تاریخ کے متعلق لکھتے ہیں

"اس بات کو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔"[۲] موجودہ دور میں مختلف تحقیقاتی نظریے آزاد کے اس نظریے سے متفق نہیں ہیں۔ محمود شیرانی "پنجاب میں اردو" میں پنجاب کو اردو کا مولد قرار دیتے ہیں اور اردو کو پنجابی کا ایک روپ ثابت کیا ہے[۳]

شیرانی اپنے تحقیقی مواد میں صاف طور پر ہریانی اور پنجابی سے اردو کا رشتہ جوڑ کر آزاد کے لسانی نظریے کو رد کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور، شیرانی کی حمایت کرتے ہوئے آزاد کے لسانی نظریے کو ان الفاظ میں رد کرتے ہیں۔

"پروفیسر شیرانی نے جو مواد پیش کیا ہے نہایت ہی مفید اور اردو کی ابتدا و آغاز سے مفید نتیجوں پر پہنچنے کے لیے کافی مدد و معاون ہو سکتا ہے۔"[۴]

---

[۱] آبِ حیات محمد حسین آزاد صفحہ مطبوعہ کشور پرنٹنگ ورکس لاہور سنہ ۱۹۰۷ء

[۲] ایضاً صفحہ ۶ [۳] پنجاب میں اردو محمود شیرانی صفحہ ۲۰

[۴] "ہندوستانی لسانیات" ڈاکٹر محی الدین قادری زور صفحہ ۸ تا صفحہ ۱۳۳

محی الدین قادری کا یہ جملہ آزاد کے لسانی نظریے کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔

زبان ہندوستانی کا ارتقاء پنجاب ہی سے شروع ہو چکا تھا۔"[1]

ڈاکٹر محی الدین قادری زور اردو کے آغاز میں تین اہم مرکز قائم کرتے ہیں۔ دہلی، دکن، گجرات اور شیرانی سے متاجلتا لسانی نظریہ پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں آزاد، شیرانی اور زور تینوں لسانی نظریوں کو مختلف اور مستند دلائل سے رد کرتے ہیں۔ آزاد کے لسانی نظریہ کے متعلق فرماتے ہیں: "اردو کا ڈھانچہ برج بھاشا پر تیار نہیں کیا گیا۔"[2]

ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنی تصنیف "داستان زبان اردو" میں اُردُو کو برج بھاشا کا روپ نہیں مانتے۔ اسی طرح پروفیسر احتشام حسین "اردو لسانیات کا خاکہ" میں آزاد کے لسانی نظریہ کو ان کی تمثیل نگاری سے منسوب کرتے ہیں اور خیالی ظرطے میں سے آگے نہیں بڑھنے دیتے مذکورہ محققین میں بعض اردو کو بنانے اور سنوارنے میں برج بھاشا[3] کے معترف ہیں لیکن برج بھاشا کو اردو کا روپ نہیں مانتے۔ لیکن آزاد کا لسانی نظریہ یک قابلِ قدر تحقیق ہے۔ کیونکہ انھوں نے زبان کے تعلق سے یہ نظریہ سب سے پہلے پیش کیا اس وقت سے لسانی تحقیق کے دروازے کھل گئے۔ اس کے باوجود آزاد نے یہ لسانی نظریہ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔

(۱) برج بھاشا اور کھڑی بولی کا ہماری زبان میں جذب ہونا زبان کے مزاج کی یکسانیت کا ثبوت ہے۔

(۲) آزاد کے عہد میں اور ان سے پہلے زبان کے متعلق یہی نظریہ منسوب تھا جس کو آزاد نے اپنی تحقیق کا جزو بنالیا ہے۔

۱؎ "ہندوستانی لسانیات" ڈاکٹر محی الدین قادری زور صفحہ ۹

۲؎ "مقدمہ تاریخ زبان اُردو" از ڈاکٹر مسعود حسین خاں صفحہ ۱۴۷ تا ۱۹۸

۳؎ "مقدمہ تاریخ زبان اردو" از ڈاکٹر مسعود حسین خاں صفحہ ۱۷۲

اور احساسات میں حقائق کی شمولیت اور اظہار کی قوت میں اسلوب قاری پر ایسا تاثر چھوڑتا ہے
جس کی بدولت قاری شعر میں کہی ہوئی بات کو اپنے مشاہدے اور تجربے کا نمائندہ تسلیم کر لیتا ہے اور
آزاد اصلیت اور اسلوب دونوں کے قائل نہیں۔

الطاف حسین حالیؔ[1]۔ شبلی نعمانیؔ[2]۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ[3]۔ وحید الدین
سلیمؔ[4]۔ شاعری میں اصلیت اور اسلوب کی کارکردگی کو تسلیم کرتے ہیں اور کسی نہ کسی پہلو انھیں
شعر میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

"نظم اردو کی تاریخ" میں امیر خسروؔ پر تبصرہ کرتے ہوئے خالق باری کو خسروؔ
سے منسوب کرتے ہیں۔[5] حالانکہ "خالق باری" خسروؔ کی تصنیف نہیں ہے۔[6]

آزادؔ نے اسی باب میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ[8] پر نظم کی تاریخ کو ختم
کیا ہے۔ لیکن دبیرؔ کو ادوار کی تقسیم میں کسی دور میں شامل نہیں کیا۔ حالانکہ میر انیسؔ کا شمار
پانچویں دور میں کیا گیا ہے۔

"آبِ حیات" میں پہلے دور کا آغاز تمہید کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جس میں
شمس اللہ ولیؔ (ولیؔ دکنی) کو نظم اردو کی نسل کا آدم لکھتے ہیں۔[8] اردو شاعری میں ولیؔ ایسی
شخصیت نہیں ہے جس کو اردو نسل کا آدم کہا جائے۔ آزادؔ خود اس بات کی نشان دہی آبِ حیات میں کرتے ہیں[9]

---

[1] "مقدمہ شعر و شاعری" از۔ الطاف حسین حالیؔ صہ ۴۳

[2] "شعر العجم" از۔ مولانا شبلی نعمانی حصہ چہارم صہ ۲-۴

[3] "ہماری شاعری" از۔ مسعود حسن رضوی ادیبؔ صہ ۱۴-۱۲۴

[4] "افاداتِ سلیم" از۔ وحید الدین سلیمؔ صہ ۷ (ہمارے شاعروں کی نفسیات) صہ ۶۷

[5] "آبِ حیات"

[6] "پنجاب میں اردو" از۔ ڈاکٹر محمود شیرانیؔ صہ ۱۹۸

[7] "آبِ حیات" نظم اردو کی تاریخ صہ ۵۸

[8] "آبِ حیات" نظم اردو کی تاریخ صہ ۸۳

[9] "ایضاً" صہ ۶۷

(۳) اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے فراہم کیا ہوا تحقیقی مواد تذکروں اور روایات پر مبنی ہے ان حالات کے پیش نظر آزاد کا یہ فیصلہ یہ ایک اہم کارنامہ ہے یہ بات الگ ہے کہ تحقیق کی بنا پر کیوں سے حقائق تک پہنچنے میں انھیں کامیابی نہیں ملی۔

"آب حیات میں نظم" اردو کی تاریخ " کے آغاز میں آزاد شعر کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

شعر خیالی باتیں ہیں جن کو واقفیت اور اصلیت سے تعلق نہیں۔ قدرتی موجودات یا اس کے واقعات کو دیکھ کر جو خیالات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے مطلب کے موقع پر موزوں کر لیتا ہے[۲]۔"

آزاد شعر کی تعریف میں یونانیوں سے متفق ہیں۔ شعر کے تعلق سے یہ خیال ارسطو[۳] کے نظریہ کا عکس ہے۔ اور شعر کی یہ تعریف محدود اور نامکمل ہے۔

شاعر کو موجودات اور واقعات سے باخبر رکھ کر خیال اور جذبات کی لہروں میں گم کر دینا حقیقت اور اصلیت سے اس کا رشتہ توڑ دینا عین فطرت کے خلاف ہے۔ انسانی فطرت کسی راز کا انکشاف کوئی بات کا اظہار کسی بھی انداز میں کرنا اس میں اصلیت کا کوئی نہ کوئی جزو ضرور موجود ہوتا ہے جذبات اور خیال طریقۂ اظہار میں اثر پیدا کرنے کے لیے قاری کو متاثر کرنے میں معاون ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت ضمنی ہے۔ محض جذبات کے سہارے حقیقت یا اصلیت سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ شعر کو تفریح طبع کا ذریعہ مان لیا جائے پھر بھی لطف پیدا کرنے کے لیے حقیقی اشیاء سے رابطہ رکھنا ضروری ہے۔ اسے زبان میں فصاحت اور بلاغت کی مدد سے ایسا تاثر پیدا کرتا ہے کہ انسان کیف و سرور کے عجیب عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ لطف و کیف حاصل کرنے والا انسان حقیقت اور اصلیت کو پانے کے بعد کیف و سرور کے حسن عالم میں پرواز کرتا ہے اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

محققین ادب اچھے شعر میں جذبے کے ساتھ اسلوب کے قائل ہیں[۴]۔ جذبات

---

[۲] آب حیات (نظم اردو کی تاریخ صفحہ ۶۳)
[۳] اردو تنقید کا ارتقاء از۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی صفحہ ۱۹۳
[۴] مقدمہ شعر و شاعری از۔ الطاف حسین حالی صفحہ ۴۲-۳۶

ولی اردو زبان کے پہلے شاعر نہیں نہ ہی زبان کے بانی ہیں۔ ان سے پہلے نظم و نثر کے نمونے موجود ہیں۔ انھیں اردو غزل کے تعلق سے بھی غزل کا آدم نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ ولی سے پہلے غزلیات کے شاعر موجود ہیں۔ جیسا کہ "پھول بن"[1] میں ابن نشاطی غزل نہ لکھنے کا جواز خود ہی بتاتا ہے۔ ولی کے تعلق سے ایسا بیان مبالغہ آمیز ہے۔

پہلے دور میں ولی کے علاوہ، آبرو، شرف الدین مضمون، محمد شاکر ناجی، محمد احسن احسن، غلام مصطفےٰ خاں یکرنگ کو شامل کیا گیا ہے۔

دوسرے دور[2] کے شعراء فصاحت و بلاغت، باریک بینی و نازک خیالی کے مالک ہیں شاہ حاتم، سراج الدین علی خاں آرزو اور اشرف علی خاں فغاں پر یہ دور ختم کیا گیا ہے۔

تیسرے دور کے آغاز[3] میں باکمال شعراء ہیں جن کی زبان فصاحت و بلاغت کے ساتھ اسلوب کے حسن کا زیور رکھتی ہے۔ مضمون آفرینی، چستی و بندش سے اس دور کے شاعروں نے فن شاعری کو سنوارا۔ مرزا مظہر جان جاناں، عبدالحئی تاباں، مرزا محمد رفیع سودا، میر ضاحک، خواجہ میر درد، سید میر سوز، میر تقی میر، اس دور کے خاص شعراء ہیں۔

آزاد نے اس دور میں سید انشا کو شامل نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ "آب حیات" میں ہمعصروں کے مطابق ادوار کی تقسیم نہیں کی گئی۔ اپنی مرضی سے ادوار قائم کیے گئے ہیں۔

چوتھے دور کے شعراء پچھلے دور کے شعراء کی پیروی کرتے ہیں۔ موضوعات کا اظہار مختلف رنگوں میں کرتے ہیں۔ نازک خیالی، شوخی و طراری میں بزرگوں سے تیز ہیں۔ جرأت، میر حسن، سید انشاء اللہ خاں انشاء، اور مصحفی اس دور کے روشن باب ہیں۔

پانچواں دور[4] تمہید دو طبقے کے شاعروں پر مشتمل ہے۔ پہلا گروہ بزرگوں کی پیروی میں مختلف انداز سے خیالات باندھنے کے باوجود بزرگوں کے فکری سرمایہ میں کانٹ چھانٹ کرتا ہے۔ اور اعلیٰ فکر سے بلند اصول پر پرواز کرتا ہے۔ لفظوں کے کوزے میں خیال کے سمندر کو سمولیں ان باکمال

---

[1] "تاریخ ادب اردو" از۔ جمیل جالبی حصہ اول ص ۹۲-۱۹۱

[2] "آب حیات" ص ۱۰۶ [3] "آب حیات" ص ۱۲۳

[4] "آب حیات" ص ۳۲۵

شعراء کا کام ہے۔ فصاحت اور بلاغت سے مضمون آفرینی ان کا طریقۂ کار ہے یہ لوگ لفظوں کی دروبست سے نازک خیالی اور باریک بینی کے قائل ہیں۔

دوسرا گروہ نئی راہوں کی تلاش میں ہے۔ کوزے میں سمندر سمو لینے کا واجبی حق ادا کرنے والا ہے۔ زبان اور مضمون کے اعتبار سے یہ دور اردو شاعری کے لیے سنہری دور ہے ناسخ، خلیق، آتش، نصیر، مومن، ذوق، آتش، غالب، انیس وغیرہ اس دور کے ستارے ہیں۔

اسی دور[۱] میں آزاد نے ذوق کی تعریف میں عقیدت مندی کا مظاہرہ کیا ہے اور غالب کے کلام کو رسماً سراہا ہے۔ اس طرح آبِ حیات کا اختتام ہو جاتا ہے۔

تذکروں کے بعد "آبِ حیات" اردو ادب کی پہلی تصنیف ہے جس میں لسانی نظریے پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ حالانکہ تحقیق کی روشنی میں یہ نظریہ آج رد ہو چکا ہے لیکن بقول مسعود حسین خاں اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ

"ہمارے یہاں لسانی تحقیق کے مرد میدان محمد حسین آزاد ہیں۔"[۲]

کیونکہ لسانی تحقیق پر مدلل بحث آبِ حیات سے پہلے کسی بھی تذکرے میں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا ادب میں لسانی تحقیق کا راستہ دکھانا آزاد کا اہم کارنامہ ہے۔

"نظم اردو کی تاریخ" لکھ کر آزاد نے تاریخ نگاری کے روایتی انداز کا خاتمہ کیا تذکروں کی زبان انتخابِ کلام میں تقابلی سلسلہ قائم کیا ادوار کی تقسیم[۳] میں ان سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ لیکن ادوار کا قیام فنی خصوصیات کے اعتبار سے قابلِ قدر ہے بعض مقامات پر شعراء کے تعلق سے جانبداری کا رویہ اپنایا گیا ہے[۴] ذوق کی تعریف کا انداز دیکھیے۔

---

۱ "آبِ حیات" ص ۴۲۰

۲ "مقدمہ تاریخ زبان اردو" از۔ مسعود حسین خاں ص ۲۱۹

۳ "آبِ حیات" از۔ محمد حسین آزاد ص ۴۲

۴ ایضاً ص ۱۱۵ بہ سراج علی خاں آرزو بہ مبالغہ آمیز بیان

جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغِ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔"[۱]

فصاحت کی کسوٹی پر ذوق کا کلام اتنا بلند نہیں ہے۔ شرف الدین خاں مضمون کے تعلق سے پہلے دور میں بیان کرتے ہیں۔

"اس زمانے کے لوگ کس قدر منصف تھے۔ باوجودیکہ مضمون سن رسیدہ تھے۔ اور خاں آرزو سے عمر میں بڑے تھے انھیں غزل دکھاتے تھے۔ صلاح لیتے تھے۔"[۲]

یہ بیان جذباتی اور تاثراتی ہونے کے علاوہ سراسر ذاتی ہے۔ آب حیات میں ایسے بیانات کسی ایک مقام پر نہیں' بلکہ لسانی تحقیق سے لے کر کتاب کے ختم ہونے تک جگہ جگہ ملتے ہیں سی وجہ سے ایک طبقہ آزاد کی اس تصنیف کو "خیالی طوطے مینا"[۳] سے منسوب کرتا ہے۔

آب حیات میں آزاد نے شعر کی تعریف کو محدود کر دیا ہے۔ لیکن کرنل ہالرائڈ[۴] کی صدارت میں منعقد مشاعرے میں "آزاد نظم" پر لیکچر کے درمیان شعر کی تعریف میں انھوں نے اسلوب اور معنوی تو پہلوں کا ذکر کیا ہے۔[۵] شاید یہ سرسید تحریک کے اثرات کا نتیجہ تھا۔

آب حیات میں عملی تنقید کے نمونے ملتے ہیں لیکن اس تنقید میں وہ اپنے قائم کیے ہوئے اصولوں پر عمل[۵] نہیں کرتے۔ پھر بھی آزاد نے "آب حیات" میں اردو شاعروں کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ آج کے نقاد اس روش پر اپنی تنقید کی شروعات کرتے ہیں۔

آزاد کی تنقیدی رائے زیادہ تر مختصر ہوتی ہے۔ شاعر کے کلام کی جملہ خصوصیات پر وہ تبصرہ نہیں کرتے۔ کچھ بڑے شعراء پر انھوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔[۶]

۱؎ ایضاً ص۴۲

۲؎ ایضاً ص۹۶

۳؎ "اردو تنقید پر ایک نظر" از ــــ کلیم الدین احمد ص۴۵ تا ص۵۰

۴؎ آزاد نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات

۵؎ "اردو تنقید کا ارتقاء" از ــــ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص۹۵

۶؎ "آب حیات" ص۴۲ ذوق ص۱۸۴ غالب ص۷ سودا ص۱۹۱ میر تقی میر

تبصروں میں جانبداری کے عناصر موجود ہیں۔ ذوق کے تعلق سے جو رائے قائم کی گئی ہے غالب اور میر تقی میر پر ایسی رائے دینے سے گریز کیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی تنقید میں بھی عقیدت مندی کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ "آب حیات" کے خیالی بیان میں کئی شخصیات سے وہ متاثر نظر آتے ہیں۔

تقابلی تنقید میں یہ عقیدت مندی کا جذبہ غالب ہے۔ لیکن یہ رنگ ان کی تمثیل نگاری کا قصور ہے اسی سبب کلیم الدین احمد نے لکھا ہے کہ

"آب حیات میں تخیّل کا عنصر تنقید میں گویا جزو اعظم ہے۔" [۱]

آزاد کو تمثیل نگاری کے شوق نے بیان میں زور اور تحریر میں حسن پیدا کرنے کے لیے اکسایا۔ بلکہ الفاظ کی بندش اور در و بست کے سبب بعض مقامات پر سچی بات میں بھی خیالی، ورہ ذاتی رائے کا شک ہوتا ہے۔ بلند پروازی نے کئی مقامات پر داستانی رنگ اپنایا ہے۔

"غائرۂ کلام میں عقل کے نجوم سے سوال ہو کہ اس شاعری کا جو نحوست زوال میں آ گیا ہے کبھی اوجِ اقبال پر بھی کرے گا، یا نہیں؟ جواب ملا نہیں۔" [۲]

آب حیات کا اسلوب اس کی خوبی کم اور خامی زیادہ بن گیا ہے۔ کیونکہ تاریخ، تنقید اور تحقیق ادب میں حقائق کی روشنی میں پروان چڑھتے ہیں۔

"ان تمام باتوں کے باوجود پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کا کہنا ہے کہ اردو میں کوئی تذکرہ آب حیات کی ٹکر کا نہیں۔" [۳]

ڈاکٹر سید عبداللہ آب حیات کو تذکروں اور تاریخ کے درمیان یک کڑی کہتے ہیں۔ [۴]

---

[۱] "اردو تنقید پر ایک نظر" از ــــ کلیم الدین احمد ص ۴۸-۴۶

[۲] "آب حیات" ص ۴۵

[۳] "آب حیات کا تنقیدی جائزہ" از ــــ مسعود حسن رضوی ادیب ص ۱۲

[۴] "تذکرہ شعرائے اردو" از ــــ ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۱۴ تا ص ۴۶

آب حیات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

ہماری ادبی لسانی تاریخوں و تنقیدی نظریات کی اشاعت سے لے کر معمولی کتابوں میں بھی آب حیات کے کچھ نہ کچھ حوالے نظر آتے ہیں۔ اپنے دلائل کو قوی بنانے کیلئے اس کتاب سے بھرپور حوالوں کا سہارا رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب "تاریخ ادب اردو" میں لیا ہے۔ لسانی نظریات کے تعین میں محمود شیرانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ہر چند آب حیات کی مخالفت کی۔ لیکن ہر شخص نے تائیداً اس بات کا اقرار بھی کیا کہ اردو زبان اگرچہ برج بھاشا سے نہیں نکلی پھر بھی برج بھاشا سے اپنی نوک پلک درست کرنے میں پیش پیش ہے۔ ان تمام مباحثوں کے ساتھ آب حیات کے مختلف تذکراتی حوالوں اور تاریخی اغلاط پر مکمل کر بحث کی گئی ہے۔ لیکن آب حیات کی اہمیت اور انفرادیت اس کی تقابلی اور تاثراتی تنقید کی وجہ سے آج بھی بہت اہم ہے۔ آب حیات اپنے طرز و حوالوں، و تاریخی خامیوں کے باوجود آج بھی مشعل راہ کا کام دیتی ہے۔ آب حیات کی ان ہی خصوصیات کو اجاگر کرنا ہمارا مقصد تھا۔ آب حیات کے تحقیقی و تنقیدی جائزہ کے لیے ہم نے اردو کے اہم نقادوں کی آراء سے اتفاق کرنے کے باوجود اس کتاب کی بعض خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔

آب حیات اپنے عہد کی نمائندہ تاریخ اور تنقید ہے۔ اردو کو جب تاریخی اور تنقیدی مواد کی ضرورت تھی آب حیات نے اس کمی کو پورا کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

باب دوم ۲

ابتدائی تاریخ کی کتب پر تنقیدی تبصرہ

(الف) خم خانۂ جاوید (چہار جلد) ـــ لالہ سری رام ۱۹۱۱ء

(ب) گلِ رعنا ـــــــــــــــ مولانا عبدالحیؒ ۱۹۲۵ء

(ج) شعرالہند (دو جلدیں) ـــ مولانا عبدالسلام ندوی ۱۹۲۶ء

(د) تذکروں، تاریخ کے بیچ کی کڑیاں اور ابتدائی تاریخ کی کتب
ابتدائی تاریخ کی کتب پر ایک نظر

ادبی تاریخ کی ابتدائی کتب کا تنقیدی جائزہ

ہمارے موضوع کے مطابق آب حیات تذکرے اور تاریخ کے بیچ ایک کڑی بن سکتی ہے۔ لیکن سنہ ۱۹۰۰ء میں لکھی گئی "خم خانۂ جاوید" کی جلدوں میں لسانی تاریخ کے موضوع سے منہ موڑ کر خالص تذکرے کا اسلوب، انداز اور تبصرہ کی تکنیک اپنائی ہے۔ "خم خانۂ جاوید" کی جلد اوّل سے چہارم تک تقریباً ۱۸ سال کا طویل وقت موجود تھا۔ اس سے پہلے آب حیات لالہ سری رام کے سامنے موجود تھی۔ "خم خانۂ جاوید" کی چاروں جلدوں کے اختتام تک "گل رعنا" ۱۹۲۵ء اور شعرالہند ۱۹۲۶ء میں جلد چہارم سے پہلے اشاعت پذیر ہو چکی تھیں لیکن لالہ سری رام نے "خم خانۂ جاوید" کے کسی حصے میں وقت کے تقاضے اور تاریخی حقائق کا عکس دکھائی نہیں دیتا۔

تقریباً اکیس سو (۲۱۰۰) شاعروں کے ان حصوں کو صرف تذکرے کے روپ میں پیش کر کے لالہ سری رام نے ادب کی خدمت کا اہم فریضہ صحیح معنوں میں پورا نہیں کیا۔ لیکن اردو شعراء کی مردم شماری کے اعتبار سے اور صرف تذکرے اور بیاضوں کی حکمت عملی کے مطابق "خم خانۂ جاوید" کی چاروں جلدیں مقدم اور تاریخی اور تنقیدی سرمایہ، ادب کی روشنی میں اس کی پرکھ "آب حیات" سے بھی کمتر درجہ کی ہے۔ آب حیات میں بیشتر اغلاط ہونے کے باوجود کئی عکس جھلکتے ہیں۔ آب حیات تذکرہ، تاریخ، تنقید، تبصرہ، سیرت، سوانح نگاری یہ تمام خصوصیات اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اسی لیے ادب میں آج اس کا ایک مقام ہے "خم خانۂ جاوید" کی ہر جلد میں جو کچھ تاریخی، تنقیدی جھلکیاں ہیں وہ مصنف کے لاشعوری عمل کا نمونہ ہے۔ دانستہ شعوری عمل کا نتیجہ نہیں ہے۔

آب حیات خم خانۂ جاوید کے بعد ہمارے ادب میں "گل رعنا" ایک قابل ذکر تالیف ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مطابق "گل رعنا" نے "آب حیات" کے بیچ ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ آب حیات تذکرے و تاریخ کے بیچ ایک کڑی ہے۔ لیکن "گل رعنا" "آب حیات" اور تاریخوں کے بیچ ایک کڑی بن گئی ہے۔ اس کتاب کا اسلوب، اور تکنیک آب حیات کا ہے۔ لیکن مولانا آزاد نے بعض بلند پایہ شعراء کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا جن کے ذکر کے بغیر اردو شاعری کی تاریخ تشنہ رہ جاتی ہے۔ مثلاً مولانا نصرتی، فقیر اللہ آزاد، سراج الدین سراج

مرزا داؤد، میر عبدالولی عزلت، عارف الدین خاں عاجز، محمد حسین کلیم وغیرہ

"گل رعنا" کے مصنف نے مندرجہ بالا کا ذکر ہی نہیں کیا۔ بلکہ ان پر تبصرہ ضرور کیا ہے۔ "آب حیات" کی اکثر متضاد بیانات کی تصدیق "گل رعنا" سے ہوتی ہے۔ اس بنیاد پر "گل رعنا" کو ہم "آب حیات" اور تاریخ کے بیچ کی کڑی کہہ سکتے ہیں۔ شعر الہند اپنے عہد کے تاریخی تقاضوں کو مکمل طور پر پورا کرتی ہے جس میں اصناف، صنائع بدائع سے پہلے قدیم عہد اور جدید دور کے شعراء پر تنقید اور تبصرہ پر علمی و ادبی میلانات سے فروعی مسائل سے بحث کی گئی ہے جہاں اسے اکثر دانشوروں نے تذکرہ بھی کہا ہے۔ لیکن اس کتاب میں بعض باتیں تاریخی نوعیت کا ایک نیا باب مقرر کرتی ہیں۔ مثلاً لکھنؤ اور دہلی شاعری کے دو اسکولوں کا نظریہ اس بحث میں مصنف کی عمیق نظری اور عرق ریزی کا پتہ چلتا ہے۔

شعر الہند سنہ ۱۹۲۶ء کی تصنیف ہے جس نے اپنے عہد میں تحقیق کے نئے دروازے کھول دیے یہ نظریہ کہاں تک صحیح اور غلط تھا اس بحث پر ادب کا ایک حصہ مشتمل ہے۔ جس نے دبستانی ادب کو وجود میں لانے کا فریضہ پورا کیا۔

تذکروں اور بیاضوں کی معلومات سے "آب حیات" "خم خانۂ جاوید" "گل رعنا" اور شعر الہند سے ادب کی ایک ایسی تاریخ مرتب ہوئی جس نے مزید تحقیقی دروازے کھول دیے اور لسانی، ادبی، تاریخ کا آغاز ہوا۔

•

خمخانۂ جاوید (جلد اوّل)

لالہ سری رام

لالہ سری رام کی تصنیف "خمخانۂ جاوید" جلد اول تاریخی نام ہے۔ جو ۱۹۰۸ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ تذکرہ ۶۸۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ۶۳۵ شعرا کا ذکر ہے۔ سترہ صفحات پر صحت نامہ اور تقاریظ و قطعات مزید ۸۰ صفحات پر محیط ہیں۔ اس تصنیف کے مطالعہ سے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ مؤلف کی نظر سے تذکرے گذرے ہیں۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں کے علاوہ مؤلف نے اپنی ذاتی نظریہ کی بنیاد پر اس تذکرے میں شعراء کا انتخاب کیا ہے۔ دیباچہ میں مصنف کا بیان قابلِ غور ہے۔

"اساتذہ کے بہت تذکرے لکھے اور لکھیں گے۔ لیکن ہر شخص کا مذاق جدا۔ کوئی بال کی کھال کھینچنا پسند کرتا، کوئی نکتہ چینی کو اپنا فرض جانتا ہے۔ کوئی باریک نظر پر گرا ہوا ہے۔ کوئی معاملہ بندی پر جھکا ہوا ہے۔ کوئی محاورہ بندی کا دلدادہ ہے۔ کوئی روزمرہ پر فریفتہ۔ کسی کو سادگی پسند ہے۔ کسی کو تعلّی۔ کوئی مراعات و مناسبات کا لفظی پابند ہے۔ کوئی تمثیل و نظائر کا دلبستہ ہے۔ کوئی لطافت پسند ہے۔ کوئی فصاحت طلب مگر میں اور ہی باتوں کا دیکھنے والا ہوں۔ میرے نزدیک حسن کلام سے دل پر چوٹ لگے جس بات سے سوتا ہوا چونک پڑے۔ جو نصیحت دل میں گھر کرے۔ جو ذکر عبرت دینے کا سبق ہے جو حکایت شکایت سے بچائے وہی غذائے روح اور حظِ نفس ہے لیکن یہی ہر ایک تذکرے کی خوش اسلوبیوں پر ناز زیبا ہے۔ جس طرح ہر گل کے ساتھ خار لازم ہیں اور ہر ایک سنگتری سے ساتھ کچھ نہ کچھ خلش مستلزم ہے۔ بس ممکن ہے کہ اس مجموعہ میں بعض مندرجات، نقادانِ سخن اور مبصران کلام جدید دکہن کی نظروں میں کھٹکیں۔ مگر ان کی ذات بابرکات سے امید ہے کہ وہ میری اس حالت پر جس کا ذکر اوپر آچکا ہے منصفانہ نظر ڈال کر ان لغزشوں اور کوتاہیوں کو راقم کی کم مائیگی پر محمول فرما کر طبع ثانی کے موقع تک ان نقائص سے آگاہ فرمائیں گے۔ تاکہ اس کا دوسرا ایڈیشن حسبِ دلخواہ ہو سکے۔" [۱]

---

[۱] خم خانۂ جاوید (مطبوعہ نول کشور) ص ۵-۴ (۱۹۰۸ء جلد اوّل) لالہ سری رام

"خم خانۂ جاوید" جلد دوم سنہ ۱۹۰۹ء

خم خانۂ جاوید کی جلد دوم ۵۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ تقاریظ کے مزید ۴۲ صفحات ہیں۔ جن پر حالی آغا، شاعر قزلباش، سید احمد دہلوی، حامد حسین قادری، مولوی فیاض الدین، عبدالحئی بیخود، نوح ناروی غلام نبی امرتسری، قمرالدین، روحانی میرٹھی، ارشاد بی ارشاد، فیاض حسین فاروقی، منشی دیا نرائن نگم وغیرہ کی رائیں اس تصنیف پر نثر و نظم میں موجود ہیں۔ الف، ب، پ سے ح تک کے لفظی شمار ابجد کے مطابق ۵۲۸ شعراء کا ذکر درج ہے۔

"خم خانۂ جاوید" جلد سوم سنہ ۱۹۱۱ء

جلد سوم ۶۵۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ۵۳۷ شعراء کا ذکر ملتا ہے۔ جو لفظ "خ" کے تخلص والے شعراء سے شروع ہو کر "ز" پر ختم ہوا ہے۔ لیکن "خ" لفظ کے تخلص رکھنے والے شعراء آخری صفحات پر مزید شمار کیے ہیں۔ ۱۴ صفحات پر فہرست شعراء درج ہے۔ آخری ۱۷ صفحات میں تقاریظ و تعریفی قطعات نظم و نثر کی طرز میں لکھے گئے ہیں۔

خم خانۂ جاوید جلد چہارم سنہ ۱۹۲۶ء

جلد چہارم ۱۹۲۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ "س" لفظ کے متخلص شعراء سے شروع ہوتا ہے۔ "ش" ابجد شماری پر ختم ہوتا ہے۔ ۵۲۴ صفحات پر محیط اس تذکرہ میں قطعات و تقاریظ مزید ۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۴۱۸ شعراء کا تذکرہ ہے۔

چاروں جلدوں کے اس تذکرے میں حسب ذیل خوبیاں و خامیاں نظر آتی ہیں۔

۱۔ "خم خانۂ جاوید" اپنی چاروں جلدوں میں ابجد کے لفظی شمار سے شعراء کا ذکر شروع کرتا ہے اور مختصر حالات کا ذکر کرتا ہے۔

۲۔ ہر جلد میں کئی شعراء کا ذکر دو تین سطر سے زیادہ نہیں ہے۔ اور بہت سے شعراء کا انتخابی کلام چند اشعار پر مشتمل ہے۔

۳۔ تمام حصوں میں اکثر شعراء کے صرف تذکرے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مثلاً پہلی جلد میں منشی حسین الدین، احمد اللہ منشی الہی سوداگر، منشی مصطفٰے خاں، سید ظفر خاں حسن اثر، منشی رادھے لال اثر فرخ آبادی وغیرہ۔

۴۔ چاروں تصانیف میں اکثر شعراء کے تذکرہ میں سکونت اور بود و باش کے مقام کا نام دیا گیا ہے لیکن کئی شعراء

کی بود و باش سے یہ تصانیف لاعلم ہے۔ مثلاً پہلی جلد میں فسق ہدایت اللہ اسیر، تلمیذ اسیر وغیرہ۔

۵۔ ہر تذکرہ میں معروف و غیر معروف شعراء کی ایک طویل فہرست ہے۔

۶۔ ان تذکروں میں کسی شاعر پر ایک دو سطریں اور کسی شاعر پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

۷۔ علاقائی اعتبار سے ان تذکروں میں دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، عظیم آباد، پنجاب، کانپور، پٹنہ وغیرہ مقامات کے شعراء کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ حالانکہ اس وقت ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں اردو شعراء موجود تھے

۸۔ زیر بحث تذکروں میں دیگر تذکروں کی خصوصیات موجود ہیں۔ بیاضوں کی طرز کے مطابق مواد ہے۔ اکثر مقامات پر تاریخی اور تنقیدی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

۹۔ کسی بھی جلد میں اشعار کے انتخاب میں کسی خاص معیار کو برقرار رکھا نہیں گیا۔ اکثر اشعار وزن سے خارج ہیں۔ چندر بھان برہمن کے اشعار غلط اور بے وزن نقل ہیں۔

۱۰۔ ان جلدوں میں اکثر شعراء پر تبصرہ تاثراتی تنقید کا نمونہ پیش کرتا ہے مثلاً محمد حسین آزاد پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ تشخص تاثر کا سبب ہے۔

۱۱۔ ان تذکروں کی سب سے بڑی خامی "آب حیات" کا تقلیدی اسلوب ہے۔ لیکن ان میں "آب حیات" کی طرح تقابلی تنقید مفقود ہے۔

۱۲۔ پچھلے تذکروں کی طرح ان میں بھی وہی غلطیاں موجود ہیں۔

۱۳۔ ۱۹۰۸ء سے پہلے اور ۱۹۲۶ء تذکرہ کی چوتھی جلد مکمل ہونے تک اردو ادب میں "اریخ" اور تحریکی تبدیلیاں نمودار ہو چکی تھیں۔ موئف نے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

۱۴۔ شعراء کے انتخاب کلام میں معیار کا فقدان بیاضوں کی حیثیت متعین کرتا ہے۔

۱۵۔ بعض شعراء پر معلوماتی مواد نہ ہونے جیسا ہے۔

۱۶۔ محمد حسین آزاد پر تاثراتی تبصرہ ملتا ہے۔ [1] (جلد اوّل میں)

۱۷۔ جلد اوّل میں امیر مینائی پر تاثراتی تنقید کا غلبہ صاف طور پر نظر آتا ہے۔ [2]

---

[1] خم خانۂ جاوید لالہ سری رام ص ۳۳-۳۲ جلد اوّل

[2] ایضاً ص ۲۲۴-۲۲۲

۸۔ بیخود دہلوی پر تبصرہ روایتی انداز سے کیا ہے۔[1]

۱۹۔ لالہ سری رام نے اپنی پہلی جلد کی اسلوب، تنقید/تبصرہ کی خامیوں پر دوسری جلدوں میں کوئی کوشش نہیں کی ہے۔

۲۰۔ تمام حصوں میں اکثر مقامات پر تنقید و تبصرے کا مواد یہ ظاہر کرتا ہے کہ تنقید و تبصرے کے یہ عناصر غیر شعوری طور پر شامل ہوئے ہیں۔ اس میں مصنف کی شعوری موجود بوجھ کو کوئی دخل نہیں ہے۔

۲۱۔ کسی بھی جلد میں کسی تنقیدی نظریہ یا ٹیکنک کو دانستہ اپنایا نہیں گیا۔

۲۲۔ سیرت نگاری اور سوانح نگاری کے لیے حاصل شدہ مواد کو شعوری طور پر قلم بند نہیں کیا۔

۲۳۔ ہر جلد میں مصنف کا مقصد شعرائے اردو کا تعارف ہے کسی جلد میں طرز اسلوب میں کوئی تبدیلی نہیں پائی جاتی۔

۲۴۔ جلد چہارم میں سخنی، شباب، شریف کے اشعار غلط نقل ہیں۔[2]

۲۵۔ اکثر شعراء کے تذکروں میں جانب داری برتی گئی ہے۔ مثلاً ناسخ۔

خم خانۂ جاوید کی تمام جلدیں اپنے عہد کے تذکروں و بیاضوں کی یاد دلانے کے باوجود مکمل تذکرے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ مولف نے جلد اول کے دیباچہ میں اس کا اعتراف کیا ہے ہر جلد کا مکمل نظم اسی طرح رقم کیا ہے۔

تذکرۂ ہزار داستاں' جس کا تاریخی نام خم خانۂ جاوید" ۱۳۲۵ھ قرار پایا ہے۔ تذکروں کی طرح شعراء کی فہرست، انتخاب کلام کا معیار لالہ سری رام کے ذاتی ذوق اور انتخاب کا پتہ دیتا ہے۔ بیاضوں کی تقلید، غیر شعوری تنقید و تبصرہ کا مواد ان جلدوں کو تذکرہ بناتا ہے۔ لیکن اکثر مقام پر طویل تبصروں کا سلسلہ اسے تذکروں سے الگ کر دیتا ہے اور اسلوب کا طرز عمل تذکروں کی صف میں کھڑا کرتا ہے۔

ان خامیوں کے باوجود قدیم ادب کلاسیکی کی تلاش و تحقیق کے لیے چاروں جلدیں مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ ان جلدوں کی مدد سے ہم اردو کے معیاری شعراء کا تعارف ترتیب وار دے سکتے ہیں۔ ان کی مدد سے عقیدت مندی سے سرشار القاب و آداب کا سلسلہ ایک تخلص کے مختلف شعراء کے تعارف کی جانکاری ہو سکتی ہے۔ تذکروں اور بیاضوں کے اسلوب کی پیروی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان عناصر کا پتہ لگانے کے لیے چاروں جلدوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

---

[1] خم خانۂ جاوید لالہ سری رام ص ۴۶۵

[2] ایضاً جلد چہارم ص ۱۴۸، ص ۴۶۵، ص ۵۵

گلِ رعنا

مولانا حکیم عبدالحیٔ

مولانا حکیم عبدالحیٔ کی یہ تالیف ۱۹۲۵ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔ "مقدمہ گلِ رعنا" میں اردو زبان کی نشوونما اور ارتقاء پر بحث کرتے ہوئے کھڑی بولی اور برج بھاشا کا ذکر کیا ہے۔ اردو کی ابتداء کا خاکہ مرتب کرتے ہوئے اُردو کے آغاز میں برج بھاشا اور کھڑی بولی اِن دو ترقی یافتہ زبانوں کا ہاتھ بتلایا ہے۔

امیر خسروؔ کے مصرعوں اور سلطان حسین شرقی (ماہر موسیقی) کے بولوں کو بطور ثبوت پیش کرکے اُردو شاعری کی تاریخ میں غزل کے ظہور کا ذکر کیا ہے۔

محمد شاہ کے عہد میں اُردو شاعری پر مختصر سا تبصرہ کرتے ہوئے اردو شاعری کے ارتقاء میں تین ذیلی عنوان قائم کیے ہیں

(۱) پہلے عنوان میں ، کن شعراء کو متقدمین میں شامل کرکے دو ادوار بتاتے ہیں۔

(۲) اس میں حیدرآباد اور بیجاپوری شعراء اور اپنے دور میں انھوں نے جو ادب پارے پیش کیے ہیں انھیں نمونے کے ساتھ پیش کرکے مختصر تبصرہ کیا ہے۔

(۳) دوسرے عنوان کے تحت اورنگ آبادی شعراء کا ذکر اور اس کے کلام پر تبصرہ ملتا ہے متقدمین میں ایک دور دہلوی شعراء کا قائم کیا ہے جس میں احمد شاہ کے عہد تک کے شعراء کو شامل کیا ہے متوسطین کے تین ادوار بتائے ہیں۔

دورِ اوّل میں سوداؔ ، میرؔ ، دردؔ ، قائمؔ ، ضیاؔ کا ذکر بطور خاص ہے۔ اور کچھ عمومی شعراء کے دیوانوں سے نقل کلام کا سہارا لے کر تبصرہ کیا ہے۔

دورِ دوم میں اثرؔ ، حسرتؔ ، جراتؔ ، مصحفیؔ ، اور رنگینؔ وغیرہ پر تبصرہ ملتا ہے۔

دورِ سوم میں نصیرؔ ، ممنونؔ ، ذوقؔ ، ظفرؔ ، مومنؔ ، غالبؔ اور شیفتہ کے کلام پر سیر حاصل بحث ہے۔ متاخرین کے باب میں تین ادوار قائم کیے ہیں۔

دورِ اوّل میں ناسخؔ ، آتشؔ اور اس کے ہم عصر شعراء کا بیان ہے۔ دوسرے دور میں امیرؔ اور داغؔ اس کے زمانے کے شعراء شامل کیے گئے ہیں۔ تیسرے دور کو حالیؔ اور آسیؔ پر ختم کیا ہے۔

اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق فرماتے ہیں۔

"سوز ماننے خود اس زمانے کے کلام کا مطالعہ نہیں کیا۔ اس لیے جو معلومات انھیں موجودہ تذکروں سے پہنچی ہے وہ سب بڑی خوبصورتی سے جمع کر دیے ہیں اور اس وجہ سے جو غلطیاں سابق تذکرہ نویسوں نے عدم واقفیت کی وجہ سے کی ہے ان کی اصلاح کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور بجنسہ نقل کردی گئی ہیں۔" [1]

۱۔ اس تذکرے میں ماخذات زیادہ تر آب حیات سے منقول ہیں۔ اس لیے غلطیاں در آئی ہیں۔

۲۔ لسانی مقدمہ میں خسرو، سلطان حسین شرقی کا ذکر کرتے ہوئے محمد شاہ کے عہد میں آجاتے ہیں۔ بابر سے عالمگیر تک کے دور کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

۳۔ آب حیات کی طرح اس میں غزل گو شعراء پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

۴۔ اس کتاب میں اردو کی ابتدائی تاریخ کا حصہ مختصر اور تشنہ ہے۔

۵۔ "گل رعنا" پر تبصرہ کرتے ہوئے علی جواد زیدی لکھتے ہیں

"اردو دکن میں کافی عرصہ سے پھل پھول رہی تھی اور وہاں ایک عظیم الشان ادبی سرمایہ وجود میں آچکا تھا جس سے قدماء بھی ناواقف نہ تھے۔ لیکن "گل رعنا" میں دکن کا ذکر بہت سرسری سا ہے۔" [1]

۶۔ "آب حیات" کی پیروی کے باوجود "آب حیات" کے مقابلہ میں دکنی شعراء کے ذکر میں اختصار برتا گیا ہے۔ اس کتاب پر علی جواد زیدی کہتے ہیں۔

"ابتداء ہی نہیں انتہا کے بارے میں "گل رعنا" کو دیکھ کر بڑے بڑے خلاؤں کا احساس ہوتا ہے۔ چونکہ یہ کتاب بنیادی طور پر بیاضی یا روایتی تذکرہ تھی اس لیے اس کی توجہ بیشتر غزل نگاری پر مذکور رہی۔ نثر، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، واسوخت، رباعی، نعت، طنز، ہجو کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔"

ان خامیوں کے باوجود اپنے عہد میں عبدالحئی کی کوشش قابل احترام ہے کیونکہ انھوں نے آب حیات کے مقابلے میں کچھ نیا مواد پیش کیا ہے۔ تبصروں میں کچھ اشارے اور تنقیدی نکات ملتے ہیں

---

[1] تاریخ ادب کا تدوین - علی جواد زیدی صفحہ ۶۲ (نظامی پریس لکھنؤ) اشاعت ۱۹۸۴ء

لیکن سے تاریخی مقام نہیں دیا جاسکتا۔ مولف نے خود اسے "تذکرۂ شعرائے اردو" قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں مزید اعتراف کیا ہے کہ پہلے انھوں نے حسب روایت قدیم ایک بیاض میں مشہور مشہور شعراء کا انتخابی کلام جمع کیا ہے بعد میں خیال ہوا کہ ان کے مختصر حالات جمع کر دیے جائیں اس طرح یہ کتاب وجود میں آگئی۔

یہ کتاب اپنے عہد میں آب حیات سے اہم نہ سہی لیکن اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اردو تذکرہ نویسی اور تاریخ کے بیچ کی کڑیاں ملانے میں "آب حیات" پہلے اور "گل رعنا" بعد میں اہم تذکرہ کہا جاسکتا ہے۔ "اردو تنقید کے ارتقاء" میں عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ

"گل رعنا" آزاد کی "آب حیات" کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اور اکثر جگہ اس میں تنقیدی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے آزاد ہی کی رایوں کو پیش کر دیا گیا ہے۔ تذکروں کا عام انداز بھی اس کے مولف نے اس کو تذکرہ ہی لکھا ہے۔ اس کے سر ورق پر صاف صاف یہ عبارت لکھی ہوئی ہے کہ "تذکرہ شعرائے اردو موسوم بہ گل رعنا"۔ [۱] قبلہ استاذی ڈاکٹر خورشید نعمانی کی رائے کے مطابق

> "مولانا نے یہ کتاب لکھ کر اردو شعراء کے تذکرہ میں اچھا خاصا اضافہ کیا ہے۔ متعدد نئے ماخذوں کی طرف توجہ دلائی اردو زبان اور شاعری کے آغاز کو وہ آب حیات" اور دوسرے قدیم تذکروں سے کئی قدم پیچھے لے گئے۔ جب دکن اور گجرات میں صوفیائے کرام کے ذریعہ اس عام فہم بولی اور سلاطین دکن اور ان کے عہد کے شعراء کے ذریعہ اس مرغوب طبع شاعری کا آغاز ہو گیا تھا۔ انھوں نے بہت سی تاریخی غلطیوں کی تصحیح کی۔" [۲]

[۱] اردو تنقید کا ارتقاء ـــ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ص ۴۲۰-۴۲۹

[۲] دار المصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات ـــ ڈاکٹر خورشید نعمانی ص ۱۳۸-۱۲۷

شعر الہند

مولانا عبدالسلام ندوی

مولفہ مولانا عبدالسلام ندوی کی یہ کتاب ۴۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ معارف اعظم گڑھ سے ۱۹۲۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کتاب میں مؤلف نے اردو شاعری کے چار ادوار قائم کیے ہیں۔ پہلے باب میں اردو شاعری کے آغاز اور قدیم شعراء پر تفصیل سے لکھا گیا ہے یہ باب تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے دور میں اردو شاعری کی تجدید اور اصلاح کا ذکر ہے۔ دوسرے دور میں میر تقی میر اور مرزا سودا کے کلام میں موازنہ کیا ہے۔ تیسرے دور میں قدماء کا ذکر ہے۔ اس میں لکھنوی شاعری کے آغاز پر بحث ہے۔ مصحفی اور انشا کا موازنہ کیا ہے تلامذۂ شعرائے قدیم کا ذکر عنوان سے خان آرزو، مرزا مظہر جان جاناں، شاہ مبارک آبرو، مصطفےٰ خاں یکرنگ، شرف الدین مضمون، شاہ حاتم، میر، سودا، میر درد، سوز، انشاء، میر حسن، جرأت، مصحفی، ابقا، دیوانہ، ضیا، حزیں، الہام، ندیم، بیدار، حسرت، فقیر اور قدرت کے شاگردوں کا مختصر ذکر ملتا ہے۔ ان کے ایک دو اشعار بطور نمونہ دیے ہیں۔ متبعین شعرائے قدیم کے عنوان میں بتایا ہے کہ کن شعراء نے کن شعراء کا تتبع کیا۔ باب اول ۱۸۰ صفحات پر ختم ہوتا ہے۔

دوسرے باب میں متوسطین کے دو دور قائم کیے ہیں۔ ابتداء ناسخ سے ہوتی ہے۔ یہ باب خواجہ آتش اساتذۂ دہلی اور تلامذۂ مومن اور غالب پر ختم ہوتا ہے۔ اسی باب میں اردو شاعری کے دو مختلف اسکولوں کا نظریہ پیش کیا ہے جس میں دہلوی اور لکھنوی شعراء کی خوبیوں پر بحث کی ہے۔ شیخ ناسخ کی اصلاحی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے الفاظ کی تبدیلی کی فہرست جلوۂ خضر سے نقل کیا ہے۔

اساتذۂ دہلی کے عنوان میں شاہ نصیر، ذوق، غالب اور مومن کے مختلف رنگوں کو اشعار کے ذریعہ دکھایا ہے۔ تیسرے باب کی شروعات متاخرین کے پہلے دور سے ہوتی ہے۔ اور ریاست رامپور سے ہوتی ہے اس میں نواب یوسف علی خاں اور کلب علی خاں کی قدر دانیوں کا ذکر ہے۔ اور شعراء لکھنؤ دہلی سے فیاضانہ سلوک پر بحث کی ہے۔

متاخرین کے دوسرے دور میں تلامذۂ داغ اور امیر مینائی کا ذکر ہے اور رامپور میں دلی اور لکھنؤ کی شاعری کے اختلاط سے ایک نیا رنگ ابھرا اس کا ذکر ہے۔ یہ باب ۶۷ صفحات پر ختم ہو جاتا ہے۔

چوتھے باب میں دورِ جدید کے عنوان پر تفصیلی معلومات پیش کی ہے۔ اس میں جدید ذہن کے تعلیم یافتہ اصحاب اصلاحی مطالبات کا ذکر کیا ہے "مقدمہ حالی" سے اصلاحی خیالات کا اظہار اور ان کی شاعری کے نمونے دیے ہیں۔ حسرت، وفا رام پوری، فانی، جوہر، اصغر گونڈوی، شاد عظیم آبادی، جوش ملیح آبادی کا کلام درج کیا ہے۔ اس کے بعد مؤلف نے وطنی شاعری، اخلاقی شاعری، سیاسی شاعری، نیچرل شاعری، مناظرِ قدرت، وصف نگاری، ظریفانہ شاعری، قومی شاعری، تاریخی شاعری کا فرداً فرداً ذکر کیا ہے۔ جس میں حالی، شبلی، اقبال، اکبر، اسماعیل وغیرہ کا کلام پیش کیا ہے۔ آخر میں متفرق نظموں کے عنوان سے انگریزی نظموں کے ترجمہ کا ذکر ہے۔

اس کتاب کی ابتداء مقدمہ سے ہوتی ہے۔ جس میں اردو زبان میں فنِ تنقید پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ کتاب میں تین ابواب میں تقسیم ہے۔ پہلے باب میں اردو کے اصنافِ شاعری پر تاریخی حیثیت سے غزل، ریختی، واسوخت، قصیدہ، مرثیہ، ڈرامہ، مذہبی شاعری، اخلاقی شاعری اور فلسفیانہ شاعری پر بحث کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں اردو کے انواعِ شاعری پر ریویو ادبی حیثیت پر مشتمل ہے۔ ان میں غزل، خمریات، قصیدہ، فخریہ، مرثیہ، ہجو، مثنوی، سہرا، وصف، تشبیہ و استعارہ اور اجزائے شعر میں قافیہ، ردیف، وزن اور محاسنِ شعر کے تحت صنائع بدائع پر رکھا گیا ہے۔

تیسرے باب میں بندوں کا تعلق اردو شاعری کے ساتھ بیانِ سخن کے زیرِ عنوان ہے۔ خاتمۂ کتاب پر اردو شاعری کا درجہ متعین کیا گیا ہے۔

"شعر الہند" جلد اول کے دیباچہ میں مؤلف کا دعویٰ ہے کہ

"آج تک اردو زبان میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی۔ جو اردو شاعری کے ان تمام انقلابات و تغیرات کو نمایاں کرتی اور اس سے یہ معلوم ہوتا کہ انواعِ شاعری کی ترقی کے لحاظ سے موجودہ زبانوں میں اردو کا کیا درجہ ہے۔" [1]

(۱) مؤلف نے اردو شاعری کے آغاز و ارتقاء پر نامکمل مواد پیش کیا ہے اس میں شاعری کے نشیب و فراز کی بھرپور وضاحت نہیں ہوتی۔

(۲) مؤلف تذکرہ میر حسن کے حوالے سے غواصی کے بابت لکھتے ہیں کہ ....

---

[1] "شعر الہند" دیباچہ۔ عبدالسلام ندوی ص د دیباچہ

"غواصی نے طوطی نامۂ نخشبی کو نظم کیا جس کا ایک مصرعہ
ہندی اور ایک مصرعہ فارسی زبان میں تھا۔"[1]

لیکن تذکرۂ میر حسن میں میر حسن کا بیان اس طرح ہے۔

"غواصی تخلص در وقتِ جہانگیر بادشاہ بود۔ طوطی نامۂ نخشبی را نظم نمود است
بزبانِ قدیم نصفے فارسی نصفے ہندی بطور ریختہ کہانی۔"

ان جملوں کا مطلب یہ ہوا کہ طوطی نامۂ نخشبی کی زبان فارسی اور ہندی ملی جلی ہے۔

(۳) سلطان قلی قطب کے بابت لکھتے ہیں۔

"خود سلطان قلی قطب شاہ نے اس قدر ذخیرہ مہیا کر دیا تھا کہ تذکرہ شعرائے دکن
میں اس مجموعہ کو ان کے نام سے موسوم کیا ہے۔"[2]

اس بیان سے یہ گمان ہوتا ہے کہ سلطان قطب کے مجموعہ کو دیوان نہیں کہہ سکتے۔ حالاں کہ
سلطان قلی قطب کا کلیات بالکل ایسا ہے جیسے کلیات مرتب ہوتے چلے آئے ہیں۔

(۴) مولف نے ابتداء میں اردو زبان کی تاریخ پر روشنی نہیں ڈالی۔

(۵) دکن کی اردو کی ابتدائی شاعری پہ کچھ نہیں لکھا گیا۔

(۶) دکنی شعراء پر جو کچھ لکھا ہے دوسروں کے اقوال نقل کیے ہیں۔

(۷) قدیم شاعری کے تعلق سے جتنی معلومات فراہم کی گئی اس میں جلوۂ خضر کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔[3]

(۸) عبد السلام ندوی نے اس میں اردو شاعری کی خصوصیات کے اعتبار سے "دہلی اور لکھنؤ"
دو اسکول کا نظریہ پیش کیا ہے۔ ان سے پہلے کسی صاحبِ نظر نے وضاحت کے ساتھ دہلی اور لکھنؤ کی
خوبیوں پر بحث نہیں کی۔

(۹) مؤلف نے ناسخ کی اصلاحی تحریک اور ان کے زمانہ میں شاعری میں مروج الفاظ کی ایک
فہرست پیش کی ہے۔ اس کے اکثر لفظ آج بھی مروج ہیں۔

---

[1] شعر الہند" عبد السلام ندوی صہ ۱۸

[2] ایضاً صہ ۲۱

[3] "رسالۂ اردو" ۱۹۲۶ء تنقیدات عبد الحق صہ ۹۴

(۱۰) جلد اول چوتھے باب میں "دورِ جدید" پر تبصرہ کرتے ہوئے مولف نے اپنے عہد کے چند تعلیم یافتہ لوگوں کے اصلاحی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن جدید دور کی شاعری پر مولف نے کوئی بحث نہیں کی ہے

(۱۱) "مقدمہ شعر و شاعری" کے اصلاحی تجاویز کو نقل کیا ہے۔

(۱۲) وطنی شاعری، اخلاقی شاعری، سیاسی شاعری، نیچرل اور قومی شاعری پر مختصراً "مقدمہ شعر و شاعری" کی تقلید کی گئی ہے۔

(۱۳) مولف نے مولانا محمد علی جوہر، اصغر گونڈوی، شبیر حسن خاں جوش، مولانا حسرت موہانی وغیرہ کے متعلق شاعرانہ خصوصیات پر چار آٹھ سطروں کے ساتھ کچھ اشعار نقل کیے ہیں۔

(۱۴) مناظر قدرت کے باب میں نظیر اکبر آبادی کا ذکر ضمناً کیا گیا ہے۔

(۱۵) دورِ جدید کی شاعری میں پیدا شدہ تبدیلیوں پر کن اسباب و اثرات کی چھاپ ہے ان باتوں کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔

(۱۶) "شعر الہند" جلد دوم میں اردو شاعری پر تاریخی اور ادبی حیثیت سے انواع شاعری، مسائل بدائع پر مختصراً بحث کی گئی ہے۔

(۱۷) ملکی شاعری کا سرمایہ میں ہندو شعراء کی فہرست نامکمل ہے۔

بابائے اردو عبدالحق کا پہلا اعتراض شعر الہند پر اس طرح ہے۔

۱۔ "ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس کتاب کا نام "شعر الہند" کیوں رکھا گیا اگر تبرکاً و تیمناً "شعر العجم" کے تتبع میں یہ نام رکھا گیا ہے تو خیر۔ ورنہ موضوع کے لحاظ سے یہ نام موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اس میں اردو شاعری کے سوا ہندوستان کی کسی دوسری زبان کی شاعری کا مطلق ذکر نہیں۔" ۱

۲۔ نصیر الدین نے اپنے مضمون "شعر الہند اور دکن" میں لکھا ہے۔

"یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے دکن کے حقوق ادا کرنے سے دریغ کیا ہے تاہم ان کے متعلق انھوں نے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں ان میں بعض فروگذاشتیں اور بعض کمیاں رہ گئی ہیں۔" ۲

۱۔ "رسالۂ اردو" ۱۹۲۶ء تنقیدات عبدالحق ص ۹۶ مولوی عبدالحق

۲۔ مقالات ہاشمی۔ ص ۲۵۸

۳۔ نیاز فتح پوری نے "شعر الہند" کی دوسری جلد پر اس طرح اعتراضات کیے ہیں۔

(۱) اصنافِ شاعری کے سلسلے میں جس اصول پر مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ اصول ناقابلِ فہم ہیں۔

(۲) وہ اردو غزل سے بیزار نظر آتے ہیں اسی وجہ سے انھوں نے سطحی اور سرسری بیان سے کام لے کر بات ختم کر دی ہے۔

(۳) غزل پر ادبی حیثیت سے جو تنقید کی گئی ہے وہ تشنہ اور نامکمل ہے۔

(۴) اصنافِ سخن کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی زیادہ واضح، مکمل اور مدلل نہیں ہے۔

(۵) "شعر الہند" تنقید کے اصولوں سے ہٹی ہوئی ہے جو اس کا بدترین عیب ہے۔" [۱]

۴۔ کلیم الدین احمد شعر الہند پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"عبدالسلام صاحب جو کچھ دیکھتے ہیں دوسروں کی آنکھ سے دیکھتے ہیں ان کی آواز اپنی نہیں، ایک صدائے بازگشت ہے۔" [۲]

مندرجہ بالا خامیوں اور اعتراضات کے باوجود "شعر الہند" اپنے عہد کی تاریخی اور تحقیقی حقائق کو پورا کرنے میں کامیاب ہے۔ اس کتاب کی اہم خوبی اور خامی یہ ہے کہ اس نے اردو شاعری کے دو اسکول کا نظریہ پیش کیا۔ جس پر بعد میں تحقیقی کام کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی یہ سب سے اہم کامیابی ہے۔

اس کے علاوہ بقول قبلہ استاذی ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی

"شعر الہند" اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں اردو شاعری اور اس کے مختلف اصناف کی تاریخی و ادبی ارتقاء سے بحث کی گئی ہے۔" [۳]

---

[۱] "نگار" ۱۹۲۶ء فروری ص ۲

[۲] "اردو تنقید پر ایک نظر" کلیم الدین احمد ص ۶۷

[۳] "دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات" ۔ ڈاکٹر خورشید نعمانی ص ۱۳۰

تذکروں، تاریخ کے بیچ کی کڑیاں/ ابتدائی تاریخ کی کتب

تذکروں اور تاریخ کے بیچ کی کڑیاں اور ابتدائی تاریخ کی کتب ہم نے اس موضوع میں آب حیات
اور گل رعنا کو تاریخ اور تذکروں کے بیچ کی ایک کڑی تسلیم کیا ہے۔ لیکن بعض حقائق اور خصوصیات کی روشنی
میں آب حیات، گل رعنا، خم خانۂ جاوید اور شعر الہند وغیرہ کتابیں ابتدائی تاریخ کی کتب میں شمار ہو
سکتی ہیں۔ پچھلے باب میں ہم نے جو بات آب حیات اور گل رعنا کے لیے لکھی ہے وہی بات خم خانۂ جاوید
پر کم اور شعر الہند پر زیادہ صادق آتی ہے۔ ہر چند کہ شعر الہند کا طرز بیان تذکروں جیسا ہے۔ لیکن
تنقید، تاریخی شواہد اور بیشتر نتائج کی روشنی میں شعر الہند کو مکمل طور پر تاریخی کتاب کہا جا سکتا ہے۔

شعر الہند میں دو ادبی اسکولوں کی تقسیم کا نظریہ سیاق اور لہجے کے تضاد کا اظہار تاریخی بازیافت
ہے۔ اس خوبی سے آب حیات، گل رعنا اور خم خانۂ جاوید نابلد ہیں۔ آب حیات پر تحقیقی تنقید کرنے
کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اس کتاب سے تاریخ نگاری میں تنقید کی ابتداء ہوئی ہے۔ ورنہ ہمارے ادب میں
آج بھی یہی کتاب اپنے کمزور حوالوں اور بیشتر خامیوں کے سبب تنقید کا ہدف بنی ہوئی ہے

خم خانۂ جاوید آب حیات کے بعد کی تصنیف ہے۔ لیکن کتاب کا انتخاب اور نگاہ کی تنقید اس
مواد سے تذکروں سے زیادہ قریب کرتا ہے۔ یہ تاریخ سے کم میل کھاتی ہے۔ ہم نے اس باب میں اس
لیے مذکورہ کتابوں کو تاریخ اور تذکروں کے بیچ کی کڑیاں تسلیم کیا ہے۔ اور ابتدائی تاریخ کی
کتب مانا ہے۔ کیونکہ ان کتابوں میں تذکروں اور تاریخوں کی خصوصیات موجود ہیں۔

بابِ سوم ۳

ادبی تاریخوں کا نصب العین

تاریخ نگاری کا مقصد

ہماری ادبی تاریخیں اصول اور ضوابط کی روشنی میں

ہماری ادبی تاریخوں کا نصب العین مقاصد اصول و ضوابط کا نچوڑ

ادبی تاریخوں کا نصب العین

صدیوں پہلے یونانی دانشوروں نے شعبہ ہائے زندگی کے تمام موضوعات کو علم کی روشنی میں فکری نگرانی سے نوازا۔ اسی وجہ سے ان کے یہاں فلسفہ کا روپ ہر موضوع نے اختیار کر لیا۔ اس طرح وہاں علم فلسفہ کی تدوین کا آغاز ہوا۔ اس لیے خیال کی کوئی بنیاد یا کسی عقیدے کے آغاز کا سلسلہ عام طور پر ہمیں یونان کے فلسفیانہ دور تک لے جاتا ہے۔ علم و فن کے اصول اور ضوابط میں ایک خاص فکری نہج اور طرز عمل و اسلوب کی تلاش کو فلسفہ کہا جاتا ہے۔ غرض کہ انسانی فکر اور عمل کی کارکردگی جو شعوری حدود میں عوام الناس کو متوجہ کرے اور سوچنے پر مجبور کرے وہ فلسفہ ہے۔ لیکن ہر فلسفہ کا اظہار اور فکری تناؤ انسانی زبان کی کرشمہ سازی ہے۔ کیونکہ انسان بولتا ہے اور یہی بولی کے ذریعے افکار خیالات اور عقائد کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کیا بولتا ہے؟ اور کیوں بولتا ہے؟ ان سوالات کے جوابات نے علم اللسان اور علم الاصوات کو جنم دیا۔ اور اسی علم کی تگ و دو اور موشگافی نے وہ تمام نازک گتھیاں پیدا کیں جنھیں ہم نے مختلف علوم کا نام دیا ہے۔ ہر علم کے اظہار کی ضمانت [illegible] ہے۔ زبان ایک سرچشمہ ہے جہاں سے علوم انسانی کے وسیع و عریض سوتے پھوٹ نکلتے ہیں۔ جن سے سماج فکری اور شعوری طور پر سیراب ہوتا ہے۔

اس بات سے کون ذی شعور انکار کر سکتا ہے کہ تمام علوم ایک گہری وابستگی کے ساتھ کم و بیش مفید ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ زبان کا علم تمام علوم کا سرچشمہ نہ سہی لیکن تمام علوم کی نشاندہی ضرور کرتا ہے۔ اور یہ حقیقت ذرا غور کرنے پر یوں واضح ہوتی ہے کہ زبان کا مطالعہ انسانی ہستی کی تمام کیفیت اور یگانگی کو واضح کر دیتا ہے۔ انسان کے "کیا" "کیوں" اور "کیونکر" سوالات سے جتنے جوابات ملتے ہیں ان میں سے ایک علم اللسان ہے اور اس سے وابستہ نظم و نثر ہے۔ لیکن علم اللسان چند اہل دماغ اور دانشوروں کا حصہ ہے۔ لیکن نظم و نثر خاص و عام سے کسی نہ کسی صورت جڑے ہوئے ہیں۔ نظم و نثر نے زندگی سے وابستہ احساسات و جذبات کے اظہار میں انسان کی مدد کی ہے۔ یہ دونوں وحشت، بربریت، تہذیب و تمدن اور دورِ جہالت تا حال، انسان کے جذبات و احساسات کے اظہار میں پیش پیش رہے ہیں۔

اس طرح جہاں فلسفہ انسان کے محض افکار کا بیان کرتا ہے۔ نظم و نثر اس کے افکار و اعمال کی روز مرہ کیفیات، ترقی، تنزل کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ متمدن قوم اپنی نظم و نثر کی کیفیات، ترقی اور تنزل کی روداد، اس کی نشوونما اور اس کی ترمیم و تبدیلی کا مطالعہ کرتی ہے۔ اسی مطالعے سے اقوام کے ما فی الضمیر سے کہ انسانی ذہن کی باریکیوں کا حال معلوم ہوتا ہے اس علم سے جو کام نکلتے ہیں، اور جو فوائد ہو سکتے ہیں اس کی تفصیل ہمارا مقصد نہیں۔

نظم و نثر میں ادوار کے مطابق تبدیلی اور ان کیفیات کو معلوم کرتے رہنا انسان کی اس عادت کا مظاہرہ ہے جس کے تحت انسان کائنات میں اپنے آپ کو زندہ جاوید بنانے کے لیے اپنے تمام اعمال و افعال سے ماخوذ نتائج تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں یاد رکھتا ہے۔ اسی ارادے سے ان کو کسی نہ کسی روپ میں محفوظ رکھتا ہے چٹانوں اور پتھروں کی بھدی تصاویر سے ریڈیو گراف کے نازک اور خوردبینی نقوش تک زبان کا سہارا لے کر تحریری قلم ان مختلف انداز سے جذبات اور احساسات کا سچا مظاہرہ تاریخ نویسی ہے

ان تمام باتوں کے باوجود دنیا کے جھمیلوں میں انسان آج سے ہزاروں اور لاکھوں سال پیشتر کے انسان کا بولنے اور سمجھنے کا عمل بھی جاننا چاہتا ہے۔ اس کو جستجو کا شوق اس بات پر اکساتا ہے کہ انسان اپنے ما فی الضمیر کو کس دور میں کس طرح ادا کرتا تھا۔ اور ان نتائج کی بنیاد پر ایک اندازے کے مطابق آئندہ زمانے میں وہ کن خیالات کو کس طرح ظاہر کرے گا۔ زبان و بیان سے تصاویر اور ریڈیو گراف تک ایسی یادوں اور باتوں کے اعادے پر خوشی سے پھولے نہیں سماتا۔ اور ان پر فخر کرتا ہے کیونکہ اس کے زبان کی تدریجی ترقی، عروج اور ترمیم و تنسیخ کا یاد رکھنا اور اس پر گہری نظر رکھنا اس کی حیات و بقا کی ضمانت ہے۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھیے نظم و نثر کی اشتراکی خوبیوں کے امتزاج سے ادب پیدا ہوتا ہے۔ نظم و نثر کی تاریخ اور اصول کا باضابطہ نام "تاریخ ادب" کہلانے کا مستحق ہے۔ مادی دنیا میں ہر شے فلسفیانہ شکل کے ساتھ تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے۔

تاریخ ہر شے کی ہستی سے وابستہ نشیب و فراز و تدریجی ارتقاء اور بقا و فنا کے امکانات کا سراغ لگا کر مزید روشن امکانات سے پیوستہ امیدوں کا پتہ دیتی ہے اسی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیز اہم ہونے کے ساتھ نازک بھی ہے۔ اسی لیے زبان اور ادب کی تاریخ نویسی میں محتاط ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا کے بیشتر زبانوں کے قواعد صرف و نحو اور ان کی ترقی

ترقی ونشو ونما کی تاریخ غیر اقوام کے افراد نے قلم بند کی ہے ۔ اور ہماری زبان بھی اس عمومی خصوصیت کی مالک ہے ۔ کیونکہ اردو کی صرف و نحو اور اس کے ادب کی تاریخ بڑی حد تک غیر ملکی مصنفوں اور مولفوں کی رہین منت ہے ۔ ان غیر ملکی مصنفوں کے بعد ہندوستانی قلم کاروں کا زمانہ آتا ہے اور سردست ہمیں اسی بات پر بحث کرنی ہے ۔

اردو میں ہندوستانی اہل قلم نے "اردو ادب" کے موضوع پر جن تاریخوں کو مرتب کیا ہے ان میں سب سے زیادہ اہم "اردو شعراء کے تذکرے" ہیں ۔ لیکن وہ تذکرے زیادہ تر شعر وسخن سے متعلق ہیں جنھیں شعراء کے تذکرے کہنا زیادہ مناسب ہوگا ۔ "آب حیات" "خم خانۂ جاوید" "شعر الہند" اور "گل رعنا" یہ مذکورہ کتابیں اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں ۔ جن میں "آب حیات" محمد حسین آزاد کی ایک مثالی کتاب ہے ۔ اس کتاب میں شعرائے اردو کے کلام پر بحث ہے لیکن اس میں زبان کی تاریخ لسانی حیثیت اور نثر نگاروں کا بھی ذکر ہے ۔ اس ضمن میں رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادب اردو" جو انگریزی میں لکھی گئی تھی ۔ اور جس کا اردو ترجمہ کیا جا چکا ہے واضح تاریخ ہے حسن عسکری کے ترجمے مع تصحیح و اضافہ کے قابل قدر ہیں ۔

حامد حسن قادری کی تاریخ "داستان اردو" اسی موضوع پر اچھی تالیف ہے لیکن مذکورہ تاریخوں نے ادب کو تذکروں کی طرح شعر وسخن تک محدود کر دیا ہے ۔ جس سے مولفین کے ذہن کا پتہ چلتا ہے کہ انھیں شعر و شاعری سے دلچسپی رہی ہوگی ۔ یا ان کے معلوماتی ذخیرے میں ادب پر شعراء کی اکثریت غالب رہی ہوگی ۔ لیکن کسی بھی زبان کی تاریخ میں اول نقش شعر وسخن نہیں ہو سکتے کیونکہ زبان کے بننے تک صوتی آہنگ کا سرمایہ کہلاتا ہے ۔ اس لیے کسی بھی زبان کی نشو ونما سے ارتقائی عروج تک نثر پہلے میدان عمل میں آتی ہے ۔ اور اس کا واضح ثبوت بعد کی علاقائی تاریخوں نے فراہم کیا ۔

پنجاب میں اردو، بہار میں اردو، دکن میں اردو، گجرات میں اردو، سندھ میں اردو وغیرہ تاریخوں نے اردو کے مشترکہ شاعروں کی قدیم نثر نگاری سے آشنا کیا ۔ لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ علاقائی تاریخوں کے مصنفین اپنے علاقوں میں محدود ہونے کے سادہ شعر وسخن کی طرف زیادہ مائل ہوئے اور ان کی ہندوستانی ذہنیت اپنے عقیدے کی بنیاد پر عقیقی مظاہرہ کرتی رہی ۔ ان کے علاوہ احسن مارہروی کی "تاریخ نثر اردو" کا لب لباب وہی شعر وسخن ہوا ۔

۱۔ اردو ادب کی ابتدائی تاریخ "تاریخ ادب اردو" رام بابو سکسینہ نے انگریزی میں لکھی تھی

ڈاکٹر شوکت سبزواری کی "داستان زبان اردو" اور مسعود حسین خاں کی "مقدمہ تاریخ زبان اردو" قابل قدر کارنامے سامنے آتے ہیں۔ جس میں زبان کی لسانی بنیاد کے پیش نظر نثر و نظم پر مدلل مواد حاصل ہوتا ہے۔

"تاریخ ادب اردو علی گڑھ" ۱۹۵۹ء ایک ایسا کارنامہ تھا جو اپنی اغلاط کی بہتات سے ختم ہو گیا۔ اس تاریخ کے بعد ہمارے سامنے فی الحال جمیل جالبی کی "تاریخ ادب اردو" سامنے آتی ہے یہ دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ ان تاریخوں میں ادب کے نثری اور نظم کے مختلف کارناموں کے باوجود لسانی ارتقا پر سیر حاصل بحث نہیں ملتی۔ اور کوئی معنی خیز نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

موصوف نے اس تاریخ میں تمام علاقوں کو اردو کا مولد ٹھہرانے کی بھرپور کوشش کی ہے دوسری بات اس لیے یہاں نثری کارناموں پر شاعرانہ کارناموں کو فوقیت دینے کا عمل غیر شعوری طور سے واضح ہو جاتا ہے۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "اردو ادب" کی مکمل تاریخ واقعتاً ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ تاریخی تقاضوں اور حقائق کی روشنی میں تاریخ نگاری کا فرض اپنے نصب العین کے مطابق کسی اہل قلم نے انجام نہیں دیا۔ ۱۹۵۹ء سے پیشتر کی تاریخوں اور تذکروں نے تاریخوں کو شعر و سخن تک محدود کر دیا۔ اس کے بعد کی تاریخوں اور چند ادبی رسائل کے مقالوں میں نثر اور نظم دونوں موضوعات کے ان کارناموں کو پیش کیا گیا۔ اس میں بھی نثری کارناموں سے انصاف نہیں ہو سکا۔ اس کے باوجود ایک غور طلب بات یہ بھی ہے کہ ہر مصنف نے موضوع کے مطابق مصنفوں کے کارنامے کا جائزہ لے کر جداگانہ رائے دینے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ کسی مصنف کی تصنیف اسی وقت توجہ کے لائق اور قابل قدر ہوتی ہے جب اسے اپنے دور کے مجموعی ماحول میں رکھ کر ادبیات کے اس تحقیقی نظریے سے جانچا جائے جس کا پیدا کرنا تاریخ انسانی کا ایک جزوی منصب ہے لہٰذا اردو کی تاریخ کی کتاب کو سب سے پہلے مجموعی طور پر اردو ادب کے موضوع سے دلچسپ ہونا چاہیے۔ مورخ ادب کا مقصد صرف یہ نہیں کہ وہ نامور مصنفوں کے کارناموں کو صحیح اور ضابطے کے مطابق بیان کر دے۔ بلکہ اتنی احتیاط ضروری ہے کہ اس میں اردو ہونے والی مختلف اقوام کے حالات اور رجحانات کا اقرار ہو جائے۔

ہمارے مورخین آج تک صرف شخصی اور ذاتی کارناموں کی بنیاد پر ادبی تصانیف کا جائزہ

لینے کے قائل ہیں۔ حالانکہ محقق ان کارناموں کے پس منظر کا جائزہ لینا چاہیے۔ اس دور میں پیدا شدہ مسائل اور زبان کی اظہاری کیفیت کی روشنی میں کوئی خاطر خواہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

مورخ ادب کا فرض ہے کہ مختلف ادوار کی ادبی تحریکات کی تحقیق کرے اور تاریخ انسانی کی ساخت میں جو شخصی اور غیر شخصی افکار و رجحانات کے باہمی تاثرات کارفرما ہیں۔ ان کی وضاحت اور تشریح ضروری ہے۔ ایسے مورخ کو محض ان امور و واقعات سے منسلک ہونا چاہیے۔ اور ان امور کی کیفیت اور اسباب سے بھی بحث کرنا چاہیے۔ اور ان کی وضاحت و تشریح کے سلسلہ میں بدلتی ہوئی ادب کے حالات زندگی تمدن و ثقافت کے سلسلے میں مختلف ادوار کے پس منظر کا جائزہ لے کر ادیب و شاعر کے تخلیقی عمل میں صحیح نتائج نکالنا چاہیے۔ اگر کوئی مولف یا مورخ تمام اسباب و کیفیت، ذرائع و وسائل کا تحقیقی مطالعہ نہیں کرتا۔ تو وہ تاریخ کی روشنی میں حقیقی نتائج تک پہنچنے میں ناکام ہو جائے گا تاریخ ادب میں مصنفین اور تصانیف کے ذوق رجحان پر ذاتی رائے ایک مادہ مورخ پیش کر سکتا ہے۔ جو مصنفین کے دلی رجحانات اور تاثرات کا عمیق مطالعہ کرے۔ ایسی بنیادوں میں زبان و ادب سے متعلق ہندوستانی زندگی سماجی اور معاشرتی ماحول کے مابین کون سے تقاضے یا وجوہات تھیں جن کے سبب ادب کے مختلف ادوار میں زبان و بیان کے خاص رنگ نے ادبی ذخیرے کو مختلف رنگوں کا اندر نہ پیش کیا۔ اور رنگوں کے محرک وہ مصنفین تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ چند اشخاص، مرد و زن، یا کسی قوم کے منصوبے کے تحت زمان و مکان کے حدود سے باہر ہو کر خلا میں بیٹھ کر کچھ کہنے کا نام ادب نہیں۔ ادب الفاظ و معنویات، مفہوم و معانی کا وہ پیمانہ ہے جو انسانی زندگی کو سلیقہ مندی سے راہِ عمل سکھاتا ہے۔ اسی لیے ادب کی تخلیقی قوت، تجربات و حالات کا جائزہ لے کر حیاتِ انسانی کا رہنما بن جاتا ہے۔ زندگی سے منسلک روزمرہ تجربات و راسا پر عمل پیرا ہونے سے نتائج کا پیش آنا۔ ان امور پر روشنی ڈالنا ادب کا فرض منصبی ہے۔ اسی لیے یہاں مورخ ادب کا فرض ہے کہ وہ اپنے ادب سے منسلک ادبا اور شعرا کے بارے میں اس حقیقت کا پتہ لگائے کہ اظہار کے قابل قدر سرمایہ میں مصنف یا شاعر کن مسائل یا حالات سے دوچار ہوا۔ جس کے نتیجہ میں اس نے ادب کے نام پر انسانی تہذیب و ثقافت کو رنگین خیالات اور رنگین اظہار بیان دے کر ادب کو مالا مال کر دیا۔ ان امور کی روشنی میں مصنفین و تصانیف کی صحیح قدر و قیمت اور اہمیت سے واقف

ہونے پر ہمیں ادبی شخصیات کی اصل ذہنیت اور روحانی کیفیات کا بہترین سراغ مل جائیگا۔ اور دوسری طرف ان کے جذبے میں پوشیدہ عصبیات کا پتہ چلے گا۔

مندرجۂ بالا بیانات پر غور و فکر سے اندازہ ہوگا کہ اردو ادب کی تاریخ "کا نصب العین کیا ہونا چاہیے۔ اس نصب العین کے مطابق لکھی گئی ادبی تاریخ، شخصی اعتبار سے قومی اور ملکی اہمیت کی ذمہ دار ہوگی۔ ایسی تاریخ سے اہلِ ملک اہلِ ادب کی ذہنی قابلیت اور کمالاتِ فنون میں تخلیقی قوت کا حال معلوم ہوگا۔ اس کے باوجود وہ مسائل یا اسباب جو ایسی تخلیقات کا موجب ہوئے۔ اور ان زبانوں میں قدروں کی بازیافت یا توڑ پھوڑ میں عوامی جذبے کے علاوہ موجودہ مصنفین اور شعراء نے کیا کردار ادا کیا۔

کسی ملک کی تاریخ یا قوم کی سوانح عمری کا موجود ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس کے ادب کی تاریخ کا ہونا اشد ضروری ہے۔ کیونکہ ادبی تاریخ کسی قوم یا ملک کا خود نوشت تذکرۂ حیات ہوتا ہے اس کے ذریعہ حیاتِ انسانی کی داخلی اور خارجی شکست و ریخت میں مختلف تہذیب و تمدن کے ساتھ معاشرتی اقدار کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ ایسی تاریخ واقعتاً تاریخِ ادب ہوگی۔ اور اردو زبان و ادب کی ایسی تاریخ ہمارے ملک اور ہماری قوم کو مختلف اقوامِ عالم اور اہلِ ادب کو بتائے گی کہ دنیا کی تہذیب و ثقافت کی ساخت اور نشو و نما میں اس کا کردار کس قدر بلند اور تعمیری ہے۔

ہمارے ادب کی ایسی تاریخ ادب و سماج تخصیات و علاقائیت کی بھی آئینہ دار ہوگی۔ لیکن مختلف جذبوں سے عصبیت کا شکار نہ ہوگی۔

ایسی تاریخ اپنے اندر زبان و بیان، مفہوم و معنی، صوتی آہنگ اور غیر صوتی ترتیب الفاظ اسلوبِ تحریر کا بہترین پیمانہ ہوگی۔ اور اصنافِ ادب اور اصنافِ سخن کی آئینہ دار ہوگی۔

ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھ کر ہی ہم تاریخ نگاری کے بہترین فرائض سے سبکدوش ہو سکتے ہیں ورنہ عام طور سے ہماری تاریخیں ان اسباب و وسائل سے خالی نظر آتی ہیں۔ ●●

تاریخ نگاری کا مقصد

زبان کی تاریخ یا قوم کی تاریخ کے مقاصد وسیع اور واضح حقائق کے متقاضی ہوتے ہیں۔ زبان کے تعمیری عوامل اور حقائق کو سامنے رکھ کر نتائج اخذ کر لینے کا نام تاریخ نگاری نہیں بلکہ تخریبی عناصر کا بھرپور جائزہ لے کر تعمیری گوشوں کو روشن کر کے تاریخ ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ قوموں کی پستی کے اسباب کا غائر جائزہ لے کر ان عوامل اور عناصر کی تلاش کیجئے جن سے ایک زبان کا خاتمہ اور دوسری نئی زبان کا آغاز ہوتا ہے قوموں کے عروج اور زوال کے ساتھ ماحول کے تقاضے، قدروں کی شکست و ریخت نظریات میں تبدیلی مختلف اقوام کے اشتراکی اعمال کے انفرادی اثرات، ان اثرات سے ماخوذ فوائد، مذہبی اور سماجی قدروں کی بازیافت اور ان قدروں سے منسوب، صلاحی اور غیر اصلاحی نتائج، جنگ و جدل سے متاثر شخصیات کا ردِّ عمل۔ ان کے خیالات میں تبدیلی ان حالات سے نمٹنے کے بعد جب مختلف اقوام کارزارِ حیات میں عملی جدوجہد پر آمادہ ہوتی ہیں اس وقت انھیں تعمیری کارگزاری کے لیے ایک صحت مند زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ صحت مند زبان سے مراد وہ زبان ہے جو لسانی جذبات اور احساسات کی عملی کارکردگی، فکر و تردّد کے اظہار پر مکمل دسترس رکھتی ہو۔ نیز ذاتی صلاحیت رکھتی ہو جو دوسروں کی زبان کو اپنے صوتی آہنگ، بیان اور تحریر سے دوسری زبانوں کو متاثر کرے یہ زبان کی وہ تاریخ ہے جب زبان مکمل ہو کر عملی کارکردگی پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

علی جواد زیدی نے ادب کی تاریخ کے تصوّر کی پوری وضاحت کی ہے۔

"ادب کی تاریخ بنیادی طور پر ادب کی تاریخ ہے۔ لیکن ضمنی طور پر زبان کی بھی تاریخ ہے۔ زبان کے تغیرات اور تبدیلیاں معاشرے کی عہد بعہد تبدیلیوں سے ربط رکھتی ہیں۔ ان کو بھی ادبی تاریخ کا لازمی جز بننا چاہیے اس کے بغیر نہ تو ادب کا مزاج سمجھا جا سکتا ہے نہ زبان کے ارتقاء کی مختلف منزلوں کا شعور ہو سکتا ہے۔ زبان کے ساتھ عروض کی بھی تاریخ ہے اور تمام اصنافِ سخن کی الگ الگ تاریخ ہے مقامی اثرات کی تاریخ ہے۔ زبانوں کے میل جول اور مختلف زبانوں کے ادبی و ثقافتی

روایات کے امتزاج و ارتباط سے جو نئے ادبی روایات بنتے بگڑتے رہے ہیں اخذ و ترک کا عمل جس طرح پر جاری رہا ہے اس سب کی تاریخ ہے۔ ان کو کھوئے بغیر ادبی تاریخ کیسے بنے گی۔" ؎۱

لیکن زبان کی نشو و نما اور ابتدائی تشکیل کی تاریخ کے لیے ان باتوں سے سوا کاوش کرنی پڑتی ہے زبانوں کے ابتدائی لفظوں کی جانچ پڑتال ان کی صوتی کیفیات اقوام کے مزاج اور احوال کا تحقیقی جائزہ اس وقت کی رائج زبانوں کی شکست و ریخت کی وجوہات ان کی تعمیر و تشکیل کا وہ عمل جس نے لفظ کو جنم دیے میں آہنگ اور صوتیات کے بھرپور تقاضوں کی نمائندگی کی ہو۔ دوسری زبانوں کے شکست و ریخت کا وہ عمل جس نے نئی زبان کو بننے میں سہولتیں فراہم کی ہوں سماج و ماحول کی وہ قدریں جنھوں نے مذہبی یا غیر مذہبی راہوں سے نئی زبان کی تعمیر میں اہم کام کیا ہو۔ انسانی ذہن کے وہ فکری تغیرات جنھوں نے نئی زبان کی نشو و نما کی ضرورت محسوس کی اور اس کی تعمیر میں اظہار کے رستوں کو معین کیا ہو۔ یہ بات الگ ہے کہ اس زمانے کے وقتی تقاضوں کے پیش نظر خیالات و جذبات کی ظاہری کیفیت پر صلاحیت کا بھرپور استعمال نہ کیا ہو۔ بلکہ وقتی طور پر ضروریات کے مطابق جذبات و خیال کے اظہار کی وضاحت ہی ان کا اہم کارنامہ تھا۔

زبان کا تدریجی ارتقائی عمل ان عوامل کو نظر میں رکھتے ہوئے سمجھ میں آسکتا ہے ساتھ ہی یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ جب زبان کی ابتدائی نشو و نما کے عوامل سے اخذ کردہ نتائج کا رابطہ باقاعدگی کے ساتھ زمانہ، ماحول، سماج، مذہب، مزاج، فکری عناصر اور شخصی کارکردگی سے اس طرح جڑا ہوا ہو کہ لسانی تغیرات کے صحیح اور واضح خاکے کو ایک مکمل تصور کے ساتھ سامنے آنا چاہیے۔ ان باتوں کی روشنی میں ہماری تاریخیں آبِ حیات سے لے کر جمیل جالبی کی "تاریخ ادب اردو" آج تک ایسے مکمل اور مدلل مواد سے قریب قریب خالی ہیں۔ ان کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بیشتر باتوں کا خیال مطلق نہیں کیا گیا۔ اور جن عوامل پر دھیان دیا گیا ان کا رابطہ زبان سے مربوط نہیں رہا۔ جیسے "پنجاب میں اردو" کی لسانی تحقیق تذکروں اور مخطوطوں کی روایات پر اپنے علاقہ تک محدود ہے۔ اس کے باوجود زبان کی تشکیل میں پچھلی زبانوں کے شکست و ریخت کا عمل اور نئی زبان میں رد و قبول کی صلاحیت کا جائزہ اچھوتا ہے۔

؎۱ "فکر و ریاض" علی جواد زیدی ص۵

اقوام کے عروج اور زوال میں مرتبات و آہنگ کی سہولت کے پیش نظر جذب کرنے کا عمل توجہ طلب ہے۔ ان مسائل کو سامنے رکھ کر علاقائی بنیاد پہ زبان کی تعمیر کا فلسفہ علاقائیت کا حامی نہیں رہتا۔ تمام علاقائی تاریخیں مثلاً "بہار میں اردو" "دکن میں اردو" "سندھ میں اردو" "مدراس میں اردو" تمام تاریخوں میں ایسے حقائق سے منہ موڑ کر زبان کی تعمیر کو علاقے سے محدود کر دیا گیا ہے۔

اس کے برخلاف علی گڑھ کی تاریخ ادب اردو میں "لسانی مقدمہ" کی کارکردگی میں مختلف ادوار اور زبانوں میں بولیوں کے جذب ہونے کا احساس اپنے تحقیقی دائرے میں تعمیری عناصر کی وضاحت نہیں کر پاتا۔ اسی طرح باب ۲ میں تاریخی واقعات کا بیان زبان کے بننے بگڑنے کا کوئی تصور نہیں ابھارتا۔ اس میں قوموں کے عروج و زوال کا سیاسی پس منظر مقالہ نگار کے ذہنی تنظریات اور کلیہ کا واضح رویہ میں اشارہ کرتا ہے اس تاریخ میں تمام مقالہ نگاروں نے قدیم نسخوں اور کتابوں کے حوالے سے قاری کو مرعوب کرنے کا طریقہ اپنایا ہے۔

جمیل جالبی کی "تاریخ ادب اردو" کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ زبان کا تدریجی ارتقاء نہیں بلکہ شاعری اور نثر نگاری کے تدریجی ارتقاء کا حال کچھ تبصروں اور مختلف لوگوں کی رائے کے اعتبار سے ابھرتا ہے۔ لیکن زبان کا ارتقائی عمل، اظہاری صلاحیت سے پہلے کس طرح رونما ہوتا رہا ہے اور کن صلاحیتوں کی بنیاد پر یہ زبان مختلف ادوار کی متنوع بولیوں کو جذب کرتی ہوئی ایک اظہار کی زبان بن گئی۔ کون سے عناصر اور جذبات سے زبان ذاتی قوت سے مالا مال کیا جس کے سبب یہ زبان اظہاری قوتوں کی تکمیل تک معقول اسباب فراہم کرنے کے قابل ہو گئی۔ ایسے تصورات اس تاریخ سے زندہ نہیں ہوتے۔

ان کے علاوہ یہ تاریخیں مختلف غلطیوں کا شکار ہیں۔ جن کا مطالعہ آپ اگلے ابواب میں کریں گے ان تاریخوں میں ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر علاقے کو اردو کا مولد قرار دینے میں یہ تاریخیں پیش پیش ہیں قومی اور جذباتی سطح کی بلندی انھیں ہر علاقہ میں یکساں نظر آتی ہے۔ جہاں یہ زبان اپنے اظہار کے ساتھ مکمل زبان نظر آتی ہے۔

ان کے علاوہ کچھ تدریسی تاریخیں مختصر اور مفید نظریے کے تحت لکھی گئی ہیں لیکن وہ اتنی مختصر ہوتی ہیں کہ جن کا اختصار نیز اجمالی کیفیت زبان کی تاریخ کے وسیع موضوع کے ساتھ مفقود ہو گئی ہے

دوران کا خصار کسی ضمن میں زبان کے کسی عمل کو مکمل طور سے نہیں برتتا۔ ان تاریخوں میں ڈاکٹر اعجاز حسین کی مختصر تاریخ "ادب اردو" اور رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو تقریباً ادبی شخصیات کا احاطہ تو کر لیتی ہیں لیکن لسانی تاریخ کے لیے طلبہ کو غیر لسانی تاریخوں کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے۔

ان تاریخوں میں سے اکثر میں سنین کے تعین پر مطلق توجہ نہیں دی گئی، دور زبان کی تدریجی ارتقائی تاریخ کا کوئی اصول نہیں بنایا گیا ہے۔ بلکہ شاعروں کے تجربے اور اعمال نامے پیش کرنے کے ساتھ زیادہ تر اصنافِ سخن میں اپنی ذاتی رائے کا فقدان ہے۔ محمد حسین آزاد صاحب اور مختلف مؤلفین کی پیش کردہ رائے کے مطابق ان کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اس زمانے میں کسی شاعر یا ادیب کے یہاں اصنافِ سخن صوتی آہنگ یا نثری اسلوب میں کیسی کیسی تبدیلیاں بتدریج رونما ہوئیں ان باتوں پر کھل کر کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا۔

کون سے دور میں کن لفظوں کو متروک کیا گیا۔ کس زمانے میں زبان کا روپ کیسا تھا۔ ایسی باتوں پر "داستان زبانِ اردو" شوکت سبزواری کے یہاں کچھ اشارے ملتے ہیں لیکن بڑی بڑی تاریخیں اس ضمن میں خاموش ہیں۔

غرض کہ زبان میں تاریخ نگاری کا اہم فریضہ تاریخ نگاری کے مقاصد اور نصب العین ۔ اصول اور ضوابط کی روشنی میں ہمارے مورخین تاریخ نگاری کا فرض پورا کرنے سے قاصر رہے ہیں اس کے علاوہ مرتبین بھی اپنے فرائض سے کوتاہی کرتے آئے ہیں۔ ایسی تاریخیں جن کو مقالات کی رو میں ترتیب دیا گیا ہے وہاں پر ابواب کی تشکیل میں مرتبین اپنے فرائض سے غافل نظر آتے ہیں۔

مرتبین کے فرائض: مرتبین کا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ بواب کی تشکیل میں سب سے پہلے اس بات کا خیال رکھیں کہ زبان کے ارتقائی عمل کا سلسلہ باب در باب ایک دوسرے سے منسلک ہو جائے اور لسانی نشو و نما کا ایک واضح خاکہ ذہن میں مرتب ہو جائے جیسے علی گڑھ کی تاریخ ادب میں لسانیاتی مقدمہ سے پہلے پہلا باب ترتیب دیا جانا چاہیے تھا۔ وہ بعد میں موجود ہے لسانیاتی مقدمہ کے بعد ساتواں باب ہونا چاہیے تھا۔ "شمالی ہند میں اردو ادب کے نمونے ۱۸۰۰ء تک" لیکن اس باب کو آخر میں ترتیب دیا گیا۔

جمیل جالبی کی تاریخ میں ایک ضمیمہ صوبۂ سرحد میں اردو آخر میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ایسی کئی

غلطیاں ہماری تاریخوں میں مرتبین کی مہربانی سے ہوئی ہیں ایسا ہی حال علاقائی ادر تدریسی تاریخوں کا ہوا ہے مرتبین کو صفحات کی ترتیب کا بھی خیال رکھنا چاہیے فہرست میں دیے گئے صفحات اور کتاب میں شائع شدہ صفحات میں اکثر غلطیاں موجود ہیں۔ مرتبین کا اہم فریضہ یہ ہے کہ مقالات یا تاریخی مواد کا بغور مطالعہ کریں اور یکسوئی کے ساتھ نظر ثانی کا عمل کریں۔ املائی غلطیوں، غلط حوالوں، سنین کی غلطیوں متضاد بیانات اور غیر واضح نتائج پر کڑی نظر رکھ کر مقالات کو پریس کے سپرد کرنا چاہیے۔ لیکن ہماری تاریخوں میں ان تمام باتوں کے باوجود اشاریہ اور ضمیمہ تک میں اغلاط موجود ہیں۔

علی گڑھ کی تاریخ اس دعویٰ کا ثبوت ہے۔ اس تاریخ میں اشاریہ کی بے ترتیبی، غلط ناموں کی طومار حوالے کی ایک کتاب کا نام مختلف طریقوں سے لکھا گیا ہے۔ اس تاریخ میں مقالہ نگاروں وران کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کے مسودوں کو صحیفہ سمجھ لیا گیا۔

علی گڑھ "تاریخ ادب اردو" میں تمہید میں ایک صفحہ پر دعویٰ کیا گیا ہے کہ

"علی گڑھ تاریخ ادب اردو" کے ذریعہ اردو ادب کے ارتقاء اور اس کے افکار و اقدار اور کارناموں کا ایک واضح تصور ابھرے گا۔ اور اردو ادب کا ہندوستانی سرزمین اور ہندوستانی فضا سے گہرا تعلق ہے اور اس کی ہندوستانی روح کی ترجمانی سب پر آئینہ ہوگی۔"

اصول اور ضوابط کی روشنی میں زبان کے وجود میں آنے کو ادب کا ارتقاء کہنا غلط ہے۔ اسے اردو کا ارتقاء کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ زبان کی ابتدائی شکل زبان کی تعمیر سے تعلق رکھتی ہے۔ ضرورت اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ادبی شکل زبان کی وہ ہوگی جس میں جذبات و افکار کا سرمایہ اخلاقی، تہذیبی، سماجی، مذہبی، شخصی اور تاریخی عوامل کو زبان کے حسن کا لباس عطا کرے۔ اس کے باوجود مذکورہ بیان کی روشنی میں افکار کا عکس کسی حد تک دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اقدار اور کارناموں کا پتہ نہیں ملتا۔ اگر مرتب کی مراد کارناموں اور اقدار سے یہ ہے کہ بزرگوں اور شاعروں نے جو کچھ اس زمانے میں کام کیا وہ زبان کے کارنامے ہیں۔ یہ خیال ٹھیک نہیں۔ کیونکہ زبان کا کارنامہ الگ موضوع ہے۔ نئی زبان نے اپنے دباؤ اور تعمیری عمل کے دوران کن زبانوں کو پسپا کیا اور کن زبانوں کو متاثر کیا۔ کن زبانوں اور بولیوں سے استفادہ کیا۔ یہ زبان کے کارنامے ہو سکتے ہیں۔ شعراء اور ادباء کے فن پارے، احساس اور خیالات، جذبات اور تاثر کے ساتھ تجربات و مشاہدات کی فکری گہرائیوں سے نئی نوع انسان کے احساس

کا اظہار اور ایسی حالت میں اس کی رہنمائی کرتے ہوئے انسانیت کی نمائندگی کرے ۔ یعنی مندرجۂ بالا ۔ شخصیات کا کارنامہ کہا جا سکتا ہے ۔ اس کے باوجود ادوار کی ٹوٹ پھوٹ اور زبان میں رد و بدل کے وہ نقوش جن کو اجاگر کرنے سے متضاد کیفیات اور زبان میں تبدیلیوں کا علم ہوتا، زبان میں روانی، برجستگی ، اظہار کی قوت ، ادبی صلاحیت ، قواعدی حد بندیاں رفتہ رفتہ کیسے اور کن حالات کے پیش نظر شامل ہوئیں اور کس موڑ پر زبان کو ایک مستقل علمی سرمایہ نصیب ہوا ۔

ہماری تاریخوں میں مرتبین اور مولفین نے ان عناصر و عوامل کی نشاندہی کا خیال نہیں کیا ۔ بلا تاریخی درجہ بندی کے ساتھ شاعروں، بزرگوں اور ادیبوں کے کارناموں کو سپرد قلم کر کے، زبان میں تاریخ نگاری کے فرض کو پورا کر لینا تصور کیا ۔ زبان کے تدریجی ارتقائی عمل کا صحیح خاکہ آج تک اردو ادب کی کسی بھی تاریخ میں موجود نہیں ۔ کسی نے علاقائی حد بندیاں قائم کیں ۔ اور اس میں بھی زبان و بیان سے تاریخی مدارج کی تشریحات ہوئی ۔ کسی نے مختلف علاقوں میں سے ہر علاقہ کو اردو زبان کا پیدائشی مرکز بتایا ۔ لیکن ثابت کرنے میں ناکام ہوا ۔ کوئی اتنی فراخ دلی پر آمادہ ہوا کہ ہر وہ علاقہ جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے اردو کا مولد قرار دیا ہے ۔ کوئی مورخ یا کسی مولف کو یہ توفیق آج تک نہیں ہوئی کہ وہ زبان کی باریکیوں پر متوجہ ہو کر ہماری توجہ اس طرف مبذول کرتا کہ فلاں زمانے میں زبان میں شگفتگی اور فصاحت پے در پے کس طرح سرایت کرتی رہی ۔ روانی ، سلاست ، برجستگی سے زبان کس دور میں کیسے مالا مال ہوئی ۔

کس زمانے میں زبان کے لب و لہجے اور ادائیگی کے مشکل لہجوں پر صوتیاتی اعتبار سے کن لفظوں اور حرفوں کے ذریعے زبان و بیان کے اظہار میں کس طرح سہولتیں فراہم کی گئیں ۔ لہجے کی روانی اور رواں الفاظ کا ذخیرہ بعد کے لوگوں نے کن حالات کے پیش نظر زبان کو دیا ۔ کوئی بھی زبان کچھ مخصوص افکار کی بلندی پر اظہار کی قوت سے پہنچتی ہے ۔ اظہار کیلئے الفاظ و معنی کا ذخیرہ خالص عوام کا دیا ہوا ہوتا ہے ۔ اس کے لیے کسی دانشور طبقے یا پھر شاہی طبقے کا تصور پیدا کرنا جانبدارانہ فعل ہے ۔

حرفوں کے ذریعہ اسلوب ، الفاظ ، حروف کے ذریعے برجستگی اور روانی کا سلسلہ کن ادوار کی پسپائی اور کون سی قدروں کی فراوانی سے شروع ہوا ۔ ایسی باتوں پر کوئی رہنمائی بتدریج مدلل صورت میں نظر نہیں آئی جس میں بحث و مباحثے سے ایسی باتوں کو سمجھایا گیا ہو ۔ بزرگ شعراء

اور ادباء کے علمی و ادبی کارناموں میں ایسی تبدیلیوں کی طرف توجہ مبذول نہیں کروائی گئی۔ بلکہ تاریخی ادوار کے اعتبار سے بزرگوں، شعراء اور ادباء کے کارناموں کو کئی کمزور حوالوں اور کئی سنی سنی باتوں کی بنیاد پر بیان کر دیا گیا ہے۔

زبان کی ابتدائی نشوونما کا واضح خاکہ کیا ابھرتا۔ بلکہ یہ تصور بھی زندہ نہیں ہوتا کہ ہماری زبان نے ابتداء میں کن زبانوں کو کس انداز میں پسپا کیا ہے۔ لسانی تاریخوں میں زیادہ تر ہندوستان کی ہر نئی زبان پر اتنا ہی زور صرف کیا گیا ہے جتنا ہماری زبان پر اس لیے نتائج کو صحیح اخذ کرنے میں آج تک ناکام ہوتے ہیں۔ لسانیاتی تاریخوں میں جہاں مختلف زبانوں کی شکست و ریخت سے نئی زبان کا آغاز ہونے کا عمل شروع ہوتا ہے اس دور میں نئی زبانوں اور بولیوں کا ارتقاء بیک وقت مختلف علاقوں میں ہونا ایسا تصور ہے جس میں لفظوں اور حرفوں کی توڑ پھوڑ کے مستقل عمل کو ثابت کرنے کی دلیلیں درکار ہوتی ہیں۔ لیکن دلیلوں کی روشنی میں نئی زبانوں کے آغاز اور نشوونما کا ابتدائی عمل ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ اسی سبب اردو کی تمام تاریخوں کا مطالعہ کرنے پر ایک نتیجہ آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تاریخیں شعراء، ادباء اور صوفیوں کے کارناموں کا تعارف ہیں

ہمارے ادب کے تاریخ دانوں نے ابھی ایسی باتوں پر غور نہیں کیا اور اگر غور کیا بھی تو مزید تحقیقات سے چشم پوشی کا رویہ اختیار کیا ہے۔ اسی وجہ سے زبان کی تدریجی نشوونما کی تاریخ نہیں بن پائی۔ بلکہ شعراء، ادباء اور صوفیوں کے کارناموں کی مکمل تاریخ بن گئی۔ ••

ہماری ادبی تاریخیں، اصول اور ضوابط کی روشنی میں

ہمارے ادب میں ادبی تحقیق کی ابتدائی شکل تذکروں کو سمجھنا چاہیے لیکن تذکروں میں موجود مواد کو صرف شعراء کے کلام اور شخصی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس تشنگی کو کسی حد تک آبِ حیات کا مطالعہ کم کرتا ہے لیکن آبِ حیات میں آزاد کے خیال طوطے و مینائی تخیلی پرواز پر مغالطے کا گمان ہوتا ہے۔ اور "آبِ حیات" کی بیشتر روایتیں اور تحقیقی مواد میں آزاد نے جانبداری کے ساتھ جذباتی گل کھلائے ہیں۔ "آبِ حیات" سے آگے گلِ رعنا اور شعر الہند پر غور کریں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ "گلِ رعنا" کے مصنف اور شعر الہند کے مولف نے "آبِ حیات" سے اہم کام انجام نہیں دیا ہے۔ بلکہ بعض بعض مقامات پر محمد حسین آزاد کے غیر تحقیقی مواد کو اپنی دلائل کا تحقیقی مواد بنا کر پیش کر دیا ہے۔ اس سے پہلے کہ اردو تاریخ نگاری کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی جائے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے ماحول سے واقف ہو جائیں۔ کیونکہ ایک زمانہ سے ادب کے دانشور طبقے میں بڑی شد و مد سے یہ مسئلہ زیرِ بحث ہے کہ آج تک اردو ادب کی کوئی محقق اور صحیح تاریخ نہیں لکھی گئی اور حقیقی تاریخیں لکھی گئی ہیں انہیں کن اصولوں کی روشنی میں ادبی تاریخ کہا جائے یا نہیں اور اگر حقیقی تاریخیں لکھی گئی ہیں اور وہ صحیح ہیں تو اردو ادب کی تاریخیں کس طریقہ پر لکھی جائیں۔ اس موضوع کے مطابق نہیں اردو کی ادبی تاریخوں کی تاریخ بیان کرنے کا مسئلہ ہے۔ اس کے ارتقاء سے بحث کرنا ہمارا مقصد نہیں اور نہ کسی خاص تاریخ پر اظہارِ خیال کا یہ موقع ہے۔ بلکہ کچھ باتیں ذہن میں محفوظ ہیں جنھیں ہم تاریخ نگاری کے لیے اہم اور ضروری سمجھتے ہیں اور جن باتوں کا اردو کی ادبی تاریخوں میں فقدان ہے۔ ان کے علاوہ کئی ضروری باتیں ایسی ہیں جو ہمیشہ غلطی سے تاریخ سمجھ کر اردو تاریخوں میں بے ضرورت ٹھونس دی گئی ہیں اور یہ باتیں ثبوت ہیں اس بات کا کہ ہمارے ادبی مورخین کے ذہن میں ادبی تاریخ کا مفہوم واضح اور صاف نہیں ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔

(۱) ہماری تحقیق کا ادبی سرمایہ تنقیح کی کمی اور نامکمل تذکروں کی دین ہے۔ اور ہماری تاریخی اساس ان ہی پر قائم ہے۔

تاریخ ذی روح اور ذی شعور انسان کے مادی عمل و حرکت کا مرقع ہے جو نمونے کے طور پر۔

تاریخِ ادب کا سرمایہ بن کر ادبی افکار اور عمل و حرکت کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ یہ مادّی ذخیرہ ہے اور اسے زمان و مکان کی قید سے آزاد ہونا چاہیے۔ تاریخ صرف ماضی کی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کا رشتہ حال سے مستقبل کی جانب استوار ہوتا ہے لیکن ادبی تاریخ تقریباً ماضی، حال اور مستقبل تینوں کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ اسی لیے تاریخِ ادب کو ادبی افکار کی شرط پر پابند کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے منسلک افکار فلسفیانہ روپ میں سیاسی اور تجرباتی مشاہدات کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر ایسے خیالات میں ادبی جھلک نمایاں نہ ہوئی تو اسے ادبی تاریخ کا سرمایہ ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ حالانکہ ادبی تاریخ میں سیاسی، عمرانی، روحانی اور معاشرتی عناصر کو مشاہداتی رنگ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن فلسفہ، عمرانیات یا سیاست کو ادبی تاریخ کے رنگ سے خوبصورت نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ کسی بھی تاریخ کے ساتھ مادّے کی قید اس لیے ہے کہ مادّے کے بغیر کوئی عمل حرکت میں نہیں آ سکتا ورنہ تاریخ محض خیالی نہیں ہو سکتی اور خیال کی بنیاد پر تاریخ کا تعین داستان اور افسانے کا روپ دھار لے گا۔ اور اردو ادب کا تاریخی المیہ ہے کہ اردو والوں کی تاریخیں حقائق سے قیاسات کی طرف گامزن ہو کر مختلف روایتوں کا ذخیرہ بن جاتی ہیں۔ کیونکہ اردو کی تاریخ نے تذکروں کی فضا میں آنکھ کھولی۔ جہاں زیادہ تر سینہ بہ سینہ تاریخی واقعات اور قیاس سے کام لیا جاتا ہے۔ اور تذکروں کی بنیادی اساس تحقیق اور تدقیق کا شعوری عمل نہیں۔ بلکہ جذبات اور عقیدت مندی کا با ضابطہ اظہار ہے۔ ورنہ اس زمانے میں لوگ تحقیق اور ذہنی پریشانی کو پسند کرتے تھے اس لیے صحیح طور پر یہ بھی کہا نہیں جا سکتا کہ تذکرہ نگاری کا خیال کیونکر پیدا ہوا۔ اگر قیاس کی بنیاد پر کہا جائے کہ فارسی تاریخیں اور تذکرے پیشِ نظر رہے ہوں گے۔ لیکن اس قیاس سے انحراف بھی کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ فارسی تذکرے زیادہ تر شہنشاہِ وقت کی تعریف و توصیف کے نمائندے ہوتے تھے اور شاعروں ادیبوں کا تذکرہ محض اسلیے کیا جاتا کہ ان واقعات سے بادشاہ کی علم دوستی اور ذوقِ سلیم کا باب روشن ہوتا تھا۔[1]

[1] صرف تذکرہ دولت شاہ سمرقندی اور لباب الالباب اس وصف سے الگ کیے جا سکتے ہیں نظامی عروضی، سمرقندی کا چہار مقالہ سنجر دربار کے نقشے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ قابوس نامہ نوشیرواں کے قوانین اور دیگر ادھر کے واقعات سے متعلق ہے۔ اس میں شعراء کا کوئی تذکرہ نہیں رشید الدین وطواط کی حدائق السحر میں مثالیں دیتے وقت اور بعض عروضی نسخوں میں کہیں کہیں شاعر کے کلام کے ذکر پر روشنی پڑتی ہے۔

صرف شعراء و ادباء کے ماحول اور ذہن و شعور کا اظہار ہرگز مدنظر نہیں تھا اسلیے ہم اردو کے تذکروں کو ایک درمیانی کڑی تصور کرنے پر مجبور ہیں۔

ایک مکمل اور مربوط تذکرہ[1] اردو شعراء کے تعلق سے جو ملتا ہے وہ میر کا نکات الشعراء ہے لیکن اس کی زبان فارسی ہے۔ نکات الشعراء سے لے کر شمیم سخن تذکرہ صفا بدایونی تک تو زیادہ تر تذکروں کو الٹ جائیے جنہیں بھی مختصر سوانح حیات کلام کی عمومی خصوصیات معمولی فنی غلطیوں کے ساتھ زندگی کے کچھ با اخلاق اعمال اور بد اخلاق مظاہروں کے علاوہ عمیق نظری سے کسی پہلو کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ پھر ان واقعات اور خصوصیات میں ذاتی بغض و عناد یا اپنی پسند کا بیشتر اظہار شامل ہو گا۔ چنانچہ نکات الشعراء میں اکثر مقامات پر میر تقی میر نے ذاتی بغض کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور ایسے ہی اقتباسات ہماری تاریخوں کا تحقیقی مواد بن جاتے ہیں جو مورخین کی فن تاریخ نگاری کا ثبوت ہے یہی نہیں بلکہ ان اقتباسات سے ماخوذ واقعات میں کسی قسم کی کمی اور زیادتی کو اخلاقی جرم نہیں بلکہ گناہ خیال کرتے ہیں۔

ادب کے مطالعہ سے بعد کے مورخین نے بہترین کاوش یہ کی ہے کہ اردو کی پیدائش کی تحقیق اور تفتیش پر تفصیلی بحث کی۔ لسانی تحقیق کا بیشتر حصہ علاقائیت پر مبنی ہے۔ جو اپنے اپنے علاقوں کو اردو کا مولد ثابت کرتی ہیں۔ پنجاب میں اردو، دکن میں اردو، بہار میں اردو، مدراس میں اردو قریب قریب سب تاریخوں کا تحقیقاتی مصالحہ آج بھی خام ہے۔ کیونکہ اس میں قطعی رائے کسی مورخ نے پیش نہیں کی۔ ہر مورخ حقائق سے قیاسات کی طرف گامزن ہو کر اپنے اپنے علاقہ میں محدود ہو جاتا ہے۔ نتائج کے مطابق قطعی رائے دینے سے گھبرانے کا یہ عمل اس لیے سرزد ہوتا ہے کہ تحقیق محض خام ہے۔ کیونکہ مورخ عام طور سے تذکروں کے حوالجات پر مکمل بھروسہ کر لیتا ہے لیکن دوسرے تاریخ دانوں کی طرح مشکوک ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے وہ اس اکھاڑے میں تصحیح اوقات کے باوجود ایک ضخیم کتاب میں ناکارہ مواد پیش کرتا ہے۔ یہ باتیں کئی بار دہرائی گئیں کہ اردو میں تاریخ لکھنے کا رواج بالکل روایتی[2] ہے۔

---

[1] سراج الدین خان آرزو کو سب سے پہلا تذکرہ نگار کہا جاتا ہے لیکن ان کا تذکرہ نایاب ہے اسلئے انھیں تذکرہ نگار مان لینا صحیح نہیں۔ [2] نگار سنہ ۱۹۶۵ء "ہماری ادبی تاریخیں" محمد عقیل ص ۲۱

اسی لیے تاریخی اعتبار سے، ان تاریخوں میں ادوار کے لحاظ سے سائنسی تقسیم[1] کا طریقہ نہیں اپنایا گیا۔

اسی سبب ہماری تاریخوں میں علاقائی اعتبار سے دبستانوں کی تقسیم کہیں پر اصناف کی بنیاد پر تاریخ کی تدوین کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ تاریخوں میں چند افسانوی واقعات اور غیر تصدیق شدہ حقائق کی بھرمار ملتی ہے۔ ان کے علاوہ وہ تفریحی جملے جو مختلف تذکروں یا ایسے تذکروں کی آئینہ دار تاریخوں میں لکھے گئے ہیں بعض مورخ اپنی استعداد کے مطابق دہراتا ہے ایسے مورخ کی نظر میں غالب یا اقبال اس لیے بڑے شاعر ہیں کیونکہ ان کو کسی تاریخ یا تذکرہ نے بڑا لکھا ہے۔ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر بغیر کسی تحقیق اور ثبوت کے بڑے شعراء مورخ کی نظر میں ٹھہرتے ہیں۔ ان کے نزدیک غالب اس لیے مشکل پسند ٹھہرتا ہے کہ آب حیات سے تذ جان عیش تک سب نے اسے مشکل پسند لکھا ہے۔ یا غالب ان کی نظر میں اس لیے فلسفی ہے کہ ڈاکٹر عبداللطیف، عبدالرحمن بجنوری، حالی اور خورشید الاسلام تک سب نے فلسفی شاعر کہتے ہیں۔

کہنے کا مدعا یہ ہے کہ ہمارے مورخین ذاتی رائے دینے سے گھبراتے ہیں اور اس کے لیے کوشاں نہیں رہتے کہ شاعر یا ادیب کا بذاتِ خود نفسیاتی تجزیہ کر کے اس کی تخیل کی گہرائیوں کا جائزہ لیں۔ اس کے جذبات اور احساس کو اپنے دل کی آواز محسوس کریں۔ اردو شعراء اور ادباء کے تعلق سے نفسیاتی تجزیہ کا فقدان کچھ محقق پر آمادہ کر دیتا ہے اور ہمارے مورخین زبان، اور اسلوب، اصنافِ سخن کی باریکیوں میں تفاوت معنی کے ساتھ "بقول اُس کے یا بقول اِس کے" تک محدود ہو جاتے ہیں ایسی حالت یا کیفیت سے وہ مطلق الگ ہونا نہیں چاہتے جہاں کسی شخصیت کے متعلق کوئی رائے دیتے ہوئی فوراً لکھ دیتے ہیں بقول فلاں صاحب آپ کا خیال ایسا ہے جیسے رام بابو سکسینہ اپنی تصنیف "تاریخ ادب اردو" میں لکھتے ہیں۔

"میر صاحب کی شہرت انکی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے۔ اور سودا قصیدہ اور ہجو کے استاد مانے جاتے ہیں[2]۔"

"آب حیات" صفحہ ۱۹۳ کے مطالعہ سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ مندرجہ بالا بیان مطلق

۱؎ نکرو ریاض۔ علی جواد زیدی ص

۲؎ تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ

کی اپنی ذاتی رائے نہیں ہے۔ یعنی سکینہ صاحب سودا و میر کے کلام کی روشنی میں حالاتِ زندگی سے خود کوئی رائے پیش نہیں کر سکے۔ ایسی رائے کا کیا وزن جس کا دارومدار دوسروں کے اقوال سے وابستہ ہو۔ یسی کئی مثالیں ہماری تاریخوں میں آسانی سے ہاتھ آجاتی ہیں "گلِ رعنا" "سیر المصنفین" میں ایسے بیانات موجود ہیں لیکن پنجاب میں اردو جیسی تاریخیں بھی بیاضوں اور مخطوطوں کے سواد سے ایسے کئی بیان مل جاتے ہیں۔ خوفِ طوالت مزید اقتباسات پیش کرنے سے قاصر ہوں۔

ہماری تاریخوں میں یہ سلوک صرف میر اور سودا کے ساتھ نہیں ہے بلکہ ہر شاعر کو اسی طرح پیش کیا گیا ہے۔ تاریخوں کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ چند رٹے ہوئے اور گھسے پٹے جملے جو اردو ادب کا مؤرخ اور طالب علم ہی نہیں بلکہ نقادانِ سخن بھی شعراء کی تعریف اور توصیف میں وہی روایتی جملے ور رائیں اپنی.. تنقیدوں میں پیش کرتے ہیں۔ تاریخوں کے علاوہ بعض تنقیدی مضامین اور تصانیف میں بھی ایسے جملے دلیلوں کو ایک دوسرے سے منسلک کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

اکثر و بیشتر تاریخوں میں یہ جملہ

"میر صاحب کا کلام آہ! اور مرزا صاحب کا کلام واہ!! ہے۔"[1]

ضرور نظر آئے گا۔ لیکن کسی مؤرخ یا تنقید نگار کو یہ خیال نہیں آیا کہ ایک بالغ نظر ور ذہین اس جملے کو پڑھ کر اور چیزیں بھی معلوم کرنے کا خواہش مند ہوگا۔ لیکن کہیں اس بات کی وضاحت مشکل سے ملے گی کہ میر کے کلام میں آہ! اور مرزا کے کلام میں واہ! کیوں ہے؟ وہ کون سی شعوری یا غیر شعوری تحریک تھی جس کے محرکِ عمل نے میر کو رونا اور سودا کو ہنسنا سکھا دیا۔ ایسے سوال ضرور ملیں گے۔ لیکن ان اقوال کی مزید تشریح اور احساس کا سراغ ملنا مشکل ہے۔

محمد حسین آزاد کے دور سے کچھ بعد تک بہت سی باتیں تحقیقی نظروں سے پوشیدہ تھیں بہت سے واقعات تجربہ گاہوں اور عجائب گھروں اور کتب خانے کی زینت بنے ہوئے تھے۔ نہ تو علم نفسیات نے اتنی ترقی کی نہ تنقید کا کوئی سائنٹفک نظریہ اور طریقہ کی جان کاری ہوئی۔ اس وقت تحقیقی ذرائع اور شعور دونوں کی کمی تھی۔ ورانحطاطی عناصر مکمل طور سے اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ زلفِ الجھن اور قرابت، زلف گرہ گیر کو جلائے امن سمجھے ہوئے تھیں۔ ایسے عالم میں ان روکھے پھیکے اور خشک موضوعات

---

[1] آب حیات صد ۱۶۴

کی سمت کون راغب ہوتا۔ اور اپنی دماغی صلاحیت سے تذکروں پر جراحی کا عمل کرتا۔ اور ان میں موجود روایات و قصص کو تحقیقی کسوٹی پر لا کر اپنا لوہا منواتا۔ اگر آزاد نے لطیفے، چٹکلے اور بعض بے بنیاد نقلوں کا سہارا لیا تو قابلِ معافی بات ہے۔ لیکن بعد کے دور سے آج تک اتنی آسانیاں اور وسیع ذرائع کے باوجود مورخین وہی لکیریں پیٹتے چلے آتے ہیں۔ اور تحقیق میں مزید تحقیق سے دلچسپی نہیں رکھتے۔

عموماً ہمارے مورخین تاریخِ ادب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

(۱) سوانح حیات سے متعلق ہوا کرتا ہے۔ جس میں سیرت نگاری کی بہت دھندلی تصویر ابھرتی ہے۔

(۲) شاعر کے کلام پر رائے یا تبصرہ کا بڑا حصہ تعریف اور ستائش پر مشتمل ہے۔ سوانح حیات عموماً روایتی انداز کی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مورخین کو تحقیقی مواد کی فراہمی میں بعض اوقات دقتیں پیش آتی ہیں۔ ان مشکلات کے پیش نظر مورخین ادب سے ہمیں مکمل ہمدردی ہے۔ لیکن سیرت نگاری کی شروعات میں مورخ کو بالکل معاف نہیں کر سکتے کیونکہ شخصیت کی پرکھ یا کارکردگی کے اعمال و افعال میں یکسانیت کا ہونا ضروری ہے۔ یہ ناممکن بات ہے کہ ایک شخصیت کے متعلق جو رائے آپ کی ہو وہی میری بھی ہو۔ اس لیے تاریخ کے اس حصہ کے علاوہ پوری تاریخ کو جو چیز نامکمل بنا دیتی ہے وہ ہمارا اخلاقی نظام ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ زندگی کی قدروں میں تبدیلی سے ہماری ناواقفیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہمارا اخلاقی نظام اور چیزوں کی طرح جانبدارانہ عمل کرنے کا عادی ہے۔ جس کا معیار صرف چند چیزوں پر ہے جیسے شخصیت میں کردار کی بلندی اور سنجیدگی کے عناصر ہونے چاہئیں۔ مزاج کے اعتبار سے خوش اخلاق اور مزید اچھائی کے لیے ظریف ہونا چاہیے۔ نظریاتی اعتبار سے گناہ و ثواب، سزا و جزا کا قائل ہونا چاہیے اگر مادیت پرست نظریے کا حامل ہو تو اس صورت میں اسے ذاتی برائیوں کے باوجود اخلاقی اچھائیوں کا مالک ہونا چاہیے۔ ادب و احترام کا جذبہ ضروری ہے۔ ان خیالات کے تحت انسان کو اخلاقی بلندی کا نمونہ اور فرشتہ صفت ہونا چاہیے۔

دوسری بات ہمارے ذہن میں رچ بس گئی ہے کہ ہر اچھا آدمی اچھا ہے اور ہر برا آدمی بالکل برا ہے۔ حالانکہ اچھے آدمی کی اچھائی اور برے آدمی کی برائی دونوں کا رشتہ زندگی کی قدروں سے جڑا ہوا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی برے آدمی میں کوئی اچھائی اور کسی اچھے آدمی میں کوئی برائی موجود ہو۔ اس نہج

پر سوچنا ہماری قدروں کے منافی ہے اس نظریہ کے مطابق بظاہر کوئی نقصان نظر نہیں آتا۔ لیکن غور کرنے پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ نظریات ادیب کی فکر اور اس کی فنی شخصیت پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ نظریہ کا یہ عمل شخصی گہرائی سے کئی نتائج نکالنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ یہ بات کون نہیں جانتا کہ سعدیؒ نے گلستاں اور بوستاں میں بہترین اخلاقی نکتے پیش کیے ہیں۔ لیکن اسی سعدی کی گلستاں کے باب پنجم میں اخلاقی تعلیم سے منسوخ تحریر کو ایک طبقہ مخرب اخلاق سمجھتا ہے یا میر جیسا بلند اخلاق آدمی یہ شعر کہنے پر کیوں مجبور ہوا۔ ؎

زلیس ہم کو نہایت شوق ہے امرد پرستی سے
جہاں جاویں وہاں ایک آدھ کو تاک رکھتے ہیں

داغ کے یہاں عریانیت اور جرأت کے یہاں لذتیت کیوں ہے؟ وہ کون سا جذبہ ہے جو درد کو صوفیانہ مسائل کی طرف مائل کر دیتا ہے اور وہ کون سا احساس ہے جو نظیر اکبر آبادی سے جاڑوں کا شباب دیکھ کر یہ اشعار کہلاتا ہے ؎

جب ایسی سردی ہوئے دلا تب روز مزے کی گھاتیں ہوں
کچھ نرم بچھونے مخمل کے کچھ عیش کی لمبی راتیں ہوں
معشوق گلے سے لپٹا ہو اور کہنی چٹکی لاتیں ہوں
کچھ بوسے ملتے جاتے ہوں کچھ میٹھی میٹھی باتیں ہوں
دل عیش و طرب میں جلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

وہ کون سی سماجی کمزوریاں ہیں جن کے تحت عصمتؔ اور منٹوؔ جنسیاتی حدود میں قید ہو جاتے ہیں۔ یا وہ کون سے اصلاحی جذبات ہیں جو اکبرؔ کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتے ہیں ؎

قدیم طرز پہ قائم رہو اگر اکبرؔ
تو صاف کہتا ہے سیّد یہ رنگ ہے میلا

جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
تو اپنی قوم مچاتی ہے آہ واویلا

ہمارے مورخین ان کا ردِ حساس کی گہرائی میں نہیں جاتے۔ بلکہ عقیدت مندی کی بنیاد پران

کے عیوب سے چشم پوشی کر جاتے ہیں۔ ان کی فکری رسائی کسی ادیب یا شاعر کی ذہنی اور جنسی تحریک کی ان خوبیوں اور خامیوں تک نہیں پہنچتی جسے مخرب اخلاق یا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی سبب ایسے ابہامات اور گتھیوں کو آئینے کی طرح روشن کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جہاں ادیب میں اپنی انفرادی قوت کا حجم کم کرنے اور زندگی کی تلخیاں یا خوشگوار لمحوں کا براہِ راست ہوا کرتا ہے۔ وہ ایسے مقامات پر ادیب کی انفرادیت صاف نظر آتی ہے۔

عقیدت مندی یا ذاتی مطالعہ کی روشنی میں ہمیشہ ہم نے آرٹ کو انفرادی یا روایتی جانا ہے۔ حالانکہ آرٹ خود آرٹسٹ کی انفرادیت کا نتیجہ ہے۔ اور گردوپیش کے ماحول سے تصادم کا ذاتی مشاہدہ ہے۔ جو آرٹسٹ سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ فن کو محض فن بنا کر پیش نہ کرے اور اپنی عاشقیت پرستی سے پیچھا چھڑا کر آفاقی جذبے کے تحت۔ ایک عام انسان اور اس کے زندہ رہنے کی جدوجہد جو زندگی سے منسلک ہے اس فن میں مشاہداتی جذبے کے ساتھ پیش کرے۔

ہمارے قدیم فنکاروں میں فن برائے فن کی حمایت کا جذبہ حالات کے مطابق سرایت کر گیا تھا۔ ان کی تخلیق پر نظر ڈالتے وقت ان کی زندگی اور گردوپیش کو فراموش کرنا منصفانہ اقدام نہیں ان کا یہ عمل شعوری یا غیر شعوری ہو۔ مگر اس میں ان کے ماحول اور ان کی کشمکش کا زبردست ہاتھ ہے آج کی روایت ان کیلئے حقائق کا تقاضا تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی روایات سے بھرپور زندگی کو کچھ مشکلات درپیش ہیں کیونکہ انفرادی زندگی پر قطعیت کے ساتھ کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ اس لیے وہ یکسانیت کے رنگ میں اتنے گہرے رنگے ہوئے ہیں کہ ان کے کلام سے ہرگز پتہ نہیں چلتا ہے کہ کسے واقعی عشق تھا۔ اور کون محض رنگی لفاظی کا شکار تھا۔ سب کے جذبات اور حسیات میں یکسانیت ملے گی۔ ان کے یہاں ہجر و وصال کے قصے ایک جیسے ہوں گے۔ ہجر میں سب کو ایک ہی طرح کی تمام دشواریوں کا سامنا ہے۔ سب کا معشوق بے وفا اور وعدہ شکن ہے۔ سب کا سراپا ایک ہوگا۔ سب کی معشوق خوبصورتی کا مثالی نمونہ ہے۔ ان مشکلات کے روبرو ہمارے مورخین جو کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ صحیح طور پر شاعر یا ادیب کے فن کو سمجھ نہیں پاتے۔ لیکن یہاں ایسا لگتا ہے کہ ہمارے مورخین زیادہ تر یہیں پر ٹھوکر کھا بیٹھے ہیں۔ اور اسی لکیر کو " فن " کہا جاتا ہے۔

تاریخوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے مورخین شاعر کا کلام دیکھتے وقت یہ

ہی چیز کو مد نظر رکھتے ہیں۔ اس کے نزدیک فنکار نے کہاں تک فن کی تکمیل کی اور فنی اصولوں کو اس نے کہاں تک نبھایا۔ اضافت کی غلطیاں کہاں کہاں ہوئیں۔ تقطیع کے اعتبار سے حرف کہاں گرتے ہیں کہاں پر شتر گربگی پیدا ہوئی۔ مصرع کا رخ کیسا ہے؟ کون کون سی رعایتیں ہیں روانی، سلاست اور واردات قلبی کا بیان مکمل اور جامع ہے یا نہیں۔ ان چند چیزوں کو ہمارے مورخین اور رجعت پسند نقاد مستردوں کی طرح دہراتے آئے ہیں۔ اس سے ذرا آگے آئیے تو تقابلی تنقید سائنٹیفک تنقید تاثراتی تنقید اور نفسیاتی تنقید کے نام پر نقادان سخن کے ساتھ مورخین بھی زمین پر رد کر خارجیت کے نام پر داخلیت کا تجزیہ کرنے لگے لیکن مطمح نظر معیاری طور پر وہی رہا ورد ذہنیت کی کارفرمائی وہی عمل کرنے پر آمادہ ہوئی کہ ہر ادیب ہر فن کا احساس، جذبہ اور اکتسابی قوت کا وہی عمل ہو جو ان سے پہلے گزرے ہوئے فنکاروں کا تھا۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ ہر دوسرے دور کا ادیب یا شاعر اپنے سے پہلے دور کے ادیب و شاعر کی طرح کیوں سوچے۔ یا اُس کے نظریات سو دفعہ پہلے کی طرح کیوں ہوں۔

کروچے کا یہ قول "آرٹ الہام ہے، اور الہام انفرادیت۔ اور انفرادیت دہرائی نہیں جا سکتی۔"
اس خیال کے مطابق یہ سوچنا بیکار ہے کہ ایک انفرادی خصوصیت جو آپ کو پسند ہو اور پچھلے دور میں موجود ہو آج کے فنکار سے آپ اس کو طلب کر رہے ہیں۔ ہم ایسے حالات میں اپنے تقاضے کے مطابق مادے کی حرکت اور زمانے کی رفتار کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ گویا ہم چاہتے ہیں کہ فن جس طرح بھی خام یا پختہ شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ بس اسی طرح قائم رہے۔ اس میں کسی قسم کا رد و بدل یا افکار کی تبدیلی کو ہم گوارا نہیں کر سکتے ان اصولوں کے مطابق ہم ہمیشہ عمر رفتہ کو آواز دینے کے قائل ہیں۔

ہمارے مورخین کو ایسی باتوں سے کوئی [illegible] کہ ادیب [illegible] سماج کے سماجی ضرورتوں سے ہمنگ مشکلات اور ان کا حل پیش کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ اور کہاں تک ایسے مسائل سے چشم پوشی کر کے راہ فرار اختیار کی، یا چشم پوشی کا یہ عمل جبراً تو نہیں کیا گیا۔ یا ادیب کی ذہنیت میں فرسودگی اور خوشامد کا انداز کیونکر آیا۔ اسے ایسی ضرورتوں سے انکار، یا وہ فن کو خود فریبی کا شکار بنانا چاہتا ہے اس نے کہاں پر ضمیر فروشی کی ہے اور کہاں پر ضمیر فروشی کروائی گئی ہے۔ اور ایک مورخ ان سب باتوں کی وضاحت صحیح انداز میں پیش نہیں کر رہا ہے تو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اسے ادب کا مورخ

ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

ہمارے مورخین میں ایک ذاتی کمزوری بھی ہے اور یہ کمزوری رجحان کے طور پر ان کی وراثت بن گئی ہے یعنی شخصیت پرستی ہمارے مورخ عقیدت مندی کے جذبے سے سرشار ہو کر شخصیت پرستی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور اسی عقیدت مندی کی بنیاد پر شخصیت دشمنی بھی کرنی پڑتی ہے۔ جہاں عقیدتمندی بے حد متاثر کرنے کے سبب عقیدت مندی شخصیت پرستی کا شکار بناتی ہے۔ وہاں فنکار کی کوئی خرابی خوبی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہی شخصی دشمنی کی خوبی خامی میں بدل جاتی ہے یا کسی فنکار سے معنت میں دشمنی مول لے لی جاتی ہے اور اس کی تمام خوبیوں پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔ اور اس کی خوبیوں کو بھی اس انداز میں سپرد قلم کیا جاتا ہے کہ وہ خرابی معلوم ہو۔ اس کی بہترین مثال "آب حیات" میں ذوق و غالب کا تذکرہ ہے اس کے علاوہ یادگار غالب اور موازنہ انیس و دبیر تاریخیں نہیں، لیکن واقعات تاریخی حیثیت سے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ تینوں مصنف شخصیت پرستی کا شکار رہے۔ ان کے بعد کی کچھ تاریخیں ان ہی سے متاثر ہیں۔ جن میں غیر تحقیقی واقعات اور روایتی مقولوں کا ذخیرہ موجود ہے۔

ادب کی تاریخ واقعات کا مجموعہ اور روایات کا ذخیرہ نہیں ہوتی، اس میں مورخ کو نسل انسانی کے ارتقائی مدارج ہونے کے عمل کی ارتقائی جد و جہد اور ان کے نتائج کو اچھی طرح اور واضح طور پر سمجھنا ضروری ہے۔ ان منازل پر مورخ کو واقعات کے ساتھ ملا کر ایک صحیح شکل کی ترتیب جو انسان کے اجتماعی، اقتصادی، ثقافتی ارتقا دینے تحویل واقف نہیں ہو گا۔ وہ ہرگز اچھا مورخ نہیں بن سکتا۔ عملی طور پر انسان کی مادی ترقی ممکن ہے چاہے وہ اقتصادی اور کچھ بھی ہو۔ ایسی ترقی کی منزل نامعلوم سے معلوم کی طرف بڑھتی ہے لیکن محض تصور پرستی کی کوئی ترقی نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی انسانی جماعت ایسی باتوں سے کوئی فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ ہمارے مورخ زیادہ تر اسی کمزوری کا شکار رہیں نہ وہ مادے کی گوناگوں صلاحیتوں سے واقف ہیں نہ اس کی کارکردگی کو انسانی ترقی کا جزو مانتے ہیں۔ اسی سبب ان کا تنقیدی میلان بہت کچھ تصور پرستی کی طرف رجوع ہے۔ جو چند محدود اصولوں کا پابند ہے اور ایسے اصولوں سے وابستہ تنقیدیں اور تاریخیں عمل کے میدان میں بالکل ناکارہ ثابت ہوتے ہیں کیونکہ ایسے اصولوں کے تحت مورخین یا تو ان کے موافق رائے دیتے ہیں

جنھوں نے تصور پرستی سے کام لے کر حسنِ تخیل کو بلندی کہا ہے یا اُن کے خلاف غم و غصّے کا اظہار کریں گے جو خیالات کی چوٹیوں پر نہیں پہنچے۔ کیونکہ مورخین کا عمل میدان تصورات پر قائم ہے۔

جدید ادب کا بیشتر حصّہ اس وقت سرسید تحریک، رومانوی تحریک اور ترقی پسند تحریک کا مرہونِ منت ہے۔ اور ان تحریکوں سے وابستہ شاعر و ادیب حقیقتوں کا متلاشی رہا ہے۔ ادب برائے ادب کے بعد ادب برائے زندگی کا دور تھا۔ لیکن تصورات کی دیواروں پر تنقید و تاریخ کے محل تعمیر کرنے والے مورخین اپنے زمانہ میں ان پر مختلف اقسام کے الزامات لگا کر انھیں فنکار ماننے سے انکار کرتے رہتے تھے۔ کیونکہ اقدار کی شکست و ریخت سے پیدا ہونے والا فن انقلابی ہوتا ہے اور اس دور کے فنکار کو مفکر اور سیاست داں ہونا ضروری ہے کیونکہ فنکار ایک مقام پر منجمد حالات میں ساکت نہیں ہو سکتا۔ اور یہی ہوا کہ اس دور میں ان مورخین نے ناانصافی کی۔ فنکاروں کے فن کو عیاں کرنے میں جانبداری کا ثبوت دیا - لیکن جس وقت یہ عوامی جذبوں میں فن کی صورت میں جذب ہو گئے۔ اس وقت ان کے قصیدے لکھنے پر جدید ادب کے نام پر بت شاعری اور کھلی شر انگیزی کا وجود ہوا لیکن اس فن کو ترقی پسند ماننے کو تیار نہ ہوئے۔ اور موجودہ تاریخوں میں ابھی ان کا مقام متعین نہیں ہوا۔ ہمارے مورخین انھیں کیا سمجھتے ہیں ابھی یہ مسئلہ سامنے نہیں آیا لیکن اس ادب سے عوام متاثر ہیں۔

غرضیکہ ہمارے مورخین کو تاریخ کی تدوین میں مندرجہ بالا باتوں پر بہت احتیاط سے گامزن ہونا ہے ورنہ تاریخ کے نام پر شخصیت پرستی کا مظاہرہ، ذاتی مشغلہ کے مطابق فن کو پرکھنے کا اصول یہ تمام چیزیں ہمارے مورخین کے لیے ازحد خطرناک ہیں۔ یہی باتیں علاقائی تاریخوں کے علاوہ علی گڑھ کی "تاریخ ادب اُردو" اور جمیل جالبی کی "تاریخ ادب اردو" میں آج بھی موجود ہیں۔ جمیل جالبی نے تو شخصیت پرستی کی بنیاد پر عقیدت پرستی کا ایک راستہ تاریخوں میں ذاتی رائے کی صورت میں نکال لیا ہے۔ لیکن شخصیت پرستی میں وہ اپنے سے پچھلوں سے دو قدم آگے نکل گئے۔

"تاریخ ادب اردو" حصّہ اول میں ولی اور سراج۔ ملا وجہی پر ان کے بیانات اس کا ثبوت ہیں۔ حصّہ دوم میں میر اور سودا کی عقیدت مندی سے یک طرفہ رائے قائم کی گئی ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری تاریخیں اصول و ضوابط کی روشنی میں آج تک بالغ نہیں ہو پائیں۔ کیونکہ ہر مورخ اپنے سے اگلوں کا رونا رو کر لاشعوری طور پر ان کا مقلد بن جاتا ہے۔ یہ تقلیدی عمل ہماری تاریخوں سے وابستہ نظریات اصول اور ضوابط کو مجروح کر دیتا ہے۔

ادبی تاریخوں کا
نصب العین، مقاصد، اصول و ضوابط کا نچوڑ

ادبی تاریخوں کا نصب العین، تاریخ نگاری کا مقصد اور ہماری ادبی تاریخوں کا اصول اور ضوابط کی روشنی میں تعین ادبی تاریخوں کی تیاری، اشاعت و طباعت میں مصنف، مؤلف، مرتب کو کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ محقق اور نقاد کو مواد سپرد قلم کرتے وقت کن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے حوالوں اور ماخذ کے لیے کن احتیاطی تدابیر کو اپنانا چاہیے۔ مذکورہ مضامین میں ان باتوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ہماری تاریخوں میں ادبی تاریخیں، تدریسی، درسیاتی تاریخوں میں عام اغلاط کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ تاریخ نگاری کے نصب العین، اصول و ضوابط ذہن نشین ہو جائیں۔ ہماری تاریخوں میں عام طور پر شخصیات اور شاعرانہ خصوصیات کو زیادہ سراہا گیا ہے۔

ادبی تاریخوں کا نصب العین کیا ہے؟ اور کیا ہونا چاہیے؟ تاریخ نگاری کا مقصد ہم نے کیا سمجھا؟ اور کیا ہونا چاہیے؟ ان تمام نکات کی طرف اس باب میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ہماری ادبی تاریخوں کو اصول اور ضوابط کی روشنی میں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں بہت سی خامیاں ہیں۔ اور وہ ان تقاضوں کو پورا نہیں کرتی ہیں۔ جن سے انھیں مکمل کیا جا سکے۔ ایسی تمام خامیوں اور کمزوریوں جن سے تاریخی نصب العین اصول اور ضوابط کا چہرہ مسخ ہوا ہے۔ انھیں اس باب میں ہم نے نمایاں طور سے اجاگر کیا ہے۔

ہمارے ادب میں تاریخ نگاروں کے نصب العین اور تاریخ نگاری کے مقاصد سے اکثر چشم پوشی کی گئی ہے۔ اصول اور ضوابط سے کسی حد تک اتفاق نظر آتا ہے۔ لیکن وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔ اکثر مقامات پر ہماری اہم ادبی تاریخیں بھی تذکروں کا آئینہ نظر آنے لگتی ہیں۔ ایسے تمام سوالوں کو اس باب میں اٹھایا گیا ہے۔ اور ان تمام خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

ہماری تاریخ نگاری کی اہمیت یا انفرادیت کا قائل خود بخود اس میدان میں ہو جاتا ہے

۔ جہاں ہم معتبد حوالوں کا ماخذ، تذکروں سے حاصل کرتے ہیں اپنے کرفد حوالوں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے منطقی دلیلیں ڈھونڈتے ہیں۔ اور تاریخ نگاری میں منطقی دلیلیں سب سے زیادہ تاریخی کردار کو متاثر کرتی ہیں۔ اس باب میں تینوں مضامین کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

باب چہارم ۴

(الف) ادبی تاریخوں پر تنقیدی تبصرہ

نمبر	کتاب	مصنف	سنہ
۱۔	داستانِ اردو	نصیر الدین خاں خیال	سنہ ۱۹۰۶ء
۲۔	سیر المصنفین	مولوی یحییٰ تنہا	سنہ ۱۹۲۶ء
۳۔	اُردوئے قدیم	حکیم شمس اللہ قادری	سنہ ۱۹۲۵ء
۴۔	اُردو زبان پر انگریزی ادب کا اثر	سید عبداللطیف	سنہ ۱۹۲۵ء
۵۔	مراۃ الشعراء (جلد اول)	مولوی عبدالرحمٰن	سنہ ۱۹۲۶ء
۶۔	تذکرہ یورپین شعرائے اردو	محمد سردار علی	سنہ ۱۹۲۷ء
۷۔	ارباب نثر اردو	سید محمد	سنہ ۱۹۲۷ء
۸۔	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	سنہ ۱۹۲۸ء
۹۔	تاریخ نثر اردو	مولوی احسن مارہروی	سنہ ۱۹۳۰ء
۱۰۔	اردو لٹریچر	ڈاکٹر گراہم بیلی	سنہ ۱۹۳۳ء
۱۱۔	تاریخ نظم و نثر	آغا باقر	سنہ ۱۹۳۲ء
۱۲۔	مغل اردو	نصیر الدین خاں خیال	سنہ ۱۹۳۴ء
۱۳۔	نقوش سلیمانی	سید سلیمان ندوی	سنہ ۱۹۳۹ء
۱۴۔	اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام	مولوی عبدالحق	سنہ ۱۹۳۹ء
۱۵۔	ہندو ادیب	ناظر کاکوروی	سنہ ۱۹۳۹ء
۱۶۔	داستان تاریخ اردو	سید حامد حسن قادری	سنہ ۱۹۴۱ء
۱۷۔	نظم اردو، منظوم تاریخ ادب اردو	حکیم ناطق لکھنوی	سنہ ۱۹۴۱ء
۱۸۔	اردو فارسی کے یورپین شاعر	رام بابو سکسینہ	سنہ ۱۹۴۴ء
۱۹۔	اردو اور فارسی کے یورپین شاعر	سردار علی	سنہ ۱۹۶۱ء

۲۰۔ اردو کے ہندی ادیب — سید قاسم علی — سنہ ۱۹۴۴ء

۲۱۔ دورِ جدید کے چند منتخب شعراء ہندو ۔ مولوی عبدالشکور سنہ ۱۹۴۴ء

۲۲۔ یادگار شعراء — ڈاکٹر اسپرنگر — سنہ ۱۹۴۴ء

۲۳۔ مراۃ الشعراء جلد دوم (دوسرا ایڈیشن) ۔ مولوی عبدالرحمٰن سنہ ۱۹۴۹ء

۲۴۔ آرٹ ان پوئٹری — شباب الدین رحمت — سنہ ۱۹۴۹ء

۲۵۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرم علی — نادم سیتاپوری — سنہ ۱۹۵۶ء

۲۶۔ تذکرہ یورپین شعرائے اردو — خواجہ محمد یوسف — سنہ ۱۹۶۱ء

۲۷۔ تاریخ ادب اردو علی گڑھ — مرتبہ شعبۂ اردو علی گڑھ — سنہ ۱۹۶۲ء

۲۸۔ تاریخ ادبیات اردو — ڈاکٹر محمد صادق — سنہ ۱۹۶۴ء

۲۹۔ تاریخ ادب اردو (حصہ اول) ڈاکٹر جمیل جالبی — سنہ ۱۹۸۱ء

۳۰۔ تاریخ ادب اردو (حصہ دوم) ڈاکٹر جمیل جالبی — سنہ ۱۹۸۳ء

۳۱۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات — ڈاکٹر عبیدہ خاتون — سنہ ۱۹۸۳ء

۳۲۔ اردو کے غیر مسلم شعراء و ادیب ۔ جگدیش مہتا — سنہ ۱۹۷۳ء

۳۳۔ اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ ۔ سید نصرت — سنہ ۱۹۸۴ء

۳۴ ہماری ادبی تاریخوں پر ایک نظر

داستانِ اردو

نصیر حسین خاں خیال

نصیر حسین خاں خیال کی تصنیف "داستانِ اردو" ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں منعقدہ کانفرنس کے صدارتی خطبہ کا خلاصہ ہے۔ پیش لفظ میں محمد اقبال سلیم گاہندری کا بیان اس کا ثبوت ہے۔

"۱۹۱۶ء میں آپ جب اردو کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کے صدر منتخب ہوئے اور اس موقع پر آپ نے جو خطبہ سنایا وہ آپ کی ضخیم تصنیف "داستانِ اردو" کا مکمل خلاصہ ہے۔"[۱]

"داستانِ اردو" ۱۵۰ صفحات پر محیط اردو کا لسانی خاکہ ہے۔ مصنف کا انداز بیان داستانی ہے ابتداء میں اقوامی عروج و زوال کے پیش نظر آریہ اور یونانی زبانوں کی تاریخ کا مختصراً بیان ہے۔ عربی فارسی، پالی، ترکی، بھاکھا، برج بھاشا، سندھی اور دوسری پراکرتوں کا تذکرہ کیا ہے اور اردو کو برج بھاشا کا دوسرا روپ ثابت کیا ہے۔

"ہماری بھاشا کی یہی وہ تدریجی ترقی و وسعت تھی جس نے پردیسیوں کو بھی پرچا کر اپنا کر لیا تھا۔ اور ان کی بے تکلف زبانوں سے آخر ایک نیا خطاب (اردو) پا کر اسے تسلیم کر لیا۔"[۲]

"ترکی سنسکرت اور فارسی کا ایک خاندان بتا کر اردو کو ان زبانوں سے متاثر بتلایا ہے۔ اور اسے اپنے عہد کی عوامی زبان کہا ہے۔"

"ترکی، ہندی اختلاط اور صدیوں کے میل ملاپ سے بھاشا نے کیچلی اتار کر جو صورت نکالی اس کا نام اردو ہے۔"[۳]

اردو زبان کے ارتقاء میں اکبر اعظم سے فورٹ ولیم کالج کے قیام تک مختلف شعراء اور دکنی اردو کے ارتقاء میں زبان قطب شاہی عہد کا ذکر کیا ہے۔ ۱۸۳۵ء میں اردو سرکاری زبان قرار پائی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اسپرنگر کی نگرانی میں دلی کی اردو سوسائٹی اور سائنٹفک سوسائٹی کو ارتقاء کا اہم ذریعہ بتلایا ہے۔ آخر میں آریہ اور دراوڑی زبانوں کا تذکرہ یورپین شعراء کی تخلیق، مہابھارت

---

[۱] داستانِ اردو ۔ نصیر حسین خاں خیال ۔ ص ۵ (پیش لفظ محمد اقبال گاہندری)

[۲] داستانِ اردو ۔ نصیر حسین خاں خیال ۔ ص ۳۱-۳۰ [۳] ایضاً ص ۵۹-۵۸

زبان کی شہرت پر تفصیلی بحث کیا ہے۔ اس تاریخ میں درج ذیل بیانات سند کے متقاضی ہیں۔

(۱) خسروؔ کی تصنیف پر لکھتے ہیں "یہ خالق باری حاکم و محکوم دونوں کے دل کا آئینہ بنی۔" ص۳۲

(۲) بابر کو اردو کا شاعر لکھا گیا ہے۔ ص۴۴

(۳) "شاہجہاں کو اردو پر وہی دعوئی ہے جو کسی صناع کو اپنی صنعت و کاریگری پر ہو اکرتا ہے۔"

(۴) "عالمگیر اب ترک نہیں بلکہ اچھا خاصہ ہندی تھا۔" ص۵۹

(۵) اردو کی پیدائش کا خاص مقام دلی بتایا ہے۔ "دکنی اپنا ادب ساتھ لائے تھے دلی والے اپنے بچے کو غیروں کی گود میں دیکھ کر اس طرح شرمائے اور پھر متوجہ ہوئے تو حق پدری ادا کرنے لگے۔" ص۳۰

(۶) اردو ارتقاء سے متعلق ذیل کے علاقوں اور شخصیات کو نظر انداز کیا گیا۔ گجرات، پنجاب، ولی دکنی، خوب محمد چشتی، شاہ باجن وغیرہ۔

اس کتاب میں اردو کو برج بھاشا کا روپ لکھا گیا ہے۔ جو محمد حسین آزاد کا نظریہ ہے لیکن مصنف نے ان کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔

خسروؔ کی غرۃ الکمال کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

بابرؔ، اکبرؔ، جہانگیرؔ، اورنگ زیب، شاہجہاںؔ سب کو اردو کا سرپرست ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"داستانِ اردو" میں اردو کے ارتقاء کا صحیح خاکہ نہیں ابھرتا۔ لیکن اپنے عہد کے تقاضوں کے اعتبار سے یہ کتاب اس دور میں مزید معلومات کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ کتاب کی یہ کامیابی اپنے مقصد کو پورا کرتی ہے۔ تحقیقی طلبا کے لیے ایک نظریہ کی تصدیق ہے اسلوب کی فضا کارنگ محمد حسین آزاد کی یاد دلاتا ہے۔

سیر المصنفین

مولوی محمد یحییٰ تنہا ۱۹۲۲ء

مولوی محمد یحییٰ تنہا کی یہ تالیف پہلی مرتبہ ۱۹۲۲ء میں منظرِ عام پر آئی۔ دوسری مرتبہ ۱۹۲۴ء میں طبع ہوئی۔ لیکن دوسری طباعت کے دوران اس پر نظرِ ثانی کی گئی اور اس درمیان موضوع کے مطابق کتابوں اور مضامین سے استفادہ کیا گیا۔

یہ نثری تاریخ ہے۔ مؤلف نے نثر نگاروں کے دو دور قائم کیے ہیں۔ پہلا دور ۱۷۷۵ء سے ۱۸۲۰ء تک دوسرا دور ۱۸۲۱ء سے ۱۸۵۷ء تک۔ باقی دور آئندہ جلدوں میں پیش کرنے کا وعدہ تھا۔ جو ایفا نہ ہو سکا۔ ہر دور کی روایت کے مطابق کتاب کی ابتداء اردو کی پیدائش سے کی گئی ہے۔ ۲۵ صفحات میں یہ ذکر ختم ہوتا ہے جس میں قدیم اردو کا ایک باب ۸ صفحات پر حاوی ہے۔ پھر اردو کا "عالمِ طفولیت" ۲ صفحات پر محیط ہے۔ ب ۱۷۷۵ء سے ۱۸۲۰ء تک کا پہلا دور شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا دور ۱۸۲۱ء سے ۱۸۵۷ء تک ہے۔ جو ۲۴۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

اس کتاب میں قدیم اردو کے نام پر بعض ایسے ناموں اور کلام کا ذکر ملتا ہے جن کی صداقت محققین کی نظر میں آج تک مشکوک ہے۔

امیر خسروؔ سے بعض پہیلیاں اور مکرانیاں منسوب ہیں جو اس دور سے آج تک ثابت نہیں ہو سکیں ہیں کہ یہ خسروؔ کی تصنیف ہیں۔

معراج العاشقین خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب کی گئی ہے۔ یہ ان کی تصنیف نہیں ہے کیونکہ معراج العاشقین کے مرتب مولوی عبدالحق نے دیباچہ میں یہ شبہ ظاہر کیا تھا کہ یہ تصنیف خواجہ بندہ نواز کی ہے نئی تحقیق سے یہ یقینی ہو گیا ہے کہ معراج العاشقین، شکار نامہ، معراج نامہ وغیرہ تصانیف خواجہ بندہ نواز کی نہیں ہیں۔

عین الدین گنج العلم (ولادت ۱۳۰۶ء) کے ذکر میں اردو یا دکنی ... لیے گئے ہیں مگر کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔ اور آج تک یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی۔

"اردو زبان کی پیدائش" کے بیان میں ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ

"لیکن اس مخلوط زبان کا نام اردو ہونے سے یہ نہ سمجھنا کہ یہ زبان شاہجہاں کے زمانے

سے رائج ہوئی ہے۔ جیسا کہ ہم قبل ازیں لکھ چکے ہیں "یہ مخلوط اور مشترک زبان عربوں کی فتوحات سندھ ہی سے معرض وجود میں آگئی تھی اور رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی رہی۔"[1]

یہ خیال غلط ہے کسی علاقائی زبان میں فاتح قوم کی زبان کے کچھ لفظ شامل ہو جانے سے کوئی تیسری زبان پیدا نہیں ہو جاتی۔

"تحفۂ عاشقاں"

کا سنہ تصنیف غلط ہے۔

محمد ملک جائسی کی پدماوت (داستان نظم) کے تعلق سے یہ اطلاع غلط ہے کہ جائسی نے اس نظم میں عربی و فارسی کا ایک لفظ نہیں آنے دیا۔

میر شیر علی افسوس کی کتاب ایک فہرست اس دور کے مطابق متروک لفظ کی بنائی ہے۔ اس میں ایک لفظ "پھساوا" ہے جو آج تک تحریر و تقریر دونوں میں استعمال ہوتا ہے "کھوسا" کے معنی کھوسٹ کے بتائے ہیں۔ لیکن اس دور میں "کھوسا" ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کی جوانی میں بھی داڑھی نہ نکلے۔ یہ لفظ آج بھی خال خال استعمال ہوتا ہے۔ "اڑنگا" کے معنی باعث لکھتے ہیں۔ لیکن یہ بھی غلط ہے۔ اس کے معنی پناہ، سہارا، پشتی ہیں۔ ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو آج تک مستعمل ہیں۔ تنہاؔ نے اس دور میں انھیں غیر مستعمل قرار دے دیا تھا۔

کاظم علی جواں کی کتاب "شکنتلا" کے بیان میں لکھتے ہیں "بعض محاورے مثلاً ... "دبلاپے سے لٹا تھا۔" یہ لٹا نہیں بلکہ لٹا تھا ہے۔ جس کے معنی کمزور نحیف، دبلا، اور فاق ہونا ہے۔

مثری للو لال کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس نے "فصیح ہندی نثر کی بنیاد ڈالی اور متعدد کتابیں لکھی۔ اور فی الحقیقت ہندی نثر کے حق میں مسیحائی کی۔"

فورٹ ولیم کالج میں جان گلکرائسٹ کی فرمائش پر سدل مصرا اور للو لال نے ہندی نثر کی روش قائم کی۔ اس میں مزید تفصیل کی ضرورت تھی۔ آج کا قاری اسے سمجھنے سے قاصر ہے۔ تاریخی حقائق ہر دور میں اپنے دور کی نمائندگی کرتے ہیں کیونکہ اس واقعہ کے پیچھے

---

[1] سیر المصنفین جلد اوّل۔ مولوی محمد یحییٰ تنہاؔ صہ۲۹

ایک گہری سازش تیار کر رہی تھی اس لیے اس کا انکشاف ضروری تھا۔ یہ کام جن کی فرمائش پر ہوا تھا۔ مسٹر (Key)[۱] مصنف "تاریخ ہندلٹریچر" کی رائے ہندی آسان ہندی کے تعلق سے ملاحظہ کیجیے۔

"اردو میں بہت سے لفظ عربی فارسی کے ایسے تھے جن کا تعلق اسلام سے تھا۔ لہٰذا ایک ایسی زبان کا بنانا مناسب معلوم ہوا جو ہندوؤں کو پسند آئے۔ اس لیے یہ کیا گیا کہ اردو زبان کو سامنے رکھا گیا اور اس میں سے عربی فارسی الفاظ خارج کر کے سنسکرت یا ٹھیٹ ہندی کے لفظ داخل کر دیے گئے۔"

یہی خیال اسی زبان کے متعلق پنڈت چندر دھر شرما گلیری صاحب نے اپنے مضامین میں ظاہر کیا ہے

اس کتاب میں ایسے حضرات کا ذکر بھی ملتا ہے جنھوں نے اکثر اوقات مذہبی مسائل یا کسی دوسرے موضوع پر کوئی مضمون لکھا ہوگا۔ اور بعض تو ایسے بھی ملیں جنھوں نے اپنی زندگی میں ایک دو خط اردو میں ثبت کیا ہو گا۔ یہ سیر المصنفین کی سب سے بڑی خامی ہے۔ دراصل تذکرے کی ایک بدعت کا نتیجہ ہے۔ ●●

---

۱ "تاریخ ہندلٹریچر" مسٹر key ص دیباچہ

اُردوئے قدیم

حکیم سید شمس اللہ قادری سنہ ۱۹۲۵ء

"تاریخ زبانِ اردو" یعنی اردوئے قدیم جس میں زبانِ اردو اور اس کے عہد بعید کی نظم و نثر کی مفصل تاریخ اور ترقیوں کا تذکرہ ابتدائی زمانے سے بارہویں صدی ہجری کے نصف اول تک مذکور ہے اور اس کے مخصوص قدیم شعراء اور مصنفین کے صحیح و معتبر حالات تحریر ہیں۔ جس کو حکیم سید شمس اللہ قادری ماہر علوم آثار قدیمہ نے عربی، فارسی، اردو، انگریزی، فرانسیسی، جرمنی وغیرہ کی مشہور و مستند کتابوں سے اخذ کر کے مرتب و مدون کیا۔"

یہ تمام مضامین مسلسل طور پر لسان العصر لکھنؤ سنہ ۱۹۱۰ء کے چار نمبروں میں شائع ہو چکی تھی۔ بعد میں سنہ ۱۹۲۵ء میں مصنف نے اردوئے قدیم کے نام سے کتابی شکل دیا۔ اب تک اس کے [illegible] ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ مد نظر ایڈیشن [illegible] مطبع منشی نول کشور واقع لکھنؤ کا طبع شدہ ہے۔

تاریخ زبانِ اردو کی ابتدا میں سنسکرت، پراکرت، شورسینی یا برج بھاشا کا ذکر کر کے آزاد کے نظریہ[1] کے مطابق اردو کو برج بھاشا کا منبع اور مخرج بتایا ہے۔ لفظ اردو کی تحقیق میں لشکر معنی بتا کر اسے لشکری بتایا ہے۔ نیز اردو کا دوسرا نام ریختہ بتا کر واضح کیا ہے کہ قدما نظم اردو کو ریختہ کہا کرتے تھے۔[1]

مسلمانوں کی آمد کی تاریخ میں ابتدائی حملوں کا ذکر حضرت عمر فاروقؓ کے عہد سے بتایا ہے۔ غزنوی عہد میں ہندوستان پر حملوں کا ذکر شہاب الدین غوری اور مختلف ادوار پر بحث کر کے اردو کی ابتدا کے متعلق اختلاف کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"برج بھاشا کا یہ تغیر کب سے شروع ہوا اور اردو زبان کی ابتداء کس زمانے سے ہوئی اس کی نسبت مصنفین سلف نے اختلاف کیا ہے۔"[2]

شیخ فرید گنج شکر کے جواہر فریدی کا ذکر کیا ہے۔ خواجہ بدر الدین اسحق، قطب الدین بختیار کاکی، شیخ سراج الدین عثمانؒ، خواجہ نصیر الدین چراغؒ، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، سید برہان الدین، جلال الدین

---

[1] "آب حیات" محمد حسین آزاد صفحہ ۲

[2] اردوئے قدیم حکیم شمس اللہ قادری صفحہ ۱ طباعت منشی نول کشور لکھنؤ ۱۹۶۷ء، [3] ایضاً صفحہ ۱

حسینی کا اردو کے ارتقاء میں ذکر کیا ہے۔ گجرات کے شیخ وجیہ الدین علوی، سید ہاشم بیجاپوری، کبیر کے دوہے، شیخ عبدالوہاب کے نثری اور شعری نمونے پیش کیے ہیں۔ امیر خسرو کے عہد میں زبان کے کچھ الفاظ بتا کر خسرو کو اردو کا شاعر لکھا ہے۔

سلطنتِ بہمنیہ کی تاریخ کے بعد دکنی مصنفین میں شیخ عین الدین گنج العلم کو اردو کا پہلا مصنف بتایا ہے۔ سید میر خوند علاؤ الدین حسینی، شیخ شمس الدین لاسعانی، شیخ بہاؤ الدین زکریا، شیخ منہاج الدین تیمی اور شیخ عین الدین کی "انوار الابرار" تصنیف کا ذکر ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ معراج العاشقین کے علاوہ ہدایت نامہ، عشق نامہ کا ذکر کیا ہے۔

سلطنتِ گجرات میں شاہانِ گجرات کے بعد اردو کا نام گجرات میں گوجری تھا کر سید علی کا کام دھنی خوب محمد چشتی کے امواج خوبی سے برہان الدین جانم کے رسالہ حجت البقاء سے اور شیخ بہاؤ الدین باجن کے خزائن رحمت سے مختلف نمونے پیش کیے ہیں۔ سید شاہ الحسینی گالوی دھنی بھنگ، خوب محمد چشتی، ہاشم علی برہانپوری سے امواج خوبی کا اردو ترجمہ نغماتِ حیات کے نام سے کیا ہے۔ اور ان پر تبصرہ کیا ہے۔

سلطنتِ قطب شاہیہ کے زیر عنوان قطب شاہیہ سلاطین کی تاریخ کے بعد قطب شاہیہ کا علمی مذاق میں سلطان قلی قطب شاہ، ملا احمد شریف و قولی خورشاہ قباد الحسینی، مرزا محمد امین، مرزا امین کی مثنویوں میں شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، ملک البروج، مطلع الانظار، قصائد کا دیوان گلستانِ نادر کا حوالہ دیا ہے جیسی قلی کی نہج البلاغہ کی شرح، سلطان عبداللہ کے نام سے برہان قاطع کے نام گنوائے ہیں۔

شعرائے گولکنڈہ، سلاطین قطب شاہیہ اور اردو شاعری کے عنوان کے تحت میں سلطنتِ قطب شاہی کے تین بادشاہ سلطان محمد قلی، سلطان محمد، سلطان عبداللہ کو اردو کے صاحبِ دیوان شاعر لکھا ہے۔ اور تفصیل سلطان محمد قلی قطب شاہ کی پیش کی ہے۔ ابوالحسن تاناشاہ کا ایک شعر لکھا ہے۔ احمد ملا کی لیلی مجنوں کی منظوم داستان ان کے معاصر فیروز اور محمود، ملا وجہی، ملا غواصی، ملا نظام الدین احمد تبریزی کی حدائق السلاطین، سید میراں حسینی، شاہ محمد جامی، ملا قطبی، ابن نشاطی کی پھولبن، جنیدی، طبعی، لطفی، فائز، اور شاہی مرزا کے مختصر حالات اور ایک دو شعر بطور نمونہ لکھا ہے۔

سلطنتِ عادل شاہیہ: سلاطین عادل شاہیہ کے نام مع سنین اور تاریخ پر روشنی ڈالی ہے سلاطین عادل شاہیہ میں زبانِ اردو کی سرپرستی میں مرحوم عادل شاہ اول دبستانی کو زبان اردو سے بہت دلچسپی

تھی۔ ان کے عہد میں اُردو شاعری کا خوب چرچا تھا۔

شعرائے بیجاپور میں شاہ میراں جی شمس العشاق، ملک خوشنود، رستمی، نصرتی، شاہ ملک، امین

سیوا، موتی، اور ہاشمی کے حالات اور کلام کے نمونے پیش کیے ہیں۔

شعرائے دکن مغلوں کے عہد میں: شہنشاہ اکبر نے جب دکن پر حملے شروع کیے تو اس دور میں مقیمی

عاجز، شفیقی، ذوقی، ہری، عشرتی، بحری، ہنر، ولی دکنی، وجدی، آزاد، ولی بیجاپوری، صنعتی

شعرائے اورنگ آباد میں ولی، ورنگ آبادی اور سراج اورنگ آبادی کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔

دہلی میں زبانِ اُردو: ملا عبدالواسع، ہانسوی کی لغات، مولوی خان فطرت، مرزا عبدالقادر بیدل

مرزا عبدالغنی قبول، شیخ شرف الدین مضمون، محمد شاکر ناجی، مصطفیٰ قلی خان یک رنگ، شرف علی خان

و شیخ ظہور الدین حاتم، پر مختصر معلومات کے ساتھ نظم کا باب ختم ہو گیا ہے۔

شر دوکی ہنداء دکن کے عین الدین گنج العلم اور سید محمد گیسو دراز بندہ نواز کے رسالہ معراج العاشقین

سے شروع ہوتی ہے۔ حضرت میراں جی شمس العشاق کے رسالے جل ترنگ کا گل باس، ملا وجہی کی سب رس پر

تفصیل سے لکھا ہے۔ شیخ برہان الدین غریب، شیخ رکن الدین، سید شاہ محمد قادری، شیخ امین الدین اعلیٰ،

شیخ محمود خوش دہاں، شاہ ولی اللہ قادری، شاہ حبیب اللہ قادری، سراد التوحید کے مصنف سید شاہ میر

کے نثر نگاروں کا ذکر کیا ہے۔

شمالی ہند میں نثر کی ابتداء میں فضلی کی دہ مجلس، محمد حسین کلیم ابن عربی، اور عطا حسین خان تحسین

کا ذکر کیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں اردو کی متعدد کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔

ضمیمۂ اول میں سعدی دکنی، دوم میں مولانا ضیا الدین بخشی، اور ان کی کتابوں کے نام دکنی کتابوں

کے ترجمہ میں حیدر بخش حیدری وغیرہ۔ ضمیمۂ سوم میں مولانا فتاحی کی دستورِ عشاق اور شبستانِ خیال

مولانا صرفی، بیجوذ، ملا جامی کی مثنوی کا ملک الصرع خواجہ محمد بیدل پر نثری دور کا خاتمہ ہوتا ہے۔

ملحقات میں دکنی اردو کے الفاظ کا املا اور مروجہ، ملا دیا گیا ہے۔ یک اچھا کام ہے۔ ہم عصر

کی تقسیم، دور اور زمنہ کے لحاظ سے شمس العشاق میراں جی، سید شاہ علی جیلنی، امین، سلطان محمد

قلی قطب، ملا احمد، میراں جیتی، ملا قطبی، غواصی، دولت، نصرتی، ابن نشاطی، شیخ ابن ادیب علی

فائز، ہاشمی، مقیمی، عاجز، عشرتی، بحری، ولی دکنی، ہنر، وجدی، ولی ورنگ آبادی، سراج

ان شعراء کا انتخابی کلام موجود ہے۔

اقتباسات تصانیف میں معراج العاشقین، سب رس، شمائل الانبیاءؐ، اسرار التوحید، معرفۃ السلوک، شرح مرغوب القلوب کے مختصر اقتباسات اخذ کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن، ۱۲۸ صفحات پر مشتمل تھا۔ اب ملحقات کے اضافے سے مزید ۱۰۶ صفحات بڑھ گئے ہیں۔

اس کتاب میں اکثر بیانات بے بنیاد اور غیر مستند ہیں۔ مثلاً

۱ــــ شیخ عبدالوہاب مولانا علی متقی برہانپوری کے مرید کے بابت لکھا ہے کہ "وہ حرم کعبہ میں بہ زبانِ اردو ہندیوں کو علوم دینیہ کا درس دیتے تھے۔" [1]

۲ــــ "علیم الدین گنج العلم کے رسالے مذہبی احکام و مسائل کے متعلق ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ قلعہ سینٹ جارج کی لائبریری میں موجود تھا۔" [2]

۳ــــ شیخ بہاء الدین باجنؒ کی تصنیف کا نام خزائن رحمت غلط ہے۔ "خزائن رحمت اللہ" ہونا چاہیے تھا۔ [3]

۴ــــ ملا وجہی کی مشہور مثنوی کا نام نہیں لکھا۔ بلکہ مثنوی کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں مشتری کے عشق و محبت کی حکایات کا بیان ہے۔ حالانکہ قطب شاہ کی عشق محبت کا بیان لکھنا چاہیے تھا۔ کیونکہ وہ بادشاہِ وقت تھا۔ مثنوی کا نام اسی کے نام سے شروع ہوتا ہے قطب مشتری [4]

۵ــــ گولکنڈہ، بیجاپور، اورنگ آباد کے شعراء کا تذکرہ تفصیل سے ملتا ہے۔ لیکن احمد آباد گجرات کے کسی شاعر کا ذکر دکنی ہوتے سے نہیں کیا گیا۔

بعض کتابوں کا حوالہ صرف فہرستوں کے اعتبار سے دیا گیا ہے۔

۶ــــ اردو نثر پر مختصر بحث کی گئی ہے۔ شمالی ہند، ابتدائی نثر کا ذکر صرف پانچ سطروں میں فضلی، محمد حسین کلیم، عطا حسین خاں تحسین اور کوئی نمونہ پیش نہیں کیا گیا۔

---

[1] اردوئے قدیم " شمس اللہ قادری ص ۲۸ مطبع نول کشور ۱۹۲۷ء

[2] ایضاً ص ۱۱۵

[3] ایضاً ص ۴۹

[4] ایضاً ص ۶۳

۷ ـــ فورٹ ولیم کالج سے منسلک نثر نگاروں کا ذکر نہ ہونے جیسا ہے۔ تتمۂ دوم میں صرف سید حیدر بخش باقی یوں دیکھیں یعنی نثر نگاروں کا ذکر ملتا ہے میر امن جیسے مشہور ادیب کی کارگزاری کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

۸ ـــ ولی کا ذکر پوری کتاب میں کہیں موجود نہیں۔ تاہم ملحقات میں انتخابِ کلام موجود ہے۔[1]

۹ ـــ شمالی ہند کے دورِ ثانی کے شعراء میں سودا، میر تقی میر، میر درد، میر سوز، قائم، یقین، میاں وغیرہ کا صرف نام گنوایا ہے۔ ان کے کوئی حالات درج ہیں۔ اور نہ بطور نمونہ اشعار پیش کیے گئے ہیں۔[2]

سنین وغیرہ کے بھی بہت اغلاط ہیں۔ لیکن اپنے عہد میں حکیم شمس اللہ قادری کی یہ کوشش اس لیے قابلِ تعریف ہے کہ ان سے پیشتر تحقیقی رویہ میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ اس لیے ۱۹۲۷ء میں یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں شامل تھی۔ اپنے عہد کے مطابق یہ تحقیقی کام بہتر تھا۔ یہ بات درست ہے کہ اس کتاب کے بعض بیانات بعد کی تحقیق کی روشنی میں غلط ثابت ہوئے۔

---

[1] "اردوئے قدیم" شمس اللہ قادری ص ۲۸ ملحقات مطبع منشی نول کشور ۱۹۲۷ء،

[2] ایضاً ص ۱۱۵

اُردو زبان پر انگریزی ادب کا اثر

سید عبداللطیف صاحب ۱۹۲۵ء

سید عبداللطیف صاحب بی۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) جو اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں پروفیسر تھے یہ ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جو ۱۹۲۵ء میں موصوف نے آکسفورڈ (لندن) یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے پیش کیا تھا۔ ۱۳۶ صفحات کی یہ کتاب لندن سے چھپی تھی۔ یہ تین حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصہ میں دیباچہ ہے جس میں انگریزی اثر سے قبل کے اردو ادب کا ذکر ہے جو صرف گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ دیباچہ کے علاوہ دو ابواب ہیں۔ پہلے باب میں اردو زبان کی تاریخ پر نظر ڈالی گئی ہے اور دوسرے باب میں اس کی خصوصیت کا بیان ہے۔ جس میں اردو پر انگریزی اثرات کی بحث ہے۔ اس باب میں ان ذرائع ابلاغ اور وسائل زبان کا ذکر ہے جن کی بدولت انگریزی کا اثر اردو تک پہنچا۔ تیسرے باب میں انگریزی اثر کے نتائج اردو پر کس طرح پڑے ان سے بحث کی گئی ہے۔ جس کے چار ذیلی ابواب ہیں۔

(۱) قدیم ادبی خیالات سے رجعت (۲) نظم میں نئی تبدیلیاں

(۳) نثر میں نئی تبدیلیاں (۴) جدید شان (ظاہر و باطن کے لحاظ سے)

اس کے بعد دو، ڈھائی صفحات کا خلاصہ ہے۔ جو کتاب کا لب لباب ہے۔

عنوانات کی تقسیم بہت اچھی ہے۔ ان کے زیر مطالعہ کوئی ایسی بات نہیں جو قابل ذکر نہ ہو۔ لیکن کتاب کا غور مطالعہ کرنے پر یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں ادبی، تحقیقی و تنقیدی نظر اور عمیق مطالعہ کا فکری سواد نہیں ہے۔ ہر بحث سرسری اور سطحی ہے۔ عام رائیں اور معمولی باتوں کا اعادہ کیا گیا ہے جو دوسرے تذکروں اور مضامین میں آچکے تھے۔ موضوع اور مضمون کے مطابق تقسیم در ترتیب بے شک قابل تعریف ہے۔ سرسید احمد خاں اور مولانا حالی کی تحریروں کا مستقل اثر اپنے عہد میں اردو زبان اور ادب پر مرتب ہو تھا۔ اسے بڑے حسن و خوبی سے تحریر کیا گیا ہے۔ جو دوسری کتابوں میں اتنے سلیقے سے نظر نہیں آتا۔ پھر بھی یہ تصنیف اپنے عہد میں ادب کی نمائندہ نہیں کہی جا سکتی تھی۔

اس کتاب میں ایسی غلطیاں ہیں جو ایک اردو کے مولف اور ادیب کے شایان شان نہیں ہے۔ شلاً "الہارون" مولانا شبلی مرحوم کی تصنیف لکھی گئی ہے۔ صفحہ ۹۲ اور صفحہ ۱۲۰

بعض مقامات پر اس کتاب کا ذکر شفتی کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ امانت کا نام امانت علی غلط لکھا گیا ہے اصل نام سید آغا حسن ہے۔ کچھ ایسے اداروں کا ذکر ہے جن کے ذریعہ انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ لیکن اس میں سب سے اونچا درجہ دائرہ معارف حیدرآباد کو دیا گیا ہے۔ یہ بیان کچھ صداقت پر مبنی نہیں ہے۔

مندرجہ بالا خامیوں کے باوجود یہ تصنیف تاریخی و تحقیقی جستجو میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس سے اخذ کردہ مواد کی مزید تحقیق کر لی جائے۔

مرآۃ الشعراء (جلد اول)

مولوی عبدالرحمٰن سنہ ۱۹۲۶ء

مولوی عبدالرحمٰن صاحب کی یہ تالیف دو جلدوں میں تقریباً ۱۱۰۰ صفحات پر محیط ہے۔ دیباچہ میں موصوف کا دعویٰ ہے کہ

"شاعروں کے حالات زندگی کو مختصر طور پر بیان کیا ہے۔"[۱]

لیکن ان کے کلام پر طویل بحث کر کے ان کی خوبیاں اور خامیاں حسن و قبح ظاہر کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ دونوں جلدوں کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ مولف نے متروکات کو واضح کرتے ہوئے استاد شعراء کے کلام میں اصلاح کے فرائض انجام دیے ہیں اکثر مقامات پر شعراء و شخصیات پر غلط بیانی سے کام لیا ہے کئی مقامات پر حوالے ندارد اور ماخذ غلط ہیں۔ اسلوب میں لگتا ہے کہ ہے مولانا محمد حسین آزاد کی پیروی کی ہے دونوں جلدوں میں دلی کی سن وفات پہ بے جا صفحات سیاہ کیے ہیں اور اپنی رائے منوانے میں ناکام رہے کتاب کی غلطیوں نے تصانیف کو مزید نقصان پہنچایا ہے۔

پہلی جلد کا آغاز اردو زبان کی تاریخ اور شاعری کی تاریخ سے ہوتا ہے۔ کتاب پانچ ادوار میں تقسیم ہے ہر دور دو تین طبقات پر مشتمل ہے۔

دور اول ۱۱۰۰ھ تا ۱۱۳۰ھ ہے اس میں دو طبقے ہیں۔

طبقۂ اول:۔ شغلیؔ، ولیؔ، سراجؔ، تاجیؔ، آبروؔ، احسنؔ، یکرنگؔ، فغاںؔ وغیرہ شریک ہیں۔

۱۔ "مرآۃ الشعراء" جلد اول مولوی عبدالرحمٰن ص دیباچہ

دور دوم: سنہ ۱۱۳۹ء تا سنہ ۱۱۶۹ء اس میں طبقۂ اول کے شعراء کے نام درج ہیں۔

حاتم، آرزو، مظہر، فغاں وغیرہ

طبقۂ دوم میں یقین، تاباں، داؤد، عزلت، عاجز، بیاں، کلیم، حزیں، آرام اور مخلص وغیرہ موجود ہیں۔

دور سوم: سنہ ۱۱۶۹ء تا سنہ ۱۱۸۰ء اس عہد کے طبقۂ اول میں درد، سودا، قائم اور میر ہیں۔
طبقۂ دوم کے شعراء ہدایت، ضیا، عارف، اثر، سوز، بقا، محب، فراق، نگین، نثار، راسخ اور بیدار ہیں۔

دور چہارم: سنہ ۱۱۸۰ء تا سنہ ۱۸۳۹ء کے طبقۂ اول میں حسن، جرأت، انشاء، مصحفی اور نظیر ہیں
طبقۂ دوم کی فہرست میں حسرت، نصیر، شہیدی، جوشش، وغیرہ شامل ہیں۔
دور پنجم: سنہ ۱۸۳۰ء تا سنہ ۱۸۷۰ء طبقۂ اول میں ناسخ، آتش، مومن، غالب، ذوق انیس اور دبیر ہیں۔
طبقۂ دوم میں وزیر، ظفر، صبا، رند، اسیر، نسیم لکھنوی، ممنون، نسیم دہلوی، قلق اور شیفتہ کا شمار کیا ہے۔ ہر دور کی تمہید اور خاتمہ کا اسلوب آزاد کی آبِ حیات کا عکس ہے دور چہارم کی تمہید کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

"اس دور میں ایسے بزرگ تشریف لا رہے ہیں جن کی سیف زبانی نے متانت کے پر پرزے کاٹ ڈالے اور رکاکت وسخافت کو فروغ ہوا۔ وہی مضامین ان لوگوں کے پیشِ نظر تھے جو دور سوم کے بزرگ اپنی قوتِ متخیلہ کے زور سے فراہم کر کے ترکے میں چھوڑ گئے تھے۔[1]"

ذیل میں اغلاط کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

۱ ـــ غزل پر اعتراض :۔ غزل پر مولف نے بھرپور تنقید کی ہے اور رائے دی کہ غزل کو اردو شاعری سے خارج کر دینا چاہیے۔[2]" حالانکہ جو صنف مولف کو ناپسند ہو اس کے بارے میں مشورہ نہیں دینا چاہیے
۲ ـــ متروکات کی آڑ لے کر مولف نے اچھے اچھے اساتذہ کے کلام میں اصلاح فرمائی ہے" آس پاس"

---

[1] مرأۃ الشعراء ـ جلد اول مولوی عبدالرحمٰن ص دیباچہ
[2] مرأۃ الشعراء ـ جلد اوّل مولوی عبدالرحمٰن ص ۳۰۲

"بلا" وغیرہ ایسے الفاظ کو متروک لکھا ہے جو لفظ آج تک زبان میں اسی حیثیت سے رائج ہیں۔

۳ ـــــ کئی شعراء مثلاً "مجنون، فغاں، ناجی، وغیرہ کے دیوان دستیاب نہ ہونے کا عذر ظاہر کیا ہے اور ان کے منقول اشعار تذکروں سے حاصل کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن اس عہد میں مندرجہ بالا شعراء کے دیوان انجمن ترقی اردو شائع کر چکی تھی۔

۴ ـــــ عزلت کے دیوان کا ذکر ہے لیکن ان کی "راگ مالا مثنوی" کا ذکر نہیں ملتا۔ حالانکہ خصوصیت کی بنا پر اس مثنوی کا ذکر ضروری تھا۔ اس میں راگ راگنیوں کی خصوصیات کو حسن و خوبی سے نظم کیا گیا ہے

۵ ـــــ جرأت کی شاعری میں مثنویوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

۶ ـــــ مصحفی کے تعلق سے درج ذیل اغلاط ہیں۔

مصحفی کے دو تذکروں کا ذکر ہے حالانکہ مصحفی کے تین تذکرے ہیں۔

"تذکرہ ریاض الفصحا" (۲) "تذکرہ ہندی" (۳) "عقد ثریا" [1]

۷ ـــــ مصحفی کے بابت لکھا ہے "عنفوانِ شباب میں دلّی آ کر .... اہلِ کمال کی .... صحبت میں شرکت کرتے کرتے شاعری شروع کر دی۔" [2] یہ بیان غلط ہے۔

مصحفی کا بیان خود کے تعلق سے ملاحظہ ہو۔

"فقیر ے اورا در ابتدائے شاعری در قصبہ امروہہ دیدہ بود۔" [3]

دیگر بیان میں کہتے ہیں۔

"فقیرے اورا در ابتدائے شاعری در قصبہ امروہہ دیدہ بود۔ اکثر بعد سہ عشرہ ملاقات می شود و تذکرۂ شعر بمیان می آید۔" [4]

مولف نے اپنے بیان کی روشنی میں "ریاض الفصحا" صـ ۲۸۷ کا ماخذ پیش کیا ہے وہ عبارت ملاحظہ ہو

"ـــــ علم عربی و طبعی و الٰہی و ریاضی، ز مولوی مستقیم سکنہ گوپا مئو شاگرد مولوی حسن خواجہ تاش

---

[1] مرأۃ الشعراء جلد اول مولوی عبدالرحمٰن صـ ۳۰۳

[2] ایضاً

[3] تذکرہ "عقد ثریا" مصحفی صـ ۵۴

[4] تذکرۂ ہندی مصحفی صـ ۲۵۴

مولوی مبین، عالم العلماء خواندہ ام و سیدی و صدر الدین شاہ زکان چو از مولوی مظہر علی کہ در صرف و نحو ثانی ایشاں کم پیدا می شود دریافتہ۔" [۱]

مولف کے مفہوم اور عبارت کے مفہوم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

۸ ـــ مصحفی کا سنِ ولادت ۱۱۶۴ھ اور سنِ وفات ۱۲۲۰ھ غلط ہے۔ [۲]

دیباچہ تذکرۂ ہندی میں مصحفی نے [illegible] وفات [illegible] ہو [illegible] مطابق کی بتائی ہوئی عمر کے مطابق سنِ

ولادت ۱۱۴۰ھ ہو سکتا ہے۔

۹ ـــ سعدی برہانپوری کو سعدی دکنی لکھا گیا ہے [۳] اس موضوع پر قاضی عبدالودود نے رسالہ

معاصر حصہ ۹ میں بحث کی ہے۔

۱۰ ـــ کس در کھوں جا دُں کیا مجوہ رہا یہ بھل بکھرا ہے

ایک بات کے بولنے سخن یاں جی ہی بارہ باٹ ہے

صفحہ ۲ پر یہ شعر ابوالحسن تاناشاہ سے منسوب ہے۔ حالانکہ یہ شعر بحری کا ہے۔

۱۱ ـــ بابا تلسی داس برہمن کی تصنیف رام چرتر مانس "کو دہ [illegible] کا بہترین [illegible] میں ترجمہ کہا گیا ہے"

"رام چرتر مانس" پورب کی ایک بولی اودھی بیسواڑی کی ترجمہ ہے [۴]

۱۲ ـــ اردو کے تعلق سے فرماتے ہیں :

"شاہ جہاں کے زمانے میں اس زبان کا نام ہندی یا دہلوی کی بجائے اردو مشہور ہوا۔" [۵]

اس بات کی کوئی سند پیش نہیں کی گئی۔ اردو لفظ زبان کے لیے پہلے خان آرزو نے استعمال کیا۔ انشاء نے "دریائے لطافت" میں اور مصحفی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے اس سے قدیم حوالہ اردو کے لیے آج تک میسر نہیں ہوا۔

۱۳ ـــ وجدی کی مثنوی "تحفۂ عاشقاں" کو وجیہ الدین کی تصنیف لکھا اور سنِ تصنیف ۱۰۱۵ھ بتایا ہے۔ [۶]

۱۔ تذکرہ ریاض الفصحا، مصحفی۔ صفحہ ۲۸۶ ۲۔ مرآۃ الشعراء جلد اول صفحہ ۲۰۲

۳۔ ایضاً ۴۔ مرآۃ الشعراء، جلد اول مولوی عبدالرحمٰن صفحہ ۲

۶۔ مرآۃ الشعراء، جلد اول، مولوی عبدالرحمٰن صفحہ ۲۴ ۵۔ ایضاً

اس مثنوی کا سن تصنیف ۱۱۵۳ھ ہے۔ وجدی کا شعر اس کا ثبوت ہے۔

دس اس کی تاریخ مجکوں عیاں

پچھانو اسے تحفۂ عاشقاں

۱۴ــــ تذکرہ عقد ثریا ص۲۳ سے منقول عبارت میں درج ذیل اغلاط ہیں ۵۵

منقول عبارت مرآۃ الشعراء ص۱۰۲	عقد ثریا کی منقول عبارت ص۲۳
۱۔ قدرداں	۱۔ قدرداناں
۲۔ پیش آمد بر مسند برابر جاے دادند	۲۔ پیش آمدہ بر مسند برابر خود جای دادند
۳۔ ہر یکے از واقفی گذرانیدند	۳۔ ہر یکے زر واقفی گذارنیدید

۱۵ــــ حاتم کی سن وفات ۱۲۰۷ھ غلط ہے۔ ص۵ صحیح ۱۱۹۷ھ ہے ص۲

۱۶ــــ (تیغقہ) کے سفر حجاز کے سفرنامے کا عنوان بردہ آور درغلط ہے ۵۶ اس سفرنامے کا عنوان "ترغیب السالک الی احسن المسالک" ہے۔

۱۷ــــ مرتب نے سراج الدین علی خان آرزو کی لغت موسوم بہ "غرائب اللغات" کو اصطلاحات صوفیا کی ایک لغت مسمی بہ "نوادر الالفاظ" کی شرح لکھا ہے۔

"نوادر الالفاظ" عبدالواسع ہانسوی کی لغت ہے۔ اس میں اصطلاحات صوفیا نہیں بلکہ عام الفاظ کی لغت ہے۔ اور سراج الدین علی خان نے اس کے الفاظ کی شرح و تصحیح کا کام انجام دیا ہے۔

۱۸ــــ ولی کے بیان میں کلیات کے علاوہ "نور المعرفت" کو کتاب کے نام سے یاد کیا ہے۔ نور المعرفت رسالہ ہے کتاب نہیں۔ اور فارسی میں فن سلوک پر نہیں لکھا گیا بلکہ ولی نے مولانا نور الدین احمدآبادی اور ان کی مسجد اور مدرسہ کی تعریف میں تحریر کیا ہے۔

۱۹ــــ مرثیہ گوئی کے بیانات میں ولی کے متعلق سے لکھتے ہیں "ولی نے کربلا کے حالات میں ایک خاص مثنوی لکھی ہے" یہ بیان غلط ہے۔ ایسی مثنوی "دہ مجلس" ولی ویلوری کی تخلیق ہے۔

مرآۃ الشعرا (جلد دوم)

مولوی عبدالرحمٰن ۱۹۴۹ء، دوسرا ایڈیشن

مولف نے پہلی جلد کی طرح شعراء کی حالتِ زندگی ان کا انتخاب اور کلام پر تنقید کا وہی رویہ رواں رکھا۔ انتخاب کلام کی صحت پر غور کیے بغیر جہاں سے فراہم ہوا درج کر لیا۔ دیباچہ میں اپنے عہد کی جدید شاعری اور افسانہ نگاری پر معقول بحث کی ہے۔ لیکن پہلی جلد کی طرح ولی کی سن وفات کے مسئلہ پر طول کلامی سے کام لیا ہے۔ لیکن کمزور دلائل اور منطقی نتائج سے حقیقت کا پردہ چاک کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس موضوع پر اختر جونا گڑھی اور عبدالحق کے دلائل مستحکم ہیں۔

مولف نے متروکات کے ہتھیار سے اساتذہ اور جدید شعراء کے کلام کو اصلاح کے نام پر شہید کر دیا ہے کسی شاعر کو نہیں چھوڑا۔ کسی کے کلام میں ایک لفظ کو متروک قرار دیا۔ پھر وہی لفظ کوئی دوسرے شاعر کے کلام میں نظر آیا تو اپنے اعتراض کو حسب روایت اسی انداز میں دہرا دیا۔ متروکات کے سلسلے میں کئی مقامات پر صحیح الفاظ اور ان کے جائز استعمال کو غلطی کے نام پر قربان کر دیا ہے۔ موصوف نے کسی لفظ کے متروک ہونے کے مندرجہ ذیل چار وجوہات درج کیے ہیں۔

"کبھی وہ لفظ ثقیل ہوتا ہے۔ کبھی صوتی لحاظ سے خراب ہوتا ہے کبھی پہلوئے ذم رکھتا ہے۔ کبھی روانی و شستگی میں فرق انداز ہوتا ہے۔" بقول مولوی عبدالحق لسانیات کی کوئی کتاب میں اس معیار کے مطابق لفظ کا متروک ہونا ثابت نہیں ہے۔

مندرجہ بالا اصولوں کی بنیاد پر لفظوں کی کاٹ چھانٹ اور ان کی ہیئت کو تبدیل کرنے کا ہنر۔۔ "مرآۃ الشعراء" کی دوسری جلد کا کارنامہ ہے۔

لسانی حقیقت کی روشنی میں لفظ کا ثقیل اور غیر ثقیل ہونا اس کے استعمال پر منحصر ہے۔ ہر زبان میں ثقیل الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اور زبان زد عام ہیں۔ انھیں متروک نہیں کہہ سکتے۔ اس حقیقت سے انحراف کرتے ہوئے مولوی عبدالرحمٰن نے بہت سے سادہ غیر ثقیل اور معقول الفاظ کو متروک قرار دیا ہے۔ حالانکہ غیر ثقیل الفاظ بھی موقع محل، واردات کی مناسبت سے غیر ثقیل نہیں رہتے۔ بلکہ بے محل استعمال ثقیل کو غیر ثقیل بنا دیتے ہیں۔ ایسا ہی معاملہ صوتیاتی روانی اور شستگی کا ہے۔ اچھا لفظ کسی کرخت لفظ کے ساتھ

دا کیا جائے تو وہ ثقیل معلوم ہوتا ہے۔ اس مشاہدے سے ثابت ہے کہ روانی اور شستگی میں نقص رخنہ نہیں پیدا کرتا بلکہ لفظ کا بیجا استعمال نامناسب ترکیب اور اسلوب بیان سے یہ خرابی آسکتی ہے۔ اس بنیاد پر طے ہے کہ لفظ کو متروک قرار دینا شخصیت کا اختیار نہیں بلکہ اس کے استعمال پر ہے۔ اور یہ حق عوام کو حاصل ہے کیونکہ خاص و عام اپنے اظہار کی سہولت کے لیے دوسری زبان کا لفظ بلاتکلف استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ذریعہ الفاظ اظہار بیان کا سرمایہ بن جاتے ہیں۔[۱]

قاری میں حسن سماعت کا ہونا ضروری ہے لفظ کی گہرائی و گیرائی کے ساتھ مفہوم کا فقدان سماعت پر گراں بار ہوتے ہے جو شک ابھرتا ہے اسے کم مائیگی کا نام دے سکتے ہیں۔ ذیل میں مولف کی متروکات اور اصلاح کیے ہوئے مصرعوں کی چند مثالیں مع اعتراضات کے پیش کی جاتی ہیں۔ مرزا داغ کا مصرع

"کہ ہیں کبھی نہیں یہ رات جاگے آنے کی"

اعتراض: (۱) کہ ہیں اور (۲) آنے کی ــــــ یہ دو غلطیاں روانی، شستگی، موقی خامیاں نہیں ہیں۔ نہ مصرعہ میں جھول کا پہلو ہے۔ نہ یہ ثقیل ہے بلکہ آج تک تقریر و تحریر میں ان کا استعمال جاری ہے۔ مولف نے کس بنیاد پر انھیں متروک لکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ موصوف نے کا ہے کو، ہیلا اور سدا جیسے لفظوں کو متروک بتایا ہے۔ اس پر ظلم یہ کہ لہو جیسے فصیح لفظ کو بھی اپنی ذہنی اپج سے متروک قرار دیا ہے۔ جو فصیح زبان میں استعمال ہوتا ہے۔

ناکامیاب اور ناکامیابی کو غلط قرار دیا گیا۔ لیکن کوئی وجہ پیش نہیں کی گئی۔ حالانکہ یہ دونوں لفظ اساتذہ سے کر آج تک ایک ہی مفہوم اور کیفیت سے بیان ہوتے ہیں "سونے پہ سہاگا" جیسی کہاوت کو غلط لکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ کہاوت آج بھی لوگوں کی زبان پر ہے عام بول چال میں گاہے گاہے استعمال ہوتی ہے۔

"رمز آغاز محبت کی بتا دی کس نے"

یہ ڈاکٹر اقبال کا مصرعہ ہے اس میں رمز کے مونث ہونے پر اعتراض ہے۔ تنہا صاحب کا کہنا ہے کہ رمز مذکر ہے۔ حالانکہ رمز آج بھی مونث کے صیغے میں آتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کے ایک مصرعہ میں "پھیرنا" پر یہ اعتراض ہے کہ یہ دیہاتی زبان ہے حالانکہ یہ لفظ آج بھی دیہات اور شہروں میں زبان کا ذریعۂ اظہار ہے۔

[۱] رسالہ اردو جنوری ۱۹۵۰ء

مولانا ظفر علی خاں کا مصرعہ ہے

"جواپنی معنیٔ تعلیں جمعدار کو کھلائے"

سیماب کے ایک شعر میں "خود رنگ" کو غلط بتاتے ہیں۔ مزید لکھا ہے کہ "یہ خود ساختہ ترکیب ہے اور بے معنی"
حالانکہ فارسی کا شستہ اور بامعنی لفظ ہے جس کے معنی اصلی اور نیچرل رنگ کے ہیں اردو میں مستعمل ہے۔

جوش کے شعر میں "اے گلاب گھٹاؤ ساون کی"۔ یہاں تنہا صاحب کا کہنا ہے کہ گھٹا ہونا چاہیے
حالانکہ ترکیب بالکل صحیح ہے۔

جگر کا ایک شعر یوں ہے۔ ؎ اپنے مطلب سے عشق کی چھیڑیں ظاہری ہے وفائیاں توبہ
اعتراض ہے کہ چھیڑیں کی جگہ چھیڑ ہونا چاہیے۔ یہاں چھیڑ کو جمع میں کیوں نہ لکھا جائے۔ اس کی کوئی
وضاحت نہیں کی گئی ہے۔

جلبت کے ایک شعر میں "چھال" کو غیر فصیح لکھا ہے جبکہ ہندی میں یہ لفظ عام طور پر استعمال ہوتا ہے
اکبر کے تعلق سے بیان کرتے ہیں کہ "آپ کبھی ریختی کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔"

نزاکت پر ستم ہے ان کا جوڑا اس قدر بھاری

دو ہر پشتہ ہے مصیبت پائینچہ مشکل سے اٹھتا ہے

شعر میں عورتوں کے لباس یا آرائش کے ذکر سے شعر یا نظم ریختی نہیں ہو جاتی۔ ریختی ایسی نظم یا شعر ہے جس
میں شاعر عورت بن کر عورتوں کی زبان میں کلام کرے۔ یہ شعر دونوں باتوں سے بری ہے۔

حسرت پر رقم طراز ہیں کہ "رعایتِ لفظی حسرت کے کلام میں کہیں کہیں موجود ہے جس کا افسوس ہے"
اپنے قول کی تائید میں حسرت کے یہ اشعار نقل کیے گئے ہیں۔

کرتی تھی لیلائے شب لو مہ کامل نثار

سو رہا تھا بام پر دہ گیسوؤں والا پڑا

ایک ٹھوکر سے جو صبح اے شوخ بے پروا خرام

رہ گزر میں ہے تیری ایک آرزو والا پڑا

ن اشعار میں رعایتِ لفظی ہے لیکن قابلِ اعتراض نہیں۔ رعایتِ لفظی کا بے تکلف آنا نا زیبا ہے۔ ایسی
صورت اشعار میں موجود نہیں ہے۔

جوش نے ایک موقع پر لکھا ہے۔

"کس کو کھا کر آرہا ہے او وبائے کائنات"

اعتراض ہے "وبا" مونث ہے۔ جوش نے مذکر لکھا ہے اس لیے غلط ہے۔ حالانکہ صنعت کے طور پر استعمال ہونے والا لفظ دونوں صیغوں میں استعمال ہوتا ہے اور "وبائے کائنات" صنعت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

خود تنہا صاحب نے ایک مقام پر محاورہ کا غلط استعمال کیا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں "اکثر نا شاعر لوگ جو اپنے آپ کو شاعر سمجھتے ہیں حالی کے منہ آتے ہیں۔" کے منہ آنا" غلط ہے۔ "منہ پر آنا" صحیح محاورہ ہے۔ امیر اور داغ کے مصرعے ملاحظہ ہوں۔

"نہ فرشتوں پہ یہ گلزار جنت آزاد آیا" (داغ)

"یاد ہے آگے بھی ہم پر کبھی منہ آتے تھے" (امیر)

تنہا نے غزل پر اس طرح شورہ دیا ہے۔ "اب غزل میں کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں اب ہم کو اس صنف کو خیرباد کہہ دینا چاہیے۔ غزل کا چراغ سحر ٹمٹما رہا ہے۔"

غزل کی مخالفت کا مسئلہ آج کا نہیں بلکہ ہر دور میں غزل کی مخالفت کبھی کسی نہ کسی صورت میں ہوتی رہی اور مخالفت کا یہ پورا باد مولانا حالی سے ترقی پسندوں تک برابر جاری رہا۔ آج بھی کسی نہ کسی روپ میں غزل پر بحث اسی طرح شروع کی جاتی ہے۔ لیکن غزل ہر دور میں سخت جان ثابت ہوئی اور ہزار ہا مخالفت کے باوجود آج تک زندہ ہے۔

حالی کے بعد جو نیا رنگ اس صنف میں آیا ہے اور عصری دور میں جس مقام سے غزل گذر رہی ہے یہ اس کے زندہ رہنے کی علامت ہے کیونکہ اس میدان کی نظم، مرثیہ، قصیدہ سب سے وسیع ہے۔ قاری کے لیے ہر مزاج اور مفہوم کا شعر اپنا گرویدہ بنانے کیلیے کافی ہے لشتولب سے شاعروں تک جو گوہر غزل کے اشعار کہہ سے وہ کسی اور صنف کی نہیں۔ کیونکہ غزل کا ہر شعر اپنے اندر ایک مکمل مفہوم رکھتا ہے جو انسانی جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ دونوں جلدوں کے مطالعہ سے کوئی تازگی انکشاف نہیں ہوتا معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ البتہ پڑھنے والا گمراہی کا شکار ضرور ہوتا ہے۔ مرأۃ الشعراء کی دونوں جلدوں کی اشاعت سے ادب میں کوئی اہم اور خاص اضافہ نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ کئی تاریخی حقائق سے مولف نے منہ موڑ کر یا انہیں نظر انداز کر کے اپنے منطقی اظہار کا سہارا لیا ہے۔

••

تذکرہ یورپین شعرائے اردو

محمد سردار علی ۱۹۲۷ء

محمد سردار علی کی یہ تالیف پہلی بار ۱۹۲۷ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یورپین شعراء پر مختصر مگر مفید معلومات کا یہ تذکرہ ۱۱۵ صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن مارچ ۱۹۴۴ء میں منظر عام پر آیا۔ اس بابت محمد سردار علی رقم طراز ہیں۔

"مزید یورپین شعرائے اردو کے حالات اور ان کا کلام دستیاب ہوا۔ اس کے بعد تذکرے کے طبع دوم کی ضرورت محسوس کی گئی۔" [۱]

اس بیانات سے واضح ہے کہ پہلے ایڈیشن میں کم معلومات بہم پہنچائی گئی تھی۔

"۱۴۹۸ء میں ہندوستان آنے والے اہل یورپ یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور کار کرتے ایسے پرتگیزی جو ہندوستان میں بس گئے۔ اور ان کے منقولہ کے افراد ہندوستانی معاشرہ کا ایک جزو بن گئے انھوں نے مقامی زبانوں کو اپنا کر کچھ کارہائے نمایاں انجام دیے۔ درج ذیل لغت نویسوں اور صرف و نحو کا مذکور رہے۔" [۲]

پہلا دور:

۱ ـــ جان شواکنکرنے ۱۷۰۴ء "اردو زبان کا لغت" (لاطینی میں)

۲ ـــ مسٹر کاشیلز ۱۷۴۳ء "اردو صرف و نحو" (لاطینی زبان میں)

۳ ـــ ہیڈلے ۱۷۷۲ء "اردو صرف و نحو"

۴ ـــ ہیڈلے ۱۷۷۲ء "یوروپین اردو الفاظ کی مختصر فرہنگ"

۵ ـــ ہیڈلے ۱۸۰۸ء "اردو گرامر" (پرتگیز زبان میں)

دوسرا دور:

۱ ـــ فرگسن ۱۷۷۳ء "ہندوستانی زبان کی ایک لغت"

۲ ـــ ڈاکٹر گل کرائسٹ ۱۷۸۶ء کے بعد اردو زبان پر قابل قدر کتابوں کا حوالہ انگریزی ہندوستانی لغت کا حوالہ [۳]

[۱] دیباچہ طبع دوم محمد سردار علی تذکرہ یورپین شعرائے اردو [۲] دیباچہ اول ایضاً ص ۷

۳ــــ ڈاکٹر ڈگ کرانسٹ ۱۸۲۰ء "اردو میگزین رسالہ"

۴ــــ گلیڈون ۱۸۰۹ء "فارسی و ہندوستانی زبان کی ایک لغت"

۵ــــ جان شیکسپیر ۱۸۱۷ء "اردو لغت"

۶ــــ ڈنکن فاربس ۱۸۴۸ء "ہندوستانی لغت"

۷ــــ برٹرینڈ ۱۸۵۸ء "اردو لغت" (فرانسیسی)

۸ــــ پلیٹ اور برانس "اردو لغت"

۹ــــ ڈاکٹر فیلن "اردو کی کئی لغات"

۱۰ــــ ڈاکٹر فیلن "ہندوستانی انگریزی لغت"

۱۱ــــ گارساں دتاسی "تذکرہ شعرائے اردو"

مولف کو اعتراف ہے کہ

"یہاں تک تو نثر اردو کا تذکرہ تھا۔ نظم کے متعلق باوجود کوشش و تحقیق کے اس بات کا پتہ نہیں چل سکا کہ اہل یورپ میں اردو کا سب سے پہلا شاعر کون ہے"[۵]

دیباچہ اوّل کے بعد ماخذ تالیف کی فہرست اس طرح ہے۔

۱ــــ "طبقات الشعراء" منشی کریم الدین ۱۸۴۸ء

۲ــــ "گلشن بے خار" نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

۳ــــ "سخن شعراء" عبدالغفور خاں نساخ

۴ــــ "خم خانۂ جاوید" لالہ سری رام

۵ــــ "انتخاب یادگار" منشی امیر احمد امیر مینائی

۶ــــ یادگار ضیغم عبداللہ خاں ضیغم

---

[۵] تذکرہ یورپین شعرائے اردو ص۹

۷ ــــ تذکرہ فرح بخش — نواب یار محمد خاں

۸ ــــ گلستانِ بے خزاں — حکیم قطب خاں باطن

۹ ــــ خطبات گارساں دتاسی — گارساں دتاسی

۱۰ ــــ انتخاب دواوین — سید فضل الحسن حسرت موہانی

۱۱ ــــ سراپا سخن — سید محسن علی محسن

۱۲ ــــ شبستانِ عالمگیری — عالمگیر محمد خاں شوق

۱۳ ــــ ادبی دنیا لاہور سنہ ۱۹۲۷ء

۱۴ ــــ رسالۂ اردو انجمن ترقی ہند — عبدالحق

تذکرہ کی ابتداء الگزینڈر ہیڈلی تخلص آزاد[1] سے کی گئی ہے مختصر حالاتِ زندگی کے ساتھ دیوان سے انتخاب اشعار بطور نمونہ پیش کیے ہیں۔ تذکرہ میں یورپین شعراء کی فہرست اس طرح ہے۔

۱ ــــ الگزینڈر ہیڈلی آزاد سن ولادت سنہ ۱۸۲۹ء سن وفات سنہ ۱۸۶۱ء

۲ ــــ رابرٹ گارڈنر سبق سنہ ۱۸۷۹ء

۳ ــــ اسٹیفن یا اسٹیوفن اصفان سنہ ۱۸۰۲ء تک زندہ ہونے کا ذکر ہے۔

مندرجہ بالا شعراء کے علاوہ ادریس، احمق، اسیر، ایرق، ایلن کرسچیانہ، جمعیت، خفی، ڈالس سومبر، ڈی کاسٹا، شکر، شائق، شور، شوق، شہزاد مسیحی، صاحب، صبر طوماس، عاشق، عابد، عبرتی، فلاطون، فلک، مضطر، مفتون، ملکہ، والہ، ولیم، کلاڈیس بیکر، وغیرہ یورپین شعراء اور شاعرات میں کسی کی سنِ ولادت اور وفات کا مولف کو علم نہیں۔ بعض کے حالاتِ زندگی اور ادبی زندگی سے مولف نابلد ہے۔ کئی شعراء پر دو یا تین جملوں سے زیادہ پیش نہیں کیا گیا۔ کئی شعراء کے انتخابی اشعار ایک یا دو سے زیادہ نہیں۔ کئی شعراء کا سنِ ولادت بتایا ہے لیکن سنِ وفات نہیں۔ کسی کا سنِ وفات مرقوم ہے۔ سنِ ولادت مذکور نہیں۔ جیسے مرزا کلیمان شکوہ گارڈنر عرف منا صاحب فنا، جوزف بنسلی فنا وغیرہ

زیر نظر تذکرے میں وہ شعراء بھی شامل ہیں جن کے باپ دادا مسلمان ہو گئے تھے یا جو خود

---

[1] یورپین شعرائے اردو — سردار علی صفحہ ۱۲

مسلمان ہو گئے تھے۔ تذکرہ نگار نے نثر میں "تہا" کا املا اس طرح لکھا ہے۔ ص۱۲ اکثر مقامات پر دو چشمی ھ کو "ہ" لکھا ہے۔ لیکن صفحہ ۵۳ پر "تھا" اور "تھیٹر" اسی صفحہ پر "کھول" اس طرح درج ہے۔ لیکن "لکھا" لکھنؤ اور "تھیٹر" اس طرح درج ہے۔ ممکن ہے کاتب کی غلطی ہو۔ اگرچہ یہ سن انیس سو چوالیس ۱۹۴۴ء کی تالیف ہے۔ بہرحال اس تذکرہ کا وجود اردو ادب میں یورپین شعراء اور ادباء کی معلومات کا ذریعہ ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہ تذکرہ ایک اضافہ ہے۔ ..

اربابِ نثرِ اردو

مولوی سید احمد

فورٹ ولیم کالج کے اردو نثر نویسوں کا تحقیقی و تنقیدی تذکرہ۔

مولوی سید احمد صاحب کی اس تصنیف کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ زیر نظر تالیف ۲۹۲ صفحات پر مشتمل ہے مولف نے اردو میں منظم اور مربوط نثر کا مرکز فورٹ ولیم کالج کو بتایا ہے۔

"شمالی ہند میں اردو نثر نویسی منظم و مربوط طور پر سب سے پہلے اسی کالج کی طرف سے عمل میں آئی۔"[1]

اس کتاب میں ارباب نثر اردو وہ ارباب ہیں جن کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے تھا۔ مولف نے ابتداء "اردو نثر فورٹ ولیم کالج سے پہلے" سے کیا ہے اس میں مختصراً دکن کی پرانی قلمی کتابوں اور رسائل کا ذکر کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے۔

"زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے بھی ان کتابوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ ان کی بنیاد زیادہ تر فارسی کی آراستہ و پرتکلف عبارتوں پر رکھی گئی تھی"[2]

فورٹ ولیم کالج کے عنوان میں اس کالج کو اردو زبان کی ترقی کا معمار بتلایا ہے اور لارڈ ویلزلی کو اس کالج کی بنیاد رکھنے والا ثابت کیا ہے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کو اس کا نگران اعلیٰ بتایا ہے۔[3]

---

[1]: اربابِ اردو نثر مولوی سید محمد صاحب، ص۲

[2] ایضاً ص۶

[3] اربابِ نثر اردو مولوی سید محمد صاحب ص۱۵—۹

جان گل کرسٹ کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈال کر اس کی ادبی خدمات اور تصانیف کا جائزہ لیا ہے انگریزی ہندوستانی لغت، ہندوستانی علم اللسان اردو کی صرف و نحو اردو زبان پر مختصر مقدمہ، ہندی کی آسان مشقیں، فارسی افعال کا جدید نظریہ اجنبیوں کے لیے رہنمائے اردو، بیاض ہندی، عملی خاکہ، ہندی الفاظ کی قرأت، اتالیق ہندی، عربی اور ہندی آئینہ، مکالمات انگریزی و ہندوستانی مشرقی قصے ہندی داستان گو، ان تصانیف کا مختصر تعارف دے کر گل کرسٹ کی اہمیت کو واضح کیا ہے گلکرسٹ کے بعد ٹامس روبک اور جورف ٹیلر کو اردو کا سرپرست کہا ہے۔ اور ان کے کارناموں کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے مولفین اور ان کی تالیفات کے ذیل میں میر امن دہلوی کی باغ و بہار، گنج خوبی، سید حیدر بخش حیدری کی قصۂ مہر و ماہ، قصۂ لیلیٰ مجنوں، طوطا کہانی، آرائشِ محفل ہفت پیکر، تاریخِ نادری، گل مغفرت، گلزارِ دانش، گلدستۂ حیدری، تذکرۂ گلشنِ ہند، میر شیر علی افسوس کے دیوانِ افسوس، باغِ اردو، آرائشِ محفل، میر بہادر علی حسینی کی نثرِ بے نظیر، اخلاقِ ہندی، تاریخِ آسام، رسالۂ گلکرسٹ، مرزا علی لطف کی کلیاتِ لطف، تذکرۂ گلشنِ ہند، مولوی امانت اللہ کی ہدایت الاسلام عربی، ہدایت الاسلام اردو، ترجمۂ قرآن مجید، جامع الاخلاق طرف اردو، مظہر علی خاں ولا کی مادھونل اور کام کندلا، ترجمۂ کریمہ، ہفت گلشن، اتالیقِ ہندی، بیتال پچیسی، تاریخِ شیر شاہی، جہانگیر نامہ، مرزا جان طپش کی کلیاتِ طپش، شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان، بہارِ دانش، یوسف زلیخا، مرزا کاظم علی جوان کی شکنتلا ناٹک، بارہ ماسہ، تاریخ فرشتہ، شیخ حفیظ الدین احمد کی خرد افروز، خلیل علی خاں کی قصۂ امیر حمزہ، واقعاتِ اکبر، قصۂ گل ہزار چمن، رسالۂ کائنات، مولوی اکرام علی کی اخوان الصفا، نہال چند لاہوری کی مذہبِ عشق عین آرائشِ جہاں کی چار گلشن، دیوانِ جہاں، تنبیہ الغافلین، میر عبداللہ مسکین کی مرثیہ ہائے مسکین للو لال کوی کی پریم ساگر، راج نیتی، سبھا بلاس، بہار [illegible]، خلاصۂ ہندی، سنگھاسن بتیسی، مرزا محمد علی فدوی کی عہد، مرزا جعفر علی [illegible]، کلی الیل فیض [illegible] چشمۂ فیض، سید حمید الدین بہاری، قران السعدین وغیرہ مصنفین کی حیات اور ان [illegible] کے ساتھ ان کی تصانیف پر تفصیل سے تبصرہ کیا ہے۔ نظرِ بازگشت میں فورٹ ولیم کالج کی کتابیں اور ان کے تعلق سے کچھ کیا۔

"اس کالج کی کتابیں اردو کے قدیم اسلوب بیان میں عظیم الشان انقلاب کا باعث ہوئیں۔ انھوں نے صفائی و سادگی کی مشترک خصوصیت کے ساتھ آئندہ مصنفین کے آگے مختلف اسالیب بیان کے دروازے کھول دیے۔"[1]

اس کتاب سے فورٹ ولیم کالج کی تاریخ کے ساتھ ارباب نثر اردو کا مکمل تعارف ہوجاتا ہے۔ جس سے زبان کی پرانی تاریخ کا علم ہوتا ہے۔ اپنے عہد میں یہ کتاب تاریخی تقاضے کو پورا کرتی ہے۔

---

[1] ارباب نثر اردو   مولوی سید محمد صاحب   ص ۲۸۶

تاریخ ادبِ اردو

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ۱۹۲۸ء

"تاریخ ادب اردو" ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی تالیف ہے۔ یہ کتاب انگریزی میں لکھی گئی تھی۔ بعد میں اس کا ترجمہ مرزا محمد عسکری نے اردو میں کیا۔

یہ تاریخ تدریسی مقصد سے ۱۹۲۸ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ تب سے آج تک اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس تاریخ کا مقدمہ فاضل لکھنوی، تمہید رام بابو سکسینہ اور تقریظ تیج بہادر سپرو کی ہیں۔

زیر نظر تاریخ دو حصوں پر مشتمل ہے۔

(۱) نظم اردو کی تاریخ   (۲) نثر کی تاریخ

دونوں حصوں کے انڈیکس جدا جدا ہیں۔

۱ــــ نظم اردو کا حصہ ۱۳ ابواب پر مشتمل ہے اور ۵۲۰ صفحات پر محیط ہے۔ انڈیکس ۵۲۱ سے ۵۵۰ تک ہے۔

باب ۱ میں زبان اردو اور اس کی اصل سے بحث کی ہے۔ اردو اور ہندی کا تعلق زبان اور ادب اور فارسی کا احسان مند ثابت کیا ہے۔ یورپ کی زبانوں کا اردو پر اثر بتا کر نثر اور نظم کی زبان در

ادبی اردو اور قدیم اردو کے نام اور رسم خط پر بحث کا خاتمہ کیا ہے۔

باب ۱۲ میں ادب اردو کی ترقی کے ابتدائی دور، نظم کا تقدم نثر پر ہے۔
اس کے وجوہات اور تعلق ادب اردو کے سلسلے میں سب سے پہلا شاعر امیر خسرو کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اردو کی پختگی کا زمانہ زریں عہد اکبری کا بتاتے ہیں۔

"زبان اردو کی توسیع کے جو لوگ شائق تھے۔ انھیں اس زبان کو مختلف طبقوں کے لوگوں تک پہنچانے اور اس کو پھیلانے کے لیے دونوں قسموں کے الفاظ یعنی ملکی اور غیر ملکی کے استعمال کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کوشش کی رفتار عہد اکبری میں بہت تیز تھی۔ شہنشاہ اکبر چاہتا تھا کہ ملک کی مفتوح رعایا فاتح کی زبان کے ذریعہ شیر و شکر ہو جائیں۔" [1] صـ ۵

جدید تحقیق کی روشنی میں یہ بیان بالکل غلط ہے۔

قدیم شعرائے دکن اور دربار شاہان دکن، گولکنڈہ، و بیجاپور پر بحث کے دوران محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، ابوالحسن قطب شاہ، عادل شاہ وغیرہ کا ذکر ہے۔ لیکن شعرائے دکن میں صرف ولی دکنی کا ذکر کیا ہے۔

"ولی کو ریختہ کا موجد گویا اردو کا چاسر خیال کرنا چاہیے۔" [2] صـ ۵۹

ولی سے پہلے دکن میں نشاطی اور وجہی جیسے ادیب اور شعراء کا کوئی ذکر نہیں ہے ولی کو اردو کا چاسر کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔

میر اور سودا کے زمانے میں زبان و شاعری کے سدھار، اصلاحیں، انشا و مصحفی کا دور، ان کی خدمات، ذوق، غالب، ناسخ، آتش سے آزاد و حالی کا ذکر کرتے ہوئے نثر اردو، فورٹ ولیم کالج کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ناول نویسی کی ابتدا اور اردو ڈرامہ پر اختتام کیا ہے۔

باب ۱۳ میں اردو شاعری کی عام خصوصیات مثلاً تقلید، تصوف، قافیہ پیمائی، نیچرل مناظر کی کمی، غزل کا رنگ، تصوف عاشقانہ، اہل دربار کا اثر، اردو شاعری پر ہندی اور فارسی کا اثر، اردو شاعری کی صنفیں بتائی ہے۔ قصائد، مثنوی، مراثی، قطعہ و رباعی، اور اردو شاعری کی خصوصیات پر باب ختم ہوتا ہے۔ اس باب میں مثنوی سحر البیان کا انتخاب لائق تقریباً ۴ صفحات

---

[1] تاریخ ادب اردو ... صـ ۵
[2] ... صـ ۵۹

پر محیط ہے۔ ہجو گوئی کا کوئی ذکر اصناف میں نہیں کیا گیا ہے۔

باب ۲ میں قدیم شعرائے دکن سے متعلق دکن کا مفہوم، دکنی زبان کی ابتداء اور دکن میں اردو شاعری کی ابتداء بہمنی دور سے ابراہیم عادل شاہ ثانی تک کے شعراء کا احاطہ کیا ہے۔ شعرائے اورنگ آباد میں ولی دکنی سے سراج تک دیگر شعراء میں عارف الدین عاجز، عبدالولی عزلت، شرافت، ضیاء، کاظم وغیرہ کا ذکر ہے۔

ولی کے تعلق سے لکھا ہے کہ

" گارساں دتاسی، بلوم ہارٹ اور میر حسن کا خیال ہے کہ ولی احمد آباد میں پیدا ہوئے، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ ان کی ولادت اورنگ آباد میں ۱۰۷۹ھ مطابق ۱۶۶۸ء میں ہوئی۔" [1]

اس بات کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔ آج کی تحقیق کے مطابق ولی احمد آباد میں پیدا ہوئے ۵۵ دکنی نہیں گجراتی ہیں۔ سن ولادت بھی غلط ہے۔

وجہی کی سب رس کا ذکر ص۱۱ پر نثر نگار کی حیثیت سے کیا ہے، اور عبداللہ قطب کو درباری شاعر کہا۔ لیکن کسی شعری کارنامہ کا ذکر نہیں ہے۔

باب ۵، ۶ اور ۷ میں اساتذہ دہلی، متقدمین، جن میں مبارک، آرزو، حاتم، مضمون، مظہر جان جاناں، ناجی، تاباں، یک رنگ، فغاں، اساتذہ دہلی وغیرہ۔

متوسطین میں میر و سودا کا زمانہ ان کے ہم عصر درد، سوز، میر حسن، میر پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اساتذہ دہلی، متاخرین میں انشا، مصحفی، رنگین، جرأت اور داغ کے کلام کی خصوصیات سے بحث ہے۔ اسی دور میں ریختی کا مطلب بتا کر منت، قائم سے راسخ تک کا بیان ہے۔

باب ۸ میں اساتذہ لکھنؤ، ناسخ و آتش، ان کے شاگردان، لکھنؤ کی طرز شاعری، لکھنؤ اور دہلی کا فرق اور ان کے دور میں زبان کے تغیرات کا بیان ملتا ہے۔

باب ۹ میں دربار لکھنؤ اور اس کے شعراء واجد علی شاہ اختر کا عہد ان سے منسلک شعراء امیر، امانت، قلق، ذکی، درخشاں اور خسرو وغیرہ کا بیان ہے۔

باب ۱۰ میں مرثیہ اور مرثیہ گو سے متعلق اس میں خلیق، انیس، دبیر وغیرہ کے کلام پر روشنی ڈالی ہے۔

---

[1] "تاریخ ادب اردو" ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ص۱۱۱

باب ۱۱ میں نظیر اکبرآبادی اور شاہ نصیر دہلوی کے کلام پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس باب میں نظیر کو اردو کا شیکسپیئر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ [۱]

باب ۱۲ میں متوسطین شعرائے دہلی ذوق و غالب کا زمانہ ہے۔ مومن، شیفتہ، تسکین، نسیم، آزردہ پر یہ دور ختم ہوتا ہے۔

باب ۱۳ میں دربار رام پور، حیدرآباد، امیر و داغ کے زمانے کے شعراء فرخ آباد، عظیم آباد، مرشد آباد، ٹانڈا، فیض آباد، ٹونک، منگرول، بھوپال، حیدرآباد، دکن میں مہاراجہ چندو لال، مہاراجہ سرکشن پرشاد اور عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ ادبی مراکز بتائے ہیں۔

باب ۱۴ میں اردو شاعری کا جدید رنگ ہے۔ آزاد اور حالی کا زمانہ ہے۔ اس دور میں انقلاب کا اثر، انگریزی تعلیم کے اثر سے اردو شاعری پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ سرسید کی طرز تحریر کا کیا اثر ادب پر ہوا۔ مقدمہ شعر و شاعری سے کیا تبدیلیاں آئیں، آزاد کی کوششیں، اکبر، اسماعیل میرٹھی وغیرہ پر بحث ملتی ہے۔

حصۂ نثر: باب ۱۵ نثر اردو کی ابتداء اور ترقی کا ہے اس میں دکنی نثر اسباب، دہ مجلس، چہار درویش، فورٹ ولیم کالج سے نثر اردو کے تعلق کے اسباب، ڈاکٹر جان گل کرسٹ، لغایت، میر امن، افسوس، بہادر علی حسینی، سید حیدر علی بخش، جوان، نہال چند لاہوری، مظہر ولا، مولوی اکرام، للوجی، لطف، مولوی امانت اللہ، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالقادر، اور عیسائی پادریوں کے کارناموں سے اردو کی ترقی بتائی گئی ہے۔

باب ۱۶ نثر اردو کا دور، متوسط اور جدید دور، فقیر محمد گویا، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی کی نثری خدمات پر مشتمل ہے۔ اس میں قیام علی گڑھ، تصانیف، قیام حیدرآباد، ندوۃ العلما، دارالمصنفین اعظم گڑھ، عبدالسلام ندوی اور سید سلیمان ندوی کی ادبی خدمات سے وابستہ ہے۔

باب ۱۷: اردو ناول کی ابتداء پر مشتمل ہے۔ یہاں شرر اور سرشار سے پریم چند اور سدرشن تک ناول اور افسانے کا ذکر ملتا ہے۔

باب ۱۸: میں اردو ڈرامہ اس کی عمومیت، سنسکرت اور ہندی کے اثرات، سوانگ اور نقلیں

---

[۱] "تاریخ ادب اردو" ڈاکٹر رام بابو سکسینہ صفحہ ۲۵۴

انگریزی اسٹیج اردو ڈراما پر شاہی دربار کے اثر سے اردو ڈراما کے مستقبل تک کا بیان درج ہے۔

باب ۱۹ زبان اردو کی خاص خوبیاں اور اس کے متعلق بعض اہل رائے لوگوں کی قیمتی آراء پر

مشتمل ہے۔ یہاں "اردو ایک فصیح اور شیریں زبان" کے عنوان سے اردو کا رسم الخط تک احاطہ ہے۔

ضمیمہ صفحہ ۲۰۹ پر ہے۔ مقدمہ اور تمہید یا فہرست میں کہیں اندراج نہیں ہے جس میں نظر

لکھنوی، چکبست اور اقبال وغیرہ شامل ہیں۔

۱ــــ زیر نظر تاریخ تدریسی اعتبار سے مکمل ہے۔ لیکن اس میں کئی بیانات کذب و اختراع کا شکار ہیں

صفحہ ۳۱ حصہ اول میں ولی دکنی سے منسوب حالات ہیں۔ وہ مجلس دراصل ولی ویلوری کا کارنامہ

ہے۔ مولف نے اس کو ولی دکنی کا کارنامہ لکھا ہے۔

صفحہ ۲۷۴ حصہ اول میں حالی کو اوّل درجہ کا شاعر نہیں مانتے لیکن آزاد کو جدید رنگ کا بانی اور ادب

اردو کا مجدد سمجھتے ہیں یہ مولف کی ذاتی رائے ہے۔ لیکن ہر شخص کا اس سے اتفاق ضروری نہیں۔

صفحہ ۱ حصہ دوم میں شیخ علی الدین گنج العلم (متوفی ۵۹۵ھ) کی تصانیف کا ذکر محض خیالی

بات ہے اس کا کوئی ثبوت مولف نے پیش نہیں ہے۔

اس تاریخ کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ مولف نے اپنا تحقیقی مواد دوسرے مولفین کی رائے پر

اعتماد کر کے پیش کیا ہے۔

۱ــــ آب حیات کی کمزور روایتوں پر من و عن بھروسہ کرکے ان پر رائے زنی کر دی گئی ہے۔

۲ــــ تنقیدی نظریات اور کلام پر رائے متقدمین، متاخرین و متوسطین شعراء کے بارے میں "[illegible]" سے

استفادہ [illegible] ہے۔

۳ــــ مختلف کتابوں سے استفادہ اور مواد حاصل کرنے کے بعد حوالوں میں کوتاہی برتی گئی ہے۔ مجموعی اعتبار

سے یہ تاریخ تدریسی مقاصد کو ایک حد تک پورا کرنے میں کامیاب رہی اور وقت کے تقاضے کو پورا کیا۔

تاریخ نثر اردو

مولوی احسن مارہروی ۱۹۳۰ء

مولوی احسن مارہروی کی یہ تالیف ۴۱۰ صفحات پر مشتمل ہے لیکن مطالعہ کے دوران شدت سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہ تالیف اردو نثر کی تاریخ نہیں۔ حالانکہ نام اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ یہ کتاب اپنی زبان کی نثری تاریخ کا احاطہ کرے گی۔ لیکن اس کتاب میں ۱۸۳۰ء سے موجودہ زمانہ تک یعنی ۱۹۳۰ء تک کے اردو نثر کے نمونے پیش کیے گئے ہیں اس کے چھ ابواب ہیں۔ اور ہر باب سو سال کا احاطہ کرتا ہے لیکن یہ التزام کسی خاص اصول کے پیش نظر نہیں کیا گیا۔ بلکہ کتاب کی ترتیب میں سہولت کی خاطر یہ قدم اٹھایا گیا ہے۔ ص ۱۵۶ پر مصنف کا اعتراف ہے کہ ہر دور کے ضمن میں متعدد نمونے درج ہیں اور ان پر تبصرہ بھی ہے۔ اس میں مذہبی، اخلاقی، طبعی، سیاسی، قانونی، دفتری، مکتوبی، اخباری، تقریری اشتہاری ہر قسم کے نثری نمونے موجود ہیں۔ جو واقعی مصنف کی محنت کی گواہ ہیں۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نثر اردو کی مستقل اور اصولی تاریخ نہیں۔ مرتب نے سرورق پر اس کی تشریح کر دی ہے۔ کہ اس میں صرف نمونے ہیں۔ گویا اس کا نام "نمونے اور منثورات" ہونا چاہیے تھا۔

ابتدا میں فاضل مرتب نے ۲۸ صفحوں کا ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں نثر اردو کے متعلق جامعیت سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں اپنے دور کے تمام مسائل درج ہیں جنھیں اردو نثر سے تعلق تھا اور جن پر سنجیدگی اور محنت سے تحقیقات کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ اور اس بات پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی تھی۔

مرتب کا بیان ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے معمولی طالب علم بھی نثر اردو کی تدریجی ارتقاء کو آسانی سے سمجھ لے گا۔ لیکن اس کتاب کی ترتیب اتنی ناقص ہے کہ طالب علم مزید مشکلات کا شکار ہو جائیگا۔ کیونکہ اس کتاب سے نثر اردو کی تدریجی ترقی کا صحیح اندازہ کرنا مشکل کام ہے مختلف نمونے یکجا ہو جانے سے کچھ لطف ضرور آتا ہے۔ لیکن کتاب کا مقصد کسی حد تک ناکام ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ دفتری مراسلے اور اشتہاری نمونے جن کا تعلق نیم تعلیم یافتہ ہے لوں سے نثر اردو کی ترقی کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ہر لکھی ہوئی چیز ادب نہیں بن سکتی۔ دیواروں پر چسپاں بازاری اشتہارات ادب کی کسوٹی نہیں بن سکتے اگر ایسا ہے تو معمولی فلموں، ناٹکوں وغیرہ کے اشتہارات بھی نثر اردو کے شاہد بن سکتے ہیں۔

چونکہ ان اشتہاروں کی زبان خاص نہیں ہوتی۔ اپنی ضرورت کا اظہار کرنے کیلئے عام لوگوں تک اپنا مافی الضمیر عوامی معیار سے کیا جاتا ہے۔ جسے کوئی زبان ادب میں شمار نہیں کر سکتی۔

فاضل مصنف اپنے دور میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اردو کے پروفیسر تھے تاہم کتاب کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے کتاب کی تیاری میں تساہل سے کام لیا ہے۔ اور اپنے عنوان سے ناانصافی کر کے مذاق اور تنقید کا موضوع بنا دیا ہے۔

اردو لٹریچر (اردو ادب کی تاریخ)

ڈاکٹر گراہم بیلی ۱۹۳۲ء

ڈاکٹر گراہم بیلی کی یہ تالیف ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ جو ۱۹۳۲ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس دور میں ڈاکٹر گراہم بیلی ہندوستان کے شہرت یافتہ محققوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ چونکہ انھوں نے اپنے فرائض منصبی کے علاوہ اپنا وقت ہندوستان کی بعض زبانوں کی تحصیل و تحقیق میں صرف کیا تھا اور یہ کتاب ان کی آخری تالیف تھی۔

اردو ادب کی اس تاریخ کی تحقیق و جستجو میں بیلی صاحب نے اپنے دور کے تحقیقی مضامین سے جو اردو رسالوں میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ بھرپور استفادہ حاصل کر کے ۱۰۰ صفحات کے اندر اردو زبان کی پوری تاریخ کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔

ابتدائی اردو کے ابواب کا ماخذ "پنجاب میں اردو" ڈاکٹر شیرانی" اردوئے قدیم" از شمس اللہ قادری۔ "اردو شہ پارے" از محی الدین قادری زور وغیرہ کی کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے۔

رسالۂ اردو کے مضامین جو قدیم اردو کے ضمن میں ان دنوں شائع ہوتے تھے ان کے ماخذ بھی ملتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ رسالۂ اردو کے ماخذ کا کہیں حوالہ موجود نہیں ہے۔

پہلے باب میں شعراء کی فہرست میں کیفی حیدر یادی کا نام ہے۔ لیکن کتاب میں کسی جگہ ان کا ذکر نہیں۔

کتاب میں ابواب کی تقسیم ذیل کے مطابق کی گئی ہے۔

۱ــــ اردو کی ابتدا "جس میں اردو کے نام اور زبانوں میں اردو کی حیثیت سے بحث ہے۔

۲ــــ اس باب میں ابتدائی دور کی تاریخ ہے جس میں صوفی اور عالم شعراء۔ قطب شاہی عادل شاہی ادوار کے شعراء دکن میں مغلوں کے عہد کے مصنفوں اور آخر میں ولی کے نوجوان ہم عصروں کا ذکر ہے۔

۳ــــ اس باب میں دہلی کی شاعری کی پہلی صدی کا حال ہے جس میں حاتم مظہر سے نصیر تک کا ذکر ہے۔

۴ــــ اس باب میں انیسویں صدی کے لکھنوی شاعر ہیں۔ جو خلیق سے رشید و عارف تک ہیں۔

۵ــــ اس باب میں دہلی کے دوسرے عہد اور رام پور کے چار شعراء کا ذکر ہے۔ جو ذوق، غالب سے مجروح تک ہیں۔ امیر، داغ، تسلیم، جلال رام پور کے شعراء میں ہیں۔

۶ــــ یہ باب اردو نثر پر ہے جس میں چند ابتدائی نثار دوسرا، فورٹ ولیم کالج کے مترجمین اور ۱۹ ویں صدی کے ارباب نثر کا تذکرہ ہے۔

۷ــــ یہ باب عہد جدید کے شعراء پر ہے جس میں حالی اور آزاد سے عظمت اللہ خاں تک شامل ہیں

۸ــــ اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے اردو نثر و نظم پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور انجمن ترقی اردو ہندوستانی اکیڈمی، عثمانیہ یونیورسٹی اور دار المصنفین کا سرسری ذکر اور اقبال پر مختصر تبصرہ ہے۔

اس کتاب میں ایسے شعراء کا ذکر بھی ہے جن کا اردو ادب میں کوئی مقام نہیں ہے

ــــ ایسی کتابوں کا ذکر ملتا ہے جن کے مصنف گمنام اور بے نشان ہیں۔

ــــ ایسے غیر معروف شعراء کا ذکر ملتا ہے جن کی کوئی کتاب یا نظم دستیاب نہیں ہے۔

ـ بعض امور کے متعلق مصنف نے ذاتی جدت کا دعویٰ کیا ہے جو محض غلط ہے مثلاً اردو کی تاریخ کی ابتداء دراصل اردو دکن کی اہمیت اور دکنی شعراء کا ذکر وغیرہ

لیکن پہلا دعویٰ "پنجاب میں اردو" سے ماخوذ ہے۔ دوسرا دعویٰ رسالہ "اردو کے مصنف میں "اردوئے قدیم" سے ماخوذ ہے

ذیل میں صفحات سے متعلق اغلاط اس طرح ہیں۔

صفحہ ۲۶: مقتدا "ابو شحمہ" مصنف نہیں یا بولیں نہیں ہے کیونکہ سرنسخہ پر یہ نام "وبا" لکھا ہے۔

صفحہ ۳۱ "یوسف زلیخا" کو ملک خوشنود کی تصنیف بتا کر کہا گیا ہے کہ یہ امیر خسرو کی "یوسف زلیخا" کی پیروی میں لکھی گئی ہے۔ دونوں بیانات غلط ہیں۔ امیر خسرو نے کوئی مثنوی "یوسف زلیخا" نہیں لکھی نہ ملک خوشنود کی کوئی تصنیف "یوسف زلیخا" ہے۔

ہاشمی کی دو تصانیف لکھی گئی ہیں۔ صفحہ ۳۱

(۱) "یوسف زلیخا" (۲) "احسن القصص" یہ ایک ہی کتاب ہے قصۂ یوسف زلیخا کو قرآن میں احسن القصص کہا گیا ہے۔

صفحہ ۳۱ مصنف نے قصۂ ملکۂ مصر و قصۂ فیروز شاہ کے مصنف کا نام محمد علی عاجز لکھا ہے جو غلط ہے حالانکہ مصنف نے اپنی تصنیف ملکۂ مصر میں اپنا نام محمود بتایا ہے۔

صفحہ ۳۲ مصنف نے عارف الدین عاجز کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے ہم نام عاجز کی ایک تصنیف اس سے منسوب کردی گئی ہے۔ عاجز اورنگ آبادی کی کوئی تصنیف کسی دوسرے دکنی عاجز سے منسوب نہیں ہے۔

صفحہ ۳۲ منظوم سب رس شاہ عبداللہ حجری کی تصنیف کا نام "گلشن حسن و دل" غلط ہے اصل نام "گلشن جشن دل" ہے۔

صفحہ ۳۶ ابو طالب، طالب قصبۂ بلنڈہ کے سکونت پذیر تھے۔ میر حسن اور قائم نے یہی لکھا ہے لیکن مصنف نے انھیں حیدر آباد کا باشندہ بتایا ہے۔

صفحہ ۳۷ شاہ قلی خاں کو بھاؤ نگر کا لکھا گیا ہے۔ وہ بھاگ نگر حیدر آباد کے تھے۔

صفحہ ۳۸ قیاسی کا نام سید عبداللہ غلط ہے سیدی عبداللہ صحیح ہے۔

صفحہ ۳۹ آرزو کی یہ تصحیح شدہ لغات "نوادر الفرص" نہیں "نوادر الالفاظ" ہے۔

صفحہ ۳۹ غرائب اللغات " آرزو کی نہیں عبد الواسع ہانسوی کی لغات ہے۔

زیر نظر کتاب میں ایسی بہت سی غلطیاں ہیں لیکن ان تمام نقائص کے باوجود یہ انگریزی زبان میں اردو ادب کی پہلی تاریخ تھی جس میں مختصر طور پر اردو ادب کی تاریخ کا خاکہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ اس سے زبان کی ابتداء کے تغیرات اور ترقی کا عہد بعہد پورا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے۔

انگریزی ادب میں اردو ادب کی اجمالی کیفیت جاننے والوں کے لیے یہ کتاب نہایت مفید ہے۔

تاریخ نظم ونثر اردو

آغا محمد باقر

مولفِ کتاب آغا محمد باقر نے سرورق پر تالیف کی وضاحت اس طرح کی ہے۔

تاریخ نظم ونثر اردو

زبان اردو کی مفصل تاریخ اور اس کی عہد بہ عہد کی ترقیوں پر مفصل بحث زمانۂ ماضی وحال کے شاعروں اور نثر نگاروں کی سوانح عمری اور ان کے کلام نظم ونثر پر سیر حاصل ریویو سن طباعت ۱۹۵۵ء

میں ذیل میں مولف کا بیان تالیف کے مقصد کی وضاحت ہے۔

" بلکہ دنیا کی مشہور اور ضخیم کتابوں کو بڑے بڑے مصنفین نے اختصار سے لکھا ہے اس کے علاوہ وہ ایک مدت سے مجھے یہ بھی خیال تھا کہ آبِ حیات پر جس بے دردی سے اعتراضات کیے جا رہے ہیں ان کا تسلی بخش جواب دینا مجھ پر فرض ہے میں نے سوچا کہ اس کام میں مجھے ایک حد تک ان اعتراضات کے جواب دینے کا نہایت عمدہ موقع مل جائے گا۔ بہر حال میں نے شیخ صاحب سے وعدہ کر لیا کہ میں اس کام کو انجام دوں گا"

اتنی بڑی تاریخ کو تقریباً چوتھائی حصے میں اس طرح قلم بند کرنا کہ کوئی ضروری تو کیا غیر ضروری چیز بھی چھوٹنے نہ پائے، اور انداز بیان بھی اس قدر آسان رہے کہ ہر مشکل مسئلہ آسانی سے سمجھ میں آجائے کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس لیے اس کی تکمیل میں اندازے سے زیادہ تاخیر ہوگئی۔ میری لگاتار کوشش سے آج یہ کتاب ختم ہوگئی ہے۔ اور اب میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ جس ارادہ سے اس کام کو شروع کیا گیا تھا وہ اس سے بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچا۔[۱]

مؤلف کے بیان سے ظاہر ہے کہ یہ تالیف رام بابو سکسینہ کی انگریزی تاریخ ادب اردو کی تلخیص ہے اور آب حیات پر اٹھائے گئے اعتراضات کو رد کرنا مولف نے اپنا فرض سمجھا ہے۔ کیونکہ مولف محمد حسین آزاد کے بھتیجے ہیں۔ رام بابو سکسینہ کی تاریخ کے اردو ترجمے جو حسن عسکری نے کیا تھا ان کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ آب حیات پر لگائے گئے الزامات اور اعتراضات رقم کرنے کے بعد مولف

---

۱ تاریخ نظم ونثر اردو آغا محمد باقر صفحہ ۲-۱

ے ردو زبان کی نشو ونما اور ارتقاء کا مختصر جائزہ لیا ہے۔ زبان اردو کو اس بھاشا کی ایک شاخ
بتایا ہے جس کا تعلق براہ راست شورسینی پراکرت سے تھا۔ ملاحظہ (تاریخ نظم ونثر اردو۔ آغا باقر ص ۸)
حاشیے میں سکسینہ کے نظریے کو قیاس آرائی پر مبنی بتایا ہے۔ دو حصوں پر مشتمل تاریخ نظم
اردو اور تاریخ نثر اردو، اردو کی نشو ونما اور ارتقاء کی مختصر تاریخ ہے نظم میں یہ قلی قطب سے اقبال
تک کے عہد پر محیط ہے۔

نثر میں خواجہ بندہ نواز کے ذکر سے فورٹ ولیم کے داستانی عہد، ناول میں سرشار سے نیاز فتح
پوری، افسانہ میں سدرشن وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ ڈرامہ کی تاریخ پر مختصر اور مفید تفصیل، امانت کے
اندر سبھا کو پہلا ڈرامہ اور ناٹک ساگر پر مختصر تبصرہ ہے۔ صحافت کی ابتداء مولانا محمد حسین کے والد محمد باقر کے
اخبار سے بتائی گئی ہے۔ رسالوں کی ابتداء شرر کے "دل گداز" کو لکھا ہے اصناف میں غزل، قصیدہ،
مثنوی، رباعی، وغیرہ داستان ڈرامہ، ناول، افسانے کی مختصر تعریف کی ہے۔

۱ ـــــ یہ تالیف عملاً مولف کے مفصل تاریخ اور بحث اور نظم ونثر پر سیر حاصل ریویو کے تقاضوں
کو مولف کے بیانات سے رد کر دیتی ہے۔ جس میں موصوف نے اتنی بڑی تاریخ کو ایک چوتھائی حصہ میں
قلم بند کرنے کا دعویٰ کیا ہے خصوصاً شعراء کے حالات اور کلام کی خصوصیات مختصر ہونے کے سبب اظہار
کے کئی پہلو قاری سے چشم پوشی کرتے ہیں مثلاً ص ۲۰ تا ص ۲۱ میں نشاطی، غواصی، وجہی، قطبی، جنیدی،
طبعی، نوری، رستمی، ہاشمی، وجدی وغیرہ کی تفصیلات ایک سے چار سطروں میں تاریخی حقائق سے
ناانصافی کرتے ہیں۔

۲ ـــــ بعض شعراء اور ادبا پر لکھے گئے جملے اپنے مفہوم کی وضاحت سے قاصر ہیں۔ مثلاً میر پر
لکھتے ہیں۔ "میر کی شعر گوئی نے بہت سی من چلی طبیعتوں میں شعر گوئی کا مذاق کر دیا تھا۔ ص ۵۹"
"انگریزی تعلیم نے اردو نظم ونثر پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اس انقلاب کی ابتدا ترجموں سے ہوئی۔"
"انگریزی میں ڈرامہ نظم ونثر اور ہر قسم کے اصناف موجود ہیں۔" ص ۱۲۷
پوری کتاب میں ایسے سینکڑوں جملے ملتے ہیں۔

۳ ـــــ رزمیہ مجلس "کو مثنوی ولی لکھتے ہیں یہ مثنوی ولی ویلوری کی ہے۔

۴ ـــــ مولف نے جہاں کہیں سکسینہ کے اعتراض کا جواب آب حیات کی حمایت میں دیا ہے صرف قیاس

سے کام لیا ہے اور اپنی بات کی کوئی سند پیش نہیں کی۔ مثلاً

"زبان اردو اس بھاشا کی شاخ ہے جو اطراف دہلی میں بولی جاتی تھی اور اس کا تعلق براہ راست شورسینی پراکرت سے تھا۔"

۵ ـــــ خسرو، اکبر، شاہجہاں کا تذکرہ اردو کے ضمن میں سند کا محتاج ہے۔

۶ ـــــ اس تالیف میں مصنف اپنے مقصد کی بار آوری میں بھی ناکام ہوئے اور تاریخ میں اختصار کے سبب تذکرہ کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

۷ ـــــ مولف تاریخی حقائق یا قیاسی نتائج کے اظہار میں اسلوب کے سبب بھی ناکام ہوئے ہیں۔

یہ تالیف تاریخی حقائق کے باوجود تحقیقی استفادہ کے لیے قابل اعتبار نہیں۔ تدریسی مقاصد میں اپنے اظہار سے معذور ہونے کے باوجود بھی اردو ادب کی تاریخ میں اس کا شمار ضروری ہے کیونکہ مولف نے "زبان اردو کی خاص خوبیاں اور اس کے متعلق تحقیق آزاد" کے عنوانات سے کچھ نئی معلومات جو اس عہد میں پس پردہ عیاں کی مگر ڈرامہ کے باب میں چند مفید معلومات اس عہد کی اگلی تاریخوں سے مفقود ہے۔ اردو اکیڈمیوں کا تذکرہ رسم الخط پر کمیٹیوں کی کوششوں کا تذکرہ میں معلومات کے ساتھ تحقیق کا مددگار بن جاتا ہے۔ اس لیے "تاریخ نظم و نثر اردو" اپنے عہد میں ایک اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

مغل اردو

سید نصیر حسین خاں خیال ۱۹۳۴ء

سید نصیر حسین خاں خیال نے ۱۹۱۶ء میں انجمن ترقی اردو کے سالانہ جلسے میں "داستانِ اردو" کے عنوان سے ایک خطبہ پڑھا تھا۔ "مغل اردو" جناب خیال کے خطبے "داستانِ اردو" کا ایک باب ہے۔ جسے ۱۹۲۲ء میں کچھ اضافے اور ترمیم کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔ یہ خطبہ اردو زبان کی تاریخ کا مختصر خاکہ ہے لیکن ۱۹۳۴ء تک ہماری زبان کی وسیع تحقیقات نے اس خطبے کی اصل اہمیت کو کم کر دیا۔

اس کتاب میں لائق مولف کا اصل مقصد یہ دکھانا تھا کہ ہندوستان میں حکمراں مغل خاندان نے اردو کی ترقی و توسیع اور سرپرستی کس طرح کی۔ لیکن اس میں مولف کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی یہ کتاب نامکمل ہونے کے ساتھ غلطیوں کا شکار بھی ہے اور موضوع کے ساتھ انصاف کرنے میں ناکام ہے۔

مولف نے اردو کا تعلق مغل حکمرانوں سے وابستہ رکھنے میں کئی باتیں اور واقعات بعید از قیاس بیان کیے ہیں۔ جیسے سات صفحات میں عالمگیر کی تعلیم نوازی اور علمی سرپرستی کا ذکر ہے۔ لیکن مدلل ثبوت اور تحقیق کے ساتھ پیش نہیں کیے گئے کہ عالمگیر نے اردو پر کیا احسان کیا ہے۔

احمد شاہ کا ذکر بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن مولف یہ بات ثابت کرنے میں ناکام ہے کہ احمد شاہ کا اردو سے کیا تعلق تھا۔ ایک جملہ بھی سند کے طور پر پیش نہ کر سکا۔ حالانکہ احمد شاہ بادشاہ کا تذکرہ بحیثیت شاعر تذکرۂ شورش میں ملتا ہے۔

مولف نے سینہ بہ سینہ روایات کو تاریخی واقعات بنا کر پیش کیا ہے حالانکہ ان واقعات سے تاریخی حقائق مسخ ہو گئے ہیں۔

مولف نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ اشتیاق دونوں کو ایک شخصیت سمجھ کر ان کا ذکر خیر کیا ہے دونوں کا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حیثیت سے ذکر ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"مولانا شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمۃ نے ۱۱۵۰ھ میں قرآن کا ترجمہ کو فارسی میں کیا۔ مگر ان مرحوم نے بھی اردو کے بڑھتے زور کو آخر تسلیم کر لیا اور

اشتیاق تخلص کر کے اس زبان کو بھی پاک اور اس کے عشاقوں کو فرخاک کرنے لگے۔" [1]
مولف نے شاہ ولی اللہ محدث کا سن وفات سنہ ۱۱۸۰ھ لکھا ہے۔ محدث دہلوی کی سنہ ۱۱۷۶ھ
میں وفات ہوئی۔ تاریخی مصرعہ ہے۔

"او بود امام اعظم دین" [2]

فدوی تخلص کے کئی شاعر ہوئے ہیں۔ ایک فدوی کا ذکر تذکرۂ مصحفی میں ہے۔ تو مسلم فدوی
لاہوری، لاہور کا ایک میر محمد حسین کا تخلص بھی فدوی تھا تو مسلم فدوی لاہوری کا شاعر ہے احمد شاہ کے زمانے
کا نہیں ہے۔ مولف نے ولی دکنی کا ذکر اس کتاب میں حقارت سے کیا ہے۔ شاید یہ کم علمی کے سبب ہوا ہے
ملاحظہ ہو۔

"ہمارے تذکروں میں میاں ولی (دکنی) اردو کے باوا آدم کہے جاتے ہیں اور کم نظری
کی وجہ سے آج تک وہ سراہے جاتے ہیں۔ مگر ایک ولی کیا کئی ولیوں نے زبان کی یہ کرامت
کبھی نہیں دکھلائی۔ حق یہ ہے کہ ولی محمد شاہ کے شروع کے زمانے میں اپنا دیوان بغل میں
دبائے گھوڑے کی شناخت کیسے دکن سے دہلی کی ٹکسال گھر تک آئے اور اردو سیکھنے لگے۔" [3]
یہ مولف کی کم نظری کی دلیل ہے کیونکہ اس زمانے میں تذکرہ قائم چھپ چکا تھا۔ اس میں سنہ ۱۱۶۸ھ میں
لکھا ہے کہ سنہ ۱۱۱۲ھ (۴۴ سنہ جلوس عالمگیر) میں ولی دہلی گئے تھے اور محمد شاہ کی تخت نشینی سے بارہ سال
قبل سنہ ۱۱۱۹ھ میں ولی فوت ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ مصحفی اور کئی قدیم تذکروں میں ولی کا محمد شاہ
کے زمانے میں دہلی جانے کا ذکر نہیں ملتا۔ ایسی بہت سی غلطیاں اس کتاب میں موجود ہیں۔
مولف نے زبان کی تدریجی ترقی کا کوئی خاکہ نہیں پیش کیا۔ جیسا اس دور کا تقاضا تھا۔ اردو زبان
کے ارتقائی مدارج اور ارتقائی رجحانات اور مختلف ادوار کی لسانی کیفیات کا جائزہ نہیں لیا گیا۔ ورنہ مستشرق
زبان کے ان مراحل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ کتاب اشعار کے غلط حوالے اور بے ترتیبی کا نمونہ ہے۔ اس کتاب
میں تاریخی غلطیوں کے باوجود محاوروں اور الفاظ کو غلط بتایا گیا ہے ملاحظہ ہو۔

"اس ملک کا خون اس ابدالی کے منہ میں لگ چکا تھا۔"
منہ میں خون لگنا غلط ہے۔ منہ کو خون لگنا ہے صحیح ہے۔

---

[1] مغل اور اردو۔ سید نصیر حسین خاں ص ۱۱۱ [2] مغل اور اردو۔ سید نصیر حسین خاں

"بادشاہ خوش اور رعیت پھولوں نہ سماتی۔" لہ

صحیح محاورہ پھولا نہ سماتا ہے۔

اس کتاب میں کئی جگہ بازار کا اور اس طرح ہے "بزار" زیرِ نظر کتاب کی سب سے بڑی خامی کمزور اور غیر مستند حوالے ذاتی رائے میں بالغ نظری کا فقدان ہے۔ مولف ہونے کی حیثیت سے زبان و بیان کا لہجہ کئی مقامات پر غیر ادبی معلوم ہوتا ہے۔

نقوشِ سلیمانی

سید سلیمان ندوی ۱۹۳۹ء

سید سلیمان ندوی کی یہ ایف ۴۰۴ صفحات پر مشتمل ہے یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۹ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ ہمارے پیشِ نظر طبع سوم ۱۹۸۰ء ہے زبان کے تعلق سے ان کے خطبات، مقالات اور مقدمات کا مجموعہ ہے۔ دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"آج کل ملک میں زبان کے مسئلہ سے جس دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے اس کو دیکھ کر یہ خیال آیا کہ ہندوستانی زبان و ادب کے متعلق اب تک جو تقریریں میری زبان سے اور جو تحریریں میرے قلم سے نکلی ہیں ان کو ایک جگہ شائع کر دیا جائے۔ تاکہ لوگوں کو اس مسئلے کے پہلو کو سمجھنے میں مدد ملے۔ بعد کو جب مجموعہ چھپنے لگا تو مجموعہ کے خیال سے کچھ اور چیزیں بھی اس میں بڑھا دی گئیں۔"

"امید کہ یہ اوراق دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔" کہ

مولانا موصوف مورخ اسلام ہونے کے ساتھ ماہر ادب بھی تھے۔ جس کا ثبوت نقوشِ سلیمانی کے خطبات مقالات اور مقدمات ہیں۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ خطبات ۲۔ مقالات ۳۔ مقدمات

لہ "مغل اردو" سید نصیر حسین خاں صفحہ

کہ "دارالمصنفین" سید سلیمان ندوی ۲۷ اپریل ۱۹۳۹ء صفحہ دیباچہ

۱ــــ خطبۂ صدارت اجلاس شعبۂ ترقی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ پونا کا ہے زبان کی تاریخ پر مختصر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اردو ملک کی ہندوستان کی عالمگیر زبان کا نام ہے۔" [۱]

اردو کے پہلے مصنف پر اظہارِ خیال اس طرح کرتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کا سب سے پہلا حقیقی مصنف جس نے زبان کو سر تسم کی سیاسی، تعلیمی، مذہبی، علمی اور اخلاقی مباحث و مضامین کے قابل بنایا سرسید کی ذات تھی۔" [۲]

یہ خطبۂ اردو تصانیف اور مصنفین اور ترجموں کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔

دوسرا خطبہ :ــ ہندوستان میں ہندوستانی کے عنوان سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۳۲ء میں پڑھا گیا تھا اس میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے بحث کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان میں زبانوں کی کثرت اور بولیوں کا ذکر کیا ہے۔ اور مسلمانوں نے ہندوستان میں کیا کیا ایجادات ہیں، اضافہ اور نام دیے مختلف صوفیائے کرام اور ادارات سے پھیلنے والے الفاظ کی طرف اشارہ کیا ہے اردو کے مختلف نام گنواتے ہوئے انگریزوں کو زبان کی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اردو اور ہندی دو شعبوں سے زبان کا نام اردو ثابت کیا ہے[۳]

اس خطبے میں آخر میں ہندی لفظوں کو اردو میں داخل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

تیسرا خطبہ، خطبۂ صدارت ہندوستانی اکاڈمی ۱۶ جنوری ۱۹۳۷ء کو بمقام لکھنؤ ہندوستانی اکاڈمی کی پانچویں اردو کانفرنس میں پڑھا گیا تھا۔ اور اس میں لکھنؤ کی ادبی خدمات کا مکمل خاکہ پیش کیا گیا تھا۔

ہماری زبان کا نام یہ تقریر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اردو میں ۹ مارچ ۱۹۳۷ء کی رات کو اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کی گئی۔ اس میں ہندوستان کو پرانا سندھو بتایا ہے اور مسلمانوں نے یہاں کی مختلف زبانوں کا ایک نام ہندی رکھا اور یہاں کے لوگوں سے گھل مل کر یہاں کی زبان کو بولنے لگے۔ جس کا نام ہندی یا ہندوی رکھا[۴]

---

[۱] نقوشِ سلیمانی ــ سید سلیمان ندوی ص۳ دارالمصنفین ۱۹۹۰ء

[۲] ایضاً ص۹

[۳] ایضاً ص۶۱

[۴] ایضاً ص۱۰۱، ص۱۱۲

پرانی تاریخوں میں ہندی یا ہندوی کیوں پڑا۔ کن وجوہات کی بناء پر پڑا۔ مختلف حوالے دے کر اس پر روشنی ڈالی اور بتلایا کہ اس زبان کا پرانا نام ہندی تھا جو متروک ہو گیا۔"

"ہمارا مقصد اسی غلطی کی اصلاح اور اسی مرے ہوئے نام کو جلانا ہے۔" [۱]

ہماری زبان بیسویں صدی میں یہ مضمون نومبر ۱۹۲۶ء میں ایک ادبی مجلس کی صدارتی تقریر کے طور پر لکھا گیا تھا۔ اس میں زبان کی پرانی تحقیق و ترتیب کو سراہتے ہوئے حال پر توجہ مرکوز کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اردو زبان کی ترقی کے وجوہات اور اسباب درج ذیل بیان کیے ہیں۔

۱۔ سر سیّد تحریک	۲۔ تعلیم کی عام اشاعت
۳۔ مذہبی تحریکات	۴۔ اردو ہندی کے جھگڑے
۵۔ سیاسی تحریکات	۶۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام
۷۔ قومی زبان کا تخیل	۸۔ آمد و رفت کی سہولت

ان موضوعات کے تحت زبانوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، مسلمانوں کا زیادہ تر ادب رسالے، مذہبی کتابیں اسی زبان میں ہیں۔ اور کتابوں کی فہرستیں دی گئی ہیں۔ اخلاق اور معاشرت نسائیت، قصص، طب، صنعت و حرفت ہر موضوع پر اسی زبان کی کتابوں کی فہرست پیش کی ہے۔ ہندوؤں کا مذہبی، ادبی، سیاسی مواد ہندی میں فراہم ہوتا ہے اس بات پر تقریر کا خاتمہ ہوتا ہے مقالات پر مبنی حصہ اکبر کے ظریفانہ کلام سے شروع ہوتا ہے ولی دکنی سے بات شروع کی ہے اور مختلف ادوار سے اکبر کی شاعرانہ خصوصیات کا فنی اور ادبی جائزہ اشعار کی روشنی میں لیا ہے۔

دوسرا مقالہ اردو انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس میں انسائیکلوپیڈیا کی تعریف اور اردو زبان میں علمی اور ملکی زبان بننے کی صلاحیت کو واضح کرتے ہوئے اردو میں انسائیکلوپیڈیا کی تجویز کے اطلاق پر عمل در آمد نہ ہونے کی بات پر افسوس کیا ہے۔

تیسرا مقالہ زبان اردو کی ترقی کا مسئلہ ہے اس میں انجمن کی کارگزاری کا ذکر کرتے ہوئے مختلف کتابوں کا نام دیا ہے۔ جسے انجمن ترقی شائع کر چکی تھی۔ پروفیسر براؤن کی "زبان اردو کی ترقی" کے خاکے کا ذکر کیا ہے۔ ہماری زبان کی صرف و نحو کی چند کتابوں کے نام تحریر ہیں۔ قواعد، لغت،

---

[۱] نقوش سلیمانی — سید سلیمان ندوی — صد ۱۰۱ — ۱۱۱

محاورات کی کتابوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے آخر میں مشورہ دیا کہ اردو فارسی عربی کی لا کھوں جلدیں لغات المبتدی کی حیثیت سے مرتب کی جائیں۔

چوتھا مقالہ ہوم رول سے پہلے (ہوم لنگویج ملکی زبان) ہے۔ اس تحریک میں سیاسی بنیاد پر زبان کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے۔ اردو زبان کی کتابی ذخیرہ کی مکمل معلومات دی ہے۔

پانچواں مقالہ انجمن اردوئے معلیٰ کے چند سوالوں کے جواب ہیں اس میں زبان کے تعلق سے چند سوالات کے جوابات بہت حسن و خوبی اور دلیل کے ساتھ دیے ہیں۔

چھٹا مقالہ ہاشم علی کے مجموعہ مراثی کا ہے۔ دکن اردو کی جائے پیدائش سے بات شروع کی ہے۔ ہاشم علی کو برہان پور کا شاعر لکھا ہے اور معقول دلیل دی ہے اور اس کے مرثیوں کے مجموعہ کا نام دیوان حسینی بتایا ہے۔ زبان و بیان، الفاظ کے معنی اور مرثیہ کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔

چھٹا مقالہ اردو کیونکر پیدا ہوئی ہے میں بڑی عمیق نظری اور تحقیقی مزاج سے مختلف علاقوں میں اردو رائج ہونے اور مختلف ناموں کے تحت مدلل بات کہی ہے اور عام استعمال میں زبان اردو کا نام صرف اردو بتایا ہے۔ سلہ

مختلف حوالوں اور بیانات کی روشنی میں اردو کو ہندوستانی زبان بتاتے ہیں۔ سندھ کو اردو کا مولد قرار دیا ہے۔ سلہ

ساتواں مقالہ بہار کے نوجوان اور ادب کی خدمت میں، بہار میں اردو ادب کی خدمت میں سرگرداں نوجوانوں کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آٹھواں سفر گجرات کی چند یادگاروں میں گجرات کی تاریخ، دکن اور گجرات میں اردو پر پرانے شعری اور نثری کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ گجرات میں بڑودہ، سورت، بھڑوچ، احمد آباد میں ادبی کتابوں کا ذکر کیا ہے

نواں مقالہ بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق ہے جس میں کرانت، اشرفی، بیمہ، قسری سوس فیرنی، قم وغیرہ کا تاریخی پس منظر، ان لفظوں کے عوامی بولیوں اور زبانوں میں چلن پر روشنی ڈالی ہے۔

سلہ، سلہ نقوش سلیمانی صفحہ ۲۵۵، صفحہ ۲۵۰-۲۴۹

دسواں مقالہ بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق دو ہے۔ یہ دونوں مقالے بڑے اہم ہیں۔ اس میں ذب، دروی، شوربا، قالین، تل، ماتم، شدہ جیسے لفظوں کا ماخذ اور لسانی پس منظر کا جائزہ، عوامی بولیوں اور زبان میں چلن پر تبصرہ کیا ہے۔

گیارہواں مقالہ تہذیب ہے۔ تہذیب کے معنی اور اردو میں دوسرے لفظوں کو ہندوستانی مزاج کے مطابق کس طرح قبولیت حاصل ہوئی بتایا ہے۔ معنی و مفہوم کی روشنی میں تبصرہ کرتے ہوئے لفظوں کے چلن پر بحث کی ہے

بارہواں مقالہ [illegible] ہے۔ [illegible] مختلف چند میووں کا ذکر کیا ہے۔ دور قدیم شعراء سے لے کر دور جدید شعراء کے کلام سے مثالیں دے کر تبدیلیوں کو واضح کیا ہے۔

تیرہواں مقالہ [illegible] اسرار میں کبیر کی بات چیت کا ہے۔ [illegible] اسرار [illegible] مقولوں کا ذکر کیا ہے۔ کبیر اور [illegible] کی بات چیت سے کبیر کے زمانے کی زبان کا پتا ملتا ہے اور کبیر کی شاعری پر مختصر تبصرہ ہے۔

تیسرا حصہ مقدمات پر مبنی ہے۔ پہلا مقدمہ مکاتیب شبلی ہے۔ تمہید کے بعد شبلی کے مکاتیب کا علمی و ادبی حیثیت سے جائزہ لیا ہے۔ مولانا کے خطوط کی خصوصیات چند لفظوں میں یوں بیان کی ہیں۔

"وہ خط نہایت مختصر لکھتے تھے۔ لفظوں کے اختصار کے ساتھ معنی میں پوری وسعت ہوتی تھی۔ القاب و آداب کی پروا نہیں کرتے تھے۔ خط شکستہ اور نستعلیق دونوں میں خط لکھتے تھے۔"[1]

دوسرا مقدمہ مکاتیب مہدی ہے ان مکاتیب کا علمی و ادبی جائزہ لیا ہے۔ درج ذیل ان مکاتیب کی خصوصیت ہے۔ ان میں مصوری کا کمال نہیں۔ تصور فطرت کا جمال ہے۔ قلم میں چلبلا اور البیلا پن تھا نئی لطیف ترکیبوں کے پیدا کرنے کا شوق تھا۔ انگریزی خیالات اور اصطلاحوں کو عربی و فارسی بنا کر پیش کرتے تھے۔ غیر فصیح لفظ برداشت نہیں کرتے تھے۔

تیسرا مقدمہ گلستان امجد ہے۔ گلستان امجد پر مختصر تبصرہ ہے۔ جو سعدی کی گلستاں کا ترجمہ ہے

چوتھا مقدمہ کلام شاد پر ہے جس میں شاد کے کلام کا علمی و ادبی اور فنی اعتبار سے جائزہ لیا ہے اور بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔

پانچواں مقدمہ کلیات عشق کا ہے بہار کے شاعر پر تبصرہ ہے جس میں بہار کی ادبی تاریخ پر بھی مختصر تبصرہ ہے

---

[1] نقوش سلیمانی، مکاتیب شبلی ۔ سید سلیمان ندوی

چھٹا مقدمہ شعلۂ طور حضرت جگر مراد آبادی کے مجموعہ پر تبصرہ ہے۔

"جگر کی شاعری کے معنوی خیالات مختصر ہیں۔ وہ انہیں الٹ پلٹ کر دہراتے رہتے ہیں مگر وہ جب کہتے ہیں تو سننے والوں کو وہ بات نئی معلوم ہوتی ہے۔" ۱؎

ساتواں مقدمہ "چمنستان" ہے صہبائی کے مجموعہ پر تبصرہ لکھا ہے اور اشعار کی روشنی میں ان کے کلام کو زیادہ فلسفیانہ بتایا ہے۔

ساتواں مقدمہ مسدس حالی پر ہے۔ مسدس کی مقبولیت، اس کی مقبولیت میں مانع آنے والی باتوں کا ذکر ہے۔ مسدس کے طریقۂ اظہار پر روشنی ڈالی ہے۔ شاعر کے مزاج اور سامعوں کے پیش نظر بہتر پیا تبصرہ کیا ہے۔

آٹھواں مقدمہ خیابان پر ہے محمود اسرائیلی کے کلام پر تبصرہ کیا ہے اور کلام کو سراہا ہے۔

نواں مقدمہ عطر سخن پر ہے۔ مولوی سید یوسف جمیل صاحب کی منتخب تالیف ہے اردو کے نخبابی مختلف مجموعوں کی خصوصیات بیان کرکے اس تالیف کے انتخاب کو سراہا ہے۔

دسواں مقدمہ حقیقت علمی شاعری ایک مثنوی ہے۔ جس میں اردو شعرا کی تاریخ اور مثنوی کے تحت قومی کی تعریف کی ہے۔

یہ کتاب ادب کے طالب علم اور زبان کے محققین کے لیے بہت مفید ہے مثلاً ص ۹۱ پر زبان کے اردو نام کو انگریزوں کی تقسیم کا کرشمہ بتایا ہے لیکن ص ۲۵۵ پر ۹۰ء کے استعمال سے اردو کا نام تجویز کیا ہے۔

یہ کتاب اس لحاظ سے ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ کیونکہ اس کے مطالعہ سے لسانی، ادبی، تہذیبی، تنقیدی، مذہبی سیاسی حالات بھی سامنے آتے ہیں۔

۱؎ نقوش سلیمانی ص ۲۳۰

اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام

مولوی عبدالحق صاحب ۱۹۳۹ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی یہ تصنیف ۷۲ صفحات پر مشتمل ہے مولوی عبدالحق اردو ادب کے ایسے محسن ہیں جو محتاج تعارف نہیں۔ اردو زبان کے لیے ان کی جدوجہد آزادی سے پہلے خراجِ تحسین کی حقدار ہے۔ ادبی دنیا میں اردو زبان کے لیے تحقیق و تنقید کے میدان میں اسلوب بیان اور اپنے کارناموں کی بنیاد پر انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مقرر کیے گئے۔ اور اس عہدے پر عملاً زبان کی سالمیت اور حقوق کے لیے لڑتے رہے آزادی سے پہلے زبان کے مسئلے پر اردو کو سرکاری زبان (ہندوستانی کے نام سے) بنانے کے لیے انتھک جدوجہد کرتے رہے اور بڑی بڑی کانفرنس میں گاندھی جی جیسی شخصیت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ آزادی سے پیشتر زبان کے حقوق اور حفاظت کے لیے جدوجہد کی تمام روداد اپنے رسالہ "اردو" میں "روداد انجمن ترقی ہند" کے نام عنوان سے تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اور انجمن ترقی ہند کی ایک جامع تاریخ ہے۔ موصوف نے "انجمن ترقی اردو" بورڈ سے "رسالہ اردو" جاری کرنے کے باوجود کئی پرانے مخطوطات اور نسخوں کو منظرِ عام پر لایا۔ اور اردو کی نشو و نما کی تاریخ کو وسعت دینے میں پیش پیش رہے چنانچہ "سب رس" ملا وجہی کی تصنیف، مولوی صاحب کی کوششوں سے ہم تک پہنچی "رسالہ اردو" میں مختلف کتابوں پر تبصروں کے ذریعہ کئی تحقیقی معلومات میں ان کے تبصرے تحقیق کا یہ ذریعہ ثابت ہوئے۔ مولوی صاحب کے تبصرے اپنی مثال آپ ہوتے تھے وہ مصنف کی بڑی سے بڑی غلطی کے طرف ایسے اشارہ کرتے کہ اصلاح بھی ہو جائے اور مصنف کی انا کو ٹھیس بھی نہ پہنچے۔

تبصرہ، تحقیق کے علاوہ "چند ہمعصر" میں عبدالحق نے سیرت نگاری اور لفظوں کے ذریعہ سراپا نگاری کا فرض ادا کیا ہے۔ غرض کہ عبدالحق کے ادبی کارناموں اور علمی کارگزاری کی بنیاد پر انھیں بابائے اُردو کہا گیا ہے۔ ان کے تحقیقی کارناموں میں سے "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" اردو کے ارتقائی دور میں صوفیائے کرام کے ذریعہ پروان چڑھی ہے اور اپنے عہد ۱۹۳۹ء میں تحقیقی طلباء کے لیے بہت اہمیت حاصل کی تھی آج بھی لسانی تحقیقات پر کام کرنے والوں کے لیے مفید ہے۔

کتاب کی ابتدا میں صوفیائے کے مطلب کی وضاحت کی ہے ۔ ظاہر اور باطن کے فرق میں صوفی کو باطن سے منسلک کیا ہے ۔ صوفیائے کرام نے اردو کے ابتدائی جملے کو زبان سے ادا کیا کیونکہ تبلیغ اور دلوں کو موہ لینے کیلئے ایسی زبان کا سہارا لینا ضروری تھا ۔ جو کہ یہاں کی بود و باش اختیار کرنے والے کی سمجھ میں آسکے ۔ اس لیے انھوں نے کچھ اپنی زبان اور کچھ مقامی باشندوں کی زبان کے لفظوں کو اظہار کا ذریعہ بنایا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تیسری زبان بن گئی ۔ جس کو آج ہم "اردو" کے نام سے بولتے ہیں اس سلسلے میں مولوی صاحب نے سب سے پہلے صوفیہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ پر اس کا اطلاق کیا ہے ۔ لیکن انھیں ان کا کوئی ہندی قول نہ مل سکا ۔ اس بات کا اعتراف سلہ کیا ہے ۔ لیکن ان سے منسلک "ہذا اولی" کی ترکیب کو اپنی دلیل کا ثبوت بتایا ہے ۔

شیخ فرید شکر گنج کے متعدد اقوال کا ذکر کیا ہے اور "سیر الاولیاء" کے حوالے سے کچھ اقوال نقل کیے ہیں "جمعات شاہی" حضرت شاہ عالم کے ملفوظات کے مجموعے سے حضرت فرید شکر گنج کا قول نقل کیا ہے ۔ اور ایک غزل ریختہ کے کچھ اشعار بھی پیش کیے ہیں اور انھیں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا مرید بتلایا ہے ۔ شیخ حمید الدین ناگوری کی تصنیف "سرور الصدور" کے حوالے سے یک واقعہ لکھا ہے اور ثابت کیا کہ ان بزرگوں کے گھروں میں ہندی بول چال کا رواج تھا سکہ ۔

شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی کو مندرجہ جملے "تو کا کچھ سمجھ دا ہے ۔" کا حوالہ دیا ہے امیر خسرو کا ایک قطعہ اور چند اشعار ریختی طرز کے دیے ۔ جو قدیم اردو کا نمونہ ہیں ۔ شیخ سراج الدین عثمان کا تعارف میں تاریخ فرشتہ کے حوالے سے ایک جملہ لکھا ہے ۔ شیخ اشرف الدین یحییٰ منیری کے دوہے پروفیسر شیرانی کی کتاب کے حوالے سے لکھا ہے ۔

برہان الدین غریبؒ کے تعلق سے بیوی عائشہ کا ملتانی زبان میں ایک جملہ لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ گھروں میں بھی ایسی بولی بولنے لگے تھے ۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے ۔ "معراج العاشقین" "تلاوت الوجود" داراالاسرار، شکار نامہ، تمثیل نامہ، ہشت مسائل جیسے رسالوں کا حوالہ دیا ہے ۔ حضرت "قطب عالم" کہا ہے کہ لکڑی ہے کہ پتھر ہے ۔ اور شاہ عالم کے

سلہ: اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ۔ مولوی عبدالحق ص۵

سکہ: ایضاً ص۹

جملے " تحفۃ الکرام " سے نقل کیے گئے ہیں۔ سراج الدین ابوالبرکات کے منہ سے نکلے ہوئے کچھ جملے " تحفۃ الکرام " کے حوالے سے نقل کیے گئے ہیں۔

حضرت سید محمد جون پوری کا جملہ " تاریخ سلیمانی جلد اول سے پیش کیا ہے۔ شیخ احمد کھٹو کا ایک جملہ اور دوہا نقل کیا ہے۔ شیخ بہاؤالدین باجنؒ کے کچھ اشعار ان کی تصنیف " خزانۂ رحمت اللہ " سے لیے ہیں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی تصنیف " رشد نامہ " کے حوالے سے جگہ جگہ ہندی دوہوں کا تذکرہ کیا ہے[1]۔

حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کا ہندی قول وجیہ الدین کی تصنیف کے حوالے سے نقل کیا ہے[2]

شیخ بہاؤالدین برناوی خاتم التارکین، سید شاہ ہاشم حسنیؒ، شمس العشاق شاہ میراں جی اور شاہ برہان الدین جانم، شاہ امین الدین علی، قاضی محمود دریائی، شاہ علی محمد جیو گام دھنی تمام بزرگان کا تعارف، اقوال یا اشعار مستند حوالوں سے پیش کیے ہیں۔ تعارف اور حالات بعض کا مختصر اور بعض کا قدرے طویل ہے۔ لیکن مستند حوالوں کی اہمیت کے مطابق مواد پیش کیا ہے۔

اس کتاب کا اصل مقصد مولوی عبدالحق کی زبانی سنیے،

"اب تک میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان صوفی اور اہل اللہ جو ہدایت اور تلقین پر مامور تھے اور جن کا اثر اہل ملک پر بہت بڑا تھا۔ وہ سب ہندی جانتے تھے۔"[3]

یہ کتاب ہرچند مختصر ہے لیکن اپنے موضوع پر مستند کتاب ہے۔ اس کتاب سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زبان سلاطین و امراء سے زیادہ صوفیائے کرام کی کاوش سے پھلی پھولی۔

---

[1] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ ۲۴ انجمن ترقی اردو ہند دہلی

[2] ایضاً صفحہ ۲۵

[3] ایضاً صفحہ ۳۲

ہندو ادیب

ناظر کاکوروی سنہ ۱۹۴۰ء

ناظر کاکوروی کی یہ تالیف اردو زبان کے ہندو ادیبوں کا تذکرہ ہے۔ جو سنہ ۱۹۴۰ء میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ حالات کے پیشِ نظر اردو دشمنی کے دور میں اس کتاب کی اشاعت ہونا مناسب تھا۔

ابتدا میں رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو اور پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری اور مولانا ضیاءالحسن صاحب علوی کی اعترافی تحریریں ہیں۔ سر تیج بہادر کی رائے، اردو کے بارے میں اس دور میں ایسی رہی ہے۔ پروفیسر فراق صاحب کے خیالات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

"میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ آج جس زبان کو اردو اور ہندی کے الگ الگ نام دیے جا رہے ہیں اور جیسے ہندی والے بہت سے غیر ضروری سنسکرت الفاظ سے گراں بار کر کے ملکی زبان سے دور ہٹے جا رہے ہیں اس کی اصل صورت اور زندہ رہنے والی صورت کے خدوخال اور نقوش بہت کچھ اردو ادب میں موجود ہیں۔ ہم ہندوؤں کا تو اُردو پہ مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ حق ہے اور اب ہمیں اس پر قابضانہ قبضہ کرنا چاہیے۔ اگر اردو مٹی تو ہندو اور مسلمان دونوں کا جینا اکارت ہے۔" ؎۱

خواجہ حسن نظامی نے اس کتاب پر ایک دیباچہ تحریر فرمایا ہے جو نہایت بصیرت افروز ہے اس کتاب میں اردو کے ہندو شعراء اور ادیبوں کا تذکرہ ٹیک چند بہار اور رائے تندرام مخلص سے شروع ہوا ہے اور عہدِ حاضر یعنی سنہ ۱۹۴۰ء تک کیا گیا ہے۔ اس کتاب سے پیشتر منشی دیبی پرشاد، خواجہ عبدالرؤف عشرت، اور بابو شیام سندر کے ہندو شعراء سے متعلق تذکرے موجود تھے۔ لیکن کتاب کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ یک دو سطری ادیب اور نثر کے مصنف بھی اس میں شامل کر دیے گئے ہیں در اصل اس دور کے تقاضے کی بنیاد پر اس کتاب کا اس روپ میں آنا بہتر ثابت ہو۔

آج کے دور میں اُسے مکمل کتاب نہیں کہہ سکتے نہ اپنے عہد میں وہ مکمل کتاب تھی لیکن کسی حد تک وہ اپنے وقت کے تقاضوں کو پورا کرتی تھی۔

؎۱ ہندو ادیب ناظر کاکوروی ص

اردو کے ہندو ادیبوں کا یہ چھوٹا سا تذکرہ جامع نہیں کہا جا سکتا۔ بعض ادیبوں اور شعراء کے تذکرے نامکمل ہیں، فرحت، خوشتر، اور تمنا کے ذکر میں ان کی تصانیف کو مکمل کیا مجمل فہرست بھی نہیں دی گئی۔

ان حضرات نے مہابھارت رامائن اور متعدد پرانی ہندو دھرم کی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

بابو شو برت لال جو من جو تقریباً سو کتابوں کے مصنف تھے وہ بھی اس کتاب میں بالکل غائب ہیں۔ انھوں نے بھی اپنشد اور فلسفہ کے شاستر اردو میں ترجمہ کیے ہیں۔

پنڈت منوہر لال زتشی جو اس وقت یوپی کے اونچے درجے کے ادیبوں میں شمار کیے جاتے تھے اس کتاب میں موجود نہیں ہیں۔ پنڈت امرناتھ صاحب، ساحر دہلوی کا ذکر ۲۰۳ صفحات کی ایک جھبکی فہرست میں ملتا ہے حالانکہ انھوں نے نیاز بریلوی کے متصوفانہ تغزل کو اتفاقی جامہ پہنانے کا بہترین کارنامہ انجام دیا تھا۔

ان خامیوں کے باوجود یہ تالیف اپنے عہد میں وقتی ضرورت کے پیش نظر غیر شعوری طور سے لکھی گئی تھی۔ اگر شعوری طور سے کافی غور و خوض کے بعد اس کی طباعت ہوتی تو یہ تالیف مذکورہ تمام خامیوں سے پاک ہوتی۔

مجموعی اعتبار سے اردو ادب میں ہندو ادیب و شعراء پر معلومات کا ایک مرقع ہے جسے کسی بھی صورت سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

داستانِ تاریخِ اردو

سید حامد حسن قادری سنہ ۱۹۴۱ء

(زیر نظر تاریخ ۷۹۵ صفحات پر مشتمل مولف حامد حسن قادری کی تحقیق کا ماحصل ہے اس کی پہلی اشاعت سنہ ۱۹۴۱ء میں، دوسری اشاعت سنہ ۱۹۵۷ء اور تیسری اشاعت سنہ ۱۹۶۶ء میں ہوئی ہے) ہمارے سامنے سنہ ۱۹۶۶ء کا ایڈیشن ہے جس کے پہلے دیباچہ میں مصنف لکھتے ہیں۔

"بہرحال میں نے "داستان تاریخ اردو" میں اس کمی کو پورا کرنا چاہا ہے تاریخ اور ارتقائے اردو کے ساتھ ہر دور کے تمام مشاہیر ادب اور بعض غیر مشہور لیکن ممتاز مصنفوں کے حالات اور ان کی تحریروں کے نمونے درج کیے ہیں۔ ادوار پر تبصرہ بھی کیا ہے۔"[1]

---

[1] داستان تاریخ اردو صـ ج تا صـ سید حامد حسن قادری۔

دوسرے دیباچہ میں وہ رقم طراز ہیں۔

"میں چاہتا تھا کہ دوسرے ایڈیشن میں صرف نظر ثانی اور ترمیم و درستی ہی نہ ہو بلکہ کتاب کو دوبارہ لکھوں۔ لیکن یہ بڑا کام تھا۔ سوچتا اور ارادہ ہی کرتا رہا حتیٰ کہ پاکستان چلا آیا اور کراچی میں آکر بس گیا۔"[۲]

پہلے دیباچہ کے بیان سے ظاہر ہے کہ یہ تاریخ اردو نثر کے مصنفین کی تاریخ ہے جس میں اردو کے ابتدائی دور سے ۱۹۲۱ء تک کے نثر نگاروں کے حالات اور کارناموں کے نمونے ملتے ہیں اور اس کتاب کا نام اس طرح لکھا ہے۔

۷۸۶
۹۲

تاریخ آغاز تالیف

داستان تاریخ اردو ۱۹۲۸ء یعنی

ابتدا سے بیسویں صدی کے شروع تک اردو زبان و ادب کے نشو و نما کی تاریخ "مصنفین نثر اردو" کے حالات اور تصنیفات کے نمونے تاریخ کی ابتدا آغاز اردو سے کی ہے اور حسب روایت گو تم کے زمانہ سے زبانوں کا ذکر کرتے ہوئے سنسکرت، پراکرت اور برج بھاشا پر تبصرہ کیا ہے۔ لیکن اردو کا آغاز پنجاب بتلایا ہے۔ اردو کے مختلف ناموں کا ذکر کرنے کے بعد اس زبان میں صوفیائے کرام کے ملفوظات کے نمونے پیش کیے ہیں درج ذیل صوفیا حضرات حضرت داتا گنج بخش، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، حضرت شاہ علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت امیر خسروؒ، حضرت مخدوم علاؤ الدین، قل محمد صاحب، حضرت شیخ سراج الدین عثمان، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا ذکر کرتے ہوئے اردو میں سب سے پہلی تصنیف نثر خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کی بتاتے ہیں۔ (رسالہ اخلاق و تصوف) ۱۳۰۸ء دکن اور گجرات سے پہلے شمالی ہند میں اردو کا آغاز بتایا ہے لیکن اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس ارتقا پذیر زبان کا مستند مواد پہلے دکن سے فراہم ہوا۔ اردو کی اہمیت اور مقبولیت میں درج ذیل کتابوں اور لغات کا حوالہ دیا ہے جن میں اردو کے الفاظ ملتے ہیں۔

(۱) ابن بطوطہ کا سفرنامہ (۲) لغت ادات الفضلاء (۳) کبیر داس (۴) گرو نانک (۵) تاریخ داؤدی

---

[۲] داستان تاریخ اردو دوسرا دیباچہ صفحہ ۱

(۶) تزکِ بابری (۷) بہادر شاہ گجراتی کا خط (۸) تلسی داس (۹) اکبر بادشاہ (۱۰) شیخ عبدالحق محدث دہلوی

شمالی ہند میں اردو نثر کے دورِ قدیم میں نوری اعظم پوری، کمال الدین مخدوم، شیخ سعدی کاکوروی، محمد افضل جھنجھانوی، پنڈت چندر بھان برہمن، معز الدین خان فطرت، مرزا عبدالقادر بیدل، جعفر زٹلی، میر عبدالجلیل بلگرامی، میرزا عبدالغنی قبول کشمیری، مرزا محمد رضا خان، بہدانی، جیسے اردو کے آغاز و نشوونما کے اس جائزے کے بعد نثر اردو کے چار ادوار قائم کیے ہیں۔ نثر اردو کا دورِ اوّل دکن میں اردو، سلطنتِ بہمنی میں شیخ عین الدین گنج العلم کی پہلی کتاب مسائلِ شرعیہ کے رسالے بتاتے ہیں۔

سلطنتِ عادل میں شمس العشاق شاہ میراں جی، سلطنتِ قطب شاہی میں شاہ میراں جی خدا نما۔ مولانا عبداللہ، ملا وجہی، میراں یعقوب کا ذکر ملتا ہے۔ دکن عہدِ مغلیہ میں سید شاہ محمد قادری، شاہ ولی اللہ قادری، سید شاہ میر، مترجم طوطی نامہ قادری، مترجم طوطی نامہ ابوالفضل دکن میں عہدِ مغلیہ کے بعد کے دور میں محمد باقر آگاہ، دیلوری، شرف الملک مولانا محمد غوث، قاضی بدر الدولہ، دہلی کے علمائے کرام رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کا ذکر اور نمونے پیش کیے ہیں۔

۲۔ نثر اردو کا دوسرا دور کی ابتدا کربل کتھا کے مصنف فضلی سے شمالی ہند میں شروع کیا ہے مختلف نثر نگاروں کے بعد سودا پر مختصر نثری تبصرہ کیا ہے۔ (مرثیہ کے دیوان کا دیباچہ۔ رفیع الدین اور مولوی عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن اور تحسین کی نو طرز مرصع اس دور میں شامل ہے۔

یورپین مصنفین اردو کے زیر بحث یورپین کی آمد کی تاریخ کے بعد پہلا یورپین مصنف اردو میں جان جوشوا کیٹلر (ڈچ) کو بتایا ہے۔ اردو کی کتب، لغات اور قواعد صرف و نحو، اور بائبل کے اردو مترجم میں پادری بنجمن شلز لیٹن زبان میں اردو قواعد اور بائبل کا اردو ترجمہ۔ ان سے ہندوستانی حروفِ تہجی پر ایک مختصر کتاب۔ کیپٹن لوبلی گائی، حروف تہجی پر رسالہ الفابیٹم، ہیڈلے، رف اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ پر کافی تفصیل سے تبصرہ کیا ہے۔ ان کے بعد کپتان ٹامس، گلیڈون، کپتان روبک، جان شیکسپیئر، ولیم ییٹس، ایس فورڈ ارناٹ، پروفیسر گارسن دتاسی، فیلن اور عیسائی مشنری کی کارگزاریاں کا ذکر کیا ہے۔

۳۔ نثر کے تیسرے دور میں فورٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں کا ذکر کچھ تفصیل سے اور کچھ مختصر کیا ہے ان میں میر امن، سید حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، لطف، امیر بہادر علی حسینی، جوان، رشید

نہال چند، منشی بینی نرائن جہاں، للو لال، وغیرہ کے بعد اور فورٹ ولیم کالج کے علاوہ، محمد حسین کلیم، حکیم شریف خاں، انشا، قتیل، شاہ اسماعیل، اعظم علی اکبرآبادی، رجب علی بیگ سرور اور مہجور جیسے نثاروں کا تذکرہ ہے۔

۴۔ چوتھے دور میں شمال اور جنوب دونوں علاقوں سے نثر نگاروں کا انتخاب کیا ہے، سکھ لال فقیر محمد خاں گویا، قطب الدین دہلوی، صدرالدین آزردہ، امام بخش صہبائی، عبدالکریم، غلام امام، ماسٹر رام چندر، امانت لکھنوی، غالب، امام شہیدی، غلام غوث بے خبر، دکن سے محمد ابراہیم بیجاپوری، شمس الامراء ثانی اور محمد عثمان حسینی کا ذکر ملتا ہے۔

۵۔ پانچویں دور میں سرسید اور ان کے معاصرین کو شامل کیا گیا ہے۔ جس میں قطب الدین، نیاز علی پریشان، امیر مینائی شامل ہیں۔

۶۔ چھٹے دور میں محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، مولوی ذکاء اللہ، مولانا شبلی نعمانی سید علی بلگرامی، ڈاکٹر نذیر احمد، سید احمد دہلوی، ناصر، نذیر اور فراق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولف نے ہر دور کے نثر نگاروں کے ضروری حالات اور ان کے کلام کا نمونہ دیا ہے جو کہیں کہیں طوالت کا شکار رہا ہے۔ تنقید بے لاگ ہے عیب اور خصوصیات دونوں پر نظر رکھ کر بحث کی ہے۔ تنقید کا انداز قدیم ہے لیکن اس سے پہلے کی تاریخوں میں ایسے تبصرے بالکل مفقود رہے۔

اس اعتبار سے داستانِ تاریخِ اردو نثر، نثر کی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ آخری ابواب میں غور و فکر اور مطالعے کی بنیاد پر مولف نے نتائج اخذ کیے ہیں جو قابلِ قبول ہیں تنقید کے دوران بعض مقام پر رائے دینے میں اعتدال نہیں برتتے۔

تبصرہ کے درمیان کہیں کہیں اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ مثلاً میر امن پر تبصرہ کرتے ہوئے محاورے روزمرہ تذکیر و تانیث اور ہندی کے الفاظ پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن بعض اچھے موڑوں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس تاریخ پر علی جواد زیدی ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں۔

"ایک بڑے فن پر مواد پھیلا کر دیکھنے کی کوشش تو کی گئی ہے اور یہی کوتاہیوں کا جواز ہے۔"[۱۱]

۱۱۔ تاریخ ادب کی تدوین علی جواد زیدی ص ۵

۱ ــــ اس تاریخ میں اردو کے آغاز و ارتقاء میں بہت زیادہ جھول پیدا ہو گیا ہے ۔ دوسرے دیباچہ میں مصنف کا بیان بھی اس بات کا ثبوت ہے ۔

۲ ــــ صوفیائے کرام کے کئی حوالے غیر مستند ہیں ۔ سنی سنائی باتوں پر اکتفا کا نتیجہ ہیں مثلاً

۳ ــــ ص۱۶ پر خالق باری کو امیر خسروؔ کی تصنیف لکھا ہے ۔

۴ ــــ ص۱۷ پر خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کا (اخلاق و تصوف کے موضوع کا) اردو رسالے سے ماخوذ اقتباس سلیس اور شستہ زبان کے سبب اس عہد کی زبان نہیں ہے ۔ مصنف کے بیان کے مطابق

"دکن سے پہلے تمام شمالی ہند میں اردو کا آغاز ہو چکا تھا اور تصنیف و شاعری بھی ہو چکی تھی" [۱]

یہ بیان صرف شمالی ہند سے عقیدت مندی کا مظہر ہے ۔

۵ ــــ ص۱۸ پر دکن اور گجرات میں ایک ساتھ اردو کا آغاز و ارتقاء بتانا بھی بعید از قیاس بات ہے ۔

۶ ــــ حامد حسن صاحب نے اس کتاب میں مصنفین کی فہرست میں غیر معروف شخصیات کا اضافہ کیا ہے مثلاً مولوی مشتاق حسین نواب وقار الملک ، مفتی صدر الدین آزردہؔ ، مفتی سعد اللہ رامپوری ، سید محمد میر ، عباس بن ناصر علی ، مولوی مسیح الزماں وغیرہ ، اور ان میں بعض لوگ عربی فارسی اور علوم قدیمہ کے بہت ماہر تھے ۔ لیکن اس بنیاد پر اردو ادب میں ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا ۔

۷ ــــ مفتی صدر الدین آزردہ کو محض ایک خط کی بنا پر اور مفتی سعد اللہ کو "فقہ اکبر" کے ترجمہ پر عباس بن ناصر کو "صبح کا ستارہ" کے ترجمہ پر اردو نثر کے مصنفین میں شمار کرنا درست نہیں ۔

۸ ــــ کئی بیانات کا تاریخی اور تحقیقی پس منظر آج تک صاف نہیں لیکن اسے بھی تحقیقی مواد بنا کر پیش کیا ہے مثلاً ص۲۱ پر شیخ عین الدین گنج العلم کے دکنی اردو رسالے لکھنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ۔ [۲]

اردو نثر کی یہ تاریخ اپنے عہد کی پہلی تاریخ ہے جس میں نثر نگاروں پر بے لاگ تبصرے اور معقول تنقیدی رویہ اپنایا گیا ہے بعض مقامات پر اچھے نتائج اخذ کیے گئے ہیں جس میں مولف کی ذاتی کاوش اور غور و فکر کا دخل ہے واقعات کی روشنی میں کچھ اہم اشارے بھی ملتے ہیں ۔

داستانِ تاریخ اردو کو اسی سبب اپنے عہد میں اردو ادب میں ایک اہم اور بے بدل اضافہ کہہ سکتے ہیں ۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے پیشتر سیر المصنفین کی نثری تاریخ اس کمی کو پورا کرنے میں ناکام رہی تھی

۱؎ داستانِ تاریخ اردو سید حامد حسن قادری ص۱۳ ، ۲؎ رسالہ اردو (جنوری ۴۲ء) عبدالحق ص۱۴۶

نظمِ اردو

حکیم ناطق لکھنوی ۱۹۴۱ء

یہ مسدس کی صنف میں منظوم تاریخ ادب اردو ہے۔ اور جناب سید ابوالعلا حکیم ناطق کی نتیجۂ فکر کا حاصل ہے۔ اس کتاب کے شروع میں اپنے عہد کے مشاہیر ادیبوں کی تحریری رائیں ہیں۔ تعارف کشفی صاحب کا ہے۔ پیش لفظ کے ساتھ مصنف کا دیباچہ ہے۔ مشاہیر ادیبوں کی تحریروں میں ناطق صاحب کی ادبی شخصیت کا اعتراف ہے۔ ناطق نے منظوم تاریخ اردو لکھ کر ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ مسدس کے ہر بند پر اکثر مصرعے کے موضوع کے مطابق ایک مفصل حاشیہ ہے۔ یہ حاشیہ بہت اہم ہے۔ کیونکہ اس میں اردو اور اس کے متعلقات کی مکمل معلومات کا مواد ملتا ہے۔ مسدس کے ذریعے ناطق صاحب نے یہ منظوم تاریخ لکھ کر ان لوگوں کے خیال کو رد کر دیا ہے جو اس دور میں کہتے تھے کہ

"اردو نظم میں مسلسل اور مربوط کلام کی گنجائش اور استعداد نہیں ہے۔" [1]

ناطق صاحب نے اپنے عہد میں وضاحت اور تسلسل کے ساتھ اردو کی سوانح عمری اس نظم میں بیان کی ہے۔ آج بھی اہل ذوق سے خراجِ تحسین حاصل کرتی ہے۔

حواشی کے ساتھ اس کتاب کی ترتیب میں ایک عمدہ طریقہ عمل میں لایا گیا ہے یعنی نظم کا ایک بند بائیں طرف کے صفحہ پر اور اسی صفحہ کے بائیں کنارے پر نمونے کے طور پر بند میں مذکور شاعروں کے دو یا چار اشعار دیے ہیں۔

حواشی کا داہنی صفحہ تاریخ اسناد کی شہادت دیتا ہے۔ گویا ایک کتاب میں تین کارنامے شعرا کا تعارف، اردو ارتقاء کے تاریخی اسباب اور منظوم تاریخ ہے۔

اس عہد میں اردو کہاں پیدا ہوئی۔ اس تحقیق میں محققین سرگرداں تھے۔ اس مسئلے کو ایک بند میں کس انداز سے پیش کیا ہے ملاحظہ ہو۔

دہلوی بارۂ اردو میں خریدار زباں
دکنی دربارِ تغلق میں گہربار زباں
عہدِ محمود کی سے ہے پنجاب سرکار زباں
بور دھا تک پہنچے بہار ملے کے زنار زباں

---

[1] رسالۂ اردو۔ عبدالحق۔ ص ۳۱۷ اپریل ۱۹۲۱ء

اک مؤرخ کیا کہے کب اور کہاں پیدا ہوئی　　　ملک میں تاریخ سے پہلے زباں پیدا ہوئی

اس بند کے چاروں مصرعوں پر مفصل نوٹ لکھ کر اپنے خیال کی وضاحت کی ہے۔

۱۹۴۷ء میں ہندو مسلم ملی اور سیاسی اعتبار، کشمکش اور تفاوت کا شکار تھے۔ اس زبان اور مشترک کلچر پر کوئی سوچنے کو تیار نہیں تھا۔ ہندو مسلم رواداری، باہمی اتحاد اور مشترک معاشرے کی شہادت اردو کی پیدائش ہے اس ضمن میں ناطق صاحب فرماتے ہیں کہ ؎

میل میں صبح عرب سے کب تھی شام ہند کم　　　مختلف ہوتے پہ بھی ملتے ہیں زلف و رخ بہم

دلربائی کو بتایا ہند نے پہنچے تا حرم　　　ہو گئے یکجا ایک مل کر کعبہ و بیت الصنم

منسلک آپس میں تھے شیخ و برہمن اس طرح!　　　باہم بغل ہم روش ہو چولی سے دامن جس طرح

اس بند کا حاشیہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے یعنی جو لوگ زبان، کلچر اور معاشرت کو الگ الگ سمجھتے ہیں وہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آیا جو بات حضرت ناطق صاحب نے کہی ہے واقعی صداقت پر مبنی ہے۔ بعض مقامی اور صوبائی تفریق و امتیاز کو ختم کر کے زبان کے ذریعہ متحد ہونے کی جو بات کہی ہے وہ قابل ستائش ہے۔

ناطق نے "نظم اردو" میں جن شعراء کا ذکر کیا ہے اور ان کی اعلیٰ کارکردگی کو سراہا ہے وہ بھی قابل ذکر ہے۔

ذیل کے بند کو انھوں نے مصحفی سے کس طرح منسوب کیا ہے ملاحظہ کیجیے ؎

لکھنؤ سے راہ نکلی ایک نئی تعلیم کی　　　مصحفی نے اک نظام خاص کی تنظیم کی

ان کے شاگردوں نے جو تنسیخ یا ترمیم کی　　　ملک کے ہر ناظم و ناشر نے وہ تسلیم کی

صاف ہو کر اب زبان کے شعلے دلکش ہو گئے　　　جلوہ منسوخات ناسخ نذر آتش ہو گئے

اردو زبان اس عہد میں جن مشکلات سے دوچار تھی اور اپنے ہی وطن میں غریب الوطن ہو گئی تھی۔ نظم کے خاتمے پر اس احساس کو ناطق صاحب کی زبانی سنیے۔

یہ تاریخ چونکہ زبان کے بے شمار واقعات بیان کرتی ہے اس لیے کچھ تاریخوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مقتبس

— اردو کا پہلا شاعر محمد قلی قطب شاہ کو نہیں لکھا۔

شروع میں اس کتاب کے مقدمہ میں اردو شاعری پر تبصرہ ہے اس میں دکنی شعراء کے کلام سے کچھ منتخب اشعار لکھے ہیں۔ جن میں کچھ اشعار غلط ہیں۔ مصنف نے خود اشارہ کیا ہے کہ یہ شعر مہمل ہے۔ یہ مصرع موزوں نہیں ہے۔ اس لفظ کے معنی سمجھ میں نہیں آئے۔ لیکن جن تالیفات کو مصنف نے ماخذ بنایا ہے انھوں نے خود اشعار غلط نقل کیے ہیں۔ ان تالیفات کا نام کہیں نہیں دیا گیا اس لیے یہ غلطیاں حکیم صاحب کے سر آگئی ہیں۔ مثلاً" ؎

ملے ہر حال آکر احد ھادو　　ہوئی دودبیرتے لٹ پٹ بل دو (۲۷)

"حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ دوسرا مصرع اس زمنے کے لحاظ سے بھی ناموزوں ہے۔" لیکن یہاں "دودبیر" لفظ ہے جس کے معنی دونوں جانب ہیں۔ ؎

دلیری سو دیراں ہات میں ہات　　ملائے گرز اور ہور شمشیر کے سات (۲۹)

"دیے ان" کو دیراں لکھا گیا ہے۔

اس مقدمہ میں اشعار کی بہت غلطیاں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے نکالی ہیں۔ اور بڑی تفصیل سے ان اغلاط کی تصحیح کی ہے۔[1]

— تصانیف کے سنین اور شعراء کے حالات میں بھی غلطیاں ہیں۔

— سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دو تخلص لکھے ہیں۔ اردو میں قطب اور فارسی میں معانی حالانکہ اردو اور فارسی دونوں میں ان کا تخلص قطب ملتا ہے۔

— ابراہیم عادل شاہ ثانی کے "نورس نامہ" کو نثری کتاب تحریر کیا ہے جبکہ "نورس نامہ" نظم میں ہے۔ اور اردو زبان میں نہیں ہے۔

— "پنجاب میں اردو" کے حوالے سے جھنجھانہ کو پنجاب کا قصبہ لکھا ہے۔ لیکن مطالعہ کے بعد "پنجاب میں اردو" میں یہ تحریر ملتی ہے کہ قریب جھنجھانہ یا جھنجھنہ ایک بہت پرانی بستی ہے۔[2]

---

[1] رسالہ اردو　اپریل ۱۹۲۱ء　صفحہ ۱۸ تا ۳۱　عبدالحق

[2] پنجاب میں اردو　محمود شیرانی　صفحہ ۱۷۹

مذکورہ اغلاط سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے کیونکہ اپنے عہد سے آج تک یہ منظوم تاریخ اردو واحد اور اپنی مثال آپ ہے۔ سید ابوالعلا حکیم ناطق کے بعد کسی نے بھی اردو کی تاریخ کو منظوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بہر حال یہ نظم سلیس، شستہ اور رواں دواں ہے۔

اُردو اور فارسی کے یورپین شاعر

رام بابو سکسینہ ۱۹۴۴ء

اے بہادر رام بابو سکسینہ کی یہ تالیف تحقیق و جستجو کا بے مثال نمونہ ہے جو ۱۹۴۴ء میں منظر عام پر آیا اس سے پیشتر موصوف کی تاریخ ادب اردو بھی اپنے وقت کی معرکۃ آراء تالیف تھی اس کتاب کی قدر و قیمت اپنے زمانہ میں اس لیے زیادہ ہوئی کہ اس دور میں اردو سے منسلک قاری یورپین شعراء کے معروف ناموں سے تو واقف تھے لیکن سکسینہ صاحب نے اس کتاب میں ایک سو خالص یورپین، ورنیم یورپین جنھیں اردو زبان کے شعر و سخن سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان میں سے بعض کے پورے دیوان منظر عام پر لائے۔ تحقیق اور جستجو کی دوڑ میں اس شخص نے تقریباً اینگلو انڈین شعراء کے علاوہ ارمنی انڈو برٹش، انڈو پرتگیز، انڈو فرینچ، انڈو جرمن، انڈو اٹالین، نیز انڈو یورپین خواتین شاعرات کا بھی سراغ لگایا ہے اس تحقیق کے دوران فاضل مصنف مطبوعہ دیوان، غیر مطبوعہ قلمی دیوان اور نظمیں بڑی جدوجہد کے بعد منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوئے۔ اس کتاب میں تحقیق سے لوگوں کے حالات بھی درج کیے گئے اور ان شعراء کے حالات خاندانی تذکروں اور شجروں کے علاوہ اس زمانے کی معاشرت اور حالات پر بھی نظر رکھ کر معلومات پیش کی گئی ہیں۔ اس کے باوجود کتاب کی تکمیل کے بعد کی معلومات ضمیموں میں موجود ہے۔ کتاب کا مواد ۲۲۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اسی طرح شعراء کا انتخاب کلام تقریباً ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

کلام کا انتخاب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان یورپین اور اینگلو انڈین شاعروں نے اردو زبان کو بڑے ذوق و شوق سے سیکھا تھا کیونکہ ان کا کلام ہر صنف سخن میں موجود ہے۔ قصیدے، مثنویات، رباعیات، غزلیں ان اصناف سخن میں ان کا کلام ۔ ۔ تشبیہات، استعارات، اور تلمیحات روزمرہ، محاورات، ایہام گوئی اور اسلوب کے اعتبار سے ہندوستانی شعراء کے برابر معلوم ہوتا ہے۔

تحقیق وجستجو کے باب میں ہر چیز حرفِ آخر نہیں ہوا کرتی۔ زمانے کے ساتھ ساتھ نئی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ کچھ نئی چیزیں سامنے آتی ہیں کچھ پرانی معلومات رد ہو جاتی ہے۔ لیکن محقق اپنے طور پر احتیاطاً اپنی معلومات کو ہر دور میں صحیح سمجھ کر پیش کرتا ہے اس لحاظ سے اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا چاہیے۔

اُردو کے ہندی ادیب

سیّد قاسم علی ۱۹۴۲ء

سید قاسم علی کی یہ تالیف ۹۵ صفحات پر مشتمل ہے جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی یہ کتاب ہندی زبان اور ناگری رسم الخط میں لکھی گئی ہے اپنے عہد کے وقتی تقاضوں کے اعتبار سے یہ بھی اردو کی خدمت کا جذبہ تھا۔ اردو ادب سے لگاؤ تھا۔ لیکن اس کتاب میں بے پروائی کا نتیجہ درج ذیل اغلاط کی صورت میں رونما ہوا۔

مولانا شبلی کی تصانیف کے اغلاط	صحیح نام
۱۔ شاعر اعظم (معنی لکھے گئے مہا کوی)	شعر العجم
۲۔ سیرت النعمان (نعمان)	سیرۃ النعمان
۳۔ مواجنائے میناو دبیر	موازنۂ انیس و دبیر

مولانا شبلی کی تصانیف پر ذاتی رائے کا مظاہرہ دیکھیے

"شبلی کی کتاب سے علمی ساہتیہ (ادب)، وسعتِ نظر، مذاق اور تنقید اور ساہتیہ کا پتہ لگتا ہے۔" وسعتیات کیا لفظ ہے اس کے معنی نہیں بتائے گئے جو مطالعہ کرنے والوں کو پریشان کرتا ہے اصل وسعتِ نظر ہے۔

ایک مقام پہ الف لیلیٰ کے معنی قوس میں (لڑکی کہانی) لکھے گئے ہیں۔

مولانا عبدالماجد کی ایک کتاب کا نام "فلسفی عشرت عام" ہے۔ مولانا کی کوئی کتاب اس نام کی نہیں ہے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی کی ایک کتاب "جواہر سخن" لکھی گئی ہے اور ذاتی رائے دیتے ہیں کہ

آپ کی کتابوں سے سنسنی پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین پہ رقم طراز ہیں کہ "تلاشِ حق" "جیسی قومی کتابوں کے برابر ترجمے کرتے چلے جاتے ہیں"

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "مولوی مفتی برہان الحق" آپ قومی لیڈر اور حکیمی کر کے اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر عظیم کریوی کو میرٹھ کا باشندہ بتایا گیا ہے۔

ثاقب لکھنوی کو قومی ست عمر لکھا گیا ہے۔

حفیظ جالندھری کی ایک تصنیف کا نام "تاریخِ ہند" بتایا گیا ہے۔ جبکہ حفیظ صاحب کی کوئی کتاب اس نام کی نہیں ہے۔

نواب محسن الملک کے حالات میں لکھا ہے کہ "آپ کی لڑکی طیبہ بیگم تھی ادیب تھیں، جس نے "انوری بیگم" "احمدی بیگم" ناول لکھے ہیں۔ حالانکہ نواب صاحب کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ طیبہ بیگم خدیو جنگ کی بیگم اور نواب عماد الملک کی بیٹی تھیں۔

مولوی نذیر احمد کی تصانیف کے نام غلط لکھے گئے ہیں۔

"نوا نوشتش" "موز بہنا"

احسن مارہروی کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ

"دیوانِ ولی کو آپ نے مفید حواشی کے ساتھ چھپایا ہے۔"

ایسی عجیب و غریب باتیں اور عبارتیں پوری کتاب میں موجود ہیں۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ موضوع کے مطابق ہندی ادیبوں کا ذکر خال خال نظر آتا ہے۔

کتاب کی زبان بہت کمزور، ناقص اور حالات بہت تشنہ ہیں اور زیادہ تر غلط ہیں۔ ہندو ادیبوں کے حالات کم اور کلام کے اقتباسات زیادہ ہیں۔ کتاب کی ضخامت اسی وجہ سے بڑھ گئی ہے۔

ادیبوں کے کلام پر ادبی اور تنقیدی رائیں گو زیادہ تر مختصر واضح اور اکثر بے محل ہیں تو بھی موجود بہت عمدہ تھی۔ جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا۔ لیکن تحقیق اور جستجو سے کم اور قیاسات پر زیادہ بھروسہ کیا گیا ہے۔ ورنہ یہ کتاب اتنی عام غلطیوں کا شکار نہ ہوتی۔

••

دورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعراء

مولوی عبدالشکور ۱۹۴۴ء

یہ تالیف ۱۹۴۴ء میں منظر عام پر آئی اس دور کے تقاضے کے بموجب ایک فرقے کے نمائندہ شاعر کی شناخت ضروری تھی کیونکہ گاندھی جی نے اردو پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ اردو زبان مسلمان بادشاہوں کی زبان ہے۔ مہاتما جی کا یہ بیان ناگپور کانفرنس میں تاریخی حیثیت کا حامل تھا۔

زیر نظر کتاب ایک مقدمہ، زبان کی پیدائش اور ارتقاء کے مختلف مدارج اور اردو شاعری کے مختلف ادوار کی خصوصیات پر مشتمل ہے۔ اس دور کے ادبی رجحانات پر بھی تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے جسے معلوماتی اعتبار سے مفید کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس مواد کے ذریعہ جن شعراء کا کلام پیش کیا گیا ہے ان کا تعلق زمان و مکان سے واضح ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں دور حاضر (۱۹۴۴ء کا زمانہ) کے علاوہ ۱۳۱ ماضی و حال کے ہندو شعراء کے حالات دیے گئے ہیں۔ جن میں کتاب شائع ہونے تک ۲۷ شعراء بقید حیات تھے۔ اردو زبان و شعر و شاعری کی خدمت اسی خلوص سے انجام دے رہے تھے جس کی اپنے اسلاف، آبا و اجداد کے ترکہ کی قدر و منزلت اور محافظ سپوتوں سے توقع کی جا سکتی ہے۔ ان سب حالات زندگی اور نمونہ کلام کے سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اظہار خیال کے علاوہ زبان کی باریکیوں اور اصناف کی خصوصیات میں یہ اپنے مسلم معاصرین سے پیچھے نہیں ہیں۔ اور اگر کسی کو نام نہ بتایا جائے تو یہ پہچان کلام کی بنیاد پر مشکل ہے کہ زیر مطالعہ کلام کسی ہندو شاعر کا ہے یا مسلمان شاعر کا۔

دنیا میں ظہور صبح ہوا گلشن پر کیسا جوبن ہے۔
خورشید کا غنچہ کھلنے لگا اللہ کی قدرت روشن ہے

یہ شعر منشی جوالا پرشاد برقؔ کا ہے اسے کون ہندو شاعر کا شعر کہہ سکتا ہے
ایک مثنوی ملاحظہ برقؔ کی شاعری میں لکھنؤ و دہلی کی زبان کا چٹخارہ ملاحظہ ہو جسے ہندو اور مسلمان سب بولتے ہیں۔

اٹھلاتی لجاتی، مسکراتی
کس ناز سے ہے بہار آتی

کم سن، البڑ، حسین، ایلی
چودھویں کی دلہن موہنی نویلی

ہریالی بنی وطن میں آئی
اک سبز پری چمن میں آئی

اس کے علاوہ دیگر شعراء کے نمونۂ کلام پر نظر دوڑائیں تو ہندو مسلمان کا امتیاز کم نظر آتا ہے

اس کتاب میں سرشار، برق (جوالا پرشاد) شاد، نظر، سرور، چکبست، برق (مہاراج بہادر) ریش اور روان کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام کے علاوہ اس دور کے بقید حیات ہندو شعراء میں ساحر شوق، کیفی، ناشاد، جوش ملسیانی، تلوک چند محروم، وحشی، جگر، اندر جیت شرما، وفا، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، ملا قیس، فرحت، مدہوش، عرش، بیتاب، تاجور، سحر، منور، مہر، اور رام پرشاد بسمل کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام پیش کیا گیا ہے۔ کلام کے انتخاب میں احتیاط اور سلیقہ مندی کا ثبوت ملتا ہے جس سے کتاب کی افادیت کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

اپنے دور کے منتخب ہندو شعراء پر یہ کتاب گراں قدر اضافہ نہ سہی لیکن قابلِ قدر کوشش ضرور ہے۔

ادب کی ایک مستقل تاریخ نہ سہی لیکن ایک فرقہ سے منسلک زبان کے فطری لگاؤ کا ایک نمونہ تو ضرور ہے۔

"دورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعراء" اپنے دور کا تقاضا تھا۔ جسے اردو ادب کا ایک روشن گوشہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کتاب سے ہندو شعراء کے کارناموں اور اردو ادب سے لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو موجودہ دور کے ہندو شعراء کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال ہے۔ ●●

یادگارِ شعراء

ڈاکٹر اسپرنگر ۱۹۴۳ء

ڈاکٹر اسپرنگر نے ۱۸۴۸ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے "شاہانِ اودھ" کے کتب خانہ کی فہرست تیار کرنے کا کام ۱۲ جنوری ۱۸۵۰ء تک پورا کیا تھا۔ اسی فہرست کے پہلے باب کا ترجمہ "یادگارِ شعراء" ہے۔ اس کتاب میں اردو شعراء کے تذکرے ہیں ان شعراء کی کل تعداد ۱۵۱۹ ہے۔ یہ حالات بہت مختصر ہیں اور جس تذکرے سے جو حال لیا ہے اس کا حوالہ دے دیا ہے۔ یہ حالات پندرہ تذکروں سے ماخوذ ہیں لیکن.. فہرست میں مابیشن تذکروں کے نام دیے گئے ہیں۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اس پر دیباچہ لکھا ہے اور تحریر کرتے ہیں کہ فہرست میں شمار شدہ تذکروں میں سے صرف پانچ چھ چھپ چکے ہیں لیکن اس وقت تک تقریباً دس گیارہ تذکرے شائع ہو چکے تھے

اس ترجمہ میں بعض نام غلط درج ہیں۔ مثلاً حرف ب کے تحت پہلے دو نام بابر اور بابر علی ہیں جو صحیح نہیں ہیں۔ ببّر اور ببّر علی ہونے چاہیے تھے۔ یہ فہرست ترجمہ تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے والوں کے لیے کار آمد اور مفید ہے۔

طفیل احمد صاحب نے یہ ترجمہ ۱۹۴۳ء میں کیا تھا اور اس دور کی ضرورت کے مطابق تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے والوں کے لیے اچھا ہے۔

آرٹ اِن اُردو پوئٹری

شہاب الدین رحمت اللہ ۱۹۵۶ء

شہاب الدین رحمت اللہ صاحب کی یہ تالیف ۱۹۵۶ء میں منظرِ عام پر آئی اس سے پیشتر انگریزی زبان میں اردو ادب پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔ اسپرنگر ڈاکٹر بیل اور سکسینہ کی تصانیف کے بعد "آرٹ اِن اردو پوئٹری" بھی اسی نہج کی کتاب ہے۔

اس کتاب میں اردو زبان و ادب کی تاریخ زبان کی عہد بعہد ترقی اور شعری ادب پر سیر حاصل تبصرہ موجود ہے۔ منتخب اشعار میں بعض کا انگریزی ترجمہ اور بعض اشعار کی رنگین سیاہ و سفید تصویریں ہیں

آخر میں ادبی مسائل پر بصیرت افروز بحث نے کتاب کو یک اہم نمونہ بنا دیا ہے اس دور میں اردو غزلوں کے اشعار کو انگریزی میں منتقل کرنا غیر اہم کام تھا۔ اور مصنف نے اس کام کو بہت حسن و خوبی سے انجام دیا ہے اور ترجمہ کا صحیح حق ادا کر دیا ہے۔

شعری مصوری گو اس دور میں ادب و فن کے اعتبار سے قابلِ قدر کاوش نہ سہی لیکن شاعری اور مصوری کے روپ میں دو آتشہ احساس کی نمائندہ ہے۔ کیونکہ دنیا کے مشہور ادب پارے "دیوانِ کومیڈی" شاہنامۂ فردوسی اور دیوانِ غالب جب مصورانہ روپ میں اظہار کا ذریعہ بنے اس وقت ان شعراء و ادباء کے محسوسات و محاکات کی غیر مرئی صلاحیت کا احساس ہوا اور تفہیم کلام میں سہولت اور تاثیر میں اضافہ ہوا یہ اپنے عہد میں "مرقع چغتائی" کے بعد دوسری تالیف ہے جس نے شعرائے اردو کے تصورات کو مصوری کے فن سے رنگ و روغن اور قلم کے منفرد انداز سے منظر بہرہ کیا ہے۔ اس فن کے متعلق اس تالیف سے پہلے علامہ اقبال نے "جشنِ حالی کے موقع پر" جاوید نامہ" کو تصویری زبان دینے کی خواہش ظاہر کی تھی کیونکہ شعری مصوری ان کی نظر میں فنونِ لطیفہ کی ایک بارآور شاخ ہے۔

"اس کتاب میں اشعار کی خیالی صورتیں، منہ بولتی تصویروں کے قالب میں ڈھل کر حواسِ ظاہری کے سامنے حقیقت کا سماں بن کر رہ گئی ہیں"[1]

مولف نے شعر کے آہنگ کو مصوری کی گرفت میں رنگ و خط سے نمایاں کیا ہے۔ جس سے اس فن کی خوبی عیاں ہوتی ہے۔ اور یہ رنگین تصویریں بیگم رحمت اللہ صاحب کی قلمی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ جو اپنے زمانہ میں ایرانی اور مغل آرٹ کی نمائندگی کرتی تھیں، ان تصویروں کی اہمیت کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں کہ ان میں "حسن سپردگی اور سپردگیٔ حسن" کی کشش پائی جاتی ہے۔

رنگوں کی آمیزش خطوط کے دلکش پیچ و خم روحِ شعر کی خاطر آئینہ بندی میں مصروف نظر آتے ہیں ان میں ترتیب و توازن اپنے وقت کا عالم بہار ہے۔ سیاہ و سفید تصویریں رحمت اللہ صاحب کی مصوری اور عکاسی کے مکتبۂ خیال کی نمائندہ نہیں ہیں بلکہ اظہار کی کمی کا بدل ہے۔

شعری اظہار میں تصویروں کی زبان کمال صناعی نہیں بلکہ شاعرانہ گیرائی و گہرائی کی عکس ریزی ہے "آرٹ ان پوئٹری" اپنے عہد کی قابلِ قدر تصنیف ہے۔

---

[1] اداریہ، ماہِ نو ۱۹۵۶ء سید شبیر علی کاظمی ص ۲۹

فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی

نادم سیتاپوری

نادم سیتاپوری کی تصنیف "فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی" فورٹ ولیم کالج کی ادبی تاریخ ہے مقدمہ اور دیباچے کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام سے فورٹ ولیم کالج کے قیام تک ادبی خدمات کا مکمل جائزہ ہے۔ کالج سے منسلک اکرام علی کی خدمات ان کی تصانیف اس کتاب کا اصل موضوع ہیں۔ اکرام علی کے معاصرین اور ان کی خدمات پر تبصرہ اکرام علی کی اہمیت کو روشن کرنے کا ذریعہ ہے اکرام علی کی سوانح حیات کا مکمل خاکہ ان کی تصانیف اخبار کا اجراء ان کی زندگی سے وابستہ دیگر کارنامے اکرام علی کی تصنیف "اخوان الصفاء" کا تاریخی پس منظر اس سے منسلک روایتیں، کتاب کی اہمیت اور موضوعات کی وضاحت تحقیقی انداز میں بیان کی ہے معاصرین میں میر امنؔ، ولاؔ، لطفؔ، حسینیؔ اور حفیظ الدینؔ کی ادبی خدمات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کی تاریخ و ادبی خدمات کی معلومات کے ساتھ ادب کی تاریخ ہے۔ فورٹ ولیم کے ضمن میں ناقص معلومات کو مکمل کرتی ہے۔ اس لیے یہ کتاب ادب کی تاریخ مرتب کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

تذکرہ یوروپین اور انڈو یوروپین شعرائے اردو

خواجہ محمد یوسف سنہ ۱۹۶۱ء

زیر نظر کتاب کے مرتب خواجہ محمد یوسف ہیں یہ کتاب امرتب کے چند لکچروں کا وہ مجموعہ ہے جو اردو مجلس حیدرآباد اور اسٹیڈی سرکل علی گڑھ کلب (حیدرآباد) کے زیر اہتمام انھوں نے دیے تھے۔ ۲۱۸، صفحات پر مشتمل لکچروں کا یہ مجموعہ میں اردو زبان کی دلآ ویزی کا ذکر ستر ادمیں ہے جس کی بدولت انگریز اور دوسری یوروپین اقوام میں یہ زبان مقبول ہوئی خاص طور پر انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو سیاسی حکمت عملی کے تحت اردو کی شہرت اور عمومیت کے آثار دیکھ کر پوری توجہ کی۔ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے فورٹ ولیم کالج اور کچھ ادارے قائم کرنے کا ذکر ہے۔

اس کتاب میں اردو کے آرمینین شعراء، انگریزی شعراء، اینگلو انڈین، انڈو پرتگالی، انڈو جرمن، انڈو فرنچ، انڈو اطالوی اور متفرق انڈو یورپین شعراء پر مختصر تبصرے، نمونے کے اشعار پیش کیے ہیں ان میں سے کچھ ہندوستان کی دوسری زبانوں پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ لیکن اردو کی شیرینی سے متاثر ہو کر اردو شاعری کی طرف مائل ہوئے۔

آخر میں کچھ انڈو یورپین شاعرات کا مختصر تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس زمانے میں اردو زبان میں اپنی جگہ بنا رہا تھا۔

اس تذکرے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اردو زبان کی مسلم اور ہندو شعراء کے علاوہ یورپین شعراء نے بھی خدمات کی ہے۔ اردو کسی ایک قوم کی میراث نہیں کہی جا سکتی۔ کیونکہ اس کی نشو و نما میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور یورپین بھی شریک تھے۔

تاریخی معلومات اور یورپین شعراء کی زبان کو سمجھنے میں یہ تذکرہ ایک نمایاں اہمیت کا حامل ہے اس تذکرے کا مطالعہ کیے بغیر اردو کا مورخ زبان کی تاریخ کو مکمل نہیں کر سکتا۔

علی گڈھ تاریخ ادب اردو

مرتبہ شعبۂ اردو علی گڑھ ۱۹۶۲ء

زیر نظر تاریخ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اسکیم کے تحت پہلی جلد کی صورت میں ۱۹۶۲ء میں اشاعت پذیر ہوئی تھی۔ یہ تاریخ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کی تمہید میں پروفیسر آل احمد سرور نے تاریخ کے پورے منصوبے کو قلم بند کیا ہے۔ اور تاریخ کی کاوشوں کا ذکر کیا ہے اور ان مضمون نگاروں کا شکریہ ادا کیا ہے۔ جنھوں نے تاریخ کی تکمیل میں مدد کی۔ آخر میں یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کا بھی شکریہ ادا کیا ہے۔

اس تاریخ میں سنہ کی قید کے ساتھ درج ذیل عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔

۱۔	تمہید	پروفیسر آل احمد سرور	الف
۲۔	لسانیاتی مقدمہ	ڈاکٹر مسعود حسین خاں علی گڈھ	۱ تا ۵۰

۳- پہلا باب سیاسی اور تمدنی پس منظر پروفیسر محمد حبیب علی گڑھ ۱ تا ۸۹

۴- دوسرا باب : گجرات میں اردو عہد ولی سے پہلے ۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی بمبئی صہ ۸۹-۱۲۱

۵- تیسرا باب : اردو ادب بہمنی دور میں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری حیدرآباد صہ ۱۲۲-۱۸۹

۶- چوتھا باب : اردو ادب میں عادل شاہی دور میں (الف) ڈاکٹر نذیر احمد علی گڑھ صہ ۱۹۰-۲۲۷

(ب) جناب نصیرالدین ہاشمی حیدرآباد صہ ۲۷۵

۷- پانچواں باب : اردو قطب شاہی دور میں ۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور صہ ۲۷۹-۳۲۷

۸- چھٹا باب : ولی اور اس کا عہد ۔ ڈاکٹر ظہیر مدنی بمبئی ۳۲۸ تا ۳۸۱

۹- ساتواں باب : شمالی ہند میں ۔ جناب سخاوت مرزا ۔ حیدرآباد

اردو ادب کے نمونے ۱۷۰۰ء تک ۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھنؤ ۴۱۹ تا ۴۶۸

۱۰- اشاریہ ۵۱۲

۱۱- صحت نامہ ۵۳۹

لسانیاتی مقدمہ میں ڈاکٹر مسعود حسین خان، سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش سے نئی آریائی زبانوں کا جنم بتاتے ہیں اور ان آریائی زبانوں کا ایک روپ اردو بتایا ہے[۱]۔ جگتوں کی شاعری کو کھڑی بولی مستند مواد مان کر لسانیاتی مطالعہ سے پنڈت چندر دھر شرما گالیری کے قول نقل کیا ہے۔

"بدیسی مسلمانوں نے آگرہ، دہلی، سہارنپور اور میرٹھ کی پشچمی بولی کو کھڑی بنا کر اپنے لشکر اور سماج کے مطابق بنا لیا تھا"[۲]

اس مقدمہ میں میر، سودا اور ناسخ کے متروکات کو زبان کے ارتقاء کے سلسلے میں اہمیت دی۔ باب اول سیاسی اور تمدنی پس منظر میں پروفیسر محمد حبیب نے مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کی آمد سے عروج اور زوال تک کے عہد کی تاریخ بتلایا ہے۔ لیکن اس مقالہ میں میل جول اشتراک سے الفاظ کا دوسری زبان میں مستعار لینا ثابت نہیں ہوتا۔ تاریخی حقائق نے دو اقوام میں نئی زبان کو بنانے میں کیا کردار ادا کیا۔ اس کا اظہار نہیں ہوتا۔ دو اقوام کا سنگم سیم و رواج سے زبان تک

---

[۱] علی گڑھ تاریخ ادب اردو صہ ۱۵

[۲] ایضاً صہ ۱۱

معاشرے کو متاثر کرتا ہے لیکن اس بات کو نظر انداز کر کے ہندو اور مسلمانوں، حکمرانوں اور خاندانوں کے عروج و زوال کے تاریخی حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔

زبان کی پیدائش اور بننے اور بگڑنے کے عوامل ان ادوار سے کس طرح منسلک تھا۔ اس موضوع پر کوئی خاطر خواہ نتائج نکالنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ صوفیاؤں کے عقیدت مندوں اور ان کے نظریات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کی تبلیغ نے زبان کے بننے اور ارتقاء پذیر ہونے میں کیا کردار پیش کیا۔ ان واقعات پر کوئی بحث نہیں کی ہے۔ اس باب کا تعلق صرف تاریخ سے ہے۔ تاریخ ادب سے نہیں۔

باب دوم گجرات میں اردو عہد ولی سے پہلے اس باب کے مطالعہ سے نجیب اشرف صاحب کی تحقیق کے مطابق اردو کی ابتداء اور تدریجی ارتقاء گجرات سے وابستہ ہے کئی صفحات گجراتی شعراء اور صوفیاء پر لکھے ہیں۔ گجرات کے صوفیاء، شعراء کی تاریخ لکھی ہے اور ابتدائی کلام پیش کیا ہے جس سے گجرات میں قدیم اردو کا ایک خاکہ ملتا ہے۔

باب سوم اردو ادب بہمنی دور میں عبدالقادر سروری نے دکن میں اردو کی ابتدائی نشوونما اور ارتقاء پذیر زبان کا جائزہ لیا ہے۔ دکن کی قدیم زبان اور صوفیا، شعراء کے بارے میں تفصیل سے حوالہ دیا ہے۔ ثبوت میں قلمی نسخوں اور مخطوطات سے ان کی تحریریں اور کلام کا نمونہ پیش کیا ہے کدم راؤ پدم، خواجہ بندہ نواز کی معراج العاشقین، وجہی کی سب رس، قطب مشتری وغیرہ کے حوالے پیش کیے ہیں۔ بہمنی دور میں اردو زبان، دکن میں، کن شعراء اور ادباء کے ہاتھوں پروان چڑھ رہی تھی۔ ذکر کیا ہے۔

باب چہارم، اردو ادب عادل شاہی دور میں اس کے دو مصنف ہیں۔

(الف) ڈاکٹر نذیر احمد   (ب) جناب نصیر الدین ہاشمی

عادل شاہی دور میں اردو دکن میں، ارتقاء پذیر زبان کی حیثیت سے بہترین شاعر اور ادیب پیش کر رہی تھی۔ عادل شاہی حکمران علم کے قدردان تھے۔ ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اردو زبان کو مالا مال کر رہے تھے۔ اس دور میں شمالی ہند سے سیاسی روابط کا ذکر بھی موجود ہے۔

(ب) میں دکن کے مثنوی نگار صوفیاء اور درباری شعراء کا جائزہ لیا ہے قلمی نسخوں اور مخطوطوں کے حوالے سے عادل شاہی دور میں اردو ایک ترقی یافتہ زبان تھی۔ جو دربار سے بازار تک بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس دور میں اچھے اچھے مثنوی نگار ملتے ہیں۔

پانچواں باب: اردو ادب قطب شاہی دور میں محی الدین قادری زورؔ نے سنہ ۱۵۰۸ء سے سنہ ۱۶۹۶ء تک قطب شاہی سلاطین کے دور میں علمی و ادبی سرپرستی کی تاریخ کا احاطہ کیا ہے۔ اس دور کی مثنویوں کا جائزہ بڑی تحقیق سے لیا ہے۔ زبان کی ارتقائی ہیئت کا تجزیہ، ذریعۂ اظہار، صوتی سہولت، اسلوب سادگی محاوروں پر روشنی ڈالی ہے۔ قلی قطب شاہ، تانا شاہ جیسے حکمرانوں کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔

چھٹواں باب: ولیؔ کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنیؔ اور سخاوت مرزاؔ نے ولیؔ اور ان کے ہم عصر شعراء کے کلام کا تفصیلی جائزہ لے کر ولیؔ کو گجراتی ثابت کیا ہے دکن کی مناسبت پر بحث کیا ہے اور اس ضمن میں معقول دلائل پیش کیے ہیں۔ اور ثابت کیا کہ ولیؔ اپنے عہد کا سب سے اچھا شاعر تھا۔

ساتواں باب: شمالی ہند میں اردو ادب کے نمونے سنہ ۱۰۰۰ء تک نورالحسن ہاشمی کے پنجاب پر غزنوی کے حملے سے بات شروع کی ہے۔ اقوام کے میل جول کے درمیان لفظوں کے دخیل ہونے کا عمل بھگتی تحریک سے اردو ادب کے نمونوں کا حوالہ دیا ہے۔ اس باب کی یہ اہم خوبی ہے۔

اس تاریخ کی تدوین میں مختلف محققین کے مختلف ذرائع سے معلومات میں جھول پیدا ہوگیا ہے۔ ہر مصنف نے اپنی دلیلوں کی روشنی میں روایات سے حقائق تک مواد پیش کیا ہے۔ اس لیے اس تاریخ میں اردو ادب کی تمام تاریخوں سے زیادہ اغلاط رونما ہوئی ہیں۔ ولادت و وفات کے سنین، پرانے نسخوں کے غلط نام شعراء کے اشعار کی غلطیاں، حکمرانوں کے عہد حکومت کے سنین میں اغلاط، حوالوں کی اغلاط کتابت، تشاریہ، انڈیکس، صحت نامہ ہر جگہ بے شمار اغلاط ہوئی ہیں۔

۱ــــ ذیل میں مسلم حکمرانوں اور سیاحوں کے عہد کے سنین میں مقالہ نگار کے درمیان فرق کے اغلاط درج کرتے ہیں۔

محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ کا زمانہ اور عہد

			سنین
۱۔	حبیب صاحب	ص ۵۱	سنہ ۷۱۲ء تا سنہ ۷۱۵ء
۲۔	نورالحسن ہاشمی	ص ۴۵۹	سنہ ۷۱۱ء

(۲) البیرونی کا زمانہ

۱۔	مسعود حسین خاں	ص ۱۵	سنہ ۱۰۱۷ء تا سنہ ۱۰۲۹ء
۲۔	نصیرالدین ہاشمی	ص ۲۹	سنہ ۹۷۳ء تا سنہ ۱۰۴۸ء

محمود غزنوی کی آمد کا زمانہ

۱۔ مسعود حسین خاں — ص ۱۵ — سنہ ۱۰۲۱ء

۲۔ پروفیسر حبیب — ص ۵۱ — سنہ ۹۹۹ء تا سنہ ۱۰۳۰ء

(۳) محمد غوری کا ہندوستان پر حملہ کا زمانہ

۱۔ مسعود حسین خاں — ص ۱۶ — سنہ ۱۱۷۸ء

۲۔ پروفیسر حبیب — ص ۵۳ — سنہ ۱۱۷۲ء تا سنہ ۱۱۷۸ء

۳۔ نورالحسن ہاشمی — ص ۴۶۹ — سنہ ۱۱۸۶ء

(۴) غوری کے ہاتھوں پرتھوی راج چوہان کی شکست

۱۔ مسعود حسین خاں — ص ۱۶ — سنہ ۱۱۹۳ء

۲۔ پروفیسر حبیب — ص ۵۱ — سنہ ۱۱۹۱ء

۳۔ نورالحسن ہاشمی — ص ۴۶۹ — سنہ ۱۱۹۲ء

(۵) قطب الدین ایبک کا دور حکومت

۱۔ پروفیسر حبیب — ص ۵۲ — سنہ ۱۲۰۶ء (وفات شہاب الدین غوری)

۲۔ پروفیسر حبیب — قطبی ص ۵۹ — سنہ ۱۲۰۶ء تا سنہ ۱۲۱۱ء

۳۔ پروفیسر حبیب — ص ۵۹ — سنہ ۱۲۱۱ء تا سنہ ۱۲۳۶ء (شمس الدین التمش کا زمانہ)

۴۔ نورالحسن ہاشمی — ص ۴۵۹ — سنہ ۱۲۱۱ء تا سنہ ۱۲۳۶ء (شمس الدین التمش کا زمانہ)

۵۔ نورالحسن ہاشمی — ص ۴۷۲ — سنہ ۱۳۲۰ء تا سنہ ۱۳۲۵ء (غیاث الدین تغلق کا زمانہ)

(۶) غیاث الدین بلبن کا دور حکومت

۱۔ پروفیسر حبیب — ص ۵۹ — سنہ ۱۲۶۶ء تا سنہ ۱۲۹۰ء

۲۔ نورالحسن ہاشمی — ص ۴۵۹ — سنہ ۱۲۶۵ء تا سنہ ۱۲۸۶ء

(۷) تغلق کا عہد حکومت

۱۔ پروفیسر حبیب — ص ۶۳ — سنہ ۱۳۲۵ء تا سنہ ۱۳۵۹ء

۲۔ عبدالقادر سروری — ص ۱۵۴ — سنہ ۱۳۲۷ء تغلق کا دولت آباد جانا

۳۔ نورالحسن ہاشمی — ص ۲۷۵ — سنہ ۱۳۲۸ء اس واقعہ کا سن

۴۔ پروفیسر حبیب — ص ۶۵ — سنہ ۱۴۱۴ء تغلق کی وفات

۵۔ نورالحسن ہاشمی — ص ۲۷۸ — سنہ ۱۴۱۳ء تغلق کی وفات

(۸) علاؤالدین خلجی کا عہد

۱۔ پروفیسر حبیب — ص ۶۰ — سنہ ۱۲۱۶ء تا ۱۲۹۶ء

۲۔ نورالحسن ہاشمی — ص ۲۷۴ — سنہ ۱۲۹۵ء تا ۱۳۱۰ء

۳۔ نورالحسن ہاشمی — ص ۲۷۵ — سنہ ۱۲۹۴ء

(۹) تیمور کے حملے کا عہد

۱۔ پروفیسر حبیب — ص ۶۵ — سنہ ۱۳۹۷ء (دہلی پر حملہ)

۲۔ نورالحسن ہاشمی — ص ۲۷۵ — سنہ ۱۳۹۸ء (دہلی پر حملہ)

(۱۰) علی عادل شاہ اول کا سال وفات

۱۔ نصیرالدین ہاشمی — ص ۱۵۲ — سنہ ۹۸۶ھ (سنہ ۱۵۹۰ء) یہ سن سنہ ۱۵۸۰-۸۱ء کے مساوی ہے

۲۔ نصیرالدین ہاشمی — ص ۱۹۲ — سنہ ۹۸۸ھ مطابق سنہ ۱۵۸۰ء

(۱۱) محمد قلی قطب شاہ کا سالِ وفات

۱۔ نصیرالدین ہاشمی — ص ۳۶۱ — سنہ ۱۶۱۲ء

۲۔ نصیرالدین ہاشمی — ص ۳۶۵ — سنہ ۱۶[illegible]ء مطابق سنہ ۱۰۲۰ھ

(۱۲) محمد قطب شاہ کا سالِ وفات

۱۔ محی الدین قادری زور — ص ۳۷۳ — سنہ ۱۶۲۵ء

۲۔ محی الدین قادری زور — ص ۳۸۵ — سنہ ۱۶۲۶ء (سنہ ۱۰۲۰ھ)

(۱) ذیل میں کتابوں کے سن تصنیف، صوفیائے کرام ادیب و شعرا کی ولادت و وفات کے اغلاط وغیرہ

سنین۔ ولادت و وفات / حضرت امیر خسرو

۱۔ مسعود حسین خاں — ص ۱۶ — ولادت سنہ ۱۲۵۳ء وفات سنہ ۱۳۲۵ء

۲۔ مسعود حسین خاں — ص ۳۵ — ولادت سنہ ۱۲۵۲ء

۲۔ نورالحسن۔ امیر خسرو کی وفات — ص ۴۴ — وفات از سنہ ۱۳۲۴ء

(۲) پروفیسر حبیب صاحب نے ص ۹۶ پر سیرالاولیاء کو خسرو کی تصنیف لکھ کر سن تصنیف سنہ ۱۳۵۶ء بتایا ہے۔

سیرالاولیاء سید محمد بن سید محمد مبارک کرمانی کی تصنیف ہے اور اس کا سن تصنیف سنہ ۱۳۹۶ء ہے۔

(۳) حضرت روشن چراغ دہلوی کے سن وفات

۱۔ مسعود حسین خاں — ص ۱۸ — سنہ ۱۳۵۶ء ولادت

۲۔ مسعود حسین خاں — ص ۱۹ — سنہ ۱۳۵۲ء وفات

(۴) کبیرداس سن وفات میں دو مقالہ نگاروں کے درمیان تین سال کا فرق ہوتے ہیں۔

۱۔ مسعود حسین خاں — ص ۲۱ — سنہ ۱۵۱۵ء

۲۔ نورالحسن ہاشمی — ص ۴۸ — سنہ ۱۵۱۸ء/سنہ ۱۴۲۵ء

(۵) مولانا افضل جھنجھانوی کی سال وفات دو مقالہ نگاروں کے درمیان تضاد

۱۔ مسعود حسین خاں — ص ۲۹ — سنہ ۱۶۲۵ء

۲۔ نورالحسن ہاشمی — ص ۴۹ — سنہ ۱۶۲۵-۲۶ء

(۶) حضرت خواجہ بندے نواز گیسو دراز کی سن تصنیف "معراج العاشقین" روانگی دہلی در گلبرگہ میں آمد کے سنین میں مقالہ نگاروں میں فرق ہے۔

۱۔ مسعود حسین خاں — ص ۳۲ — سنہ ۱۴۲۲ء تا سنہ ۱۴۱۲ء

۲۔ عبدالقادر سروری — ص ۱۴۲ — سنہ ۱۳۹۸ء، سنہ ۱۴۰۱ء، سنہ ۱۴۱۲ء، سنہ ۱۴۲۱ء

۳۔ عبدالقادر سروری — ص ۱۵۴ — خواجہ بندے نواز کی ولادت ۴ رجب سنہ ۷۲۱ھ بمطابق ۱۳ر نومبر سنہ ۱۳۲۱ء

۴۔ عبدالقادر سروری — ص ۱۵۵ پر گلبرگہ بندہ نواز کی آمد میں تردید کرتے۔ سنہ ۱۴۱۲ء

(۷) بندہ نواز کا دہلی سے واپسی کا سن

۱۔ عبدالقادر سروری — ص ۱۵۵ — سنہ ۱۳۹۸ء (دہلی سے واپسی)

۲۔ عبدالقادر سروری — ص ۱۵۷ — سنہ ۱۳۹۹ء (گلبرگہ پہنچنے کا سن)

۳- نورالحسن ص ۴۷۶ سنہ ۱۳۹۰ء (دہلی روانگی)

۴- نورالحسن ص ۴۷۶ سنہ ۱۴۱۲ء (گلبرگہ پہنچنے کا سن)

۵- نصیرالدین ہاشمی ص ۲۶۶ سنہ ۱۴۲۱ء وفات

۶- عبدالقادر سروری ص ۱۵۶ سنہ ۱۴۲۲ء وفات

(۸) عبدالقدوس گنگوہی کا سن وفات دو مقالہ نگاروں کے درمیان اس طرح ہے۔

۱- مسعود حسین خاں ص ۳۶ سنہ ۱۵۳۸ء

۲- نورالحسن ہاشمی ص ۸۳ سنہ ۱۴۵۵ء تا ۱۵۳۶ء

(۹) شیخ شاہ باجن کے سال ولادت و وفات میں مقالہ نگاروں کے درمیان

۱- مسعود حسین خاں ص ۳۸ سنہ ۱۵۰۶ء وفات

سنہ ۱۳۸۸ء / سنہ ۷۹۰ھ ولادت

سنہ ۹۱۲ھ حاشیے میں

۲- نجیب اشرف ندوی ص ۱۰۵ سنہ ۱۳۸۸ء سنہ ۷۹۰ھ ولادت

سنہ ۱۴۰۹ء وفات ۱۲۱ سال کی عمر پا کر

۳- نصیرالدین ہاشمی ص ۲۵۹ سنہ ۱۳۳۳ء سنہ ۷۰۲ھ ولادت

سنہ ۱۳۸۸ء سنہ ۷۹۰ھ وفات

(۱۰) حضرت شاہ عالم کے عہد میں نجیب اشرف کے نزدیک ایک ہی صفحہ پر فرق ہے۔

ص ۱۰۳ سنہ ۸۹۰ھ سنہ ۱۴۸۵ء

ص ۱۰۳ سنہ ۸۸۰ھ سنہ ۱۴۷۵ء

(۱۱) شیخ عین الدین گنج العلم کا سال وفات

۱- عبدالقادر سروری ص ۵۰ سنہ ۷۹۹ھ سنہ ۱۳۹۶ء

۲- عبدالقادر سروری ص ۱۵۱ انیسویں سطر سنہ ۷۹۵ھ سنہ ۱۳۹۲ء

۳- نورالحسن ہاشمی ص ۴۷۶ سنہ ۱۳۹۳ء

(۱۲) بحری کا سال وفات دو مولفین اس طرح رقم کرتے ہیں۔

۔ نصیر الدین ہاشمی ص ۴۹ سنہ ۱۷۸۱ء سنہ ۱۱۳۰ھ

۲۔ نورالحسن ہاشمی ص ۴۵۹ سنہ ۱۷۱۷ء سنہ ۱۱۲۰ھ

(۱۳) ملا وجہی کی وفات دو مختلف سنین

۱۔ محی الدین قادری زور ص ۳۸ سنہ ۱۶۷۱ء سنہ ۱۰۸۱ھ

۲۔ محی الدین قادری زور ص ۳۸ سولہویں سطر سنہ ۱۶۶۰ء سنہ ۱۰۷۰ھ مساوی ہے
سنہ ۱۶۶۶ء سنہ ۱۶۶۷ء کے

(۱۴) مرزا مظہر جان جاناں کے سنِ وفات ہجری اور عیسوی میں فرق

۱۔ ظہیر الدین مدنی ص ۲۵۵ وفات سنہ ۱۱۹۵ھ سنہ ۱۷۸۰ء
حالانکہ سنہ ۱۱۹۵ھ سنہ ۸۱-۱۷۸۰ء کے مساوی ہے

غلط ماخذ

(۱) مسعود حسین خاں ص ۳۳ خسرو کی مثنوی "نہ سپہر" کے حوالے ریختہ کو زبانِ دہلوی لکھا ہے۔

۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد ص ۲۵۵ نہ سپہر کے حوالے سے ریختہ کو ہندوی بتاتے ہیں۔

(۲) ۱۔ مسعود حسین خاں "خیر المجالس" (ص ۷۱ پر) کو حضرت روشن چراغ دہلوی کی تصنیف بتایا ہے۔
خیر المجالس حضرت روشن چراغ دہلوی کی تصنیف نہیں ہے۔

(۳) ۱۔ مسعود حسین خاں ص ۸۱ پر خان آرزو کی لغت کا نام نوادر الالفاظ لکھا ہے۔

۲۔ مسعود حسین خاں ص ۲۵ تصحیح خان آرزو غرائب اللغات ہندی

۳۔ مسعود حسین خاں ص ۲۹ تصحیح خان آرزو غرائب اللغات ہند لکھا ہے

۴۔ مسعود حسین خاں ص ۳۸ خان آرزو کی لغت نوادر الالفاظ

۵۔ مسعود حسین خاں ص ۴۲ عبدالواسع ہانسوی غرائب اللغات لکھا ہے۔

(۴) ولی کا دیوان دہلی پہنچنے کا زمانہ

۱۔ مسعود حسین خاں ص ۳۰ سنہ ۱۷۱۹ء

۲۔ ظہیر الدین مدنی ص ۲۳ سنہ ۱۷۰۰ء

(۵) شیخ بہاء الدین باجن کی تصنیف "خزائن رحمت اللہ" کے حوالے سے

۱۔	مسعود حسین خاں	ص ۳۵	زبانِ دہلوی ۔ دھلوی کہیں
۲۔	سید نجیب اشرف	ص ۱۵	زبانِ دہلوی ۔ نہیں
۳۔	نصیر الدین ہاشمی	ص ۲۵۹	ہندوی

(۹) نشاطی کے پھول بن کے سنِ تصنیف میں تضاد

۱۔	نصیر الدین ہاشمی	ص ۲۹۲	سنہ ۱۲۵۵ء سنہ ۱۰۶۶ھ
۲۔	محی الدین قادری زور	ص ۳۵۵	سنہ ۱۲۶۶ء سنہ ۱۰۷۶ھ
۳۔	محی الدین قادری زور	ص ۳۵۶	سنہ ۱۲۵۶ء سنہ ۱۰۶۶ھ

اشعار کی غلط نقل ، اوزان ، اعراب ، ایک ریختہ دو بار درج مختلف مقالہ نگار ایک ریختہ

کو مختلف نقل کرتے ہیں ۔ الفاظ ، فرق

(۱) ۱۔ مسعود حسین خاں ص ۱۴ خسرو کا ریختہ

زرگر پسرے چوں ماہ پارا ۔۔۔ کچھ گھڑیئے سنواریئے پکارا

نقد دلِ من گرفت بشکست ۔۔۔ پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

(۲) نور الحسن ہاشمی ص ۱۷

زرگر پسرے چو ماہ پارا ۔۔۔ کچھ گھڑیئے کچھ سواریئے پکارا

نقد دلِ من گرفت وشکست ۔۔۔ پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ پکارا

(۲) ۱۔ مسعود حسین خاں ص ۴۸ چند طبعات ریختی سے منسوب غزل کے دو مصرعے وزن سے خارج ہیں۔ مثلاً

ع "خدا جانے کس شہر اندر ہمن کو لاکے ڈالا ہے۔"

ع "پیا کے ناؤں عاشق' یا عجب دیکھے ہوں"

(۳) نجیب اشرف ص ۹۷ پر نصیر الحق کا ایک شعر غلط لکھا ہے ۔

گیارہ سو او پر باون ہوئے جب

لکھا گوہری منیل یہ قصا تب

(۴) ص ۱۰۲ پر نجیب اشرف شیخ شاہ باجن "خزائن رحمت اللہ" کے حوالے سے یہ شعر غلط نقل

کرتے ہیں ۔

۱۔ ایک بھوڑی ہوں سیو کرنا — موی برتیبیؔ روکھ دیر ہند

۲۔ ایک بدال ہوئی اب دھوتی — ایک باندھ ھاھا ہوتی

۳۔ ایک کبلی ہوئی دوانی — ایک بادل حصندہ رانی

۱۔ سیوڑی۔ دیر نہ ہونا ۲۔ باڑی۔ ہونا ۳۔ بادل حصندہ۔ ہونا

(۵) صفحہ ۳۰ محی الدین قادری زورؔ نے نصرتیؔ کی وفات کے قطعۂ تاریخ میں دوسرا اور چوتھا مصرع غلط لکھا ہے۔

۱۔ ضربِ شمشیر سوں یو دنیا چھوڑ — جا کے جنّت میں خوش ہو رہے

سالِ تاریخ آ ملا یک نے — یوں کہے نصرتیؔ شہید رہے

(۶) صفحہ ۳۹ محی الدین قادری زورؔ نے غواصیؔ کے قطعہ میں بے وزن مصرعے لکھے ہیں۔

ے رزگار میں جو کرم جس کے باب کر — درجہ بلند دے کے نواز یا ثواب کر

ستی پہ جال دنیا کی بکا ایک ہیچ تھی پھر — کیا گناہ اپنے لیے سر پہ لاب کر

(۷) صفحہ ۳۹ پر محی الدین قادری زورؔ نے جنیدی کی مثنوی "ماہ پیکر" کا درج ذیل شعر خارج الوزن کر دیا ہے۔

نین گھایل ہے دل سوتی مجروح سینہ ریش

یو قد برچھا' فرنگ سوکا' پلک کچھوا بعنوان خنجر کر

(۸) صفحہ ۵۲ محی الدین قادری زورؔ ، دوحیؔ کے مرثیہ کا شعر خارج الوزن کر دیا ہے۔

یوں نہ لانے شفق کے دستے ہیں — ہو میں ڈوبے ہیں سب گگن کے گال

(۹) صفحہ ۳۴ ظہیر الدین مدنیؔ نے ولیؔ کے درج ذیل شعر کو وزن سے خارج کر دیا ہے

ولیؔ تو بحرِ معانی کا ہے غواص — ہر ایک مصرع ترا موتیوں کی لڑ ہے

(۱۰) صفحہ ۵۰ نور الحسن ہاشمی نے قزلباش خان امیدؔ سے منسوب غزل میں یہ تین مصرعے غلط نقل کیے ہیں

مصرع — ہاسن کی بیٹھی ایک مری آنکھ میں کھڑی

مصرع — رفتم بہ عیش و گفتم جانم فدائے تست

مصرع — ایسی نہ سیتا اور نہ بھوانی رادھکا

(۱۱) ص۱۰۵ نورالحسن ہاشمی نے جعفر زٹلی سے منسوب غزل کے دو اشعار میں دوسرا اور تیسرا مصرعہ غلط ہے۔

گیسوئے تابدار ہیں یا ناگ ہیں بھجنگ　　یا زلف مشک رنگ ہے نافۂ ختن
چوں ماہتاب روئے او کرنا ہے جھلک جھلک　　یا آفتاب گشتہ درخشندہ درگگن

بے ربط اور غیر ادبی جملوں کا استعمال اس تاریخ میں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو

۱۔ ص۹ "سی طرح تصوف، بھگتی اور انسان دوستی کی دوسری تحریکوں کے اثرات بھی محفوظ رہ گئے ہیں"

۲۔ ص۴۳ "اس زمانے سے لے کر اب تک سخت اختلاف رائے رہا ہے۔"

۳۔ ص۷۵ "راؤ بجن سنگھ نے اچھے شرائط پر صلح کی درخواست کی جس کو اکبر نے منظور کر لیا۔"

ان کے علاوہ کئی جملے بے ربط اور غیر ادبی زبان کا شکار ہیں اس تاریخ میں کتابت کی اغلاط بھی بے شمار ہیں۔ کہیں کہیں ہمزہ کا استعمال بے ضرورت [illegible] کو بگاڑ دیتا ہے۔

غلط نامہ کتاب میں غلطی کی اصلاح کے لیے ہوتا ہے لیکن تاریخ کے غلط نامے میں صحیح بھی غلط کر دیا ہے مثلاً۔ ص۱۵ سطر ۲ پر بیشتر کی بجائے پیشتر ص۵۲۹ پر غلط نامے میں تصحیح کی گئی ہے۔
ص۵۴ سطر ۶ پر تاج الدین بلدوز صحیح ہے لیکن ص۵۲۹ غلط نامے میں تاج الدین یلدوز تصحیح ہے
ص۲۷۸ برہان ماثر کی تصحیح ص۵۴۱ پر برہان ماثر ہے۔

اس تاریخ میں اشاریہ کی ترتیب و تدوین میں بھی بے شمار اغلاط ہیں اس کی تمام اغلاط سے تفصیلی بحث رشید حسن خاں نے کیا ہے۔ [1]"

رشید حسن خاں کے اس مضمون کی بنیاد پر طویل غلط نامے سے اغلاط کی تصحیح کی گئی لیکن اس سے بھی کام نہیں بنا تو یہ "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" واپس لینے کا فیصلہ کیا گیا اور اس طرح اردو ادب کی ایک اچھی تاریخ کا تصور ختم ہو گیا کیونکہ یہ تاریخ تمام تاریخوں کی اغلاط کی تصحیح کی خاطر لکھی گئی تھی لیکن نظر ثانی کرنے والوں اور مقالہ نگاروں کی بے احتیاطی سے کافی سرمایہ رائیگاں ہوا۔ اور ادب کی تاریخ کا موضوع آج تک تشنہ ہے۔ اس کمی کو تاریخ ادب اردو جمیل جالبی نے کسی حد تک پورا کیا ہے۔ حال ہی میں ان کی دو جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

---

[1] ماہنامہ تحریک اکتوبر ۱۹۶۳ء۔ دہلی۔ تاریخ ادب اردو۔ از رشید حسن خاں

تاریخ ادبیات اردو

ڈاکٹر محمد صادق ۱۹۶۴ء

ڈاکٹر محمد صادق کی اس کتاب کا انگریزی نام " اے ہسٹری آف اردو لٹریچر " ہے یہ مقالہ ۱۹۶۳ء میں (آکسفورڈ یونیورسٹی) پیش کیا گیا تھا۔ یہ مقالہ انگریزی زبان میں اردو ادب کی ابتداء دکنی ادب سے شروع ہو کر اقبال اور حفیظ کے عہد پر ختم ہوا ہے تاریخ کے باب میں مصنف کا درج ذیل بیان ملاحظہ ہو۔

ص۲۷ " تاریخ میں واقعات اپنی اصلی شکل میں نہیں بلکہ جس طرح لکھنے والوں کے ذہن منعکس ہوتے ہیں پیش کیے جاتے ہیں۔ اور چونکہ دو ذہن بالکل یکساں نہیں ہو سکتے کسی واقعہ کے متعلق دو لکھنے والوں کا بیان وہ کتنے ہی جانبدار کیوں نہ ہوں۔ ایک نہیں ہو سکتا۔"

لیکن افسوس یہ ہے کہ مصنف نے ایسی ہی غلطیوں کا مظاہرہ کیا ہے یہاں پر چند غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

ص۸۰ سال وفات آبرو ۱۷۵۰ء غلط ہے۔

ص۸۰ سال ولادت آبرو ۱۶۹۲ء غلط ہے۔

ص۸۰ سال ولادت آرزو ۱۶۹۸ء غلط ہے۔ ۱۰۹۹ء سفینۂ خوشگو

ص۸۰ سال ولادت معشوق ۱۶۸۹ء غلط ہے۔

ص۸۰ حاتم " دی لیڈنگ پوئٹ آف دہلی ایج آف محمد شاہ " یہ بیان غلط ہے قدیم تذکروں سے ثابت ہے کہ آبرو، معشوق، یک رنگ، اور سودا، میر و درد کا جو رتبہ تھا وہ حاتم کا نہیں تھا

ص۹۰ ایہام گوئی مصنف کے مطابق ہم سال ۱۷۲۰ء سے ۱۷۵۹ء غلط ہے یہ مظہر کے دور تک جاری رہی۔ اس کی مخالفت میں مظہر نے سب سے پہلا قدم اٹھایا اور یہ صنعت صرف میر حسن تک کے کلام میں ملتی ہے۔

ص۱۱۲ " خان آرزو کی مجمع النفائس میں ان ہندوستانی شعراء کا ذکر ہے۔ جنھوں نے فارسی، ہندوستانی اور دکنی میں شعر کہے تھے۔" یہ بیان غلط ہے۔ آرزو کا تذکرہ علم فارسی گویوں سے تعلق رکھتا ہے۔

ص۹۴ غرائب اللغات اور نوادر اللغات، آرزو سے منسوب کی گئی ہیں حالانکہ غرائب اللغات عبدالواسع ہانسوی کی ہے اور نوادر اللغات نہیں، نوادر الالفاظ آرزو کی ہے۔

ص۹۵ میر کی پیدائش کا مقام الٰہ آباد لکھا گیا ہے اس صفحہ پر دو جگہ میر کا تعلق الٰہ آباد سے دکھایا گیا ہے جبکہ اکبر آباد ہونا چاہیے۔

ص۹۵ میر کی والد کی وفات کے بعد امان اللہ نے میر کی پرورش کی" ذکرِ میر" سے ثابت ہے کہ امان اللہ پدرِ میر سے قبل مر چکے تھے۔

ص۹۶ اللہ وردی خاں ناظم بنگالہ غلط ہے علی وردی خاں صحیح ہے

ص۱۰۷ "خواب و خیال" کو اثر کے عالم شباب کی تصنیف لکھنا غلط ہے۔

ص۱۰۸ میر حسن سنہ۱۷۲۷ء کی پیدائش غلط ہے بلکہ سنہ۱۱۵۰ھ کے لگ بھگ ہے۔ سفینۂ ہندی

ص۱۲۰ مصحفی سنہ۱۱۷۹ھ لکھنؤ آئے۔ مصحفی نے عقدِ ثریا میں لکھنؤ میں آمد سنہ۱۱۹۹ھ لکھا ہے۔

ص۱۲۱ "جواں بخت (جہاندار) اور آصف الدولہ میں ایک درباری حسینہ کی بدولت بگاڑ ہوا" جہاندار شاہ نے لکھنؤ کی ایک طوائف سے نکاح کر لیا تھا۔ اسے درباری حسینہ کہنا غلط ہے۔

ص۱۲۲ انشا عہدِ سعادت علی خاں میں لکھنؤ پہنچے لکھنا غلط ہے کیونکہ انشا عہدِ آصف الدولہ میں لکھنؤ گئے تھے ص۱۲۳ سلیمان شکوہ کی بدولت انشا کو سعادت علی خاں کے دربار میں رسوخ ہوا یہ غلط بیان ہے۔

ص۱۲۵ انشا کو مصحفی کا شاگرد لکھا گیا ہے یہ بیان غلط ہے۔

ص۱۳۳ ناسخ کا سالِ وفات دیا گیا ہے اور زمانۂ ولادت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ص۱۳۳ سرور سالِ ولادت سنہ۱۷۸۷ء غلط ہے۔

ص۱۳۳ سرور سالِ وفات سنہ۱۸۶۷ء غلط ہے ایک معاصر آلِ احمد مارہروی کے دیوانِ تاریخ ص۵۱ پر سرور کا سالِ وفات سنہ۱۲۸۵ھ درج ہے بمطابق سنہ۱۸۶۷ء نہیں ہوگا۔

ص۱۳۳ "فسانۂ عجائب بنارس میں لکھی گئی ہے۔ بالکل غلط ہے۔

ص۱۶۹ "ذوق کے ہزاروں اشعار ایسے لوگوں کی زبان پر ہیں جنھوں نے اس کا نام بھی نہیں سنا۔" یہ بیان مبالغہ آمیز ہے۔

ص۱۷۶ "پدرِ غالب رام پور میں فوجی افسر تھے۔" ان کا رام پور سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

"ہرمز عبدالصمد" غالب نے ہرمزد عبدالصمد لکھا ہے ۔

صفحہ ۲۹۰ "آب حیات" کی بے جا مبالغہ سے بھرپور تعریف کی گئی ہے ۔ مصنف نے سجّاد حسین کے ناول "طرحدار لونڈی" کا ذکر نہیں کیا ۔ حالانکہ اس کا زمانۂ تصنیف فسانۂ عجائب سے پہلے کا ہے اور کتاب بھی نا قابلِ التفات نہیں ہے ۔

مرزا محمد سعید کی "خوابِ ہستی" اور "یاسمین" بھی نظرانداز ہوئی ہیں ۔

نو بے سید محمد کا ڈرامہ "نوابی دربار" کا ذکر ضروری نہیں تھا اس کتاب کی خامی کا سبب دراصل مصنف میں معلومات کی کمی ہے ۔ روایاتی اقوال، غیر مستند بیانات اور مصنف کی ذاتی رائے کا مظاہرے میں فکری عناصر کا کوئی اثر نہیں ہے ۔

مندرجۂ بالا غلطیوں کے علاوہ بھی اس کتاب میں کچھ غلطیوں کو نظرانداز کر دیا گیا ہے ۔

کتابت کی خامیاں بھی اس کتاب میں گاہے گاہے ملتی ہیں ۔

مصنف کے یہاں مطالعہ کی کمی نے ذاتی رائے میں لفاظی کا روپ دھار لیا ہے، اور بے ضرورت مبالغہ آرائی کا سہارا لیا گیا ہے ۔

لہٰذا تحقیقی اعتبار سے یہ کتاب اردو ادب میں خاطر خواہ اضافہ نہ کر سکی ۔

تاریخِ ادبِ اردو (حصہ اوّل)

ڈاکٹر جمیل جالبی سنہ ۱۹۸۱ء

جمیل جالبی کی یہ کتاب ادبی تاریخوں کی خامیوں اور کمی کو پورا کرنے کے مقصد سے لکھی گئی ہے۔ یہ تالیف (قدیم دور میں) آغاز اردو سے سنہ ۱۷۵۰ء تک کے دور پر ۷۹۱ صفحات پر محیط ہے۔ پیش لفظ میں مصنف نے اس کتاب کو چار جلدوں میں لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ یہ کتاب اردو زبان کے ارتقا کی ابتدا سے سنہ ۱۷۵۰ء تک کی تاریخ ہے۔ تمہید میں اردو زبان اور اس کے پھیلنے کے اسباب کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد لسانی، تہذیبی ورثے اور معاشرتی دباؤ، اردو زبان کے ارتقا کے اسباب ہیں۔ یہ تاریخ چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر فصل کے تین ابواب قائم کیے ہیں۔ پہلی فصل کے تین ابواب کی تفصیل اس طرح ہے۔

پہلا باب — مسعود سعد سلمان سے گرونانک تک — سنہ ۱۰۵۰ء تا سنہ ۱۵۲۵ء

دوسرا باب — بابر سے شاہجہاں تک — سنہ ۱۵۲۵ء تا سنہ ۱۶۵۷ء

تیسرا باب — دورِ اورنگ زیب — سنہ ۱۶۵۷ء تا سنہ ۱۷۰۷ء

مذکورہ تین ابواب میں شمالی ہند میں ادب کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فصل دوم چار ابواب پر مشتمل ہے۔ تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

پہلا باب: پانچویں صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری سنہ ۱۰۵۰ء تا سنہ ۱۴۰۰ء

دوسرا باب: نویں اور دسویں صدی ہجری کے ملفوظات سنہ ۱۴۰۰ء تا سنہ ۱۶۰۰ء

تیسرا باب: نویں اور دسویں صدی ہجری کی ادبی روایات سنہ ۱۴۰۰ء

چوتھا باب: دسویں، گیارہویں، بارہویں صدی کے اوائل سنہ ۱۶۰۰ء تا سنہ ۱۷۵۰ء میں گجری، اردو روایت

مندرجہ بالا ابواب میں گجراتی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔

فصل سوم: "اردو دکنی دور میں" کے عنوان سے دو ابواب پر قائم ہے۔

پہلا باب: پس منظر ماخذ دور ادبی و لسانی

دوسرا باب: ادب کی روایت نویں اور دسویں صدی ہجری کے اوائل سنہ ۱۴۲۱ء تا سنہ ۱۵۲۵ء

فصل چہارم: "عادل شاہی دور" سنہ ۱۴۹۰ء تا سنہ ۱۶۸۵ء میں زبان کے ارتقاء کی روداد۔

پہلا باب: پس منظر، روایت اور ادبی و لسانی خصوصیات

دوسرا باب: گجری روایت کی توسیع، ہندوی روایت کا عروج — سنہ ۱۵۲۵ء تا سنہ ۱۶۲۷ء

تیسرا باب: ہندوی و فارسی روایت کی کشمکش — سنہ ۱۶۲۷ء تا سنہ ۱۶۴۰ء

چوتھا باب: فارسی روایت کا عروج — سنہ ۱۶۴۰ء تا سنہ ۱۶۵۷ء

پانچواں باب: غزل کی روایت کا سراغ حسن شوقی — سنہ ۶۴۳ء

چھٹا باب: مذہبی تصانیف پر فارسی اثرات — سنہ ۱۶۴۰ء تا سنہ ۱۶۷۵ء

ساتواں باب: دکنی ادب کا عروج نصرتی — سنہ ۱۶۵۷ء تا سنہ ۱۶۷۵ء

آٹھواں باب: نیا عبوری دور — سنہ ۱۶۵۷ء تا سنہ ۱۶۸۵ء

فصل پنجم: قطب شاہی دور سنہ ۱۵۱۸ء تا سنہ ۱۶۸۶ء تک سات ابواب پر مشتمل ہے تفصیلات ملاحظہ ہوں۔

پہلا باب: پس منظر۔ روایات ادبی و لسانی خصوصیات کا جائزہ

دوسرا باب: فارسی روایت کا آغاز سنہ ۱۵۱۸ء تا سنہ ۱۵۸۰ء

تیسرا باب: فارسی روایات کا عروج، محمد قلی قطب شاہ سنہ ۱۵۸۰ء تا سنہ ۱۶۱۱ء

چوتھا باب: فارسی روایت کا عروج، نظم و نثر میں ملا وجہی سنہ ۱۵۸۰ء تا سنہ ۱۶۴۰ء

پانچواں باب: تین حصوں میں تقسیم ہے۔

(الف) فارسی روایت کی توسیع سنہ ۱۶۲۵ء تا سنہ ۱۶۷۲ء

(ب) دوسرے شعراء کے عنوان سے

(ج) اردو نثر معاصرین شاعر پر سیر حاصل بحث

فصل ششم: فارسی روایت کا نیا عروج۔ ریختہ سنہ ۱۶۸۵ء تا سنہ ۱۷۵۰ء کا احاطہ کرتا ہے۔ اس سے منسلک دو ابواب کی تفصیل اس طرح ہے۔

پہلا باب: ولی دکنی پر مفصل معلومات و بحث

دوسرا باب: معاصرین ولی اور بعد کی نسل کا ہے۔ جس میں ولی کے معاصرین و ما بعد

کی نسل کے شعراء کا جائزہ لیا ہے۔ اختتامیہ اسی فصل سے منسلک ہے جس میں زبان کے ارتقاء کا جائزہ کا اعادہ کیا گیا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو زبان برصغیر پاک و ہند کی عوامی زبان ہے۔ سفر ہذا پچھلے ابواب کے تاریخی اعادے کی صورت میں مختصراً پیش کیا ہے یہ اختتامیہ ۵۸۶ صفحہ نمبر پر ختم ہوا ہے بعد ازاں ضمیمے کے عنوانات کی تفصیل اس طرح ہے۔

(۱) پاکستان میں اردو جس میں پنجاب اور اردو (ابتدائی) ص۵۹۳

(۲) سندھ میں اردو (لسانی اشتراک) ص۶۷۱

(۳) اردو، پنجابی، سرائیکی، سندھی ص۶۹۶

(۴) صوبۂ سرحد میں اردو روایت ص۶۹۹

(۵) بلوچستان کی اردو روایت ص۷۰۹

مذکورہ موضوعات میں اردو زبان کا ارتقاء اور مولد ہر علاقے سے منسوب کیا گیا ہے۔ اشاریہ میں کتابوں کے نام اشخاص، مقامات اور موضوعات کے الگ الگ اشاریے تیار کیے گئے ہیں لسانی اصول کی روشنی میں موصوف کے درج ذیل بیانات جذبات پر مبنی ہے اور تضاد کا شکار

"اس زبان کا مولد ہر وہ علاقہ ہے جہاں مختلف الزبان لوگ آپس میں مل جل رہے ہیں ملنے جلنے کا یہ عمل خواہ پنجاب و سندھ میں ہو رہا ہو یا دہلی، شمالی ہندوستان دکن اور گجرات میں۔" [1]

"مسلمانوں کے الفاظ یہاں کی زبانوں میں شامل ہونے لگے۔" [2]

"آنے والے مسلمان ہندوؤں کے الفاظ صحیح تلفظ و لہجہ سے ادا نہیں کر سکتے ہوں گے۔" [3]

"مسلمان جس زبان کو شمال سے اپنے ساتھ لائے تھے اور جس کے خون میں ان کی قوت عمل اور نظام خیال کی توانائی شامل ہو گئی تھی۔" [4]

---

۱ "تاریخ ادب اردو" جلد اوّل۔ جمیل جالبی ص۵۸۶

۲ ایضاً ص۵۹۶

۳ ایضاً ص۵۹۶

۴ ایضاً ص۱۵

لسانی ارتقاء کی بحث میں متضاد بیان ، زبان کے ارتقائی اسباب و وسائل کا ذریعہ محض مسلمان یا کسی ایک قوم سے جوڑ دینا بھی غیر دانشمندانہ اقدام ہے درج ذیل بیان زبان کی تاریخ پر علاقائی عصبیت کی مہر لگاتا ہے اور لسانی تحقیق کے ضمن میں تمام تحقیقی مواد اصول اور ضابطوں کی روشنی میں معتبر نہیں ہے کیونکہ مولف کے طرز استدلال سے ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف نے عربی و فارسی لفظوں کی کمی بیشی کو زبان کی پہچان اور اس کے ارتقاء کا پیمانہ بنایا ہے ۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"مغربی پاکستان کی سب زبانوں میں جو چیز قدر مشترک ہے وہ اردو زبان اور اس کا ذخیرۂ الفاظ جس میں اسلامی روح اس طرح سرایت کیے ہوئے ہے کہ اسلام اور اردو ایک دوسرے کے ترجمان اور علامت بن گئے ہیں۔" [1]

لسانیات کے قواعد کی روشنی میں اصولاً زبان میں اسماء کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے زبان کے ڈھانچے کی تعمیر کرنے والے عناصر کو اولیت دی جاتی ہے۔ جمیل جالبی نے اس حقیقت کو بھول کر مذکورہ بالا بیان دیا ہے۔

درج ذیل بیانات کذب و اختراع کا شکار ہیں کیونکہ ان کے ماخذ اور حوالوں میں عدم مطابقت ہے،

"اس دور میں اردو زبان مدرسوں اور مکتبوں میں عام طور پر ذریعۂ تعلیم بن جاتی ہے۔" [2]

"ایک مصنف شیخ محبوب عالم ساکن جھجر ہیں یہ بھی عہد عالمگیر کے بزرگ ہیں۔" [3]

"امیر خسرو ۹۹ تصانیف کے مالک تھے۔" [4]

"خالق باری کو امیر خسرو کی تصنیف تسلیم کیا ہے۔" [5]

"شاہجہاں کے عہد میں لکھتے ہیں" شاہی ملازمتوں کے لیے اس زبان سے واقف ہونا ضروری قرار دیا جاتا ہے۔" [6]

---

[1] "تاریخ ادب اردو" جلد اول ۔ جمیل جالبی ص ۶۶۹

[2] ایضاً ص ۷۷

[3] ایضاً ص ۸۰

[4] ایضاً ص ۲۷

[5] ایضاً ص ۲۹ تا ص ۳۲ [6] ص ۲۷

درج ذیل بیان اردو کی عقیدت یں جذبات سے لبریز حقائق سے دور ہے

"یہاں یہ بات بے محل نہ ہو گی کہ پنجاب اور اہل پنجاب سے اس زبان کا رشتہ ناطہ روز اول سے ہی قائم ہے۔" [۱]

سہ — اس بستی کا کیا پتیارا — آج تمھوں کل رو جوں مارا [۲]

سگ — سو کیوں تس کو دھر سے پیارا [۳]

مولف نے جیو گتام کے کلام کے مذکورہ مصرعوں کو "بحر ہزج مربع سالم" کا وزن قرار دیا ہے۔ حالانکہ تقطیع کرنے پر بحر متقارب بنتی ہے موصوف نے مزاحف کو سالم بنا دیا ہے۔

مولف عہد شاہجہاں کے ولی رام ولی اور چندربھان برہمن کو ریختہ گو شاعر درج کرنے کے بعد ولی کے باب میں دہلی میں ریختہ گوئی کا رواج ولی کے دیوان کی آمد کو تسلیم کیا ہے۔ مسعود سعد سلمان کے متعلق لکھتے ہیں۔ "وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے شاعر تھے۔" [۴]

ناصر علی سرہندی کے لیے لکھا ہے کہ

"اس دور کے عظیم المرتبت شاعر ہیں۔" [۵]

خوب محمد چشتی پر لکھتے ہیں کہ

"خوب محمد چشتی اس نئے ادبی و تہذیبی رجحان کے ترجمان اور نمائندہ ہیں۔" [۶]

اس تاریخ کے بابت، اتنا کہنا ضروری ہے کہ محققانِ ادب قیاسات سے حقائق کی طرف رجوع ہوتے ہیں لیکن جمیل جالبی نے حقائق سے قیاسات کی بنیاد پر نتائج اخذ کرنے کا کام انجام دیا ہے۔

بقول رشید حسن خاں صاحب

۱۔ "تاریخ ادب اردو" جلد اول۔ جمیل جالبی ص ۲۲

۲۔ ایضاً ص ۱۱۴

۳۔ ایضاً ص ۱۱۴

۴۔ ایضاً ص ۱۱

۵۔ ایضاً ص ۱۳۲

۶۔ ایضاً ص ۱۲۸

"جمیل جالبی نے اس دور میں شیرانی صاحب کی حکمت کا سہارا لیا اور اپنی باتوں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے غیر معتبر حوالے ہی نہیں بلکہ بے بنیاد نتائج بھی اخذ کر لیے ہیں۔" [۱]

ان جملہ خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود ایک جامع تاریخ ہے۔ جو خامیوں اور کمی کو پورا کرنے سے معذور سہی، لیکن موضوع سے متعلق سیر آب کرنے میں کامیاب ہے کچھ تاریخی حقائق اور تحقیقی وسائل پر جمیل صاحب کو دوسری تاریخوں کی روشنی میں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

یہ تاریخ تدریسی اور تحقیقی تقاضوں کو کافی حد تک پورا کر سکتی ہے اس عہد میں اردو زبان اور ادبی تاریخ پر ایک مفید اور اچھی کتاب کہی جا سکتی ہے۔

تاریخ ادبِ اردو جلد دوم ۱۹۸۲ء سندھ

ڈاکٹر جمیل جالبی

تاریخ ادب اردو (اٹھارویں صدی) جمیل جالبی کی تحقیقی کاوش ہے یہ تاریخ دو حصوں میں ۱۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے حصہ اول میں پیش لفظ کے بعد تمہید کے پہلا باب اٹھارویں صدی کے سیاسی منظر، طرز فکر تہذیبی و معاشرتی رویے سے شروع ہوتا ہے۔ مصنف اس عہد کے سیاسی منظر، طرز فکر میں قومی زوال اور شعراء اور ادباء پر اس کے اثرات کا جائزہ لے کر معقول نتائج اخذ کرتا ہے۔

دوسرے باب میں اردو شاعری، رواج، کشمکش، اثرات، محرکات و میلانات کے عنوانات کے تحت شاعری کے عروج، ماحول اور تخلیقی کاوشوں میں زبان کے بننے سنورنے کا حال مصنف نے دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

فصل اول: شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدائی روایت کے عنوان سے پہلا باب ہے۔ حصہ (الف) میں مذہبی شاعری (ب) میں لسانی خصوصیات شمال و دکن کی زبانوں کا فرق بتلایا ہے ان میں مذہبی شاعری کے نمونے اور ان میں لسانی رد و بدل کی خصوصیات کا جائزہ پیش کیا ہے اور شمال و دکن کی زبانوں کا فرق بہترین دلائل کے ساتھ واضح کیا ہے۔ اسی باب میں رزم نامے کے عنوان سے رزمیہ کلام ہے۔ جس میں مرثیے اور مختلف مثنویوں کے نمونے پیش کیے ہیں۔

تیسرے باب میں طنز و ہجو کی روایات کے تحت جعفر زٹلی کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔

فصل دوم کے پہلے باب میں فارسی کے ریختہ گو بیدل اور شاہ گلشن پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ دوسرے حصے میں فارسی کے ریختہ گو آرزو اور مخلص کے کلام کے نمونے اور تبصرہ ملتا ہے۔ فصل سوم کے پہلے باب میں ولی دکنی کے اثرات، تخلیقی رویے، شاعری کی پہلی تحریک ایہام گوئی پر بحث کرتے ہوئے ولی کے کلام کا اثر زبان و بیان کے لحاظ سے شمالی ہند کے شعراء پر لکھا ہے۔ دوسرے اور تیسرے باب میں ایہام گو شعراء، آبرو، اور ناجی چوتھے میں غیر ایہام گو شعراء، اشرف، فائز وغیرہ کے کلام کو پیش کیا ہے اس دور میں ایہام گوئی کی وجوہات معاشرے سے متاثر لوازمات شاعر عشق اور امرد پرستی کے اسباب، اور مندرجہ بالا شعراء کے مخصوص رویے پر بحث کی ہے۔

فصل چہارم کے تین ابواب میں، ایہام گوئی کے رد عمل کے شعراء مظہر جان جاناں اور شاہ حاتم کا ذکر ہے۔ فصل پنجم میں رد عمل کی تحریک کی توسیع کا بیان ہے پہلے باب میں میر و سودا کا دور کی ادبی اور لسانی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ دوسرے باب میں میر تقی میر کی حیات، سیرت تصانیف پر معاشرے کے اثرات کو واضح کرتے ہوئے ان کے کلام کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اصناف سخن میں غزل اور مثنوی کا لسانی تجزیہ کیا ہے۔ تیسرے باب میں محمد میر تقی میر کا مطالعہ شاعری کے عنوان کے تحت ان کے کلام کی خصوصیات، اور ماحول کے اثرات پہ تبصرہ ہے۔

اس تاریخ کے حصہ دوم میں چھ ابواب ہیں۔ ایک باب میرزا محمد رفیع سودا کا قائم کیا ہے اس میں ان کی حیات، سیرت، تصانیف پر تبصرہ ہے۔ شاعری کے تجزیہ سے فنی خصوصیات، معاشرتی انحطاط کی جھلکیاں اور قومی تنزل کا خاکہ اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ پانچویں باب میں خواجہ میر درد کی شاعرانہ خصوصیات، حیات، اور مطالعہ فنی مزاج کی تبدیلی کا خاکہ پیش کیا ہے چھٹا باب قائم۔ میر، سوز، میر اثر، کی حیات اور مطالعہ سے شروع ہوتا ہے، ان شعراء کے کلام کے نمونے اور خصوصیات کا جائزہ اور زبان و بیان کی تبدیلی کا ذکر ہے۔

ساتویں باب میں میر حسن کی حیات و کلام کی خصوصیات، اس عہد میں زبان کے مزاج اور ماحول کے مطابق مثنوی کا مروج اور وجوہات کا تجزیہ تحریر کیا ہے۔

آٹھویں باب میں اس دور کے دوسرے شعراء جعفر علی حسرت، میر محمدی بیدار وغیرہ کے کلام اور تصانیف سے بحث ہے۔

نویں باب میں چند شعراء کے عنوان سے دہلی کے اجڑنے اور مرکزیت کے ختم ہونے کے بعد منتشر شعرا میں رکن الدین، راسخ وغیرہ کا ذکر ہے۔

فصل ششم۔ اٹھارویں صدی میں اردو نثر کے عنوان سے پہلا باب اردو نثر کے رجحانات اسالیب وادبی خصوصیات کے ساتھ مختلف نثر نگاروں کی تصانیف اور نثر کا ماحول پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں تنقیدی نثر اور اسالیب، زبان کے تنقیدی شعور اور نقادوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں مذہبی تصانیف اور ان اسالیب پر بحث ہے۔ چوتھے باب میں تاریخی نثر کا اسلوب ہے۔ پانچویں باب میں افسانوی تصانیف اور اسالیب کا جائزہ لیا ہے۔

(۱) ا۔ اس تاریخ کی درج ذیل خصوصیات قابلِ غور ہیں۔

۱۔ ہر عہد کے پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں شعراء اور ادبا کی تخلیقات کا جائزہ لیا گیا ہے
۲۔ معاشرے، سماج اور ماحول کے ساتھ تخلیقی کاوشوں میں زبان و بیان کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔
۳۔ اصنافِ سخن کی تعریف حالات کی روشنی میں پیش کی گئی ہے۔
۴۔ قومی زوال اور تاریخی حقائق کے ردِ عمل کا نتیجہ پے در پے لسانی تبدیلیوں کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا ہے۔
۵۔ متنازعہ فی معاملات کے تجزیہ کو پیش کر کے قیاسی نتائج اخذ کیے ہیں دیگر تاریخوں میں ان کا بیان نہیں ہے۔

اس تاریخ کے دونوں حصوں میں درج ذیل خامیاں موجود ہیں۔

۱۔ زیرِ نظر تاریخ میں اکثر واقعات کی تکرار ہے جیسے ولی دکنی کے دیوان کا ذکر اکثر مقام پر غیر ضروری ہے
۲۔ پیش لفظ میں مصنف کا دعویٰ ہے کہ "تاریخ ادب اردو" میں میں نے کم و بیش ہر بات کو حوالے اور سند کے ساتھ پیش کیا ہے۔" [۱]
(۲) درج ذیل بیانات کے حوالے ندارد

---

[۱] تاریخ ادب اردو۔ جلد دوم۔ حصہ اول۔ جمیل جالبی صفحہ ۱۲

ص۲۱ "اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب اردو زبان سے واقف تھے اور حسب ضرورت اسے بولتے تھے۔"

ص۲۴ "جیسے ہی اٹھارویں صدی عیسوی میں عملِ زوال شروع ہوا فارسی کا اثر بھی کم ہونے لگا اور اس کی جگہ ملک گیر زبان کی حیثیت سے اردو لینے لگی۔"

ص۲۵ "فارسی کے مشہور شاعر ناصر علی دکن گئے تو وہ بھی دکنی اردو میں غزلیں کہنے لگے۔"

ص۴۹۸ "کہا جاتا ہے کہ جو خطوط شاہ ایران کو لکھے اور جس طرح از میں شہنشاہ اکبر کو القاب و آداب کے ساتھ پیش کیا جس کی وجہ سے عباس صفوی کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ ہندوستان کا رخ کرتا۔"

(۳) مصنف نے اکثر شعراء کے ذکر میں جذباتی انداز اختیار کیا ہے رواداری میں حد تجاوز سے گزرنے کی مثالیں ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

ص۲۲۱ "آبرو جن کا نام .... میں دلی آگئے پھر یہیں کے ہو رہے۔"

ص۲۲۳ "آبرو ایک قادر الکلام شاعر ہے .... مربوط رواں شعر لکھتا ہے۔" اور مشکل قافیوں کو بامعنی انداز میں لطف میں لاتا ہے۔"

ص۲۶۱ "مصطفےٰ خاں یک رنگ بھی مضمون کے معاصر اور انھیں کی طرز میں شعر کہتے ہیں۔"

ص۲۶۲ "یک رنگ خاں جہاں خاں لودھی کے نبیرہ اور محمد شاہ کے منصب دار تھے۔"

ص۲۶۳ "یک رنگ کا کلام ایہام کے رنگ میں ضرور ہے لیکن اس کے یہاں ایہام کی وہ شدید صورت نہیں ملتی۔"

ص۲۶۴ "یک رنگ کی زبان صاف، محاورے کی رچاوٹ اس کے کلام میں مزہ دیتی ہے۔"

بعض بیانات تاریخ کی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہیں جیسے

ص۳۰ "اردو نے قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ، مسمط اور اس کی آٹھوں قسمیں یعنی مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن، متسع اور معشر کو بھی اپنا لیا۔ ان کے علاوہ ترکیب بند۔ ترجیع بند، مستزاد اور فرد کو بھی قبول کیا۔" جہاں تک ہمارا خیال ہے ابتدائی دور میں کچھ اصناف اردو شاعری میں مروج تھے۔"

صد ۱۸۹ "ہر بڑے شاعر کی طرح دیوان ولی میں بھی کئی رنگ موجود تھے۔ ہر شاعر نے اپنی پسند کے مطابق ولی کی شاعری سے اپنا محبوب رنگ چن لیا۔"

صد ۱۸۱ ایہام گوئی شمال میں اردو شاعری کی پہلی تحریک تھی۔ جس نے اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کیا تھا۔

صد ۵۸۶ "نظم اور غنائی شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔"

صد ۵۸۵ "ان کی زبان جذبات کے تقاضوں کے ساتھ رنگ بدلتی ہے۔"

(۴) درج ذیل بیانات میں تضاد کے پہلو ہیں۔

صد ۶۷۳ "سودا کو غزل میں میر پر اور کبھی میر کو سودا پر ترجیح دینا صحیح تنقیدی انداز نظر نہیں ہے۔"

یہ بیانات اوپر کے بیان کی تردید کرتے ہیں۔

صد ۶۷۲ "میر کے یہاں اندر کی دنیا آباد ہے۔ لیکن سودا کے یہاں باہر کی دنیا سے رشتہ استوار ہے۔"

صد ۶۷۰ "فن کا شعور میر کو سودا سے کہیں زیادہ ہے۔"

صد ۶۷۳ "سودا پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہجو کو ایک فن کے طور پر استعمال کیا۔"

مصنف کی تحریر میں شعراء و ادباء کے ذکر میں "کے ہاں" "کی بہتات پڑھتے وقت گراں گزرتی ہے۔ پوری کتاب میں "کے ہاں" "کی بجائے" "کے یہاں" ہونا چاہیے تھا۔

چند مثالیں

صد ۲۲۳ "آبرو کے ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ واضح ہیں۔

صد ۲۲۲ "آبرو کے ہاں رعایت لفظی اور تجنیس کی وہ صورت بھی نظر نہیں آتی۔"

صد ۲۶۲ یک رنگ کے ہاں شعر ایہام کا نہیں بلکہ ایہام شعر کا تابع ہے۔"

صد ۶۷۲ "میر کے ہاں اندر کی دنیا لیکن سودا کے ہاں باہر کی دنیا سے رشتہ استوار ہے"

(۵) پیش لفظ میں مصنف کا دعویٰ ہے کہ "تاریخ ادب لکھتے ہوئے میں نے رنگین شاعرانہ اسلوب سے حتی الامکان دامن بچایا ہے۔ تاکہ اسلوب کی رنگینی اصل تاریخ کو ماند نہ کر دے۔"

لیکن اکثر مقامات پر جذباتی تحریر اور شاعرانہ اسلوب اپنایا گیا ہے جیسے۔

صد ۲۹ "تہذیبی اثرات کے رنگین خوشبودار دریا میں جب کوئی معاشرہ نہاتا ہے تو اس

کا رنگ اور خوشبو اس کے جسم اور روح میں اتر جاتے ہیں۔ پھر یہی رنگ اسے اچھے لگتے ہیں اور یہی خوشبو اسے بھاتی ہے۔"

صفحہ ۱۲۱ موسم بدلتا ہے تو بہت پہلے سے جانے والے موسم اور آنے والے موسم میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ یہ آنکھ مچولی اتنی آہستہ رو ہوتی ہے کہ موسم کی خبر ہمیں اس وقت ہوتی ہے جب وہ واقعی آچکتا ہے۔"

صفحہ ۱۸۹ یہ بظاہر قدرت ہے کہ موسم اور زمین کے مطابق فصل اگتی ہے گرمی کی فصل سردی میں اور سردی کی فصل گرمی میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس طرح جو تہذیبی موسم اور معاشرتی زمین شمال میں موجود تھی۔ اس میں ایہام گوئی کے رجحان کا پروان چڑھنا ایک فطری عمل تھا۔

صفحہ ۲۴۳ "ان کے رنگ و سخن کی پیروی کر کے خود کو دریافت کرنے میں مصروف تھے۔"

صفحہ ۲۴۹ "ناجی وہی ہنر مندی دکھا رہے ہیں جو کشیدہ کاری اور زردوزی کے کام میں دکھائی جاتی ہے۔

صفحہ ۲۹۷ اس دور کا ادب، قدیم ادب و فارسی اثرات کو شاہجہاں آباد کی زبان میں تحلیل کر کے اسے ایک ایسی نئی صورت دے دیتا ہے۔ جس کی تخلیقی توانائی اور ہند ایرانی تہذیبوں کے سنگم سے زبان کا ایک تیسرا دریا وجود میں آجاتا ہے۔ جو اس صدی کے شروع میں آہستہ آہستہ بڑھتا پھیلتا ہے۔ اور میر و سودا کے دور میں پاٹ دار ہو کر سارے برِ عظیم کے تخلیقی ذہنوں کو سیراب کرنے لگتا ہے اور اس تخلیقی عمل میں زبان و بیان کے یکساں معیار کے ساتھ سارا برِ عظیم شریک ہو جاتا ہے۔

مصنف نے بیشتر مقامات پر شاعرانہ تحریروں کا سہارا لیا ہے۔

(۹) پہلا حصہ عشق، امرد پرستی جیسے موضوعات پر بحث کی طوالت بہت گراں گزرتی ہے اس میں ذیل میں روبہ زوال معاشرے میں عورت کی غلط حیثیت بتائی ہے۔

صفحہ ۱۹۸ "اس معاشرے میں عورت نے اپنی وہ حیثیت کھو دی تھی جو متوازن معاشروں میں عورت کی ہوتی ہے۔ اس بیان میں بے حد لوچ ہے کیونکہ

۱۔ متوازن معاشرے میں عورت کی حیثیت کیا ہوتی ہے اس کو واضح نہیں کیا گیا۔

۲۔ عشق کے موضوع پر معشوق کے لیے مذکر کا صیغہ استعمال کرنے کے باب میں اسی معاشرے کی عورت کی حیثیت بہت اہم بتائی گئی ہے۔

۳۔ عورت کی حیثیت کا مفہوم "کردار" سے اخذ کیا گیا ہے۔ یا سماجی اہمیت سے اس بات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔

۴۔ افراتفری اور انتشار پسند معاشرے میں فرد کی حیثیت عورت سے زیادہ عیوب کا مجموعہ بن جاتی ہے۔

ان تمام خامیوں کی نشاندہی کے باوجود ڈاکٹر جمیل جالبی کی یہ تاریخ اردو کی تاریخوں پر ایک ممتاز مقام کی حامل ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات

ڈاکٹر عبیدہ بیگم

"فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" ڈاکٹر عبیدہ بیگم کا تحقیقی مقالہ ہے، جو ڈاکٹر محمود الٰہی کی نگرانی میں مکمل ہوا۔ گورکھپور یونیورسٹی میں پیش کردہ یہ مقالہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ عنوانات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ فورٹ ولیم کالج کے اغراض و مقاصد

۲۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین

۳۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات

۴۔ فورٹ ولیم کالج کی نثر کا اسلوب

۵۔ اردو نثر پر فورٹ ولیم کالج کے اثرات

ماخذ اور مصادر کے علاوہ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ مصنفین کی تصانیف کا اندراج بھی ہے۔ عنوانات اپنے موضوع کی مکمل تاریخ اور تحقیق پر حاوی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے موضوع پر اکثر کتابیں محدود ہیں لیکن ڈاکٹر عبیدہ کی کتاب فورٹ ولیم سے متعلق جملہ کارکردگی، ادبی خدمات اور اردو ادب پر اس کے اثرات کا مکمل جائزہ ہے۔ اکثر باتیں محققین کے لیے نئی ہیں۔

فورٹ ولیم کالج سے منسلک اردو ہندی کے مصنفین کے حالات اور کارناموں کے باب میں کئی پہلو توجہ طلب ہیں۔ موضوعات کی تفصیل کے سبب کتاب کی ضخامت بڑھ گئی ہے اسی وجہ سے کتاب پر تبصرہ

کرتے ہوئے ڈاکٹر صبیحی پریمی لکھتے ہیں۔

"یہ کتاب ضخامت کے لحاظ سے مولوی نجم الغنی اور جمیل جالبی کی کتابوں کا جواب ہے۔" [۱]

اس کتاب میں کچھ غلطیاں بھی ہیں یہ اغلاط کتاب کی افادیت کو متاثر نہیں کرتیں۔

یہ کتاب اردو کی نثری تاریخ میں اہم اضافہ ہے۔

●●

اُردُو اور فارسی کے یورپین اور انڈو یورپین شاعر

سردار علی

یہ کتاب سردار علی کے چند لکچروں کا مجموعہ ہے۔ جو اردو مجلس حیدر آباد اور اسٹڈی سرکل، علی گڑھ کلب (حیدرآباد) میں دیے گئے تھے یہ کتاب اردو کے آرمینی، انگریزی اینگلو انڈین، انڈو پرتگالی، انڈو جرمن، انڈو فرنچ، انڈو اطالوی اور متفرق انڈو یوروپین شعراء اور انڈو یورپین شاعرات کے مختصر تذکرہ پر مشتمل ہے۔

زیرِ نظر کتاب گو مختصر تذکرہ ہے لیکن اس میں مولف نے شعراء کا انتخاب کلام بڑی دل جوئی و محنت سے یکجا کیا ہے۔ مختصر تعارف کے ساتھ کلام کا انتخاب بھی دیا ہے۔

اردو زبان کی ولاآویزی کا انگریز اور دوسری یورپین اقوام کو متوجہ کرنے کا بہترین ثبوت یہ چھوٹا سا تذکرہ ہے ۱۹۶۱ء میں اس تذکرے کی اشاعت ہوئی اور اس تذکرہ میں وہی شعراء جلوہ گر ہیں جن کا تعارف رام بابو سکسینہ اپنی تصنیف

European and Indo European poets of Urdu and Persian.

میں کرا چکے تھے۔

---

[۱] جائزے مرتبہ مظفر حنفی تبصرہ صبیحی پریمی ص۳۴

اردو کے غیر مسلم شعرا و ادبا

جگدیش مہتا درد کی یہ تالیف ۳۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ غیر مسلم شعراء کے کلام کا انتخابی مجموعہ ہے شعراء کے متعلق مختصر معلومات اور انتخاب کلام کے منتخب نمونے شائع کیے گئے ہیں کچھ ادیبوں کے متعلق مختصر معلومات پیش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں عہد حاضر کے تقریباً دو سو غیر مسلم شعراء اور ادباء کے حالات کا نمونۂ کلام سے واضح ہو جاتا ہے کہ غیر مسلم شعراء اور ادباء کے اور قلم کاروں کے دل میں بھی اردو ادب کی خدمت کا جذبہ اسی طرح بیدار ہے جس طرح مسلم شعراء اور ادباء میں جذب ہے [۱]

اس کتاب میں اکثریت پنجاب کے شعراء اور ادباء کی ہے مرتب ہندوستان کے ہر علاقے پر خاطر خواہ نظر ڈالتا تو اس کتاب کی ضخامت کے ساتھ کتاب کی ادبی افادیت کسی حد تک بڑھ سکتی ہے بہر حال مصنف کی یہ کوشش بھی کسی حد تک بے لوث خدمت اردو ادب سے لگاؤ کی غمازی کرتی ہے۔

[۱] وضاحتی کتابیات۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، از ظفر صدیقی - جلد اول صفحہ ۴۳

اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ

سنہ ۱۴۹۶ء تا سنہ ۱۹۸۰ء — سید نصرت مہدی یداللّٰہی سنہ ۱۹۸۴ء

اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ سید نصرت مہدی یداللّٰہی کی تصنیف ۱۹۱ صفحات پر مشتمل ہے صفحہ ۱۷۳ سے صفحہ ۱۷۶ تک کتابیات کی فہرست درج ہے اس کتاب کی اشاعت سنہ ۱۹۸۴ء میں ہوئی۔ یہ مقالہ مصنف نے ایم۔فل کے لیے پیش کیا تھا پیش لفظ میں گیان چند جین نے لکھا ہے کہ

"میں کہتا رہتا ہوں کہ مذہب اور فرقے کی بنا پر ادبی جائزہ لینا مستحسن نہیں۔ اردو میں ہندوؤں کا حصہ، سکھوں کا حصہ، اردو کے مسیحی شعراء کشمیری پنڈت شاعروں کا تذکرہ، اردو میں وہابی ادب، اردو میں شیعی ادب، وغیرہ پر مقالے اور کتابیں لکھی گئی ہیں۔" [۱] اس نظریہ کے باوجود کتاب کے تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ "اپنی زبان میں" مصنف کی تلاش و ترتیب کا ذکر کیا ہے۔

پہلا باب: حضرت سید محمد جونپوری کی سوانح حیات سے شروع ہوتا ہے۔ سلسلہ نسب، کشف و کرامت کا تذکرہ

[۱] اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ۔ سید نصرت مہدی، نصرت یداللّٰہی صفحہ ۱-۲

نہایت عقیدت مندی اور جذباتی انداز سے کیا ہے۔ مختلف حوالوں کے ساتھ واقعات اور اظہار خیال کی داعیں لسانی پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ کلام کے نمونوں کا کوئی تبصرہ نہیں۔

دوسرا باب: حضرت میاں شیخ مصطفےٰ گجراتی کی حیات و سیرت سے متعلق ہے۔ ان کے پہیلے اور ریختہ کی مثالیں مخطوطات سے نقل ہیں۔

سید میراں ہاشمی کے دیوانِ ہاشمی کا باب قائم کیا ہے ان کا عہد سکونت کا جائزہ ہے کہ ان کے دیوان اور مثنوی یوسف و زلیخا سے مثالیں پیش کی ہیں۔ ان کے مرثیہ اور قصیدہ پر تبصرہ کیا ہے۔ میاں عبدالمومن، مومن کے باب میں مثنوی اسرارِ عشق کو عنوان بنایا ہے ان کی حیات اور نسب پر کوئی تحقیق پیش کی۔ صرف مثنوی کی تاریخ اور تحقیق پر زور دیا ہے [۱]

میاں سید اسحاق سرمست کے ذکر میں ایک غزل پر اکتفا کیا ہے۔

میاں عبدالمجید مہدوی کی مثنوی فیض عام پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کو دکنی کا سرمایہ کہا ہے۔ حضرت میاں .... شہاب الدین شہید سدوث کی (مثنوی فیض عام قدس) کے بیان میں فیض عام کو مہدوی عقائد اور سید محمد مہدیؑ کی تاریخ کا ماخذ لکھا ہے لسانی اعتبار سے لسے دکنی الفاظ کا ذخیرہ کہا ہے۔ رسالہ در حجت دلیل بے واسطہ یا خلاصۂ عقیدہ میاں مصطفےٰ میں رسالے کی تفصیل مثنوی اشعار بطور نمونہ پیش کیے ہیں۔ کچھ لفظوں کو گنوایا ہے۔

مثنوی تاریخ غریبی کو قریب مہدوی کی تحقیق بنایا ہے۔ بعض مضمونوں میں قوم مہدویہ کی ایک اہم تالیف لکھا ہے لفظوں کی لسانی کیفیت بتائی ہے۔

آرعلین مہدوی کے "وفات نامہ" مثنوی کا موضوع بتا کر اشعار پیش کیے ہیں۔ دکنی، راجستھانی، عربی فارسی، زبانوں کے الفاظ کا ذکر کیا ہے۔

شہادت نامہ حضرت سیدنا امام حسن و امام حسین کے موضوع پر لکھی گئی مثنوی رسالہ راگ ہدیت المصلیٰ کو آرعلین مہدوی کے فنی کمال کا مظہر بتایا ہے۔

جمیل جالبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ مینا ولورک کو مہدوی نے قلم بند کیا ہے معراج نامہ کرامعانی کو بھی مہدوی کے کلام کے مجموعہ کی فہرست میں شامل کیا ہے۔

بقول گیان چند جین

---

[۱] اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ۔ سید نصرت مہدی۔ نصرت پبلشنگ صفحہ ۹۴

"مولوی عبدالحق نے اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام نامی رسالہ لکھا اس میں بھی ایک فرقہ کے ... درویشوں کے کارناموں کا ذکر ہے ہمیں ان صوفیائی تخلیقات کے مذہبی پہلو سے دلچسپی نہیں لسانی وادبی پہلو سے ہے اتنے ہی قدیم کارنامے مہدوی بزرگوں کے ہیں۔"[1]

۱۔ گیان چند جین نے صرف مہدوی فرقہ کو جیاد بناکر عبدالحق پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ لسانی خدمات کے پیش نظر مولوی عبدالحق نے کبھی ذاتی بنیاد پر ادباء و شعراء کا شمار کسی تصنیف میں کم نہیں کیا ہے۔

۲۔ نصرت مہدی صاحب کا مقصد صرف مہدوی فرقہ کو ادب میں نمائندگی دلانا تھا۔ لیکن کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ حسب نسب کے تاریخی حقائق زیادہ، اور ادبی ولسانی حقائق مختصر ہیں۔

کسی فرقہ یا ذات کی ادبی خدمات پر زبان کے لیے قابلِ احترام ہوتا ہے لیکن مصنف کے بیان کے مطابق اردو ادب میں مہدوی فرقہ کی خدمات کا ذکر نہیں کے برابر ہے حالانکہ مصنف نے جن حوالوں کا سہارا لے کر مہدوی فرقہ کو نمائندگی دلانے کی کوشش کی ہے۔ وہ مختلف صورتوں میں ادبی تاریخوں میں موجود ہے اس مواد کو یکجا کر کے مصنف نے کوئی اہم کارنامہ انجام نہیں دیا ہے اور اس لحاظ سے اس کا الزام بے بنیاد ہے۔

اس کتاب پر ذاتی جذبے کی گہری چھاپ ہے۔ ورنہ مذکورہ کتاب میں شامل ہر شاعر اور ہر ادیب کا ذکر ادبی تاریخوں نے بڑے احترام سے کیا ہے۔

اردو ادب کی تاریخوں میں اسے بیش بہا اضافہ نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ ادبی تاریخ نگاری میں ضرور اضافہ ہوا ہے۔

پروفیسر محمود شیرانی اور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے تاریخ عرب اور مہدویوں کا ادب پر تفصیل سے لکھا ہے۔

●●

---

[1] اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ۔ سید نصرت مہدی۔ نصرت ید اللّٰہی۔ ص۲

ہماری ادبی تاریخوں پر ایک نظر

تذکروں کے بعد "آبِ حیات" اور "گلِ رعنا" جو تذکروں اور تاریخ کے بیچ کی کڑیاں ہیں[1] ادب کی تاریخ پر ابتدائی کتب جس میں "شعر الہند" کو بھی گوارا کیا جاسکتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے ادب کی تاریخ کا خاکہ ابھرتا ہے۔ لیکن انھیں مکمل تاریخ نہیں کہہ سکتے۔ تاریخ کے نصب العین، اصول و ضوابط کی روشنی میں تاریخ نویسی کی ابتداء کہہ سکتے ہیں۔ ان تصانیف کو نظر انداز کرنے کے بعد مولوی یحییٰ تنہا کی سیر المصنفین سامنے آتی ہے یہ تاریخ اردو کے نثر نگاروں کی محدود تاریخ ہے۔ اور اس میں مصنف نے کسی معیار کو برقرار نہیں رکھا ہے۔

نثر نگاری کی خصوصیت کے پیش نظر مصنفین کا انتخاب نہیں کیا۔ بلکہ داستان قصے کہانیوں اور معمولی ترجمے کرنے والے مصنفوں کے علاوہ ایک خط لکھنے والوں کو اس تاریخ میں مصنف کی حیثیت سے پیش کیا ہے[2]۔ تاریخ نگاری کے تقاضوں سے بھی چشم پوشی کی ہے۔

مولوی عبدالرحمن نے "مراۃ الشعراء" کی دو جلدوں میں شعراء کی تاریخ کیا بیان کی، بلکہ ان کے کلام میں اصلاح کرنے کا حربہ بروئے کار لایا۔ متروکات کی بحث میں الجھ کر جائز و ناجائز سب کو ایک لاٹھی سے ہانک دیا۔ استاد شاگردوں کے کلام کو اپنی اصلاح کے ہتھیار سے مسخ کر دیا ہے اس اثناء میں وہ تاریخ کے اصول کو بھی پس پشت ڈال کر بری الذمہ ہو گئے۔

حکیم شمس اللہ قادری کی "اردوئے قدیم" زبان کی نشو و نما سے کر شمالی ہندوستان سے جنوب تک کے شعرا و ادبا کے حقائق سے زیادہ روایات کا مواد فراہم کرتی ہے۔ یہ کتاب تاریخ کے اوصاف سے خالی تذکروں کی خصوصیات سے معمور ہے۔

محمد سردار علی "تذکرہ یورپین شعرائے اردو" کے مصنف بھی اردو زبان میں شاعری کرنے والے یورپین [illegible] کا مختصر تعارف میں بھرپور کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ لیکن رام بابو سکسینہ اپنی "تاریخ ادب اردو" میں آبِ حیات کی غیر معتبر حوالوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ تاریخ نویسی کی حقیقت سے نظر بچا کر کئی

---

[1] اردو تنقید کا ارتقاء — عبادت بریلوی صہ ۴۳۹

[2] رسالۂ اردو — جنوری ۱۹۵۰ء عبدالحق

روایات کو تحقیق بنیاد بنالیتے ہیں۔

"تاریخ نثر اردو" میں مولوی احسن مارہروی نثر نگاروں کی تاریخ پر حاوی نہیں۔ مزاج اور ماحول سے واقف نہیں۔ بلکہ اپنے پیش روؤں کی تقلید میں غیر تحقیقی باتوں کو تحقیق کا جزو بنالیتے ہیں۔

"اردو زبان پر انگریزی ادب کا اثر" میں سید عبداللطیف اپنی مرضی کے مطابق نتائج اخذ کرتے ہوئے اردو تاریخ کا جائزہ پیش کرتے ہیں اور "اردو لٹریچر" میں ڈاکٹر گراہم بیلی جن امور سے بحث کرتے ہیں۔ وہ نامکمل ہیں۔ "مغل اردو" میں سید نصیر حسین خاں خیال اپنے وقت کے اچھے لکھنے والے تھے۔ لیکن ادوار اور سنین کے اعتبار سے کئی خامیاں ان کی تصنیف کو تاریخی مقام دینے سے قاصر ہیں۔

"ارباب نثر اردو" پر نظر دوڑانے سے فورٹ ولیم کالج کی محدود تاریخ کا علم ہوتا ہے۔ اس سے منسلک ادباء کے حالات مکمل طور پر واضح نہیں ہوتے۔ جسے تحقیقی تاریخ نہیں کہہ سکتے۔

سید سلیمان ندوی کی "نقوش سلیمانی" مضامین، شخصیات اور لکچروں کا مجموعہ ہے۔ کچھ تاریخی اصول اور ضابطوں کے تحت لکھے گئے ہیں۔ کچھ مضامین پر عقیدت مندی اور خلوص کے جذبات کی چھاپ لگی ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تصنیف "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" صوفیائے کرام کے مختصر حالات اور مختصر کلام کا آئینہ ہے۔ حالانکہ پوری تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے لیکن نصب العین اور تاریخ نویسی کے اصول کا اطلاق اس پر بھی نہیں ہوتا۔

ناظم کاکوروی کی تصنیف "ہندو ادیب" میں ہندو ادیبوں کی تاریخ اور انتخاب کلام میں تحقیقی مواد کی بنیاد تذکروں سے مستعار ہے۔

سید حامد حسن قادری کی "داستان تاریخ اردو" اپنے عہد کی پہلی کتاب ہے۔ جو تاریخی نصب العین اور تاریخ نویسی کی نوعیت اور اصولوں سے میل کھاتی ہے حالانکہ اس کتاب میں ہر بیان تاریخی تحقیق کا ضمانت دار نہیں ہے۔ لیکن کسی حد تک قابل غور ہے۔ جس پر مزید تحقیق کی ضرورت پیش آتی ہے۔

حکیم ناطق لکھنوی "نظم اردو" میں اردو کی منظوم تاریخ نگاری کے باب میں شعری پابندیوں سے تحقیقی معیار کم اور جذباتی مواد پیش کرتے ہیں۔ "اردو کے فارسی کے یورپین شعراء" میں رام بابو سکسینہ صرف یورپین شعراء کی تاریخ میں اپنی پہلی تاریخ ادب اردو کے اصولوں سے بھی انحراف کر جاتے ہیں اور بیشتر روایات کی روشنی میں یورپین شعراء کے حالات اور کلام پیش کرتے ہیں۔

سید قاسم علی "اردو کے ہندی ادیب" میں اردو میں لکھنے والے ہندو ادیبوں سے بحث کرتے ہیں۔ زبان کی تاریخ پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ مولوی عبدالشکور صاحب بھی "دورِ جدید کے چند منتخب شعراء" میں اپنے سے کچھ ادبا اپنے عہد تک کے نئے لکھنے والے شعراء کے قصیدے سناتے ہیں۔ جس پر ذاتی عقیدت کی گہری چھاپ ہے۔ "یادگارِ شعراء" میں ڈاکٹر اسپرنگر کی مرتب کردہ فہرست ہے۔ جس میں اردو شعراء کے بھولے بسرے نام دکھائی دیتے ہیں۔ "آرٹ ان اردو پوئٹری" شہاب الدین رحمت انگریزی سے اردو ترجمہ ہے اور کئی خامیوں کا شکار ہے۔ لیکن اس میں آرٹ کے ساتھ اشعار کا انتخاب اپنے عہد میں ایک کاوش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

خواجہ محمد یوسف کی تصنیف "تذکرۂ یوروپین اور اینگلو یوروپین شعرائے اردو" نام سے ہی تذکروں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ جس پہ تاریخ نگاری کا گمان کرنا بے سود ہے۔ شعبۂ اردو علی گڑھ کی مرتبہ "تاریخ ادب اردو علی گڑھ" اپنے وقت کی ایسی تاریخ تھی جس کی تیاری میں کافی وقت صرف ہوا۔ مرتبین نے تاریخ نگاری کے نصب العین، اصول و ضوابط کی روشنی میں تاریخ نویسی کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ تاریخ ادبی تاریخ، کم شخصی تاریخ زیادہ بن گئی۔ ہر لکھنے والے نے اپنے مخصوص نظریے کے زیرِ سایہ مواد کو پروان چڑھایا۔

دوسرے باب پر مکمل تاریخ ہند کا گمان ہوتا ہے ادبی مخطوطوں اور تذکروں سے اخذ کردہ مواد کو تاریخ کی تحقیق کا نمایاں جز بنایا۔ نتائج کی پروا کیے بغیر وہ تاریخ اپنے نصب العین، اصول و ضوابط کی روشنی میں اغلاط کا ایک مجموعہ بن گئی۔ رشید حسن خاں نے اس تاریخ پر ایک اہم مضمون لکھا ہے اور یہ تاریخ واپس لینے کا اعلان کیا گیا۔ اس طرح حکومت اور قوم کا ایک عظیم سرمایہ اس کی تیاری میں رائیگاں ہو گیا۔

ڈاکٹر محمد صادق کی تصنیف "تاریخ ادبیات اردو" ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے لکھی گئی۔ بعد میں شائع ہوئی۔ اس تاریخ میں عہدِ قدیم سے اپنے عہد تک کا تاریخی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ ہر عہد کے شعراء اور ان کے کلام سے وابستہ خصوصیات اور تبدیلیوں کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ لیکن ان تبدیلیوں کی وجوہات سے چشم پوشی کی گئی ہے اس بنا پر تاریخ نویسی کے اصولوں کی نمائندہ نہیں کہہ سکتے۔ "تاریخ ادب اردو" جلد اول اور دوم جمیل جالبی کی تحقیقی تصانیف

ہیں۔ ان تاریخوں میں تاریخ نگاری کے اہم اصولوں کو اپنایا گیا ہے۔ لیکن طویل بحث و مباحثہ سے نتائج کا اخذ کرنا ان تاریخوں کی اہم خامی ہے ان تاریخوں کو اپنے سے پچھلے عہد کے مقابلے میں موجودہ عہد کی نمائندگی دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ان میں پیش کردہ مواد ادب کی پچھلی تاریخوں پر تحقیقی اور تاریخی اعتبار سے حاوی ہے

یہ تاریخیں، اصول، ضوابط، اور نصب العین کے تمام تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں۔ لیکن تاریخ نویسی کی بنیاد پر ایک اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ تاریخیں مکمل کسوٹی نہ سہی لیکن ایک آئینہ ہے جس میں مختلف عہد میں زبان کے ارتقاء سے نشوونما تبدیلیاں اور تحریکات، خیالات کا عکس ابھرتا ہے ماحول اور مزاج کا خاکہ نکھرتا ہے۔ یہ تاریخیں شخصیات کی نفسیات ان کے عہد سے ماخوذ اقدار، وقتی تقاضوں، انقلابی نظریوں، علمی تحریکوں، ادبی مجلسوں، کلام کی فنی بنیادوں اور ادبی سرگرمیوں کی تصویر ہے اسی سبب ان تاریخوں کو تحقیق طلبا کے لیے اہم سمجھا۔ لہٰذا طلبا اور عوامی ذوق کے حامیوں کے لیے معلومات کا ذخیرہ کہہ سکتے ہیں

ہمارے ادب میں اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق سب تاریخیں اپنی جگہ اہم اس لیے کہی جا سکتی ہیں کہ انھوں نے اپنے عہد میں ادب سے متعلق کسی نہ کسی کمی کو پورا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ معلومات اور تحقیق کے نتائج کی بنیاد پر بعد میں ان کے بیانات رد ہوئے لیکن جس عہد میں ادب سے وابستہ مواد انھوں نے پیش کیا۔ آنے والوں نے اس پر تحقیق کی۔ اور حقیقت کا پتہ لگایا۔ لیکن یہ بیانات محققین ادب کے لیے تحقیق کے دروازے ثابت ہوئے۔ جن کو کھولنے کے لیے لوگوں نے مختلف ذخیروں سے چابیاں حاصل کیں۔

نصب العین اصول و ضوابط کی روشنی میں ہماری تاریخ نویسی ہنوز نامکمل ہے۔ ادب کی تاریخ ہر عہد میں مزاج اور ماحول سے وابستہ شخصیات کا آئینہ ہوتی ہیں۔ اور زبانوں کی نشوونما اور اصناف کی ایجادات کی تصویر ہوتی ہیں تحقیق کے ساتھ تنقید، الوازمات کا ذخیرہ ہوتی ہیں۔ تاکہ قاری اپنے طور پر نتائج اخذ کرنے میں ٹھوکریں نہ کھائیں۔ ایسی تاریخوں کی ہمارے ادب میں کمی محسوس ہوتی ہے۔ شاید آگے کوئی ادب نواز تاریخ نگاری کی اس تشنگی کا خاتمہ کر دے۔

(ب) لسانی تاریخوں پر تنقیدی تبصرہ

لسانی کتب پر تبصرہ

۱۔	پنجاب میں اردو	ڈاکٹر محمود شیرانی	سنہ ۱۹۲۸ء
۲۔	ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	سنہ ۱۹۳۵ء
۳۔	زبان اور علم زبان	پروفیسر عبدالقادر سروری	سنہ ۱۹۲۶ء
۴۔	مقدمہ تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خان	سنہ ۱۹۶۱ء
۵۔	ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	ڈاکٹر سید احتشام حسین	سنہ ۹۶۳ء
۶۔	داستان زبان اردو	ڈاکٹر شوکت سبزواری	
۷۔	اردو زبان کا ارتقاء	ڈاکٹر شوکت سبزواری	سنہ ۹ء
۸۔	اردو میں لسانی تحقیق	ڈاکٹر عبدالستار دلوی	سنہ ۹۰ء
۹۔	جدید اردو لسانیات	ڈاکٹر امیر اللہ شاہین	سنہ ۱۹۷۳ء
۱۰۔	اردو زبان کی لسانی تشکیل	ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ	سنہ ۱۹۸۵ء

ہماری لسانی تاریخوں پر تنقیدی تبصرہ

ہماری لسانی تاریخیں

اردو میں لسانیات کا سرمایہ بہت مختصر ہے لسانی مطالعہ کی عمر بھی مختصر ہے لسانیات کا علم حال میں ایک سائنس کی شکل میں پھیل کر ہمارے سامنے آیا ہے۔ اور مستقل ایک علم بن گیا ہے۔

لسانیات پر ہمارے یہاں جو کچھ کام ہوا ہے اس کے غائر مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشاء اللہ خاں انشاؔ، محمد حسین آزادؔ اور بعد کے مورخین نے اس کے ہلکے پھلکے اشارے دیے ہیں۔ انشاؔ نے اپنی قواعد "دریائے لطافت" میں اردو کے لسانی رشتوں پر نظر ڈالی ہے۔ محمد حسین آزادؔ نے اپنی تاریخ "آب حیات" میں بتلایا ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ اس لسانی تجزیے میں تحقیق و تلاش کے نئے گوشے کھول دیے ہیں۔ "پنجاب میں اردو" میں شیرانی نے بتلایا کہ اردو پنجاب سے نکلی ہے۔ یہ نظریے زبان کی نشو و نما تشکیل و تعمیر کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ حالات اور ماحول میں زبان کا تدریجی ارتقاء کس طرح ہوتا ہے بتاتے ہیں اور دوسری زبانوں کے الفاظ اور تبدیلیوں کی وجوہات اور تبدیلیاں کے اثرات، بولنے والوں کے مزاج اور ماحول کا پتہ بتاتے ہیں۔ صوتیاتی تغیرات سے مختلف قدروں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ قدریں زبان کے بولنے والوں کے رگ و ریشے میں پیوست ہوتی ہیں۔ اور گردش لیل و نہار کی روشنی میں نئے حقائق ہم تک پہنچاتے ہیں۔ ہمارے پیش نظر لسانی سرمایہ میں مندرجہ ذیل کتابیں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

۱۔	آبِ حیات	محمد حسین آزادؔ
۲۔	پنجاب میں اردو	ڈاکٹر محمود شیرانی
۳۔	ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ
۴۔	مقدمہ تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں
۵۔	ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	ترجمہ جان بیمز سید احتشام حسین
۶۔	داستانِ زبانِ اردو	ڈاکٹر شوکت سبزواری
۷۔	اردو زبان کا ارتقاء	ڈاکٹر شوکت سبزواری
۸۔	زبان اور علم زبان	ڈاکٹر عبدالقادر سروری
۹۔	زبان کا مطالعہ	ڈاکٹر عبدالوحید خاں

۱۰۔ اُردو کی لسانی تشکیل — ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

۱۱۔ جدید لسانیات — ڈاکٹر امیر اللہ شاہین

کسی بھی ادب کی مکمل تاریخ لسانی تاریخ کے پیش نظر مرتب ہوتی ہے ادبی تاریخ، انفرادی اور ذاتی خوبیوں کے عناصر تلاش کرتی ہے۔ ہر فنکار کے فن کو لہجے کی آنچ میں تپا کر اسلوب، زبان و بیان، لہجے کی سلاست فصاحت و بلاغت کے معیار پر پرکھتی ہے۔ ماحول اور معاشرے کے پیش نظر فن میں رائج اصناف، اقدار کے محاسن و معائب کو تلاش کرتی ہے۔ لیکن لسانی تاریخ زبان کی ابتدا اور ارتقاء کا ایسا مرقع ہے جس میں زبان کی تہذیب و پرداخت کا عکس نظر آتا ہے۔ نئی زبان بولی، ورادبی ذخیرے کی زبان ہونے تک پہنچ پڑوسی ماحول، زبانوں کی صوتیات اور آہنگ سے اپنے مزاج کے مطابق کس طرح فائدہ اٹھاتی ہے۔ لہجہ اور بیان کی سلاست میں عوام کو اظہار کی ادائیگی میں کیسے سہولت پہنچاتی ہے۔ تمام حقائق کا خاکہ سامنے رکھتی ہے اس کے باوجود لسانی تاریخ مختلف اقوام کی تہذیب و تمدن کا ایک ایسا آئینہ ہوتی ہے۔ جس میں قوم کی صوتی مزاج اور ہم آہنگ لفظوں سے مختلف زبانوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اس لیے لسانی مورخ، تحقیق تجزیہ اور تنقید تینوں فرائض ادا کرتا ہے۔ دیگر زبانوں کی ٹوٹ پھوٹ، شکست و ریخت کا عمل، سیاسی، تہذیبی، نفسیاتی ہر رخ اور ہر پہلو کو دیکھ کر ان کی کمزوریوں کا سراغ لگاتا ہے۔ جو الفاظ مناسب ادائیگی کا حق ادا کرنے سے معذور ہیں ان کے مقابلے میں دوسرے لفظ کس طرح زبان زد عام ہوتے ہیں۔ علاقائی مزاج اور ماحول کے مطابق ان کا تحقیقی جائزہ لیتا ہے۔ نیز ایک یا مختلف اقوام کے بیچ ان عوامل کا پتہ لگاتا ہے۔ جس کے سبب ایک نئی زبان اظہار کا ذریعہ بنتی ہے۔ لفظ کا جنم خود بخود نہیں ہوتا کسی زبان سے مسخ شدہ حالت یا دوسری زبان میں ہٹنے تک لہجے کی ادائیگی میں فرق کے ساتھ پہلی زبان میں ادائیگی کی مشکلات کا سبب اور نئی زبان میں اس لہجے کی ادائیگی کو سہل اور آسان کیسے بنایا جاتا ہے۔

زبان کی نشو و نما، تشکیل و تعمیر کا مسئلہ اور تاریخی حقائق سے نتائج اخذ کرنا لسانی مورخ کا اہم فرض ہے۔ زبان کا تدریجی ارتقاء۔ اس میں شریک وسائل، ان وسائل کے جملہ لوازمات دوسری زبانوں سے وابستہ حروف تہجی، افعال و اسماء، صرف و نحو کے قواعد جو دوسری زبانوں کا سرمایہ تھے ہماری نئی زبان میں کس طرح رائج ہوئے۔ ان سب کا تقابلی مطالعہ ان کی اصلیت کا پتہ لگا کر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔

مختلف اقوام کے باہمی اشتراک مختلف فرقوں کے علاقائی افراد، مختلف ذات، مذہب، شخصیت کے یکجا

ہونے سے کچھ نئی آوازیں، نئے الفاظ کا تبادلہ، ادائیگی سے زبان و لہجے میں نرمی، گرج، سبک یا بھاری پن، کم آرائش
کا پیدا ہونا، سماعت پر گراں گزرنا یا بھلا لگنا۔ دو مختلف اقوام میں تہذیبی مزاج سے جُدا شخصیات میں سہولت
ادائیگی کی خاطر لفظوں کا جنم یا رد و قبول کا عمل تیسری آواز کی بازگشت بن جاتا ہے۔ جو الفاظ اپنی آواز کے مطابق
ذریعۂ اظہار کے دوران زبان کو بننے بگڑنے یا سنورنے میں مدد دیتے ہیں۔ غرض کہ کسی زبان کے بننے کا عمل
نشو نما اور ارتقائی مدارج کا بتدریج جائزہ، لسانی مورّخ کا فرض ہے۔ لسانی تاریخوں میں وسائل در وسائل
کا امکانی حدود میں سراغ لگانا، زمانی حدود سے وابستہ حقائق سے امکانی نتائج اخذ کرنا ایک کامیاب لسانی
مورّخ کا کارنامہ ہے۔

مذکورہ تاریخیں ہمارے لسانی نظریات کی بنیاد پر خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ نتائج
مختصر مضامین کی وساطت سے اخذ کیے گئے ہیں جن میں برج موہن کیفی کی "کیفیہ" میں ڈاکٹر محمود شیرانی کے
موافق نظریہ اپنایا گیا ہے۔ اور "نقوشِ سلیمانی" میں سید سلیمان ندوی نے سندھ کو اردو کا مولد قرار دیا ہے۔ آبِ
حیات میں محمد حسین آزاد نے اردو کو برج بھاشا کا روپ کہا ہے۔ ڈاکٹر محمود شیرانی نے پنجابی، ہریانی اور دکنی
عوامل کو اکٹھا کر کے اردو کو پنجابی کا روپ تسلیم کیا ہے۔

ہندوستانی لسانیات میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے شیرانی کے نظریہ کی حمایت کی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین اپنی
تصنیف "مقدمۂ تاریخ زبان اردو" میں اردو کو ہریانی سے تشکیل دینے کی بات کرتے ہیں۔ وہ اس کے قریب
پنگل، برج بھاشا سے سنوارتے ہیں۔ تمام نتائج جلدبازی سے نکالے گئے ہیں۔ یا نتیجہ پر مبنی ہیں۔ ان تمام تاریخوں
میں فروعی اور سطحی باتوں کو بنیاد بنا کر دوسری زبان سے اردو کا رشتہ قائم کیا گیا ہے۔ زبان کے صرفی و نحوی
قواعد کے پیش نظر ڈاکٹر شوکت سبزواری کی "داستانِ زبانِ اردو" اور "اردو زبان کا ارتقاء" دونوں
ایسی تصانیف ہیں جن میں مختلف زبانوں کی خصوصیات سے نتائج اخذ کر کے اپنی زبان کا جائزہ لیا گیا ہے۔
اسی لیے انھوں نے اردو کو خالص ہندوستانی زبان کہا ہے ملاحظہ ہو۔

"اردو ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کرتے کرتے یا
یوں کہیے ادلتے بدلتے پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ ان سے لیتے اس حالت
کو پہنچی جس میں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔"[1]

۱؎ اردو زبان کا ارتقاء — ڈاکٹر شوکت سبزواری ص۱۵

پنجاب میں اُردو

ڈاکٹر محمود شیرانی

تحقیق کے گوہر شب تاب پروفیسر محمود شیرانی کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے وہ ادب کے جید مورخ اور محقق تھے۔ وہ تحقیقات کے فاضل ماہر تھے۔ ان کی شہرت ان کی دو تصانیف کی وجہ سے ہے۔

۱۔ تنقید شعرالعجم

۲۔ پنجاب میں اردو

اردو میں ان کی تحقیق کا آغاز "پنجاب میں اردو" سے ہوا۔ پنجاب میں اردو انھوں نے ۱۹۲۸ء میں اس وقت لکھی جب وہ اسلامیہ کالج لاہور میں اردو فارسی کے استاد تھے اس کتاب نے تحقیق اور اس کے رجحانات پر گہرا اثر ڈالا۔ اس کے فوراً بعد

دکن میں اُردو
گجرات میں اردو
بہار میں اُردو
بنگال میں اُردو

وغیرہ کتابیں ترتیب دی گئیں۔

اردو کی ابتدا کے متعلق مختلف نظریات میں شیرانی کا نظریہ ہے کہ اردو کا خمیر پنجاب میں تیار ہوا۔ اس نظریے کا دگر نظریات سے اختلاف یا ٹکراؤ نہیں دکن گجرات میں اردو تصانیف کے آغاز کے نظریات سے اس کتاب کا کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ عرض حال میں انھوں نے لکھا ہے کہ

"اردو زبان کا آغاز سرزمین پنجاب سے منسوب ہونا کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ نہیں ہے اس سے پیشتر پنڈت کیفی بعقیدہ خود مذاق کے طور پر اور شیر علی خاں صاحب سرخوش نے پرلطف تذکرہ اعجاز سخن میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے مگر اس کتاب میں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے اس تالیف کا نام جس کے آخری باب "پنجاب میں اردو" کی رعایت سے رکھا گیا ہے۔"

اس کتاب کے مختلف ایڈیشن نکلے تیسرے ایڈیشن میں عبدالمجید سالک کا دیباچہ ہے یہ دیباچہ شیرانی کی وفات کے ساتھ ۱۹ ستمبر ۱۹۴۹ء کو لکھا گیا ہے۔

"پنجاب میں اردو" کے مقدمہ میں شیرانی نے اردو کی قدامت، بھارت کا تعلق اردو سے، اردو کا ارتقاء و آغاز، مسلمانوں کی آمد کے وقت دہلی کی زبان، زبان کا دہلی سے پنجاب پہنچنے کا نظریہ، پنجابی اور اردو کا اشتراک، پنجاب پر بیرونی سیاسی اثرات۔ ملتان اور اس کے اطراف میں فارسی کا دور، پنجاب پر ایرانی تمدن، غزنوی دور میں مسلمانوں کی سی زبان، پنجاب کی زبان کے مرکز تغلق کا دہلی میں منتقل ہونا۔ ساتویں صدی ہجری میں زبان کی حالت، اردو کی ہر دلعزیزی، شمالی ہند میں اردو کا مرکز، ہریانوی زبان کا مرکز۔ ہریانوی ہندبانی، پنجاب اردو کا نیا مرکز وغیرہ امور پر عالمانہ انداز سے بحث کی ہے۔ بتلایا ہے کہ یہ زبان ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے کے دوران اقامت گزینی کا نتیجہ ہے۔ رفتہ رفتہ یہ زبان مختلف صوبوں میں پھیلتی گئی۔ دسویں صدی سے تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ گجرات میں تصانیف کا سلسلہ سب سے پہلے شروع ہوا۔ انھوں نے البیرونی، ابوالفرج رونی، مسعود سعد سلمان، عثمان مختاری، سنائی غزنوی، تاج الدین ریزہ، منہاج سراج، خسرو، ضیا برنی، سعید محمد بن مبارک، شمس سراج عفیف اور بحرالفضائل کے مصنف محمد بن قوام بن رستم بن احمد بلخی اور دوسرے مصنفین کی تصانیف اردو الفاظ، محاورات، فقرے اور دوہے جمع کیے اور بتلایا کہ اردو ساتویں ہجری میں گھروں میں بولی اور لکھی جا رہی تھی۔

شیرانی نے اردو کے مختلف ناموں کے بارے میں محققانہ بحث کی ہے۔ اور ریختہ کے معنی و مفہوم کا تعین کیا ہے۔ صفحہ ۲ پر مخدوم حضرت سرخوش کے حوالے ملاحظہ ہوں۔

"اگرچہ لفظ ریختہ کے فارسی میں کئی معنی ہیں مگر زبان کے تعلق میں فطرتاً اس سے ٹوٹا پھوٹا یا شکستہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔"

صفحہ ۲۹ پر شمس سراج عفیف "تاریخ فیروز شاہی" کے حوالے سے ملاحظہ ہو۔

"شمس سراج عفیف اپنی تاریخ فیروز شاہی میں حصار فیروزہ کی آبادی کے بیان میں اس کی خندق کی تعمیر کے متعلق کہتے ہیں۔

ان صفحات پر ریختہ کی قسمیں بتلائی ہیں۔

اردو کے دیگر نام صفحہ ۲ تا صفحہ ۱۳ پر اس طرح دیے ہیں۔

۱۔ زبانِ دہلوی ۲۔ گوجری ۳۔ دکنی

۴۔ زبانِ ہندوستان ۵۔ ہندی ۶۔ ہندوی وغیرہ

تاریخی حالات کے پس منظر میں اردو کے آغاز سے بحث کی ہے۔ پنجاب میں اس کا خمیر کس طرح تیار ہوا۔ بتلایا ہے۔ پنجابی اور اردو کی صرفی و نحوی قرابت پر روشنی ڈالی ہے اس باب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کس قدر دقت نظری سے مختلف ماخذات کا مطالعہ کر کے نتائج اخذ کیے ہیں۔ اور ان کے دلائل و شواہد کس قدر قوی اور مستحکم ہیں۔

قدیم اردو پر پنجاب کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ سورج بھاشا اور برج کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ مسلمانوں کی ہندی زبان کی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ پرتھوی راج راسو کے بارے میں بتلایا ہے کہ اس کا مصنف کون ہے؟

خسرو کی خالق باری کو جہانگیری دور کے ضیاءالدین خسرو کی تصنیف ثابت کیا ہے۔ اس کے بعد ذیل کے صوفیاء اور ان کی تصانیف و خدمات کا ذکر ہے۔

۱۔ ابی الحسین بن ابو عثمان الجلالی

۲۔ شاہ یوسف

۳۔ شیخ فخر الدین حسین ریحانی لاہوری

۴۔ سید احمد توختہ ترمذی لاہوری

۵۔ سید یعقوب صدر دیوان ریحانی لاہوری

۶۔ حکیم سنائی متوفی

۷۔ عثمان مختاری غزنوی

۸۔ محمود ردیبائی

فارسی لغات سے اردو کی قدامت ثابت کی ہے اور اس سلسلے میں ذیل کی تصانیف و لغات سے مدد لی ہے۔

۱۔ فرہنگ نامہ فارسی لغات	مولانا فخر الدین مبارک غزنوی
۲۔ دستور الافضل	مولانا رفیع المعروف صاحب خیرات
۳۔ زفان گویا	ملا رشید برادر جد جامع شرف نامہ منیری

۴۔ اداۃ الفضلاء	قاضی بدرالدین محمد دہلوی
۵۔ رکن الدین باریک شاہ	مولانا ابراہیم بن قوام فاروقی
۶۔ مفتاح الفضلاؑ	محمد بن داؤد شادی آبادی شارح خاقانی و الوری
۷۔ تحفۃ السعادت	شرف نامہ منیری مولانا محمود بن شیخ ضیاؑ
۸۔ طب حقائق الاشیاؑ۔ قنیۃ الطالبین	قاضی شاہ
۹۔ مواید الفوئد لسان الشعراء	۔
۱۰۔ فوائد الفضلاؑ لسان الشعراء	۔

نثری جائزہ میں "پوتھی سوتری" اور "ہزار رسائل" پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب پر یہ معرکہ آرا تصنیف ختم ہو جاتی ہے۔

زیر نظر کتاب میں بہار گجرات کے صوفیہ کی شمولیت کس وجہ سے کی گئی ہے۔ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ غالباً یہ بتلانا مقصود ہو کہ پنجاب سے زبان ان علاقوں میں پھیل گئی تھی۔

شاہ باجن ؒ کے کلام کو دہلوی کہا گیا ہے۔ مگر شاہ باجن نے اپنے ملفوظ "خزائن رحمت اللہ" میں کہیں بھی اسے دہلوی نہیں کہا۔ یہ بعد کی اختراع یا اضافہ ہے۔

پنجاب میں اردو کے ماخذات کے سلسلہ میں اکثر بیاضوں سے حوالے دیے گئے ہیں۔ بابا فریدؒ کے اشعار بھی ایسی ہی بیاضوں سے لیے گئے ہیں۔ بعد میں اکثر ماخذات کی خود تردید کی ہے۔ تحقیق کا یہ ابتدائی دور تھا ماخذات اتنے عام نہیں تھے۔ اور وسائل اتنے زیادہ نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی تحقیق میں خارجی شواہد کے علاوہ داخلی شواہد سے بھی کام لیا ہے۔ اس طریقہ سے بعد میں کتابوں کے غلط انتساب کے مغالطے کو دور کیا ہے۔ مثلاً "پرتھوی راج راسو"۔ "خالق باری" "گم شدہ بازیافت" ان کی تحقیق کا خاص میدان تھا۔ ٥٥

ہندوستانی لسانیات

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

-ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ پہلے ماہرِ لسانیات ہیں جنھوں نے باقاعدہ لندن اور پیرس میں اس علم کی تحصیل و تکمیل کی۔ انھوں نے ہندوستانی صوتیات پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا اردو کی گمراں منزل پر کام کیا۔ انھوں نے یورپ میں جدید اصولِ لسانیات اور آریائی لسانیات کے تقابلی مطالعہ پر مختلف ماہرینِ لسانیات کی رائے ذیل کے مطابق بیان کیا ہے

۱۔ پروفیسر آر۔ ایل۔ ٹرنر اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز۔ لندن

۲۔ ڈاکٹر گراہم بیلی

۳۔ پروفیسر لارڈ جیمس ۔ صدر شعبۂ صوتیات اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز۔ لندن

۴۔ مادموزیل ویران ۔ سوربون یونیورسٹی۔ پیرس

۵۔ پروفیسر شرانک ۔ پروفیسر صوتیات، کالج دی فرانس

۶۔ پروفیسر وانڈریس

۷۔ پروفیسر ژی وے لسنبت۔ رکن ادارۂ تحقیقات

۸۔ ڈاکٹر جیولس بلاک۔ رکن ادارۂ تحقیقات عالیہ۔ پیرس یونیورسٹی

۹۔ پروفیسر سلون لیوی ۔ پروفیسر سنسکرت۔ کالج دی فرانس

یورپ کے چار سالہ قیام میں مذکورہ بالا ماہرین لسانیات سے بحث و مباحثہ کے بعد جو کچھ انھوں نے حاصل کیا اس سے ایک چھوٹی سی تعارفی کتاب تیار ہو گئی۔ ہندوستان واپس آ کر وہ اس کتاب کی ترتیب میں مصروف تھے کہ مارچ ۱۹۳۲ء میں ہندوستانی کیڈمی کی کانفرنس میں الہ آباد گئے۔ وہاں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے اس بارے میں گفتگو کی۔ انھوں نے اس قسم کی کتاب کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا حتٰی اس کتاب میں ان کا مقدمہ "بطور تبرک" شامل ہے انھوں نے اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے اس جانب پہلا قدم اٹھایا ہے اور "ہندوستانی لسانیات" کے نام سے یہ مختصر مگر جامع اور نہایت مفید کتاب لکھی ہے۔ جس میں اہم لسانیاتی مسائل

اور خاص طور پر ہندوستان کی زبانوں کی تقسیم اور ان کے باہمی تعلقات سے سلیس زبان اور
دلنشین پیرایہ میں بحث کی ہے ۔ اس وقت ایسی ہی مختصر اور جامع کتاب کی ضرورت بھی
تھی ۔ جو آنے والی محقق اور ضخیم کتابوں کے مقدمہ کا کام دے اور جس طرح سے پڑھنے
والوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد میں فائدہ اٹھا سکے ۔" [۱]

اس کتاب میں فراہم معلومات نے آج تک طلبہ مصنفین کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور وہ برابر اس سے
استفادہ حاصل کرتے رہتے ہیں ۔ کتاب کے مندرجہ ذیل مندرجات ہیں ۔

۱ ۔ دیباچہ

۲ ۔ تمہید

۳ ۔ حصہ اول

۴ ۔ حصہ دوم

۵ ۔ کتابیات

۶ ۔ اشاریہ

حصہ اول کے محتویات ملاحظہ کیجیے ۱ تا ۸۰ صفحات

حصہ دوم کے محتویات درج ذیل ہیں ۱ تا ۵۰ صفحات

کتاب کی ترتیب کے متعلق زور صاحب کا بیان ملاحظہ ہو

"مضامین کی فطرت اور نوعیت کے لحاظ سے اس کو دو حصوں میں منقسم کر دینا پڑا
پہلا حصہ عام لسانیات اور السنۂ عالم سے متعلق ہے اور دوسرا ہندوستانی زبان اور
اس کے متعلقہ مسائل سے مخصوص ہے ۔ ممکن ہے کہ پہلا حصہ عام طور پر اتنا دلچسپ نہ
ثابت ہو جتنا دوسرا ہے اس بات کی ضرور کوشش کی گئی ہے کہ بے جا طوالت نہ
ہونے پائے اور دلچسپی باقی رہ سکے ۔ دوسرا حصہ زیادہ اہم ہے اور جدید ترین تحقیقات
کی پیداوار ہونے کے باعث غالباً دلچسپی اور غور سے پڑھا جائیگا ۔ حصہ اردو زبان و
ادب کے طالب علموں کی نصابی ضرورتوں کے مطابق لکھا گیا ہے ۔" [۲]

---

[۱] "ہندوستانی لسانیات (مقدمہ) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ص۵ | [۲] "ہندوستانی لسانیات. محی الدین قادری زور مقدمہ ص۱

کتاب کا دیباچہ ہندوستان کے بزرگ عالم لسانیات عبدالستار صدیقی کا ہے انھوں نے علم لسان، لسانیاتی تحقیق۔ تقابلی لسانیت کی وضاحت کی ہے۔ اس کی اہمیت پر زور دیا ہے اور زور صاحب کی کاوش کو سراہا ہے تمہید میں لکھا ہے کہ

"آج تک (۱۹۳۲ء تک) بہت کم تحقیقات کی گئی ہیں اور جو کچھ کی گئیں ہیں وہ دوسری زبانوں میں قلم بند ہوئی ہیں۔ خود اردو زبان میں (سوا پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی "پنجاب میں اردو" کے) کوئی تحقیقاتی اور قابل توجہ کام نہیں کیا گیا۔ یہ ایک انتہائی اہم ضرورت ہے اور اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنھیں اپنی زبان اور ادب کے کسی نہ کسی شعبہ میں کام کرنے یا اس پر غور و خوض کرنے کا موقع ملا ہو جو اپنی زبان کو دنیا کی شائستہ زبانوں کی صف میں دیکھنے کے خواہش مند ہوں۔ یا جن کی نظریں ترقی یافتہ زبانوں کے کارناموں سے روشناس ہوں۔" [1]

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس وقت تک اردو میں خال خال ایسی تحریریں ملتی ہیں اور لسانیات ایک فراموش شدہ موضوع بھی ہے۔

پہلے باب میں لسانیات کے مقاصد، فوائد اور تاریخ پر روشنی ڈالی۔ دوسرے باب میں زبان کی ماہیت آغاز اور تشکیل سے بحث کرتے ہوئے زبان کے ارتقاء لفظوں کی تشکیل، لفظوں کے مفہوم پر روشنی ڈالی ہے۔

زبانوں کے فطری ارتقاء کی بحث میں صوتی تغیر و تبدل اور ادغامی اثرات کی وضاحت کی ہے۔ ولی، قلی قطب شاہ اور خوب محمد گجراتی کے کلام سے مثالیں دی ہیں اردو سنسکرت کے ادغامی اثرات بتلائے ہیں صوتی تبدیلیوں کی قسمیں کی بحث میں استیشن، ٹیشن، سٹیشن، بیرسٹر، بیلسٹر، کا تلد، قاعدہ کی دلچسپ مثالوں سے بحث کو ذہن نشین کیا ہے۔

زبان کی ارادی تشکیل میں عوام اور علماء کے حصے اور اثرات سے بحث کی ہے سیاسی، ثقافتی، اور معاشرتی اثرات کے نتائج بتلائے ہیں۔ وضع اصطلاحات کا بیان سات آٹھ سطروں میں ختم کر دیا ہے۔

دنیا کی زبانوں کی تقسیم کے طریقے، خاندان، ہند، یورپی اور ہند یورپی زبان کے گروہوں کا بیان

---

[1] "ہندوستانی لسانیات" (تمہید) محی الدین قادری زور صفحہ ۹

ہے۔ ہند آریائی کے ارتقاء کے سلسلے میں آریاؤں کا ہند میں ورود اور گریرسن کے نظریہ کی بحث ملتی ہے
ہندوستان کی موجودہ آریائی زبانوں اور غیر آریائی زبانوں پر تفصیل سے لکھا ہے ان کی مختلف شاخیں
بتلائی ہیں۔

دوسرے حصہ میں ہندوستانی کے آغاز کے بارے میں مواد، مختلف نظریات اور جدید تحقیقات کا جائزہ
لیا ہے ہندوستانی کے ارتقاء کی سہ مرکزی تقسیم اور اس کے اختلاف کے اسباب بیان کیے ہیں۔ ادبی بولیوں میں گجراتی
دکنی، اور شمالی کے اختلافات سے دلچسپ بحث کی ہے۔ گجراتی اور دکنی، شمالی اور دکنی میں تلفظ کے اختلاف
کی مثالیں دی ہیں۔ تحریک مظہر ں کے نتائج اور لکھنؤ کی خدمات کے بیان پر ہندوستانی کی ہمہ گیری کا باب
مشتمل ہے۔ آخر میں اردو ہندی کے جھگڑے کے اسباب اور نتائج سے بحث کی ہے اور اردو کی ضرورتیں
بیان کی ہیں۔

کتابیات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مولف نے مواد کے حصول کی ہر ممکنہ کوشش
کی ہے۔ اشاریہ بھی مفید ہے۔

زیر نظر کتاب "لسانیات" میں اولین کوشش ہے۔ اس کی اہمیت و افادیت آج تک برقرار ہے
اور لسانیات میں مفید اضافہ ہے اور اس کتاب سے طلباء و اساتذہ اور لسانیات کے مصنفین بھی حسب ضرورت
بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔

زبان اور علم زبان

عبدالقادر سروری

پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب کی یہ تالیف کا لسانیات کے موضوع پر منتخب تالیف میں شمار
ہوتا ہے۔ یہ کتاب اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں درج ذیل عنوانات ہیں۔

۱۔ زبان درس کی اہمیت

۲۔ زبان کا آغاز

۳۔ علم زبان

۴۔ زبان کا ارتقاء

۵۔ علم زبان کی شاخیں

۶۔ صوتی تبدیلی

۷۔ صوت

۸۔ تجزیہ

۹۔ تشکیلات

۱۰۔ نحو

۱۱۔ معنیات

۱۲۔ تاریخی طریقہ

۱۳۔ مماثلت اور دوسرے عوامل

۱۴۔ زبانوں کی تقسیم

۱۵۔ دنیا کی زبانیں

۱۶۔ ہندوستان کی زبانیں

۱۷۔ علم زبان کی تاریخ

۱۸۔ تحریر کا آغاز و ارتقاء

زیر نظر تالیف میں لسانیات کے متعلق ضروری مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے فاضل مولف نے تقریباً ان تمام تصانیف سے استفادہ کیا ہے جو انگریزی زبان میں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ اسے نئے دور کی جدید لسانی تحقیقات کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں ان مسائل کو جو اس دور کے لیے نئے تھے۔ اردو کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس مشکل کام کے دوران کچھ پرانی اصطلاحات کا اضافہ ہوا ہے۔ ان کی وجہ بعض مقامات پہ عبارت گراں ہو گئی ہے۔ کہیں کہیں لفظی ترجمہ کا گمان گذرتا ہے اس کے باوجود مولف کی محنت قابلِ ستائش ہے۔

ایک دو مقامات پہ دکنی محاورہ یا روزمرہ کی پرانی شکل دکھائی دیتی ہے مثلاً "گھڑی گرنا" کو دکنی کے علاوہ کوئی اردو پڑھنے والا نہیں سمجھ سکتا۔ دکنی میں "گھڑی گرنا" کے معنی تہہ کرنا ہے۔

اپنے دور کے تقاضے کے مطابق مولف نے کتاب کے آخر میں حوالے کی کتابوں کے نام درج کر دیے ہیں۔ تاکہ اگلے محققین کے لیے سہولت ہو جائے علاوہ ازیں دو ضمیمے اضافے کیے ہیں۔ جو دور کی کتابوں میں نظر نہیں آتے۔

۱۔ انگریزی اصطلاحات اور ان کے اردو مترادفات کی فہرست بہ ترتیب حروف تہجی درج کی گئی ہے۔

۲۔ اشاریہ (انڈکس) ہے۔

موضوع کے اعتبار سے ایک مکمل تصنیف نہ سہی لیکن کارآمد ضرور ہے۔ زیر نظر کتاب کا تحقیقی معیار سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ آنے والے محققین کے لیے بدرقہ ثابت ہوگا۔ ●●

مقدمہ تاریخ زبان اردو

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

یہ کتاب ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تحقیق کاوش کا نتیجہ ہے یہ موضوع کے لحاظ سے اردو ادب کی تاریخ کی اہم کتاب ہے ہماری نظر کے سامنے تیسرا ایڈیشن ہے جو نظر ثانی کے ساتھ کئی اضافوں اور ترمیم و تنسیخ کے بعد ۳۱۲ صفحات پر مشتمل ہے حالانکہ پہلا ایڈیشن ۲۰۸ صفحات پر محیط ہے۔

ہمارے ادب میں لسانی نظریات کی بنیاد رکھنے والی کتابیں آب حیات "پنجاب میں اردو" اہم ہیں ان کا مواد لسانی اصول کے مطابق نظریات وضع کرتا ہے اس مواد کے بیش نظر مسعود حسین خاں کا تحقیقی رویہ بھی لسانیات کے میدان میں قدرے مختلف ہے۔ اور ایک مشعل راہ ہے۔ انھوں نے اپنے تحقیق شدہ مواد کے زور پر قابل قدر نتائج اخذ کیے ہیں۔

۱۔ موصوف نے اردو کے عہد بہ عہد ارتقاء کی تاریخ اور اس کی ابتداء سے متعلق لسانیاتی نظریوں کا جائزہ لیتے ہوئے معقول دلائل کو بنیاد بنا کر نتائج اخذ کیے ہیں۔

۲۔ پہلے باب میں موصوف نے ہندوستان کی قدیم آریائی زبانوں کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے اور ہند آریائی زبانوں کی تاریخ کا جائزہ لے کر ہند آریائی زبانوں کی ادوار پر تقسیم کی ہے۔

۳۔ دوسرے باب میں ہندوستان کی جدید آریائی زبانیں اور ان کی گروہ بندی کا بولیوں کے اعتبار سے تجزیہ کیا ہے۔ تیسرے باب میں اردو زبان اور اس کے ارتقاء کا تحقیقی مواد کھڑی بولی سے اخذ کیا ہے۔

۴۔ چوتھے باب میں آزاد، پروفیسر محمود شیرانی، محی الدین قادری زور کے لسانی نظریوں پر تنقید کرتے ہوئے اردو کا رشتہ برج بھاشا، پنجابی و دکنی سے استوار کیا ہے۔ نیز یہ بھی بتایا ہے کہ آزاد، شیرانی، زور وغیرہ کس بنیاد پر مذکورہ زبانوں سے اردو کے رشتے کو جوڑتے ہیں۔

۵۔ پانچویں باب میں موصوف نے تشکیل اردو کی ابتدا کے بارے میں نئے نظریہ کا خاکہ پیش کیا ہے۔ دکنی، ہریانی، دکنی اور میواتی، دکنی اور کھڑی بولی کا موازنہ کرکے ان سے نتائج اخذ کیے اور ایک نیا نظریہ پیش کیا جس میں وہ اردو کو جمنا پار کی بولیوں سے ملاتے ہوئے میواتی علاقہ سے نکلتے ہوئے اردو پر مختلف زبانوں کے اثرات مرتب کرتے ہیں اور اردو کی تشکیل کو ہریانی کے زیر اثر ثابت کرتے ہیں لیکن کھڑی بولی کے اثرات اور برجی محاوروں سے اس زبان کی نوک پلک درست کرتے ہوئے اصلاح زبان کے اس سلسلے کو ملحوظ تک جاری رکھتے ہیں جہاں اس عہد میں اردو کے مشترک عناصر "دلی والی" کے مقامی محاورے کے مقابلے میں زیادہ مستند اور رائج بتلاتے ہیں۔

۶۔ زبان کی تشکیل کا نظریہ مسعود خاں کی ذاتی تحقیق کا نتیجہ ہے لیکن کوئی تحقیقی نظریہ چاہے کتنا ہی مدلل کیوں نہ ہو اس کی عمر ایک عمر تک اور ایک خاص عہد یا چند خاص ادوار سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ نئی تحقیق کے سائے میں پرانی تحقیقات کے نقوش مدھم پڑ جاتے ہیں۔" [1]

۷۔ مسعود حسین خاں نے لسانی نظریہ سازی میں جانفشانی سے کام لیا ہے۔ تحقیق کے ماخذ اور ذہنی کاوش میں یکسانیت کے تحت قابل قدر نتائج کا اخذ کرنا موصوف کا حق ہے۔

۸۔ آنے والے عہد میں اپنا نظریہ پرانے نظریوں کو اپنی مزید تحقیق سے رد کرتا ہے لیکن تحقیق کے دستوں کا صحیح تعین پرانے نظریوں کے سہارے کیا جاتا ہے۔

۹۔ مسعود حسین خاں کا یہ تحقیقی مقالہ اپنے عہد میں لسانی تحقیق میں مفید اضافہ ہے اور آنے والے محققانِ لسانیات کے لیے مشعل راہ ہے کیونکہ موصوف کا پیش کردہ مواد منطق کم اور حقائق سے زیادہ قریب ہے یہ کتاب تدریسی، تحقیقی، معلوماتی ہر میدان میں ایک اہمیت کی حامل ہے۔ ●●

---

[1] رسالۂ اردو اپریل سنہ ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۲۴

ہندوستانی لسانیات کا خاکہ

سید احتشام حسین

سید احتشام نے جان بیمز کے ایک کتابچہ کا ترجمہ "ہندوستانی لسانیات کے خاکے" کے نام سے کیا ہے۔ یہ کتاب کل چھ ابواب پر مشتمل ہے اس میں ہندوستانی زبانوں کی تقسیم ان کے ارتقائی مدارج اور خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اس کتاب پر سید احتشام صاحب نے ایک جامع مقدمہ لکھ کر اس کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔

مقدمہ میں ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، اغراض و مقاصد، زبان و بیان کی خوبیاں اور اہم نکات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے بھرپور استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔

مقدمہ کے بعض مفید نتائج اور مشوروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے بھی پروفیسر سید احتشام حسین ایک ممتاز نقاد رہے۔

آخر میں ہندوستان کی لسانی تقسیم کا ایک نقشہ پیش کیا ہے۔ پروفیسر احتشام کا تنقیدی اسلوب اور تحریری انداز اپنی جگہ ایک اہمیت کا مالک ہے اس کے باوجود یہ کتاب تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے جامع اور لسانیات کا مذاق رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔

اُردو زبان کا ارتقاء

ڈاکٹر شوکت سبزواری

ڈاکٹر شوکت سبزواری لسانیات کے میدان میں اپنی تحقیق کا لوہا منوا چکے ہیں "اردو زبان کا ارتقاء" دوسرا کارنامہ ہے جو ۲۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ لسانیات کے باب میں اردو ادب کے تحقیقاتی ذخیرہ کو اپنے زریں نظریات سے مالامال کرنے میں ان کی پہلی تصنیف "داستان زبان اردو" نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتابوں کے تحقیقی مواد سے اردو کو ہندوستانی زبان ثابت کرنے میں فخر محسوس کیا ہے۔

زیر نظر کتاب کی ابتداء میں ماخذ کی فہرست درج کی ہے۔

۱۔ موصوف نے تمہیدی باب اوّل میں زبانوں کے خاندان اور ان کے تجزیے کو دو عنوانوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) زبانوں کی صوری تقسیم

(۲) زبانوں کی نسلی تقسیم۔ اس میں زبانوں کی نسلی اور صوری خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔

۲۔ باب دوم "پاکستان کی قدیم و جدید زبانوں اور ان کے تعلقات پر مدلل بحث کی ہے۔

۳۔ باب سوم میں "ہندو پاک کی زبانوں کے رشتے اور اردو کا ماخذ" کا عمیق نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ باب اوّل اور دوم میں درج ذیل تحقیقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۔ صوتی تبدیلیاں۔ حرکات و علل۔ حروفِ صحیح۔ حروف مخلوط

۲۔ اخذ و تالیف الفاظ۔ (الف) سابقے، لاحقے۔ فارسی لاحقے (ب) ترکیب الفاظ

۳۔ باب سوم میں اسمائے حالیہ، جنس، عدد، اعرابی حالت، فاعل، مفعول، اضافی آلی یا سببی، تجردی، ظرفی

۴۔ باب چہارم میں اسمائے مطلقہ (۱) ضمیریں (۲) اسمائے اشارہ (۳) اسمائے موصولہ (۴) حروفِ استفہام (۵) کنایات (۶) ظروف (۷) اسمائے اعداد

(۱) اعدادِ ترتیبی (۲) اعدادِ توصیفی (۳) اعدادِ مکسور (۴) حروف

۵۔ باب پنجم میں افعال و مشتقات (۱) اصلی یا اولی مادے (۲) وضعی یا ثانوی مادے (۳) مصدر اور حاصل مصدر (۴) تعدیہ (۵) فعل معاون (۶) مشتقات افعال (۷) معروف و مجہول (۸) افعال کا استعمال (۹) صورتیں (۱۰) افعال کی گردان

قواعد یا صرف و نحو کے اعتبار سے صوتی اور صوری طریقوں سے ہندوستان کی تمام قدیم و جدید زبانوں کے تقابل کے ساتھ اردو زبان کا لسانی جائزہ لیا ہے اور مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے۔ یہ ہندوستان کی پرانی پراکرتوں سے بنی ہے اور پالی کی ایک شاخ ہے درج ذیل بیانات ملاحظہ کیجیے:

"ہندوستانی کے دو معنے ہیں ایک عام بول چال کی۔ دوسرے ادبی ہندوستانی، ادبی ہندوستانی کو اردو کہتے ہیں۔"[۱]

"اردو ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک ہے جو ترقی کرتے کرتے یا یوں کہیے کہ ادلتے بدلتے پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ ان سے لیتے اس حالت کو پہنچی قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ ... پالی اس کی ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل ہے اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے۔"[۲]

"اردو کو آخری عہد کی پراکرت، شورسینی، اپ بھرنش کی ترقی یافتہ صورت بتلایا جاتا ہے۔ تذکیر و تانیث کے

---

۱ اردو زبان کا ارتقاء ڈاکٹر شوکت سبزواری ص ۲

۲ ایضاً ص ۱۰

ہب میں اپ بھرنش اردو سے بہت گہری ہوئی ہے۔ اور ارتقاء کے لحاظ سے اردو سے بعد کی زبان معلوم ہوتی ہے۔" [سلہ]

مندرجۂ بالا اقتباسات کی روشنی میں موصوف نے "داستان زبان اردو" بیان کی ہے۔ اور اردو زبان کا ہر لحاظ سے جائزہ لیا ہے۔ "اردو" کو خالص ہندوستانی زبان قرار دیا ہے۔ مصنف کا یہ نظریہ اپنی کاوش اور جستجو کی وجہ سے قابلِ غور ہے یہ نظریہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ لسانیاتی تحقیق میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے اس سے اردو کی دوسری زبانوں کے لسانی رشتے کی گرہیں کھلیں گی۔

یہ نیا خیال سب سے پہلے ڈاکٹر شوکت سبزواری کا حصہ ہے۔ اپنی تصنیف "داستانِ زبانِ اردو" کے بعد "اردو زبان کے ارتقاء" میں اپنے اس نظریے کو استحکام عطا کیا اور حقائق کو مستحکم بنیادوں پر رکھا ہے یہ کتاب لسانیات کے باب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے جس نے اپنے سے پہلی تمام تصانیف کے نظریات سے مختلف نظریہ پیش کیا ہے۔ اس لیے آئندہ نسل کے لیے لسانی تحقیق میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور محققینِ ادب کے لیے ایک رہنما کا کام دے گی۔

••

داستان زبان اردو

ڈاکٹر شوکت سبزواری

داستانِ زبانِ اردو ڈاکٹر شوکت سبزواری کی تحقیقی کاوش کا حاصل ہے اس کتاب کی اشاعت ناگزیر تھی کیونکہ ماہرینِ لسانیات و ادب کے درمیان اختلافی جو مسائل تھے۔ ان کا اس میں ازالہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے مثلاً پروفیسر محمود شیرانی پنجاب کو اردو کا مولد قرار دیتے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی سندھ کو اردو کا مرکز مانتے ہیں محی الدین زور شیرانی نظریہ کی حمایت کرتے ہیں۔ محمد حسین آزاد اس زبان کو برج بھاشا کا ایک روپ تسلیم کرتے ہیں اسی طرح مغربی مصنفین اور ہندوستانی زبان کے ماہرین کی رائیں بھی مختلف ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس کتاب میں ان تمام نظریات اور آراء کا عالمانہ اور محققانہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ اردو بذاتِ خود ایک زبان ہے۔ اور یہ کسی ایک زبان کے بطن سے پیدا نہیں ہوئی۔ اور اخذ و استفادہ کا عمل دنیا کی ہر زبان کرتی ہے ایسے ہی اردو زبان نے بھی ہندوستان کی مختلف

لہ اردو زبان کا ارتقاء — ڈاکٹر شوکت سبزواری صفحہ ۱۲

زبانوں سے استفادہ کیا۔ موصوف کا بیان ملاحظہ کیجیے۔

"آج جس زبان کو ہم اردو کہتے ہیں وہ آریہ قبائل کے ہمراکاب پاک و ہند آنے والی قدیم پراکرت کے کسی قدیم روپ کی ترقی یافتہ صورت ہے اس کا نام اردو ہے جو تیرہویں صدی میں علاحیہ مسلمانوں کی سرپرستی میں اس کا احیاء ہوا۔" [1]

موصوف نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اردو کا مولد دلی اور میرٹھ کے درمیان کا علاقہ ہے۔ دوسرے دلائل کے ساتھ انھوں نے اس دلیل پر بار بار زور دیا ہے کہ ہندوستان کے کسی بھی علاقے کی مکمل طور پر زبان اردو نہیں تھی لیکن یوپی کے مغربی اضلاع کے دیہات اور شہروں میں عامی اور عالم ہندو مسلمان ہر شخص کی بول چال اور ادب کی زبان اردو ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی کی رائے پر تنقید کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ اگر مسلمانوں کی آمد سے اردو کے رشتہ کو ملایا جائے تو پھر مولانا سید سلیمان ندوی کی رائے زیادہ وزنی ہے کہ اردو کی ابتدا سندھ میں ہوئی۔ کیونکہ مسلمانوں کی آمد اور اس کے اثرات سب سے پہلے اسی خطے میں پڑے۔

زیر نظر کتاب میں کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا گیا اور رشتہ چھوڑا گیا ہے۔ موصوف کی بعض دلیلیں وزنی ہیں لیکن بعض رائیں ایسی بھی ہیں جن سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ موصوف نے اردو زبان کو قدیم پراکرت کا روپ کہا ہے۔ مختلف دلائل سے یہ مسئلہ بآسانی سلجھ نہیں سکتا۔ بہرحال ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کاوش اور جستجو، قابل ستائش ہے۔ کیونکہ اس پر کسی مخصوص علاقہ کی چھاپ نہیں ہے۔

یہ کتاب علاقائی ادبی عصبیت کا شکار نہیں ہوئی۔ اور مصنف نے حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ اردو کو خالص ہندوستانی زبان کہنا چاہیے۔ کسی ایک قوم، کسی ایک علاقہ کی چھاپ اس زبان پر لگانا تنگ نظری کی دلیل ہے۔

لسانیات کی تحقیق میں یہ کتاب ایک گراں قدر اضافہ ہے کیونکہ لسانیات کے فکر انگیز پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے اور ہندوستان کی مختلف زبانوں کے قواعد و صوتیات کی بنیاد پر اردو کا رشتہ ان زبانوں سے ثابت کیا گیا ہے۔

---

[1] داستان زبان اردو۔ شوکت سبزواری صفحہ ۲
[2] ایضاً ۳۸-۴۷

اردو میں لسانیاتی تحقیق

مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی

ڈاکٹر عبدالستار دلوی صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ پچھلے تیس سالوں سے اردو ادب کے خاموش خادم ہیں۔ فی الحال ممبئی یونیورسٹی میں کرشن چندر چیئر سے منسوب عہدے پر اردو زبان کی تدریس میں مصروف ہیں اور تحقیقی کام کرنے والے طلبا کے مددگار و نگراں ہیں۔ "اردو میں لسانی تحقیق" موصوف کی خدمت کا ایسا نمونہ ہے جسے جدید لسانیات سے متعلق اہم موضوعات پر مضامین کا بہترین انتخاب کہا جا سکتا ہے۔ ان کی عرق ریزی اور عمیق نظری کا ثبوت کتاب کا ہر مضمون ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے کتاب کے "پیش لفظ" میں لکھا ہے۔

> "ڈاکٹر دلوی نے لسانیات سے متعلق منتشر مضامین کا یہ انتخاب کر کے وقت کے ایک اہم تقاضے کو پورا کیا ہے۔ حرف و صوت، رسم خط، زبان اور بولی، لفظ و معانی اور صوت و شعر کے ابواب کے تحت انھوں نے اردو لسانیات سے متعلق وہ سب کچھ یکجا کر دیا ہے جو علمی لحاظ سے لائق اعتنا ہے۔" ۱؎

اس کتاب کا ہر مضمون اردو زبان کے نامور ماہر لسانیات، نقادوں، انشاء پردازوں اور ادیبوں کے نام کی نمائندگی کے ساتھ موضوع کے مطابق مواد کی فراہمی کا ضامن ہے۔ موصوف نے مرتب مضامین کے ذریعہ جدید لسانیات کے باریک اور الجھا دینے والے مسائل اور نکات کو روشن کیا ہے۔ اور ان کے عام فہم انداز میں کتاب کی ترتیب مضامین کا انتخاب یکے بعد دیگرے موضوعات کا سلسلہ تحقیقی جذبے کی دلچسپی برقرار رکھتا ہے۔ لسانیات سے منسلک ہر موضوع ہر مسئلہ تحقیقی تشنگی کو مزید اکسانے کے ساتھ یکسوئی سے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ کتاب کا ہر باب اپنے موضوع کے مزاج کے مطابق محققین ادب، تنقید نگاروں، انشا پردازوں، ادیبوں کا تعارف اور موضوع کا مکمل نمائندہ ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے مقدمہ میں ابواب کی تفصیل کتاب کی اہمیت کو دوبالا کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"میں نے مضامین کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے تاکہ اس سے زبان کی وسعت اور لسانی سطحوں

۱؎ اردو میں لسانیاتی تحقیق (مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی) پیش لفظ مسعود حسین خاں

کے تنوع کو سمجھا جا سکے۔ پہلا حصہ "حرف و صوت" سے متعلق ہے۔ "حرف و صوت" تحریری و تقریری زبانوں میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرا حصہ "زبان اور بولی" ہے۔ اس سے زبان اور بولی میں لسانیاتی فرق کے ساتھ اس کے رشتے بھی منسلک ہیں۔ اس سے زبان کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں بنیادی باتیں ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔ "تیسرا حصہ" "لفظ و معنی" کا ہے یہ قواعد اور اشتقاقیات سے متعلق ہے۔ صرف لفظوں کا مطالعہ ہے۔ اور معنی کو لفظ سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ چوتھے حصے میں اردو زبان سے متعلق "افکار و مسائل" پر بحثیں ہیں۔ اردو زبان کی صحت کے سلسلے میں صوتی و لسانی پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ پانچواں حصہ "صوت و شعر" اسلوبیات سے متعلق ہے جو اب لسانیات کا موضوع بھی ہے۔ مجموعی حیثیت سے اسلوبیات (لسانی مفہوم میں) نیا موضوع ہے اردو میں اس موضوع پر گنے چنے مضامین ہی ملتے ہیں۔ مضامین کی تعداد خود اس حقیقت پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مضامین اردو لسانیات میں اس موضوع کی آبرو ہیں۔ آخری حصہ "رسم الخط" سے متعلق ہے رسم الخط کی زبان میں ثانوی حیثیت کے پیش نظر ماہرین زبان نے زیادہ اہمیت نہیں دی ہے تاہم اردو کے تعلق سے علمی اور بنیادی موضوع ہے۔" [1]

جدید اردو لسانیات

ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین

ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین کی تصنیف "جدید اردو لسانیات" ١٥٨ صفحات پر محیط ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ١٩٧٣ء میں اور دوسرا ایڈیشن جون ١٩٩٣ء میں شائع پذیر ہوا۔ موصوف نے کتاب کی ابتداء میں "زبان اور زبان کی ابتداء کے نظریے" پر بحث کیا ہے۔ نظری اور غیر فطری قوتوں سے آواز اور الفاظ کو ادا کرنے کی صلاحیت پر بحث کرتے ہوئے امریکی ماہر لسانیات جسپرسن جرمن مفکر میکس مولر کے اس نظریہ کو رد کیا ہے "کہ ابتدائی آدمی میں کچھ مادے تخلیق کرنے کی صلاحیت تھی۔ جو بعد کے ادوار میں معدوم ہو گئی۔" [2]

---

[1] اردو میں لسانیاتی تحقیق (مرتبہ عبدالستار دلوی) مقدمہ | [2] جدید اردو لسانیات۔ ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین دوسرا ایڈیشن ص ١٢

عالمی زبانوں کے خاندان کی درجہ بندی میں

۱۔ ہند یورپی، یا انڈو یورپی یا انڈو ہٹائٹ

۲۔ سامی یا سیمٹیک

۳۔ فنو یوگرک

ان تین خاندانوں سے دنیا کی دیگر زبانوں کی پیدائش بتلایا ہے۔ [1]

قدیم یوروپی زبان کے بیان میں سنسکرت، پراکرت، اور اپ بھرنش کو ہند آریائی زبانیں بتاکر ان سے پیدا ہونے والی علاقائی زبانیں یہ ہیں۔

آسامی، بنگال، اڑیا، مراہٹی، پنجابی، گجراتی، راجستھانی، مشرقی اور مغربی ہندی بولیاں وغیرہ سے اردو نکلی ہے۔ ہندوستان میں زبانوں کے خاندان کے ذکر میں آسٹرک، دراوڑی، تبتی، برمی، ہند آریائی خاندانوں پر مختصر مگر جامع معلومات کا اضافہ ہے۔

ہند آریائی کا عہد وسطیٰ کو [illegible] ق م سے [illegible] تک پھیلا کر مہاراشٹری پراکرت، شورسینی پراکرت، ماگدھی، اردھ ماگدھی، پشاچی پراکرت زبانوں کا تذکرہ کیا ہے۔

ہند آریائی کے عہد جدید کو [illegible] کے بعد مقرر کیا ہے اس عہد میں شورسینی، اپ بھرنش، ماگدھی اپ بھرنش، اردھ ماگدھی، مہاراشٹر، براچڈ اور کیکئی اپ بھرنش کا شمار کیا ہے۔

جدید ہند آریائی زبانیں اور ان کی درجہ بندی میں علاقائی بنیاد پر پنجابی، سندھی، بنگالی، اڑیا، بھوج پوری، مغربی ہندی، گجراتی، اودھی، چھتیس گڑھی، میواتی، جے پوری، مارواڑی، برج، بندیلی، قنوجی، ہریانی، اور کھڑی بولی کا تذکرہ کیا ہے ان زبانوں کے ربط و ضبط کی بنیاد میں، افعال، اسماء اور ضمائر پر سرسری نظر ڈال کر گریرسن کی زبانی تقسیم کا نقشہ پیش کیا ہے اور گریرسن کی گروہی تقسیم کو تلفظ کے فرق، اسماء کی اشکال، فعل ماضی، فاعل اور جنس سے محققین کے اختلاف پر روشنی ڈالی ہے۔ [2]

مغربی ہندی کے زیر عنوان گریرسن کے حوالے سے کھڑی بولی، ہریانی، برج، بندیلی اور قنوجی

---

[1] جدید اردو لسانیات۔ ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین دوسرا ایڈیشن صفحہ ۲

[2] ایضاً صفحہ ۴۵ تا صفحہ ۵۰

کا تعلق شورسینی اپ بھرنش سے جوڑ دیا ہے اور برج بھاشا کو اہم زبان بتایا ہے۔

اردو کی ابتدا کے نظریہ میں گریرسن کی کتاب "لسانیاتی جائزۂ ہند" کے حوالے سے اردو کو برج بھاشا اور پنجابی کے امتزاج پر اور پروفیسر زول بلاک کے قول کی روشنی میں ہریانی بولی کی تاریخی قدامت اور بنیادی اہمیت پر زور دیا۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر محمود شیرانی، پروفیسر مسعود حسین خاں تمام ماہرین کے لسانی نظریات کو مختلف دلائل، اسماء ضمائر، فعل، زمانے، مضارع کی مثال اور دلائل سے رد کر دیا ہے مولانا محمد حسین آزاد اور سرسید احمد خاں کے لسانی نظریہ کی اس طرح تردید کی ہے۔

"دراصل ان بزرگوں کے سامنے لسانیاتی تجزیہ کے بجائے وہ تاریخی اور سیاسی حالات تھے جو بار بار مغالطے میں مبتلا کرتے تھے۔ ان میں برج بھاشا کی تاریخی اور ادبی حیثیت تھی۔"[۱]

موصوف کا لسانی نظریہ یہ ہے۔

"اس سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو کھڑی بولی کہیں نہ کہیں اور کھڑی دکھتری نکلا ہے۔"[۲]

شمالی ہند کی اردو اور دہلی میں اصلاح زبان کی تحریک کے باب میں سلیمان سعید سے مظہر جان جاناں اور شاہ حاتم کی اصلاح زبان کی تحریک کے باب میں رقمطراز ہیں۔

"شاہ محمد حاتم کو اصلاح زبان کا بہت شدید احساس تھا۔ اسی لیے انھوں نے ایہام گوئی ترک کی اپنے کلام کا بہت بڑا حصہ خود تلف کیا۔"[۳]

لکھنؤ کی اردو اور ناسخ کی تحریک اصلاح زبان پر مفصل اور تنقیدی تبصرہ کیا ہے۔ علی گڑھ تحریک اور اردو کی توسیع میں سرسید کی مساعی کا بیان کیا ہے۔ حالی، شبلی اور ذکاء اللہ کو اس تحریک کا روح رواں بتلایا ہے۔

اردو اور ہندی کا رشتہ کے ضمن میں مختلف مثالوں سے اردو میں ضم ہونے والی بھاری بھرکم آوازوں اور حرفوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اردو کی مخصوص آوازوں کا ہندی میں پایا جانا بھی ثابت ہے اور اردو ہندی کو ایک خاندان سے پیدا ہونے والی زبان ثابت کیا ہے۔

"اصطلاحات سازی اور اردو" اس باب میں اصطلاحی اور لغوی زبان میں مفہوم اور معنی کے فرق

۱؎ جدید اردو لسانیات ۔ ڈاکٹر حبیب اللہ خاں شاہین دوسرا ایڈیشن صہ ۷

۲؎ ایضاً صہ ۸۴ ۔ ۳؎ ایضاً صہ ۹۴

کی وضاحت میں بہت عمیق نظری کا ثبوت دیا ہے۔ موجودہ معروف زبانوں میں مرکب آوازوں اور اصطلاحی لفظوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

"جدید اردو لسانیات" اعضائے صوت یا اعضائے متکلم میں جدید لسانیاتی اور صوتیاتی تحقیق کے معیار پر سائنٹفک نقطۂ نظر سے اعضائے متکلم پر معلومات فراہم کی ہیں۔

۱۔ زیر نظر کتاب کی اہم خوبی یہ ہے کہ جامع شواہد اور دلائل سے مصنف نے تمام لسانی محققین کے نظریات کو رد کیا ہے لیکن ان دلائل کی روشنی میں موصوف نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ اس تصنیف کی اہم خامی ہے کھڑی بولی سے اردو کی پیدائش کا نظریہ بھی مصنف کے مغالطے کا سبب ہے۔

۲۔ مصنف کا درج ذیل جملہ غلط معلومات فراہم کرتا ہے اور مغالطے میں ڈالتا ہے۔

"خواجہ مسعود سعد سلمان نے ترکی اور فارسی کے علاوہ کسی زبان ہندوی میں بھی شاعری کی۔" [۱]

۳۔ "اکبر کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ برج میں بھی شاعری کرتا تھا۔" [۲]

مصنف نے اس معلومات کا کوئی حوالہ پیش نہیں کیا اس کتاب میں اصلاح زبان کی تحریکات پر تفصیلی معلومات ملتی ہیں۔ اردو اور ہندی کے رشتے پر کئی باتیں قابل غور ہیں۔ اردو رسم الخط کی خوبیوں سے اردو کی انفرادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اصطلاحات سازی اور اردو میں اصطلاحات پر مفصل معلومات ملتی ہیں۔ اعضائے صوت یا اعضائے متکلم کی معلومات اس کتاب کی انفرادیت کو برقرار رکھتی ہے۔ ان خوبیوں کی بناء پر یہ کتاب تحقیقی کام کے لیے مفید ہے۔ مگر اس کے تمام بیانات قابل قبول قرار نہیں دیے جا سکتے۔

تحقیق کی راہ کھلی ہوئی ہے۔ آنے والے محققین اس پر تفصیل سے بحث اور تحقیق کریں۔

---

[۱] جدید اردو لسانیات ڈاکٹر مہر اللہ خاں شاہین ص ۲۔ ۳

[۲] ایضاً ص ۷

اُردو کی لسانی تشکیل

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کی تصنیف "اردو کی لسانی تشکیل" ۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا سال اشاعت ۱۹۸۵ء ہے۔ کتاب کی ابتداء "کتاب نامہ" کے عنوان سے ہوتی ہے جس میں مصنف نے مواد و موضوع کے مطابق پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ "کتاب نامہ" دیباچہ کی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں موضوع مواد اور معاون شخصیات پر تفصیل ملتی ہے۔

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نقاد اور محقق کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں اس کتاب کی اشاعت کے بعد ان کا شمار ماہر لسانیات میں کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ فی الحال موصوف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات میں استاد ہیں، نیز وزارت تعلیم و ثقافت، حکومت ہند کے ادارے اردو ٹیچنگ اور ریسرچ سینٹر میں پرنسپل کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں۔

موصوف نے "اردو کی لسانی تشکیل" میں تحقیقی نوعیت کے آٹھ مضامین ہیں۔ پہلے مضمون میں اردو کے آغاز و ارتقاء کے ان نظریات سے بحث کی گئی ہے جو مولانا محمد حسین آزاد، حافظ محمود شیرانی، سید محی الدین قادری زور، پروفیسر مسعود حسین خاں، گیان چند جین، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور سہیل بخاری کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان نظریات کی روشنی میں لسانی تقسیم اور ارتقاء پر بحث کرتے ہوئے موصوف نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ دوسرے مضمون میں "اردو زبان کے عہد بہ عہد ارتقاء" سے بحث کی ہے۔ اور شمالی ہند میں اردو کے لسانی ارتقاء کی روشنی میں اس کے ادبی ارتقاء کی بھی نشاندہی کی گئی ہے اور اردو کے قدیم سرمایۂ ادب کی لسانیاتی خصوصیات پر اعتماد کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

"اردو کے چند دیگر لسانیاتی مسائل" میں اردو کی معکوسی (کوزی) آوازوں کے ارتقاء، قدیم اردو کی صوتیاتی خصوصیات اردو اور ہریانی کے درمیان لسانیاتی مشابہت قدیم اردو کے سرمایۂ الفاظ اور اردو رسم الخط کے ارتقاء اور املا کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کی مدلل بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں قدیم شعرائے دہلی کے دس مرثیے بھی شامل ہیں۔ جن کا تعلق سترھویں صدی کے ربع چہارم سے ہے۔ افضل کی "بکٹ کہانی" کے بعد یہ مرثیے شمالی ہند میں ریختہ گوئی کا ایک اہم نمونہ خیال کیے جاتے ہیں۔

۱۔ اس کتاب میں مصنف نے جن لسانیاتی نظریات پر تحقیقی نوعیت سے تنقید کا رویّہ اپنایا ہے مطالعہ کے دوران معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نیا لسانی نظریہ کا اظہار کیا جائے گا۔ لیکن پہلے نظریات کے تعمیری عناصر کو ایک جگہ اکٹھا کیا گیا۔ ذاتی نظریہ سے پس و پیش کیا گیا ہے۔

۲۔ اردو کی معکوسی آوازوں کے ارتقاء میں صوتیاتی خصوصیات کا اظہار تسلی بخش نہیں ہے۔

۳۔ رسم الخط کے ارتقاء میں املاکی تبدیلیوں کی بحث تشنگی کا شکار ہے۔

ان خامیوں کے باوجود اردو کی ابتداء اس کے عہد بہ عہد ارتقاء میں ظہور پذیر ہونے والی لسانی تبدیلیوں اور آغاز و ارتقاء کے متعلق جو مختلف نظریے پچھلی چند دہائیوں میں وجود میں آئے ہیں ڈاکٹر مرزا، خلیل احمد بیگ کی یہ کتاب ان نظریات میں ایک اضافہ ہے کیونکہ اس کتاب میں تمام نظریات پر بحث کا نچوڑ ہے۔

لسانی تاریخوں پر تبصرہ

ہماری زبان کے لسانی پہلوؤں پر بہت کم تحقیقات کی گئی ہے۔ اردو کی نشوونما اور تدریجی ارتقائی منازل کے تحقیقی نظریوں میں دو اہم نظریے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

(۱) آب حیات میں محمد حسین آزاد کا نظریہ جس میں موصوف اردو کو برج بھاشا کا روپ تسلیم کرتے ہیں۔

(۲) ڈاکٹر محمود شیرانی اپنی تصنیف "پنجاب میں اردو" اردو زبان کو پنجابی زبان کا دوسرا روپ سمجھتے ہیں اول الذکر تصنیف کو ہم نے تذکروں اور تاریخ کے بیچ کی کڑی شمار کیا ہے لیکن لسانی نظریے کی بنیاد پر آب حیات لسانی تاریخوں کے زمرہ میں بھی آجاتی ہے۔

اردو کی ابتداء سے متعلق مختلف نظریے ہیں لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان سب میں اردو زبان کے آغاز کو ہندو مسلم میل کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے مگر اس میل جول کے مقام، نوعیت اور پھر نتیجے نکالنے میں یہ سب تحریریں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

آغائے اردو مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "آب حیات" میں برج بھاشا کو اردو کا ماخذ بتایا ہے اس سلسلہ میں آزاد نے جو عالمانہ بحث کی ہے وہ قابل قدر ہے۔ اردو کی ابتداء سے متعلق یہ پہلا نظریہ تھا۔ اس لیے ابتداء میں اسے صحیح تسلیم کیا گیا۔ لیکن تحقیق کے میدان میں کوئی فیصلہ حرف آخر نہیں ہوا کرتا صحیح بات تو یہ ہے کہ نہ تو اردو برج بھاشا سے نکلی اور نہ برج بھاشا کا نام ہندی ہے۔

دوسرا اہم نظریہ حافظ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں پیش کیا۔ اس کتاب میں انھوں نے اردو اور پنجابی دونوں سے متعلق تفصیل نہایت اہم اور دلچسپ لسانی پہلوؤں پر بحث کی ہے ان کے اہم لسانی دلائل جن کی بنا پر وہ اردو کو بہ نسبت برج بھاشا کے پنجابی سے زیادہ قریب و مشترک قرار دیتے ہیں۔ دو ہیں۔

(۱) پنجابی اور اردو دونوں ایک ہی اصول کے تحت لسانی اور نحوی قرار پاتے ہیں۔

(۲) اردو میں چند اجزا ایسے ہیں جن کی توضیح صرف عہد حاضر کی پنجابی کے مطالعہ اور اس کے غور و خوض سے ہو سکتی ہے یہ خصوصیتیں زیادہ تر لفظی حیثیتوں اور صوتی تغیرات سے متعلق ہیں۔ سید سلیمان ندوی "نقوش سلیمانی" میں سندھ کو اردو کا ابتدائی مرکز قرار دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ مسلمان سندھ میں چار صدیوں تک نشو و نما حاصل کرتے رہے وہاں انھوں نے فطرتاً ایک زبان کی بنیاد ڈالی جو کہ اردو کی ابتدائی شکل تھی۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں محمود شیرانی کے خیال کی نفی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اردو زبان دہلی کے گرد و نواح کی بولیوں میں میواتی اور کھڑی بولی سے زیادہ قریب ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنی تصانیف "داستان زبان اردو" اور "اردو زبان کا ارتقاء" میں اردو کو خالص ہندوستانی زبان کہتے ہیں۔ اپنے دلائل و شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اردو زبان ہند آریائی زبانوں میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے خیال میں اردو میں بانگرو یا ہریانی زبان کا قابل لحاظ اثر ہے جب شمالی ہند کے مسلمانوں نے دکن پر حملہ کیا تو وہاں ان کے ساتھ وہی زبان گئی جو ابھی قائم ہے۔ اطراف و جوانب دہلی کی زبان کا پورا اثر پڑنے نہیں پایا یہ غیر پختہ زبان دکھن میں پھیل گئی۔ ان مختلف نظریوں کی کشمکش میں مبتلا ہو کر ایک قاری سہ مصرعہ "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا" کا مصداق بن جاتا ہے

ہماری لسانی تاریخوں میں اکثر محققین و ماہرین لسانیات اپنے مواد کو صدیوں کی تاریخ میں محیط ہونے کے باوجود دو ٹوک فیصلے تک پہنچ نہیں پاتے۔ حقائق سے چشم پوشی کر کے قیاسات پر زیادہ زور رہے۔ لسانی تاریخ کے اصول و قواعد کی روشنی میں ڈاکٹر محمود شیرانی، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کی لسانی تاریخیں اہمیت کی حامل ہیں۔

ان ماہرِ لسانیات کے علاوہ کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جن کی بنیاد علاقہ پرستی پر ہے اور جو کہ اردو کی ابتداء اپنے مخصوص علاقہ سے گردانتے ہیں۔

••

(ج)

ادبی تاریخوں میں علاقائی رجحان پر عمومی تبصرہ

علاقائی تاریخوں پر تنقیدی تبصرے

۱۔	دکن میں اردو	ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی	سنہ ۱۹۲۳ء
۲۔	تذکرہ شعرائے اورنگ آباد	سید سردار علی	سنہ ۱۹۲۶ء
۳۔	عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	سنہ ۱۹۳۵ء
۴۔	اردو شہ پارے	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	سنہ ۱۹۳۹ء
۵۔	شعرائے پنجاب	محمد باقر نسیم رضوانی	سنہ ۱۹۳۷ء
۶۔	مدراس میں اردو	ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی	سنہ ۱۹۳۹ء
۷۔	دلستانِ ادب حیدرآباد	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	سنہ ۱۹۴۵ء
۸۔	دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	سنہ ۱۹۴۵ء
۹۔	بنگال میں اردو	وفا راشدی	سنہ ۱۹۵۴ء
۱۰۔	بہار میں اردو زبان کا ادب اور ارتقاء	اختر اورینوی	سنہ ۱۹۵۷ء
۱۱۔	دکنی ہندو اور اردو	سید نصیر الدین ہاشمی	سنہ ۱۹۵۶ء
۱۲۔	مدراس میں اردو ادب کی نشوونما	افضل الدین اقبال	سنہ ۱۹۵۸ء
۱۳۔	ریاستِ میسور میں اردو کی نشوونما	ڈاکٹر حبیب النساء	سنہ ۱۹۶۲ء
۱۴۔	اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ	سلیم حامد رضوی	سنہ ۱۹۶۳ء
۱۵۔	ریاست ٹونک اور اردو شاعری	مختار شمیم	سنہ ۱۹۶۷ء
۱۶۔	بہار میں اردو نثر کا ارتقاء سنہ ۱۹۱۴-۵ء	مظفر اقبال	سنہ ۱۹۸۰ء

تبصرہ کتب

۱۷۔ بمبئی میں اردو — ڈاکٹر میمونہ دلوی — سنہ ۱۹۸۰ء

۱۸۔ سخنورانِ گجرات — ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی — سنہ ۱۹۸۱ء

۱۹۔ تاریخ ادبیات گورکھپور — ڈاکٹر سلام سندیلوی — سنہ ۱۹۸۲ء

۲۰۔ مغربی بنگال کے اردو شعراء — مشتاق احمد

۲۱۔ بدایوں کے چند ادباء و شعراء — مبشّر علی

۲۲۔ کامٹی کی ادبی تاریخ — شرف الدین ساحل

علاقائی تاریخوں پر تنقیدی تبصرہ

۲۳۔ مشرقی بنگال میں اردو — اقبال عظیم

ادبی تاریخوں میں علاقائیت کا رجحان

علاقہ پرستی، زبان، تہذیب و معاشرت اور ذات پات کی بنیاد پر انسانوں کے حقوق کی شنوائی کا تصور ۱۸ ویں صدی کی یورپین سیاست کی دین ہے۔ اسلام میں ان جذبات اور احساسات کی کوئی قدر و قیمت نہیں کیونکہ یہاں کردار کی بنیاد پر انسان کو عزت و ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہندو دھرم میں ذات پات اور علاقائی بنیاد پر انسانی حقوق کی تقسیم کا بھرپور نظریہ موجود ہے۔ اور اسی وجہ سے انگریزوں نے ہندوستان میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کے جذبات کو بڑھاوا دیا۔ اور ہندوستانیوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتے رہے۔ یہی اثرات مسلمانوں پر بھی مرتب ہوئے۔

ہندو معاشرت اور انگریزی سیاست کی کرشمہ سازیاں عملی سیاست کے میدان میں پوری طرح در آئیں اور انیسویں و بیسویں صدی میں ان جذبات کا طوفان ہر شعبۂ حیات پر حاوی ہوتا چلا گیا۔ سیاست، معیشت، تاریخ اور ادب سب ہی اس سے متاثر ہوئے۔ اسی جذبہ کے تحت اردو زبان کا مولد اپنے اپنے علاقوں کو قرار دینے کی مہم چل پڑی۔ اردو کی ابتداء، نشوونما، ارتقاء ہر علاقے والوں نے اپنے علاقے کو اردو زبان سے منسوب کیا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے علاقائی تاریخ "دکن میں اردو" مولف مولوی نصیر الدین ہاشمی کا نام آتا ہے اسی بنیاد پر عبدالحق نے لکھا ہے کہ

"یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ہر صوبہ اردو کو اپنی زبان بتاتا ہے۔" ۱؎ جس زمانے میں یہ بات کہی گئی اس وقت اردو کو اپنا کہنا اور تحقیق سے اسے ہندوستانی زبان ثابت کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ کیونکہ ملک کا ایک طبقہ اس دور میں اردو کو ہندوستانی زبان ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ اس کے پیش نظر مولوی عبدالحق کے یہ الفاظ اردو زبان سے انسیت کا مظاہرہ ہیں۔

علاقائی جذبات کے عمل اقدام سے کئی حقائق کا سامنا ہوا۔ اور اردو کے تعلق سے نئی نئی باتیں سامنے آئیں۔ اردو زبان سے متعلق ثبوت، مخطوطوں، بیاضوں، مجموعۂ کلام، صوفیوں کے اقوال اور قلمی تصانیف کا علم ہوا۔ اور اردو کو ہندوستانی زبانوں کے ساتھ ہندوستانیت کا مظاہرہ کرنے میں سہولت ہوئی۔ غرض کہ اردو کی ابتدائی نشوونما، اور ارتقائی مدارج کا تعین مزاجاً ہندوستانی اخوت کے ساتھ ذہن و دل میں رکھنے کے قابل ہوا۔ اور اردو زبان کو خالص ہندوستانی زبان سمجھنے میں ہم حق بجانب ہوئے۔

۱؎ پنجاب میں اردو ۔ رسالہ اردو ۱۹۲۸ء صفحہ ۲۷ جولائی، عبدالحق

تیسری بات اس تعلق سے پرانی شاعری نثر کا مستند مواد ور گمنام شعراء اور ادباء اور صوفیوں کے کارنامے علاقائی حوالوں میں ظاہر ہوئے۔ زبان کی مختلف شکلیں صوتی اعتبار سے کن حالات میں کس طرح وضع ہوئیں یہ باتیں سامنے آئیں۔

علاقائی تاریخوں میں اردو زبان سے انسیت کے مظاہرے کا بے پناہ ثبوت ملتا ہے کیونکہ ہر علاقے نے اردو زبان کو اپنے علاقے سے منسلک کرنے کے لیے مختلف علاقائی تاریخوں میں تحقیقی مواد کے ذریعے ثبوت بہم پہنچایا گیا ہے اس جذبے کی شدت نے جنوبی اور شمالی ہند میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے نظریے سے مستند مواد کو غیر مستند قرار دینے کا جذبہ بیدار ہو تا گیا۔ اور ایک تاریخی تصنیف سے مختلف تاریخوں کے لکھنے کا احساس برابر کام کرتا رہا۔ ذیل میں ہم شمالی اور جنوبی ہند کے علاقائی جذبے کے تحت کتنی تاریخیں لکھی گئیں اس کی فہرست دیتے ہیں۔ یہاں صرف ایسے نام درج کیے جاتے ہیں جو اپنے علاقوں میں اردو کی نمائندگی کرتے ہیں اور اپنے علاقہ سے باہر اردو کے وجود کو تسلیم کرنے کی منکر ہیں۔

(۱) شمالی ہند کے علاقوں کی نمائندہ تاریخیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ "آب حیات"	از محمد حسین آزاد
۲۔ "خم خانۂ جاوید"	از لالہ سری رام
۳۔ "گل رعنا"	از عبدالحئی
۴۔ "داستان تاریخ اردو"	از ڈاکٹر شوکت سبزواری
۵۔ "داستان زبان اردو"	از ڈاکٹر شوکت سبزواری
۶۔ "تاریخ زبان اردو"	از ڈاکٹر شوکت سبزواری
۷۔ "پنجاب میں اردو"	از حافظ محمود شیرانی
۸۔ "مقدمہ تاریخ زبان اردو"	ڈاکٹر مسعود حسین خاں (لسانیاتی)
۹۔ "لکھنؤ کا دبستان شاعری"	ابواللیث صدیقی
۱۰۔ "دہلی کا دبستان"	نورالحسن ہاشمی
۱۱۔ "بہار میں اردو"	ڈاکٹر اختر اورینوی
۱۲۔ "دو ادبی اسکول"	علی جواد زیدی

(۲) جنوبی ہند کے علاقوں کی نمائندہ تاریخیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ "دکن میں اردو" از مولوی نصیر الدین ہاشمی

۲۔ "دکنی ادب کی تاریخ" از ڈاکٹر محی الدین قادری زور

۳۔ "اردو شہ پارے" از ڈاکٹر محی الدین قادری زور

۴۔ "میسور میں اردو" از پروفیسر آمنہ خاتون اور مسٹر حبیب اللہ شاہ

۵۔ "کرناٹک میں اردو" از مسٹر حبیب اللہ

۶۔ "مدراس میں اُردو" از مولوی نصیر الدین ہاشمی

۷۔ "اُردوئے قدیم" از شمس اللہ قادری

ان تاریخوں کے علاوہ مشرقی اور مغربی علاقوں کی تاریخیں اس طرح ہیں۔

۱۔ "بھوپال میں اردو ادب کا ارتقاء" حامد سلیم رضوی

۲۔ "سندھ میں اردو" مصنفہ حسام الدین راشدی

۳۔ "تاریخ ادب پاکستان" مرتبہ وحید قریشی

۴۔ "بنگال میں اردو" از وفا راشدی

۵۔ "بہار میں اُردو" از اختر اورینوی

۶۔ "بہار میں اُردو" از مظفر اقبال

ان تاریخوں کے علاوہ اور بھی علاقائی تاریخیں ہیں لیکن مندرجہ بالا تاریخیں اس لیے قابل ذکر ہیں کیونکہ یہ علاقائی ادب کی نمائندہ ہیں۔

تمام تاریخیں علاقائی محبت اور انسیت کا بہترین نمونہ ہیں کیونکہ ان تاریخوں میں علاقائی فوقیت کے پیش نظر انتہائی کمزور حوالوں کو بنیاد بنا دیا گیا ہے۔ اپنی تحقیق کے اجزائے ترکیبی میں روایات، غیر معتبر حوالے، بغیر تحقیق کے حوالہ در حوالہ یا عوام کے غیر معروف اشعار، منفرد شخصیات کے بیانات پر من و عن بھروسہ کر لیا گیا ہے مندرجہ بالا تاریخوں نے اپنے اپنے علاقوں کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لیے جائز و ناجائز حوالوں اور روایات پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر لیا ہے۔ ان تاریخوں میں بیشتر خامیاں موجود ہیں۔

فہرست میں شامل کردہ تاریخیں اپنے مزاج اور ماحول کے مطابق علاقائیت کا سرچشمہ ہیں۔ ان میں کچھ ایسی

ہیں جنھیں علاقائی شعراء اور ادباء کا مرقع کہا جا سکتا ہے بہت سی زبان شناسی سے لے کر مزاج اور ماحول کو سمجھانا ہوئی علاقائی زبانوں اور غیر علاقائی مباحثوں کے ساتھ اپنی سرزمین سے منسلک شخصیات کی منظر ہیں اور ہر موضوع سے تاریخوں پر علاقائیت کا غلبہ ہے۔

دکن میں اردو

سید نصیر الدین ہاشمی ۱۹۲۳ء

"دکن میں اردو" اردو کے ممتاز محقق اور ماہرِ دکنیات، سید نصیر الدین ہاشمی کی گراں قدر تالیف ہے۔ یہ ان کی دو سال کی محنتِ شاقہ کا ثمرہ ہے۔ ۱۹۲۳ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا جو تقریباً ۱۸۰ صفحات پر مشتمل تھا اس مقدمہ میں انھوں نے تمثیل کے پیرایہ میں دکن میں اردو کی ابتداء، شمالی ہند میں اردو کے ادبی نقوش اور نشوونما، ولی کا شمالی ہند کا سفر، شمال کے شعراء کے اثرات، دوآبہ میں اردو کی ترویج و اشاعت اور دکن میں اس کی ترقی کو بیان کیا ہے ذیل کے اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"شمالی ہند کا درخت بار آور نہیں ہوا کہ دکھنی پودا زمین کی عمدگی اور بر وقت آبیاری سے بہت جلد ترو تازہ و سرسبز و شاداب ہو گیا لیکن قبل از وقت بار آوری سے پھلوں میں کثرت ہو کر زیادہ مٹھاس باقی نہ رہی۔"[1]

"یہاں کا چمن گو خزاں برباد نہ ہوا تھا۔ درخت پھلوں سے خالی نہ ہوئے تھے۔ پھول زمانے کی نیرنگیوں کے باعث کملا نہ گئے تھے تاہم عمدہ مسالہ اور نئے مصالحوں کی ضرورت تھی تا کہ طرز جدید کے آلات اور نو ایجاد کھاد کو جو یورپ کے گلزاروں کی چمن بندی میں کار آمد تھے استعمال کریں۔ باغبان نے اس گر کو دریافت کر لیا اور نئے سر و سامان کے ساتھ چمن کی آراستگی میں مشغول ہو گئے۔"[2]

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف نے تلاش و تجسس غور و مطالعہ کے بعد اس کو مرتب کیا تھا مواد کی فراہمی کی دشواریاں تھیں۔ مستند کتابوں کا مواد لیا۔ ابتداء میں ان کا ارادہ ایک مضمون لکھنے کا تھا مگر مضمون بڑھتے بڑھتے ۱۸۰ صفحات کی کتاب بن گئی۔

---

[1] دکن میں اردو، سید نصیر الدین ہاشمی ۱۹۲۳ء ص [2] ایضاً ۱۹۲۳ء ص

اس کتاب میں وقتاً فوقتاً اضافے ہوتے رہے۔ ہاشمی صاحب نے کتب خانہ آصفیہ / کتب خانہ سالار جنگ کی وضاحتی فہرستیں تیار کیں۔ یورپ میں دکنی مخطوطات تصنیف کی۔ اس کام کے دوران ان کی نظر سے کئی مخطوطات گزرے، اور نیا مواد سامنے آیا۔ اس کو انھوں نے کتاب میں سمو دیا۔ اور اب یہ کتاب ۸۱۲ صفحات کی بن گئی۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا دوسرا مکتبہ ابراہیمیہ نے ۱۹۲۶ء میں شائع کیا اس میں کچھ ترمیم اور اضافے کیے گئے تیسری اشاعت بھی مکتبہ ابراہیمیہ سے کی اس وقت وہ یورپ میں دکنی مخطوطات پر اپنا کام مکمل کر چکے تھے کتاب شائع ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ نئے مواد کے اضافے نے کتاب کی ضخامت بڑھا دی۔ پہلی دوسری اشاعت میں میسور اور مدراس میں اردو ایک باب تھا۔ تیسری اشاعت میں اسے علیحدہ کر دیا گیا۔ کیونکہ مولف نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب تصنیف کر دی تھی۔

اس کی چوتھی اشاعت ۱۹۵۲ء میں مکتبہ معین الادب لاہور کی طرف سے ہوئی۔ اس میں ۱۶ سال میں جو جدید معلومات فراہم ہوئی تھیں ان کا اضافہ کیا گیا ۱۹۶۱ء میں پانچویں مرتبہ بلا اجازت تغیر و ترمیم کے اردو مرکز لاہور نے شائع کر دی یہ چوتھی اشاعت کا عکس تھا۔

چھٹی اشاعت ۱۹۶۳ء میں ہوئی۔ اس میں کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ آصفیہ، ایوان اردو حیدرآباد سے بہت سا مواد بھی آ گیا۔ اس میں ایک جدید باب کا اضافہ ہوا ہے۔

آندھرا میں اردو:

۱۹۵۶ء میں آندھرا پردیش کا قیام عمل میں آیا۔ حیدرآباد کے کچھ علاقے اس سے جدا ہو گئے لیکن آندھرا کے کئی اضلاع شامل ہو گئے اس لیے اس میں تبدیلیاں ناگزیر ہو گئیں حال میں اس کا خوبصورت ایڈیشن ترقی اردو بیورو دہلی نے شائع کیا۔ ڈائرکٹر ترقی اردو بورڈ فہمیدہ بیگم نے اپنی بات میں شاہ صدرالدین کی تصانیف میں "رموز السالکین" کا اضافہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ شاہ موصوف کی دو کتابیں کسب عروج اور مرآۃ الافکار انجمن ترقی اردو دہلی کے کتب خانہ میں ہیں۔ حبیب خاں نے دکن میں اردو پر اپنے تبصرے میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ [۱]

فہرست مکتوبات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی تمہید آٹھ ادوار آندھرا میں اردو پر مشتمل ہے۔ آخر میں اخبارات و رسائل اور اردو ادوار کا بیان بھی شامل ہے۔ شروع میں اظہار واقعات

---

[۱] ہماری زبان علی گڑھ ۱۵ جولائی ۱۹۶۵ء

میں مختلف اشاعتوں کا ذکر ہے۔ طبع اول کا مقدمہ ہے جنوبی ہند میں اردو کی ابتداء، پراکرت، دکن میں اردو، نظم و نثر کی ابتداء، دکھنی نظم و نثر کا بیان تمہید سب شامل ہے۔

پہلے دور میں بہمنی دور کے مصنفین کا ذکر ہے اس دور میں بتلایا ہے کہ ریختہ نظم و نثر کی صورت سب تحریر میں آگئی تھی۔ اس میں ترقی بھی ہو رہی تھی۔ اس دور میں تصوف کا رواج تھا۔ غزلیات، مثنوی،،، قصیدوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ معراج العاشقین کو خواجہ بندہ نواز کی تصنیف بتلایا ہے۔" [۱]

نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کا زمانۂ تصنیف ۸۶۵ھ سے ۸۶۸ھ قرار دیا ہے تاریخ ادب اردو جمیل جالبی مثنوی کے اشعار کے حوالے سے ۸۲۸ھ (۱۴۲۱ء) تا ۱۴۳۴ء) بتایا ہے دوسرے دور کو کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

قطب شاہی دور — نثر

قطب شاہی دور — نظم

اس دور کی تفصیل میں عادل شاہی دور کی نظم اور نثر

نظام شاہی دور کی نظم

بریدشاہی دور کی نظم

قطب شاہی دور میں عموماً مثنویوں کا رواج تھا۔ یہ فارسی کے ترجمے تھے۔ مترجمین نے اضافے کیے اور ان کی شکل کو بدلنے کی کوشش کی۔ صفحات ص۲۶ تا ص۹۵ پر مثنویات کی فہرست ہے۔

دوسری فصل میں عادل شاہی دور کی نثر اور نظم کا حال ہے۔ عادل شاہی دور کے شعرا و ادیبوں کی تصانیف کی فہرست یوں ہے۔ ص۱۸۵–۱۸۳

شمار	نام	تصانیف
۱۔	شاہ برہان الدین جانم	وصیت الہادی، مغز مرغوب، سک سہیلا
۲۔		منفعت الایمان
۳۔	ابراہیم عادل شاہ ثانی	نورس
۴۔	عبدل	ابراہیم نامہ

۱۔ دکن میں اردو۔ سید نصیر الدین ہاشمی۔ ص۲۹

۵۔ آتشی

۶۔ مقیمی — چندر بدن و مہیار

۷۔ امین — بہرام و گل اندام

۸۔ شوقی — فتح نامہ نظام شاہ، میزبانی نامہ

۹۔ صنعتی — قصۂ بے نظیر، گلدستہ

۱۰۔ ملک خوشنود — ہشت بہشت، بازارِ حسن

۱۱۔ رستمی — خاور نامہ

۱۲۔ دولت — تکملہ، بہرام و گل اندام

۱۳۔ شاہی (علی عادل شاہ) — کلیات

۱۴۔ نصرتی — گلشنِ عشق، علی نامہ، تاریخ اسکندری

۱۵۔ شاہ ملک — شریعت نامہ

۱۶۔ امین (امین الدین علی) — محبت نامہ، رموز السالکین

۱۷۔ ظہور — غزل

۱۸۔ ہاشمی — یوسف زلیخا، دیوان

۱۹۔ ایاغی — نجات نامہ

۲۰۔ شغلی — پند نامہ

۲۱۔ علی — پند دل نامہ

۲۲۔ کریم — نظم مدحیہ وغیرہ

۲۳۔ مرتضیٰ — وصل نامہ

۲۴۔ حسینی — دیوان

۲۵۔ مختار — معراج نامہ، مولود نبیؐ

۲۶۔ قدرتی — قصص الانبیاء

۲۷۔ مومن — اسرارِ عشق

نمبر	نام شاعر	تصانیف	سنہ تصانیف
۱	ولیؔ	کلیات	مابعد سنہ ۱۱۰۰ھ
۲	محمود بحری	من لگن ۔ بھنگ نامہ	مابعد سنہ ۱۱۰۰ھ
۳	ضعیفیؔ	ہدایت نامہ ۔ عشق صادق } قصہ خدا	مابعد سنہ ۱۱۰۰ھ
۴	ترابؔ	کفن چور ۔ نصیحت بدن }	مابعد سنہ ۱۱۰۰ھ
۵	علاولؔ	ابلیس نامہ	مابعد سنہ ۱۱۰۰ھ
۶	حسینؔ	قصۂ شمعون	مابعد سنہ ۱۱۰۰ھ
۷	مظفرؔ	قصۂ مہر و ماہ	مابعد سنہ ۱۱۰۰ھ
۸	ذوقیؔ	وصال العاشقین، غوث نامہ، منصور نامہ وفات نامہ، ماں باپ نامہ	مابعد سنہ ۱۱۰۰ھ
۹	بحریؔ	گلشن حسن و دل	سنہ ۱۱۱۴ھ
۱۰	مبتلاؔ	چندر بدن	سنہ ۱۱۱۴ھ
۱۱	راجیؔ	نام علی	سنہ ۱۱۱۰ھ
۱۲	دریاؔ	وفات نامہ	سنہ ۱۱۱۱ھ
۱۳	عبدالصمد	شمائل النبیؐ	سنہ ۱۱۱۱ھ
۱۴	وجدیؔ	پنچھی باچھا۔ تحفۂ عاشقاں ۔ مخزنِ عشق	سنہ ۱۱۴۴ھ
۱۵	محبوب عالم	مرثیہ ۔ مثنوی ۔ درد نامہ	
۱۶	فتیحؔ	زلیخا ثانی، پند نامہ، لقمان	سنہ ۱۱۳۰ھ
۱۷	عاشقؔ	اشارات الغافلین	
۱۸	اشرفؔ	جنگ نامہ حیدر	سنہ ۱۱۲۵ھ
۱۹	ولی ویلوری	روضۃ الشہداء ۔ روضۃ الیقین ۔ روضۃ الانوار دعائے فاطمہ ۔ مثنوی رتن پدم	سنہ ۱۱۳۰ھ

نمبر	نام شاعر	تصانیف	سن تصانیف
۲۰	عشرتی	دیپک پتنگ، چت لگن، نیہ درپن	
۲۱	روحی	مرثیہ	
۲۲	محمد بن رضا	ترجمہ قصیدہ	
۲۳	محمد حیدر	اضافہ پھول بن	
۲۴	بیچارہ		
۲۵	طالب		
۲۶	فراقی	مرأت الحشر	
۲۷	یتیم احمد	مرثیہ	
۲۸	ندیم	مرثیہ	
۲۹	شاہ طاہر	خوان نعیما اور کنز النفائس	
۳۰	شاہ عبدالرحمٰن	باغ حسینی	سنہ ۱۱۴۱ھ
۳۱	عبدالخلیل	مرثیہ	
۳۲	ذاکر	مرثیہ	

چوتھا دور سنہ ۱۱۳۶ھ سے سنہ ۱۲۲۰ھ تک سلطنت آصفیہ کا دور ہے اس زمانے کے علم و ادب کے مراکز کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس زمانہ میں نہ صرف اورنگ آباد ہی علم و فضل کا مرکز تھا۔ یہاں گولکنڈہ و بیجاپور کے اہل کمال کے ساتھ دہلی کے اہل کمال بھی موجود رہتے بلکہ برہان پور اور حیدرآباد بھی شعر و سخن کے مرکز بن گئے تھے" لہ

تفصیل کے ساتھ اس دور کے شعراء اور مصنفین کی خدمات پیش کی ہیں پانچویں دور کی نظم و نثر پر تبصرہ ہے۔ اس دور میں ان حالات کا جائزہ لیا ہے جن میں اردو سلطنت آصفیہ کی سرکاری زبان قرار دی گئی تھی

لہ "دکن میں اردو" سید نصیر الدین ہاشمی۔ صفحہ ۳۰۷

س دور کے شعراء کا حال اور کلام ہے۔ عہد عثمانی کے شعراء کا ذکر ہے۔

ساتویں دور میں جامعہ عثمانیہ کے قیام اور اس کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کا حال ہے شعراء کا ذکر ہے ساتویں دور کی نثر میں عصر حاضر کے نثر نگاروں کا جائزہ لیا ہے خواتین کے کارناموں کا ذکر ہے اخبارات رسائل اور انجمنوں کا ذکر ہے۔ آندھرا میں اردو نیا اضافہ ہے۔ اس علاقے کے اخبارات اور رسائل کا بیان ہے۔ خاتمۂ کتاب میں لکھا ہے کہ دکن کی تاریخ کے گوشوں کو روشنی میں لانے کے لیے ۱۹۲۲ء میں سروے کیا گیا تھا اور چالیس سال کے عرصے تک مسلسل اس میں اضافے ہوتے رہے۔

اپنی معلومات کے ذخیرے کو اس کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب سے واضح ہو جاتا ہے کہ دکن میں چند صدیوں سے اردو ادب نے ترقی کی کون کون سی منزلیں طے کیں۔

۱۹۵۶ء میں لسانی بنیاد پر صوبوں کی تشکیل عمل میں آئی، اور تلنگی کے ساتھ اردو بھی سرکاری زبان قرار پائی لیکن حکومت کو تلنگی کی سرپرستی اور جامعہ عثمانیہ سے اردو کے اخراج نے اردو کے لیے نئے سوالات پیدا کر دیے۔

۱۔ بعض جگہ متن کی صحت کا خیال رکھا ہے مگر کہیں کہیں غلطیاں سرزد ہو گئی ہیں۔ ص ۲۸۹ پر شعر نامکمل ہے۔

۲۔ ولی کو اورنگ آبادی لکھا گیا ہے۔ ص ۲۸۹

۳۔ خیاں کی مت کر دو طرفداری — حاظر زلف مشک فام رکھو — ص ۲۲۷

خیال کی جگہ حال چاہیے

۴۔ نہ دیکھے خدا کو بیابان میں — پہر آکر دیکھے ہے اک آن میں — ص ۲۷

آکر کی جگہ کے چاہیے۔

۵۔ کتک برس تلک شیخ جنگل پھرے — ص ۲۷ فلک چاہیے۔

۶۔ شکر کوئے بائی بہتر — ص ۲۷ مائی بہتر چاہیے۔

معظم کے بیان میں لکھا ہے۔

"اول الذکر ———————— نظم کیے ہیں ص ۲۶۷

۷۔ شاہ معظم نے حضرت بندہ نواز کے سلسلے کے بزرگوں کے حالات نظم کیے ہیں اور ضمنی طور پر تصوف کے نکات بیان کیے ہیں۔ (شاہ معظم حسینی شاہد انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش ص ۱۲۵)

۸۔ مخدوم مہائمی کو علی' ملّا علی مہائمی لکھا ہے ص۹

۹۔ مصنف نے اپنی کاوش اور تحقیق کا حق ادا کیا ہے جن جن ماخذ سے تمتع کیا ہے۔ فراخ دلی سے اس کے حوالے دیے ہیں مثلاً

اردوئے قدیم	شمس اللہ قادری
پنجاب میں اردو	ڈاکٹر محمود شیرانی
اردوئے قدیم	عبدالحق
رسالۂ اُردو	عبدالحق
اُردوٗ شہ پارے	سید محی الدین قادری زور

۱۰۔ صفحات کے حوالے نہیں دیے ہیں۔ کتاب یا مصنف کا نام لکھ دیا ہے۔ شفیق اور تمنّا کے تذکرے مشہور ہیں۔ ان کے نام سے بھی وہ تذکرے مراد ہیں مگر صفحات کا حوالہ ضروری تھا۔ تو سین میں صفحات کے حوالے کے ساتھ چند کتابوں کے نام دیے جاتے ہیں۔

۱۔ تذکرۃ الاولیاءِ دکن (ص۱)

۲۔ ہندوستانی لسانیات (ص۱۱)

۳۔ روضۃ الاقطاب (ص۱۷)

۴۔ تاریخ فرشتہ (ص۲/۱)

تاریخ فرشتہ (۲۴)

تاریخ فرشتہ (۲۷)

تاریخ فرشتہ (۱۷۷)

تاریخ فرشتہ (ص۱۸۰-۱۷۹)

۵۔ بہمنی سلطنت (ص۲۲-۲۱) نہیں

۶۔ قطب مشتری (ص۷۷-۵۵) نہیں

۷۔ سیف الملوک و بدیع الجمال (ص۲)

۸۔ طوطی نامہ (ص۱۰۱)

۹۔ تذکرہ اولیائے دکن (ص۲۹)

۱۰۔ تذکرہ ادبی دکن (ص۶۵)

۱۱۔ طبقات الشعراء (ص۱۷۹)

۱۲۔ پھول بن (ص۱۳۳)

۱۳۔ اردو شہ پارے (ص۱۲۶، ص۲۵۹، ص۳۰۰)

۱۴ اردو نثر کا آغاز (ص۱۴۳)

۱۵۔ بساطین السلاطین (ص۱۷۰، ص۱۶۹، ص۱۸۰، ص۸۰، ص۱۹۵)

۱۶۔ مثنوی بہرام و حسن بانو (ص۱۹۹)

۱۷۔ رسالۂ اردو (ص۱۹۹)

۱۸۔ چمنستانِ شعراء (ص۲۲۱)

۱۹۔ داستانِ اردو (ص۳۰۵، ص۳۰۴)

کئی مقامات پر یہی حالت ہے۔ صرف چند پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ص۱۷ معراج العاشقین کو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف بتایا ہے تو غلط ہے۔

"بندہ نواز کی نظم کے مختلف نمونے دستیاب ہوئے ہیں" ص۱۳ تخلص شہباز تھا لیکن اس کی کوئی سند پیش نہیں کی ہے۔

ان فروگذاشتوں سے کتاب کی افادیت پر اثر نہیں پڑتا۔

مختصر یہ کہ دکن میں اردو گراں قدر تالیف ہے اردو ادب کا کوئی محقق اور نقاد اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کی اہمیت اور افادیت مسلّم ہے۔ یہ حوالے کی کتاب بن گئی ہے۔ اور علاقائی ادب کی ترتیب و تشکیل میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

تذکرۂ شعرائے اورنگ آباد

سردار علی ۱۹۲۶ء

یہ رسالہ سردار علی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ جو ۲۸ر صفحات پر مشتمل ہے ۹ار اور ۳۰ر صفحات پر فہرست شعرائے اورنگ آباد درج ہے۔ اس میں وہ تمام شعراء کا شمار ہے جن کا ذکر رسالہ میں کیا ہے دیباچہ میں موٴلف نے اس رسالہ کی تیاری میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ یہ تالیف ۱۹۲۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی ہے حاشیہ پر ماخذ کی فہرست اس طرح ہے۔

نمبر	نام کتاب	مصنف یا مولف	مطبوعہ۔ قلمی
۱	محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن	عبدالجبار خاں صوفی۔ ملکاپوری	طبع حیدرآباد ۱۳۲۹ء
۲	چمنستانِ شعراء	لچھمی نارائن شفیق	قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ
۳	تحفۃ الشعراء	مرزا محمد افضل بیگ قاقشال	قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ
۴	تاریخ اردوئے قدیم	حکیم شمس اللہ قادری	طبع حیدرآباد ۱۳۲۴ء
۵	گلِ رعنا	مولانا عبدالحئی لکھنوی	طبع اعظم گڑھ ۱۳۴۳ء
۶	نکات الشعراء	میر تقی میر	طبع بدایون
۷	تذکرۂ شعرائے اردو	میر حسن دہلوی	طبع علی گڑھ ۱۹۲۲ء
۸	سخن شعراء	عبدالغفور خاں نساخ	طبع لکھنؤ ۱۳۵۱ء
۹	گلستانِ سخن	مرزا قادر بخش دہلوی	طبع لکھنؤ ۱۸۸۲ء
۱۰	گلشنِ ہند	مرزا علی لطف	طبع لاہور ۱۹۰۶ء
۱۱	گلشنِ بے خار	نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ	طبع لکھنؤ ۱۸۹۴ء
۱۲	رسالہ لسان الملک	ـ	طبع حیدرآباد ۱۹۲۲ء

تذکرہ کا آغاز میر غلام علی ارشد سے کیا ہے۔ ان کے بعد مولوی متبحر حسین کا ذکر کرتے ہوئے سلسلۂ نسب در

اورن کی کتاب "تفریحات کیں فی جلال محی الدین جیلانی" کا مذکور ہے۔ انکی اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی کا ذکر کیا ہے۔ نمونۂ کلام میں متفرق سات اشعار پیش کیا ہے۔

میر حسن علی خاں ایما کو اورنگ آباد کا باشندہ بتایا ہے ۱۲۲۳ھ میں وفات کا ذکر کیا ہے اردو فارسی زبانوں میں شاعری کا ذکر ہے۔ نمونۂ کلام میں تضمین کے پانچ اشعار نقل کیے ہیں۔

میر محمد میر بندہ کا اصلی وطن اورنگ آباد بتایا ہے۔ "چمنستانِ شعراء" کے حوالے سے میر تخلص کا ذکر ہے۔ بعد میں بندہ تخلص اختیار کیا۔ انھیں مثنوی کا شاعر لکھا ہے۔ مثنوی کا کوئی نام نہیں ہے اور نمونۂ کلام کے ۱۹ اشعار لکھے ہیں۔

لالہ جکشن بیجان کو سراج اورنگ آبادی کا شاگرد لکھا ہے اور نمونۂ کلام میں پانچ متفرق اشعار دیے ہیں۔ محمد پناہ پناہ کو لچھمی نرائن شفیق کے رفیقوں میں سے بتایا ہے اور اردو فارسی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے نمونے کے دو اشعار پیش کیا ہے۔ حقیر سنگھ کا جہا سنگھ نام بتا کر انھیں اردو فارسی کا شاعر لکھا ہے نمونۂ کلام نہیں دیا گیا۔ داؤد۔ مرزا داؤد نام لکھ کر اورنگ آباد کی پیدائش بتائی ہے۔ ولی کا معاصر لکھا ہے اور پندرہ متفرق اشعار درج کیے ہیں۔ ملا نہال کرن داغ پر پانچ جملے لکھے ہیں اور نمونے کے تین اشعار نقل کیے ہیں۔ روپ نرائن ذہین پر پانچ جملے ہیں اور نمونۂ کلام نہیں۔ میر میراں رمز کے مختصر حالات، ان کے تخلص "جدید" کا بھی ذکر کیا ہے اور بارہ اشعار بطور نمونہ لکھا ہے۔

محمد رضا بیگ رضا کو سراج اورنگ آبادی کا شاگرد بتایا ہے اور چھ اشعار پیش کیے ہیں۔

تمین علی چند کو لچھمی نارائن شفیق کا معاصر لکھا ہے اور چھ اشعار لکھے ہیں۔ سید عبد العلا سامی کا عبارت بیجان کو لکھا ہے اور اورنگ آباد کا باشندہ بتایا ہے نمونۂ کلام میں ایک شعر بھی نہیں دیا گیا ہے سید سراج الدین سراج اورنگ آبادی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ تاریخ ولادت و وفات بتایا ہے اور تمام شاعروں سے زیادہ اشعار پیش کیا ہے۔

سید شرف الدین شرافت کا مختصر حال اور چار اشعار ہیں۔

میر باقر شہید ان کا مولد اورنگ آباد ہیں مختصر معلومات اور چار اشعار پیش کیے ہیں۔ لچھمی نارائن شفیق کو اورنگ آباد کا بتایا ہے اردو میں صاحب اور فارسی میں شفیق تخلص کرتے تھے ان کا کلام صرف دو شعر تھا حاتم صفی، ماثر حیدری ان کے دیوان ہیں۔ تذکرہ گل رعنا، تذکرہ شام غریباں، بساط الغنائم

مرأت الہند، گلستان، تذکرہ کرناٹک، چمنستان شعراء ان کی تصانیف ہیں۔ نمونۂ کلام نہیں دیا ہے۔ میر عبد الحیٔ خاں صارم مختصر حالات پر اکتفا کیا ہے اور سات اشعار لکھے ہیں عارف الدین خاں عاجز کے حالات تفصیل سے ملتے ہیں اور چودہ اشعار لکھے ہیں

مرزا جمال اللہ عشق کے مختصر حالات اور تین اشعار نقل کیے ہیں۔

معتبر خاں عمر کے مختصر حالات اور چھ اشعار ہیں۔

غازی الدین خاں غازی پر ایک سطر اور ایک شعر لکھا گیا ہے۔

شاہ عنایت اللہ فتوت پر تین سطر دو شعر نقل ہیں۔

میر فخر الدین ترمذی کے مختصر حالات اور چھ اشعار ہیں۔

فضلی پر چار سطریں اور چار اشعار ملتے ہیں۔

میر ہاشم فقیر پر چار سطریں اور ایک شعر لکھا گیا ہے۔

کوثر پر دو سطریں اور دو شعر ملتے ہیں۔

محسن پر تین سطریں اور تین شعر ملتے ہیں۔

سرو جی رائے للہ پر تین سطریں اور تین اشعار ہیں۔

مبتلا پر ڈھائی سطریں اور تین اشعار کا مواد ہے۔

مرزا محمدی بیگ مرزا پر دو سطریں ایک شعر ملتا ہے۔

محمد ماہ محرم پر تین سطریں اور تین اشعار ملتے ہیں۔

شیخ احمد مضطر پر ڈھائی سطریں اور دو شعر کا مواد ملتا ہے۔

مفتون پر ڈھائی سطریں ملتی ہیں۔ نمونۂ کلام نہیں ہے۔

مقصود پر ڈھائی سطریں اور ایک شعر ملتا ہے۔

مہتاب موہن لال پر دو سطریں دو شعر ملتے ہیں۔

مرتضیٰ مہدی پر دو سطریں اور دو شعر کا مواد ہے۔

میر علی مہر پر دو سطریں نمونۂ کلام کچھ نہیں

اس طرح نادر، نشاط، ندرت، نجات، نیاز، واحد وغیرہ کا بھی حال ہے۔ دو سطریں اور دو شعر کا مواد ہے۔

ولیؔ کو اورنگ آبادی لکھا ہے اور ان کے حالات تفصیل سے پیش کیے ہیں۔ نمونۂ کلام بھی ۱۹ اشعار پر مشتمل ہے۔

ہادیؔ مرزا محمد بیگ یادؔ پر چار سطریں اور کچھ اشعار فراہم کیے ہیں۔

افسرؔ پر ایک ادھوری سطر اور تین اشعار لکھے ہیں۔

میر بخشی عاشق علی خاں ایمادؔ، میر اولاد محمد خاں ذکاؔ، نورالدین علی خاں رنگینؔ، مرزا عطا ضیاؔ، میر بہاالدین عروجؔ، خواجہ ابوالبرکات عشرتؔ، عزیز اللہ عزیزؔ، شرف علی فغاںؔ، اور صوفی شاہ کاظمؔ پر ڈھائی سطریں تین اشعار لکھے گئے ہیں اور یہ تذکرۂ شعرائے اورنگ آباد کے آخری شاعر ہیں۔

۱۔ یہ تذکرہ نہایت تشنہ اور موضوع کے اعتبار سے ادھورا ہے۔ بلکہ اسے بیاض کہنا چاہیے۔

۲۔ مذکورہ شعراء میں کسی ایک پر بھی قابلِ تشفی حالات کا گمان نہیں ہوتا بلکہ سراجؔ اور ولیؔ جن کے بابت کافی مواد فراہم ہو سکتا تھا۔ ان پر بھی مواد حاصل کرنے کی خاطر خواہ کوشش معلوم نہیں ہوتی۔

۳۔ شفیقؔ۔ ولیؔ۔ سراجؔ اور صادم کے علاوہ کسی شاعر کا سن ولادت نہیں دیا گیا۔

۴۔ بعض شاعروں کا سنِ وفات لکھا گیا۔ لیکن ولادت کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔

۵۔ کئی شعراء مثلاً داغؔ، رنگینؔ، عشقیؔ، غازیؔ، فتوتؔ، کمال، مبتلاؔ اور للہؔ وغیرہ کے حالات پر دو اور چار سطروں کی معلومات تحریر ہے۔

۶۔ کئی شعراء کے حالات ہیں۔ لیکن ایک شعر بھی مثال کے طور پر پیش نہیں کیا گیا۔ ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز مجھی نارائن شفیقؔ پر ہوتی ہے۔ مولف ان کا ایک شعر بھی حاصل نہ کر سکے۔ اس کتاب کی تالیف کے وقت چمنستانِ شعراء شائع نہیں ہوا تھا۔ مگر عبدالجبار ملکاپوری کے تذکرہ شعراء اور قلمی چمنستان شعراء (مشمولہ ماخذ) میں شفیقؔ کے اشعار ملتے ہیں۔ شعراء کے مختلف حالات اور کلام کے نمونے میں چند اشعار دیے ہیں کلام پر تبصرہ نہیں ہے۔

اس تذکرہ کا نام علاقائی ادب کی تاریخوں کے سلسلے میں برائے نام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس تذکرے سے یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ مولف نے حتی الامکان کوشش کی ہے اس کا ثبوت ماخذ کی فہرست ہے۔

مولف نے علاقائی جذبے کے پیش نظر کوشش کی ہے اپنے عہد کے مطابق اس کوشش کو سراہنا ہو

عہدِ عثمانی میں اُردو کی ترقّی

سید محی الدین قادری زور ۱۹۲۵ء

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اردو کے ممتاز ادیب، نقاد اور ماہر لسانیات ہیں۔ دکنی ادب کے احیاء، ترویج و اشاعت میں ان کی گراں بہا خدمات ہیں۔ انھوں نے دکن کی قدیم تصانیف کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا۔ ان کو ترتیب دیا اور ان کی اشاعت کی اس طرح انھوں نے اس ادب کو ایک نئی زندگی بخشی۔ ایوانِ اردو، حیدرآباد ان کی کاوشوں کی یادگار ہے۔ اس میں دکن کی اہم اور نادر تصانیف اور ان کے مخطوطات جمع کر دیے ہیں۔ مندرجۂ ذیل ان کی تصانیف ہیں:

۱۔ ہندوستانی لسانیات

۲۔ ادبی شہ پارے

۳۔ دکن میں اُردو

۴۔ عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقّی

عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی ۲۰۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ۱۹۲۵ء کی تصنیف ہے اس میں عثمانی دور میں اردو کی ترویج و اشاعت میں جو اقدامات کیے گئے ان کی تفصیل ہے۔ دیباچہ چار صفحات کا ہے۔ اس میں کتاب کی وجہ تالیف، ترتیب و تدوین کا ذکر ہے۔

تمہید دس صفحات کی ہے۔ اس میں اعلیٰ حضرت سلطان العلوم عثمان علی خاں کی دادودہش، فیض عمومی اور اردو زبان و ادب کی خدمات کا ذکر ہے۔ اصل کتاب کے دو حصے ہیں۔

(۱) پہلے حصے میں سلطان العلوم کی اردو نوازی کی تفصیل ہے اس ذیل میں مندرجۂ ذیل بیانات ہیں۔

اردو شاعروں اور نشاپردازوں کی قدردانی

انجمنوں اور ادبی اداروں کی امداد و قدردانی

اردو رسائل اور اخبارات کی امداد

جامعہ عثمانیہ کی تشکیل

سررشتہ تالیف و ترجمہ کا قیام

(۲) دوسرے حصے میں سلطان العلوم کی سرپرستی کے اثرات ظاہر کیے گئے ہیں جس ذیل میں

انفرادی کوشش

اجتماعی خدمات

حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد، اور اس کے اثرات پر روشنی ڈالی ہے۔ تین مکمل ضمیمے اور اشاریہ ہے ضمیمہ میں شاعروں، ادیبوں، انجمنوں، اداروں، رسائل اور اخبارات کی فہرستیں ہیں کتاب کی ترتیب و تبویب میں اصول، قاعدہ اور سلیقہ برتا گیا ہے بعض چیزوں کا سرسری ذکر ہے۔ بعض امور میں مصنف کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

× سلطان العلوم کے عہد کا سب سے مبارک، ممتاز اور نمایاں کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے اس کے تخیل و تشکیل کے بارے میں زور صاحب نے تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا امتیازی وصف اردو ذریعہ تعلیم تھا مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے اردو ترجمہ کے لیے ایک سررشتہ "ترجمہ و تالیف" قائم کیا تھا یہاں صدہا کتابیں ترجمہ کی گئیں اور شائع ہوئی ہیں۔

سلطان العلوم کی ادبی فیاضیوں اور سرپرستیوں کے ذکر میں زور صاحب نے زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام اس کی تعمیر و تشکیل کے "تخیل" کے اولین نقوش کو دور دراز ڈانڈوں سے ملا کر اس درخشاں کارنامے کو دھندلا کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اس جامعہ کے قیام کے بعد ایک مخالف تحریک شروع ہوئی تھی اس تحریک کو ڈاکٹر صاحب نے ضرورت سے زیادہ تفصیل سے لکھی ہے۔ لیکن اسی قدر تفصیل سے جامعہ کی تنظیم اس کی تعلیم کی اشاعت اور سررشتہ کے قیام پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔

بہر حال حیدرآباد میں علم و ادب کے فروغ اردو میں علوم وفنون کی کتابوں کے تراجم جامعہ عثمانیہ کے قیام تعمیر و تشکیل اور نصاب وغیرہ کے بارے میں اس کتاب سے مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہے اس باب میں یہ قابلِ قدر اضافہ ہے۔

●●

اُردو نثر پارے

سید محی الدین قادری زور ۱۹۲۹ء

بیسویں صدی کے اوائل میں قدیم اردو کی تحقیقات (۱۹۰۰ء کے اوائل) کا کام زیادہ تر دکن میں ہوا اردو کے ان خدمت گاروں میں بابائے اردو مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو اس تحریک کے امام اور پیشوا تھے۔ ان کے رسالے (رسالۂ اردو) نے اردو کی تاریخ میں ایک انقلابی کام کیا۔ فراموش شدہ ادب کے نمونے پیش کیے تحقیقات اور انکشافات سے نئے نظریے قائم ہوئے اور پرانے نظریے منسوخ ہوئے۔ ان کے بعد دوسرا نام حکیم شمس اللہ قادری کا ہے جن کی گرانقدر تالیف "اردوئے قدیم" نے کئی گوشے نظر کے سامنے پیش کر دئے۔ آغا حسن حیدرآبادی کے مضامین بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ حیدرآباد کے سید محی الدین قادری زور، سید محمد احمد، عبدالقادر سروری کی خدمات بھی گرانقدر ہیں۔

اردو شہ پارے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی معرکۃ آرا تصنیف ہے اس میں اردو ادب کے آغاز سے ولی کے زمانے کے مشہور اور نثر نگاروں کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ زور صاحب نے اس کو اہم اور دلچسپ بنانے کے لیے تحقیقی حواشی بھی درج کیے گئے ہیں کتاب دیدہ زیب ہے طباعت عمدہ اور کاغذ اعلیٰ ہے۔

زیر نظر کتاب دیباچہ، مقدمہ، چار ابواب، شہ پاروں کی فہرست اور چند ضمیموں پر مشتمل ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

		صفحات
(۲) دیباچہ		
۳۔ مقدمہ الف ۔	باب اول اردو ادب کی ابتدائی کوششیں	۷
ب ۔	باب دوم اردو دکن میں [illegible]	۲۱
ج ۔	باب سوم [illegible]	۷۶
د ۔	باب چہارم [illegible] کی حکومت میں	۱۲۲
[illegible] فہرست	(الف) بلحاظ مضامین	۷۷
	(ب) بلحاظ مصنفین	۱۸۰
۵۔ اردو شہ پارے	(الف) نظم	۸۹

(ب) نثر ۲۱۷
ا۔ مقدمے کے ضمیمے ۱۔ دور اوّل کے مصنفین اور ان کے کارنامے ۳۳۹
۲۔ باب اول کے علیحیات ۳۴۰
۳۔ بیجاپوری مصنفین اور ان کے کارنامے ۳۴۵
۴۔ باب دوم کے علیحیات ۳۴۳
۵۔ گولکنڈہ کے مصنفین اور ان کے کارنامے ۳۴۵
۶۔ باب سوم کے علیحیات ۳۴۷
۷۔ چوتھے باب کے مصنفین اور اس کے کارنامے ۳۴۸
۸۔ ایڈنبرا کی بیاض کے مرثیے
۷۔ اردو ادب سے متعلق سنین ۳۵۲
۸۔ اضافے ۳۵۷
۹۔ اشاریہ

تمہید میں فاضل مصنف نے اپنے یورپ کے قیام، قلمی کتابوں کے مطالعہ کی دقتوں، متن کی ترتیب خوانندگی کی الجھنوں اور ترتیب و تہذیب کی مشکلات پر روشنی ڈالی ہے ۔ انتخابات میں ادبیت کا خیال رکھا ہے ۔ اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ ان کی ترتیب اس نہج سے ہو کہ زبان و ادب کے ارتقاء کا سلسلہ نظر کے سامنے آجائے ۔ کام کا جو خاکہ اس کی دوسری اور تیسری جلد کے لیے بنایا گیا تھا وہ یوں تھا۔

دلّی سے حالیؔ تک — سید محمد صاحب

حالیؔ سے موجودہ دور تک — عبدالقادر سروری صاحب

کے سپرد کیا گیا تھا لیکن افسوس کہ یہ کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔

اس کے پہلے باب میں اردو کی ابتدائی کوششوں کے سلسلہ میں شمالی ہند گجرات اور دکنی ادب کا جائزہ شمال سے مسعود سعد سلمان و خسروؔ کو گجرات سے شاہ بہاؤالدین باجن ؒ، شاہ علی جیوگام دھنی دکن سے ملک العلوم گنج العلم، خواجہ بندے نواز عبداللہ حسینی کا انتخاب کیا گیا ۔

مسعود سعد سلمان، و خسروؔ کی ہندی شاعری کا ذکر کیا ہے ۔شاہ باجن ؒ کے متعلق آٹھ سطریں

ہیں جو پنجاب میں اردو سے ماخوذ معلوم ہوتی ہیں۔ شاہ علی جیوگام دھنی اور خوب محمد کا حال مختصر ہے دکن کے خواجہ بندہ نواز کی معراج العاشقین کو لسانی لحاظ سے اہم اور اردو نثر کا پہلا نمونہ قرار دیا ہے۔ صفحہ ۱۹

باب دوم میں بیجاپور میں بھی اردو ادب کے ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلے چار تاج دار

یوسف عادل شاہ	سنہ ۸۹۵ھ سنہ ۹۱۶ھ
شاہ میراں جی	سنہ ۹۰۲ھ
اسماعیل عادل شاہ	سنہ ۹۱۶ھ سنہ ۹۴۱ھ
ابراہیم عادل شاہ اول	سنہ ۹۴۱ھ سنہ ۹۶۵ھ
علی عادل شاہ اول	سنہ ۹۶۵ھ سنہ ۹۸۸ھ
شاہ برہان الدین جانم	سنہ ۹۹۰ھ

کے عہد میں ابتدائی تحریکات کو بیان کیا ہے اور شاہ برہان الدین جانم کے کاموں کا تذکرہ اور ان کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ صفحہ ۳۲ تا صفحہ ۳۳ شاہ برہان الدین کے کارناموں کی چند خصوصیات صفحہ ۳۳ کی ہیں۔

۱۔ ان کا اسلوب کا بیان میراں جی کی تصانیف سے زیادہ سادہ ہے۔

۲۔ انھوں نے حتی الوسع فارسی و عربی الفاظ کو استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے۔

۳۔ باپ کی طرح ان کی نظمیں بالکل صوفیانہ خیالات اور اعتقادات سے مملو نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے پڑھنے سے شاہ برہان کے ذوقِ شعری کا بھی پتہ چلتا ہے۔

۴۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے ان کے کارنامے محققین کے لیے کافی مواد پیش کرتے ہیں۔ اس لیے اس وقت بھی ہم کو ان کے ۱۲ ہزار اشعار محفوظ ملتے ہیں۔

آخری تاجدار :- ابراہیم عادل شاہ ثانی، آتشی، مقیمی، امین، نوری کا دور اردو ادب کا سمہرا دور ہے۔ اس دور میں صنعتی، رستمی، ملک خوشنود، دولت، نصرتی، ملک، ابن نشاطی، مرزا، ہاشمی، شیدا، مومن کی ادبی خدمات اور کلام کی خصوصیات کا ذکر ہے۔

باب سوم بھی اسی طرز پر ہے جس میں گولکنڈہ کا جائزہ لیا گیا ہے پہلے چار تاجداروں کے عہد کی ابتدائی تحریکات کے بعد آخری چار تاجداروں کے عہد کا حال ہے۔

میں قلی قطب شاہ، وجہیؔ، حسنؔ، غواصؔ، شوقیؔ، خیالیؔ، غواصیؔ، قطبیؔ، سلطانؔ، جنیدیؔ، ابن نشاطیؔ، حیرانؔ، یعقوبؔ، طبعیؔ، امینؔ، فائزؔ، لطیفؔ، نوریؔ، شاہیؔ اور مرزا غلام علی وغیرہ کا ذکر ہے۔

باب چہارم: مغلوں کے عہد میں اردو ادب کے جائزے پر مشتمل ہے اس میں وہ تمام انشاء پرداز شامل ہیں جن کی پیدائش دکن میں مغلوں کے قبضے کے بعد یا شمالی ہند کے شہروں میں ہوئی۔ ان کو مغل حکومت سے کوئی مدد نہیں ملی کسی نے ان کی سرپرستی نہیں کی۔ شمالی ہند کے افضل، شیخ جیون اور میر جعفر علی، نیز دکن اور گجرات کے مرثیہ نگار اور نثر نگار ہیں ص۱۲۹

اس کے بعد مضامین اور مصنفین کے لحاظ سے دو تفصیلی فہرستیں ہیں۔ ص۱۹۸ ص۔ ص۱۱۹-۲۲۵ تک انتخابات ہیں۔ پھر ضمیمے ہیں۔ آخر میں اردو کی صرف ایک دور کی تاریخیں پیش کی گئی ہیں جن کا تعلق اردو شہ پاروں سے ہے۔ فرہنگ اور اشاریہ پر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

شمالی ہند کے ادب کے بیان میں شیخ فرید شکر گنج، شرف الدین، بو علی قلندر وغیرہ کو لیا گیا ہے۔ شیخ فرید شکر گنج کا مستند کلام "خزائن رحمت اللہ" میں ملتا ہے۔ حضرت شرف الدین کا دوہا مشکوک ہے۔[۱]

امیر خسرو کے کلام کو مشتبہ قرار دیا ہے۔ (شہ پارے) جبکہ عبدالواسع ہانسوی ص۲ نے خالق باری میں اور وجہی[۳] نے سب رس میں ان کے "دوہے" نقل کیے ہیں۔ گجرات کے دبستان اردو میں تین بزرگوں کو لیا ہے۔ گجرات اور اہل گجرات کے ساتھ انہوں نے انصاف نہیں کیا۔ باجن کے کلام کو وہ تسلیم نہیں کرتے اس کو ادبی لحاظ سے قابل قدر، معتبر قرار نہیں دیا۔ باجن کے کلام کے نمونے اس وقت پنجاب میں اردو سے مل سکتے تھے۔ ان کا انداز تنقید غیر ادبی ہے۔ ان کو معتبر نمونے پیش کرنے تھے۔ اس عہد کی زبان کی یہی حالت تھی ان سے ادبی کارناموں کی توقع کرنا عبث ہے۔ ان کے کلام کی تاریخی اور لسانی اہمیت تسلیم ہے۔ زور صاحب کا بیان ہے کہ

۱۔ خزائن رحمت اللہ قلمی ــ شیخ بہاء الدین باجن رح

۲۔ اردو کی نشو و نما میں اردو صوفیائے کرام کا حصہ مولوی عبدالحق

۳۔ رسالہ عبدالواسع ص۲ ص۔ سب رس : ملا وجہی

ہو سکتا ہے کہ گجرات کے اثر سے دکن کی ادبی زبان بڑی حد تک بدل گئی ہو۔ اور جو لوگ اس مشترکہ زبان میں لکھتے تھے۔ وہ اپنی زبان کو گجری کہنے لگے اور یہاں زبان دکنی کہلانے لگی۔ مگر یہ فرق زیادہ عرصے تک نظر نہیں آتا کیونکہ متاخر اہلِ قلم پھر اپنی زبان کو دکنی کہتے رہے"[1] قابلِ تسلیم نہیں ہے جن لوگوں نے اپنی زبان کو گجری کہا۔ وہ یا تو گجراتی ہیں یا گجرات سے آکر دکن میں بس گئے تھے حسن شوقی کا بیان مولوی عبدالحق کے مضمون جولائی ۱۹۲۹ء کے "رسالہ اردو" سے ماخوذ ہے۔ لیکن اس کے ماخذ کا ذکر نہیں کیا۔ مومن اور بحری کے بیانات و حالات حکیم شمس اللہ قادری کی تصنیف "اردوئے قدیم" سے ماخوذ ہیں[2]

مومن	"اردوئے قدیم"	از حکیم شمس اللہ قادری	ص ۹۰
مومن	"ادبی شہ پارے"	از محی الدین قادری زور	ص ۴۶
بحری	"اردوئے قدیم"	از حکیم شمس اللہ قادری	ص ۹۸-۹۹
بحری	"ادبی شہ پارے"	از محی الدین قادری زور	ص ۱۲۹

تمام مرثیہ گو شعراء کا زمانہ ۱۱۵۰ھ تسلیم کیا ہے جس بیاض سے کلام لیا گیا ہے اس میں سنہ کتابت نہیں ہے۔ کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کلام بارہویں صدی کا ہو سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے کتاب کی ترتیب کی تعریف کی ہے مگر اس کی خامیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

"فاضل مولف نے عجلت سے کلام لیا ہے۔ اور عجلت میں بہت سی غلطیاں در آئی ہیں۔" کتاب کے ہر صفحے پر یہ خامیاں نظر آتی ہیں۔

جیوں پھول تازا بن منے جیوں پوتلی لوچن منے

لوچن کی جگہ لوچن ہونا چاہیے۔ کیونکہ لوچن کے معنی آنکھ اور پوتلی یعنی آنکھ کی تلی

وندی تیری شہرت سے پورب جھے ایں۔

"پورب" نہیں ہے بلکہ پورے بمعنی بہرہ ہے۔

---

[1] "ادبی شہ پارے" ۔ محی الدین قادری زور ص ۱۲

[2] "اردوئے قدیم" ۔ شمس اللہ قادری ص ۹۰ اور ص ۹۸-۹۹

الفاظ کی صحت اور معنی کا خیال نہیں رکھا گیا۔ مثلاً"

ادھار ۔ بمعنی غذا ۔ خوراک دیے ہیں ۔ مگر صحیح اعار ہے ۔

اپنگ نہیں اپنگ ہے ۔ اس کے معنی بہت کے لکھے ہیں ۔ بارا کے معنی سردی بتلائے ہیں ۔ بارا کے معنی ہولکے ہیں ۔ پگن کے معنی بری گھڑی کے دیے ہیں غلط ہے ۔ نسگون اور گنوان معنی خوبیوں والے ۔ یعنی سو الفاظ کے شروع میں بطور سابقہ کے ہمیشہ اچھے معنوں میں آتا ہے ۔ بعض مشکل الفاظ کے معنی نہیں دیے گئے مثلاً"

بیدنا ۔ سانت ، مگمگن ۔ داکھ ۔ اچھال اور پارک وغیرہ

"نورس کے متعلق لکھتے ہیں کہ "ابراہیم پہلا بادشاہ تھا جس نے اردو میں ایک لمبی نظم لکھی ہے ۔ اس کا نام نورس اور موضوع موسیقی ہے ۔" صفحہ ۳۵ (اردو شہ پارے) نورس کو اردو کی کتاب نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ ٹھیٹ ہندی زبان میں ہے ۔

"غالباً وہ بہت اچھا شاعر تھا بدقسمتی سے راقم کی نظر سے اس کی اردو نظم من لگن نہیں گزری ۔ یہ کئی بار مدراس اور بنگلور میں چھپ چکی ہے ۔ اور اب شاید کہیں بھی نہیں ملتی ۔" [۱]

حالانکہ "من لگن" کا نسخہ عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے ۔ اس کتاب میں انتخابات کی صحت کا خیال نہیں رکھا گیا ہے ۔

مولوی عبدالحق [۲] نے افسوس کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے ۔

" اردو رسالہ " کے استفادے کے باوجود مولف نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ۔ حسن شوقی کے ظفر نامہ اور میزبانی نامہ صفحہ ۱۰۲ پر رسالہ اردو کا ماخذ ہے لیکن اس کا حوالہ پیش نہیں کیا گیا ۔

جب شہ پارے میں مزید خامیوں کی تفصیلات کے لیے "رسالہ اردو" (جولائی سنہ ۱۹۲۸ء) اور تحقیقی مطالعہ ڈاکٹر نذیر احمد صفحہ ۲۱۵ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ان میں شہ پارے کی تمام خامیوں سے تفصیلی اور تحقیقی بحث کی گئی ہے ۔

---

[۱] اردو شہ پارے محی الدین قادری زور صفحہ ۱۶

[۲] "رسالۂ اردو" جولائی سنہ ۱۹۲۸ء ۔ عبدالحق

شعرائے پنجاب

محمد باقر نسیم رضوانی

سرزمین پنجاب سے وابستہ ۲۹ شعراء کا یہ تذکرہ دو سو انتیس صفحات پر محیط ہے مرتب نسیم رضوانی کے بیان سے اس کی وضاحت اس طرح ہوتی ہے۔

"یہ تذکرہ صرف عصر حاضر کے شعراء پر مشتمل ہے۔ ہر ایک شاعر کے کلام پر مفصل تنقید سے علاً اغماض کیا گیا ہے کیونکہ راقم کے خیال میں شاعر کے کلام پر اس وقت تک ممکن نہیں کہ صحیح تنقید کی جائے جب تک اس کا مکمل کلام پیش نظر نہ ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں کیونکہ بہت سے حضرات کا مجموعۂ کلام تا ہنوز شائع نہیں ہوا۔" [1]

مندرجۂ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ اپنے عہد کے معروف شعراء کے علاوہ غیر معروف شعراء کا انتخاب ہے۔ تذکرے کی ہیئت پر شعراء کے مختصر حالات اور علاقائی بنیاد پر کلام کا انتخاب پیش کیا ہے تنقید سے پرہیز کرنے کی وجہ بتائی گئی ہے۔ جدید اردو شاعری کے رجحانات میں جدید تغزل، رومان اور منظر نامہ، فلسفہ، طنز و مزاح نظمیں وغیرہ کے عنوانات پر مختصراً تبصرہ کیا ہے جس میں عابد علی عابد، چراغ حسن حسرت اور اختر شیرانی کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔ ۲۹ شعراء کے اس تذکرے میں مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال، تلوک چند محروم، سالک غلام رسول مہر، حفیظ جالندھری، چراغ حسن حسرت کاشمیری، سید عبدالمجید عدم وغیرہ معروف شعراء ہیں۔ ان میں اکثر شعراء کی تصاویر کے ساتھ مختصر حالات اور دستیاب انتخابی کلام نقل کیا ہے۔ غیر معروف شعراء جو علاقائی حدود میں معروف ہو گئے۔ ان کے مختصر حالات اور کلام کا انتخاب اپنے عہد اور علاقے کی نمائندگی کے لیے پیش کیا ہے۔

شعراء کے انتخابی کلام میں غزلوں اور نظموں کو اہمیت دی گئی ہے

۔اکثر شعراء کے گیت، رباعیات اور آزاد نظموں کو اہمیت دی گئی ہے۔

عبدالمجید عدم کی نظم پر اکتفا کیا ہے۔ حالانکہ ان کے قطعات اور رباعیات مشہور رہیں۔ مولانا ظفر علی خاں اور اقبال کے انتخاب میں ان کے نمائندہ کلام پر توجہ نہیں دی گئی۔ "شعرائے پنجاب" تذکرہ کی ...

حیثیت سے علاقائی ادب کی نمائندگی میں شمار کیا جا سکتا ہے

---

[1] شعرائے پنجاب مرتبہ محمد باقر نسیم رضوانی (دیباچہ)

مدراس میں اردو

ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی ۱۹۳۹ء

ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی کی یہ تصنیف تقریباً ۲۲۵ صفحات پر محیط ہے۔ یہ کتاب افضل الدین کی تصنیف مدراس میں اردو سے پہلے کی ہے۔ اس میں اردو زبان سے تعلق رکھنے والے قدیم و جدید شعراء اور نثر نگاروں کا مختصر تعارف اور نمونۂ کلام موجود ہے جنھوں نے سرزمین مدراس میں جنم لیا یا خطۂ مدراس میں آ کر سکونت پذیر ہوئے اس تاریخ سے یہ امکان روشن ہو جاتا ہے کہ اردو ہندی کی طرح مدراس کے لیے کوئی نئی زبان یا نئی چیز نہیں بلکہ اس کا رواج اور شوق دورِ قدیم سے وابستہ ہے۔ بلکہ اس علاقے میں بڑے معروف و معیاری شعراء اور ادباء پیدا ہوئے ہیں کتاب کا ایک باب مصنف نے مدراس کے علاقے کے رسائل اور اخبارات اور انجمنوں کے لیے مقرر کیا ہے اردو رسالوں اور اخبارات کی صحافی اور ادبی خدمت کے ساتھ انجمنوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور ان انجمنوں نے اردو زبان کی کیا خدمت انجام دی ان میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔

اس کتاب کا آخری باب "میسور میں اردو" کے لیے مقرر کیا گیا ہے اس باب کے ذریعہ سلطان حیدر علی اور سلطان ٹیپو کے عہد میں اردو نے میسور میں ترقی کے جن مراحل کو عبور کیا ان پر تحقیقی مواد مختصر اور مفید حکمت عملی کے ساتھ پیش کیا ہے وہاں کے شعراء و ادباء کے مختصر کارناموں کا ذکر کیا ہے یہ تصنیف ۱۹۳۹ء میں منظر عام پر آئی۔ اس تصنیف کے تعلق سے بابائے اردو مولوی عبدالحق رقم طراز ہیں "اہل مدراس اور میسور کے لیے خاص کر یہ کتاب بہت بصیرت افروز ہوگی اور اس کو پڑھنے کے بعد انھیں معلوم ہوگا کہ اردو زبان ان کے بزرگوں کی مقدس میراث ہے جس کی اشاعت و ترقی ان کا فرض ہے۔"[۱]

اپنے عہد کے تقاضوں کے پیش نظر یہ تصنیف علاقائی جذبہ کو ابھارنے کے ساتھ علاقائی تحقیق پر مجبور کرتی ہے اور ہر علاقے میں اردو کے پرانے نقوش کا پتہ دیتی ہے۔ مدراس کے رسائل، اخبارات اور انجمنوں کے قیام سے پرانی اردو کے صحافت کے معیار کا اندازہ ہوتا ہے نیز پرانے رسائل اور اخبارات کی تکنیک کا اندازہ ہوتا ہے۔ انجمنوں کے قیام نے علاقائی جذبے کے تحت ادب اور زبان کے ارتقائی منازل میں کیا کردار ادا کیا اس کا علم ہوتا ہے۔

میسور میں اردو کے باب سے میسور (کرناٹک) میں حیدر علی سے ٹیپو سلطان کے عہد تک اردو کی ترویج و ترقی کا خاکہ سامنے آ جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر تحقیقی کام کرنے والے طلباء کے لیے یہ کتاب اپنے عہد سے آج تک مطالعہ کرنے کے لیے آمادہ کرتی ہے۔

---

[۱] "رسالۂ اردو" جولائی ۱۹۳۹ء مولوی عبدالحق ص ۵۶۱

داستانِ ادبِ حیدرآباد

سید محی الدین قادری زور ۱۹۴۸ء

سید محی الدین قادری زور کی تالیف اور حیدرآباد کے اردو فارسی ادب کی تاریخ ہے۔ سرورق پر "داستانِ حیدر مرقوم ہے۔ یعنی حیدرآباد کے تین سو سالہ اردو فارسی عربی ادب و شاعری کا جائزہ جس میں جملہ ارباب کمال کا مختصر سا حال اُن کے رشحاتِ قلم کے مجمل خصوصیات اور اس شہر کی جملہ علمی و ادبی تحریکات اور ان کا پس منظر واضح کیا گیا ہے۔

ارباب کمال کا حال اور ان کی تخلیقات و مطبوعات کا جائزہ مختصر ہے۔ کتاب دس ابواب ایک ابتدائیہ بعنوان "کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو" اور اشاریہ پر مشتمل ہے جو ۲۰۱ صفحات پر محیط ہے۔

۱۹۴۸ء میں سقوطِ حیدرآباد کے بعد علمی، ادبی، تہذیبی اور تمدنی اقدار میں جو زوال کے آثار شروع ہو گئے تھے آغاز سخن میں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک زمانہ میں تلنگانہ دکن کا خلاصہ تھا مگر فاضل مؤلف کی دور بین نگاہ نے جو آثار دیکھے ان کو یوں بیان کیا ہے۔ ص۱ "حیدرآباد ابھی ابھی انقلاب سے دو چار ہو ہے یہ شہر تقریباً تین صدیوں سے علم و فضل اور شعر و سخن کا گہوارہ رہا ہے اردو فارسی اور عربی کے سیکڑوں بلند پایہ ادیب اور باکمال شاعر اس شہر میں پیدا ہوئے یا باہر سے آکر اس میں کچھ اس طرح رچ بس گئے کہ اپنوں اور بیگانوں میں کوئی فرق باقی نہ رہا لیکن یہ سلسلہ اب ختم ہوتا نظر آرہا ہے۔ در موجودہ رجحانات سے ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا شعر ' آخری بادل ہیں اک گذرے ہوئے طوفاں کے ہم "

اس سرزمین کا مستقبل کیا ہوگا۔ زور صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے۔

ص۲ "یہ سرزمین مستقبل میں شاید کچھ اور ہی نیتیم کے گل بوٹے کھلائے گی عربی فارسی اور اردو کے شاعروں اور ادیبوں کے جو کارواں در کارواں قافلے اس شہر کے آغاز سے اب تک اس کی زیب و زینت اور چہل پہل کا باعث تھے اب کم نظر آئیں گے جدید سیاسی نظریوں نے ہر جگہ ہر چیز کی قدر و قیمت کو متاثر کیا ہے۔ جو جو پہلے تاریکی میں تھے۔ اب اجاگر ہوتے جا رہے ہیں اور جو روشن تھے ان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھانے لگا ہے۔"

دکن میں تخریبی کارروائیوں اور ہندی کے تسلط سے ہماری آنکھیں بند نہیں ہیں سب کچھ دیکھ چکی ہیں۔ زور صاحب نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔

"یہ ظاہر ہے کہ ہر انقلاب کے پیچھے خواہ وہ کتنی ہی تعمیری کیوں نہ ہو تخریبی قوتوں کو ابھرنے، در

سرسبز ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن جو ہی عبوری دور ختم ہوتا ہے۔ سیاسی بصیرت اور بھلے اور برے کی تمیز پیدا ہونے لگتی ہے۔ ایسے وقت میں حیدرآباد اور اردو، ہندی کے سچے بہی خواہوں کو محسوس ہوگا کہ اردو کو شہر بدر کرنے کی جو بھی کوشش کی جائے گی وہ نہ صرف اہلِ حیدرآباد بلکہ ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی کی توسیع اور اشاعت کے لیے بھی سخت مضرت رساں ثابت ہوگی۔"[۱]

زورؔ صاحب نے حیدرآباد کے علم و فن، شعر و سخن کی تاریخ کی ترتیب کا جو خاکہ مرتب کیا تھا یہ کتاب اس کا ایک حصہ ہے۔ اس باب میں ان کی کئی تالیفات ہیں انہیں میں مواد زیادہ ہے۔

"اس جائزے کی ترتیب میں اس بات کو بطور خاص ملحوظ رکھا گیا ہے کہ جن شاعروں اور ادیبوں یا جس دور کی نسبت معلومات اب تک کم شائع ہوئی تھیں۔ ان پر قدرے وضاحت سے لکھا جائے اس لیے بعض ادوار کے کارنامے ذرا تفصیل سے بیان کیے گئے۔ اور اسی طرح نثر نگاروں اور مورخوں پر شاعروں کے مقابلے میں زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ ور اس طرح اگرچہ تناسب باقی نہیں رہا لیکن ایک دیرینہ غفلت اور کمی کی تلافی ہو گئی۔ بعض شاعروں اور ادیبوں کا ذکر دو دوروں میں آسکتا تھا لیکن اسی دور میں ان کو شامل کیا گیا ہے جس میں انھوں نے زیادہ علمی و ادبی سرگرمی دکھائی۔"[۲]

شاعروں اور ادیبوں کے حالات اور تصانیف کلام کی ترتیب تلاش میں احتیاط سے کام لیا ہے۔ ۱۹۵۱ء کے بعد سے کئی نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اس وقت تک کی معلومات کو سمیٹنے اور ترتیب دینے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

زیر نظر کتاب کوئی مبسوط تاریخ اور مفصل تذکرہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک جائزہ ہے جو زیادہ تر مولف کے تاثرات پر مشتمل ہے۔" صفحہ ۱۶

اس کتاب میں پہلی بار اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں کے اہلِ قلم اور ان کی خدمات سے بحث کی گئی ہے۔ موضوع میں اتنی وسعت اور اہمیت ہے کہ ہر باب پر ایک علیحدہ کتاب لکھی جا سکتی ہے (اس کے ماخذ میں

---

[۱] داستانِ ادب حیدرآباد ــ سید محی الدین قادری زورؔ صفحہ ۱۳-۱۲

[۲] داستانِ ادب حیدرآباد ــ سید محی الدین قادری زورؔ صفحہ ۱۶-۱۵

۱۔ شاعروں، ادیبوں کی تحریروں
۲۔ تذکروں
۳۔ مولف کی کتابوں
۴۔ گردھاری لال شفیق، شاہ تجلی
۵۔ غلام امام خاں بیدری
۶۔ غلام حسین خاں زماں
۷۔ عبدالجبار خاں صوفی
۸۔ حکیم شمس اللہ قادری اور نصیر الدین ہاشمی کی کتابوں سے بطور خاص استفادہ کیا ہے

ابتدائی دور ۹۰۰ھ سے ۱۰۵۰ھ تک کی تاریخ ہے اس میں حیدرآباد کا مختصر حال ہے۔ اس میں سلطان قلی قطب شاہ، میر محمد مومن، وجہی کی خدمات کا ذکر ہے۔ کیشر آلمیاس (عربی نسخہ) کی نقل اور اس کے فارسی ترجمہ کی تفصیل دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ ص ۲۷۲

سلطان محمد کے عہد کے علماء فضلا کا ذکر ہے مثلاً حسن شوقی کی دو مثنویوں ظفرنامہ نظام شاہ اور ضیافت نامہ عادل شاہ کا ذکر ہے جو شعراء اور اہل ہنر گزشتہ عہد کے نا قدری اور گمنامی کے سیلاب میں ڈوب رہے تھے ان کو سلطان محمد کے عہد نے دوبارہ زندگی بخشی۔ غواصی نے لکھا ہے۔ ؎

ڈوبے تھے ہنر مند سو پھیر کر	نکل آئے تجھ دور میں تیر کر
دیا جیوں راگ ہور رنگ کوں	کیا دور سینیاں پو کے زنگ کرنا

یہ اصل میں محمد قلی، میر مومن، وجہی، اور غواصی کا دور تھا۔ عہد ابن خاتون و ابن نشاطی کا دور ۱۰۵۰ھ سے ۱۱۰۰ھ تک کا ہے۔

محمد ابن خاتون کی معارف پروری کا ذکر ہے۔ اس دور کے چند ممتاز اہل قلم اور ان کی تصانیف ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ ملا حسین آملی (استادِ سلطان عبداللہ) شرح نہج البلاغہ ہدایت الابرہان قاطع

۲۔	ملا نظام الدین	حدیقۃ السلاطین
۳۔	الغنی یزدی	رواج گلشن قطب شاہی

۴۔	وجہی	سب رس
۵۔	جنیدی؟	ماہ پیکر
۶۔	ابن نشاطی	پھولبن
۷۔	سید بلاقی	معراج نامہ
۸۔	غلام علی خاں لطیف قزلباش	ظفر نامہ محمد حنیف

سنہ ۱۱۰۰ھ سے سنہ ۱۱۵۰ھ تک کا دور انتشار کا زمانہ ہے۔ گیارہویں صدی کے آخری دو چار سالوں میں دکن میں جو انقلاب آیا اس نے سرزمین دکن کی تہذیب و شائستگی اور علم و فضل کی بنیادیں ہلا دیں۔ تقریباً ۵۰ سال تک اہل حیدرآباد دم نہ لے سکے اور اس شہر کی مرکزیت ختم ہو گئی۔

اس دور کے قاصی، بحری، نوری، مرثیہ گو، روحی، ہاشم علی، مرزا، خلیل خاں پدری، شیخ داؤد حنفیقی، سید محمد خاں سترآبی، فراقی، خلیل اللہ خاں نظاری، میر عنایت اللہ جنیدی، قابل ذکر ہیں۔ ہاشم علی برہانپور کے تھے۔ ان کا ذکر مہر کتاب میں مولف نے حیدرآباد کے اہل علم میں کیا ہے۔

آصف جاہ کی علم دوستی اور معارف پروری کی وجہ سے چند شاعر اور ادیب حیدرآباد آ گئے تھے۔

سنہ ۱۱۵۰ھ سے سنہ ۱۲۰۰ھ تک کا دور علم و ادب کے احیاء کا زمانہ ہے۔ عہد آصف جاہ کے اردو شاعروں میں کئی ممتاز نام نظر آتے ہیں۔ ان میں بالاجی ترمبک ذرہ، میر غلام علی آزاد، بلگرامی، نور محمد عاصی، مرزا علی تقی خاں ایجاد، لچھمی نارائن شفیق، گردھاری لال، جمال اللہ عشق، شاہ تجلی خاص طور سے قابل ذکر ہیں ان میں کئی برہان پور کے ہیں۔ اور شفیق اورنگ آبادی کے۔ نور محمد عاصی کے نام سے دو مثنویوں غلامۃ المعارف، الواح العلوم، کا انتساب غلط ہے۔

عہدِ ارسطو جاہ: سنہ ۱۲۰۰ھ سے سنہ ۱۲۲۰ھ کا زمانہ ہے۔ یہ حیدرآباد کی خوش قسمتی تھی کہ اس کو ایک ایسا فیاض اور علم دوست وزیر ملا۔ جس نے نظام علی خاں کے عہد کے علم و فن کی یاد تازہ کر دی۔ انھوں نے تقریباً دو سو شاعروں کی سرپرستی کی ان سب کا کلام (مجموعہ فصاحت) میں محفوظ ہے۔ ارسطو جاہ نے مہ لقا، چندا بائی کی بھی سرپرستی کی اس دور کی زبان کی اہم خصوصیات کا بیان کیا ہے۔ صفحہ؟۲

چندا اور چندولال کا عہد ۱۲۲۰ء سے ۱۲۵۰ء تک کا زمانہ ہے۔ اس میں چندا، چندولال، میر عالم، منشی غلام حسین جوہر، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔
"یہ عہد اصل میں اردو شعر و سخن کا عہد ترقی ہے۔" ص ۱۴۱
شمس الامرا اور شمس الدین فیض کا عہد ۱۲۵۰ء سے ۱۲۸۰ء تک کا ہے۔ اس دور میں شعر و ادب کے علاوہ دیگر علوم و فنون کی کتابوں کے انگریزی، فرانسیسی اور لاطینی سے اردو ترجمے ہوئے۔ ص
مختار الملک اور وقار الامراء کا دور ۱۲۸۰ء سے ۱۳۲۰ء پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سرکشن پرشاد کا دور ۱۳۵۰ء پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس عہد میں علم و ادب نے کافی ترقی کی۔
آخری باب جامعۂ عثمانیہ پر ہے۔ اس کے قیام دارالترجمہ اور جامعۂ عثمانیہ کے متعلق اہل قلم اور جامعہ کے ناموران کا ذکر ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا ذکر ایک سفینہ کا طالب ہے۔
اشاریہ مفید ہے اور محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔

●●

دکنی ادب کی تاریخ

محی الدین قادری زور ۱۹۰۵ء

دکنی ادب کی تاریخ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی تصنیف ہے۔ موصوف نے اس میں اردو زبان کے قدیم مرکزوں، گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ، حیدرآباد، اور اورنگ آباد کے شاعروں اور ادیبوں کی اردو خدمات کی تفصیلی تاریخ (سنہ ۱۳۵۰ء تا سنہ ۱۹۵۰ء) لکھی ہے۔
کتاب کا ایک مقدمہ، پانچ ابواب اور اشاریہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں فاضل مرتب نے نئی ادبی دریافتوں، کوشش، اردو شہ پارے کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ دکنی ادب میں روز بروز اضافے ہوتے جا رہے ہیں اردو ادب کی تاریخ میں جو نت نئے اضافے ہوئے، چھوٹی بڑی کتابوں کا اضافہ ہوا۔ ان کو ایک سلک گوہر میں پرو لیا جائے۔ اس طرح دکن کے قدیم خدمات گزاران اردو کے کاموں اور ناموں کو سمجھنے اور سمجھانے میں مدد ملے گی۔ ص ۸ ابواب کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ بہمنی عہد — گلبرگہ اور بیدر — سنہ ۱۳۵۰ء تا سنہ ۵۲۵ء
۲۔ عادل شاہی عہد — بیجاپور — سنہ ۱۴۹۰ء تا سنہ ۱۶۸۶ء
۳۔ قطب شاہی عہد — گولکنڈہ اور حیدرآباد — سنہ ۱۵۰۸ء تا سنہ ۱۶۸۷ء
۴۔ مغل عہد — حیدرآباد اورنگ آباد — سنہ ۱۶۸۶ء تا سنہ ۱۷۵۰ء
۵۔ دکنی ادب کا اثر شمالی ہند پر
۶۔ اشاریہ

۱۔ عہدِ بہمنی میں سید گیسو دراز کی تصنیف معراج العاشقین ص۱۱ کا ان کے نام سے غلط انتساب ثابت ہو چکا ہے۔ اس کو ان کی تصنیف بتلایا ہے۔

۲۔ نظامی کی مثنوی کا نام کدم آؤ ص۵ پر لکھا ہے۔ پورا نام کدم راؤ پدم راؤ ہے ص۱۴

۳۔ قطب شاہی عہد کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے زورؔ صاحب نے لکھا ہے کہ

"مولوی نے وجہی کی کتاب تاج الحقائق سلطان لو سعید سے چھپوا دی ہے مگر ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ (غالباً بازار میں نہیں آئی) ص۴۳ تاج الحقائق کو بعض مصنفین وجہی کی تصنیف تسلیم نہیں کرتے۔ نورالسعید اخترؔ نے اسے اکبرالدین شائع کیا ہے۔ وجہیؔ کا متفرق اردو کلام اکرام الدین صدیقی صاحب نے جمع کر کے سب رس (حیدرآباد دکن) کے مختلف شماروں میں شائع کر دیا ہے۔ حسن شوقیؔ کے کلام اور مثنوی کو جمیل جالبیؔ نے پاکستان سے شائع کر دیا ہے۔" [۱]

ہاشم علی دکن کا ممتاز مرثیہ گو تھا اس نے مراثی میں عجمی روایت کو عمدہ طریقے سے نبھایا ہے۔ اس کا ذکر دو سطروں سا میں ہے۔ کلام کا نمونہ نہیں کو دیا گیا۔ ص۴۹

ولیؔ کو اورنگ آبادی لکھا ہے۔ جشنِ ولیؔ کے سلسلے میں سنہ ۱۹۳۶ء میں سید نجیب اشرف ندوی ان کو لکھا تھا کہ ولیؔ گجراتی ہے۔ (یادگارِ ولیؔ) اس کے بعد سید اختر جوناگڑھی نے علی گڑھ کے رسالے (مصنفؔ سنہ ۱۹۴۸ء) میں مسلسل مضامین لکھ کر ثابت کیا کہ ولیؔ گجراتی ہے۔ ان کے بعد سید ظہیر الدین مدنی نے سنہ ۱۹۵۰ء میں ولیؔ گجراتی لکھی۔)

---

[۱] دکنی ادب کی تاریخ — محی الدین قادری زورؔ ص۴۹

ولی کے رسالہ نور معرفت کو ولی کے ایک ہم عصر ولی اللہ کی تالیف بتایا ہے صفحہ ۱۱۱ دراصل یہ رسالہ بھی ولی کا ہے اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کی جانب سے کتابی شکل میں اور اردو رسالہ (عبدالحق) میں شائع ہو چکا ہے۔ عزلت کی راگ مالا اور کارزار کا ذکر نہیں ہے۔ صفحہ ۱۲۳

سید محی الدین قادری زور نے خاکی کو ریختی کا شاعر کہا ہے۔ صفحہ ۱۲۵ دراصل وہ ایک صوفی منش شاعر تھے۔ دکنی زبان میں انھوں نے تصوف کے مسائل کا ذکر کیا ہے (علمی نقوش: غلام مصطفےٰ خاں) اس کے دیوان کے نسخے کمیاب ہیں۔ حبیب الرحمن شیروانی کے نادرات میں ایک نسخہ تھا جواب علی گڑھ میں محفوظ ہے۔

عاصمی کے نام سے خلاصۃ المعارف اور انواع اعلوم مثنویات کا انتساب غلط ہے۔ (اورینٹل کالج میگزین شمارہ ۔)

شاہ سراج کے بیان پر دکنی ادب کی تاریخ کا بیان ختم ہو جاتا ہے۔

شمال ہند کی اردو پر دکنی ادب کا اثر کا باب بھی فکر انگیز ہے اس باب میں لکھا ہے کہ ولی نے تین دفعہ سے زیادہ دہلی کا سفر کیا اور یہ شعر ان سے منسوب کیا ہے۔

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

لیکن دراصل ولی نے صرف ایک مرتبہ شمالی ہند کا سفر کیا اور یہ شعر ان سے غلط طور پر منسوب ہو گیا ہے

دکنی کے رواج اور اس کے ردِ عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے میر، سودا اور قائم سے چند اشعار نقل کیے ہیں۔ ان میں ریختہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اس تصنیف میں جہاں بہت ساری خوبیاں ہیں وہاں جابجا خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اشاریہ ناقص ہے۔ اکثر حوالے متعلقہ صفحات پر نہیں ملتے۔

بنگال کا اردو ادب

جناب وفا راشدی

مشرقی اور مغربی بنگال میں اردو زبان و ادب کی ابتدا سے ۱۹۵۴ء تک کی تاریخ ہے مشہور فرانیسی ادیب و مؤرخ گارساں ڈاسی نے لکھا ہے۔ زیرِ نظر کتاب استفادہ ہے۔ سخن ہائے امروز اور چار ابواب پر مشتمل ہے سخن ہائے امروز میں الف

انتساب	وفا راشدی
پیش لفظ	ماہر القادری
تعارف	اقبال حامد دیوبندی
تقریظ منظوم	کامل صدیقی، بریلوی
سخن ہائے گفتنی	وفا راشدی

سخن ہائے گفتنی کے علاوہ تمام بیانات تقریظی شان کے حامل ہیں۔ سخن ہائے گفتنی میں مولف نے بتایا ہے کہ یہ کاوش اس کی بارہ سال کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ بنگال کے شعراء و ادباء کو دنیائے ادب سے روشناس کرایا گیا ہے۔

کتاب کے پہلے حصے میں بنگال میں اردو کی ابتدا اور اس کی ترقی پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد بدیہی ارتقاء کے اعتبار سے ذیل کے ادوار قائم کیے ہیں۔

پہلا دور	فورٹ ولیم کالج اور اس عہد کے دیگر مصنفین	سنہ ۱۸۰۰ء تا سنہ ۱۸۲۵ء
دوسرا دور	بنگال میں اردو شاعری کا عروج	سنہ ۱۸۲۵ء تا سنہ ۱۸۷۵ء
تیسرا دور	شمس لنسخ اور خالد کا زمانہ	سنہ ۱۸۷۵ء تا سنہ ۱۹۱۰ء
چوتھا دور	آزاد، وحشت، ناطق اور آرزو کا زمانہ	سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۵۴ء

علاوہ ازیں دیگر ابواب کے عنوانات یہ ہیں۔

۱۔ بنگال میں واجد علی شاہ کا زمانہ اور ان کے ہم عصر شعراء

۲۔ بنگال میں علامہ آرزو لکھنوی اور ان کے تلامذہ

۳۔ بنگال کے ہندو ادیب

۴۔ بنگال کی اہلِ قلم خواتین

۵۔ بنگال میں اردو صحافت

۶۔ ادبی انجمنیں

۷۔ بنگال میں اردو تصانیف و مطبوعات

بنگال میں اردو کی ابتدا سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بنگال کے سلطان حسین شاہ ۹۰۹ھ کے درباری شاعر رگھاونی نے اس کی مدح میں لکھا ہے۔ ؎

شاہ حسین آہے بڑا راجہ ۔۔۔ چتر سنگھاسن ان کو چھاجا

اس موقع پر شاہ بہاء الدین باجن ۹۱۲ھ کو ان کا ہم عصر لکھا ہے۔ باجن کا زمانہ ۷۹۰ھ کا ۹۱۲ھ تک کا ہے۔ یہ شاعر ان کے آخری ایام کا ہے۔ باجن کا شعر بھی غلط نقل کیا ہے۔ صحیح شعر یوں ہے۔ ؎

باجن جو کسی کے عیب ڈھانپے ۔۔۔ اس لیکھے درجن مقرر کا ہے

درجن کے بجائے ارجن لکھا گیا ہے۔

شیخ نور الحق مندوی ۱۰۱۲ھ کا ایک جملہ نقل کیا ہے۔ یا خذ غیر معتبر ہے۔ کسی بھی کتب یا ملفوظ سے حوالہ نہیں دیا ہے۔ یہ باب بے حد تشنہ ہے۔ اور زبان و ادب کی ابتدا پر کوئی خاص معلومات نہیں ملتی اور فوری طور پر انگریزوں کے دور کا ذکر آجاتا ہے۔

پہلا دور ۱۸۰۰ء تا ۱۸۲۵ء تک فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور اس عہد کے دیگر مصنفین کے حالات اور تصانیف کے بیان میں ہے اس باب میں جو معلومات دی گئی ہے ان کی حیثیت ثانوی، مختصر اور تشنہ ہیں اس امر پر سیر حاصل بحث ملتی ہے۔

اربابِ نثرِ اردو	سید محمد احمد
فورٹ ولیم کالج	اکرام علی
داستانِ نثرِ اردو	حامد حسین قادری
گل کرسٹ اور اس کا عہد	عتیق احمد صدیقی

تمہید میں صفحہ ۱ پر لکھا ہے کہ شمس ولی اللہ نے ایک مثنوی شہدائے کربلا کے حالات پر قلم بند کی ہے۔ دراصل یہ ولی دیلوری کی مثنوی ہے۔ "گل رعنا" کا حوالہ دیا ہے صفحہ کی نشاندہی نہیں کی ہے۔

صفحہ ۳ پر درد مند فقیہہ کا بیان ہے ان کے مشہور ساقی نامہ کا ذکر کیا ہے

دوسرا دور ۱۸۲۵ء سے ۱۸۷۵ء تک کا ہے جس میں بنگال میں اردو شاعری کے عروج کا حال لکھا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل کا بیان ہے۔

اختر، ضیغم، ناسخ، کامل، احمد، آزاد، شائق، شہباز، اختر، ضیا، شیدا

اشرف، آشفتہ، عیش، تمکین اور تمنا وغیرہ

ان شعراء کے کلام کے جو نمونے پیش کیے ہیں ان میں بیشتر ساقط الوزن ہیں۔ غالب کا مشہور شعر بھی غلط نقل کیا ہے۔ صفحہ ۵ صحیح شعر یوں ہے ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ

بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

بیں کی جگہ میں اور تا کے بعد بہ نہیں لکھا گیا ہے۔

تیسرا دور: ۱۸۷۵ء سے ۱۹۱۰ء کا ہے۔ اس کو شمس النسیخ اور حالد کا زمانہ کہا ہے۔ ان کے تلامذہ کا بھی ذکر ہے۔

چوتھا دور: ۱۹۱۰ء سے ۱۹۵۴ء تک کا زمانہ آزاد، وحشت، ناطق اور آرزو کا عہد ہے اس کو ترقی وارتقاء کے دور سے منسوب کیا ہے اور اسے چار گروپ میں تقسیم کیا ہے۔

صفحہ ۹۵ پہلا گروپ، دورِ حاضر کے اساتذہ کا حال، مثلاً رضا علی، وحشت، ابوالکلام آزاد ناطق لکھنوی، عندلیب شادانی، شرف الحسین شرف وغیرہ

دوسرا گروپ، وہ شعراء کرام جو موجودہ دور کے اساتذہ کے بعد صفِ اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں، مثلاً جمیل مظہری، آصف، واصف، پروفیسر بے خود۔

تیسرا گروپ: ان شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ ہے جن کی مشق سخن تقریباً ۲۵ سال سے جاری ہے

چوتھا گروپ: ابھرتے ہوئے نوجوان شعراء وانشا پردازوں کا مختصر حال جن کی ادبی عمر کم از کم دس سال اور زیادہ سے زیادہ پندرہ سال ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی صرف ایک تصنیف تفسیر ترجمان القرآن کا ذکر کیا ہے۔ قاضی نذر الاسلام کا بھی ذکر شامل کیا گیا ہے۔ اور وہ اردو کے شاعر نہیں تھے۔ ان کے بنگالی گیت کا ایک ٹکڑا پیش کیا ہے[۲] ص ۱۴۰

نرگس باگ میں — بہار کی آگ میں

بھرول واگ میں — کہاں میرے پیارے — آؤ آؤ پیارے

دردِ دل زور — رنگیلا کور

شرابا طہورہ — لاؤ ساقی بھر

پیالہ تو بھر دے — مستانہ کر دے

یہ ٹکڑا قدیم اردو سے مماثلت رکھتا ہے۔ غالباً اسی بنا پر شمار کر لیا ہے۔ دوسرے گروپ میں جمیل مظہری سر فہرست ہیں۔

پروفیسر محفوظ الحق فارسی کے ادیب تھے ان کو بھی شامل کر لیا ہے۔ انھوں نے کامران کے فارسی دیوان کو مرتب کیا ہے اس کے بارے میں لکھتے ہیں

"مرزا کامران کے فارسی دیوان کو اردو لباس سے آراستہ کیا۔"

اس سے دھوکہ ہو سکتا ہے کہ دیوان کا اردو ترجمہ کیا دراصل مقدمہ اردو میں ہے دارا شکوہ کی کتاب مجمع البحرین کو مجمع ابحاراں ص ۱۸۱ پر لکھا ہے۔

تیسرے اور چوتھے گروپ میں کئی شعراء کا ذکر ہے ایک علیحدہ فصل میں واجد علی شاہ اور ان کے ہم عصر شعراء کا مختصر تعارف اور تبصرہ کیا ہے۔ آگے چل کر بنگال میں آرزو لکھنوی اور ان کے تلامذہ کے حالات اور کلام کو پیش کیا ہے ان کے شاگردوں میں جرم محمد آبادی کا ذکر کیا ہے۔ دراصل محمد آبادی غازی پوری کے نامور شاگرد تھے۔[۱]

بنگال کے ہندو ادیب اور اہل قلم خواتین کا ذکر ۲۶/۲۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس کے بعد بنگال میں صحافت کا باب ہے۔

ادبی انجمنوں کے بیان پر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ آخر میں بنگال میں اردو تصانیف اور مطبوعات کی فہرست ہے۔ ص ۲۸۶

۱؎ شمارہ آج کل

اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے صبا کاکوری نے لکھا ہے ۔

ص۵۹ پر شاہ الفت حسین فریاد کو مرشد آباد کا رہنے والا بتلایا ہے ۔ ناظم آباد ان کا وطن تھا ۔

ص۵۹ شہباز کا کلکتہ وطن بتلایا ہے ۔ دراصل وہ بہار کے تھے ۔

ص۲۷ المہلال کو روزنامہ لکھا ہے ۔ جبکہ وہ ہفتہ وار اخبار تھا ۔

ص۲۸ راجہ رام نرائن موزوں کو مرشد آباد کا باشندہ لکھا ہے ۔ وہ بہاری تھے ۔

پروفیسر محفوظ الحق ناطق کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے کلکتہ میں وفات پائی وہ کلکتہ کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بہار آگئے تھے ۔ اور وہیں وفات پائی ۔

ص۲۶ انشاءاللہ خاں کے والد ماشاءاللہ خاں کا تخلص حسن لکھا ہے مصدر ان کا تخلص تھا ۔

جمیل مظہری بہاری تھے ۔

بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء (۱۲۰۴ء تا ۱۸۵۷ء)

اختر اورینوی

زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر اختر اورینوی کا ڈی لٹ کا تحقیقی مقالہ ۱۹۵۷ء میں طبع ہوا ۔ اختر اورینوی نے اس میں بہار کی اردو زبان اور ادب و شعراء کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے اس کتاب کی فہرستِ مضامین میں مقدمہ کے تحت درج ذیل عنوانات قائم کیے ہیں وہ ذیل کے مطابق ہیں ۔

۱ ۔ فلسفۂ زبان و اقوام

۲ ۔ اردو زبان کے آغاز کا پس منظر

۳ ۔ اردو زبان کا ارتقاء

(۱) فلسفہ زبان و اقوام میں زبان کی تعریف ، اہمیت اور غرض و غایت پر روشنی ڈالی ہے ۔ اس بحث میں مختلف یوروپین ماہرینِ لسانیات اور احتشام حسین اور زور کے خیالات نقل کیے ہیں اور آٹھ بڑے لسانی خاندان گنوائے ہیں ۔

(۱) سامی (۲) ہند یوروپی (۳) دراوڑی (۴) ہند چینی (۵) ملائی (۶) افریقی (بانتو) (۷) امریکی (سرخ ہندی) (۸) موسٹرا (آدی باسی)[۱]

---

[۱] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء اختر اورینوی ص۱۵

(۲) اردو زبان کے آغاز کے پس منظر میں اردو زبان کو پروفیسر وحیدالدین سلیم کی رائے کے ساتھ آریائی زبان قرار دیا ہے۔ اور ہندوستان کی مختلف ہند آریائی زبانوں، ماگدھی، پالی، سنسکرت، پراکرت، اپ بھرنش کا ذکر کیا ہے۔ اور پراکرتیں، اپ بھرنش سے ہندی بنگلہ اور اردو زبانوں کی پیدائش بتائی ہے۔

(۳) اردو زبان کی ارتقاء میں "اردو جدید ہند آریائی دور کی ایک اہم زبان ہے جدید ہند آریائی دور کے آغاز کے متعلق کوئی قطعی بات پیش نہیں کی جا سکتی۔" [۱]

مولف کا بیان ہے گریرسن، محی الدین قادری زور، محمود شیرانی، مسعود حسین خاں، شوکت سبزواری، سید سلیمان ندوی وغیرہ نے

باب اوّل بہار میں اردو زبان کی تمہید میں، بہار کی پرانی زبان کو ڈاکٹر ایس سی سرکار کے حوالے سے پروٹو اردو کا نام دیا ہے۔ موریا کے زمانے سے عربی فارسی کے اثرات کے زیر اثر مقامی بھاشاؤں سے پروٹو اردو کی پیدائش کا خیال ظاہر کیا ہے۔ قطب الدین ایبک کے سپہ سالار بختیار خلجی منیر اور بہار کے قصبے کو "بہار میں اردو کے ارتقاء کا اہم سنگ میل بتایا ہے۔ [۲]

صوفیائے بہار، ادیب اور شعراء کے کارناموں و مختصر رسالوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

باب دوّم: بہار میں اردو ادب کی تمہید میں بختیار خلجی کی فتوحات کے زمانے میں صوبۂ بہار میں مسلمانوں کے سیاسی و تہذیبی اثرات کا آغاز (۵۹۰ھ تا ۶۰۲ھ) بتایا ہے مختلف احوال، اقوال اور داستانوں کا ذکر کرتے ہوئے بہار، جعفر عظیم آبادی، مرزا بیدل، راسخ عظیم آبادی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ آخر میں کتاب کے اگلے ابواب میں آنے والے فنکاروں کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"بہار میں اردو ادب کا سرمایہ کثیر ہے ان میں سے مختلف فنکاروں کے خزانے سے زر و جواہر کو میں پیش کروں گا۔ میں ان کی ساری دولت منظر عام پر نہیں لا سکتا۔ کیونکہ میرا دامن تنگ ہے میں انتخاب میں چند باتوں کو پیش نظر رکھوں گا۔ اوّل یہ کہ میں اہم فنکاروں کو چنوں گا۔ دوئم یہ کہ انتخاب اس لحاظ سے بھی ہوگا کہ اردو

---

[۱] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء اختر اورینوی ص ۲۶

[۲] ایضاً ص ۳۷

[۳] ایضاً ص ۱۰۱

کی متحدہ وراثت اور غیر فرقہ وارانہ حیثیت ثابت ہو۔ [1]

بہار میں اردو شاعری کے عنوان سے درج ذیل شعراء کا ذکر خاص کلام کے نمونے اور سوانح عمری کے ساتھ حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔

مرزا عبدالقادر بیدلؔ، سید عمادالدین عمادؔ پھلواروی، ملا محمد علیم تحقیقؔ عظیم آبادی، قاضی عبدالغفار غفارؔ، غلام نقشبند سجادؔ، حضرت بی بی ولیہؔ، لالہ اجاگر چند الفتؔ، مہاراجہ رام نرائن موزوںؔ شاہ آیت اللہ جوہریؔ، مدارؔ، نور محمد دلدارؔ، میر وارث علی نالاںؔ، غلام جیلانی محزوںؔ، شیخ غلام یحییٰ حضورؔ، ہیبت قلی خاں حسرتؔ، شاہ کمال علی کمالؔ، شیخ محمد عابد دلؔ، شیخ محمد روشن جوششؔ، میر محمد رضا رضاؔ، مفتی غلام مخدوم ثروتؔ، خواجہ امین الدین امینؔ، شاہ نورالحق طپاںؔ پھلواروی، غلام علی راسخؔ، شاہ امان علی ترقیؔ، شاہ ظہورالحق پھلواروی، شاہ ابوالحسن فردؔ، قادر علی فگارؔ عظیم آبادی۔

تذکرہ نگاروں میں غلام حسین شورشؔ، نواب علی ابراہیم خاں خلیلؔ، وجیہ الدین عشقیؔ، شعرائے شاہجہاں آباد جو عظیم آباد میں آباد ہوئے۔ میر محمد باقر حزیںؔ، اشرف علی خاں فغاںؔ میر ضیاالدین ضیاؔ، شاہ رکن الدین عشقؔ، مرزا محمد علی فدویؔ، مہاراجہ کلیان سنگھ عاشقؔ وغیرہ۔

بہار میں اردو نثر نگاری میں حضرت عمادالدین قلندرؔ پھلواروی، حضرت ظہورالحق ظہورؔ حضرت محمد تقی بلخی، فردوسیؔ، حضرت شاہ عطا حسین منعمیؔ گیاوی، سید محمد اسحاق عرفؔ، میر دمڑیا، عالم علی عظیم آبادی، مولوی شجاع الدین علیؔ، مولوی محمد عالم علی، حیدریؔ، مولانا محمد احسن گیلانی مولانا ولایت علی زبیری صادق پوری، مولانا عنایت علی زبیری صادق پوری مولانا فیاض علی وغیرہ

آخر میں کتابیات اور اشاریہ پر اختتام ہے۔

اس تحقیقی کتاب میں درج ذیل اغلاط ہیں۔

۱۔ فلسفۂ زبان واقوام میں لسانی خاندان کی تقسیم کا شمار نا قابلِ قبول ہے۔

۲۔ اردو زبان کے آغاز کے پس منظر میں تاریخی انکشافات میں قیاس آرائی پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔

۳۔ اردو زبان کے ارتقاء میں مختلف نظریات کی بحث کے باوجود بہار میں اردو کے ارتقاء کا زمانہ قطب الدین ایبک کے سپہ سالار بختیار خلجی ۶۰۲ھ بتانا درست نہیں ہے۔ صفحہ ۱۲

---

[1] بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقاء۔ اختر اورینوی صفحہ ۱۹۲ تا صفحہ ۱۹۳

۴۔ صفحہ ۱۷۹ پر اس قول کی تردید ہو رہی ہے۔

"صوبۂ بہار میں مسلمانوں کے سیاسی و تہذیبی اثرات کا آغاز باضابطہ طور پر اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی کی فتوحات سے ہوا۔

۵۔ سفینۂ خوش گو کو اردو شاعری کا تذکرہ لکھا گیا ہے۔ یہ اردو شاعری کا تذکرہ نہیں ہے صفحہ ۱۱۱

۶۔ مرزا بیدل کی جائے پیدائش کے اختلاف کا ذکر کیا ہے صفحہ ۱۹۶

(۱) سفینۂ خوش گو میں اکبر آبادی لکھا ہے۔

(۲) آزاد بلگرامی کے تینوں تذکرے "ید بیضا" "خزانۂ عامرہ" سرو آزاد میں عظیم آبادی لکھا ہے

(۳) عقد ثریا میں مصحفی نے عظیم آبادی لکھا ہے۔

(۴) علامہ سلیمان ندوی صوبۂ بہار لکھتے ہیں

(۵) اس کے علاوہ کوئی بخاری، کوئی لاہوری، کوئی دہلوی کہتا ہے لیکن صفحہ ۱۹۶ پر مرزا عبدالقادر بیدل کی جائے پیدائش عظیم آباد اعتماد کے ساتھ لکھا ہے۔

(۶) یہ دعویٰ کہ ان ادبی نمونوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی جائے گی جس سے لوگ عمومی طور پر واقف نہیں۔" صفحہ ۱۹۳

اس بیان کی روشنی میں انتخابی اشعار دعویٰ کی تردید کرتے ہیں۔

(۷) کہیں حوالے کی سند پیش کی ہے اور کہیں اسناد نہیں ہیں۔

(۸) عیسوی سنہ اور ہجری میں مطابقت کے پیش نظر دو عیسوی سنین کی ضرورت کے باوجود صرف ایک سن لکھا گیا ہے۔

(۹) بیدل کے والد شاہ کمال کے مرید تھے اس بات کا ثبوت پیش نہیں کیا گیا صفحہ ۱۹۶

(۱۰) اگر کوئی شاعر اپنے خاص علاقے سے ضرورتِ زندگی کے لیے کسی دوسرے مقام پر ہجرت کر جائے تو وابستہ علاقہ سے اسے منسوب کرنا ادبی تحقیق کے شایانِ شان نہیں۔

(۱۱) بیدل تخلص اختیار کرنے کی وجوہات سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شیخ عبدالعزیز عزت کے دامن میں اختیار کیا تھا۔" یہ قول غلط ہے۔

(۱۲) صفحہ ۱۹۷ پر لکھا ہے کہ "بیدل عہد عالمگیری میں پٹنہ سے دہلی گئے۔ اعظم و معظم کے استاد

داتالیق مقرر ہوئے۔" حالانکہ معظم ۱۰۵۳ھ میں پیدا ہوئے [1] اور اعظم کا سال ولادت ۱۰۶۳ھ ہے۔[2]

ان سنین کی روشنی میں بیدل معظم سے چھوٹے اور اعظم سے چند سال بڑے ہیں۔ عمروں کا تفاوت ایسا نہیں کہ عالمگیر انھیں اتالیق مقرر کرتا۔

(۱۳) صفحہ ۱۹۶-۱۹۷ پر بیدل اعظم کے قصیدے کی فرمائش پر نوکری چھوڑنے کا واقعہ درج ہے لیکن نوکری چھوڑنے کا واقعہ مراۃ الخیال میں تفصیل سے ملتا ہے نوکری چھوڑنے کی اصل وجہ یہ نہیں تھی۔

(۱۴) صفحہ ۱۹۵ پر امیر الامراء حسین علی کے قتل کے تعلق سے بیان ہے کہ

"شاید فرخ سیر کے اشارے پر ہوا تھا۔"

تاریخی حقائق سے ثابت ہے کہ حسین علی خاں اور عبداللہ خاں فرخ سیر کے قتل کے ذمہ دار ہیں اور حسین علی خاں کا قتل محمد شاہ کے عہد میں ہوا تھا۔

(۱۵) صفحہ ۱۹۵ پر مصنف نے اسی واقعہ پر لکھا ہے کہ بیدل نے تاریخی رباعی کہی۔

ع "سادات بوئے نمک حرامی کردند"

یہ ذکر سرو آزاد میں آزاد کے علاوہ کسی تحقیقی تصنیف میں نہیں ملتا۔

(۱۶) صفحہ ۲۰۳ پر سید عماد الدین عماد پھلواروی عنوان قائم کیا ہے اور پہلی سطر میں سید عماد الدین قلندر پھلواروی، چوتھی سطر میں حضرت عماد الدین عماد قلندر پھلواروی لکھا ہے یہ دو شاعر ہیں یا صرف ایک شاعر ہے۔ ان کے بابت معلومات بھی تشنہ ہے۔ ان کا تخلص عماد بتایا ہے جبکہ اردو شاعری میں اس تخلص کا کوئی شاعر موجود نہیں۔[3]

(۱۷) (صفحہ ۲۱۳ سے صفحہ ۲۲۲ تک) محمد سجاد پھلواروی کا سنہ ولادت اور وفات دونوں غلط ہیں۔ کیونکہ ان کے سنین میں بہار کے محققوں میں اختلاف ہے سجاد پھلواروی سے منسوب اشعار مشکوک ہیں کیونکہ بہار کے صوفیاء کے بابت یہ امر یقینی ہے کہ کسی نے اردو اشعار نہیں کہے۔[4]

---

[1] ماثر عالمگیری صفحہ ۳۳۵

[2] ماثر عالمگیری صفحہ ۳۳۶

[3] [4] نوائے ادب بمبئی۔ قاضی عبد الودود

(۱۸) (ص ۲۲۳ تا ص ۲۲۴) بی بی ولیہ کا سالِ وفات غلط ہے۔

(۱۹) (ص ۲۲۷ تا ص ۲۳۵) راجہ نرائن موزوں کا بہار کا صوبیدار ہونا غلط ہے بلکہ وہ نائب صوبیدار رہ چکا ہے

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

(۲۰) تذکرہ میر حسن کے حوالے سے مصنف لکھتا ہے کہ یہ شعر موزوں نے سراج الدولہ کے قتل پر کہا تھا۔ حالانکہ تذکرۂ شورش، تذکرۂ مسرت افزا اور گلزار ابراہیم میں یہ شعر موزوں کے نام سے درج نہیں ہے

(۲۱) "بھولی نہیں ہے مجھ کو بتوں کی ادا ہنوز
دل کے نگیں پہ نقش ہے نامِ خدا ہنوز"

یہ شعر موزوں کا نہیں ہے۔ تذکرۂ میر حسن میں یہ شعر منعم برادر قائم کے نام درج ہے۔

(۲۲) موزوں کے قول کا ہرگز نہ کیجیے اعتبار
جونک اگر مٹی ملے تو لہو پیتی رہے

اس کے علاوہ مزید دو اشعار مصنف نے بیاضِ موزوں سے منسوب کیے ہیں۔ یہ اشعار موزوں کے نہیں سودا کے ہیں دونوں بیان غلط ہیں۔ مختلف تذکروں میں یہ اشعار جعفر علی خاں ذکی کو دہلوی سے منسوب ہیں۔ کلیات سودا کے کسی نسخے میں ان کا وجود نہیں۔

(۲۳) حزیں کا سالِ وفات ۱۱۷۸ھ لکھا ہے "سیر المتاخرین" میں سنہ ۱۱۸۰ھ ہے

(۲۴) (ص ۲۲۵ سے ص ۲۲۶) جوہر کی پھلواروی کا سالِ ولادت غلط ہے۔ ان کے فارسی دیوان جس میں شورش تخلص ہے۔ کلکتہ امپیریل لائبریری کا حوالہ دیا ہے جو آج کل نیشنل لائبریری کے نام سے مشہور ہے۔ متذکرہ فارسی دیوان یہاں موجود نہیں ہے جوہر کے مراثی و سلام مکمل اور نامکمل دونوں طرح کے کئی اشعار میں غلطیاں کی گئی ہیں۔

(۲۵) مثنوی گوہر جوہری کے اشعار کی تعداد ۲۳۰۴ لکھا ہے یہ مثنوی دراصل ۲۴۰۴ اشعار کی ہے۔

(۲۶) (ص ۲۴۵) تاریخ وفات ۹ جمادی الثانی سنہ ۱۲۰۶ھ جن حوالوں سے ملتی ہے ان میں پہلے حوالے (نسخے) سنہ ۱۲۰۶ھ موجود نہیں۔ دوسرے نسخے میں ان کی ریختہ گوئی اور تخلص پر کوئی تفصیل نہیں ملتی۔

خدا بخش لائبریری اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں موجود نسخوں میں غلام یحییٰ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

(۲۷) (صفحہ ۲۷۰) ہیبت قلی خاں حسرت کا سالِ وفات بغیر حوالے کے درج ہے۔

(۲۸) (صفحہ ۲۷۰) خلیل صاحب کے حوالے سے قصہ طوطی نامہ قلی خاں حسرت سے منسوب کیا ہے۔ خلیل نے شعرائے اردو پر کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے۔

(۲۹) تاریخ ادبیات دتاسی کا ذکر ہر مقام پر تذکرہ دتاسی کے نام سے کیا ہے

(۳۰) (صفحہ ۲۷۸) مسرت افزا کے حوالے سے حسرت کے صرف تین اشعار لکھے ہیں جبکہ مذکورہ تذکرہ میں چھ اشعار ہیں۔ تذکرہ شورش میں ۲۶ اشعار بتلائے ہیں۔ (اس میں ۱۷ اشعار ہیں۔

(۳۱) (صفحہ ۲۷۸) سے
کعبہ بھی ہم گئے نہ گیا ان بتوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

یہ شعر حسرت کا لکھا گیا ہے حالانکہ یہ شعر یقین کا ہے۔ دیوان یقین میں موجود ہے۔

(۳۲) (صفحہ ۲۸۱) شاہ کمال علی کا سالِ وفات ۱۲۱۵ھ بغیر حوالے کے لکھا گیا ہے۔

(۳۳) (صفحہ ۲۸۱) عروض ہندی ان کے حوالے سے ان کے رسالہ کا ذکر کیا ہے لیکن تفصیلی نہیں خدا بخش لائبریری میں موجود نسخہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

(۳۴) (صفحہ ۲۸۳) عابد دین سے منسوب چار اشعار میں آخری شعر جوشش کا ہے۔

سے
رہتا ہے مدام آب دیدہ   جوں آئینہ بہ ستم رسیدہ

اس شعر میں "بہ ستم" کو "یہ ستم" لکھا ہے۔

(۳۵) (صفحہ ۲۸۷) رضا ابن جمال یعنی حسین جمال لکھا ہے اور باپ کا کوئی ذکر نہیں ہے حالانکہ تذکرہ شورش ان کی شاعری کا ذکر کرتا ہے۔

(۳۶) (صفحہ ۲۹۰ تا صفحہ ۲۸۸) خردت کے ولادت و وفات کے سنین کی کوئی سند پیش نہیں کی گئی۔ ان کی فارسی شاعری کا ذکر نہیں کیا۔ مرثیہ کے آخری شعر کے مصرعہ اولیٰ میں ہجر کو ہجر لکھا ہے۔

(۳۷) (صفحہ ۲۹۳ تا صفحہ ۲۹۰) یقین کا سنِ وفات ۱۲۵۶ھ غلط ہے۔ معاصر یقین تمنا عظیم آبادی کی بیاض میں یقین کا سالِ وفات ۱۱۹۹ھ ہے۔ جوشش اور ابراہیم خاں کا ہم عصر ۱۲۵۸ھ تک کیسے زندہ رہ سکتا ہے خم خانۂ جاوید میں بھی ۱۲۵۶ھ نہیں ہے۔

(۳۸) (ص۳۱۲ تا ص۳۱۳) شاہ نورالحق طپاں ط سے لکھا ہے اور مقطع کے اشعار میں ت سے تپاں لکھا ہے۔

(۳۹) (ص۳۰۹ تا ص۳۱۰) راسخ پیدائش سال میں کسی تذکرہ سے ثابت نہیں ہے۔

(۴۰) (ص۳۱۹ تا ص۳۱۶) فرد پھلواروی سالِ ولادت ۱۱۹۱ھ غلط ہے ص۳۱۶ پر سالِ وفات ۱۲۶۵ھ حاشیہ ۱۲۶۶ھ دیا پھر ص۳۱۷ پر ۱۲۶۵ھ بلخی کے حوالے سے لکھا ہے جو غلط ہے۔

(۴۱) (ص۳۲۲ تا ص۳۱۹) قادر علی فگار کی مثنوی قصہ یوسفؑ زلیخا کے منظوم قلمی نسخہ کا ذکر کیا ہے لیکن اس کی اشاعت کی بابت معلومات غلط ہے اس کا نسخہ خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ ان کے دیوان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

(۴۲) (ص۳۲۲ تا ص۳۲۴) غلام حسین شورش سالِ وفات ۱۱۹۵ھ در ۱۱۹۳ھ دیا ہے سالِ وفات، شورش تذکرہ، شیفتہ میں ۱۱۹۰ھ مسرت افزا ۱۱۹۵ھ ہے۔ یہ صحیح ہے۔ شورش کے جو شعر شعرالہند کے حوالے سے نقل کیے ہیں لیکن فہرست حوالہ جات میں شعرالہند کا نام نہیں ہے۔

(۴۳) (ص۳۲۴ تا ص۳۲۶) نواب ابراہیم خاں خلیل کو میر قاسم عالیجاہ کا وزیر لکھا ہے۔ ملازم کو وزیر کیسے کہا جا سکتا ہے۔

(۴۴) علی ابراہیم کو لارڈ کارنوالس کے عہد میں بنارس کا گورنر لکھا ہے حالانکہ یہ کبھی گورنر نہیں ہوئے۔

(۴۵) خلیل کے والد کا نام خواجہ حکیم غلط ہے۔ صحف ابراہیم خلیل نے اپنے والد کا نام محمد حسن رضا درج کیا ہے۔ خواجہ کا لقب نہ خلیل کے نام کے ساتھ نہ ان کے خاندان کے کسی فرد سے منسوب تھا۔ ص۲۱ سراپا سخن و تذکرۂ نادر کے مرتب جناب مسعود حسن رضوی نے بھی یہی نام لکھا ہے۔

(۴۶) گلزارِ ابراہیم شعرائے ریختہ کا تذکرہ کی ابتداء کا سن ۱۱۸۴ھ، و اختتام ۱۱۹۸ھ غلط ہے۔ کیونکہ دستور الفصاحت میں گلزار ابراہیم کے یہ سنین نہیں ہیں۔

(۴۷) وجیہہ الدین عشقی (ص۳۲۸ تا ص۳۲۶) عشقی فارسی انشاء پرداز میں بڑا پایہ رکھتے تھے یہ بیانات غلط ہے۔

(۴۸) "عشقی نادر در ڈھاکہ میں بھی رہے ہیں" یہ بیان غلط ہے۔ ان کا ڈھاکہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

(۴۹) عشقی کے متعلق یہ بیان "نمونۂ مجھے اردو کا نمونۂ کلام کہیں نہیں مل سکا۔" غلط ہے تذکرہ عشقی میں اس کے اشعار موجود ہیں۔

(۵۰) (صفحہ ۲۱۹) میر محمد باقر حزیں کو عظیم آبادی لکھا گیا ہے۔ حزیں دہلی کے باشندے تھے۔

(۵۱) (صفحہ ۲۳۰ تا صفحہ ۲۳۱) اشرف علی خاں فغاں کو "کوکہ" لکھ کر سوتیلا بھائی لکھا ہے۔ حالانکہ "کوکہ" رضاعی بھائی کو کہتے ہیں۔

(۵۲) ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے پریشان ہو کر مرشد آباد گئے۔ وہ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے بعد مرشد آباد گئے تھے۔

(۵۳) (صفحہ ۲۳۴) میر ضیاء الدین ضیاء اور ان کا صحیح نام ضیاء الدین حسین ہے۔ ۱۱۹۶ھ تک زندہ رہنے کا بیان غلط ہے۔

(۵۴) (صفحہ ۲۳۶ تا صفحہ ۲۲۲) شاہ رکن الدین عشق کا سالِ ولادت ۱۱۳۰ھ اور سالِ وفات ۱۲۰۳ھ درست نہیں غلط ہیں۔ کیونکہ یادگارِ عشق میں سو سال عمر کا اشارہ ملتا ہے لیکن سالِ پیدائش کسی تذکرے میں نہیں ہے۔

(۵۵) (صفحہ ۲۳۵ تا صفحہ ۲۳۶) مرزا محمد علی فدوی کی ۱۱۴۰ھ ولادت حاشیے میں غلط ہے احمد شاہ کا عہدِ سلطنت ۱۱۶۲ھ غلط ہے اور سالِ وفات فدوی ۱۲۱۰ھ بھی غلط ہے۔

(۵۶) ۱۱۹۰ھ میں ان کا سکونت اختیار کرنا کسی قدیم تذکرہ سے ثابت نہیں ہے۔

(۵۷) عشق کی درسیات کی تعلیم دینے کا ثبوت ایک دو روایات پر منحصر ہے۔

(۵۸) ان کے دیوان کا نسخہ سید حسن عسکری کو دانشگاہ پٹنہ، پٹنہ شہر سے ملا یہ بیان غلط ہے۔

(۵۹) (صفحہ ۲۴۵) آثم کا سالِ وفات ۱۲۱۵ھ غلط ہے "نسخہ تاریخِ مظفری" میں درج ہے کہ اکبر ثانی کے پہلے سال جلوس ۱۲۲۱ھ ۱۲۲۲ھ میں انھوں نے رحلت کی۔

اس تاریخ کی مزید اغلاط اور تفصیلات کے لیے قاضی عبدالودود کا مضمون رسالہ "نوائے ادب" میں قسط وار ملاحظہ کیجیے۔

اس علاقائی تاریخ میں مصنف نے صرف علاقائی جذبہ کو مقدم رکھا اس تاریخ کا مطالعہ خاطر خواہ نتائج اخذ کرنے میں مانع ہے۔ کیونکہ منطقی رویہ سے تحقیقی دلائل قابلِ قبول نہیں ہوتے۔

••

مدراس میں اردو ادب کی نشوونما

محمد افضل الدین اقبالؔ

زیرِ نظر تصنیف محمد افضل الدین اقبالؔ کے پی ایچ ڈی کے مقالہ کا ایک جزو ہے اور تین ابواب کے ۴۰۶ صفحات پر مشتمل ہے پورا مقالہ ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اسی لیے مقالہ کا ابتدائی حصّہ شائع کیا گیا ہے مطبوعہ مقالہ کے ابواب کے درج ذیل عنوانات ہیں۔

(۱) ہندوستان کی تمدنی تاریخ میں جنوبی ہند کی اہمیت (۲) نوابانِ ارکاٹ کے عہد میں اردو کی سرپرستی

(۳) فورٹ سینٹ جارج کالج

۱۔ آخری باب دو سو سے زیادہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ابواب میں کئی جز ہیں ان کی ذیلی سرخیاں ہیں۔ ہر جزو نئے صفحہ سے شروع ہوتا ہے انہیں باب قرار دینا جائز تھا۔ مثلاً پہلا باب چھ ابواب کا ہے۔

۲۔ تحقیقی مقالہ کی ابتدا میں سیاسی، سماجی پس منظر کا، جہاں سماجی دھاروں سے متعلق زبان کے نشیب و فراز کا ذکر ہونا چاہیے۔ لیکن اس تاریخی پس منظر میں طوالت ہے پہلے باب کے ذیلی جز کے عنوانات دیکھیے:

(۱) عہدِ قدیم میں ایشیائی، افریقی اور یورپی ملکوں سے جنوبی ہند کے تعلقات

(۲) عہدِ وسطیٰ میں عربوں، ترکوں اور ایرانیوں سے جنوبی ہند کے تعلقات

(۳) جنوبی ہند میں یورپی اقوام کی آمد — ان عنوانات کو نظر انداز کرنے میں کوئی نقصان نہیں تھا

۳۔ مدراس کے احاطہ کا تعین نہیں کیا گیا۔ آج مدراس علاقہ ایک شہر کے نام سے محدود نہیں۔ پہلے ریاست کا نام تھا۔ اب تامل ناڈو اسی کا نام ہے۔

۴۔ بقول مقالہ نگار صوبہ مدراس کرناٹک ہے۔ لیکن یہ تقسیم مغلیہ عہد کے صوبوں کی تقسیم کے اعتبار سے ٹھیک ہے آج کا کرناٹک دوسرا علاقہ ہے، ورنہ ذیل میں مقالہ نگار یوں لکھتے ہیں۔

"انفرقی مدّت تک کرناٹک میں رہا پھر سیر کرتے ہوئے بیجاپور میں آیا۔"[۱]

بیجاپور کرناٹک میں ہے۔ مقالے کے ابتدا میں علاقائی بنیاد پر حدود اور مغلیہ عہد کے کرناٹک آج کے تامل ناڈو کے تامل ناڈو کے نقشے دے کر واضح کرنا ضروری تھا۔

۱؎ مدراس میں اردو ادب کی نشوونما — افضل الدین اقبال [illegible]

۵۔ اس مقالہ میں ادبی ادوار کی تقسیم حقیقت ہے۔ سرپرستی کی تقسیم عہد حکومت کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ ادبی ادوار ہمیشہ سلطانی ادوار کے برابر نہیں چلتے۔

۶۔ مقالہ نگار نے علاقائی ادیبوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ علاقہ مدراس کی حد تک یہ کام قابلِ تعریف ہے۔

۷۔ ایسے ادیب جو باہر سے آکر مدراس میں آباد ہو گئے تھے ان پر سیر حاصل بحث نہیں ہے اور موضوع سے کسی حد تک انصاف نہیں کیا گیا ہے جیسے حکیم اعز الدین بحل، آ۔ اظفری گورگانی، شاہ حسین حقیقت اور والا موسوی وغیرہ

ان ادیبوں کو اگر اس جائزے میں مقام دیا جانا علاقائی نسبت سے درست ہے تو پھر وہ مدراس کے جو باہر جا کر بس گئے تھے انھیں خارج کر دیا جائے۔ مثلاً سید شاہ حسین حقیقت کی جملہ تصانیف کا تفصیلی تعارف ہے حالانکہ ان میں سے بیشتر شمالی ہند میں تخلیق ہوئیں۔ بہار یا باہر سے آنے والے ادیبوں کا ذکر ایک علیحدہ فصل میں کیا جاتا ہے۔ اور قیام کے دوران تصانیف کا ذکر کرنا واجب تھا اسی طرح مدراس سے باہر جانے والے ادیب کے بیرونی قیام کے ادب پاروں کو شاملِ جائزہ نہ کیا جائے۔

۸۔ تبصرے با بیان فورٹ سینٹ جارج کالج پر بہت تفصیل سے باتیں پیش کی ہیں۔ مصنفوں کی فہرست میں جن شخصیات کو شامل کیا گیا ہے ان پر شدید شبہات ہیں۔ مثلاً ٹامس روبک مدراس میں فوجی آفیسر تھے۔ لیکن بعد میں وہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ چلا گیا اور اس کے تمام تصنیفی کام کلکتہ میں ظاہر ہوئے اگر مدراس میں اس نے کچھ لکھا تھا تو اس کا ثبوت پیش کرنا ضروری تھا۔[۱] اور اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ وہ مدراس کالج سے وابستہ تھا۔

جنرل جوزف اسمتھ[۲] یہ صاحب سرے سے اہلِ قلم نہیں تھے۔ مدراس کے جوزف اسمتھ اور شمال کے جنرل جوزف اسمتھ دو مختلف شخص تھے۔ نواب مبارز الملک افتخار الدولہ صولت جنگ جیسے خطابات شمال کے جنرل جوزف کو ملے تھے۔ اور وہی تحسین[۳] کے مربی تھے۔

۹۔ ہندوستانی مصنفین میں بعض میں بعض کو فورٹ سینٹ جارج سے منسوب کرنے کا ثبوت نہیں پیش کیا گیا جیسے سید شاہ حسین حقیقت بریلوی کو ریذیڈنٹ کرنل کڈ اپنے ساتھ میر منشی بنا کر مدراس لے گیا تھا۔

---

[۱] صفحہ ۳۱۹، صفحہ ۳۲۰ پر اس کا ذکر کیا گیا ہے

[۲] صفحہ ۳۲۳

[۳] دیباچہ نوطرز مرصع مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صفحہ ۳۱ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد

لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ کالج سے وابستہ ہوئے [1] اور اُن کے مربی کا نام کرنل کرڈ تھا۔ گوڈ کو غلط ہے حقیقت کا ذکر سینٹ جارج کالج کے باب میں غلط ہے۔

۱۰۔ قاضی ارتضاء علی خاں خوشنود کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ "یہ ۱۸۱۰ء سے ۱۸۱۵ء تک مدراس میں درس و تدریس اور تالیف کتب میں مشغول رہے۔ مقالہ نگار صفحہ ۲۹۶ پر لکھتے ہیں "

گمان غالب ہے کہ یہ عرصہ فورٹ سینٹ جارج کی خدمت میں گزرا۔"

گمان کی بنیاد پر ایک ادارے سے منسوب کرنا تحقیقی مزاج کے خلاف ہے۔

۱۱۔ صفحہ ۳۱۶ مرزا محمد جان کے بابت مقالہ نگار کسی تصنیف سے واقف نہیں۔ محمد جان غلط ہے۔ محمد خان صحیح ہے۔ جنھوں نے مطلع الانوار کا ترجمہ اسرار محمدی کے نام سے کیا ہے [2]۔

۱۲۔ صفحہ ۳۲۳ تا صفحہ ۳۲۹ پر محمد خان اور اسرار احمدی کا ذکر ہے۔ اسرار محمدی صحیح ہے۔

۱۳۔ فورٹ سینٹ جارج کے دو معینہ مصنفو۔ اکرام علی اور بہادر علی حسینی۔ اکرام علی مولف ... اخوان الصفا کے بارے میں ان کے بھائی تراب علی کے تعلق سے خیال ہے۔

صفحہ ۳۲۷ " ناجی نے اپنے ہم وطن بھائی (خلیل الدین اشک) کے شایان شان میزبانی کی تھی۔ اور اپنے پاس رکھا تھا۔ تو پھر اکرام علی ان کے اپنے بھائی تھے۔ وہ بھی ضرور مدراس آئے ہوں گے۔ کرام علی کا تعلق کلکتے سے ہے۔ کیونکہ ناجی نے اپنے بعض اعزا کو مدراس بلایا تھا۔ اس خیال کو بنیاد بنا کر اکرام علی اور ان کی اخوان الصفا " کو مدراس کے ادبی پاروں میں جگہ دے دی گئی۔"

۱۴۔ صفحہ ۳۸۱ اکرام علی کی طرح میر بہادر علی حسینی کے متعلق بھی کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا وہ بھی فورٹ سینٹ جارج کالج کے شعبۂ تدریس سے وابستہ تھے۔"

مقالہ نگار کو یقین نہیں ہے پھر بھی ان کا تذکرہ بے سود ہے۔ کتاب کی ضمنی فصل "سینٹ جارج کی چند غیر مطبوعہ تصانیف" میں تین دکنی داستانیں یا حکایتوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے ایک دکنی سنگھاسن بتیسی ہے جس کے مصنف کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ انفس نے اس کے بارے میں رفیعہ سلطانہ کی کتاب "اردو نثر کا آغاز و ارتقاء" صفحہ ۳۹۱ کا غلط حوالہ دیا ہے۔ یہ صفحہ ۲۷۹ پر ہے اور رفیعہ سلطانہ نے اس مقام پر کچھ

---

[1] شاہ حسین حقیقت اور ان کا خاندان۔ از مشرف احمد ادبیات پاکستان کراچی ۱۹۷۷ء

[2] رفیعہ سلطانہ کا شائع شدہ مضمون فورٹ سینٹ جارج کالج (دکنی کا ایک مرکز) ہماری زبان ۸؍۹؍۹

نہیں لکھا ہے۔ لیکن "ہماری زبان" کے حوالے سے اسے فورٹ سینٹ جارج کالج سے کیا تعلق ہے؟

۱۶۔ صفحہ ۲۹۲ پر فضل الدین کا قیاس ہے کہ یہ ترجمہ فورٹ سینٹ کالج کے لیے ہوا تھا یہ انکشاف ثبوت کا محتاج ہے

۱۷۔ صفحہ ۲۹۵ گلستاں کے یہ ترجمے بہت ممکن ہے فورٹ سینٹ جارج کالج کی طرف سے کرائے گئے ہوں۔"

گلستان سعدی کے دکنی ترجمے صرف امکان کی بنیاد پر سینٹ جارج کالج کی غیر مطبوعہ تصانیف کے شمار میں ہیں۔ اگر ایسی بات تھی تو ایک فصل قائم کرکے اس میں گمان اور قیاس کے مصنفین اور تصانیف کا تذکرہ کرتے۔

۱۸۔ مقالہ نگار کو چند اچھی تصانیف کا تنقیدی جائزہ پیش کرنا تھا۔ محض ناموں کی فہرست اور غیر تنقیدی نعل تذکرہ بن جاتا ہے۔

۱۹۔ ہندی کے یہ الفاظ غلط برتے گئے صفحہ ۲۵ پاڑوا، صحیح پلّو صفحہ ۲۸ راما نوجا، صحیح راماںج صفحہ ۲۸ ہوبا دیشیا صحیح ہتّوپدیش صفحہ ۱۸۹ پر "اعیض اعزاز الدین پیدا ہوئے" یہ روزمرہ حیدرآباد کی مقامی زبان کا ہے وہاں یا ان کے یہاں ہونا چاہیے۔

(مقالہ) یہ کتاب مذکورہ خامیوں کے باوجود علاقائی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ مقالہ نگار کی کاوش اور محنت کو سراہا جانا ضروری ہے۔ کیونکہ ۴۰۴ صفحات کی اس تصنیف میں مقالہ نگار نے ایک معیار برقرار رکھا ہے تحقیقی مواد کو اچھی طرح دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے جانفشانی کے ساتھ ساتھ عرق ریزی بھی کی ہے۔

مصنف نے ضرورت کے مطابق جہاں جہاں اپنی رائے یا نظریہ کا اظہار کیا ہے وہ زبان کی پختگی کا ثبوت ہے۔

علاقائی بنیاد پر اردو ادب کے سرمایہ میں یہ تاریخ ایک خلاء کو پُر کرتی ہے۔ اور اول سرمایہ کی شناہد۔

••

ریاستِ میسور میں اُردو کی نشوونما

ڈاکٹر حبیب النساء

ڈاکٹر حبیب النساء کا مقالہ "ریاستِ میسور میں اردو کی نشوونما" دو حصوں میں منقسم ہے پہلا حصہ تمہیدی حیثیت سے جنوبی ہندوستان اور عربوں کی دوستی و تعلقات کی تاریخ کا اظہار ہے مقالہ نگار نے تاریخی حقائق سے میسور میں اردو کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے صوفیوں، درویشوں کی دکنی اردو کی خصوصیات میں ہریانی، پنجابی اور کھڑی بولی کے عناصر تلاش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ دکنی زبان کی شہرت شمالی ہندوستان سے جنوبی ہندوستان کے لوٹنے تک کے تاریخی حقائق کا اظہار ہے۔

مقالہ کا دوسرا حصہ تحقیقی ہے اور چھ ابواب پر مشتمل ہے مقالہ نگار نے اس حصے کے ہر باب میں ہر دور کے سیاسی، سماجی، ادبی ماحول کی روشنی میں شعراء ادباء کے کارناموں کو ظاہر کیا ہے اس لیے میسور میں اردو کے تدریجی ارتقاء کا خاکہ سامنے آجاتا ہے۔

باب ششم میں میسور میں اردو صحافت کی تاریخ پر تحقیقی مواد ملتا ہے۔ مختلف اخبارات، مثلاً قاسم الاخبار، میسور اخبار وغیرہ کی ادبی خدمات کو سراہا ہے۔

باب ہفتم میں میسور میں سرکاری مدارس کے اجراء اور ان میں اردو کے مقام کی تاریخی رپورٹ تعلیمی کارکردگی کے ساتھ پیش کی ہے۔ جو ۱۸۶۲ء سے ۱۹۵۶ء کی تاریخ کا احاطہ ہے اردو کی ترقی میں میسور یونیورسٹی کا حصہ کس طور ثابت ہوتا وہاں کی تعلیمی پالیسی کی تاریخ مرتب کر دی ہے۔

باب ہشتم میں اشاعت کے مختلف ذرائع، انجمنوں، مدارس، کتب خانے کی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ خاتمہ کے عنوان سے میسور کی عوامی زبانوں کا تذکرہ کیا ہے اور اردو کی اشاعت کے اداروں کا سرسری جائزہ لیا ہے۔

یہ تاریخ دیگر علاقائی تاریخوں کی طرح علاقائی رجحان کا نمونہ ہے۔ مقالہ نگار کا بیان قابلِ غور ہے۔

"ریاستِ میسور میں اردو کی نشوونما" ایک ایسا موضوع ہے جس پر ابھی تک وسیع پیمانے پر تحقیق نہیں کی گئی۔ اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ دو چار متفرق مضامین یا ایک چھوٹی سی کتاب تک محدود ہے۔" ؎۱ اس تاریخ کا شمار علاقائی تاریخوں کے ذیل میں کیا جا سکتا ہے۔

؎۱ ریاستِ میسور میں اردو کی نشوونما" ڈاکٹر حبیب النساء بیگم ص۱ پیش لفظ

اُردُو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصّہ

سلیم حامد رضوی ۱۹۶۳ء

اُردو ہندوستان کی عالمگیر زبان ہے جس کے کئی بڑے اور چھوٹے مراکز ہیں ان مراکز کے اہلِ قلم نے زبان و ادب کی خدمات کی ہیں ان کے جائزے اور ترتیب سے اردو کی مکمل تاریخ مرتب ہو سکتی ہے تا حال ایسی کوئی تاریخ نہیں ہے جو چھوٹے سے چھوٹے مرکز کی ادبی خدمات پر پوری روشنی ڈال سکے اس سلسلہ میں کافی محنت کی جا رہی ہے

زیرِ نظر کتاب سلیم حامد رضوی کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جو ۱۷۰۷ء سے ۱۹۶۳ء تک تقریباً ڈھائی سو سال کے ادب کا جائزہ ہے فاضل مرتب نے یہ کام ۱۹۵۵ء میں شروع اور ۱۹۶۳ء میں مکمل کیا اس کام کی ترغیب موصوف کو ۱۔ مسعود حسن رضوی ۲۔ پروفیسر آل احمد سرور اور ۳۔ احتشام حسین نے دی تھی۔

زیرِ نظر کتاب تمہید اور نو ابواب پر مشتمل ہے تمہید میں اس تالیف کی ضرورت اور مقصد، ترتیب کتاب، ماخذات ادبا و شعراء کی شمولیت کا معیار اور تحقیق کی دشواریوں کا ذکر کیا ہے اصل مقالہ کافی ضخیم تھا طباعت کیلیے اس کی تلخیص ضروری تھی۔ زیرِ نظر کتاب تلخیص ہے۔ رضوی صاحب اس کتاب کی تمہید میں رقمطراز ہیں۔ "اصل مقالہ جس میں راقم الحروف کو ڈاکٹریٹ ملی تھی کافی طویل تھا اس طوالت کی وجہ سے یہ کتابی صورت میں شائع نہ ہو سکا۔ مجبوراً اصل مقالہ میں چند ابواب کو کم کر کے مقالہ کو اس قابل بنا دیا گیا کہ وہ چھپ سکے اس طرح بے شمار حوالوں کو بھی ترک کر دینا پڑا۔" [۱]

پہلے باب میں بھوپال کی سیاسی اور تمدنی تاریخ پس منظر کے طور پر پیش کی گئی ہے بھوپال میں اُردو کی نشوونما کے لیے جو ماحول سازگار تھا اور آب و ہوا اس آرہی تھی اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ص ۴۲

دوسرے باب میں بھوپال میں اردو زبان کے آغاز و ارتقاء پر تبصرہ کیا ہے ۱۷۰۷ء سے ۱۹۴۹ء کے عہد کو مختلف حصوں (ادوار) میں تقسیم کر کے ہر دور کے نثری اور شعری ادب کا اجمالی ذکر ہے بھوپالی زبان کی مقامی (خصوصیات) دلچسپ حصّہ ہے جو ص ۶۵ تا ص ۹۵ تک بیان کی گئی ہے۔

تیسرا باب دورِ اوّل (۱۷۰۷ء، ۱۸۱۸ء) کی ادبی تخلیقات کے جائزے پر مشتمل ہے اس میں تخلیقات پر تبصرہ ہے۔ زبان و بیان کی خوبیوں اور خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قاضی محمد صالح کو بھوپال کا پہلا

---

[۱] "اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصّہ" سلیم حامد رضوی بھوپال ص ۲۳ (تمہید)

معلم شاعر قرار دیا گیا ہے۔ [۱]

اس باب میں برہانپور کے عشق خیراتی صدیقی کی مثنوی "فقۂ ہندی" صفحہ ۸۲ سید مقصود عالم دیدار کی "یوسف و زلیخا" صفحہ ۸۶ سحر البیان کی طرز میں عنایت اللہ نادان کی مثنوی "ماہ خورشید" (مخطوطہ سینٹرل لائبریری بھوپال) صفحہ ۹۹ اور امیر گوالیاری کی کتاب "جنگ نامہ بندۂ بھوپال" وغیرہ اہم حصے ہیں اور مولف کی عرق ریزی اور کاوش کی شاہد ہیں۔ دور اوّل کے شعراء اور تخلیقات پر تبصرہ مختصر ہے۔

"سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس دور میں جتنے شعراء کو ان کی تخلیقات کی روشنی میں پیش کیا گیا وہ سب کے سب قطعاً گمنام تھے۔ نہ تو ان کا ذکر کسی تاریخ یا تذکرے میں کیا گیا ہے اور نہ اہلِ بھوپال ان کے وجود سے باخبر تھے۔ اس کتاب میں یہ قابلِ احترام شخصیتیں پہلی بار منظرِ عام پر آ رہی ہیں یہ دیکھ کر دل دکھتا ہے کہ کیسے کیسے بلند مرتبہ فنکار ادب بھوپال کے مخصوص سیاسی حالات کا شکار ہو کر پردۂ گمنامی میں مستور ہو گئے۔ وہ اپنی اعلیٰ کارگزاری کی روشنی میں شہرت اور نیک نامی سے محروم رہے جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔"

دوسرے اس دور میں ایسی مثنویاں ملتی ہیں جو یا تو قدم کے لحاظ سے تاریخی اہمیت کی مالک ہیں یا فنکاری کا ایسا نمونہ ہیں جو بھوپال کی اٹھارویں صدی کی ادبی ترقی اور ارتقاء کو ثابت کرتا ہے۔" صفحہ ۱۰۹ تا صفحہ ۱۱۱

دور دوم ۱۸۱۹ء تا ۱۸۶۸ء کی تخلیقات کا جائزہ چوتھے باب میں ہے اس دور کے رافت [۲] کی مثنوی "زلیخائے ہندی" پر سیر حاصل تبصرہ ملاحظہ ہو۔ صفحہ ۱۲۱

"رافت نے ایک خواص کا سراپا ۱۸۰ راشعار میں بیان کیا ہے مقصود اس ماحول کو واضح کرتا ہے جس میں حضرت یوسف نے اپنی پیغمبرانہ عصمت کا امتحان پاس کیا۔" [۲]

خواصوں کا اس کی کروں کیا بیاں — اتارا سا پریوں کا رہتا وہاں
میں ان میں لکھتا ہوں حال ایک کا — قیاس اس پہ کر سب کو تو رفتا
وہ اس کا تبسم وہ اس کی ادا — وہ اس کا تکلم وہ انداز یا
وہ غمزہ و عشوہ و ناز و غرور — وہ آن و کرشمہ وہ حسن اور وہ نور

---

[۱] اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ صفحہ ۵۸

[۲] اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ سلیم حامد رضوی صفحہ ۱۲۱

صد ۱۲۲ پر" یہ سراپا بہت طویل ہے۔ اس میں جسم کے ہر عضو اور اس کے حسن ولوازمات حسن، سج دھج، زیورات
لباس، چال ڈھال، غرض ہر چیز کی کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ تصویر سامنے آجاتی ہے اس سراپا کے
آخری اشعار ملاحظہ ہوں۔

سراپا غرض کیا کہوں اک طلسم — بنایا خالق نے تمام ان کا جسم
نکلتی تھیں باتوں میں محبوبیاں — ٹپکتی تھیں ہر عضو سے خوبیاں
سنہرے بدن کی غضب وہ چمک — تجلی حسن سے کندن کی ہوئے دمک

فراں روایانِ بھوپال کی ادبی خدمات کا بھی مذکور ہے۔ کہیں کہیں سے ایسے شاعر کو شریک کر لیا ہے
جس کا کلام نہیں ملتا۔ مثلاً شاہ فریدالدین عطاری، مشطاری[1]

پانچواں باب دورِ سوم ۱۸۶۸ء تا ۱۹۰۱ء کی ادبی تخلیقات کے بیان میں ہے نواب شاہجہاں
بیگم اور نواب صدیق حسن خاں اور ان کے دربار سے متعلق شاعرات، شعرا اور ادبا کا ذکر ہے۔
چھٹے باب میں ان شعرا کا ذکر کیا گیا ہے جو دربارِ شاہجہانی یا صدیقی سے متعلق نہ تھے اپنے ذاتی
شوق سے شعر و ادب کی خدمت میں مصروف تھے۔ فرانسیسی نسل کے بھوپالی شعرا کا بھی ذکر ہے بھوپال سے
متعلق چند مشاہیر مثلاً ظہیر دہلوی، مشاکل دہلوی، اسلم جیراجپوری، ذاکر حسین ثاقب، عبدالغفور شہباز
وغیرہ کی خدمات کا مختصر تعارف ہے۔ یہ دورِ سوم کی نثری تصانیف کا تذکرہ و تبصرہ صد ۲۴۹ سے صد ۲۶۱
صفحات پر محیط ہے۔ ساتویں باب میں دورِ چہارم ۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۶ء تک کی تخلیقات کا ذکر ہے
اس باب میں ذیل کے مشاہیر کا بھوپال سے تعلق اور خدمات کا ذکر ہے۔
، حامدی شوق قدوائی نیاز — سید کلب احمد مانی جائسی — مضطر خیرآبادی
حصۂ نثر بے حد معلومات افزا ہے۔ اس دور کے اخبارات اور رسائل پر بھی نظر ڈالی ہے[2]
آٹھواں باب دورِ پنجم ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۹ء تک کے شعری اور نثری تخلیقات پر محیط ہے اس
عہد کے شاعر اور نثر نگاروں کا تعارف و تخلیقات کا تبصرہ ہے۔ اخبارات و رسائل کے علاوہ
علمی و ادبی اداروں کا تعارف بھی شامل ہے جن مشاہیر کا تعلق بھوپال سے رہا ہے ان کی خدمات اور تحقیق
پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

---

[1] "اُردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" سلیم حامد رضوی صد ۱۳۷
[2] ایضاً صد ۳۱۷

۱۔ سر راس مسعود ۲۔ ڈاکٹر علامہ اقبال ۳۔ علامہ سید سلیمان ندوی ۴۔ جگر مرادآبادی
۵۔ حفیظ جالندھری ۶۔ جاں نثار اختر ۷۔ گیان چند جین

سنہ ۱۹۵۶ء میں بھوپال کا انضمام ہوا۔ انضمام کے بعد سنہ ۱۹۵۶ء سے سنہ ۱۹۶۳ء تک کی شعری و نثری تخلیق کا بیان نویں باب میں ہے۔ زبان و بیان سلیس و دلکش ہے۔ تنقید میں عموماً محاسن پر زیادہ توجہ کی ہے زبان کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ شعراء و ادباء کی قلمی کتابوں کا غائر نظر سے مطالعہ کیا گیا ہے ان شعراء اور ادبا کا ذکر کیا گیا ہے جن کی انفرادی صلاحیتوں اور کوششوں نے بھوپال کی علمی و ادبی زندگی پر اپنے نقوش چھوڑے ہیں ۱۵۰ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ماخذات کی فہرست اس طرح ہے۔

۱۔ تذکرہ شاعرات اردو محمد جمیل ۴۔ گلشن بے خار شیفتہ
۲۔ تذکرہ شعرائے اردو فیلن ترجمہ مولوی کریم الدین ۵۔ حیات العلماء عبدالباقی سہسوانی
۳۔ کاملانِ رام پور احمد علی خاں شوق ۶۔ بہارِ سخن بابو شیام سندر لال

زیرِ نظر کتاب اردو ادب میں گرانقدر سرمایہ ہے۔ ادب میں ایک اضافہ ہے۔ فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے ہر ممکن کوشش و ذریعہ سے مواد فراہم کیا ہے۔ فراہم شدہ مواد کو خوش اسلوبی، سلیقگی اور مناسب ترتیب کے ساتھ سائنٹفک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ریاستِ ٹونک اور اردو شاعری

مختار شمیم

مختار شمیم کی کتاب "ریاستِ ٹونک اور اردو شاعری" پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ مصنف کے مطابق

"میں نے مقالہ کا عنوان "ریاستِ ٹونک اور اردو شاعری" رکھا ہے نثری خدمت کا سرسری ذکر صرف دوسرے باب میں ضمنی طور پر کر دیا گیا ہے چونکہ کسی مختصر مقالہ میں نظم و نثر دونوں کے ساتھ انصاف کرنا تقریباً ناممکن تھا اس لیے موضوع کو بالخصوص شاعری تک محدود رکھنا زیادہ مناسب معلوم ہوا۔"[1]

---

[1] ریاستِ ٹونک اور اردو شاعری مختار شمیم ص ۹ دیباچہ

پہلا باب ریاست ٹونک کی تاریخ ہے اس میں مختلف نوابوں کے عہد کی تاریخ اور ریاست میں ہونے والے اہم کارہائے نمایاں کا تذکرہ ہے۔

دوسرا باب ریاست کے تہذیبی اور علمی ماحول سے بحث کرتا ہے اس ذیل میں جغرافیائی اثرات مذہبی اثرات چند اہم معاشرتی پہلو، مکتب اور مدرسے، تصانیف اور ان کے مصنفین، کتب خانے اخبارات و رسائل، ادبی انجمنیں اور مشاعرے، فن خوشنویسی امرائے ریاست کی سرپرستی اور مشاہیر کا ریاست سے تعلق مومنؔ اور ٹونک، غالب اور دربار ٹونک پر تفصیل سے مواد پیش کیا گیا ہے۔

تیسرا باب ٹونک میں اردو شاعری کی ابتداء سے ادبی سرگرمیوں، رجحانات اور خصوصیات شعری پر مدلل تبصرہ ہے۔ ریاست کے شعراء میں نظر محمد گویاؔ، مجھی ناراض آرزوؔ، محمد علی خاں رونقؔ وغیرہ کے کلام پر تبصرہ ہے۔

چوتھا باب ٹونک میں اردو شاعری کا فروغ، پس منظر، شعری رجحانات اور خصوصیات کے ساتھ خلیقؔ، اسدؔ لکھنوی، ظہیرؔ دہلوی، مضطرؔ خیر آبادی، کیفؔ، عاشقؔ، خیالؔ اور نظرؔ کے کلام اور فنی نقطۂ نظر سے تبصرہ کرتا ہے۔

پانچواں باب ٹونک میں جدید رجحانات کے پیش نظر پس منظر کی روشنی میں ریاست کے مختلف شعراء پر رد، نوی تحریک کے اثرات، ترقی پسند تحریک کے اثرات، آزادی کے بعد شعری رجحانات اور دور جدید کے چند قابل ذکر شعراء پر تبصرہ ہے۔

یہ مقالہ علاقائی رجحان کا نمائندہ ہے ذیل کے اقتباس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ "جس طرح ادبی خدمات کے سلسلے میں حیدر آباد، رام پور اور بھوپال وغیرہ کا ذکر کیا جاتا ہے اسی طرح ریاست ٹونک کی ادبی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔" [1]

اس مقالہ میں اسدؔ لکھنوی، ظہیرؔ دہلوی اور مضطرؔ خیر آبادی وغیرہ کا تذکرہ موضوع سے انصاف نہیں کرتا۔ کیونکہ گردش لیل و نہار کے اثر سے یہ شعراء اس سرزمین پر آئے۔ علاقائی ادب میں ان تجاب کا شمار ہونا چاہیے۔

---

[1] ریاست ٹونک در اردو شاعری مختار شمیم ص ۱۵۵

بہار میں اُردو نثر کا ارتقاء

سنہ ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک

مظفر اقبال

مظفر اقبال کا تحقیقی مقالہ "بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک" سرزمین بہار سے وابستہ مصنفین و نثر نگاروں کی تاریخ ہے۔ مصنف نے باب اول میں تمہید کے زیر عنوان

ا ۔ حصے میں بہار میں اردو زبان کے آغاز کا جائزہ لیا ہے۔

ب ۔ میں ہندوستان میں اردو نثر اور اس کے مختلف اسالیب کے ارتقاء پر ۱۹۱۴ء تک کچھ کا سرسری جائزہ ہے

ج ۔ میں بہار میں اردو نثر کے ارتقاء کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

باب دوم میں مختلف مذہبی تحریکات کے زیر اثر بہار میں اردو نثر کی ترقی اور ان تحریکوں سے وابستہ مصنفین کے اسالیب اور کارہائے نمایاں کو اجاگر کیا ہے۔ تحریک وہابیہ، تحریک تبلیغ عیسائیت تحریک آریہ سماج، تحریک احمدیہ قادیان وغیرہ کے زیر اثر اردو نثر کے فروغ کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے۔

باب سوم میں اردو صحافت اور دیگر نثری تحریروں مثلاً تاریخ، تذکرہ، سیرت، سوانح، آپ بیتی سفرنامہ، طب، قانون، جغرافیہ، سائنس اور فلسفہ وغیرہ موضوعات کے متعلق تفصیلی بحث ہے۔

باب چہارم میں بہار کی ادبی نثر یعنی داستان، تمثیل، ناول، ڈرامہ، اور تنقید کے ارتقاء کی تفصیلات کا بیان ہے باب پنجم میں بہار میں ادبی و لسانی تحقیقات خصوصاً لغت، تاریخ ادب اور لسانیات کے ارتقاء پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ مقالہ کتابی شکل میں علاقائی رجحان کی نمائندگی کرتا ہے لیکن بہار کے علاوہ ہندوستان کی اردو نثر کا جائزہ، غیر ضروری حصہ ہے مصنف کے بیان سے واضح ہے کہ

"یوں تو زیر نظر مقالہ میں صرف بہار کی اُردو نثر کے ارتقاء کی تاریخ مرتب کی گئی ہے لیکن پس منظر کے طور پر پورے ملک کی اردو نثر اور اس کے اسالیب کے ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاکہ دو ادب کی تاریخ کے اس گمشدہ باب کی صحیح قدر و قیمت متعین ہو سکے۔" [1]

اس بیان کی روشنی میں مصنف کی نیک نیتی کا اندازہ ہو جاتا ہے اس کتاب سے بہار کی علاقائی

---

[1] بہار میں اردو نثر کا ارتقاء مظفر اقبال صہ دیباچہ

، درار دو ادب کی ادبی تاریخ کی ترتیب میں مدد لی جا سکتی ہے علاقائی تاریخ میں شمار کردہ کتابوں میں ایک ہے۔

بمبئی میں اُردو ۱۹۸۰ء

ڈاکٹر میمونہ دلوی

اردو زبان کے ارتقاء اور تدوین میں ہندوستان کے مختلف علاقوں نے حصہ لیا۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقاء کے کئی مراکز اور نظریات ہیں۔ مختلف علاقوں میں اردو زبان و ادب کا جو کام ہوا ہے اس کی ترتیب و تدوین کے بغیر زبان کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ ان مختلف کڑیوں کو جوڑ کر ایک سلسلہ اور ربط قائم کیا جا سکتا ہے۔

اس ذیل میں ہمارے یہاں قابل قدر کوششیں ہوئی ہیں۔ مثلاً

۱۔ پنجاب میں اردو	۲۔ دکن میں اردو	۳۔ بنگال میں اردو
۴۔ بہار میں اردو	۵۔ سندھ میں اردو	۶۔ سخنوران گجرات

مختلف شہروں کے ادب کی تاریخ بھی مرتب کی گئی ہے۔ مثلاً

۱۔ گورکھپور کا اردو ادب	۲۔ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ
۳۔ کامٹی کا اردو ادب	۴۔ ناگپور کا اردو ادب
۵۔ برہان پور کا اردو ادب	۶۔ حیدرآباد کا اردو ادب
۷۔ اورنگ آباد کا اردو ادب	۸۔ بمبئی میں اردو

مختلف خصوصیات اور نظریات کی بنا پر اردو کے دبستان بھی قائم کیے گئے ہیں۔

۱۔ دبستانِ دہلی	۲۔ لکھنؤ کا دبستان	۳۔ رو ادبی اسکول

آگرہ اور دکن کے دبستانوں کی خصوصیت پر مزید تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ "بمبئی میں اردو علاقائی ادب کی تاریخ" یہ ڈاکٹر میمونہ عبدالستار دلوی کا تحقیقی مقالہ ہے موصوفہ کو اس پر بمبئی یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی گئی ہے۔ مقالہ اس موضوع پر اولین کاوش ہے زیر نظر مقالہ پیش لفظ چھ ابواب، کتابیات اور اشاریہ پر مشتمل ہے اور ۴۳۲ صفحات پر محیط ہے۔

پیش لفظ میں مقالہ نگار نے شبلی، نیاز، نذیر احمد، مولوی عبدالحق نے بمبئی کی تعریف میں جو اشعار اور کلمات کہے ہیں ان کا ذکر کیا ہے۔ بمبئی کے اردو ادب کے بارے میں
"مولوی عبدالحق، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، ضیاالدین برنی، رئیس احمد جعفری، سجاد مرزا مولانا امداد صابری، عتیق احمد صدیقی، ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کی کاوشوں کا ذکر کیا ہے۔" [1]

مقالہ نگار کا یہ دعویٰ نہیں کہ
"اردو زبان نے بمبئی کی سرزمین پر جنم لیا۔" [2]

شہروں میں اردو زبان و ادب اپنی ارتقائی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اسی زمانے میں بمبئی میں بھی زبان و ادب کے لیے کام ہو رہا تھا۔ [3]

مگر قدیم ترین سراغ جو مصنفہ کو مل سکا وہ ابراہیم فقیہ کی تصانیف ہیں۔ بہرحال بمبئی میں اردو ادب کے سلسلے میں جو کچھ علمی و ادبی کام ہوا اس کو مقالہ نگار نے یکجا طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مواد کی فراہمی، ترتیب، تہذیب کے سلسلے میں حتی الامکان کوشش کی ہے۔ سائنٹفک انداز اختیار کیا ہے۔ کئی گمنام شعراء نثار، تصانیف اور اخبارات کا پہلی مرتبہ تذکرہ کیا گیا ہے۔

بمبئی کے سیاسی، سماجی، اور معاشرتی تاریخ پر مقدمہ میں روشنی ڈالتے ہوئے موصوفہ نے لکھا ہے کہ
"عربوں کا پہلا قافلہ بمبئی سے قریب تھانہ کے مقام پر ۱۵ھ میں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں وارد ہوا۔" [4]

بمبئی کے سیاسی، سماجی، اور معاشی تاریخ والے باب میں بھی اس نکتہ پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ اور نہ کوئی ثبوت دیا ہے۔ اپنے رہنما ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور دیگر بزرگوں سید نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر عالی جعفری شہاب مالیر کوٹلوی، شاہد علی خان، اور ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کے شکریہ پر پیش لفظ ختم ہو جاتا ہے۔

پہلے باب میں بمبئی کی سیاسی اور سماجی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ بمبئی کی وجہ تسمیہ بتائی ہے بعد میں سیاسی تاریخ آبادی اور اردو کے چند سرپرست خاندانوں کا ذکر ہے۔ وجہ تسمیہ بمبئی میں مختلف اردو، فارسی، انگریزی حوالوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی لسانی توجیہہ کی ہے۔

"ممبئی کی ابتدائی ام جو دولبی یعنی صوت Labial nasal ہے۔ دولبی بندشی صوت

---

[1] [2] [3] مقدمہ "بمبئی میں اردو" صفحہ ۲

[4] مقدمہ "بمبئی میں اردو" صفحہ ۵

"Bi-Labial stop" "ب میں بدل گئی۔ اور اس طرح یہ نام بمبئی بن گیا۔" [1]

ہند مسلم اور برٹش دور میں بمبئی کی سیاسی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے بمبئی کی آبادی کے بیان میں واضح شہادتوں کی عدم موجودگی میں واضح طور پر نہیں لکھا جا سکتا تھا۔ کون یہاں کے قدیم باشندے تھے۔ بعد میں خوجہ، میمن، بوہرہ اور کوکنی مسلمانوں کا ذکر ہے۔

اردو کے سرپرست خاندانوں میں مقبہ خاندان، روگھے خاندان، کشکلیے خاندان، تنگیکر خاندان، قور خاندان، جینکر خاندان، مہایم خاندان، طیب جی خاندان کا ذکر کیا ہے۔

مقبہ خاندان کے منشی محمد ابراہیم مقبہ، بمبئی کے ورسوا کیڈٹ اسکول کے کلکر سٹ کی تصانیف ور زندگی کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ طیب جی کی علم دوستی، معارف پروری اور علمی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اس خاندان کے بزرگ اور ممتاز افراد بدرالدین طیب جی، زہرہ بیگم، عطیہ بیگم، محمد علی اصغر علی فیضی وغیرہ کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔

باب دوم کے دو حصے ہیں۔ دور اول ۱۷۹۳ء سے ۱۸۵۷ء تک دوسرے دور کے زمانے کا تعین نہیں کیا ہے۔ اسے بھی ۱۸۵۷ء تک محدود رکھا ہے دور اول کے شعراء اور نثر نگار اس طرح ہیں۔

شعرائے دور اول

۱۔ برقی	۲۔ قاسم مہری	۳۔ مولوی یوسف مرگھے
۴۔ فقیہہ	۵۔ نصرت	۶۔ فاطمہ
۷۔ سلیمی	۸۔ احمد	۹۔ سپاہی
۱۰۔ تقی مہری	۱۱۔ جمیل	۱۲۔ قنبر
۱۳۔ بینوا	۱۴۔ قاسم	۱۵۔ خلیق
۱۶۔ شرف	۱۷۔ نزاکت	۱۸۔ تبسم ۱۹۔ دلکش ۲۰۔ حجاب

نثر نگار دور اول

۱۔ برقی ۲۔ ابراہیم مقبہ ۳۔ منشی نظام الدین ۴۔ شیخ صالح محمد عثمانی ۵۔ یوسف مرگھے
۶۔ طیب جی بھائی میاں ۷۔ اشرف ۸۔ غلام علی مہری ۹۔ منشی غلام محمد ۱۰۔ غلام حسین مہری
۱۱۔ شہاب الدین مہری ۱۲۔ محمد اسمٰعیل کوکنی ۱۳۔ بابو صاحب قنبر

---

[1] مقدمہ بمبئی میں اردو ص ۵
ایضاً ص ۱۳ ص ۱۲

دوسرے دور کے نثر نگار

۱۔ ملا عمر ۲۔ ثابت ۳۔ مدرس ۴۔ حافظ ۵۔ غلام محمد ۶۔ محمد اسماعیل مصطولے

۷۔ عبدالغنی مصطولے ۸۔ محمد علی دلری ۹۔ ابو محمد عبدالحق ۱۰۔ ابو محمد عبدالعزیز ۱۱۔ محمد اسمٰعیل مہرس

۱۲۔ احسن عقبہ ۱۳۔ یوسف

دوسرے دور کے شعراء

۱۔ شیخ محمد عقبہ	۲۔ رونق	۳۔ نجمی	۴۔ اخلاص
۵۔ افسر	۶۔ یوسف	۷۔ عشق	۸۔ نجیب
۹۔ سمندر	۱۰۔ سکندر	۱۱۔ فرحت	۱۲۔ ثابت
۱۳۔ طپش	۱۴۔ فدا	۱۵۔ حمیدہ	۱۶۔ سحر
۱۷۔ نظامی	۱۸۔ احسن	۱۹۔ سردار	۲۰۔ آرزو
۲۱۔ وفا	۲۲۔ واقد	۲۳۔ برق	۲۴۔ ذبیح
۲۵۔ تجمل	۲۶۔ ہدف	۲۷۔ ممتاز	۲۸۔ ناطق
۲۹۔ سائل	۳۰۔ شریر	۳۱۔ الفرد	۳۲۔ احمد
۳۳۔ تارک	۳۴۔ بیکس	۳۵۔ ناظر	۳۶۔ سالک
۳۷۔ شاغل	۳۸۔ تسکین	۳۹۔ محمود	۴۰۔ اخلاص
۴۱۔ کوثر	۴۲۔ افضول	۴۳۔ مراد	۴۴۔ کلام
۴۵۔ بے تاب	۴۶۔ اثر	۴۷۔ عاشق	۴۸۔ طالب
۴۹۔ محمود	۵۰۔ جوہر	۵۱۔ غالب	۵۲۔ صابر
۵۳۔ فروغ	۵۴۔ ذبیح	۵۵۔ طیب	۵۶۔ متین
۵۷۔ شمس	۵۸۔ فرخ	۵۹۔ رسا	۶۰۔ ہلال
۶۱۔ عطا	۶۲۔ مبلغ	۶۳۔ فہیم	۶۴۔ سعید
۶۵۔ رفعت	۶۶۔ ذائق	۶۷۔ جلیل	۶۸۔ یوسف
۶۹۔ خلیق	۷۰۔ لطف		

عموماً شعراء کے حالات اور ان کے کلام پر تبصرہ مختصر ہے شاعر اور نثر نگار کی زبان کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ صد ۸۳ پر وفا کی تاریخ وفات کے پہلے مصرعے

غلط "چو رفت قاضی یوسف بسوئے مہر عدم "

صحیح "وفائے زار رقم کرد سال آن زبگا "

صحیح "وفائے زار رقم کرد سال آن یکا " (صحیح)

(پہلے مصرعہ) میں مہر زائد ہے اور آخری مصرعے میں "یکا" پر مرکز لگا کر "بگا" بنا دیا ہے۔
مقالہ نگار نے شعراء، ور نثر نگاروں کی تخلیقات، مخطوطات کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کے کتابت کے فرق اور انداز کو بھی دھیان میں رکھا ہے۔ ۱؎

سید عبدالفتح حبشی کا بیان نستہ اور مختصر ہے بعض بیانات، ایک دو سطر پر مشتمل ہے۔ دور اول، پر تبصرہ جامع اور مانع ہے اس میں نظم اور نثر کی اقسام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔
دور دوم کے شعراء کے کلام کا انتخاب کافی ہے۔ البتہ نثر نگاروں کی تخلیقات میں تبصرہ اور اقتباسات کی کمی کھٹکتی ہے اس میں بتلایا ہے کہ بمبئی کی ادبی دنیا نے سرسید کی تحریک کے اثرات کو کس حد تک قبول کیا۔

"بمبئی کی ادبی دنیا نے مذکورہ بالا تمام اثرات کو کم وبیش قبول کیا۔ مختلف شاعروں اور نثر نگاروں نے اپنی تخلیقات میں ان بدلتے ہوئے رجحانات کو جگہ دی۔ شاعری میں مذہبی مجلسوں، مثنویوں اور قصیدوں کے علاوہ غزل کا میدان پہلے سے زیادہ وسیع ہو گیا۔ نظم نگاری پر خاص توجہ دی گئی۔ سنی عقائد رکھنے والے مسلمان شاعروں نے مرثیے کی طرف اب تک کوئی توجہ نہ دی تھی۔ پہلے دور میں صرف غلام علی آہی کے یہاں ایک مرثیہ دستیاب ہوتا ہے لیکن اس دور میں کئی بوہرہ شاعروں کے مرثیوں کے مجموعے دستیاب ہوتے ہیں ان شاعروں کے یہ مرثیے صاف اور ستھری اردو کے علاوہ ان کی مادری زبان گجراتی اور زبان گجری میں بھی ملتے ہیں علاوہ ان لوگوں نے پوربی زبان میں بھی چند مرثیے قلم بند کیے ہیں۔" ۲؎
بتلایا ہے کہ "اردو کے نثری ادب میں جو تبدیلیاں ہندوستان میں ہوئیں ان کو بمبئی کے نثر نگاروں نے بھی قبول کیا اور اپنے اپنے طور پر نئی راہیں ڈھونڈیں۔" ۳؎

۱؎ بمبئی میں اردو صد ۲۲۹-۲۲۸ ۲؎ "بمبئی میں اردو" ڈاکٹر میمونہ دلوی صد ۲۴۲

تیسرا باب صحافت کا ہے اس میں بمبئی کی اردو صحافت اخبارات ورسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بمبئی کے سب سے قدیم دستیاب اخبار "کشف الاخبار" کے بارے میں لکھا ہے کہ اس اخبار سے اقتباسات نقل کیے ہیں سلطان الاخبار سے امیر مینائی کے انتقال پر قطعات اور منظومات نقل کیے ہیں۔ [1]

دکن ریویو کے بارے میں مختصر لکھا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ اوائل ۱۹۰۶ء میں نظم واکر نامہ کے سلسلے میں مولوی ظفر علی خاں ریاست حیدرآباد سے بدر کر دیے گئے جنوری ۱۹۰۶ء میں محفوظ علی بدایونی کے پاس شمالی ہند چلے گئے اور دکن ریویو بند ہو گیا۔ وہاں سے سات ماہ بعد مولانا [2] اور محفوظ علی نے بمبئی میں ایم اے بشیر اینڈ کو کے نام سے دوکان کھولی۔ مگر کاروبار میں نقصان ہوا۔ پھر دکن ریویو کا سلسلۂ جدید شمارہ ۱ ٹائمز آف انڈیا بلڈنگ سے نکلنا شروع ہوا۔ جنوری، فروری ۱۹۰۷ء کے پرچے بمبئی میں تیار ہوئے۔ مولانا حیدرآباد چلے گئے۔ ۱۹۰۷ء کے مارچ کا پرچہ حیدرآباد سے نکلا۔ بمبئی کی اردو صحافت کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ آخر میں اخبارات کے گوشوارے میں بتلایا ہے کہ وہ کہاں محفوظ ہیں۔

بمبئی کے اردو مطابع کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں بمبئی کے کریمی پریس نے دکن میں وہی خدمات انجام دیں جو شمالی ہند میں نول کشور انجام دے رہا تھا۔ اس پریس نے اردو کی قدیم تصانیف شائع کیں۔ بمبئی کے مطابع کی اشاعتی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ "بمبئی کے ان قدیم مطابع نے اردو ادب کی جو سب سے بڑی خدمت انجام دی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو کی قدیم دکنی اور گجراتی تصانیف کو زیور طبع سے آراستہ کر کے ہمیشہ کے لیے زندہ رکھا۔ چنانچہ یہاں سے قدیم تصانیف مثلاً گجرات کے بارہ قصوں کا مجموعہ "چندر بدن مہیار" "من لگن" "پنچھی" "قصہ سیف الملک و بدیع الجمال، یوسف زلیخا، اور کئی اساتذہ کے دواوین، وغیرہ شائع کیے۔ مختلف موضوعات پر مشتمل انتخابی کلام مثلاً منتخب مراثی، غزلیں، مثنویاں وغیرہ کا مجموعہ شائع کرنے کے علاوہ مختلف شعراء کے منتخب کلام کے مجموعے "چمن بے نظیر" "گلدستۂ بے نظیر" "چمنستان بے لیظ، گلشن ہند وغیرہ کے نام سے شائع کیے۔ اور اس طرح کئی شاعروں کا نام محفوظ کر کے ہم تک پہنچا دیا ہے۔

---

[1] "بمبئی میں اردو" ڈاکٹر میمونہ دلوی صفحہ ۲۹۵

[2] مولانا ظفر علی خاں

بمبئی کے یہ پریس متعدد شعراء مصنفین اور مترجمین کو حق محنت ادا کر کے کئی کتابوں کو بڑے اہتمام سے شائع کرواتے تھے۔" [1]

بمبئی کی علمی و ادبی تحریکوں پر مفید اور معلومات افزا معلومات فراہم کی گئی ہے اور آنے والے محقق کے لیے راہیں ہموار کر دی ہیں قدیم شاعروں کا حال لکھتے ہوئے موصوفہ نے حوالہ نہیں دیا کہ کس کتاب سے وہ مواد اخذ کیا گیا ہے حضرت مخدوم مہائمی کے عرس کے موقع پر جو گلدستے شائع ہوتے تھے ان کا ذکر اور انتخاب ضروری تھا۔ وہ نسخے اس وقت نجیب اشرف صاحب کی لائبریری میں تھے۔

انجمن ضیاء الاسلام اور اسلام کلب کا ذکر کیا ہے مگر ان کے قیام کی تاریخ نہیں بتلائی سب سے پہلی انجمن جو بمبئی میں قائم ہوئی وہ انجمن اسلام تھی۔ جس کی تاسیس ۱۸ اپریل ۱۸۷۶ء کو رکھی گئی۔ موصوفہ نے ۱۸۷۵ء لکھا ہے [2]

گلدستوں، رسالوں اور کلام کے انتخابی مجموعات پر سیر حاصل بحث کی ہے مختلف تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

اردو ڈراموں پر حسب ذیل عنوانات کے تحت مواد پیش کیا ہے۔

اردو ڈرامے کا آغاز۔ بمبئی کے تھیٹر اور ڈرامے۔ بمبئی کے تھیٹروں میں اردو ڈرامے۔ اردو ڈرامہ نویس

اردو ڈرامہ پر کافی کام ہو چکا ہے مگر ڈرامہ کے کسی مورخ اور نقاد اس مفید اور مختصر معلومات کا حوالہ نہیں ضروری ہے۔ باب ہشتم لوک گیت پر ہے اس میں مختلف قسم کے گیت ان کی سماجی اہمیت ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس صنف پر موصوفہ کی مستقل تصنیف ہے آخر میں اشاریہ ہے۔ مجموعی طور پر "بمبئی میں اردو" علاقائی ادب کی تاریخ میں ایک مفید اضافہ ہے مقالہ نگار نے ہر ممکن کوشش سے مواد فراہم کیا سلیقہ اور سائنٹفک طریقہ پر ترتیب و تدوین کی تخلیقات کی علمی و ادبی اور لسانی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے شعراء کے کلام پر تبصرہ کیا ہے مکاتیب و اداروں کی تاریخ لکھی گلدستوں، رسالوں اور اخبارات کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی۔ اس طرح زیر نظر کتاب علم و ادب کے ہر گوشے پر محیط ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے مصنفہ اس کا دوسرا ایڈیشن تیار کرے اور اس میں مفید اضافے کرے ابھی تک اس موضوع پر کسی نے قلم اٹھانے کی ہمت نہیں کی ہے۔

---

[1] "بمبئی میں اردو" ڈاکٹر میمونہ دلوی صفحہ ۳۱۴ تا صفحہ ۳۵۱

[2] ایضاً صفحہ ۲۴۱

سخنورانِ گجرات

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی سنہ ۱۹۸۱ء

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی صاحب ایک ممتاز ادیب اور نقاد ہیں۔ آپ زبان و ادب کے نامور خدمت گزار ہیں۔ موصوف اسماعیل یوسف کالج بمبئی میں اردو کے پروفیسر تھے۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ۱۹۴۷ء میں قیام کے بعد آپ اس کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ انجمن نے آگے نوائے ادب کے بھی مدیر منتخب ہوئے ان کی ادارت میں یہ پرچہ بڑی آب و تاب سے نکلتا رہا۔ اس کے مضامین علمی مرتبہ کے حامل تھے۔ وہ مضامین دستاویزی حیثیت رکھتے تھے۔ مقابلۃً اس رسالے کی حیثیت خوب تھی اردو رسائل، جرائد میں یہ بات پہلی مرتبہ انہوں نے شروع کی۔ بڑی جانفشانی سے کام کرتے تھے۔

گجرات کے ادب پر وہ زبردست Authority ہیں۔ ولی کو گجراتی اور احمد آبادی ثابت کرنے میں انھوں نے صدہا ماخذ" اردو دستاویزات کا مطالعہ کیا۔ اور اپنے مدلل دلائل اندرونی اور بیرونی شہادتوں پر مشتمل ولی گجراتی کی شکل میں پیش کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن پہلے سے بہتر تھا

ان کی حسب ذیل تخلیقات ہیں

۱۔ ولی گجراتی ۲۔ رسالہ نور المعرفت ۳۔ اردو غزل خسرو سے ولی تک

۴۔ اردو ایسرا ۵۔ میاں داد خاں سیاح ۶۔ سخنورانِ گجرات

جب تک وہ انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ رہے انجمن کا نام بلند اور رسالے کا معیار علمی رہا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اپنے وطن سورت چلے گئے۔ سنہ ۱۹۶۶ء میں نجیب اشرف ندوی ڈائرکٹر انجمن اسلام کی وفات کے بعد دوبارہ ان کو ڈائرکٹر شپ پیش کی گئی اور وہ سنہ ۱۹۷۰ء تک اس کے ڈائرکٹر رہے۔ ۷۱ء کے [illegible] ماہ کی جصوت [illegible] تو انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ پھر وہ مستقل طور پر سورت میں مقیم تھے۔ وہیں ۱۹۹۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔

سخنورانِ گجرات: گجرات میں اردو ادب کے آغاز و ارتقاء پر ایک گراں مایہ تصنیف ہے۔ یہ دراصل ان کا مقالہ ہے۔ پی ایچ ڈی کی ترقی یافتہ شکل ہے اور سنہ ۱۹۶۲ء

میں مکمل کر لیا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں ان کو ڈگری ملی۔ اور نظر ثانی کے بعد یہ مسودہ کی شکل میں محفوظ رہا۔ بار بار اس کی اصلاح ہوتی رہی اور ۱۹۸۱ء میں ترقی اردو دہلی نے اسے شائع کیا۔ اس بابت ان کی زبان سے سنیئے وہ کہتے ہیں "مقالے نے نئی شکل اختیار کر لی ہے۔" [1]

یہ مقالہ انتہائی محنت اور جانفشانی سے لکھا گیا ہے تمام ذرائع سے مواد شامل کیا گیا ہے اس کو ترتیب دیا گیا۔ اس پر تبصرہ لکھا گیا اور مختلف سائنٹفک طریقہ پر ابواب کے تحت اس کی تبویب کی گئی۔ کیونکہ اس موضوع پر اس سے پہلے کوئی تصنیف نہ تھی۔ مضامین ہی لکھے گئے اس لیے مقالہ نگار کو سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ ولی کی وطنیت اس کے کلام کی صحت اور سن وفات کے بارے میں مقالہ نگار نے بڑی عرق ریزی سے کام کیا ہے۔

پورا مقالہ ان کی سخت جانفشانی، انتھک جدوجہد، عمیق مطالعہ، دیدہ ریزی، نکتہ سنجی دقیقہ رسی کی دین تبحر علمی کا شاہد ہے یہ مقالہ اردو ادب میں گرانقدر اضافہ ہے اور گنتی کے ان چند مقالوں میں سے ہے جن کو صحیح معنوں میں مقالہ کہا جا سکتا ہے۔ سطور ذیل میں سخنوران گجرات کا تعارف و تذکرہ اور تبصرہ پیش کیا جا رہا ہے محتویات کی فہرست یہ ہے۔

اظہار ممنونیت، دیباچہ، مقدمہ

پہلا باب۔ سیاسی و سماجی پس منظر ۱۴۰۰ء تا ۱۷۰۶ء تذکرہ، نمونۂ کلام تبصرہ دیباچہ میں لکھتے ہیں "سخنوران گجرات" گجرات کے سلسلۂ اردو ادب کی ایک کڑی ہے بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا گیا ہے۔ اور بس! اس کی افادیت کا اندازہ قاری کے زاویۂ نظر پر موقوف ہے اس حقیر ادبی کاوش کو پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اللہ کرے کسی قابل ثابت ہو۔"

سخنوران گجرات مقدمہ چار ابواب اور تین ضمیموں پر مشتمل ہے مقدمہ میں گجرات کی مختصر تاریخ تاجروں اور صوفیوں کے ورود، اردو زبان سے متعلق مختلف نظریوں، اردو کی ادبی تشکیل اور اردو کے قدیم نام گجری پر اظہار خیال کیا گیا ہے پہلا باب صوفیا کے مستقل کارناموں سے تعلق رکھتا ہے اس باب کا زمانہ ۱۴۵۰ء تا ۱۶۵۰ء متعین کیا گیا ہے۔

دوسرا باب ۱۶۵۰ء تا ۱۷۵۰ء ولی اور اس کے ہمعصروں سے تعلق رکھتا ہے۔

---

[1] سخنوران گجرات ـ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی صفحہ ۱۳

تیسرا باب ۱۷۵۰ء تا ۱۸۵۰ء دورِ عزلت قرار دیا گیا۔ اور
چوتھا باب ۱۸۵۰ء تا ۱۹۵۰ء کے شعراء سے متعلق ہے۔ آخر میں تین ضمیمے اضافہ کیے گئے ہیں
پہلا ضمیمہ، گجرات کے چند معزز خانوادوں کے حالات اور ان کی علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی خدمات پر مشتمل ہے۔
دوسرے ضمیمہ میں گجرات کے چند دستیاب نثری کارناموں سے متعلق معلومات ہے۔ تیسرے ضمیمہ میں
مختلف کتابوں سے لیے گئے شعراء کی فہرستیں درج کی گئی ہیں [1]

اظہارِ ممنونیت میں انھوں نے اپنے والدین، اساتذہ، احباب، کالج کے رفیق کار اساتذہ
اور بعض فنونِ لطیفہ کے ماہرِ فن اساتذہ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ان کی ذہنی تربیت میں ان کے علاوہ
ذیل کے بزرگوں کا بھی حصہ ہے۔

بابائے اردو عبدالحق ـ قاضی عبدالودود ـ محمد شہاب مالیر کوٹلوی
ان کے احباب میں قابلِ ذکر احباب یہ ہیں۔
ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ ـ نورالحسن ہاشمیؔ، سید عطاء اللہ نورالدین ـ عبدالقادر نورالدین
عبدالرزاق قریشی ـ عبدالقادر سروری

دیباچہ میں گجرات کی مختصر تاریخ اور اردو ادب کا تعارف ہے۔ مقدمہ میں گجرات کی تاریخ اور
گجری لفظ اردو کے آغاز و ارتقاء کی مفصل تاریخ ہے احمد آباد کی قدیم ترین مسجد کا کتبہ بھی دیا ہے۔
ستلایا ہے کہ گجرات کی اردو دراصل گجری کا وہ ابتدائی روپ ہے جو سب سے پہلے گجرات کی رائج الوقت
زبان کی بنیاد پر ہندوستانی اور غیر ہندوستانی عناصر کے امتزاج اور تحلیل کی ابتدا ہے [2]

پہلا باب سیاسی و سماجی پس منظر ہے اس میں گجرات کے سلاطین کی تاریخ بیان کی ہے ان
کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے اس پس منظر کے بعد اس باب میں شیخ احمد کھٹوؒ، شیخ باجنؒ، قاضی
محمود دریائی، شاہ علی جیوگام دھنی، بابا شاہ حسینی اور شیخ محمد چشتی کا ذکر ہے۔ اور ان کے حالات
بیان کیے ہیں۔ کلام پر تبصرہ ہے اس باب کا تبصرہ عالمانہ ہے زبان و بیان کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں
دوسرے باب میں حصہ سیاسی و سماجی پس منظر کے بعد ولیؔ، شرفؔ، رضیؔ، تمناؔ، فراقیؔ،

---

[1] سخنورانِ گجرات ظہیر الدین مدنی ص ۱۱-۱۳
[2] ایضاً ص ۲۳

راقمؔ، احمدؔ، احمدیؔ، صباؔئی احمد آبادی کا تذکرہ ہے۔ ۵۵

تیسرے باب میں عنصرِ سیاسی و سماجی پس منظر کے بعد ۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۰ء تک ذیل کے شعراء کا ذکر ہے۔

عزلتؔ، تجردؔ، فاضلؔ، اقدسؔ، رحمتؔ، محمودؔ، بہادرؔ، حامدؔ، بخششؔ، کریمؔ، محبتؔ، نصیرؔ، صاحبؔ، ضاحکؔ، لطیفؔ، کمترؔ، عباسؔ، شرفؔ، لطیف اللہ ان کے کلام پر تبصرہ ہے۔ چوتھے باب میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء کے عہد پر سیاسی و سماجی پس منظر کے بعد ذیل کے شعراء کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔

اخلاقؔ، اختؔر، تررؔ، افضلؔ، بہادرؔ، خاموشؔ، سیاحؔ، مجنوؔ، سرورؔ، شیفتہؔ، صادقؔ، شفقؔ، رشیدؔ، علویؔ، غنیؔ، فاضلؔ، غنیؔ، فرحتؔ، قطبؔ، کاملؔ، منظورؔ، جمالؔ، ذکاؔ، رحمتؔ، سعیدؔ، شوکتؔ، سیداؔ، شادؔ، قطبؔ، منشی منیرؔ، منعمؔ، سید عظیم الدین منادیؔ اور حسرتؔ وغیرہ کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ بھڑوچ، بڑودہ اور احمد آباد کے شعراء کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔

سعید صاحب نے ص ۲۵۶ سے ص ۳۳۴ تک گجرات کے چند خاندان کے متعلق مفید اور کارآمد معلومات جمع کر دی ہے۔ یہ وہ تمام خاندان ہیں جن کا گجرات کی تاریخ، علم و ادب اور تہذیب سے خاص تعلق ہے۔ ان کے نام ملاحظہ کیجیے:

(۱) سورت، حضرت سید جمال الدین المعروف بہ خواجہ داتا صاحب کا خاندان
(۲) عیدروسی خاندان (۳) رفاعی خاندان (۴) مولانا غلام محمد کا خاندان
(۵) حضرت سید عبدالوہاب بخاری کا خاندان (۶) قادری خاندان (۷) مدنی خاندان
(۸) سورت کا نواب خاندان (۹) نواب بیہ کا خاندان (۱۰) میر غلام بابا کا خاندان (۱۱) بخشی خاندان
(۱۲) سچین کا نواب خاندان (۱۳) ملا خاندان عمدۃ التجار (۱۴) شیخ حسن خاندان عمدۃ التجار
(۱۵) شیخ چلپی عمدۃ التجار (۱۶) مرزا عاشور بیگ کا خاندان (۱۷) بامکھ خاندان
(۱۸) حکیم میر عیسیٰ کا خاندان (۱۹) حکیم شیخ محمد میاں کا خاندان (۲۰) منشی لطف اللہ فریدی کا خاندان (۲۱) سید نثار حسین شعبی بہاری کا خاندان (۲۲) سورتی جمعدار کا خاندان بھڑوچ۔ بڑودہ

---

۵۵ سخنورانِ گجرات ظہیر الدین مدنی ص ۸۴

(۲۳) شیرازی خاندان (۲۴) بھروچ کا نواب خاندان (۲۵) بڑودہ کا نواب خاندان
(۲۶) میر صاحب کا خاندان۔ احمد آباد و کھمبایت (۲۷) حضرت قطب عالم بخاری کا خاندان
(۲۸) حضرت قاضی دریائی کا خاندان (۲۹) علامہ شاہ وجیہ الدین گجراتی کا خاندان (۳۰) باوا پیارا قادری کا خاندان (۳۱) کھمبایت کا نواب خاندان۔ سوراشٹر (۳۲) جوناگڑھ کا نواب خاندان
(۳۳) مانگرول کا نواب خاندان (۳۴)

دوسرا ضمیمہ گجرات میں اردو نثر ہے اس میں عزلت کے دیوان کے دیباچہ کو بطور خاص نقل کیا ہے۔

تیسرے ضمیمے میں آئینۂ تاریخ مؤلفہ سید عبدالرحمٰن عرف عیدو صاحب عیدروس کے شعراء کی فہرست دی ہے۔

زیر نظر گراں مایہ تصنیف کے ہر باب کی تکنیک ہے سیاسی و سماجی پس منظر، مختصر شعراء و ادبا کے حالات، کلام، مجموعی تبصرہ، کلام پر تبصرہ، زبان و بیان کی خوبیاں، علاقائی ادب کی جتنی تاریخیں ہیں ان میں سب سے بہتر تصنیف ہے۔ یہ ان کی زندگی کا حاصل ہے وہ اردو ادب میں اسے اعلیٰ مقام حاصل ہونا چاہیے۔ چونکہ یہ موضوع اور تکنیک پر یہ اولین تصنیف ہے۔

تاریخ ادبیات گورکھپور سنہ ۱۹۸۲ء

ڈاکٹر سلام سندیلوی

یہ علاقائی تاریخ ڈاکٹر سلام سندیلوی کی کاوشوں کا ثمرہ ہے جو ۲۷۲ صفحات پر محیط ہے پیش لفظ میں مصنف نے لکھا ہے کہ

"گورکھپور کی ادبی تاریخ اب تک کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ البتہ چند مضامین لکھے گئے ہیں میں نے پہلی بار اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس میں خاص طور سے قدیم ادیبوں کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں تاکہ ان کا نام اور کلام محفوظ رہ سکے۔ لیکن دور حاضر کے قلمکاروں

کو بھی اس میں ضمنی طور پر جگہ دی گئی ہے۔" [1]

اس تاریخ میں پانچ ابواب قائم کیے گئے ہیں۔

باب (۱): گورکھپور کا تاریخی پس منظر، ہندوؤں کے دور میں گورکھپور کو ویدک عہد میں آریاؤں کی تہذیب کا مرکز بتایا ہے۔ ڈاکٹر راج بلی پانڈے کی کتاب "گورکھپور جن پد" کے حوالے سے گوتم بدھ کے عہد کا ثبوت دیا ہے مہابھارت میں گورکھپور کا ذکر موجود ہے۔ ان حوالوں سے گورکھپور کو قدیم شہر ثابت کیا ہے۔

مہایہ سوامی ۴۶۸ ؟ قبل مسیح اور ۲۹۵ء میں گپت حکومت کا علاقہ بتایا ہے مسلمانوں کے دور میں (گورکھپور سلطنت دہلی کے عہد میں) مسلمانوں کے اثرات گورکھپور سے غزنوی کے عہد سے ثابت کیا ہے۔

سید سالار مسعود غازی کو غزنوی کا سپہ سالار بتایا ہے۔

محمد غوری ۱۱۹۹ء کے عہد میں گورکھپور شامل ہے قطب الدین ایبک کا قبضہ بھی گورکھپور پر ثابت کیا ہے تغلق خاندان سے عہد مغلیہ تک کسی بھی ذریعے سے گورکھپور کی اہمیت کو واضح کیا ہے گورکھپور کا ایک نام معظم آباد بھی بتایا ہے۔ گورکھپور نوابین اودھ کے عہد میں بھی نوابوں اور ان کے متعلقین کو گورکھپور تک لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

گورکھپور انگریزوں کے دور میں بھی ۱۸۵۷ء میں منگل پانڈے کے کارنامے کو سراہتے ہوئے گورکھپور کا سپوت لکھا ہے۔ اس ضمن میں آزادی کی تمام تحریکوں میں گورکھپور کا حصہ ثابت کیا ہے۔

باب دوم: گورکھپور کی فارسی نظم و نثر میں غلام خاندان، تغلق خاندان، سید خاندان اور لودھی خاندان کے عہد میں گورکھپور میں فارسی نظم و نثر کا رواج بتایا ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں منشی دھوم رام گزرے کا ذکر کیا ہے۔ عبدالرحیم دہریا، شاہ مراد عالم صاحب، مولوی احمد علی رضوی رہانوی، منشی محمد حسن عجیب گورکھپوری، وکیل احمد فارغ، مولوی عبداللہ صاحب، مولوی محمد صفدر حسین خاں، ناظر گورکھپوری، منشی اوما پرشاد، منشی سنت لال عنبر، مولوی حکیم سید علی محمد صاحب جگر، اصغر شیخ پوری ثم گورکھپوری، حکیم محسن گورکھپوری، اور محمد عبدالرحمٰن صاحب واحدی پر اس باب کو ختم کیا ہے۔

باب سوم: گورکھپور کی اردو شاعری کی شروعات اس طرح کی ہے۔

گورکھپور کو اس بات کا فخر ہے کہ یہاں کی سرزمین سے باہر کے مشاہیر ادب اور شاعر یہاں آئے۔

---

[1] تاریخ ادبیات گورکھپور — سلام سندیلوی صفحہ ۱۰

شعرا وادبا اس سرزمین سے وابستہ رہے ۔ درج ذیل ان کا ذکر ہے ۔

۱۔ مولوی نذیر احمد ۲۔ اکبر الٰہ آبادی ۳۔ منشی پریم چند ۴۔ گاندھی جی

۵۔ مولانا حسرت موہانی ۶۔ جگر مراد آبادی ۷۔ اصغر گونڈوی وغیرہ

اصغر گونڈوی کی پیدائش گورکھپور بتائی ہے گورکھپور میں ذوق اور غالب کے عہد سے شاعری کی جا رہی تھی۔ گورکھپور کے سید احمد علی شاہ کو غالب کا ہم عصر بتایا ہے تفصیل کے ساتھ نمونۂ کلام بھی دیا ہے ۔ شاہ مراد عالم گورکھپوری، حسرت گورکھپوری، منشی سنت لال، عنبر گورکھپوری، محشر گورکھپوری، حکیم برہم، اختر گورکھپوری، وسیم خیرآبادی، ریاض خیرآبادی، محسن گورکھپوری، وقیصر گورکھپوری، صغیر گورکھپوری، محشر گورکھپوری، صوفی حاجی سید چراغ علی، شاہ طیش گورکھپوری، رنگ بہادر لال جگر گورکھپوری، ذاکر گورکھپوری بدر گورکھپوری، مولوی سبحان اللہ صاحب، فخر و عظیم گورکھپوری ۔ ولایت گورکھپوری، سہیل گورکھپوری، قمر گورکھپوری، حیرت گورکھپوری، اظہر گورکھپوری، اختر گورکھپوری، سعد گورکھپوری، شیدا گورکھپوری، ناہید گورکھپوری، خوشتر گورکھپوری، احسن گورکھپوری، فانی گورکھپوری، نسیم گورکھپوری، ناچیز گورکھپوری، طالب گورکھپوری، بہتر گورکھپوری، نظر، ریحان، سید محمد حنیف ۔ ہاشمی، قتیل، عمر، پریم، سید کاظم علی سبز پوش، شائق، رام داس دریا، بسم، احقر، گوہر، جگر، عارف یتیمی، فراق، مولوی ساجد علی اخگر ۔ اقبال صدیقی، نور، ڈاکٹر احمر، شمس انا ذوق، مہدی، مسلم انصاری، عمر قریشی، شمیم صدیقی، بی اے بہادر محشر، عمر گردش، مذکورہ شعرا میں ایسے شعرا بھی شامل ہیں۔ جو گردش لیل و نہار کے سبب وقتی طور پر گورکھپور میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے کلام اور حالات بھی درج کیے گئے ہیں۔

باب چہارم: گورکھپور کی اردو نثر نگاری میں مہدی افادی سے شروعات کی ہے۔ ان کے اسلوب کی تاریخ تعریف میں مولانا شبلی نعمانی کے خط کا حوالہ دیا ہے۔ عبد الماجد دریا بادی کا بھی حوالہ دیا ہے ۔

علامہ محمد احسان اللہ عباسی، حکیم برہم، ریاض خیرآبادی، مولوی محمد سبحان اللہ عظیم گورکھپوری عبد المجید حیرت گورکھپوری، قاضی تلمذ حسین، سید کامل حسین، مولانا آزاد سبحانی، ربانی، مولوی ثناء اللہ مولوی محمد عبد المجید، قاضی محمد عظیم الحق، عبد الاحد، معظم آبادی، شیخ خادم حسین افسر، عبد القیوم ذوق گورکھپوری، نواب زادہ علی کبیر، مجنوں گورکھپوری، شیخ جگو، محمد مسلم عباسی صاحب، ڈاکٹر احمر گورکھپوری

سیدؔ محمد رشید دردؔ گورکھپوری، محمد حامد علی وغیرہ

مندرجۂ بالا شعراء اور نثر نگاروں میں ایسے اصحاب بھی شامل ہیں جن کے ادبی کارنامے منظرِ عام پر نہیں ہیں محض لکھنے کے ذوق و شوق کی بنیاد پر انھیں شامل کیا ہے۔

بابِ پنجم: گورکھپور کی اردو صحافت میں گورکھپور کی اردو صحافت پر بزرگوں کے قول کو سند بنا کر ایک یہودی کا اردو ماہنامہ جاری کرنے کا ذکر کر لیا ہے۔

ریاض خیرآبادی کے ریاض الاخبار ۱۸۷۱ء سے باقاعدہ صحافت کی ابتداء بتائی گئی ہے۔ اس میں مختلف قسم کی خبروں کے علاوہ شعر و شاعری پر بھی مواد ہوتا تھا۔[۱]

فتنہ عطرِ فتنہ " ریاض خیرآبادی کا دوسرا اخبار تھا جو طنز و مزاح کا پرچہ تھا۔ "مصلح کل"، ریاض خیرآبادی کا ایک روزنامہ تھا۔ اس کے سرورق پر مصلح کل لکھا تھا۔ اس میں کون سا مواد ہوا کرتا تھا اس پر روشنی نہیں ڈالی۔

"لطیف الاخبار" توی پور سے عبداللطیف خاں نکالتے تھے۔ جس میں خبریں اور دیگر موضوعات ہوتے تھے پیسک۔ ماہنامہ محلہ توی پور مولوی عبداللطیف خاں صاحب کا تھا۔

گلچیں: ماہنامہ عسکری اور تسنیم خیرآبادی، اس میں شعراء کا کلام شائع ہوتا تھا۔ الوقت ایک ہفتہ وار اخبار تھا۔ جو گورکھپور سے جاری ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر جناب سعیدؔ زار تھے اس میں ملکی اور غیر ملکی خبریں شائع ہوتی تھیں۔

مشرق: حکیم لٹلہ برہم لکھوپالی اس کے مدیر اعلیٰ تھے۔ اس میں سیاسی خبریں و سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے

لسان العصر: ماہنامہ کے مدیر قاضی تلمذ حسین کو بتایا ہے اس طرح اور دوسرے اخباروں، ماہناموں میں تحفۂ خوشترؔ، بسرت سنگھ خوشترؔ، روحانیت، مولانا امداد سبحانی دعوت، مولانا آزاد سبحانی۔ موثر کا ماسٹر عبدالرحیم سیتاپوری، عزیزؔ، میاں صاحب جارج، صلح قاضی محمد علی اخترؔ، ایوان، مجنوں گورکھپوری، شاہکار، حکیم عارف بلگرامی، کونین، عزیزالرحمن اصلاحی، محنت سنگھ، موتی لال مختارؔ، زندگی، عبدالرشید ندرؔ، نشیمن محمد علی کبیر خاں، بیدارؔ، وصی حیدر صاحب، بیباشی، فضل الرحمٰن عثمانی، صبح وطن، مقبول احمد، اشتراک، جناب ایم کوٹھیادی، نبض، ملک زادہ منظور احمد، تابور، عاصمؔ کونڈوی

---

[۱] تاریخ ادبیات گورکھپور سلام سندیلوی ص ۲۳۲

پیکر اور مبارک اللہ کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ اس تاریخ میں گورکھپور کی تاریخی پس منظر میں بغیر مستند حوالوں کے کئی بیان مبالغہ کا شکار ہیں۔ مثلاً سپہ سالار مسعود غازی نے بنارس سے جونپور تک کا علاقہ فتح کیا۔ گورکھپور اس میں کیسے شامل ہو۔ محمد غوری نے قنوج فتح کیا۔ گورکھپور اس میں کیسے شامل ہوا۔ ص۲

۲۔ گورکھپور انگریزوں کے عہد میں عنوان قائم کر کے ۱۸۵۷ء جنگ آزادی کے آغاز میں گورکھپور کے منگل پانڈے کا ذکر کیا ہے۔ مختلف تحریکوں میں گورکھپور کے لوگوں کا حصہ بتا کر کوئی حوالہ نہیں پیش کیا۔

۳۔ تمام مسلم حکمراں خاندانوں کے دور میں فارسی نثر و نظم کا رواج گورکھپور میں بتایا۔ لیکن ان عہدوں میں کسی فارسی شاعر یا انشاء پرداز کا نام پیش نہیں کیا صرف اورنگ زیب کے عہد میں فارسی کے استاد ... مادھو رام گدارے کا ذکر ہے۔ اس کا بھی کوئی حوالہ نہیں ہے ص۵

۴۔ عبدالرحیم دہریہ کس عہد میں گورکھپور میں ہوا؟ کوئی ذکر نہیں ہے!

۵۔ ۱۸۵۷ء منگل پانڈے کا ذکر پہلے اور ۱۸۲۶ء کے حالات بعد میں درج ہیں۔

بہت سے شعراء اور نثر نگاروں میں بھی زمانی ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔ مثلاً ص۳ پر نذیر احمد، اکبر الہ آبادی، پریم چند کے بعد گاندھی جی کا ذکر کیا ہے۔

۶۔ وسیم خیرآبادی اور ریاض خیرآبادی کو زمانی ہجرت کی بنیاد پر گورکھپور کی ادب میں تذکرہ ہے

۷۔ شعراء کے باب میں مجنوں گورکھپوری کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جبکہ انھوں نے شروع ہی سے شاعری کی طرف توجہ دی ہے۔

۸۔ صحافت کے باب میں بزرگوں کے قول کو سند مان کر ایک یہودی کے ماہنامہ جاری کرنے کا ذکر بھی تحقیق کے خلاف ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی اغلاط ہیں لیکن پیش لفظ میں مصنف کا بیان غلطیوں کی تلافی کر دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اس کتاب میں بہت کافی تاریخی و تحقیقی غلطیاں ہوں گی۔ لیکن گورکھپور کے بزرگ ادیبوں نے جو حالات بتائے ہیں میں نے ان پر اعتبار کیا ہے۔ رسائل و کتب سے جو مواد مل سکا اس کو شامل کر لیا۔ مگر تاریخ ادبیات گورکھپور کا یہ نقش اوّل ہے جو ناقص ہو سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرے بعد کوئی دوسرا محقق اس موضوع پر قلم اٹھائے گا تو صحیح ادبی تاریخ مرتب کرے گا کیونکہ وہ نقش ثانی

ہوگا صد

اس بیان کے آخری جملے سے ثابت ہے کہ ڈاکٹر سلام سندیلوی کو خود اپنی تحقیق پر یقین کامل نہیں۔ وہ ۱۹۸۰ء تک بحیثیت ایک محقق کے اردو ادب میں مشہور ہوچکے تھے۔ تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر قلم اٹھا چکے تھے۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ، اردو رباعیات پر مقالہ پیش کرکے پی ایچ ڈی کر چکے تھے "اردو شاعری میں منظر نگاری" پر ڈی لٹ بھی ہوگئے تھے۔ غالب کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ پیش کرکے اپنی اہمیت منوا چکے تھے۔ اس لحاظ سے "تاریخ ادبیات گورکھپور" ان کا صرف ایک کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔

مغربی بنگال کے اُردو شعراء

مشتاق احمد

زیر نظر کتاب مؤلفہ مشتاق احمد کی "مغربی بنگال کے اردو شعراء" علاقائی ادبی مطالعہ پیش کرتی ہے اس محدود مطالعہ سے بڑی تاریخوں کی تیاری میں مواد ملتا ہے۔

اس کتاب میں بیسویں صدی کے شعراء کے تذکرے ہیں۔ مؤلف نے مواد کی فراہمی میں بڑی کاوش کی ہے خط و کتابت کے ذریعے شعراء کے حالات اور کلام حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب میں ۱۲۵ شعراء پر تذکرہ اور نمونۂ کلام ہے تقریباً ۱۰۰ شعراء کی تصاویر اور پیدائش کے لحاظ سے ان کی ترتیب ہے۔ جن کی تاریخ پیدائش نہیں ملی انہیں حروف تہجی سے ترتیب دیا ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے مواد جمع کرنے میں بہت محنت کی ہے لیکن ان کے سامنے پیش کشی کا کوئی معیار نہ تھا۔ لفت بھگوا ... اور بعض کے انتہائی مختصر میں ضروری اور غیر ضروری مواد میں فرق نہیں کیا گیا ہے ساوک لکھنوی ورضا س علی بے خود کے بیان مل... باتیں پائی جاتی ہیں۔ کہیں شعراء کے خاکے لکھنے کی کوشش کی ہے مگر چونکہ مؤلف کو خاکہ نگاری پر دسترس حاصل نہیں ہے اس لیے بیان کہیں دلچسپ اور کہیں سپاٹ ہوگیا ہے۔ اس کتاب میں ایسے شعراء کا تذکرہ ہے جو بنگال کے علاوہ دوسرے صوبوں میں پیدا ہوئے مگر یہاں آکر بس گئے بعض ایسے ہیں جن کا بنگال سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسے جوان سندیلوی وغیرہ۔

نمونۂ کلام مختصر ہے اس سے نقاد کو شعراء کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کی مدد نہیں ملتی۔ خاص بات یہ ہے کہ شعراء کے متعلق سنین محفوظ ہو گئے ہیں۔ جن سے آئندہ تاریخ نگاری میں کام لیا جا سکتا ہے۔
یہ کتاب ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ مختصر یہ کہ مؤلف کی کاوش اور محنت قابلِ تعریف ہے۔

بدایوں کے چند ادباء و شعراء

مبشر علی صدیقی

مبشر علی صدیقی کی زیرِ نظر تالیف "بدایوں کے چند شعراء" ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ مؤلف کی کاوش قابلِ تعریف ہے اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر انصار اللہ نظر کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے مؤلف کے بیان کے مطابق اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

"۱۔ پہلا حصہ اشخاص سے متعلق ہے ۲۔ دوسرا حصہ تصانیف سے متعلق ہے
۳۔ تیسرے حصے میں رسائل پر تبصرہ ہے۔" [1]

مؤلف کے پہلے حصے کی معروف شخصیات فانی، علی حاتم، قمر بدایونی، لکشمی نرائن جوہر، ابر احسنی گنوری، آلِ احمد سرور، اور دلاور فگار ہیں مذکورہ شخصیات کی علمی و ادبی شخصیت پر مصنف نے بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ اکثر شعراء کے کلام کا انتخابی نمونہ بھی پیش کیا ہے لیکن اس کے علاوہ بدایوں کے غیر معروف شعراء و ادباء پر بھی ایک اچھا مضمون شامل کر دیا ہے جس سے بدایوں کے غیر معروف شعراء کا تعارف ہو جاتا ہے۔ "دوسرے حصے میں حسب ذیل مضامین شامل ہیں۔" [2]

"دیوانِ غالب کے بدایوں ایڈیشن" "ڈاکٹر سید محمود کا مقدمۂ دیوانِ غالب" "ثاقب بدایونی کا قصیدہ" "چراغ مدعا" اور "طنزیات و مقالات" (سید محفوظ علی بدایونی) مؤلفہ محمد محی الدین۔ ان مضامین پر مؤلف نے موضوع کے مطابق بہتر تبصرہ کیا ہے۔ جس سے مؤلف کے قوتِ فیصلہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

تیسرے حصے میں رسائل پر تبصرہ ملتا ہے۔ جس کے زیرِ عنوان اخبارات بھی آ گئے ہیں اس حصہ میں

---

[1] بدایوں کے چند ادباء و شعراء — مبشر علی صدیقی — ص۱۹
[2] وضاحتی کتابیات جلد اول — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مظفر حنفی — ص۱۵۶

ماہنامہ "چمن" "بدایوں منظور" بدایوں پر بڑی اعتبار سے تبصرہ کیا ہے۔ اور منتخب اشعار شعرائے بدایوں پر بہت فکر انگیز اظہار ملتا ہے تیسرے حصے میں بدایوں کے اردو اخبارات، کتب خانوں اور مختلف اداروں پر عمدہ تبصرہ موجود ہے۔

مجموعی اعتبار سے یہ کتاب بدایوں کی تاریخ ادب اردو کا جائزہ لینے میں کافی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔۔

دکنی ہندو اور اُردُو

مولوی نصیر الدّین ہاشمی

مولوی نصیر الدین ہاشمی کی یہ تالیف ۱۹۵۶ء منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں علاقائی بنیاد پر دکن کے ہندو شعراء، نثر نگاروں اور ایڈیٹروں کا تذکرہ ہے حالاتِ زندگی کے ساتھ نمونۂ کلام بھی درج کیا گیا ہے جن ہندو شعراء، نثر نگاروں اور اخبار کے ایڈیٹروں نے زبان و ادب کی خدمت کی۔ یہ کتاب علاقائی اعتبار سے اس کی نمائندگی کرتی ہے۔

مؤلف نے دسویں صدی ہجری بمطابق سترہویں صدی عیسوی سے ۱۹۵۶ء تک کے تمام ہندو شعراء اور نثر نگاروں کا حال اور کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔

اس کتاب سے اردو کی ہمہ گیری اور مقبولیت کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے لیکن اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ اردو زبان صرف مسلمانوں کی ملکیت نہیں یہ برصغیر پاک و ہند میں ہر دور سے وابستہ رہی ہے مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود اس کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے یہاں اس بات کی تشریح بھی ضروری ہے کہ اس کتاب میں دکن سے مراد موجودہ خطۂ آندھرا پردیش نہیں ہے۔ بلکہ دکن سے مراد وہ خطّہ ہے جو اس سے قبل ریاست حیدرآباد دکھلاتا تھا۔

کامٹی کی ادبی تاریخ

شرف الدین ساحل

شرف الدین ساحل کی تصنیف "کامٹی کی ادبی تاریخ" موضوع کے اعتبار سے مقامی شعرا اور ادبا کے حالات اور کلام کا انتخابی نمونہ ہے۔ مقامی شعرا اور ادبا کی قابل ذکر سرگرمیوں، ادبی اور علمی خدمات کے پیشِ نظر تاریخ کی ترتیب میں احتیاط برتی ہے۔

بزم غالب کامٹی کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی اس تاریخ کو علاقائی تاریخوں کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے "ودربھ میں اردو" "برار میں اردو" اسی مقصد کے تحت لکھی جا چکی ہیں۔ اس بنیاد پر شرف الدین ساحل کی "کامٹی کی ادبی تاریخ" تحقیقی اور تاریخی ادب کا علاقائی عکس ہے۔ کلام کے انتخاب میں علاقائی گونج کی شناخت موصوف کی شاعرانہ صلاحیت کا ایک اچھا ثبوت ہے۔

مشرقی بنگال میں اردو

پروفیسر سید اقبال عظیم

پروفیسر سید اقبال عظیم ڈھاکہ کی یہ تصنیف[1] محاسنِ صوری ومعنوی سے آراستہ "مشرقی بنگال میں اردو" ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے لائق مصنف نے محنت وجانفشانی سے مواد اکٹھا کیا ہے اور با قاعدہ چھان پھٹک کر سلیقہ سے سپردِ قلم کیا ہے۔

اس کتاب میں تنقیدی عنصر کم ہے مگر معلومات وافر ہے۔ کہیں کہیں ہلکے تنقیدی اشارے میں اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے زیرِ نظر کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ فسانۂ دوش ۲۔ فکرِ امروز ۳۔ فکرِ فردا

فسانۂ دوش سوانحی زیادہ اور تنقیدی کم ہے۔ اس میں ۲۰۰ دو سو سال کے ۲۴ مشاہیر اور ۱۳۲ اہلِ قلم کا ذکر ہے۔ اس میں منشی علی قلی خاں کا بیان ملتا ہے انہوں نے سنہ ۱۱۲۶ سنہ ۱۱۲۰ء

---

[1] وضاحتی کتابیات۔ مرتبین ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ مظفر حنفی جلد اول صفحہ ۴۲

میں معیذ لات نامی کتاب ترتیب دی تھی۔ اس میں مرحوم نے اکرام اللہ خان فوجدار رنگ پور اور محمد محسن علی خاں میر منشی، شہزادہ عظیم الشان کے خطوط جمع کیے تھے۔

دور اول کے فنکاروں میں شائق، منیغم، صبا، آشفتہ، اختر، نساخ، شمس، آزاد، طپش مشہور ہیں۔ سید محمد آزاد اور دلا بنج کے مشہور انشاء پرداز تھے۔ نساخ کی شہرت محتاج بیان نہیں ان کی شہرت، دہلی، لکھنؤ تک پھیل چکی تھی خواتین میں خجستہ اختر سہروردی، راحت آرا بیگم ورحمیفہ بانو ممتاز حیثیت کی مالک ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ ذکرِ امروز کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان سب میں عصرِ رواں کے ۴۴ ادیب اور شاعروں کا مذکور ہے۔ رضا علی وحشت اردو کے صفِ اول کے شاعر اور نقاد ہیں۔ رشید ملتری، پروفیسر اشک، شرق، محمود بولانی، صادق القادری قابلِ ذکر ہیں۔ اس حصے میں حکیم حبیب الرحمٰن صاحب کی نامکمل تالیف "ثلاثہ غسالہ" سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حکیم صاحب اردو فارسی عربی کے جید عالم تھے۔ وہ ایک ضخیم تذکرہ ترتیب دے رہے تھے ان کے مسودے کا وزن تقریباً ایک من ہے۔ موت کے بے رحم ہاتھوں نے اس کام کو مکمل نہ ہونے دیا۔ کتاب کا تیسرا حصہ فکرِ فردا فکر انگیز باب ہے اس میں مشرقی پاکستان میں اردو کی ترویج و اشاعت کے مسائل سے بحث کی گئی ہے اور مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے۔ تمام امور کا تجزیہ کرکے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں چند ایسے اصحاب کو بھی شامل کر لیا ہے جو بنگال میں پیدا نہیں ہوئے مگر وہاں قیام پذیر رہے۔ اس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مصنف نے کہیں کہیں اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی تنقیدات کو تخریبی قرار دیا ہے۔ نساخ کو مردِ مجاہد پسند کیا ہے۔ ••

علاقائی تاریخیں ایک جائزہ

علاقائی رجحان کے پیشِ نظر مرتب تاریخوں میں "پنجاب میں اردو" پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود شیرانی کی تصنیف علاقائی نمائندگی کا تابندہ نمونہ ہے حالانکہ ہم نے اس کتاب کو لسانی تاریخوں میں شمار کیا ہے اس کا اصل سبب یہ ہے کہ یہ تاریخ خالص لسانی نظریہ کی حقیقت کو تاریخی دسائل کے ساتھ بیان کرتی ہے اور لسانی تحقیق کے طالب علموں کو دعوتِ فکر دیتی ہے اس کے علاوہ علاقائی نہج پر لکھی گئیں تمام تاریخیں کسی نظریہ کے پیشِ نظر نہیں لکھی گئیں۔ اور علاقائی داستانوں کے روپ میں تذکروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کچھ علاقائی شعراء کے کلام کا انتخاب اور دیار کی تحقیقات کا عکس دکھاتی ہیں۔ بعض تاریخیں مثلاً

"دبستان ادب حیدرآباد" "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء" "تذکرہ شعرائے اورنگ آباد" وغیرہ اپنے علاقوں کے ادباء و شعراء کی منظم تاریخ ہیں

اکثر تاریخیں جیسے "تاریخ ادبیات گورکھپور" "مدراس میں اردو" "بنگال میں اردو" وغیرہ اپنے علاقے کے شعراء و ادباء کے علاوہ ایسے شعراء و ادباء جو ان علاقوں میں کسی وجہ سے یا کسی اور غرض سے آئے انھیں بھی اپنی علاقائی تاریخوں میں شمار کرتے ہیں۔ ان علاقائی تاریخوں میں غیر معتبر حوالوں کی بہتات ہے دکن میں مسلمان خاندان کے عروج کے ساتھ یہ زبان بھی آگے بڑھی ظاہر ہے کہ ادبی تاریخ کی دنیا میں اب یہ تھیوری فرسودہ ہو چکی ہے۔

"علی گڑھ تاریخ ادب اردو" مرتبہ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اردو ادب کی تاریخ میں یہ پہلی کوشش تھی۔ جسے گرانقدر علمی و ادبی ادارہ نے شروع کیا تھا۔ اور امید کی جا سکتی تھی کہ اس سے اردو ادب کی ایک جامع تاریخ مرتب ہو سکے گی۔ لیکن کتاب کی تدوین، مطابقت اور تصحیح کے کام میں ڈھیلے پن اور سستی کی وجہ سے اس میں کئی جزوی غلطیاں در آئیں اور ایک طویل غلط نامے کے ساتھ اسے شائع کیا گیا۔ اس تاریخ سے اہل اردو نے بڑی امیدیں وابستہ کی تھیں۔ لیکن۔

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

"تاریخ ادب اردو" از جمیل جالبی

جمیل جالبی کی یہ تصنیف چار جلدوں پر مشتمل ہے اس کی دو جلدیں چھپ کر منظر عام پر آئی ہیں۔ ان ان کتابوں پر ہم نے تاریخ کی کتابوں کے ضمن میں تفصیلی بحث کی ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کی کتاب "تعارف تاریخ ادب اردو" ہر چند کہ مختصر ہے لیکن قابلِ قدر ہے پروفیسر نسیم قریشی کی کتاب "اردو ادب کی تاریخ" بہت مختصر ہے۔

ڈاکٹر انصار اللہ نظر کی "اقلیم ادب" ایک اچھی کاوش ہے اور اپنے موضوع سے حتی الوسع انصاف کرتی ہے اس کتاب میں ادبی تاریخی مواد کو چھان پھٹک کر پیش کیا گیا ہے۔

علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی تشکیل کے علاوہ ہمارے ادب میں ایک اجتماعی لیکن ناکامیاب کوشش رہی۔ ساری تاریخیں انفرادی کوششوں پر مبنی ہیں۔ ان کتابوں سے بہر حال ادب کی سمت رفتار کا پتہ تو چلتا ہے اور آئندہ ادب کی تشکیل کے تعین کی بات ذہن میں آتی ہے۔

(د) ہماری تدریسی تاریخیں، تنقیدی تبصرہ

تدریسی کتب تبصرے

۱۔ تاریخ ادب اردو — ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد — سنہ ۱۹۴۰ء

۲۔ اردو ادب کی تاریخ — ڈاکٹر نذیر احمد عباد اللہ — سنہ ۱۹۵ء

۳۔ اردو ادب کی تاریخ — نسیم قریشی — سنہ ۱۹۵۵ء

۴۔ اردو کی ادبی تاریخ — پروفیسر عبدالقادر سروری — سنہ ۱۹۵۶ء

۵۔ جائزۂ تاریخ ادب اردو — شرافت حسین مرزا — سنہ ۱۹۶۰ء

۶۔ اردو ادب کی تاریخ (نظم) — سید ابوالعاصم رضوی — سنہ ۱۹۷۵ء

۷۔ مختصر تاریخ ادب اردو — ڈاکٹر سید اعجاز حسین — سنہ ۱۹۶۲ء

۸۔ تعارف تاریخ ادب اردو — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — سنہ ۱۹۶۳ء

۹۔ تاریخ تعلیم ادب (بار دوم) — ڈاکٹر انصار اللہ نظر — سنہ ۱۹۸۳ء

۱۰۔ تدریسی تاریخوں کا جائزہ

۱۱۔ جدید تاریخ ادب اردو — عظیم الحق و امیر حسن نورانی
ادارہ اشاعت اردو دہلی ترمیم شدہ ایڈیشن اکتوبر سنہ ۱۹۶۶ء
اس کا ذکر نہیں ہے۔

ہماری تدریسی تاریخیں

تدریسی تاریخوں کے ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ تدریسی تاریخوں سے مراد درس و تدریس کی تاریخ نہیں ہے بلکہ دورانِ تعلیم مختلف معیار کے اعتبار سے جن لسانی و ادبی تاریخوں کو شاملِ نصاب کیا گیا ہے انہیں ہم تدریسی تاریخیں لکھ رہے ہیں۔

ہمارے ادب میں کچھ تاریخیں تحقیقی و ادبی کاوشوں کے پیشِ نظر لسانیات اور ادب کی مزید معلومات سے دلچسپی رکھنے والوں اور تحقیقی کام کرنے والے اصحاب کے لیے مکمل تاریخ کے روپ میں لکھی گئی ہیں۔ لسانی و ادبی نظم و نثر دونوں میں ہماری تاریخوں کی ابتدا آبِ حیات سے شروع ہوتی ہے۔ "آبِ حیات" کے بعد "خم خانۂ جاوید" اور "گلِ رعنا" کا نمبر آتا ہے لیکن نہیں اصولوں کی روشنی میں محققانِ ادب تاریخ کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے بعد شعر الہند، مرآۃ الشعراء اور سیر المصنفین کا شمار تاریخوں میں کیا جا سکتا ہے لیکن ان تاریخوں میں کئی خامیاں موجود ہونے کے سبب مکمل تاریخ کہنا اور تدریسی مقاصد کے لیے ان کا اندراج ناممکن ہے مرآۃ الشعراء جلد اول / دوم اور شعر الہند اردو کے نظم کے ادب پر زیادہ توجہ دیتی ہیں۔ سیر المصنفین صرف نثر نگاروں کا جائزہ دینے پر قدرت رکھتی ہے۔

اسی دہائی میں دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی کی دکن میں اردو کی شناخت علاقائی رجحان کے سلسلے سے پنجاب میں اردو جیسی نظریاتی تحقیق سامنے آئی۔ ان تصانیف کے بعد لسانی اور ادبی جائزہ کی تحقیق پر مبنی "تاریخ ادب اردو علی گڑھ" لیکن اپنی ان خامیوں کے عوض بے معیاری تحقیق کذب و اختراع کی نمائندہ بن گئی۔ ادھر لسانی ادب میں مسعود حسین خاں کی "مقدمہ تاریخ زبانِ اردو" اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کی "داستانِ زبانِ اردو" معرکۃ الآرا تصانیف نے تحقیق کی لاج رکھی لیکن ان تاریخوں کے علاوہ ہر ادب میں نصابی ضرورت کے پیشِ نظر مختصر و مفید معلومات کی مکمل تاریخ نگاری کا

کام بھی کیا جاتا ہے کیونکہ درس و تدریس کے دوران پڑھائی جانے والی تاریخ تقریباً لسانی، ادبی اور اصنافِ سخن کی مکمل تاریخ ہونا چاہیے۔ نصابی حیثیت میں نظم و نثر، اصناف کا مکمل جائزہ ہونا چاہیے۔ معیار کے مطابق ان چیزوں کی معلومات اہم ہے۔ ان مقاصد کے پیشِ نظر سکنڈری بورڈ، گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ طلبہ کے معیار کے مطابق درج ذیل تاریخوں کا شمار کیا جا سکتا ہے۔

۱۔	تاریخ ادب اردو	مرتبہ ادارۂ ادبیات اردو	سنہ ۱۹۴۰ء
۲۔	اردو ادب کی تاریخ	ڈاکٹر نذیر احمد و عباد اللہ	سنہ ۱۹۴۵ء
۳۔	اردو ادب کی تاریخ	نسیم قریشی	۱۹۵۵ء
۴۔	اردو ادب کی تاریخ	پروفیسر عبد القادر سروری	سنہ ۱۹۵۶ء
۵۔	جائزہ تاریخ ادب اردو	شرافت حسین مرزا	سنہ ۱۹۶۰ء
۶۔	مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	
۷۔	اردو کی ادبی تاریخ	پروفیسر عبد القادر سروری	سنہ ۱۹۵۶ء
۸۔	اردو ادب کی تاریخ حصہ اول نظم	سید ابو العاصم رضوی	سنہ ۱۹۷۵ء
۹۔	تاریخ اقلیم ادب	ڈاکٹر انصار اللہ نظر	
۱۰۔	تعارف تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	

ان تاریخوں کے علاوہ مختصر تاریخ ادب اردو، نسیم انہونوی۔ اور تاریخ ادب اردو، ورڈ کورٹ بھی کسی زمانے میں داخلِ نصاب رہی ہیں اس کے علاوہ رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو بھی داخلِ نصاب رہ چکی ہے لیکن مذکورہ پہلی دو تاریخیں اب نصابی تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہیں اور رام بابو سکسینہ کی تاریخ معیاری تعلیم کے لیے ذریعۂ تدریس کی ذمہ داری کو پورا کر سکتی ہے مگر تاریخ بھی کئی خامیوں اور طوالت کے سبب تدریسی حقائق سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔ فہرست میں شمار شدہ تاریخیں اور ان کے علاوہ زیادہ تر تاریخوں کی معلومات اور تحقیق کے اصل ماخذ آبِ حیات، گلِ رعنا اور شعر الہند ہیں۔ ہذا اب یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ تینوں تصانیف کے بیشتر بیانات متحسین جدید تحقیق کی رو سے غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ ان میں اکثر میں کتابت کی غلطیاں بھی ناقابلِ برداشت ہیں۔ ان ماخذ کے سہارے لکھی گئی تدریسی تاریخیں بیشتر تردیدی بیانات کا شکار ہیں۔

ان تدریسی تاریخوں میں شعرا و ادبا کی فنی خصوصیات اور خامیوں کا تذکرہ من و عن مصنف ۔ سوا ڈاکٹر سید اعجاز، شجاعت علی سندیلوی وغیرہ کے سب نے ماخذات کی ہو بہو نقل کی ہے اور خصوصیات اور خامیوں کے تعلق سے رائے دینے میں بھی آب حیات، نگار، عت اور شعر الہند کی تقلید کی ہے۔

کلام یا فن میں اسلوب کے ضمن میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا جس کے سبب طالب علم ان معلومات کی روشنی میں اعتماد سے کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔

آج کے نصابی تقاضوں کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے یہ تاریخیں نصابی ضرورت کو پورا کرنے کے بجائے ادھورا چھوڑ دیتی ہیں ان کی خامیوں اور خوبیوں کا اپنے "تدریسی تاریخوں کے تجزیے" میں کریں گے۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ ان تاریخوں میں بعض بے بنیاد بیانات ہیں جن کے کوئی حوالے درج نہیں کیے گئے ہیں اور تاریخی کتب میں حوالوں کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے لیکن ان کتابوں میں مستند حوالوں کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔ ان تاریخوں سے زبان کی تاریخ کے عہد بہ عہد کا تصور ممکن نہیں ہوتا۔ کس دور میں کن حرفوں کو کس عہد میں کس لفظ کو متروک کیا گیا۔ کس عہد میں ہندی تراکیب کا زور تھا۔ کس دور میں فارسی کا غلبہ تھا۔ کس زمانہ میں انگریزی ادب سے ہمارا ادب متاثر ہوا۔ کس تحریک نے ادب کو کس طرح متاثر کیا۔ اسلوب میں تبدیلیوں کے اسباب وقتی تقاضوں کے مطابق زبان و بیان سے خیال تک کن کن تبدیلیوں سے ادب کا خزانہ مالامال ہوا۔ ان سوالات کا خاطر خواہ جواب تدریسی تاریخیں نہیں دے سکتیں۔

آج کل ہندوستان کے مختلف بورڈوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل شدہ تاریخوں میں نسیم قریشی، شجاعت علی سندیلوی اور ڈاکٹر سید اعجاز حسین کی تاریخوں کو گرداناکیا جا سکتا ہے گرچہ خامیوں سے یہ تاریخیں بھی مبرا نہیں ہیں لیکن دوسری تاریخوں سے کم خامیوں کی حامل ہیں۔

تاریخ ادب اردو

مرتبہ: ادارہ ادبیات اردو[1]

تاریخ ادب اردو ۱۹۳۴ء کی ادارہ ادبیات اردو کی مرتبہ کردہ ایک مختصر سی درسی کتاب ہے۔ اس کتاب کے عمومی دیباچہ میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ۵ مارچ ۱۹۳۴ء کو لکھا کہ ادارہ کو دنیا کی مختلف زبانوں کی ادبی تاریخوں کی اشاعت کا فیصلہ کیا۔ اور یہ کام مختلف افراد کے سپرد کیا گیا:-

مولوی میر حسن	تاریخ ادب انگریزی
مولوی سید ابو الفضل	تاریخ ادب عربی
پروفیسر عبد القادر سروری	تاریخ ادب ہندی

اردو ادب کی تاریخ کا کام زور صاحب کے ذمہ تھا۔ اس وقت تک اردو میں چند ادبی تاریخیں لکھی جا چکی تھیں۔ ان مصروفیت کی وجہ سے کام کی تکمیل میں تاخیر ہو گئی۔

اس کتاب کی تالیف میں ڈاکٹر سکسینہ کی تاریخ ادب اردو کی مدد لی گئی ہے۔

زور صاحب نے لکھا ہے کہ:

"دوسری مطبوعہ تاریخوں اور تذکروں اور خود میرے مسودہ تاریخ ادب اردو کے مطالعے کے نتیجے بھی اس میں جگہ جگہ شامل ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی ترتیب بالکل تحقیقی اور سائنٹفک بنیاد پر کی گئی ہے۔"

۱۹۳۴ء میں اس کتاب کی ترتیب و اشاعت اس وقت درسی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کافی تھی اسی لئے تاریخ کی دوسری اشاعت ۱۹۴۱ء میں ہوئی۔ اس کتاب کے چار حصے ہیں پہلے حصے میں وہاں اردو کی تاریخ اور اردو ادب کا آغاز بیان کیا گیا ہے۔ اردو ادب کے ابتدائی دو دور بتلائے گئے ہیں۔

۱۔ مذہبی دور

۲۔ ادبی دور

مذہبی دور میں خواجہ بندہ نوازؒ، میراں جی شمس العشاقؒ، برہان الدین جانمؒ، امین الدین اعلیٰ، عبد اللہ شاہ، شاہ علی جیو گام دھنیؒ، خوب محمد چشتیؒ وغیرہ کی تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

ادبی دور کی تین فصلوں میں قطب شاہی، عادل شاہی اور مغلیہ دور میں بحث کی ہے اس دور میں گولکنڈہ، بیجاپور اور اورنگ آباد کے شعراء کا ذکر کیا ہے۔ قطب شاہی دور، فیروز، ملا خیالی، محمد قلی قطب شاہ

---

[1] تاریخ ادب اردو - ادارہ ادبیات اردو ۱۹۴۵ء مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد

ظل اللہ، عبداللہ قطب شاہ، قطبی، معینی، جنیدی، ابن نشاطی، میران یعقوب، طبعی، ابوالحسن تاناشاہ، امین الدین شاہ گل خان، اور ناثروں اور ان کی ادبی تخلیقات کا ذکر کیا ہے جا بجا بتلایا ہے کہ کون کون سی تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہو گئی ہیں۔ عادل شاہی دور کے ممتاز شعرا، آتشی، امین، دولت، ملک خوشنود، رستمی، ملا نصرتی، مرزا، شاہ ملک، سیوا، شاہ عبدالمومن مومن، میران ہاشمی اور شاہ محمد قادری کا بیان ہے جو مختصر اور معلومات افزا ہے۔

مغلوں کے عہد کے دکنی ادب میں محمد علی عاجز، ولی اللہ قادری، شیخ داود، شاہ حسین ذوقی، آمین، قاضی محمود بحری، محمد فیاض ویلوری، محمود بیگ، احمد گجراتی، عارف الدین عاجز، ابوطالب طالب، صباحی، شاہ میراں اللہ بحری، عراقی، فقیر اللہ فرہاد، محبوب عالم (شیخ جیون) وجدی اور ان کی منظومات کا ذکر اور تعارف ہے۔ ولی کے کلام پر بحث کی ہے۔

"ان کے اسلوب بیان میں سادگی اور صفائی کے ساتھ شوکت اور رفعت پائی جاتی ہے بعض وقت وہ فصاحت اور بلاغت کے اعلیٰ درجے تک پہنچ جاتے ہیں ان کا میلان طبع تصوف کی طرف تھا۔ ان کی شاعری اس زمانے کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ وہ اردو کے نصف درجن شعرا کے صف اول میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں اور اس لحاظ سے کہ انھوں نے دہلی کے شعراء کو اپنی ملکی زبان میں شعر گوئی کی ترغیب دی۔ ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے جن دنوں قدیم دکنی شاعروں کی دولت شعری سے دنیا آشنا نہ تھی۔ وہ بابائے ریختہ کے لقب سے ملقب تھے"۔ [1]

ولی کے معاصرین میں ہاشم علی، امامی، امین گجراتی، سید گجراتی، غلام گجراتی، قادر، تمیم احمد اشرف، معتبر خاں، سید محمد ولا اور سراج کا ذکر کیا ہے۔

ہاشم علی کو گجراتی بتلایا ہے۔ وہ برہان پور کے رہنے والے تھے۔ ان کا قلمی دیوان دیوان حسینی کے نام سے محفوظ ہے۔ اس کا ایک دیدہ زیب نسخہ دکن کے کالج پونہ کے خان بہادر عبدالقادر سرفراز کے کتب خانہ میں محفوظ ہے سلیمان ندوی نے اس پر ایک سیر حاصل تبصرہ نقوش سلیمانی میں لکھا ہے۔ اڈنبرا یونیورسٹی میں ان کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔

دوسرے حصہ میں دہلی میں اردو ادب کے ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے حاتم کے دور کا ذکر کیا ہے۔ مظہر، سودا اور [illegible] رنگ فغانی، مصحفی، انشاء اور نظیر کے دور کو ترقی کا دور کہا ہے۔ اس دور کے اہم شعراء کے کلام پر [illegible] ہے۔ نظم و نثر کی توسیع کے سلسلے میں مصحفی اور انشاء کے دور میں نثر کی ترقی مذکور ہے۔ انشاء

---

[1] تاریخ ادب اردو۔ ادارہ ادبیات اردو ص ۵۵

کی تخلیقات سے بحث کی ہے اردو نثر کی ترقی کے سلسلے میں تحسین، عطا محمد، ڈاکٹر گل کرسٹ، میر امن، مرزا علی لطف، سید بخش حیدری، بہادر علی حسینی، مظہر علی ولا، اکرام علی، امانت اللہ شیدا، بینی نارائن جہاں، للو لال، شاہ عبد القادر، مولوی اسماعیل، مفید ہند، خلیل اللہ خاں اشک، کی کاوشوں کا ذکر ہے۔

دیوان جہاں کو اردو شاعروں کا تذکرہ بتلایا ہے۔[1]

اس کی حیثیت ایک مختصر بیاض کی ہے۔

دکن میں اردو ادب کے احیاء کے سلسلے میں لکھا ہے کہ

"اٹھارویں صدی عیسوی کا آخری زمانہ اردو کی ہمہ گیری کے لئے بہت موافق ثابت ہوا۔ کیونکہ اس وقت نہ صرف دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں اردو نظم و نثر کی جو جو کوششیں کی گئیں۔ بلکہ عین اس زمانہ میں حیدرآباد میں بھی اردو ادب کی بھی سے قدر و منزلت اور سرپرستی شروع ہوئی"۔[2]

دکن کے اعلیٰ پائے کے شعراء کا ذکر کیا ہے ان میں تمنا، شفیق، شیر محمد خاں ایمان، ماہ لقا بائی چندا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جدید علوم و فنون کے سلسلے میں دکن کی خدمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

شعر و سخن کے مجموعوں اور تذکروں اور تاریخوں کے علاوہ اس عہد میں دکن میں جدید علوم و فنون کو اردو میں منتقل کرنے کی بھی کامیاب کوششیں کی گئیں۔ چنانچہ شمس الامراء نواب فخر الدین خاں ایک بڑے علم دوست امیر تھے جنہوں نے اپنے اطراف علماء کا ایک گروہ جمع کر لیا تھا۔ جو تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے چونکہ نواب صاحب کو علوم ہیئت اور ریاضیات سے خاص شغف تھا۔ اس لئے زیادہ تر ان ہی سے متعلق فرانسیسی اور انگریزی زبان سے ترجمے کرائے اور اپنے سنگی چھاپے خانے میں چھپوائے۔ ترجموں کے علاوہ خود نواب صاحب اور ان کے فرزندوں اور ان کے ساتھیوں نے کئی طبع زاد رسالے بھی لکھے تھے۔ ذاتی تحقیق اور تلاش کے لئے انھوں نے ایک رصد گاہ "جہاں نما" تعمیر کرائی تھی۔[3]

تیسرے حصے میں لکھنؤ اور دبستان کا روایتی بیان ہے ان دبستانوں کی اور ان کے شعراء کا ذکر ہے۔ جدید دور میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کے کارناموں سے بحث کی ہے۔ جدید دور کے شعراء کا بھی بیان ہے۔ اقبال کے ذکر پر یہ دور ختم ہو جاتا ہے۔

اجتماعی خدمات کا ذکر درج ذیل ہے۔

---

[1] تاریخ ادب اردو۔ ادارہ ادبیات اردو صفحہ ۹۰ [2] تاریخ ادب اردو۔ ادارہ ادبیات اردو صفحہ ۱۰۰-۱۰۱
[3] ،، ایضاً صفحہ ۹۷

۱۔ دارالترجمہ عثمانیہ ص۱۴۲

۲۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ ص۱۴۴

۳۔ انجمن ترقی اردو

۴۔ ہندوستانی اکیڈمی

۵۔ ادارہ ادبیات اردو

۶۔ اردو اکیڈمی جامعہ

اردو صحافت پر مختصر بیان ہے۔ آخر میں اشارہ یہ ہے۔

یہ تالیف ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۳ء تک دوبارہ طبع ہوئی۔ اس کے بعد اردو ادب میں جو جدید انکشافات اور تحقیقات ہوئیں جن مفروضات کو رد کر دیا گیا ان کا اس میں بیان نہیں ہے۔ اور اس کو تلاش بھی نہیں کرنا چاہیئے یہ درسی کتاب ہے اردو کے ابتدائی امتحانات سندی امتحانات اور بی اے تک کی سطح کے لیے مرتب کی گئی تھی۔ اس موضوع پر اس عہد میں اس سے زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی اس میں خامیاں ہیں۔ شعرا کے سنین میں اغلاط کتابوں کے اغلاط اور انتسابات ہیں مگر یہ سب ۱۹۲۹ء کی تحقیقات پر مبنی ہیں۔

کتاب جس مقصد کے لئے لکھی گئی اس کو پورا کرتی ہے۔ اپنے عہد کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوئی ہے۔ اب اس کی حیثیت ایک قدیم دستاویز کی ہے۔ کہ اس وقت ہماری معلومات کس مقام پر تھیں۔ اور محی الدین قادری زور کی تالیفات میں اس کا شمار کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ ادب اردو

ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر عباد اللہ

ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر عباد اللہ دونوں کی علمی جاں کاوش کے نتیجے میں "تاریخ ادب اردو" ۹۰۴ صفحات پر مشتمل ہے پوری کتاب انیس ابواب پر محیط ہے۔

"تاریخ و تنقید اردو زبان کا دیباچہ ہے۔ مؤلفین نے اس میں اردو زبان کی ابتدا اور اس کے خمیر سے بحث کی ہے۔ اور سید سلیمان ندوی کی طرح سندھ سے اردو کی ابتدا بتلایا ہے۔" ۱؎

"اردو کو لشکری زبان کہہ کر لاہور اور پنجاب مولد بتلایا ہے۔ لیکن اردو کو دکن کی مہمان زبان لکھتے ہیں" ۲؎

۱؎ تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر عباد اللہ ص۲ ۲؎ تاریخ ایضاً ص۲

"اور اردو کو اتحاد قومی یکجہتی کی علامت بتاتے ہیں، لکھنؤ کو آصف الدولہ کے عہد میں اردو کا مرکز بنایا ہے۔"[۱]

"فورٹ ولیم کالج کی خدمات کو سراہتے ہوئے ۱۸۵۷ء میں مزاج و ماحول کے مطابق سر سید احمد خاں، شبلی، ڈاکٹر نذیر احمد، محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی کو اردو نثر کے اچھے نثر نگار کہا ہے۔ غالب کی شاعری اور خط نویسی کو اردو زبان میں انقلاب کا نام دیا ہے۔"[۲]

اردو کی تدریج و ترقی میں فورٹ ولیم دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی، دارالمصنفین اعظم گڑھ کا ذکر کیا ہے۔

باب اول "اردو کا مقام" میں اردو زبان کی اہمیت، مقبولیت، روز افزوں ترقی کا ذکر ملتا ہے۔ کچھ ذہین شاعر و ادیب اور شاعرات مثلاً کرنل ہارانڈ، ملکہ حجاز (انگریز خاتون کا تخلص) فرانسیسی ڈاکٹر گستاولی بان، ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز افسر کی رائے اردو بابت بتلایا ہے۔ اردو زبان کو عربی فارسی ترکی اور سنسکرت الفاظ کا مجموعہ کہا ہے۔ اور اس کے رسم الخط کو فارسی میں آسان بتلایا ہے۔[۳]

اردو کو ہندوستان کی بہترین عوامی زبان بتا کر مختلف ریاستوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد اعداد و شمار سے بتایا ہے اور اس کے علاوہ ہندوستان سے باہر عرب، عدن، افغانستان، بنی اسرائیل، بلخ، سیلون، افریقہ، زنجبار، امریکہ اور یورپ وغیرہ میں بھی اردو بولنے والوں کے اعداد شمار بتائے ہیں۔[۴]

مختلف اقوام کے درمیان اشتراک کا ذریعہ اردو کو بتایا گیا ہے۔ اردو کی ترقی میں حصہ لینے والے ہنود کا نام پندرھویں صدی میں بابا کبیر داس اور گرو نانک سے شروع کیا ہے۔ سولہویں صدی میں تلسی داس، سور داس، سترھویں صدی میں چندر بھان برہمن، اٹھارھویں صدی میں سنتوکھ رام بیتاب، رائے بہاری داس عزیز، دیدھ سنگھ قلندر، سر سب سنگھ دیوانہ، ٹیک چند بہار، مکند رام فدوی، انیسویں صدی میں ہری رام ایم اے، جگن ناتھ پرشاد فیض، لالہ عزاز چند جاوید، درگا سہائے سرور، منشی بانکے پرشاد طالب بنارسی، منشی پریم چند، نوبت رائے نظر، تلوک چند محروم، برج نرائن چکبست، دولہا رام شاد، واقف کا ذکر کیا ہے۔

لفظ اردو اور ہندی پر گاندھی جی کی بھاشا ہتیہ سمیلن کا حوالہ دیتے ہوئے بحث کیا ہے اسے مسلمانوں کی میراث بتلایا ہے۔[۵] مختلف زبانوں میں اس کا نام کیا تھا اس پر بحث کیا ہے۔

باب دوسرا :- اردو شاعری کا دور، مختلف ادوار کی فہرست اور ترقی پسند کی تعریف پر مشتمل ہے۔

تیسرے باب میں ناول نگاران، افسانہ، ہجو، مزاح، تنقید، مقالہ، اور محققین ادب سلیمان ندوی، زور اور عبدالحق کو لکھا ہے۔

---

[۱] تاریخ ادب اردو - ڈاکٹر نذیر احمد و ڈاکٹر عبادالله صدیقی - ۱۹۵۵ء تاریخ ادب اردو ڈاکٹر نذیر احمد و عباد الله صفحہ ۱۵

[۲] ایضاً ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صفحہ ۵

[۳] ایضاً ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صفحہ ۶

[۴] ایضاً ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹

باب چوتھا :۔ "تنقید کسے کہتے ہیں ۔ اور ایک اچھے نقاد کی تعریف ہے" سے شروع ہوتا ہے ۔
جس میں تنقید اور تبصرہ تمریات کی شاعری پر ختم کیا ہے ۔ درد، میر، آتش، ناسخ، غالب، ذوق، داغ، اصغر
گونڈوی، شاد عظیم آبادی، جگر، پیارے صاحب رشید، نظیر اکبر آبادی، ساغر، جوش، اکبر، اقبال اور چکبست وغیرہ کا
ذکر کیا ہے ۔

باب پنجم :۔ نگارشات (الف) میں ڈرامہ نویسی ڈرامہ کی تعریف اور اقسام (ب) مزاح نگاری اس
کی تعریف جس میں رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی اور ملا رموزی کا شمار
کیا ہے ۔ طنز و تنقید کا فرق بنا کر رشید احمد صدیقی اور فرحت اللہ بیگ پر تفصیل سے بحث کیا ہے ۔ (س)
اردو ناول اور افسانے کی تعریف میں ناول نگاری، ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی
رسوا، سجاد حسین اور پریم چند ۔ (د) افسانہ اور مختصر افسانہ میں پریم چند، سدرشن، بدری ناتھ، سجاد حسین نیاز فتحپوری
اور خواجہ حسن نظامی کا ذکر ملتا ہے ۔

باب چھٹا :۔ مثنوی کی تعریف و تاریخ پر محیط ہے ۔ سحر البیان میں میر حسن اور گلزار نسیم میں فرق بتلایا ہے ۔
شوق کا تذکرہ بھی کیا ہے ۔

ساتواں باب :۔ (الف) قصیدہ اور اس کی تعریف (ب) غزل کی تعریف اور خصوصیات مختلف مثالوں کے
ساتھ کی گئی ہے ۔ (ج) مرثیہ کی تعریف، اس کے فوائد، اردو مرثیہ کی تاریخ میں میر خلیق، ضمیر، انیس، دبیر
عشق، مونس، عارف اور اوج کا ذکر کیا ہے ۔

باب آٹھواں :۔ فورٹ ولیم کے مصنفین کا ہے ۔ میر امن کے حالات تنقید و تبصرہ کے ساتھ لکھے گئے ہیں ۔
میر شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی، مرزا لطف علی لطف، مظہر علی ولا، نہال چند لاہوری اور بینی
نارائن کا تذکرہ ضمناً کیا ہے ۔ صہ۸۳

مرزا رجب علی سرور اور فسانۂ عجائب کا ذکر موجود ہے ۔

باب نواں :۔ اردو کے عناصر خمسہ میں سرسید کے حالات، ادبی خدمات، طرز تحریر، مولانا آزاد کے حالات، ادبی
خدمات اور طرز تحریر، مولانا نذیر احمد کے حالات، خدمات اور طرز تحریر، حالی، شبلی کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ محسنین
اردو کے عنوان میں پروفیسر رام چند، محسن الملک اور ذکاء اللہ کا ذکر کیا ہے ۔
باب دسواں :۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر کی ناول نگاری اور طرز تحریر پر تنقید کے ساتھ

روشنی ڈالی ہے۔ افسانہ میں پریم چند، علامہ راشد الخیری، منشی سجاد، محمد ہادی رسوا، سجاد حیدر یلدرم اور کرشن چندر کی ناول نگاری و افسانہ نگاری کا جائزہ لیا ہے۔

گیارہواں باب :۔ مقالات و صحافت میں خواجہ حسن نظامی، ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید عابد حسین، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی، قاضی عبدالغفار خان، دتاتریہ کیفی، نیاز فتحپوری، مہدی افادی، چراغ علی، سید علی بلگرامی، ظفر علی خان اور چکبست پر بحث ملتی ہے۔

بارہواں باب : تحقیق و تنقید میں وحیدالدین سلیم، کلیم الدین احمد، سید احتشام حسین، مولانا عبدالحق، پروفیسر آل احمد سرور، مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔

باب تیرہواں : مزاح نگاری میں پطرس، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور کا ذکر کیا ہے۔

باب چودہواں :۔ ادوار اور تدریجی ترقی کا ہے اس میں اردو کو کھڑی بولی کا ایک روپ بتایا ہے۔[1]

اسی باب میں بہمنی دور میں عین الدین گنج العلم، بندہ نواز گیسو دراز، شاہ میراں جی، شاہ برہان الدین جانم عادل شاہی میں نصرتی، امین، میواں، ہاشمی، موتمن، مرزا۔ اور قطب شاہی دور میں محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی، جنیدی، ابن نشاطی، تحسین۔ دکنی اردو مغلوں کے عہد میں عاجز، ولی ویلوری، ولی اورنگ آبادی اور سراج کا ذکر آیا ہے۔

باب پندرہواں :۔ اردو ادب کی ترقی کے تدریجی اور ادواری نمونہ میں شمالی ہند میں بھگت نامدیو کی کھڑی بولی سے شروع کرتے ہیں۔ خان آرزو، شاہ مبارک آبرو، محمد شاکر ناجی پہلے دور میں حاتم، مرزا مظہر جان جاناں اور شاکر ناجی۔ دوسرے دور میں سودا، میر تقی میر، میر حسن اور درد کو روحانیت کے بادشاہ لکھا ہے۔[2]

تیسرے دور میں مصحفی، انشا، جرأت، میر خلیق، ضمیر، امیر، اور نظیر اکبر آبادی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے چوتھے دور میں دو اسکول دبستان لکھنؤ اور دہلی اسکول سے شاہ نصیر، ذوق، غالب اور مومن کا ذکر ملتا ہے۔

باب سولہویں میں ادب کی رفتار ۱۸۵۷ء کے بعد جسے چوتھا انقلاب لکھا ہے اس دور میں جدید شعراء کی فہرست نظم میں آزاد، حالی، اکبر آبادی، اسماعیل میرٹھی، نظم طباطبائی، سرور جہاں آبادی، چکبست، اقبال، جوش، سیماب، حفیظ، افسر، اختر شیرانی، ساغر نظامی، احسان بن دانش اور ترقی پسند شعراء میں مجاز، معین احسن جذبی، علی سردار جعفری، وامق جونپوری اور فیض احمد فیض۔

پانچواں انقلاب ۱۹۴۷ء کو اردو کا مستقبل سے منسوب کرتے ہوئے اردو زبان کے ساتھ ہونے والی

---

[1] تاریخ ادب اردو - ڈاکٹر وحید احمد و ڈاکٹر عبادت اللہ ص۱۹۷ [2] ایضاً - ص۲۳۲

ناانصافی کا ذکر کیا ہے۔

باب سترہ میں سنہرے دور میں سودا، میر تقی میر، خواجہ میر درد کی شخصیت فن اور کلام پر تنقید و تبصرہ کیا ہے۔

باب اٹھارہ۔ میں (الف) شعرائے متوسطین، لکھنؤ اسکول سے انشاء، مصحفی، آتش، ناسخ کی سیرت اور کلام پر تفصیلی معلومات نمونہ کلام کے ساتھ درج کی گئی ہے۔

دبستان دہلی میں غالب، مومن اور ذوق کا ذکر بطور خاص کیا ہے۔

باب انیسواں: شعرائے متاخرین (جدید) میں نظیر اکبرآبادی، داغ، امیر مینائی، شاد عظیم آبادی، حسرت موہانی، فانی، آرزو، اصغر، ثاقب، ریاض خیرآبادی، جگر، فراق، عزیز لکھنوی وغیرہ۔

مرثیہ گو میں انیس و دبیر، نظم گو شعراء میں نظیر اکبرآبادی، اقبال، چکبست، درگا سہائے سرور، ساغر نظامی، دانش، حفیظ، مجاز، شباب، اختر، جذبی، جعفری، وامق اور فیض پر کتاب ختم ہوتی ہے۔ انڈکس صفحہ ۳۰۱ تا صفحہ ۳۱۲ ہے۔

۱۔ اس تاریخ کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ مصنفین نے ادوار اصناف اور کلام کے درمیان کوئی معیار مقرر نہیں کیا اس لئے اکثر شعراء و ادباء کا ذکر بار بار کیا گیا ہے۔

۲۔ "شاہجہاں کے عہد میں اس نئی زبان کا نام اردو پڑا" [۵۰] کوئی ثبوت نہیں

۳۔ "اردو ایجاد ہونے سے انیسویں صدی تک اس کے مختلف نام بدلتے رہے۔" [۵۱] محققان ادب کے قلم سے ایسا جملہ غلط عکاسی کرتا ہے۔

۴۔ خمریات کی شاعری میں اکبر، نظیر اور داغ کا شمار کرنا غلط ہے۔ [۵۲]

۵۔ خمریات مزاح میں بطرس پر سرسری تبصرہ کیا گیا ہے۔ [۵۳]

۶۔ ناول نگاری میں منشی فیاض ایڈوکیٹ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ [۵۴]

۷۔ تحقیق و تنقید کے باب میں محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ [۵۵]

۸۔ صفحہ ۲ پر سندھی کو اردو کی شکل میں لکھتے ہیں صفحہ ۲ پر کھڑی زبان کا روپ اردو کہا ہے۔

۹۔ دکنی شعراء کے نام گنا لئے، لیکن کوئی شعر نمونہ کے طور پر پیش نہیں کیا۔ شمالی ہند کے شعراء کا ایک یا دو شعر بطور نمونہ پیش کئے ہیں۔ [۵۶]

۱۰۔ دریائے لطافت کو انشاء اور قتیل کی مشترک تصنیف لکھتے ہیں۔ [۵۷]

۵۰؎ تاریخ ادب اردو ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر ضیاء اللہ صفحہ ۲ صفحہ ۱۰ ۵۱؎ ایضاً۔ صفحہ ۳
۵۲؎ ایضاً۔ صفحہ ۱۵ ۵۳؎ ایضاً۔ صفحہ ۵۶ ۵۴؎ ایضاً۔ صفحہ ۱۴۳ ۵۵؎ ایضاً۔ صفحہ ۸۰
۵۶؎ ایضاً۔ صفحہ ۱۹۲

۱۱۔ ترقی پسند شعراء میں کیفی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، اختر الایمان کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔[۱]

۱۲۔ مؤلفین نے یہ تاریخ تدریسی مقاصد کے پیش نظر لکھی کئی متنازعہ فی مسائل کو اس میں پیش کیا ہے اور ان کی وضاحت نہیں کی گئی مثلاً اردو زبان کے مولد کا مسئلہ۔

۱۳۔ زبان کے سیاسی حالات سے طالب علم کا تعارف ذہنی کشمکش کا سبب بن جاتا ہے۔

۱۴۔ کئی شعراء اور ادباء کے ناموں کا اعادہ مختلف بیانات کی روشنی میں طلباء کو گمراہ کر سکتا ہے۔

ان خامیوں کے باوجود اپنے عہد میں درپیش مسائل کی روداد اس تاریخ میں ملتی ہے جو تحقیقی کام کرنے والے طلبہ کے لئے اہم ہے مختلف اصناف کی تعریف اور تعارف کی حکمت عملی معلومات میں اضافہ کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ تاریخ تدریسی مقاصد کو پورا کرنے میں ناکام سہی لیکن بعض حقائق کی روشنی میں طلباء کی معلومات مزید اضافہ کیا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ

نسیم قریشی ۱۹۵۵ء

یہ تالیف نسیم قریشی کی کاوش کا نمونہ ہے۔ ۲۴۶ صفحات پر محیط ہے۔ تالیف کا مقصد مؤلف نے "عرض مؤلف" کے عنوان میں یوں بیان کیا ہے۔

"محترم سید ظہیر الدین علوی رجسٹرار جامعہ اردو کی فرمائش پر میں نے امتحانات جامعہ کی درسی ضرورتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اردو ادب کی یہ مختصر تاریخ مرتب کی ہے۔ اردو ادب کے اس مختصر جائزے میں نہ ادبی رجحانات پر سیر حاصل تبصرہ کی گنجائش تھی اور نہ تمام قابل لحاظ ارباب فن کے تذکرہ کا۔ اردو زبان و ادب کے ارتقاء کا ایک واضح تصور مجمل طور پر نگاہوں کے سامنے آ جائے۔"[۲]

ابتداء "اردو زبان کی پیدائش اور ترقی" سے کی گئی ہے اس میں اردو زبان کی ابتداء اور ارتقاء مختصر بیان کیا ہے مسلمانوں کے تجارتی قافلوں کی آمد عربی زبان کے اثرات غزنوی کے حملوں سے فارسی کے اثرات، البیرونی بیرونی اور حکیم سنائی کے یہاں ہندی لفظوں کی موجودگی، پرتھوی راج راسو میں عربی فارسی کے وجود کو مثال بنا کر خسرو کی پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کا ذکر کرتے ہوئے کبیر کی بھگتی شاعری اور صوفیا کے کلام میں ہندی کے لفظوں کی شمولیت کو دلیل بنا کر پراکرت، برج بھاشا اور کھڑی بولی سے اردو کی پیدائش بتایا ہے۔ چندر بھان برہمن کو اردو کا پہلا شاعر بنا کر نمونے میں دو شعر پیش کیا ہے۔[۳]

---

[۱] تاریخ ادب اردو ڈاکٹر ... [illegible]

[۲] اردو ادب کی تاریخ نسیم قریشی مرکز کتاب گھر کلاں محل دہلی ۱۹۵۵ء ص عرض مؤلف

[۳] ایضاً ص ۱۴۳

لیکن دونوں شعر بے وزن اور غلط ہیں۔

پنڈت کیفی کی کیفیہ سے نقل کیا ہے غلط مثال پیش کی ہے۔

خوباں کے باغ میں رونق ہوئے تو کس طرح یاراں

نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوسن ہے نہ لالہ ہے

ہوئے کے بجائے ہووے۔ دونا کی جگہ دوناں اور مروا کی جگہ مرا چاہیئے۔

پیا کے نام عاشق کوں قتل باعجب دیکھے ہوں

نہ برچھی ہے نہ کرچھی ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے

نام کے بجائے ناؤں چاہیئے۔ ۵۱

"اردو دکن میں دوسرا عنوان قائم کیا ہے دکن میں زبان کی نشو و نما اور ادب کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

اردو میں تصنیف و تالیف کا کام سب سے پہلے دکن میں شروع ہوا اور صوفیوں کی بابرکت قلم نے اس کی ابتدا کی اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام شیخ عین گنج العلم کا ہے۔ ۵۲

یہ حقیقت ہے کہ دکن میں اردو تصنیف و تالیف کا کام پہلے ہوا۔ لیکن یہ بیان مستند نہیں کہ شیخ عین الدین گنج العلم پہلے مصنف ہیں۔ یہ قول روایات پر مبنی ہے۔ ۵۳

مؤلف نے دکنی اردو کے ارتقا میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، عبداللہ حسینی، شاہ میراں جی شمس العشاق، شاہ برہان الدین جانم، شاہ میراں جی جیسے صوفیاؤں کا ذکر کیا ہے۔ نیز ثبوت میں مرغوب القلوب مصنفہ میراں جی کے تین اشعار اور کتابوں کا نام پیش کیا ہے۔ ۵۴

اردو ادب عادل شاہی سلطنت (۱۴۹۰ء سے ۱۶۸۶ء) کے عنوان کے تحت اس خاندان کے علم و ادب کی سرپرستی کا ذکر کرتے ہوئے رستمی، ملک خوشنود، نصرتی، امین، میراں ہاشمی، عبدالمومن، مومن، مرزا کے کارناموں اور تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

اردو ادب قطب شاہی دور میں ۱۵۱۸ء تا ۱۶۸۷ء کے زیر عنوان اس خاندان میں اردو کی ترقی کا تذکرہ کیا ہے اس دور میں محمد قلی قطب شاہ، تحسین علی، محمد قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی، ابن نشاطی، جنیدی، ملا قطبی کے علمی و ادبی تصانیف اور شعری کارناموں کا بیان ہے اور ابوالحسن تانا شاہ کے دور کے شاعر

---

۵۱ اردو ادب کی تاریخ۔ نسیم قریشی۔ آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی۔ ص۲۲ ۵۲ اردو ادب نسیم قریشی ص۲۹۵
۵۳ اردوئے قدیم حکیم شمس اللہ قادری ص۱۲ ۵۴ ایضاً۔ ص۱۵ ص۲۳ ص۲۴

نوری، فائز، شاہی، اور مرزا کے ناموں کا ذکر ملتا ہے۔ ۱؎

دکنی اردو مغلوں کے عہد میں عاجز، بحری، امین اور وجدی پر مختصر اظہار خیال کیا ہے ولی اور سراج کی ادبی خدمات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ۲؎

دکنی ادب ایک تبصرہ" کے عنوان سے جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ چیز کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ دکن نے زبان و ادب کی خدمت بڑے ہمہ گیر ذوق کے ساتھ کی ہے۔ دکنی ادب کا آغاز تصوف کے رسالوں سے اور صاحب دل صوفی شاعروں کے کلام سے ہوا لیکن بہت جلد شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، ترجیع بند اور رباعی غرض کہ ارباب سخن نے ہر میدان میں فکر و نظر کی جولانیاں دکھلائی ہیں ۳؎ مثنوی کے فروغ پر زور دیتے ہوئے دکنی ادب کا مختصراً جائزہ لیا ہے۔ لیکن دکن کی سلطنتیں مذہباً شیعہ تھیں صحیح نہیں ہے۔ ۴؎

اردو ادب کا ارتقا شمالی ہند کے عنوان سے اردو زبان کی تاریخ و ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے جعفر زٹلی، قزلباش خاں امید، سلیمان قلی خاں داؤد، معزالدین فطرت، عبدالقادر بیدل اور سعد اللہ گلشن کو تذکروں کے حوالوں سے تفریح طبع کے لئے اردو شعر گو بتایا ہے۔ فائز کو ولی کے دور کا شاعر بتلایا ہے ۵؎

شمالی ہند کی اردو شاعری کے مزاج انداز ارتقا اور خصوصیاتِ زبان کے موضوع پر ولی کی آمد کا ذکر کرتے ہوئے زبان کی اصلاح اور فارسی اثرات کا ذکر ملتا ہے۔ اس میں درج ذیل ادوار قائم کئے ہیں۔

دور اول کے شعراء خان آرزو، شاہ مبارک آبرو، محمد شاکر ناجی، شاہ ظہورالدین حاتم، اور مرزا مظہر جانِ جاناں ہیں۔ اس دور میں ایہام گوئی سے اردو شاعری کو پاک کیا گیا۔

دوسرے دور کے شعرا سودا، میر، خواجہ میر درد، میر حسن اور سوز ہیں۔ اس دور میں فارسی شعر گوئی کی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔

تیسرے دور میں مصحفی، انشا، اور جرأت کا ذکر کیا ہے۔

چوتھے دور میں دو اسکول دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ ناسخ اور ان کے شاگردوں کا ذکر ہے۔

دہلی اور لکھنؤ کی زبان اور شاعری کے فکری نہج پر مختصر بحث کرتے ہوئے داغ، نسیم دہلوی، ظہیر دہلوی، امیر اللہ تسلیم، مجروح، ممنون، امیر مینائی اور جلال لکھنوی کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے آخر میں کہتے ہیں۔

اوپر کی سطروں میں ہم نے آمدِ ولی کے دور سے امیر و داغ کے زمانے تک شمالی ہند میں اردو شاعری

۱؎ اردو ادب کی ... نسیم قریشی ص۲۲۷-۲۲۸ ۲؎ ایضاً ص۲۴۶-۲۴۷ ۳؎ ایضاً ص۲۶۰ ۴؎ نسیم - ایضاً ص...
۵؎ ایضاً ص۲۶۴

کے مزاج ارتقا اور عہد بہ عہد کی ترقیوں اور خصوصیات پر نگاہ ڈالی ہے ذیل میں ہم اس زمانے کے بہت خاص امتیاز رکھنے والے شاعروں کا مختصر حال بیان کریں گے۔ اور ان کے کلام کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالیں گے۔ تاکہ شمالی ہند کے شعر و ادب کا مزاج انداز خصوصیات اچھی طرح نمایاں ہو جائیں۔" [1]

یہ تفصیلی جائزہ "معاصرین ولی کا دور" سے شروع کیا ہے۔ اس میں خان آرزو شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون، محمد شاکر ناجی، محمد حسین کلیم، اشرف علی فغاں، شاہ ظہور الدین حاتم، مرزا مظہر جان جاناں کی سیرت اور کلام کی خوبیوں کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ دور سودا اور میر کے عنوان سے سودا، میر تقی میر، خواجہ میر درد، میر سوز، میر حسن، قائم چاند پوری، انعام اللہ خاں یقین کا تذکرہ کیا ہے۔

دور انشا و مصحفی میں میر انشا اللہ خاں انشا، مصحفی، شیخ قلندر بخش جرأت، خواجہ میر اثر، رنگین اور نظیر اکبر آبادی کا تذکرہ ہے۔

دور ناسخ و آتش میں خواجہ حیدر علی آتش، [illegible] خلیل صبا، نسیم اور مرزا شوق پر مفصل بحث کی گئی ہے

دبستان لکھنؤ کے دور زندہ جاوید ادبی شاہکار کے عنوان میں گلزار نسیم اور زہر عشق دونوں مثنویوں کا اسلوبی جائزہ ہے کر مرثیہ اور مرثیہ گوئی میں میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے [illegible] کرتے ہیں۔

دبستان دہلی میں دور ذوق و غالب میں شاہ نصیر، حکیم مومن خاں مومن، ذوق، غالب، [illegible] میناں، جلال لکھنوی پر نظم و شاعری کی تاریخ ختم کی گئی ہے۔

۱۹ صفحوں پر اردو نثر ۱۸۵۷ء تک کے عنوان اور نثر دکن میں موضوع کے تحت اردو کی پہلی نثری کتابیں خواجہ بندہ نواز کی معراج العاشقین اور ہدایت نامہ بتلایا ہے۔ اور [illegible] کی سب رس پر مختصر تبصرہ کا خاتمہ ہے۔

شمالی ہند کے عنوان کے تحت خواجہ سید جہانگیر سمنانی، فضلی کی دہ مجلس کا ذکر کیا ہے۔ [illegible] حسین خاں تحسین نو طرز مرصع کو میر امن کی باغ و بہار کا ترجمہ بتلایا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے عنوان میں گل کرسٹ کی لغت اور قواعد کی ترتیب اور ہندوستانی نثر کی ادبی خدمات، فورٹ ولیم کالج کے اہل قلم میں میر امن، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، بہادر علی

---

[1] اردو ادب کی تاریخ۔ نسیم قریشی صفحہ [illegible]

سید احتشام الدین رضوی کے اسلوب اور ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔

مقالات و صحافت کے باب میں سید علی بلگرامی، مہدی افادی، ظفر علی خاں، سید سلیمان ندوی، خواجہ حسن نظامی، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی، نیاز فتحپوری اور قاضی عبدالغفار کی ادبی خدمات کا ذکر ہے۔

ناول اور افسانہ میں رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، منشی سجاد حسین، محمد ہادی رسوا، راشد الخیری، پریم چند، علی عباس حسینی، سجاد حیدر یلدرم اور کرشن چندر کی ناول نگاری اور طرز اسلوب کا تعارف ہے۔

طنز و مزاح میں فرحت اللہ بیگ، پطرس، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور کے اسلوب اور ادبی خدمات کے جائزے پر تاریخ کا خاتمہ کیا ہے۔

۱۔ اس تاریخ میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ شعراء کے کلام کی خصوصیت میں انتخاب اشعار نہیں دیے گئے۔

۲۔ کچھ ادباء و شعراء کے ولادت کے سن لکھے گئے، اور کچھ کے سنین نہیں دیے گئے۔

۳۔ ترقی پسند ادب کے باب میں مجنوں گورکھپوری کا کوئی ذکر نہیں حالانکہ وہ ادب و زندگی سے بحث کر چکے تھے۔

۴۔ صحافت کے باب میں امداد صابری کی صحافت کی تاریخ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

۵۔ تنقید میں امداد کا کوئی ذکر نہیں ہے حالانکہ کاشف الحقائق اس موضوع پر موجود ہے۔

۶۔ مرثیہ کے باب میں میر انیس اور میر دبیر پر اکتفا کیا ہے۔

۱۹۵۵ء میں تدریسی مقاصد کے تحت اس تاریخ میں مختصر بیانات کئی موضوعات پر مفید مواد کو متاثر کرتے ہیں۔

یہ تاریخ اپنے دور میں تدریسی مقاصد کو پورا کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئی گیا ہوں کے معیار نصاب تک اس تاریخ سے استفادہ ممکن تھا۔ آج اس تاریخ کی حیثیت ادب کی تاریخوں میں وہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اپنے دور کے تقاضوں کے تحت تدریسی تقاضوں کی اہمیت رکھتی تھی۔

۷۔ تاریخ نویسی کا سب سے بڑا عیب ماخذات وغیرہ میں جن سے کام لیا ہے اس تاریخ میں ماخذات کی کتابیات سے اور روایات کے حوالوں کا کوئی ذکر نہیں۔

اردو کی ادبی تاریخ

پروفیسر عبدالقادر سروری ۱۹۵۷ء

پروفیسر عبدالقادر سروری کی اردو کی ادبی تاریخ ۲۸۲ صفحات پر محیط ہے۔ یہ تاریخ داخل نصاب رہ چکی ہے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں طبع ہوا اس کا دوسرا ایڈیشن ہی یہ منتخب تکنیک اور مواد کے اعتبار سے اور ادبی تاریخوں سے مختلف ہے مختصر اور بے حد مفید ہے۔

مصنف عبدالقادر سروری کے چند کلمے ملاحظہ کیجئے:-

یہ مروجہ نوعیت کی تفصیلی تاریخ ادب نہیں ہے اس میں رجحانات اور تحریکات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ادب کے مزاج کو بتاتے ہیں۔ اور خود ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی ساخت کے بھی ضامن ہوتے ہیں اس مخصوص نقطہ نظر کے لحاظ سے یہ غیر اہم بات ہو جاتی ہے کہ ذیلی تفصیلات اس میں ہوں یا نہ ہوں چنانچہ ایک ہی تجانسے سمیت لکھنے والوں کی تفصیلات دینے اور اس کی طرف اشارہ کرنے کی بھی ان صفحات میں گنجائش کم نکل سکی اور ان تفصیلات پر حاوی ہونے کا منشا بھی نہیں تھا ؎[۵]

پروفیسر عبدالقادر سروری، سابق صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی، سابق پروفیسر اردو و صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی اور صدر شعبہ اردو و ہندی ڈگری تھے۔ تدریسی تقاضوں کو جدید روشنی میں سمجھنے کے قائل تھے۔ لہٰذا موصوف نے تدریسی مقاصد کو ذہن میں رکھ کر اس تاریخ کی تدوین کی ہے۔

زیر نظر تاریخ کی فہرست یوں ہے:-

۱۔ دوسری اشاعت کے لئے ۔ ۲۔ چند کلمے

۳۔ قدیم ہندوستان عظیم ہندوستان ۔ ۴۔ نئی لہر

۵۔ تہذیبی لین دین ۔ ۶۔ نئی تہذیب نئی زبان

۷۔ فاتح مفتوح ۔ ۸۔ شمال کی دکن کی طرف

۹۔ پہلے آثار ۔ ۱۰۔ نئی تہذیب اور نئی لسانی روایات

۱۱۔ نشو و نما ۔ ۱۲۔ شمال اور جنوب کا سنگم

۱۳۔ روال آمادہ اجزا ۔ ۱۴۔ اہل نظر کی تازہ بستیاں

۱۵۔ مغربی دھارا ۔ ۱۶۔ ہندوستان ہمارا

۵۔ اردو کی ادبی تاریخ، پروفیسر عبدالقادر سروری، مطبوعہ اعلیٰ پریس دہلی ۱۹۵۷ء صفحہ ۸

۱۷۔ شکست اور تعمیرِ نو۔

"قدیم ہندوستانِ عظیم میں ہندوستان کی پرانی تاریخ سے ابتدا کی ہے۔ موہنجوداڑو و ہڑپہ آریہ، یونانی، عرب، ایرانی اور افغانی اور انگریزوں کی آمد کا مذکور ہے۔ آریوں کی مقدس کتابیں رگ وید اتھروید، اذیجروید، اپنشد کی تدوین، آریوں کی آمد پراکرتوں، ناگری، اونتی، سوریسی، ماگدھی اور سنسکرت کے وجود میں آنے کا ذکر کیا ہے۔ سنسکرت سے جدید آریائی زبانوں کی نشوونما بتلایا ہے جن میں مشرقی پنجابی، سندھی مہاراشٹری، مرہٹی، ہندی، اڑیہ، بنگالی اور آسامی ہیں۔

تاریخی تسلسل میں قبیلوں، فرقوں اور مذہب کے زوال کا ذکر بیرونی اور داخلی وغیرہ کا مذکور ہے۔

نئی لہریں ساتویں صدی عیسوی سے بات شروع کی ہے عربوں کے عروج کے ذکر میں ان کے تجارتی تعلقات سے آمد تک تاریخ بتائی ہے۔

تہذیبی لین دین میں محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ اس حملہ کے اثرات اور آپسی تعلقات کی بنا پر کچھ لفظ مثلاً ناؤ، اور خدا کا مرکب "ناخدا" بتا کر ہندوستانی اور فارسی اور عربی لفظوں کے میل جول کی طرف اشارہ کیا ہے سندھی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے اختلاط بزرگ بن شہریار کی کتاب "عجائب الہند" کے حوالے سے ہندی لفظ کا حوالہ دیا ہے نب، انبہ، آم۔ اور کو آج سے وابستہ کیا ہے عرب کی کہانیاں ہندوستانی ادب میں ہندوستانی کہانیوں کا مذکور ہے۔ ان واقعات اور لین دین کے حصول پر اردو کی ابتدا سندھ سے ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سروری صاحب کی رائے ہے کہ لیا میں چونکہ ان کے کئی نام اور الفاظ یہاں رائج ہو گئے تھے۔ ص۳۳

نئی تہذیب نئی زبان کے عنوان میں محمود غزنوی کا پنجاب پر حملہ اور اس کے علم و ادب کے تبدیل ہونے کا ذکر ہے۔ ہندوستانیوں سے مسلم قوم کے میل جول البیرونی کی کتاب الہند میں ہندی کا ذکر کیا ہے۔ در، نثر، دھوبی، جہاز، موتی، چرخی، دد، وغیرہ لفظوں کا مذکور ہے۔ حکیم سنائی کے شعر میں پانی لفظ کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھتے ہیں کہ

"پنجاب میں اس دور کے مربوط اردو کے آثار نہیں ملتے تاہم تذکرے ملتے ہیں۔ کہ ہندوی میں شعر کہے جاتے تھے۔ ص۵۵

فاتح مفتوح کے باب میں غوریوں کے عہد کا ذکر ہے اس دور میں اہم سی ادیب مسعود بن محمد سعد

مولانا شہاب الدین بدایونی، علامہ برہان الدین محمود بن ابوالخیر بلخی، الشیخ ابو بکر بن یوسف سجزی، سید صدر الدین محمد، مولانا شمس الدین خوارزمی کی دہلی میں موجودگی بتائی ہے۔ اور ذیل کے مشائخین کو ابتدائی دور کا معمار بتایا ہے۔

"مشائخین و صوفیا، اور زہاد ہیں جن کے ہاتھوں ابتدائی دور میں اردو پروان چڑھی حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر، شیخ بو علی اشرف الدین قلندر، شیخ ابو بکر طوسی، شیخ حسام الدین ملتانی کا ذکر کے قابل ذکر ہیں۔" صـ۲۲

مسلمان صوفیوں کو عوامی زبان ہندی یا ہندوی کے استعمال کا ذریعہ بتایا امیر خسرو کی بوریوں پہلوں کا ذکر اور نمونہ کلام کو پیش کیا ہے۔

شمال کی رو دکن کی طرف میں تغلق کے دور سے ابتدا کی ہے۔ بزرگوں میں شیخ نصیر الدین نصر اللہ کا ذکر کیا ہے۔ مشہور شعراء میں تاج الدین عرفی، خواجہ حسن، امیر ارسلان کلاہی، جلال الدین نائب کی مثنوی اور خلجی نامہ کا حوالہ دیا ہے۔

پہلے آثار ۱۳۲۷ء میں دہلی کی حکومت میں تبدیلی کا ذکر کیا ہے۔ تغلق خاندان کے عروج و زوال پایہ تخت کی تبدیلی کا حوالہ دے کر دولت آباد دکن سے وابستہ ہے۔ یہاں برہان الدین غریب، یوسف حسینی راجو، بندہ نواز گیسو دراز، حسن سجزی اور شیخ زین الدین کی زبانیں اردو بتائی ہیں اور اردو میں شاہ راجو کے سہاگن نامہ رسالہ کا ذکر کیا ہے۔

نئی تہذیب نئی لسانی روایات میں حسن بہمن شاہ کے عہد میں حضرت عین الدین گنج العلم کے رسالہ کا ذکر کیا ہے لیکن کوئی نام نہیں دیا۔ فیروز شاہ کے عہد میں محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز کی اردو تصانیف معراج العاشقین، شکار نامہ، تمثیل نامہ، خلاصہ توحید، تلاوت الوجود اور ایک نظم چکی نامہ مذکور ہے۔ گجرات میں ان عالموں کے تبع ہونے کا ذکر کیا ہے۔ شیخ علاؤ الدین علی ابن احمد مہائمی کا ذکر کیا، مفتی رکن الدین، مولانا راجح داؤد گجراتی، شیخ وجیہ الدین علوی، صوفیا میں نظام الدین اولیاء کے خلیفہ حسام الدین عثمان بن داؤد ملتانی، کمال الدین دہلوی، نصیر الدین چراغ دہلوی، شیخ یعقوب، شیخ زین الدین خلد آبادی، کبیر الدین ناگوری، علیم الدین شبلی، شیخ احمد کھٹو وغیرہ "گجرات کے وہ بزرگ جن کے یہاں اردو میں مکمل کارنامے ملتے ہیں ان میں خوب محمد چشتی، شیخ

شیخ بہاء الدین باجن اور شیخ سید علی جیوگام دھنی قابل ذکر ہیں۔ بعد؟

خوب محمد چشتی کی ترنگ مثنوی جیو گام دھنی کی جواہر اسرار اللہ کا حوالہ دیا ہے۔ شمال میں شرف الدین یحییٰ منیری غوث گوالیاری اور عبدالقدوس گنگوہی کے ملفوظات کا ذکر ہے۔ قطبن کی مثنوی مرگاوتی کو بجا طور اردو کا کارنامہ لکھا ہے۔

"نشوونما" پرورش بہمنی سلطنت میں فیروز کی مثنوی پرت نامہ کا ذکر کیا ہے۔ حسن شوقی کی جنگ نامہ نظام شاہ بیجاپور میں یوسف عادل کے عہد میں صوفی حضرت حاجی رومی نصیرالدین نصر اللہ بزرگ اور میر اسماعیل کے آباد کئے ہوئے شہروں کے نام سے اردو تہذیب کی شروعات کا اندازہ کیا ہے۔

علی عادل شاہ کے زمانے میں میراں جی شمس العشاق نظم ارشاد نامہ اور سکھ سہیلا، ساتھ میں وصیت الہادی کا ذکر ہے۔ اردو کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے نورس اور ابراہیم نامہ کو اردو کے مستقل اور دلیل بنانے قرار دیا ہے۔ اسی عہد میں ابوالقاسم فرشتہ، آتشی، مقیمی اور عبدل کا مذکور ہے۔

خوب محمد کے زمانے میں رستمی، صنعتی، اور ملک خوشنود علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں نصرتی یاقوت کی ادبی خدمات پر بحث کی ہے۔ علی اردو کا اچھا شاعر تھا شاہی تخلص تھا۔ شاہ امین الدین اعلیٰ شاہ ملک کے شریعت نامے کا شمار کیا ہے۔

ابراہیم اور علی کے زمانے میں ابوالمعالی ملا عبدالرزاق رفعت عبدالقادر عبداللطیف محمد معتمد اور ہاشمی کو سب سے بڑا شاعر کہا ہے۔ یوسف زلیخا مثنوی کا حوالہ دیا ہے۔

گولکنڈہ میں سلطان قلی کے عہد کی تاریخ میں محمد قلی قطب شاہ کے کارنامے کو سراہا ہے۔ اس کی تعمیر کردہ عمارتوں کا ذکر کرنے کے بعد اس کے فن پر بحث کی ہے۔ سے اپنے عہد کا بلند پایہ شاعر کہا ہے۔ اسی کے دربار سے وابستہ ملا وجہی کی قطب مشتری، و نثر میں سب رس کا ذکر کیا ہے۔

عبداللہ کے عہد میں ابن نشاطی کی پھول بن نثر میں طوطی نامہ غواصی طبعی اور امین میراں یعقوب قابل ذکر ہیں۔ ابوالحسن کے عہد میں فائز اور فضل کا ذکر کیا ہے۔

شمال اور جنوب کا سنگم کے حوالے سے مغلوں کی آمد سے اردو کی نشوونما کی گئی کیفیت کو اس کا تعارف لکھا ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں محمد علی عاجز اور ہاشمی کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح نسائی عہد اور شفیق کا ذکر کیا ہے۔

زوال آمدہ، جزا دیں مغلوں کے زوال اور دہلی میں ولی کی آمد، خان آرزو، قزلباش امید، انجام، اقدام
جعفر علی خاں کا ذکر ہے ۔

اس عہد کے بعد فغاں، فائز، مضمون، یک رنگ، ان کے بعد مظہر جان جاناں، آبرو، حاتم،
تاباں، انھوں نے صنف غزل کو ترقی دی۔ میر اور سودا نے اسے عروج تک پہونچایا۔ میر کی مثنوی اور سودا
کے ہجو پر تفصیلی بحث کی ہے ۔

اہل نظر کی تازہ بستیاں کی اٹھارویں صدی کے وسط سے ابتدا کی ہے دہلی کے فساد، بد امنی
اور انتشار کا ذکر کیا ہے ۔ اس عہد میں لکھنؤ کے ادبی ماحول کا جائزہ لیا ہے ۔ سودا اور میر کی لکھنؤ میں
قدر دانی پر روشنی ڈالی ہے ۔ میر حسن کی سحر البیان، مصحفی اور انشا کی خدمات، ناسخ کی اصلاح، میر انیس
اور دبیر کی مرثیہ نگاری، دیا شنکر نسیم کی مثنوی نگاری، جرأت اور رنگین کی ریختی گوئی اور رجب علی بیگ سرور
کی نثر نگاری کا بھرپور جائزہ لیا ہے ۔

واجد علی شاہ کی تعمیری اور ادبی کارناموں، مراثی، مثنوی، غزل سب کا جائزہ لیا ہے ۔ مٹیا برج میں
ادبی طور پر پہونچے ہوئے شاعروں کا بھی ذکر کیا ہے ۔

دہلی میں انیسویں صدی ربع دوم، مرہٹوں کے ہنگامے، احمد شاہ ابدالی کے اثرات کے جائزے کے
بعد غالب کی غزل گوئی، نثر نگاری میں خطوط، بہادر شاہ ظفر، ذوق و مومن کی غزل گوئی اور قصیدہ
نگاری کا جائزہ لیا ہے ۔

رامپور میں شعر و ادب کا جائزہ لیا ہے ۔ نواب کلب علی کے عہد میں اور امداد علی بحر، قاسم علی جلال،
تسلیم، منیر، آتش اور انس وغیرہ کے شعر و ادب پر بحث کیا ہے ۔ غالب اور مومن کے قیام کا ذکر بھی کیا
ہے ۔ امیر مینائی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے ۔

آگرہ میں نظیر اکبرآبادی کی شاعری اور نظم نگاری پر مفصل تبصرہ کیا ہے ۔

حیدرآباد میں آصف جاہ ثانی کے عہد میں غلام علی آزاد بلگرامی، لچھمی نرائن شفیق، حکیم الدین یکجی،
عشق، عزلت، شاہی، مرزا علی لطف، عاجز، منت، تمنا، سکندر جاہ کے زمانے میں قمر الدین منت، ایمان،
احسان، فیض، چندا، حفیظ اور چندو لال، لکھمی لال، چندو لال شاداں، نصیر کے شعری کارناموں پر
تبصرہ کیا ہے ۔

میسور میں میسور کا تاریخی پس منظر پیش کرنے کے بعد سبقت کی تحفۃ المجاہدین اور ذوقی ترانے کا ذکر کیا ہے۔
مدراس، مدراس کا تاریخی جائزہ لے کر حافظ محمد مکی، غلام محی الدین، محمد صبغۃ اللہ، ارتضیٰ علی خان کا ذکر کیا ہے۔ اور صبغۃ اللہ کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ محمد غوث خان اعظم کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔
۔ مغربی دھارا میں اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط سے انیسویں کے وسط تک کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات پیش کئے ہیں۔ فورٹ ولیم کے گل کرسٹ اور وہاں سے وابستہ نثری کام کرنے والے میرامن، نہال چند لاہوری، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، بہادر علی حسینی، مرزا علی لطف، شیخ حفیظ الدین، کاظم علی جوان کے اسلوب، نثری کارناموں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔
برہما سماج تحریک، آریہ سماج تحریک، سرسید تحریک، حالی، آزاد کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔
مقدمہ شعر و شاعری اور مسدس حیات جاوید کا ذکر کرتے ہوئے شعری اور نثری صفات پر تبصرہ کیا ہے۔
مضمون اور انشائیہ نگاروں میں سرسید، حالی، ناول میں محمد نذیر احمد، تاریخ میں شبلی، علی تنقید میں شبلی، طنز نگاروں میں اکبر الٰہ آبادی، ناول شرر، نثر، نظم طباطبائی صوری حیثیت سے ناول نگاری پر بھی مختصر تبصرہ ملتا ہے۔
"ہندوستان ہمارا" میں سامراجی قوتوں سے شروعات کی ہے اور ان کے خلاف چلنے والی تحریکوں کا ذکر کیا ہے۔ آزادی کی تحریک کے رہنماؤں اور شعراء و ادب میں حالی، امام بخش صہبائی، راسخ، مختلف اردو کے اخبارات کے مضامین کا حوالہ دیا ہے۔
چکبست، مولانا محمد علی جوہر، اقبال، پریم چند، سید احمد دہلوی اور ظفر علی خان، کا ذکر کیا ہے۔
اقبال کی تصویر درد پر یہ باب ختم ہوتا ہے۔ شکست و تعمیر نو میں جدید اثرات کا ادب پر کیا اثر ہوا اس کا جائزہ لیا ہے۔ رومانوی تحریک اور مختلف حالات کا جائزہ لیا ہے۔ حقیقت نگاری کی تحریک میں حسرت اور جوش، ظفر علی خان، اقبال، نیا آہنگ کی بنیاد پر حفیظ جالندھری کے شاہنامہ، اختر، ساغر نظامی، فیض احمد فیض، مخدوم، مجاز، جذبی، فراق، میراجی اور ن م راشد کی نظم نگاری کا ذکر کیا ہے۔
ناول اور افسانے میں پریم چند، اپندر ناتھ اشک، کرشن چندر، علی عباس حسینی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی کی افسانہ نویسی پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ سجاد ظہیر کا ذکر بھی کیا ہے۔

تنقید میں مجنوں فراق، آل احمد سرور، احتشام حسین، خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر اور یوی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، وقار عظیم، عابدی، اویس احمد ادیب، کا مذکور ہے۔

ڈرامہ میں احسن، آغا حشر کشمیری، مجیب، اشتیاق حسین قریشی، کرشن چندر وغیرہ کا ذکر ہے۔

انشائیہ اور مضمون نگاری میں آل احمد سرور، احتشام حسین، اختر اور ینوی، مجنوں، اختر انصاری، فراق، نور الحسن ہاشمی اور عبادت بریلوی کا شمار کیا ہے

۱۔ اس تاریخ کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ جتنے حقائق اور واقعات پیش کئے ہیں ان کے ماخذ کا ذکر نہیں ہے۔

۲۔ ولی دکنی پر مختصر اور سراج پر مفصل معلومات درج ہے۔

۳۔ محمود کے بارے میں لکھتے ہیں کہ علم و ادب کے شیدائی تھے۔ دربار میں چار سو شاعر تھے جن میں فردوسی، اسدی طوسی، منوچہری، حکیم سنائی اہمیت رکھتے ہیں۔ صفحہ ۵

۴۔ حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر کے ہاتھوں ابتدائی دور میں اردو پروان چڑھی۔ صفحہ ۴۲
اسی صفحہ پر کچھ سطروں بعد شیخ فریدالدین گنج شکر سے کچھ اردو کلام منسوب ہے۔

۵۔ اس لحاظ سے نوریس اور ابراہیم نامہ اردو کے وہ مستقل اولین کارنامے ہیں جو ادبی اہمیت رکھتے ہیں۔ صفحہ ۱۱

نوریس اردو زبان میں نہیں لکھی گئی۔

۶۔ انشائیہ اور مضمون نگاری پر جو فہرست ادیبوں نے پیش کی ہے اس میں انشائیہ نگار کے معیار پر کوئی ادیب نہیں۔

۷۔ شیخ بہاءالدین باجن کی تصنیف کا ذکر نہیں کیا حالانکہ خزائن رحمت اللہ ان کا شعری کارنامہ ہے
ڈرامہ کی فہرست میں کرشن چندر کا نام زائد ہے۔

ان اغلاط کے باوجود اپنے عہد میں یہ تاریخ عہد بہ عہد ارتقاء کے اعتبار سے تدریسی تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس میں تحریکات اور اصناف پر اچھا مواد ملتا ہے۔ اس میں سماجی اور سیاسی پس منظر کی روشنی میں ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس دور میں کوئی تدریسی تاریخ اس نہج پر نہیں لکھی گئی قدیم ادب میں بہت سے نئے نام سامنے آتے ہیں جو ان سے پہلی تاریخوں میں نہیں ہیں اردو کی نشو و نما اور ارتقاء کا یہ بہترین مرقع ہے۔ کیونکہ

تاریخ کی روشنی میں ہر عہد میں عروج و زوال کے ساتھ زبان کا ارتقاء بتایا گیا ہے۔

اس بنیاد پر یہ تاریخ اپنے عہد کی اچھی تاریخ ہے جو تدریسی اور نصابی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ چند کلمے میں تاریخ سے متعلق مصنف نے وضاحت کی ہے

جائزہ تاریخ اردو ادب

مرتبہ :- شرافت حسین مرزا ۱۹۶۷ء

شرافت حسین مرزا ایم اے کی یہ تالیف ۲۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور سر سید بکڈپو علی گڑھ کی شائع کردہ ہے ۱۹۶۷ء میں اشاعت پذیر ہوئی ہے۔

مرزا صاحب نے تالیف کتاب کی غرض و غایت دیباچہ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"اردو زبان و ادب کی تاریخوں میں کوئی کتاب اب تک ایسی نہیں ہے۔ جو ادب کی مبتدی طالب علموں کی ضرورت کو پورا کر سکے" [1]

یہ کتاب موصوف کے دعویٰ کی روشنی میں خالص تدریسی مقاصد کے تحت لکھی گئی جو درج ذیل عنوانات پر مشتمل ہے:-

۱۔ اردو زبان کا آغاز و ارتقاء

۲۔ اردو کا دکنی دور

۳۔ شمالی ہند میں نثر کا تاریخی ارتقاء۔ شمالی ہند کی شاعری۔ شاعری کے دو اسکول دبستان دہلی و لکھنؤ۔ حیدرآباد۔

علی گڑھ کی تحریک جدید اردو ادب، اردو نظم۔

ترقی پسند تحریک :-	جدید اردو غزل
تین اصناف ادب :-	ناول، مختصر افسانہ، ڈرامہ
علم و ادب :-	مقالات و صحافت اور تحقیق و تنقید
طنز و مزاح	اردو مکتوب نگاری۔ اداریے

مندرجہ بالا عنوانات پر گمان ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے زبان و ادب کے تمام مکمل احوال و مسائل کو سمو دیا ہے لیکن مطالعہ کے دوران تحقیقی کاوش تاریخی معلومات اور تنقیدی بصیرت کی کم مائیگی پر افسوس

---

[1] جائزہ تاریخ اردو ادب۔ شرافت حسین مرزا۔ سر سید بکڈپو علی گڑھ ص ۱

ان کی تصانیف کے نام بھی ملاحظہ کیجئے:۔

"اردو لسانیات کا خاکہ ایک ترجمہ اور ویرانے ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے ادب اور سماج روایت اور بغاوت تنقیدی جائزے اور عملی تنقید اردو کی کہانی ساحل اور سمندر ان کی مشہور کتابیں ہیں"۔[1]

مرزا شرافت نے مولانا آزاد اور سید احتشام حسین کی تصانیف کے بیچ "و" اور "سے" نازک فرق کا خاص اہتمام کیا ہے۔ اور اکثر جگہ کسی لفظ کی کمی و بیشی سے نام کو نمایاں کیا ہے جیسے مولانا آزاد کی تصنیف۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ بتایا ہے اور سید احتشام حسین کی تصنیف اور لسانیات کا خاکہ۔

اس معلومات کے باوجود دونو مصنفین کی ادبی خدمات پر تنقیدی بصیرت کے روبرو جو خیالات لفظوں میں ڈھالے گئے ہیں وہ مولف کی انفرادیت کی دلیل ہے تاریخ ادب اردو اور لسانیات کے موضوع پر مولانا آزاد کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ اردو کی کہانی ضرور سید احتشام حسین کی تصنیف ضرور ہے لیکن تاریخ ادب اردو آزاد کی کوئی تصنیف نہیں ہے دونوں نام کا اندراج الگ الگ کیا ہے۔

مختلف ادارے کے تعلق سے مسلم یونیورسٹی کا سرسری ذکر کرنے کے بعد مرزا صاحب رقمطراز ہیں۔۔

شعبۂ اردو کی زیر سرپرستی تصنیف و تالیف قائم ہوا اور مولانا عبدالحق صاحب اس کے سکریٹری مقرر ہوئے"[2]

ایسے کئی بیانات بے ضرورت اور بغیر ثبوت کے اس تالیف میں کثرت سے موجود ہیں۔ انداز بے فراق کا تنقیدی مجموعہ کا نام لکھا گیا ہے۔[3] حالانکہ اندازے ہونا چاہیئے۔

پروفیسر آل احمد سرور کی تصنیف کا نام تنقید ایک ہے لکھا گیا وہاں تنقیدی اشارے ہونا چاہیئے۔

اس تالیف میں سیکڑوں غلطیاں موجود ہیں۔ سب سے حیرتناک بات یہ ہے کہ نہایت لغو اور جھوٹے بیانات پر مؤلف نے طبع کاری کرنے کے باوجود کوئی حوالہ کسی کتاب سے پیش نہیں کیا۔ حالانکہ یہ تاریخ سرسید بکڈپو علی گڑھ جیسے ذمہ دار ادارہ سے شائع ہوئی لیکن ان امور کی طرف سے کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

اور یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۷۶ء تک مصنف کے بیان کے مطابق مبتدی طالب علموں کی وضاحت مدنظر نہیں کی گئی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۷۶ء تک یہ تالیف جامعہ اردو علی گڑھ ادیب کامل کے نصاب میں شامل تھی جب کہ یہ کتاب کسی زاویہ سے لسانی ادبی اور تاریخی تقاضوں کو پورا نہیں کرتی اور اپنے مواد کی روشنی میں مبتدی طالب علموں کو بھی گمراہ کرتی ہے۔

مصنف کے منفی بیانات کئی ادیبوں اور شاعروں کے بابت انتہائی مضحکہ خیز ہیں تاریخی حقائق اور

---

[1] جائزہ تاریخ اردو ادب شرافت حسین مرزا از سرسید بکڈپو علی گڑھ ص ۲۲۵

[2] ایضاً ص ۲۲

[3] ایضاً ص ۹۵

ہوتا ہے بعض مقامات پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ کتاب ناقص معلومات کا ذخیرہ اور مصنف کی سطحی تحقیقی کاوشوں کا نمونہ ہے اس تالیف میں بیشتر غلطیاں موجود ہیں مختصر افسانے کے باب میں ایک مقام پر بعض ادیبوں کا ذکر کرنے کے بعد سہیل عظیم آبادی، راجندر سنگھ بیدی، اپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس، عزیز احمد اور قرۃ العین حیدر کے نام گنواتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ان کے نام بھی ناول اور افسانے لکھنے والوں میں لئے جا سکتے ہیں۔" ؎۵۱

تحقیقی معلومات کے چند نمونے دیکھئے۔

"سرسید احمد خاں شاعر نہیں تھے۔" ؎۵۲

مولانا ابوالکلام آزاد پر اقتباس ملاحظہ ہو۔

"مولانا آزاد اردو میں اساذہ میں اردو تنقید میں ترقی پسند رجحان کو بڑے موثر اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش کرتے ہیں ان کے یہاں انگریزی میں منطقی طریقہ استدلال ہوتا تھا اور تنقید میں بڑی متانت و علمی سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں انگریزی ادب کا اچھا خاصا اثر ہے" ؎۵۳

اس اقتباس کا انداز بیان سمجھا ہوئے تیر لانے کے برابر ہے اب ذرا مولانا کی تصانیف کے نام ملاحظہ کیجئے۔

"تنقیدی جائزے، روایت و بغاوت، ادب و سماج، تنقید و عملی تنقید ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں ویرانے ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ڈاکٹر [illegible] کی کتاب کا اردو ترجمہ تاریخ ادب اردو" ان کی مشہور کتاب ہے ساحل اور سمندر ان کے امریکہ و [illegible] کے سفر کے تاثرات ہیں۔" ؎۵۴

مولانا محمد حسین آزاد کی تصانیف کا نام ادب کا بچہ بچہ جانتا ہے لیکن مرزا کی تحقیق سب سے دو قدم آگے ہے ان کا طرز استدلال اور ان کے تنقیدی نظریات کا تجزیہ ادب کے طلبہ کے لئے گمراہ کن معلومات ہیں۔

سید احتشام حسین پر موصوف کے خیالات ملاحظہ ہوں۔

"انھوں نے مغرب و مشرق کے امتزاج سے اردو تنقید میں ایک نیا رنگ پیدا کیا ہے ان کی تنقیدوں میں مادی اور معاشی پہلو نمایاں رہتا ہے ترقی پسند ادیبوں میں بحیثیت نقاد اور افسانہ نگار ان کا بلند مقام ہے ایک ادبی مطالعہ کی غرض سے آپ امریکہ جا چکے ہیں جو ان کی مقبولیت اور لگن کا ثبوت ہے۔" ؎۵۵

؎۵۱ جائزہ تاریخ اردو ادب، شرافت حسین مرزا، سرسید بکڈپو علی گڑھ ۱۹۷۱ء ؎۵۲ جائزہ تاریخ اردو ادب، شرافت حسین مرزا، ص ۱۴۳

؎۵۳ ایضاً ص ۱۴۳ ؎۵۴ ایضاً ص ۱۴۳

؎۵۵ ایضاً ص ۱۴۲

اور فنی خصوصیات کے بیان میں دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔

یہ تالیف اپنے کذب اور اختراعی بیانات کی روشنی میں ادب کے نام پر ایک بدنما داغ ہے۔

اردو ادب کی تاریخ (حصہ اول نظم)

سید ابو العاصم رضوی

سید ابو العاصم رضوی کی تالیف سنہ ۵ق م سے بیسویں صدی تک تمام لسانی اور فکری و ادبی تحریکوں کا جائزہ اور ان ادوار کے تمام نمائندہ شاعروں کی شعری تخلیقات پر تنقید و تبصرہ معہ نمونۂ کلام کے مواد سے پر ۴۴۳ صفحات پر محیط ہے۔ اس کی اشاعت ۱۹۷۵ء میں ہوئی ہے اس کی غرض و غایت پر مؤلف پیش لفظ میں رقمطراز ہیں کہ

"اس وقت اردو ادب پر تین قابل ذکر کتابیں موجود ہیں اولاً رام بابو سکسینہ صاحب کی پُر مغز اور گراں قدر تصنیف "تاریخ ادب اردو" جو پچاس ساٹھ برس پرانی ہونے کے باوجود جدید لسانی تحقیقات اور بیسویں صدی کے شاعروں اور تحریکوں سے تقریباً خالی ہے۔

ثانیاً محمود اکبرآبادی کی تالیف صحیفۂ تاریخ اردو جس میں گھس گرج خودنمائی دعائے تحقیق اور درستی، سوب زیادہ ہے اور ادبی مواد کم۔ مزید برآں اس میں کسی بھی شاعر کے کلام سے کوئی بھی مثال نہیں ہے۔

ثالثاً ڈاکٹر اعجاز صاحب کی کتاب مختصر تاریخ ادب اردو کم اور مختصر تذکرۂ شعرائے اردو زیادہ ہے نیز اس کتاب میں بھی اکثر و بیشتر شعراء کے کلام کے نمونے موجود نہیں ہیں۔ اور جو ہیں وہ بھی ناکافی ہے۔"[۱]

"موجودہ کتاب "اردو ادب کی تاریخ" میں سنہ ۵ق م سے لے کر بیسویں صدی تک تمام لسانی فکری و ادبی تحریکوں کا ایک سرسری سا جائزہ لیا تاکہ وہ لوگ جنہیں وسیع مطالعہ کا وقت یا موقع نہیں ہے وہ کم وقت میں اردو ادب کی تاریخ سے واقف ہو سکیں۔"[۲]

اس دعوے کے ساتھ پہلے باب میں اردو زبان کے ارتقاء میں اردو کا رشتہ ہند آریائی، ہند ایرانی اور ہند یوروپی سے لگایا ہے۔ ان زبانوں کی بولیوں اور ادوار کا ذکر کیا ہے۔ پنڈت چندر دھر شرما گلیری کے مطابق اردو کا آغاز کھڑی بولی کہا ہے۔"[۳]

---

[۱] اردو ادب کی تاریخ۔ سید ابو العاصم رضوی۔ مجلس ترقی اردو ۲۵/۴۲۰ بادلی ٹیر اکلو دہلی صفحہ ۶

[۲] ایضاً صفحہ ۹

[۳] ایضاً صفحہ ۱۹

(الف) فصل محمد بانوی اور چودہویں صدی میں دکن میں اردو کے الف عنوان میں اردو شاعری بہمنی دور میں صوفیائے سید یوسف راجو، شیخ عین الدین گنج العلم کے مختصر رسالے، شہباز حسینی سید گیسو دراز کی معراج العاشقین و رنظامی کی کدم راؤ اور پدم راؤ۔ اور سولہویں صدی کی ابتدا، بہمنی حکومت میں عماد شاہی، نظام شاہی، احمد نگر، برید شاہی بیدر، قطب شاہی گولکنڈہ، عادل شاہی بیجاپور کا ذکر آیا ہے۔

اس باب کے (ب) ذیل میں ابراہیم عادل شاہی دور میں شاہ اشرف بیابانی، شاہ میراں جی برہان الدین جانم اور رفائی کا تذکرہ ہے۔

(ج) کے ذیل میں ابراہیم عادل شاہ ثانی، عبداللہ قطب شاہ، مقیمی، ہستی، ملک خوشنود، امین، علی عادل شاہ ثانی شاہی، نصرتی، ہاشمی، بحری، دولت اور شاہ ملک کی تصانیف کا ذکر ہے۔ دیگر شعرا تحسین، قادر، ممتاز، علی، مرتضیٰ، حسین، کریم، ندیم، معظم، مومن، شاہ ابوالمعالی، محمد، ترابی، نعمت، عبدالقادر اور عبداللطیف کا نام دیا گیا ہے۔

(د) کے ذیل میں محمد قطب شاہی دور اردو شاعری ادبی اعتبار سے اس دور کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) ابتدائی دور میں زبان کی خصوصیت۔

(۲) دور عروج میں قلی قطب شاہ کے کلام کے نمونے وجہی کی قطب مشتری کا ذکر ہے۔

(۳) شیخ احمد، محمد قطب شاہ اور غواصی کا ذکر کیا ہے۔

(۴) دور انحطاط میں ابوالحسن تانا شاہ کا مذکور ہے۔

تیسرا باب سترہویں صدی کے ذیل میں ولی اور اس کے دور کا جائزہ لیا ہے اس کی شاعری کی خصوصیت بیان کیا ہے لیکن ہم عصر شعرا کی خصوصیت بیان نہیں کی ہے۔

چوتھے باب میں شمالی ہند میں شاعری کا چرچا، سیاسی اور مذہبی پس منظر کے عنوان سے محمد شاہ، شاہجہاں، شاہ عالم، جہاندار شاہ کے ادوار کی تاریخ، شاکر ناجی کے شہر آشوب کا ذکر کیا ہے۔ نیز سودا اور قائم کے شہر آشوب کا ذکر کیا ہے۔ تصوف کے اثرات میں ولی کی آمد، محمد شاہی عہد میں بتایا ہے۔ شمالی ہند میں شاعری کا پہلا دور میں میر زٹلی کو شامل کیا ہے ایہام گوئی میں خان آرزو، آبرو، مضمون اور یک رنگ کا ذکر ہے۔

شاعری کا تیسرا دور متقدمین شعرائے اردو میں حاتم کی اصلاح زبان کی تحریک کا ذکر ہے۔

فغاں، مظہر جانِ جاناں کے کلام کے نمونے بھی ہیں۔

پانچواں باب دبستانِ دہلی: میر اور سودا کا عہد۔ اس دور کی شاعری میں تشبیہات و استعارات کا برمحل استعمال معیارِ شاعری بتایا ہے۔ عہد کی خصوصیات میں ایہام گوئی کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا ہے۔ عربی و فارسی کے لفظوں کی تراکیب، میر، سودا، درد، سوز، قائم اور حسن کو اور آخر میر حسن کو غزل گو اور حسن، میر اور مصحفی کو مثنوی گوئی کا فروغ دینے والا کہا ہے۔ سودا، سکندر، مسکین، گدا، آغا تقی، افسردہ اور احسان نے مرثیہ کو واسوخت، مخمس، مسدس اور مسمط کو میر، سودا، اور میر ضاحک نے بامِ عروج پر پہنچایا۔ میر، سودا، درد، سوز، یقین، ضیا، قائم اور میر حسن کا ذرا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

ساتواں باب: دبستانِ لکھنؤ ۱۷۲۴ء تا ۱۸۵۷ء، سیاسی، تہذیبی، سماجی پس منظر تفصیل کے ساتھ لکھنؤ کے محرم کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ لکھنویت کا مفہوم بتا کر یہاں کی شاعری کی خصوصیات میں تشبیہات و استعارات، غیر فطری پن، معاملہ بندی، جرأت کی تفصیل سے شروعات ہے۔ انشا، مصحفی، رنگین وغیرہ۔

آٹھواں باب: مثنوی میں میر حسن کا ذکر کیا ہے۔

نواں باب: میں نظیر اکبر آبادی اور ان کی شاعری کے مختلف نمونے دے کر بحث کی ہے۔

دسواں باب۔ دہلی کے شعراء نے متوسطین میں شاہ نصیر، ذوق، غالب، مومن، اور ظفر کا شمار کیا ہے۔ ان کے کلام نمونے کے طور پر ہیں۔

گیارھواں باب: لکھنؤ کے شعراء نے متوسطین میں آتش، ناسخ کی اصلاحات پر روشنی ڈالی ہے۔ مرثیہ میں خلیق، فصیح، ضمیر، اور دلگیر کو مرثیہ کے تعمیری دور میں شمار کیا ہے۔ عروج میں انیس و دبیر کا شمار ہے۔ مشاہیر کے مرثیوں میں حالی، چکبست، اور اقبال، نظم طباطبائی۔

رباعی کے ذیل میں انیس، حالی، اکبر، رواں، اور جوش کو شامل کیا ہے۔ لکھنؤ کے شعراء نے متاخرین میں وزیر، برق، رشک، مہر، بحر، جلال، قلق، امانت، منیر، محسن کاکوروی۔ آتش کے سلسلے سے دیا شنکر نسیم، شوق، رند، صبا کو شمار کیا ہے۔

چودھواں باب: بیسویں امیر و داغ کے زمانے میں تسلیم دہلوی، داغ، امیر مینائی، وحشی دیوبندی، شیفتہ، تسکین، سالک، مہدی، مجروح، حالی اور ذکی کا ذکر ملتا ہے۔

پندرھواں باب: دورِ جدید نظم جدید میں آزاد اور حالی سے شبلی، اسمٰعیل میرٹھی، شفق، اکبر آبادی،

شوق قدوائی، سرور جہان آبادی، نظم طباطبائی، چکبست اور شاد عظیم آبادی، کا ذکر اور نظم کی مختصر تعریف ہے۔

سولہواں باب۔ دور حاضر میں اردو شاعری پر مغربی فنون اور فلسفہ کا ترجمہ اور اصلیت اور واقعیت کا ذکر کیا ہے۔ اس میں صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، جگت موہن لال رواں، امجد حیدرآبادی، ڈاکٹر اقبال، سیماب، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، حسرت موہانی، فانی بدایونی، جوش، حفیظ جالندھری، ریاض خیرآبادی، آرزو لکھنوی، فراق گورکھپوری، شفیق جونپوری، معین احسن جذبی، فیض احمد فیض، نوح ناروی، بیخود دہلوی، مولانا محمد علی جوہر، قیوم نظر، ابن انشا، محمد صفدر، ڈاکٹر وزیر آغا، یاس یگانہ چنگیزی، محمود دہلوی، چنگیزی، ساغر نظامی، احسان دانش، اختر شیرانی، ماہر القادری، یوسف ظفر، عبد العزیز خالد، جیلانی کامران، مجاز ردولوی، اثر، علی سردار جعفری، انسب مظفر نگری، شمیم کرہانی، عامر عثمانی، انور صابری، نعیم صدیقی، حفیظ میرٹھی، مخمور سعیدی، جگن ناتھ آزاد، جاں نثار اختر، نشور واحدی، سکندر وجد، اختر انصاری، روش صدیقی، احمد ندیم قاسمی، وامق جونپوری، جاوید وششٹ، عنوان چشتی، کیفی اعظمی، کلیم عاجز، احمد فراز، فنا، شکیل، مجید لاہوری، سراج قادری، ابوالمجاہد زاہد، کوثر نیازی، ظہیر کاشمیری، احمد ریاض، ملا، اختر الایمان، قمر عثمانی، میراجی، ن م راشد، فطرت انصاری، آل احمد سرور، عرش ملسیانی، غلام ربانی تاباں، مجروح سلطانپوری، قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی، سلام مچھلی شہری، عبد الحمید عدم، عندلیب شادانی، تلوک چند محروم، خمار بارہ بنکوی، ولاور فگار، صبا افغانی، منظور احمد، طفیل ہوشیارپوری، کلیم عثمانی، ممتاز ثاقب، رفعت سروش، نازش پرتاپگڑھی، واقف مرادآبادی، اقبال صفی پوری، بیکل اتساہی، شاد تمکنت، مخدوم محی الدین پر یہ باب ختم ہوتا ہے۔

اٹھارواں باب:۔ اردو ادب کے چند رجحانات اور تحریکوں سے متعلق طنز کی تحریک کا بانی جعفر زٹلی بتایا ہے سودا کی ہجو کو اسی کا روپ کہا گیا ہے۔

تصوف کی تحریک کا ولی کو بانی کہا ہے ہجو کی تحریک کو سودا سے منسوب کیا ہے۔ اور مدح کی تحریک کا بھی بانی کہا ہے قنوطیت کی تحریک کا بانی میر تقی میر کو کہا ہے جمالیات کا بانی میر حسن کو بتایا ہے۔ ریختی کی تحریک کا بانی سوز۔ مرثیہ کی تحریک کا بانی سنگ بنیاد دکن کو بتایا ہے۔ معاملہ بندی کی تحریک کا بانی انشاء اور جرأت کو بتایا ہے رجائیت کی تحریک نظیر اکبرآبادی سے وابستہ بتائی ہے۔ اصلاح زبان کی تحریک کا بانی ناسخ کو لکھا ہے۔

جذبات نگاری کی تحریک کا بانی مومن کو بتایا ہے۔ ظہور راے کی تحریک امانت اور گیت کی تحریک ظفر سے منسوب کرتے ہیں۔ فلسفیت کی تحریک کا سہرا غالب کے سر باندھ کر داغ کو روزمرہ کی تحریک کا بانی کہتے ہیں۔ طنز و مزاح کا بانی اکبر کو بتایا ہے۔ اسلام پسند تحریک اقبال کے لئے مخصوص کیا ہے۔ رومانی تحریک کی ابتدا جوش اور اختر شیرانی سے کی۔ ترقی پسند تحریک کی ابتدا فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، مخدوم، کیفی، ساحر اور اختر شیرانی سے ہوئی۔

۴۴۴ صفحات سے فہرست ماخذات کا اندراج ہے۔

پیش لفظ میں مؤلف نے دعوی کیا لیکن ٹھوکر کھائی ہے کیونکہ بیشتر مقامات پر شعراء کے نمونۂ کلام نہیں پیش کیا۔ زبان کے ارتقاء پر سیر حاصل بحث نہیں کی۔ نہ زبان کی نشوونما کا مسئلہ حل کر سکا۔ زمانی اعتبار سے شعراء و ادباء کی تقسیم میں بے ترتیبی ہے۔

اس تاریخ کی سب سے بڑی خامی ماخذات کی ہے۔ زیادہ تر ماخذ "تاریخ ادب اردو" "علی گڑھ اور لکھنؤ کا دبستان شاعری" "آب حیات" اور "شعر الہند" جب کہ بہت سے بیانات معتبر نہیں ہیں۔

ذیل میں کچھ اغلاط کی نشاندہی ضروری ہے۔

۱۔ صفحہ ۲۲ پر خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا سید گیسو دراز لکھا ہے۔ نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو کدم راؤ پدم لکھا ہے۔ بریدشاہی (بیدر) کو بدر لکھا گیا ہے۔

۲۔ صفحہ ۱۹ پر ماہر لسانیات کے مطابق اردو کا آغاز کھڑی بولی سے ہوتا ہے۔ لیکن کھڑی بولی سے اردو کا آغاز کسی محقق نے نہیں لکھا ہے۔

۳۔ صفحہ ۲۰ پر امیر خسرو کو زبان دہلوی کا شاعر لکھا ہے۔ اسی صفحے پر ہندی کا شاعر بھی لکھا ہے۔ کون سا بیان صحیح مانا جائے۔ ویسے امیر خسرو کو محققین نے ہندوی کا شاعر کہا ہے۔

صفحہ ۲۱ پر خواجہ مسعود سعد سلمان ہندوی زبان میں شعر کہتے تھے۔ لیکن ایک شعر بھی بطور نمونہ نہیں پیش کیا۔ یہ بیان غلط ہے۔

۴۔ زبان کے ارتقاء کے باب میں گجرات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ خوب محمد چشتی اور شاہ باجن جیسے صوفیاء کے نام سے کون واقف نہیں ہے۔

۵۔ صفحہ ۲۲ چندربھان برہمن کی غزل کو محققین کے حوالے سے اردو کی پہلی غزل بتایا لیکن محققین کا نام نہیں لکھا۔ غیر معتبر دیوان پر بھروسہ کر کے لکھ دیا ہے۔

۶۔ ص۲۵ شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالے کے حوالے دے کر کسی رسالے کا نام نہیں دیا۔ ماخذ کا حوالہ بھی نہیں دیا گیا کیونکہ یہ محض روایتی بات ہے۔ یوسف راجہ کے "سہاگن نامہ" رسالہ کا نام ہے مگر حوالہ نہیں دیا ہے۔

۷۔ قلی قطب شاہ کا شعر غلط ہے۔ "پیا باج پیالہ پیا جائے نا"

غلط۔ پیا باج یک تل جیا جائے نا

صحیح۔ پیا باج پیالہ پیا جائے ۔۔ نا
پیا باج یک پل جیا جائے نا

۸۔ ص۸۵ پر ولی کے معاصرین میں سراج اور عزلت کو شامل کیا گیا ہے۔ سراج کا دور بعد کا ہے۔

۹۔ ص۱۲۱ پر جرأت کا ذکر پہلے اور انشا کی تفصیل بعد میں کی گئی ہے۔

۱۰۔ ص۔ دور جدید میں ص۶۴۲ پر ان شعراء کا ذکر ادبی لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا جیسے یوسف ظفر، عبدالعزیز خالد، سید مقرب حسین، جیلانی کامران، حیرت شملوی، انسب مظفر نگری، ممتاز جاوید، شورش مجید لاہوری، صبا افغانی، کلیم عثمانی، ممتاز، واقف مرادآبادی، اقبال صفی پوری، بیکل اتساہی وغیرہ۔ بعض مشاعرہ باز شعراء کو بھی ادبی تاریخ میں ادب کا معمار سمجھا گیا ہے۔

۱۱۔ شعراء کی ترتیب میں زمانی حدود کا کوئی خیال نہیں رکھا۔ جیسے بیکل اتساہی عنوان جوش کا ذکر پہلے اور آخر میں شاذ تمکنت اور مخدوم محی الدین کا ذکر کیا ہے۔

۱۲۔ ص۱۴۷ پر اصلاح زبان کی تحریک کا بانی ناسخ کو بتایا ہے۔ حالانکہ حاتم نے دہلی میں اس کی شروعات کی تھی۔

۱۳۔ مصنف نے اصناف سخن کے رجحان کو تحریک کا درجہ دے دیا ہے اسی لیے اٹھارویں باب میں اصناف سخن شاعر کی فنی شناخت کو "نئی تحریک" کا نام دے کر اس موضوع کا بانی لکھا ہے۔ تحریک اور رجحان، اصناف سخن اور فنی خصوصیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

تدریسی اعتبار سے مصنف نے بتایا دوسری تاریخوں پر "پیش لفظ" میں تنقید کی لیکن ان تاریخوں میں علاوہ خامیاں اپنی تاریخ میں در آئیں اور مصنف بے خبر ہے۔

۔ جیسی کوشش اچھی کی گئی تھی۔ اپنے تنقید و تبصرے کے اعتبار سے مافی الضمیر کا اظہار بعض مقامات پر صاف

نہیں کر پایا نتیجہ یہ ہوا کہ بے احتیاطی میں ادبی وغیر ادبی تمام اشعار کی فہرست تیار ہوگئی۔ تدریسی اعتبار سے یہ کتاب اتنی کامیاب نہیں جتنی کہ سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس میں کئی باتیں ابتدائی معلومات وغیرہ ضمنی دیے گئے ہیں۔ جن کو طلبہ سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

مصنف شاید اسی ناکامی کے سبب دوسرے حصے پر مزید عرق ریزی نہ کر سکا۔

مختصر تاریخ ادب اردو

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

"مختصر تاریخ ادب اردو" ڈاکٹر اعجاز حسین کی تالیف ہے اور درسی کتابوں میں خاص اہمیت کی حامل ہے اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

زیر نظر کتاب نثر کے ۱۱ ابواب۔ نظم کے آٹھ ابواب اور یک عرضِ حال پر مشتمل ہے عرض حال میں وجہ تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ دورانِ تعلیم جو دقتیں محسوس ہوئیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"اردو پڑھتے پڑھاتے وقت کثر یہ کمی محسوس ہوئی کہ اس زبان میں تاریخ ادب پر کوئی ایسی کتاب نہیں جو اس کی ابتدائے آفرینش سے آج تک کا حال بتا سکے۔ کوئی کتاب امیر و داغ تک پہنچتے پہنچتے خاموش ہو جاتی ہے۔ اور اگر کوئی چند قدم آگے بڑھتی بھی ہے تو موجودہ دور کے نثر نگاروں کا ذکر کیا ہے شعرا کی اچھی خاصی تعداد پر انفرادی حیثیت سے کوئی تبصرہ و تنقید نہیں پیش کرتی۔ اور شاید ایسی تو اس وقت تک کوئی کتاب ہی نہیں جو تاریخی لحاظ سے نثر نگاری کے سلسلہ میں موجودہ دور کے طرز تحریر وغیرہ پر روشنی ڈال سکے۔"[۱]

پہلا باب زبان کی ابتدا اور دکن کی خدمات کے بارے میں ہے۔ زبان کی ابتدا کے متعلق مختلف نظریات نے اس مسئلے کو کافی الجھا دیا ہے۔ اور وہ اپنے بیان سے مطمئن نہیں ہیں ص۲ اس میں جن شعرا کا ذکر ہے ان کی تفصیل باب ۱۹ کے ذیل میں دی جاسکتی ہے۔

باب نمبر ۱ — صفحہ ۱ تا ص۲
باب نمبر ۲ — شمالی ہند — صفحہ ۲۲ تا ص۳۰

---

[۱] مختصر تاریخ ادب اردو۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین۔ ص۳

باب ۳ — صفحہ ۲۲ تا ۳۴

باب ۴ — 〃 ۳۵ تا ۴۱

باب ۵ — 〃 ۴۲ تا ۴۷

باب ۶ — 〃 ۴۸

باب ۷ — 〃 ۴۹ تا ۵۵

باب ۸ — 〃 ۵۶ تا ۵۹

باب ۹ — 〃 ۶۱ تا ۶۴

باب ۱۰ — 〃 ۶۵ تا ۷۳

باب ۱۱ — 〃 ۷۴ تا ۱۰۷

ہر باب کے آخیر میں اس دور کی خصوصیت بیان کی گئی ہیں حالات زندگی مختصر ہیں کلام پر تنقید کلام کے موقع پر بھی مدنظر رہی ہے تنقید میں قریب قریب ہر جگہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کی کوئی امتیازی خصوصیت نظرانداز نہ ہونے۔

مصنف کی نمایاں خصوصیات کو ہر جگہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے حالات اور کلام کی فراہمی میں ڈاکٹر صاحب کو جو دقتیں پیش آئیں ان کا ذکر کیا ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے باوجود اصرار اور تقاضے کے بروقت مواد فراہم نہ کیا۔

قدیم شعراء کی ترتیب میں زمانی ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے موجودہ شعراء کی ترتیب میں کوئی التزام نہیں ملتا۔ مصنف کو جیسا جیسا مواد ملتا گیا وہ پریس کو بھیجے گئے۔

حصہ نثر میں باب ۱ اور ۲ میں فورٹ ولیم کالج اور اس کے باہر کے مصنفین کا تذکرہ ہے باب ۳ میں نثر کی ترقی میں صفحہ ۱۲۰ تا صفحہ ۱۲۶ تک شبلی کی خدمات کا ذکر ہے مقالات اور صحافت کے باب ۴ میں صفحہ ۱۳۲ تا صفحہ ۱۳۶ کا مذکور ہے۔

تنقید کے باب میں صفحہ ۱۲۹ سے صفحہ ۱۳۱ تک تنقیدی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ناول نگاروں میں نذیر احمد سے راشد الخیری تک کے ناول اور ان کے فن کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

مختصر افسانے کے باب میں پریم چند سے سعادت حسن منٹو تک جائزہ لیا ہے۔

آخری باب میں ذیل کا ذکر ہے :-

۱۔ زبان کی ابتداء کا باب غیر تسلی بخش ہے ۔

۲۔ معراج العاشقین کو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف ہی قرار دیا ہے ۔ صہ

۳۔ شاہ برہان الدین جانم کو خانم کو لکھ دیا ہے ۔ صہ ۳۶

۴۔ صہ ۲۱ پر لکھتے ہیں "سب رس" اردو میں ۱۰۴۵ھ میں تصنیف ہوئی ۔

وجہی کی دوسری کتاب "تاج الحقائق" ہے اس کے بارے میں لکھی ہوئی سطریں کاتب کی لاپرواہی کی نذر ہو گئیں ۔ "تاج الحقائق" کو بعض محققین نے وجہہ الدین کی تصنیف قرار دیا ہے "جمیل جالبی" ۔

۵ ۔ اس کتاب کو نور السعید اختر صاحب نے مرتب کر کے شائع کیا ہے اور نصیر الدین ہاشمی کی کتاب دکن میں اردو" مطبوعہ ۱۹۶۰ء میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے ۔ (صہ دکن میں اردو)

۶ ۔ ولی کو اورنگ آبادی لکھا ہے ۔ صہ ۳۳ ان کو بعض اہل قلم افسر جونا گڑھی اور ظہیر الدین مدنی گجراتی کہتے ہیں اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے ۔

۷ ۔ دکن میں مرثیہ نگاری کا باب تشنہ ہے ۔ بیانات نامکمل ہے ۔

۸ ۔ شمالی ہند کے ادب کے ضمن میں برہمن کی غزل کو نقل کیا ہے اسے اولیت دی ہے ۔ برہمن کے نام اس غزل کا انتساب غلط ہے ۔ مسعود حسین رضوی نے فائز محمد حسن آبرو اور عبدالحق نے حاتم کو شمالی ہند کا پہلا شاعر قرار دینے کی کوشش کی ہے ۔

نثر کی تاریخ دکن میں نثر کے سب سے بڑے وجود کی نشاندہی کرتے ہوئے دکن کی تصانیف فارسی کے دکنی تراجم پر روشنی ڈالی گئی ہے اس کے بعد شمال کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے ۔

صہ ۵۵ پر معراج العاشقین خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف قرار دیا ہے

فورٹ ولیم کالج کے متعلق اہل قلم کا تذکرہ تشنہ ہے ۔ عصر حاضر کے بعض نثر نگاروں کا بیان نامکمل ہے ۔

ظفر علی خان کی نظم و نثر کی کتابوں میں سے صرف ان کے مجموعۂ کلام بہارستان کا ذکر کیا ہے ۔ صہ ۳۲۵

تنقید کا باب حالی اور شبلی جیسے معتبر نقادوں کے ذکر سے خالی ہے ۔ صہ ۳۲۶

اور صحیح کے لکھنے والوں میں سے کسی ایک کا نام نہیں دیا ۔ صہ ۳۴۱

بعض ماخذات کے صفحات نمبر نہیں ہیں ۔

۱۔ تاریخ زبان اردو

۲۔ اردو شہ پارے

۳۔ دکن میں اردو

۴۔ مثنوی لعل و گوہر

۵۔ علی نامہ

۶۔ بہار گلشن

۷۔ جہاز جاوید

۸۔ آئینۂ معرفت

۹۔ مضامین چکبست

۱۰۔ گلشن حیات

۱۱۔ دیوان ناصری

۱۲۔ جوئے شیر

"اردو تنقید کا ارتقاء" میں ڈاکٹر عبادت بریلوی اس تاریخ کے ضمن میں فرماتے ہیں۔

"غرض یہ ہے کہ مختصر تاریخ ادب اردو کی تنقید میں یک حد تک سائنٹفک تنقید کی خصوصیت ملتی ہیں لیکن تفصیل اور گہرائی کی اس میں بھی کمی ہے پھر بھی دوسری تاریخوں کے مقابلے میں جہاں تک تنقید کا تعلق ہے اس کا مرتبہ بلند ہے۔ [۱]

تعارف تاریخ اردو

شجاعت علی سندیلوی

مؤلف ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کی تالیف تعارف تاریخ اردو ۳۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ تین حصوں میں منقسم موضوعات کے تحت درج ذیل عنوانات کا احاطہ کرتی ہے :

حصہ اول : آغاز اردو، ابتدائی دور کے نمونے، شمالی ہند اور جنوبی ہند میں اردو کے مختلف نام

حصہ دوم اردو نظم۔ نظم اور مشہور اصناف سخن کی تاریخ شاعری کے اسکول اور مشاہیر شعراء اردو۔

۱۔ اردو تنقید کا ارتقاء، ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۱۵۵

حصۂ سوم اردو نثر:- اردو نثر کی تاریخ مشہور متداول اصناف کا تعارف اور مشاہیر ادب اردو کے چند اداروں مؤلف نے "اردو کی تشکیل" کا مخلوط نظریہ پیش کیا ہے ذیل کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:-

"علاقوں کے اعتبار سے مسلمانوں کے مرکز سندھ، پنجاب اور دہلی رہے انھیں علاقوں کی زبان کے الفاظ ملے جو زیادہ تر عربی، فارسی اور ترکی تھے یہی مخلوط الفاظ اردو کے پیدا ہونے کے سبب بنے"۔ [1]

مؤلف نے شمالی ہند میں اردو کے ابتدائی نمونے صوفیا کرام کے ملفوظات اور جنوبی ہند میں شیخ گنج اعلم اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے بتایا ہے۔ اردو نظم میں مختلف اصناف کے مفہوم اور تاریخ کا مختصر جائزہ لیا ہے دلی، لکھنؤ اسکول کے علاوہ جدید اسکول کی شاعرانہ خصوصیات اور علم و فن کے نکات پر مختصراً لکھا ہے۔

متقدمین میں ولی سے حاتم تک متوسطین میں سودا سے میر تقی میر تک، متاخرین میں شاہ نصیر دہلوی سے تسلیم تک مشاہیر جدید شاعری میں آزاد سے اقبال دو، حاضر میں محمد علی جوہر سے نشتر واحدی ترقی پسند شعراء میں مجاز سے معین حسن جذبی تک تمام شعراء تک کے کلام کے انتخاب کی روشنی میں مختصر تبصرہ کیا ہے۔

نثر کی تاریخ میں جنوبی ہند کے وجہی کی سب رس شمالی ہند میں فضلی کی کربل کتھا اور فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات پر روشنی ڈال کر رقعات غالب سے نثر میں تبدیلی کے امکان کو تسلیم کیا ہے۔ نثری اصناف کا مختصر تاریخی جائزہ لیا ہے۔

فضلی سے تحسین تک یوروپین مصنفین کنبل سے گلکرائسٹ، فورٹ ولیم کے مصنفین میں میر امن سے مرزا جان طپش تک فورٹ ولیم سے باہر کے سید انشا سے مرزا غالب سر سید سے وقار الملک تک، ادب اور تنقید میں لسانیات میں چکبست سے ممتاز حسین تک مقالات و صحافت میں مہدی افادی سے حیات اللہ انصاری تک، ناول اور افسانہ نگاری میں سرشار سے کنہیا لال کپور تک ڈرامہ نگاروں میں طالب بنارسی سے سید امتیاز علی تاج تک تمام انشا پردازوں طنز و مزاح، ڈرامہ نگاروں ناول و افسانہ نگاروں وغیرہ پر مختصر مگر جامع معلومات کا مواد پیش کیا ہے۔ اردو کے اشاعتی اداروں کا تذکرہ ان کی تاریخ اور کارکردگی میں فورٹ ولیم سے انجمن اسلام بمبئی اور ادارہ فروغ اردو لکھنؤ۔

---

[1] تعارف تاریخ اردو - ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ص ۲

کی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ اس تاریخ میں ذیل کے اغلاط تدریسی تاریخ کے کردار کو متاثر کرتے ہیں لیکن تحقیق کی روشنی میں

۱۔ اردو کی تشکیل کا واضح تصور نہیں ہے۔

۲۔ امیر خسرو کو اردو نظم کے موجد تسلیم کرنا خلاف تحقیق ہے۔ صہ ۳۳

۳۔ کئی بیانات کی سند پیش نہیں کی گئی نہ کتابیات کا مواد موجود ہے۔

۴۔ ترقی پسند شعرا کے باب میں کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی کا تذکرہ نہیں ہے۔

۵۔ رپورتاژ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

مندرجہ بالا اغلاط تحقیقی مقاصد کی کسوٹی ہے لیکن تدریسی مقاصد کی بنیاد پر یہ غلط اندازی معاونت میں طلبہ کو متاثر نہیں کرتے۔ اس لیے یہ کتاب سکنڈری معیار کے طلبہ تک تدریسی مقاصد کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہوئی ہے۔

مولف کے بیان کے مطابق بھی اغلاط کا اعتراف انکساری کا نمونہ ہے۔

"اپنی علمی بے مائیگی اور معلومات محدود کے پیش نظر یہ بعید نہیں ہے کہ کتاب میں خامیاں اور غلطیاں ہوں ارباب بصیرت سے ملتمس ہے کہ وہ ان کوتاہیوں سے نہ صرف درگزر فرمائیں بلکہ زحمت فرما کر مجھے مطلع بھی فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں خامی نہ رہے" لہ

مندرجہ بالا اغلاط کی روشنی میں اغلاط کی نشاندہی کتاب میں بھی ضروری ہے۔ تاہم اغلاط کے باوجود کتاب اپنے موضوع کی وضاحت اور تدریسی مقاصد کو پورا کرتی ہے۔ اور تدریسی تاریخوں میں اضافہ کرتی ہے

تاریخ اقلیم ادب

ڈاکٹر انصار اللہ نظر

تاریخ اقلیم ادب، پہلا حصہ، ڈاکٹر انصار اللہ نظر کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ مختصر تاریخ دیگر تاریخوں سے چنداں مختلف ہے اور تدریسی تاریخوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

سکولوں کالجوں تعلیمی اداروں میں اردو زبان و ادب کی تاریخ کی تدریس ایک اہم اور نازک

لہ معارف تاریخ اردو۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی صفحہ ۱۱

مسئلہ ہے۔ نصابی مقاصد مختلف الخیال اساتذہ اور عصری تحقیقات پر گہری نظر اور غائر مطالعہ کے متقاضی ہیں۔ نیز جدید تدریسی مقاصد کے تقاضوں کو پورا کرتی۔

ڈاکٹر انصار اللہ نے مطالعہ کی بنیاد پر اس تاریخ کو مرتب کیا ہے۔ اسی لئے وہ تدریسی معیار پر پوری اترتی ہے۔ نیز اپنے معلمی کے فرائض کی روشنی میں تحقیق کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اسی لئے موصوف نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ مختلف مراکز اور ادوار کی تفصیلات ماخذ کے حوالے طویل حواشی ناقدین اور محققین کی آرا اور گراں باری سے طالب علم گھبرا جاتا ہے۔

اس تاریخ کی اہم خوبی یہ ہے کہ ابتدا میں زبان کے آغاز و ارتقاء کے سلسلے میں مختلف نظریات سے بحث کی گئی ہے۔ پروفیسر شیرانی، مسعود حسین خان کے نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس نظریہ کی تردید کی ہے کہ

"اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ربط و ضبط سے وجود میں آئی" [1]

اور اب ہندستانی کو اردو کا قدیم روپ بتایا گیا ہے۔

شاہ باجنؒ کے تعلق سے شیرانی کے اس قول کی تردید کی گئی ہے کہ انھوں نے باجنؒ کے کلام کو زبان دہلوی کہا ہے۔ کیونکہ باجن نے خود اس زبان کو اپنی کتاب میں "خزائن رحمت اللہ" میں زبان دہلوی نہیں لکھا ہے۔

باب نویں صدی ہجری کی ہندوی تصنیف مآد اور دکنی چند ادب مزید تحقیق کا مطالبہ کرتا ہے شاہ باجنؒ کے تعلق سے لکھا گیا ہے۔

وہ بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے۔ ہندی یا ہندوی میں شعر کہہ لیتے تھے:

دسویں صدی ہجری مطابق سولہویں صدی عیسوی اس باب میں ہندوی کو کل ہند حیثیت کی حامل بتایا ہے کہ مختلف مقامات پر مختلف انداز کی تصانیف وجود میں آئیں۔ لیکن کل ہند صرف شمالی ہند کے بجائے خصوصی خطے دکن اور گجرات میں ہیں اور یہ زبان اس وقت دکن اور گجرات میں اظہار خیالات اور تصنیف کا اہم ذریعہ ثابت ہوئی تھی۔

گیارہویں صدی ہجری مطابق سترہویں صدی عیسوی اس باب میں زبان و ادب کے نئے مراکز اور ادبی زبان پر مقامی زبانوں کے اثرات کے نمایاں ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

---

[1] اعلیم ادب۔ ڈاکٹر انصار اللہ نظر صفحہ

مختلف علاقوں میں زبان و ادب کے حاصل شدہ سرمایہ کا تعارف نظم و نثر اور تاریخ گوئی میں گجرات کی اولیت کا ذکر ہے۔ خوب محمد چشتی کا کتاب اور ہاشم علی مرثیہ گو کے علاوہ بے درد کے دو شاعروں کا ذکر کیا ہے اور دکنی ادبا اور شعرا پر بھی تبصرہ موجود ہے۔

پروفیسر محمود شیرانی کے نظر "پنجاب میں اردو" پر سخت تنقید کرتے ہوئے دکنی اور گجراتی شعراء کی مثالیں پیش کی ہیں۔

حامد باری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ان کے پیر میاں میر کوئی بزرگ تھے"۔

پیر میاں میر اپنے وقت کے ایک مشہور عالم و بزرگ تھے۔۔ بادشاہ نامہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ شاہجہاں کو پیر میاں میر لاہوری اور شاہ فضل اللہ عرف نائب رسول اللہ برہانپوری سے گہری عقیدت تھی۔ صفحہ ۲۲ پر لغات میں ہندوی الفاظ کی شمولیت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ

"پہلا شخص جس نے شعوری طور پر یہ کام کیا۔ برہان پور کا حکیم محمود ایاز تھا" جس نے اپنی تالیف "مفتاح السرور عادل شاہی" میں ایک فصل ادویہ کے فارسی ناموں کے مترادفات پر مشتمل قائم کی۔ یہ رسالہ ۹۲۲ھ میں تالیف ہوا تھا۔

فاضل مصنف کا یہ بیان محل نظر ہے۔ محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمد بدر خزانہ البلخی نے ۸۲۳ھ میں ایک فرہنگ "بحر الفضائل" تالیف کی اس کتاب میں ایک فصل میں ہندوستانی پھولوں اور آلات موسیقی کے نام ہیں اس کے آخری باب کا عنوان ہے: باب چہاردہم در الفاظ ہندوی کی در نظم ... آید ... بابر کے عہد کے حکیم یوسفی نے "علاج الامراض" میں کئی ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں۔

چند خامیوں کے پیش نظر اس تالیف کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ تدریسی تاریخوں میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو جدید انداز سے لکھی گئی ہے۔ زبان اور انداز بیان دلکش ہیں زبان و ادب کے طالب علموں کے لئے مفید اور کار آمد ہے۔

یہ تاریخ تدریسی مقاصد کے تقاضے کو پورا کرتی ہے۔

لے مقالات شیرانی جلد اول صفحہ ۱۱۵

تدریسی تاریخوں کا جائزہ

اصناف ادب اور علاقائی مواد پر تصانیف کے ساتھ ساتھ اردو کی چند مختصر تاریخیں بھی لکھی گئیں جو بیشتر تدریسی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر سید اعجاز حسین کی "مختصر تاریخ ادب اردو" اہمیت کی حامل ہیں۔ ہر چند کہ یہ مختصر ہے لیکن اس میں ادبا و شعرا سے متعلق کافی مواد مل جاتا ہے اور برابر اضافے بھی ہوتے رہے ہیں۔ اس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں دور حاضر کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں خاصا مواد مل جاتا ہے جو دوسری تاریخوں میں موجود ہیں۔

اسی سے ملتی جلتی محمد باقر کی "تاریخ نظم و نثر اردو" ہے اس میں مختصر پیمانے پر عہد بہ عہد مختلف اصناف بالخصوص نثر اور مرثیہ کا ذکر کیا گیا ہے لیکن بیشتر قدیم ڈھانچہ ہے۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادب اردو" ایک جامع کوشش ہے اس کتاب کو آل احمد سرور نے اردو ادب کی پہلی تاریخ کہا ہے اور اس میں نظم کے تمام اصناف اور نثر کا پہلی بار جائزہ لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد صادق کی انگریزی کتاب "A HISTORY OF URDU LITERATURE" ایک اچھی کاوش ہے۔ اس میں اردو کے آغاز کی داستان دکن سے شروع کی گئی ہے اور کلام کے انتخاب میں افراد و واقعات کی تحقیق میں اکثر مقامات پر علاقائی جذبات کے تحت جانبداری کا ثبوت ملتا ہے۔ علاقائی تاریخ و علاقائی ادب کی تاریخ دو الگ موضوع ہیں لیکن ہر تاریخ میں دونوں موضوعات سے بھرپور مواد فراہم کیا گیا ہے۔ اور ایک دوسرے کو اس طرح گڈمڈ کر دیا گیا ہے کہ حد فاصل قائم کرنا مشکل ہے۔

ان تاریخوں میں "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" "ادبی شہ پارے" ایسی تصانیف ہیں جو اپنے علاقوں کے مخصوص عہد کے ادبی ماحول کا خاکہ پیش کرتی ہیں۔ ان میں سے ایسے شعرا اور ادبا بھی شامل ہیں جن کا مقام ادب میں متعین کر کے ادب کے اقدار سے چشم پوشی کرنا ہے۔

سخنوران گجرات ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کی تاریخ اپنے حوالوں اور تاریخی شواہد کی روشنی میں جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی کی تصنیف "بمبئی میں اردو" اپنے علاقہ کی ادبی تاریخ کا مظہر عکس ہے۔ علاقائی جذبے سے سرشار تاریخوں میں "پنجاب میں اردو" اپنے تحقیقی مواد کی روشنی میں علاقہ کی نمائندہ تاریخ کہی جا سکتی ہے جس میں زبان کی پیدائش پنجاب کے علاقے سے ثابت کی گئی ہے۔ باقی ماندہ علاقائی تاریخوں میں اپنے علاقے کے ادبی ماحول کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

لسانی نظریہ کو بنیاد بنا کر تاریخ نویسی کا فرض پورا نہیں کیا گیا۔ دکن میں اردو اور نصیر الدین ہاشمی سے اس نظریہ کی بنیاد پر تاریخی مواد فراہم کیا۔ لیکن تحقیقی حقائق میں جن وسائل کو ذریعۂ اظہار بنانے میں ڈاکٹر محمود شیرانی کو جو کامیابی حاصل ہوئی کسی اور علاقائی تاریخ کو ایسی شہرت نصیب نہیں ہوئی ان باتوں کے باوجود ہماری علاقائی تاریخیں کم از کم اپنے اپنے علاقے کے ادبی ماحول اور لسانی ارتقاء کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ یہی علاقائی تاریخیں ہماری تدریسی تاریخوں کو مواد فراہم کرتی ہیں۔

ان تاریخوں میں ڈاکٹر طاہرہ اسعد راشد نظر کی "اقلیم ادب" شجاعت حسین سندیلوی کی "تعارف تاریخ ادب اردو" کو بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔

(۵) دبستانی کتب پر تبصرہ

۱۔ دہلی کا دبستان شاعری — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سنہ ۱۹۶۵ء

۲۔ دبستان لکھنؤ — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی سنہ ۱۹۷۰ء

۳۔ دو ادبی اسکول — ڈاکٹر علی جواد زیدی سنہ ۱۹۷۶ء

۴۔ لکھنؤ کی لسانی خدمات — ڈاکٹر حامد اللہ ندوی سنہ ۱۹۶۳

۵۔ اردو نثر کا دہلوی دبستان — ڈاکٹر عبدالرحیم جاگیردار

۶۔ دبستانی تاریخوں پر تبصرہ

ہمارا دبستانی ادب

ہر زبان میں اپنے مخصوص علاقوں کے حدود میں پائے جانے والے لب و لہجہ، افکار و نظریات، خصوصیات
لسانی، مقامی بولیوں اور زبانوں کے اثرات کا سرچشمہ ہے۔ دنیا کی ہر بڑی زبان بلکہ عام زبانیں بھی جہاں
جہاں وہ بولی پڑھی لکھی جاتی ہیں مقامی بولیوں اور مخصوص زبانوں کے لب و لہجہ، الفاظ، فکری سرمایہ ہر لحاظ
سے مالا مال ہوتی ہے۔ اگر کسی زبان میں فکری سرمائے کے مختلف نظریات، لسانی انفرادیت، علاقائی خصوصیات،
مخصوص اصناف میں مخصوص لب و لہجہ کا فقدان ہوتا ہے وہ زبان ادبی زبان ہوتے ہوئے بھی دنیا کی معروف
زبانوں میں شمار نہیں ہو سکتی۔ ایسی زبان ہر دور میں ارتقا پذیر ہوتی ہے۔ ہر عہد میں ارتقائی منازل طے
کرتی ہے۔ اسی بنیاد پر اس کے ادوار کی تقسیم ہوتی ہے اسی وجہ سے اس کی لسانی انفرادیت قائم ہوتی ہے
نشو و نما کے دور سے ارتقائی عہد اور عصر حاضر تک زبان کی ادبی اہمیت کے مختلف متروک ذخیرہ الفاظ
اسلوب کی تبدیلیاں اصناف کے اصول رائج الوقت اصناف کی ہیئت مستقل لب و لہجے کا تعین، منفرد شعری
خصوصیات، شخصی و علاقائی اثرات کے زیر اثر آنے والے الفاظ اور خیال و زبان کا اصول ادبی قرار ہوتے ہیں۔

یہ تمام خوبیاں ہماری زبان میں عہد قدیم سے آج تک ارتقا پذیر رہی ہیں۔ اسی سبب ہمارے
ادب میں قدیم و جدید ادب کی تقسیم ہوئی اور وجوہات کی بنا پر مختلف علاقوں میں اردو زبان کی تخلیق ہوئی۔ اسی سبب
تصوف، رنگینی، جمالیات اور فلسفہ کی تلاش ضروری ہے۔ ان نظریات کے پیش نظر دبستانوں کی کھوج ضروری
ہماری زبان میں دبستانی ادب کا بیش بہا سرمایہ موجود ہے جس نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے
لسانی اضافی مستقل لب و لہجہ اور لسانی انفرادیت کا عظیم ادب ہماری زبان کو اصلاحی اور تخلیقی نظریات
کی روشنی میں مختلف اصول سماجی و معاشرتی اقدار سے اپنی شناخت کر دی۔

ہمارے دبستانی ادب میں دو دبستانوں کا تصور اہم ہے جس میں لکھنؤ اور دہلی اسکول کا شمار
کیا جاتا ہے۔ ان دبستانوں سے وابستہ شعراء و ادباء ان علاقوں کے پروردہ شعراء اور دبستانی
لوازمین و سامعین تک اپنے فطری مزاج سے کہیں گہرائی کے دلدادہ ہیں کہیں سطحیت پر اکتفا کرتے
ہیں۔ کہیں عورتوں کی زبان کو عورتوں کے انداز گفتگو میں کہنے کے قائل ہیں کہیں اس کے لیے مذکر کے
صیغے کے پابند ہیں کہیں نزاکت نفاست اور لطافت میں عورتوں کے لوازمات کا ذکر خصوصیات
سے معاوضہ ذکر کرتے ہیں۔ کہیں اس سے اجتناب کرتے ہیں کسی مقام پر ایک صنف پر زیادہ توجہ دی گئی؟

کسی جگہ دوسرے صنف کو خیالات کے اظہار کا بہترین پیمانہ بنایا گیا ہے۔ ایک جگہ کچھ الفاظ خالص مذکر کے صیغے میں استعمال ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ وہی الفاظ مونث کے صیغے میں زیر تحریر لائے جاتے ہیں۔ ان تمام ان تمام باتوں کا سراغ لگانے کے لئے ہم اگر اپنے دبستانی ادب کا مطالعہ کریں تو بہت سے حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں۔

قدیم ادب کے مطالعہ سے جہاں زبان کی نشو و نما اور ارتقاء کا انکشاف ہوتا ہے۔ وہیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ہماری زبان علاقائی حدود میں مستقل بولی جانے والی مقامی زبانوں سے متاثر نظر آتی ہے چنانچہ گجرات کی پرانی اردو پر گجراتی، دکن کی پرانی اردو پر مرہٹی، پنجاب کی پرانی اردو پر پنجابی، دہلی کی پرانی اردو پر برج بھاشا، کھڑی بولی اور سنسکرت کا اثر نمایاں ہے۔ اس عہد کی اردو شاعری پر مقامی زبانوں کے خیال، تراکیب، تشبیہات، استعارات، لب و لہجہ کا عکس جھلکتا ہے۔ یہ لسانی خیالی لب و لہجہ کی تفاوت اور انفرادیت بعض اوقات مخصوص مزاج اور شخصی صفت کی بنا پر اکثر علاقوں میں پائی جاتی ہے اس کی مثال سب سے بہتر اور آسان یہ کہ ہر شاعر اور ادیب اپنے لہجے، خیال اور اسلوب کی خصوصیات سے آج بھی پہچانا جاتا ہے۔ ایسے اوصاف اور خصوصیت علاقائی حدود کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہاں کے شعراء اور ادباء کیا ایک عام آدمی بھی گفتگو کے دوران پہچان لیا جاتا ہے۔

اپنے مخصوص انداز گفتگو، زبانی لب و لہجہ، خصوصی الفاظ کی مخصوص ادائیگی اس کی شناخت ہو جاتی ہے۔ ان علاقوں کے شعراء اور ادباء اپنی ادبی کاوشوں اور اشعار کے اظہار خیال میں اپنے اسلوب اور علاقائی زبان کے لفظوں کے برتنے میں مزاجاً اپنی منفرد عادات و اطوار اور فکری سرمایہ میں ان کے دخل کے باعث پہچان لئے جاتے ہیں۔

اکثر علاقوں میں کسی ایک صنف کی مشق آزمائی اور اس صنف میں برتے جانے والے الفاظ و فقرے کردار مختلف صفات کے مالک ہوتے ہوئے بھی علاقہ سے وابستہ انسانی عادات و خصائل سماجی و معاشرتی اقدار کے احترام کی بنا پر اپنی تخلیقات اور کاوشوں پر چھاپ لگاتے ہیں۔

یہ شناخت ایسی ہے جس سے اپنے عہد کا ادیب یا شاعر چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ تحقیقی مزاج اسی خوبیوں اور خامیوں سے دور مختلف علاقوں میں انفرادیت کے عناصر کا سراغ لگاتے ہیں۔

اسی بنا پر عبدالسلام ندوی نے اپنی تصنیف شعر الہند میں دو علاقوں کے شعر دہلی اور لکھنؤ کے

درمیان دبستانوں کو تقسیم کیا اور انہوں نے قولاً نہیں عملاً دونو مقامات کے شعراء میں اضافے کے مخصوص لہجے الفاظ کے منفرد استعمال لسانی نہج پر تذکیر و تانیث کی مثالیں اشعار کے ذریعہ پیش کیا ہے۔

اردو ادب میں یہ پہلا موقع تھا جس میں کسی ادبی تاریخ کے مصنف نے دو علاقوں کے مختلف خیالی لب و لہجہ اور لسانی خصوصیات کے مدنظر جائزہ لیا تھا۔ یہ بات ادب کے تحقیق کے لئے مواد کا اہم ذریعہ ثابت ہوئی چنانچہ عندلیب شادانی نے سب سے پہلے اس مسئلے کو اپنی تحریروں سے عیاں کیا اور انھوں نے شعر الہند کے مصنف سے اتفاق کرتے ہوئے کئی لکھنوی اور دہلوی شعراء کے لب و لہجہ اور خیالی مواد پر مفصل بحث کی۔ مختلف خیال کے نمائندہ اشعار میں لب و لہجہ کے فرق فکری و سطحی مواد زبان کی انفرادیت کو واضح کیا۔ اسی سبب ادب کے محققین اس موضوع پر سوچنے لگے۔ نورالحسن ہاشمی نے دہلی کا دبستان شاعری اور ابواللیث صدیقی نے دبستانِ لکھنو پیش کر کے اس نظریہ کو مزید تقویت پہنچائی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دبستانوں کا قیام کسی تعصب یا کسی ذاتی پرخاش پر نہیں ہوا۔ بلکہ ان علاقوں سے حاصل شدہ مواد اپنی انفرادیت کا اعلان کرتا ہے۔ حالانکہ دبستانوں کی اس تقسیم اور تحقیقی مواد کو بے بنیاد اور رد کرنے کی غرض سے علی جواد زیدی نے دو ادبی اسکول جیسی تصنیف پیش کی۔ لیکن انھوں نے اس طلسم کو توڑنے کے ساتھ دکنی اسکول کے قیام کا مشورہ دیا۔

علاقائی فوقیت کا نیا دکنی اسکول کے قیام سے کھڑا کر دیا۔ حالانکہ دہلی کا دبستان اور دبستانِ لکھنو کے محققین نے دونوں علاقوں کی انفرادی خصوصیات اور لسانی اہمیت لکھنوی اور دہلوی زبان میں لہجے کے مخصوص عناصر کو تلاش کر کے علاقائی انفرادیت کے حقائق کو نمایاں کیا۔

اردو ادب میں مستقل لب و لہجہ کی بنیاد پر دبستانوں کے قیام کا نظریہ پیش کیا ہے علی جواد زیدی نے اپنی تصنیف "دو ادبی اسکول" میں اس طلسم کو توڑنے کی انتھک کوشش کی۔ لیکن دکنی اسکول کا نظریہ پیش کرنے کے سبب علاقائی تعصب سے بری الذمہ نہ ہو سکے۔ اس کے برخلاف اس تصنیف کے بعد حامد اللہ ندوی کی تصنیف "لکھنو کی لسانی خصوصیات" نے ان دبستانوں کی حمایت نہیں کی۔ بلکہ لکھنوی ادباء اور شعراء کی تخلیقات اور کاوشوں کو وسیع کر دیا۔ اس بنا پر لکھنو کی لسانی خصوصیات اپنے علاقے سے منسوب ہوئی۔ اور ان تصنیف سے علی جواد زیدی کے دبستانوں کے رد کردہ نظریہ کی تردید ہو گئی ہے؟

یہ سب تصانیف اپنے عہد سے آج تک دبستانی ادب کی انفرادیت کا آئینہ ہے۔ ہر تصنیف سے شخصی

مزاج اور طبیعت کا راز کھلتا ہے۔ علاقائی حدود کی لسانی خصوصیت اور لب و لہجہ کی تاثیر معلوم ہوتی ہے۔ فکری گہرائی و گیرائی سے سطحیت تک ذہنوں کی سوجھ بوجھ کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز اپنے آبا و اجداد کی سخن فہمی اور سخن گوئی کے کردار کی نسوانیت اور مردانگی کا ثبوت ملتا ہے۔ دبستانی ادب ہمارے ادب کا آدھا سرمایہ ہے۔ اور اس کا مطالعہ یکسوئی سے تہذیبی معیار اور اخلاقی گراوٹ عروج و زوال کی جملہ باتوں کے نتائج اخذ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ معاشرت میں رسم و رواج سے مذہبی عقائد کی منازل تک ہماری کمزوریوں کی ایک داستان سناتا ہے۔ توہم پرستی میں حقیقی زندگی سے فرار کا پردہ اٹھاتا ہے۔ ہر زاویہ فکر سے ہمارا دبستانی ادب زبان کے نشو و نما اور ارتقا کا آئینہ ہونے کے باوجود ہماری مذہبی، سماجی، معاشرتی قدروں کی روپ ریکھا ہے۔ اس لئے دبستانی ادب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

مذکورہ تصانیف سے ہم اپنے دبستانی ادب کا سرمایہ سمیٹ سکتے ہیں۔ ان تصانیف کی روشنی میں اپنے ادب کے معیار اور مزاج کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ ان تصانیف پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ ان خامیوں اور خوبیوں کو اجاگر کرنا ہمارے موضوع کا ایک حصہ ہے۔

ہمارے نزدیک دبستانی ادب کا جائزہ علاقائی تعصب یا شخصی تصانیف کے کردار کو متاثر کرنا نہیں ہے۔ ہمارا مقصد دبستانی ادب کے موضوع پر لکھی گئی تصانیف کی خامیوں اور خوبیوں پر تبصرہ ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ ہمارے ادب میں مختلف دبستان مختلف علاقوں کی ادبی خدمات کا مطالعہ کرنے والے پر عیاں ہو جائیں اور ان نظریات کی دوڑ میں جانب داری و غیر جانبداری کی حکمت عملی کو اپنانے والی تصانیف کا رویہ طشت از بام ہو جائے جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو سکے۔

صنف، زبان، لب و لہجہ، مخصوص محاورے، ضرب الامثال کو برتنا، منفرد خیالات کی پیروی، اخلاقی، سماجی، معاشرتی قدریں، تہذیبی اور فکری سرمایہ کے امتیازی اور انفرادی عناصر فنی اور غیر فنی تحریروں میں در آتے ہیں۔

دبستانوں کی تقسیم یا تشکیل ان مفروضات کی امتیازی اور انفرادی کیفیت سے ہوتی ہے۔ اور ان عوامل کے پیش نظر ہمارے ادب میں دبستان لکھنؤ اور دہلی کے دبستان کی تشکیل ہوتی ہے۔

لکھنؤ کا دبستانِ شاعری

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

ابواللیث صدیقی کا یہ مقالہ کتابی شکل میں ۸۸۷ صفحات پر محیط ہے۔ دس ابواب کے احاطے میں یہ کتاب علاقائی تاریخ کا عمدہ نمونہ ہے۔

باب اوّل کا آغاز سیاسی اور تہذیبی پس منظر کے عنوان سے ۹ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اور فہرست مضامین میں آغاز داستان تاریخ پس منظر کے عنوان سے شمار کیا ہے۔ اس عنوان کے مطابق مصنف لکھنؤ کا سیاسی اور تہذیبی پس منظر واضح کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہے۔

باب دوم تا چہارم میں لکھنؤ کی تاریخ تہذیب، اثرات اور شاعری سے بحث کی گئی ہے۔ لکھنؤ کی شاعری اور تہذیبی محاسن و معائب پر روشنی ڈالی ہے مثلاً

"شجاع الدولہ کے عہد سے حسین و حسین عورتوں کو سوسائٹی میں بڑا دخل ہوا۔ ادھر عیش و عشرت اور فراغت نے مردانہ جذبات و خیالات کو کمزور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کے جذبات و خیالات اور زبان پر نسائیت غالب آگئی۔" [۱]

دوسری جگہ وہ رقمطراز ہیں:-

"وہاں شاعری جذباتی ہوگئی داخلی تھی۔ تو یہاں لفظی اور خارجی ہوگئی۔" [۲]

تینوں ابواب میں لکھنؤ کی تاریخی تہذیبی، سیاسی، معاشرتی خامیوں اور خوبیوں کے پس منظر میں شاعرانہ اوصاف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ رعایت لفظی، ضلع جگت، تشبیہ و استعارات کی بھرمار تکلف اور تصنع کے گواہ ہیں۔

باب پنجم مہاجرین شعرائے دہلی کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں وہ تمام شعراء جو دہلی اجڑنے یا گردش لیل و نہار کے سبب لکھنؤ آگئے تھے ان پر ماحصل تبصرہ کیا ہے۔ سراج الدین علی خان آرزو کی تصانیف میں "غرائب اللغات" بھی شامل ہیں۔ حالانکہ عبدالواسع ہانسوی کی نوادر اللغات کی تصحیح ہے۔ سراج اللغات اور غرائب اللغات کو دو الگ تصانیف سمجھ لیا گیا ہے۔

اس باب میں سراج الدین علی خان آرزو، سودا، میر حسن، میر مستحسن خلیق، قمر الدین منت، جعفر علی حسرت، میر سوز، حیدر علی حیران، میر تقی میر، قلندر بخش جرأت، میر انشاء اللہ خاں انشاء، مصحفی، رنگین اور نسیم دہلوی

---

[۱] لکھنؤ کا دبستان شاعری، پہلا ایڈیشن، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ص۶۲

[۲] ایضاً ص۴۷

کا ذکر ہے۔ لیکن ان شعرا پر طویل تبصرے اور ان کے کلام میں خاص تبدیلیوں کا ذکر نہیں کیا گیا۔
ان شعروں نے لکھنؤ کی فضا پر کیا اثر ڈالا۔ اس پر کوئی رائے نہیں دی گئی۔
باب ششم تا دہم تاریخ اور ان کے سلسلے سے پاس تگانہ چنگیزی تک ہے خاندان داغستانی اور حکیم لکھنوی میں سلسلۂ مصحفی سلسلۂ آتش سلسلۂ امیر مینائی وغیرہ شعرا کے شجرے اور سلسلوں کا خاکہ دیا گیا ہے۔
ان ابواب میں لکھنوی شعرا کے خاص انداز بیان تاریخ کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر متروکات اور شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ نامکمل ہے۔ ان حالات میں سماجی اور معاشرتی اقدار نے شعراء کو کہاں تک متاثر کیا ہے۔ ان باتوں پر مصنف نے نظر کی ہے اور معنی خیز نتائج نکالے ہیں۔ حوالت بیان سے قاری کا دل اکتا جاتا ہے لیکن کلام کے انتخاب میں اعتدال ہے۔
اس کے علاوہ لکھنؤ کے خاص اصناف جیسے مرثیہ رباعی کے پیش نظر مرثیہ کے تاریخ کے باب میں اردو مرثیہ پر خاطر خواہ مواد فراہم نہیں کیا گیا۔
مثنوی، رباعی، قصیدہ کی صنف میں لکھنوی شعرا کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔ مثنوی اور رباعی پر مصنف کی بحث غزل کے اظہار پر سبقت نہیں لے جا سکتی۔
علاقائی ادب کی بنیاد پر یہ تصنیف ایک مرکز ادب کی تاریخ ہے۔ اس سے لکھنؤ کی تاریخ اور زبان و ادب کے مزاج و ماحول پر روشنی پڑتی ہے۔

دلی کا دبستان

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

دلی کا دبستانِ شاعری" نور الحسن ہاشمی کا تحقیقی مقالہ ہے اس تصنیف میں دلی کی زبان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے دلی کی شعری اور نثری زبان کو لکھنؤ کی شاعری اور نثر نگاری سے مختلف ثابت کیا گیا ہے۔ لب و لہجہ کی اہمیت شگفتگی اور گہرائی کی کسوٹی پر عمیق تطبیق محاورہ اور ٹکسالی زبان، عام بول چال کی زبان، کو اپنانے اور برتنے میں اہل دلی کو لکھنؤ پر فوقیت دے کر دلی کی زبان کو ایک الگ اسکول تسلیم کرانے کی بھرپور کوشش کرنے کے باوجود مصنف کی نظر میں اہل دلی کی زبان اور شاعری

لکھنؤ والوں سے بہتر ہے ان امور پر مصنف نے مدلل تبصرہ کیا ہے لیکن حوالہ جات میں سخت حملہ کیا ہے۔ شعرائے کے اسمائے گرامی اور تخلص کئی مقامات پر غلط لکھے گئے ہیں۔ شعراء اور دیگر شخصیات کے سن ولادت اور وفات کے ماخذ غلط ہیں۔ اشعار کا انتساب غلط ہے۔ بعض اشعار کا اگرچہ ماخذ صحیح ہے لیکن اشعار غلط نقل کیے گئے ہیں۔ متعدد مقامات پر واقعات کا ماخذ بالکل غلط ہے۔ بعض واقعات بیان کیے گئے ہیں لیکن ماخذ نہیں پیش کیے گئے۔

اس تصنیف میں زبان کی تاریخ شعراء و ادباء کے فن پر رائیں پیش کی گئیں ہیں لیکن ان بیانات میں آزاد سے عبدالحق تک مختلف تبصرہ نگاروں کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے مصنف کی ذاتی رائے اس مقالہ میں کم موجود ہے۔ کئی مقامات پر غلط ماخذ کی ادائیگی میں اپنی رائے کا استعمال بڑی بے دردی سے کیا ہے۔ کچھ ایسی شخصیات کا بیان کیا ہے جن کا تعلق موضوع یا پس منظر سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ اغلاط اس دبستان میں خارزار کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔

ذیل میں اغلاط کو چار حصوں میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ ولادت و وفات کی سنین کی اغلاط

۲۔ اسماء و تخلص کی اغلاط

۳۔ حوالاجات کی اغلاط

۴۔ اشعار کی غلطیاں، متضاد بیانات

(۱) اغلاط سال ولادت و وفات

اغلاط	تصحیح
ص۷۹ سال وفات ہدایت ابدون جوار ۱۲۱۵ھ	۱۲۷۹ھ تذکرہ ذکا اردہلوی
ص۱۱۱ سال وفات بیدل ۱۱۳۳ھ ۳۰ صفر کے ساتھ	۴ صفر ۱۱۳۳ھ سفینۂ خوشگو ص۱۲۳
ص۱۲۲ سال وفات حاتم ۱۲۰۰ھ	۱۱۹۷ھ معاصر جدید حصہ دوم ص[illegible]
ص۱۲۶ سال وفات مصحفی ۱۲۰۹ھ	۱۲۴۰ھ دیباچہ تذکرہ ہندی
ص۱۳۲ سال وفات احسن ۱۱۶۰ھ	۱۱۳۵ھ
ص۱۴۸ سال وفات سودا	۱۱۹۵ھ تذکرہ ہندی ص۱۴۵ "سودا کجا و آں سخن دل فریب او"

اغلاط	تصحیح
صفحہ ۱۲۲ سال وفات میر تقی میر ۱۲۲۷ھ	۱۲۲۵ھ نوادر الکلام
صفحہ ۱۶۱ سال وفات تاباں ۱۱۶۱ھ	
صفحہ ۱۹۶ سال وفات انشاء ۱۲۳۳ھ	۱۲۳۳ھ آب حیات صفحہ ۲۶۹
صفحہ ۲۱۲ سال وفات رنگین ۱۲۵۱ھ	۱۲۴۳ھ تا ۱۲۱۵ھ تذکرہ طوفان
صفحہ ۲۱۳ سال وفات اثر ۱۲۵۰ھ	۱۲۰۹ھ رسالہ اردو، میخانہ درد صفحہ ۱۶۲
صفحہ ۲۱۵ سال وفات منت ۱۲۰۶ھ	۱۲۰۸ھ کلیات منتون نسخہ کلکتہ (قطع تاریخ)
صفحہ ۲۱۶ سال وفات محب ۱۲۰۲ھ	۱۲۰۵ھ سلیمان شکوہ
صفحہ ۲۲۲ سال وفات حسرت ۱۲۱۰ھ	۱۲۰۰ھ کلیات جرأت نسخہ امیر الدولہ لائبریری
صفحہ ۲۰۶ سال وفات جرأت ۱۲۲۵ھ	۱۲۳۵ھ دیوانہ کمال نسخہ رام پور، دیوان نازش نسخہ خدا بخش
صفحہ ۲۲۲ سال وفات راسخ ۱۱۷۲ھ	۱۱۷۱ھ
صفحہ ۲۲۳ سال وفات دردمند ۱۱۷۶ھ	۱۱۶۹ھ نوائے ادب ۱۹۵۲ء

اسم اور تخلص کی غلطیاں

اغلاط	تصحیح
صفحہ ۱ صفحہ ۲۲ سرب سنگھ دیوانہ	سرب سکھ دیوانہ (دیوان قصائد مصحفی قطعہ امیر)
صفحہ ۲ روشن الدولہ خواجہ سرا	محمد شاہ روشن الدولہ
صفحہ ۵ شہزادہ سپہ سالار قمر الدین خاں	قمر الدین خان محمد شاہ کے وزیر تھے
صفحہ ۱۹ صفحہ ۲۱ نواب سلیمان شکوہ	مرزا محمد سلیمان شکوہ بادشاہ کے بیٹے تھے
صفحہ ۲۳ سنتوکھ رام بے نوا	سنتوکھ رائے بیتاب (معاصر حصہ دوم)
صفحہ ۳۱ سیا ناتھ	سنا تھ سنگھ (خلاصۃ الافکار)
صفحہ ۳۲ ظہور الدولہ مربی مہر	مہر کے کسی مربی کا یہ خطاب نہیں
صفحہ ۳۵ غلام مصطفیٰ خاں یکرنگ	غلام مصطفیٰ (خاں) دیوان زادہ حاتم کے دیباچہ

	یں مرقوم ہے ۔
ص ۳۲/۱ ص ۱۰۳/۵ غلام مصطفیٰ خاں یک رنگ	
ص ۳۳/۳ مہربان خاں رند وزیر غالب جنگ	غالب جنگ کی جگہ احمد بنگش ہو، تھا مہربان خاں احمد بنگش کے وزیر تھے ملازم تھے
ص ۴۵/۱ شیخ چاند	شیخ محمد چاند
ص ۷۵/۱ فتح محمد کا تخلص ولی	فتح محمد کا تخلص دل تھا
ص ۹۵/۵ عبد الغنی قبول	عبد الغنی بیگ قبول
ص ۹۵/۱ میر حیدر علی شاہ حیدر (اشپرنگر فہرست ۲۳۶)	میر حیدر علی شاہ (گلزار ابراہیم)
ص ۱۰۵/۱ نواب اصغر علی خاں نسیم	اصغر علی خاں نسیم (دیوان نسیم کا دیباچہ)
ص ۱۱۶/۱ طبقات الشعراء کا مصنف کریم الدین خاں	کریم الدین
ص ۱۱۶/۱ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی	چراغ دہلی ۔ لقب ہے
ص ۱۱۷/۱ فرہنگ سراج اللغۃ (آرزو)	غرائب اللغات (عبد الواسع ہانسوی)
ص ۱۱۹/۱ آبرو کا لقب مبارک	لقب نہیں عرفیت ہے
ص ۱۲۳ فاخر علی خاں	فاخر خاں
ص ۱۳۳ احسن آبرو	محمد احسن
ص ۱۳۴ سکندر رائے قائم	فارغ
ص ۱۳۶ احسن اللہ	محمد احسن
ص ۱۳۹/۱ ڈھوکے	دوکے
ص ۱۵۰/۵ سلیمان قلی خاں	سلیمان علی خاں (عقد ثریا نسخہ خدا بخش)
ص ۱۶۹ عبد الغنی قبول بیگ	عبد الغنی بیگ قبول
ص ۱۸۳ شیخ علی قلی ندیم ۔ علی قلی ندیم	مراد علی قلی (مخزن نکات)
ص ۲۲۵ مرزا علی قلی ندیم علی قلی خاں ندیم	
ص ۱۰۳ فغاں مرشد آباد سے فیض آباد سراج الدولہ کے پاس چلے آئے تھے ۔	شجاع الدولہ ہونا

صفحہ	اغلاط	تصحیح
ص۱۹	حسن کا نام غلام میر حسین	میر غلام حسن
ص۱۹	میر حسن کے آقا سر فراز جنگ	سردار جنگ
ص۲۱۶	رائے امان محمد شاہی	رائے مان
ص۲۱۳	میاں شناء اللہ فراق	ثناء اللہ خاں فراق مجموعۂ نغز
ص۲۱۱	تمام استادوں کے کلام پر اصلاح دی	تمام کی جگہ بعض ہونا چاہیئے
ص۲۲۳	محمد فقیہ دردمند	محمد فقیہ صاحب آخری لفظ جزو اسم ہے۔
ص۲۲۵	مائل شاگرد قائم	قدرت کے بھی شاگرد رہ چکے تھے
ص۲۲۶	ہدایت اللہ ہدایت	ہدایت اللہ خاں ہدایت
ص۲۲۷	نسیم دہلوی کا پہلا تخلص اصغر تھا۔	اصغر تخلص اصغر علی رامپوری کا تھا۔ نسیم کا اس تخلص سے کوئی تعلق نہیں
ص۲۲۹	شہزدہ معظم محمد احمد شاہ دونوں بھائیوں کے نام کو ملا دیا ہے۔	شاہ عالم اور بہادر شاہ دونوں میں کسی کا نام محمد احمد شاہ نہیں تھا۔
۳۱۵	کیتھر	کیٹھر ہونا چاہیئے۔ مصرعۂ سودا ع "بازو کرا سے جلد کٹھر کو یہ جائے" معیار ص۳۴۶

(۳) حوالہ جات کی اغلاط

صفحہ	اغلاط	تصحیح مع حوالہ
ص۹	مقالات مظہری	اس نام کی کوئی کتاب موجود نہیں معمولات مظہریہ
ص۱۱	آرزو نے فرہنگ سراج اللغۃ ترتیب دی	آرزو چراغ ہدایت لکھی ہے اور سراج اللغۃ کا فرد دوم قرار دیا۔
ص۲۰	خریطۂ جواہر (مظہر) اساتذۂ فارس کے کلام کا مجموعہ ہے۔	اس کتاب میں متعدد ہندوستانی شعراء فارسی کے اشعار موجود ہیں۔

بیان	تصحیح
ص۱۵۱ رسالۂ سودا تنبیہ الغافلین	رسالۂ سودا عبرت الغافلین
ص۱۵۱ سودا کا تذکرہ اب ناپید ہے	سودا نے کوئی تذکرہ لکھا ہی نہیں۔ اس کے حق میں جو شہادت ہے۔ بہت کمزور ہے
ص۱۶۳ کلیات میر میں غزلوں کے چار دیوان ہیں	چار نہیں چھ ہیں۔ دستور الفصاحت ص۲۶
ص۱۶۸ "مثنوی نایاب استاد عمدۃ الملک کی مدح میں لکھی گئی ہے"	استاد صحیح ہے عمدۃ الملک غلط ہے۔
ص۱۸۳ "فغاں نے فارسی دیوان چھوڑا"	فغاں کے دیوان میں فارسی اشعار ملتے ہیں یہ صحیح ہے لیکن ان کا کوئی فارسی دیوان موجود نہیں اور نہ کسی تذکرے سے ثابت ہے۔
ص۲۲۳ دیوان ذوق۔ مرتبہ آزاد و میراں	آزاد سے اس دیوان کا کوئی تعلق نہیں یہ ہے دیوان ۱۲ ہزار اشعار پر مشتمل ہے
ص۲۳۳ "اردو دیوان غالب خیال ہے کہ ۱۸۴۲ء میں پہلی مرتبہ چھپا"	۱۸۴۱ء میں پہلی مرتبہ طبع ہوا۔
ص۲۶۳ "ظہیر الدین دہلوی کے چار دواوین میں سے ایک چھپا ہے"	ظہیر الدین دہلوی کے تین دیوان چھپ چکے ہیں
ص۲۶۷ "نظامی پریس نے "انقلاب دہلی" کے نام سے ایک مجموعہ ان درد انگیز نظموں کا شائع کیا ہے جو دہلی کے نامور شاعروں نے غدر میں دہلی کے تباہی پر لکھی تھیں۔	یہ کتاب "فغان دہلی" کے نام سے پہلی بار چھپی تھی۔ نامور شاعروں سے مصنف کی کیا مراد ہے۔ کیونکہ کئی شاعر اس میں ایسے ہیں جو نامور نہیں اور دہلوی بھی نہیں ہیں۔
ص۲۹۵ سوانح از صفیر مصحفی کا دیوان ۱۲۳۳ھ میں لکھا گیا۔	دیوان کا دیباچہ ۱۲۳۳ھ میں لکھا گیا تھا۔ دیوان ۱۲۳۵ھ میں شائع ہوا کیونکہ میر کی وفات کا قطعۂ تاریخ اس میں موجود ہے جو ۱۲۳۴ھ سے پہلے کا واقعہ ہے۔

(۴) اشعار کی اغلاط مع تصحیح

ص۳ یاں بلبلِ تن نکل گیا داں عیز اپنی کلی لگا کے جاتا ہے۔

اس شعر میں کلی کے بجائے کلی جا ہیئے۔ کلیات میر ص۳۵

ص۹ کیا کعبہ و دیر کیا خرابات تو ہی تھا غرض جدھر گئے ہم

تم کتنے بیٹھے ہوئے آفت ہو اٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو

کاملوں کا یہ سخن مدت سے مجھکو یاد ہے

جگ میں بے معشوق جینا زندگی برباد ہے

جس کو تیرا خیال ہوتا ہے اس کو جینا محال ہوتا ہے

ص۸ اے صبا کس طرف سے آتی ہے تجھ سے بوئے نگار آوے ہے

تمہارے عشق میں ہم ننگ و نام بھول گئے جہاں کے کام تھے جتنے تمام بھول گئے

مندرجہ بالا اشعار حاتم کے اشعار ہیں جو آبرو کے نام سے منسوب کردئے گئے ہیں۔

ص۱۰۲ "از زلف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے"

"آب حیات" اور دریائے لطافت کے حوالے سے یہ مصرع آتش کے نام نقل کیا گیا ہے۔
اور دریائے لطافت ص۳ پر یہ مصرع مرزا فطرت کے نام رقم کیا گیا ہے۔

ص۱۱۵ چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں ہرگز رفو سوزن تدبیر گر سو برس سیتے رہے

تذکرۂ شوق کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔ لیکن تذکرۂ گردیزی میں یہ شعر یوں درج ہے۔

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو تا قیامت سوزن تدبیر گر سیتے رہے۔

ص۱۲۲ صبا کہیو اگر جاوے گی اس یار دل بر سوں کہ کر کر قول کل کے گئے برسوں ہوگئے برسوں

آبرو کے نام سے نقل ہے ص۱۲۲ پر چند الفاظ کی تبدیلی سے احسن سے منسوب کیا گیا ہے۔ دراصل یہ شعر احسن کا ہے۔

ص۱۲۳ "ہائے جانِ جاناں مظلوم" سودا کی رباعی کا تاریخی مصرع ہے جس سے قتل مظہر کی تاریخ وابستہ ہے۔ سودا نے رباعی کے متعلق یہ ہدایت دی ہے کہ تیسرے مصرع پر چار کا اعداد کا اضافہ ہونا چاہیئے۔ جب صحیح قتل کا زمانہ ۱۱۹۵ھ نکلتا ہے لیکن مصنف نے اس بات کی وضاحت نہیں کی۔

ص۱۴۳ "مرزا کجا وآں سخن دل فریب او" مصحفی کا یہ مصرع سودا کی تاریخ وفات ہے۔ تذکرۂ الشعراء ص۱۴۵ "آبِ حیات میں بھی یہ مصرع ہے۔ لیکن اس صراحت کے ساتھ درج ہے کہ مرزا کی جگہ سودا پڑھا جائے۔ اس سے وفات کا زمانہ صحیح نکلے گا۔ مصنف نے اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

ص۱۵۲ شیخ چاند کی کتاب "سودا" ص۱۵۱ سے ایک اقتباس پیش کیا ہے جس میں ذیل کے اشعار سودا سے منسوب ہیں:

سودا کو تم سمجھتے تھے کہہ سکے گا یہ غزل   آفریں ایسے وہم پر صدقے میں اس گمان کے

معتبر خطی نسخوں میں اس غزل کا وجود نہیں ہے۔ حالانکہ کلیات مطبوعہ سودا میں ہے۔ لیکن معتبر خطی نسخوں سے غیر حاضر ہے۔

دراصل یہ غزل سودا کے شاگرد شیدا کی ہے۔

ص۱۶۱ "میر کی غزلیں ہر بحر میں ہیں" اس جملہ کا مفہوم میر کی غزلوں کو ۱۹ بحور سے وابستہ رکھتا ہے۔ لیکن بحر طویل، بحر مدید، بحر سریع، بحر مقتضب، بحر جدید اور مشاکل میں میر کی کوئی غزل نہیں ملتی۔

ص۱۶۵ "ہر چند لگائے ہیں بتاں گُل مہندی"

نکات الشعراء مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق ص۹۶ گُل کے بجائے کل ہے۔

ص۲۰۳ "مصحفی کے کلیات میں آٹھ دیوان غزل کے اور متعدد قصائد اور مثنویاں ہیں"

کلیات مصحفی نسخہ لاہور میں غزلوں کے چار دیوان دو اردو قصائد کے دیوان جن میں قطعات مثنویات کے علاوہ دیگر اصناف اس کلیات میں موجود ہیں۔ ویسے مصحفی نے ایک دیوان کے چوری جانے کا ذکر بھی کیا ہے۔

ص۲۲۳ پھول تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا گئے۔

یہ مصرع دیوان ذوق میں یوں درج ہے۔

ص[illegible] "پھول تو دو دن بہار اپنی صبا دکھلا گئے"

ص۲۶۵ "نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں" الخ (بدون حوالہ)

یہ اشعار ظفر سے منسوب ہیں۔ حالانکہ ظفر کے کسی دیوان میں یہ اشعار موجود نہیں ہیں۔

مصنف نے ماخذ بیان نہیں کیا۔ یہ اشعار مضطر خیرآبادی کے ہیں

ص۲۲۳ بلند و پست عالم کا بیاں کرنا   قلم ہے شاعروں کا یا کوئی رہرو کا ہے ٹھیکا

آتش کا یہ شعر ناسخ سے منسوب کیا گیا ہے۔

(۴) متضاد بیانات

ص۲ مصنف نے "محمد روشن الدولہ خواجہ سرا" لکھا ہے۔ روشن الدولہ اور ان کی اولاد کا ذکر اکثر کتابوں میں ملتا ہے۔ مصنف نے انھیں خواجہ سرا کس بنیاد پر لکھا ہے؟

ص۱۱ "جواں بخت (ولیعہد شاہ عالم) مرہٹوں کے زیر اثر تھے۔"

یہ بیان غلط ہے کیونکہ سلطنت کا کاروبار نجیب الدولہ کے ہاتھ میں تھا اور ان کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری ضابطہ خان کو سونپی گئی تھی۔

ص۲۰ ولی کا دہلی آنا ۱۱۳۳ھ میں لکھا گیا ہے اور ولی ۱۱۱۹ھ میں فوت ہو چکے تھے۔

ص۲۱۳ پر سیانا تھ کو استاد فن لکھ کر ولی سے متاثر بتایا گیا ہے اس کی تصدیق میں اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ ولی کے ہم عصر نہیں تھے۔

ص۲۱۳ پر پریم ناتھ آرام کو استادِ فن لکھا گیا ہے۔ کسی تذکرہ نگار یا کسی تاریخ نگار نے پریم ناتھ آرام کو اس لقب سے یاد نہیں کیا ان کا صرف ایک شعر ملتا ہے۔

نہ بولنا سجن کا بھاتا لگے ہے مجھ کو   خاموشی ان لبوں کی چپ چپ کی ہے مٹھائی

مصنف نے ایک شعر کی بنیاد پر استاد فن کہدیا۔

ص۲۱۳ پر بلاس رائے رنگین اور گلاسی رام خوش دل کو بھی استادِ فن کا لقب دیا گیا ہے۔ حالانکہ دونوں معمولی شاعر ہیں۔ جن کا بہت کم کلام ملتا ہے۔

ص۲۱ مصنف کا بیان ہے کہ آرزو ریختہ کہتے تھے۔ آرزو بقول خود ۱۰۹۹ھ میں پیدا ہوئے (سفینۂ خوشگو ص۳۱۲) اور ۱۱۱۸ھ عالمگیر کے قریب انھوں نے فارسی شاعری شروع کی۔ مصنف نے ریختہ گوئی کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔

ص۲۱ مصنف نے جعفر زٹلی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ فارسی اور ریختہ میں شعر کہتے تھے اور ولی سے متاثر تھے۔ جعفر زٹلی کے کلیات (مطبوعہ) سے یہ بات ثابت نہیں کہ وہ ولی سے متاثر ہوئے۔

ریختہ گوئی کا آغاز کب ہوا؟ اس کا واضح ثبوت نہیں ہے۔ تذکرہ شورش کتب خانۂ دانشگاہ آکسفورڈ اور طائف المقال کتب خانۂ دانشگاہ پنجاب میں درج ہے کہ سکہ کہنے پر فرخ سیر قتل کرا دیا تھا۔

ص۳۱ امید کے تعلق سے درج ہے کہ ولی سے پہلے اردو میں شعر کہتے تھے

ص۳۵ پر رقمطراز ہیں کہ جتنے اشعار امید سے وابستہ ہیں، وہ دراصل ولی کی آمد کے بعد کے ہیں۔ مصنف کے بیان میں تضاد ہے۔ آمید ۱۱۳۳ھ عالمگیری میں ہندوستان آئے تھے۔ مصنف کے بیانات اپنی تردید کرتے ہیں۔ امید کا شعر کہنا بھی کسی تذکرے سے ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے اردو میں شعر کہے ہیں۔

ص۴۹ یقین کو آبرو کا ہم عصر لکھا گیا ہے۔ یقین آبرو کے ہم عصر نہیں تھے وہ آبرو کے بعد فوت ہوئے۔ مصنف نے ان کو آبرو کا ہم عصر بنا دیا۔

ص۵۱ پر سعدی گجراتی یا ساکوروی اور ص۵۵ پر صرف سعدی کاکوروی لکھا گیا ہے دونوں باتیں غلط ہیں۔ وہ برہان پوری تھے۔ سعدی کا ایک ریختہ ملتا ہے۔

ص۵۱ مصنف کا بیان "۱۱۲۰ھ میں ولی دہلی آئے تھے اور اسی وقت ان کے کلام کی مقبولیت نے بہتوں کو اس طرف راغب کر لیا تھا"۔ "قائم، حاتم، آبرو، فائز نے شعر کہنا شروع کیا" اس بیان کی روشنی میں اگر حاتم کی پیدائش کا جائزہ لیا جائے تو حاتم کا سال ولادت ۱۱۱۱ھ درد نکلتا ہے۔

ص۵۵ قبول کا کلام ریختہ میں بہت تھوڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قبول کے بیٹے گرامی کا ایک شعر بعض تذکروں میں قبول سے منسوب ہے اس کے علاوہ ایک شعر قبول کا تیرہویں صدی کے تذکرے میں ملتا ہے۔ اگر یہ دونوں اشعار من وعن قبول کے تسلیم کر لیے جائیں جب بھی قبول کا کلام ریختہ میں تھوڑا ہے۔ کہنا درست نہیں۔

ص۵۷ "فائز کا شمار ان فارسی گویوں میں ہے جنھیں اردو کا دیوان مرتب کرنے کا مطلق دھیان نہ تھا" فائز کا دیوان اردو موجود ہے۔

ص۶۰ "ولی مرید سعد اللہ گلشن" ولی کو مرید لکھ دیا گیا ہے۔ حالانکہ نور المعرفت میں ولی نے شاگرد لکھا ہے مرید نہیں لکھا۔

ص۶۳ مصنف نے فائز اور حاتم کا ذکر اس انداز سے کیا کہ پڑھنے والا یہ سمجھ لے گا کہ یہ دونوں شاعر

فارسی گو نہیں تھے ۔ جبکہ صـ۸۵ پر فائز کو فارسی گویوں میں شریک کیا ہے ۔ اور حقیقت میں فائز کا فارسی کلام اردو سے بہت زیادہ ہے اور حاتم کا اردو کلام فارسی سے زائد ہے ۔

صـ۸۸ " حاتم نے اپنے کلام پر نظر ثانی کی تو وہ تمام اشعار نکال دیئے جن کی ایہام پر بنیاد تھی "

دیوانزادہ کے مطالعہ میں کئی اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں یہ صنعت برتی گئی ہے ۔

صـ۸۹ "حاتم کے جو تھوڑے ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں ایہام نہیں ۔ وہ زیادہ تر دیوانزادہ سے ماخوذ ہیں "

اس جملہ کو کس طرح سمجھا جائے کیا دیوانزادہ کے علاوہ حاتم کے تمام اشعار اس صنعت ایہام سے وابستہ ہیں "

صـ۹۰ "انشاء اور رنگین نے مل کر ریختی ایجاد کی" دریائے لطافت صـ۸۵ اور صـ۹۹ پر انشاء نے اعتراف کیا ہے کہ وہ ریختی کے موجد نہیں ہیں "

صـ۹۲ مصنف ذوق کا خطاب ملک الشعراء بتاتے ہیں ۔ حوالہ "آب حیات" کا دیتے ہیں ۔ حالانکہ آب حیات میں بھی یہ خطاب بغیر ثبوت کے آزاد نے لکھ دیا ہے ۔

صـ۱۰۱ " معز فطرت کسی غلطی پر ایسے شرمندہ ہوئے کہ جان دے دی" یہ بات مصنف اور تذکرۂ قائم کے علاوہ کسی نے نہیں لکھی ۔

صـ۱۱۰ بیدل اعظم کی ملازمت میں پٹنہ سے دہلی آئے " ملازم ہونا صحیح ہے لیکن ملازمت کے لئے پٹنہ سے دہلی آنا صحیح نہیں ہے ۔

صـ۱۱۱ بیدل نے قتل فرخ سیر کی تاریخ کہی " سادات بوے نمک حرامی کردند " اور ڈر سے عبداللہ کے زمانۂ صوبیداری میں لاہور چلے گئے

کسی تاریخ یا تذکرے سے یہ بات ثابت نہیں ہے ۔ بیدل جب لاہور گئے ۔ اسوقت لاہور کے صوبیدار عبدالصمد خاں تھے ۔

صـ۱۲۵ "حاتم نے دیوانزادہ کے دیباچہ میں ۵۰ شاگردوں کے نام گنوائے ہیں "

مصنف نے بغیر حوالے کے یہ بات لکھی ہے ۔ اس کے باوجود نسخہ لندن رام پور اور لاہور تینوں

نسخوں سے مصنف کے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوئی۔

صـ۱۲۶ "میر حسن نے بھی حاتم کو دیکھا تھا" یہ بات مصنف کے سوا کسی اور تذکرہ نگار کے یہاں نہیں ملتی ہے۔

صـ۱۲۷ "احسن کی طبیعت میں حسن پرستی تھی۔ مصنف نے کوئی حوالہ نہیں دیا یہ بات کسی اور نے نہیں لکھی۔

صـ۱۳۵ "میر کلو شاہ شاگرد مظہر" میر کلو شاہ کا مظہر کا شاگرد ہونا کہیں ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ میر کلو شاہ درد کے داماد تھے اور شاگرد بھی تھے۔

صـ۱۸۰ "سوز ۱۲۱۲ھ میں آصف الدولہ کے استاد مقرر ہوئے" یہ بھی صریحاً بے بنیاد بات ہے۔

صـ۱۸۱ "سوز کا دیوان مختصر ہے" پانچ چھ ہزار اشعار پر مشتمل دیوان مصنف کی نظر میں مختصر ہے۔ کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔

صـ۱۹۰ "میر حسن خاص دہلی کے رہنے والے تھے۔ ۱۲ برس کی عمر میں فیض آباد گئے" میر حسن نے اپنے تذکرہ میں شروع جوانی لکھا ہے۔

صـ۱۹۶ "انشاء مرشد آباد سے دہلی آگئے" مختلف مقامات سے ہوتے فیض آباد آگئے، مختلف مقامات دہلی جانا کئی برس بعد کا واقعہ ہے۔

صـ۱۹۹ "سلیمان شکوہ پہلے مصحفی سے اصلاح لیا کرتے تھے" یہ آب حیات کا قول ہے۔ آزاد نے کوئی سند نہیں پیش کی۔ نہ مصنف آب حیات کے علاوہ کوئی ثبوت پیش کرسکے۔

صـ۲۰۱ "مصحفی کو سلیمان شکوہ کے یہاں ۲۵ روپئے مشاہرہ پر نوکر ہونا لکھا گیا ہے۔ مصنف کو اس بات کی خبر نہیں ہے کہ آب حیات میں اس سلسلے میں جو اشعار ہیں۔ ان کا سلیمان شکوہ سے تعلق نہیں۔

صـ۲۰۲ "مصحفی کا عہد طفلی امروہہ میں گذرا" بحوالہ دیباچہ دستور الفصاحت صـ۹۹ لیکن معاصر جلد ۱۲ صـ۵ میں درج ہے کہ مصحفی نے اکبرپور (موضع مبھاولی و شیخ پور) کو اپنا آبائی وطن لکھا ہے۔ اور امروہہ کا ذکر کہیں نہیں کیا۔

صـ۲۰۲ "رنگین کچھ دنوں حیدرآباد کی فوج میں افسر توپ خانہ رہے"

حقیقت یہ ہے کہ رنگین حیدرآباد کبھی نہیں گئے۔

ص۲۲۲ نصیرنے "وہ قدیم الفاظ جو انشاء اور مصحفی تک باقی تھے۔ مثلاً ٹک وا چھڑے تس پر وغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ترک کردئے۔

تس پر غالب کے یہاں ملتا ہے۔

ع مصرعہ ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

دیوان نصیر میں ٹک اور وا چھڑے موجود ہیں۔ پھر نصیر نے کیسے ان الفاظ کو ترک کردیا تھا۔

ص۲۸۴ "میر نے ایک بار لکھنؤ میں کہا کہ میرا کلام سمجھنے کیلئے جامع مسجد کی سیڑھیوں کی زبان جاننا ضروری ہے" اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

ص۲۹۵ بحوالہ صفیر، انشاء ۱۲۱۱ھ میں لکھنؤ آئے" حالانکہ ۱۲۱۰ھ سے کئی پہلے انشاء لکھنؤ آچکے تھے۔

ص۲۹۵ "انشاء ۱۲۲۲ھ میں سعادت علی خاں کے ملازم ہوئے" (بحوالہ صفیر) یہ بیان محتاج ثبوت ہے۔

ص۲۹۵ صفیر کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ "انشاء نے ۱۲۳۳ھ میں گوشۂ گمنامی میں جگہ پائی" انشاء آخری عمر میں مجنوں ہوگئے تھے۔

ص۳۲۲ "میر شیر علی افسوس داروغۂ توپ خانہ عالیجاہ" یہ قول کسی اور کا ہے مصنف نے بھی مخالفت نہیں کی میر شیر علی افسوس کے والد داروغہ تھے۔

مندرجہ بالا اغلاط کی روشنی میں "دلی کا دبستان شاعری"

علاقائی ... ولب و لہجہ کی تحقیق فنی خصوصیات،
شخصی انفرادیت کی آئینہ دار ہے۔ اس بنیاد پر مزید تحقیق کاوش اور تاریخی حقائق کا اظہار کرتا ہے۔
اور محققان ادب کے لئے مشعل راہ نہیں کارزار ادب میں مجاہدانہ عمل کا بھی اظہار ہے۔

دو ادبی اسکول

علی جواد زیدی

زیرِ نظر کتاب علی جواد زیدی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن سن ۱۹۷۰ء میں اور دوسرا ایڈیشن جولائی سن ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ ۳۷۶ صفحات پر محیط یہ کتاب دبستانی نظریات کو رد کرتی ہے۔ اس بات کا ثبوت دیباچۂ دوم کا یہ اقتباس ہے:

"لکھنؤ کا اسکول اور دلی اسکول کی اصطلاحیں ستّر اسّی برس تک سکۂ رائج الوقت رہی ہیں۔ کئی نسلوں نے اس پر آمنّا و صدقنا کہا ہے۔ اس لئے مجھے یہ خوش فہمی نہیں تھی کہ لوگ فوراً ہی اپنے نظریات کو بدل دیں گے۔ لیکن جس گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا گیا ہے اور ارباب دانش و فکر نے اس پر جس کشادہ دلی اور وسیع النظری سے تبصرے کئے ہیں اس سے یہ یقین ہو چلا ہے کہ پرانے مؤرخین اور ناقدین کے تسامحات کی اصلاح ہو سکے گی۔ اور لکھنؤ اور دلی کے اکتسابات کا مطالعہ اب اسکولوں کی طرح نہیں، بلکہ ادبی مرکزوں کی حیثیت سے لیا جائے گا۔"[1]

اس کتاب کے سرورق کی تفصیل اس طرح ہے۔ دو ادبی اسکول نام و نہاد لکھنؤ اور دلی اسکول کی مشترکہ خصوصیات علی جواد زیدی۔

دیباچۂ طبع اوّل کا یہ اقتباس بھی قابلِ غور ہے:

"میں نے اس مقالے میں یہ عرض کرنے کی جرأت کی تھی کہ میں لکھنؤ اور دلی کو الگ الگ ادبی اسکول نہیں مانتا۔ اردو میں "دکنی اسکول" "فارسی اسکول" "علی گڑھ اسکول" تو بن سکتے ہیں لیکن "لکھنؤ اسکول" اور "دلی اسکول" ادبی مفروضے ہیں۔"[2]

مصنف نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کتاب کا نام "دو ادبی اسکول" کیوں رکھا گیا؟

"میں نے سہولت کے لئے اس کا نام "دو ادبی اسکول" رکھ دیا ہے مگر شروع ہی یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ لکھنؤ اور دلی کا تقابلی مطالعہ نہیں ہے۔ یہ دو مفروضہ اسکول کا تفصیلی اور ہمہ گیر جائزہ بھی نہیں ہے۔ اس کتاب کی نوعیت سراسر جوابی ہے۔ میرے تمام مفروضات اسکول ساز و بالخصوص عندلیب شادانی کی تحریروں کے پس منظر میں پڑھنے کے لائق ہیں۔ میں نے زیادہ تر عندلیب شادانی کے حقائق و ذوق سے سروکار رکھا ہے۔"

---

[1] دو ادبی اسکول۔ علی جواد زیدی ص ۹
[2] ؎ ؎ ؎ ص ۱۳

عبدالسلام ندوی اور ابو اللیث صدیقی کے خیالات سے ضمناً بحث کی گئی ہے۔ ان سب حضرات نے لکھنؤ کی چند خصوصیتیں گنائی ہیں۔ چھان بین اور جانچ پڑتال نے بتایا کہ بعینہ وہی ما بہ الامتیاز کیا ہے۔" [1]

کتاب کی ابتداء "دو دبستانوں کی بات" سے ہوئی ہے۔ مصنف نے اس موضوع کے تحت اسکول سازوں سے کچھ سوالات کئے ہیں۔

"مثلاً کیا سودا اور میر، سوز اور درد ہی سے دلی اسکول عبارت ہے؟ اور کیا آبرو، تاجی، معروف اور حاتم دلی کے نمائندے نہیں ہیں؟ کیا احسان، نصیر اور ذوق راندہ درگاہ ہیں۔ اور کسی قدر مومن اور پوری طرح غالب ہی دلی کی نمائندگی کرتے ہیں؟ کیا نصیر و مومن، ذوق و غالب کے پہلے ہی دلی اسکول ختم ہو گیا؟ کیا دلی میں ہمیشہ ایک ہی رجحان رہا؟ کیا ایک ہی دور میں بیک وقت اہم رجحانات سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ ہر رجحان کا ایک تاریخی محرک ہے تو ہر ایک رجحان کے تاریخی محرکات کیا کیا ہیں؟ اور ان میں تضاد کیوں ہے؟" [2]

ان سوالات کے پیش نظر تاریخی محرکات اور سماجی پہلوؤں کی روشنی میں دلی کی سادہ روی اور حقیقت پسندی اور لکھنؤ میں رقص و سرور عام ہو چکی وجوہات کا جائزہ لیا ہے۔ دلی کے ادبی پس منظر میں اردو زبان کی نشوونما اور ارتقاء پر بحث کرتے ہوئے کھڑی بولی برج بھاشا اور صوفیائے کرام میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کو دکنی ادباء اور شعراء کی صف میں شمار کرنے پر اعتراض کیا ہے۔ اکبر اور جہانگیر کے دور میں خان خاناں، بیربل، ابو الفضل، فیضی، بیرم خاں، شاہجہاں دارا شکوہ اور دانیال کو اردو کا سرپرست بتایا ہے۔ [3]

"ڈاکٹر شیر الدین کے حوالے سے شیخ بہاء الدین باجن، میاں گجراتی، عشقی خان، میر بخش امیر خسرو درگا پرشاد نادر دہلوی، منشی ولی رام ولی، چندر بھان برہمن، افضل جھنجھانوی کو ریختہ کے شاعر بتلایا ہے۔

لسانی اختلاط کے بیان میں اردو کو سنسکرت، برج بھاشا، اودھی، پنجابی، راجستھانی گجراتی، مراٹھی، پوربی کے اثرات سے معمور بتایا ہے۔ ان اثرات کو فارسی اور عربی سے ہمکنار کیا ہے۔

---

[1] دو ادبی اسکول — محمد جواد زیدی ص ۱۵
[2] " " ایضاً " ص ۲۰
[3] " " ایضاً " ص ۲۵

کئی رجحان میں مصنف نے اردو پر فارسی اثرات کے باوجود سنسکرت کے اثرات کا اعتراف کیا ہے۔
دلی کا ادبی مرکز دلی کے ادبی اکتسابات کا باقاعدہ سلسلہ فرخ سیر کے عہد حکومت سے شروع کرکے محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں عروج بتایا ہے۔ مستقل غزل گویوں میں فائز کو شمالی ہند کا پہلا صاحب دیوان شاعر لکھا ہے۔

آبرو، ناجی، مضمون، اور حاتم کو بھی صاحب دیوان شعراء بتلایا ہے اور ان دواوین کو دلی اسکول کا نقطۂ آغاز بتایا ہے۔ اس عہد کے عام رجحانات میں لفظی صنعت گری، خارجیت خیال آفرینی عریانی اور فحش نگاری کی حد تک معاملہ گوئی کے عناصر بتایا ہے۔ ان کے کلام میں درد مندی اور سوز وگداز کا عنصر کم ہے۔ جسے دہلوی اسکول کا طرۂ امتیاز کہا جاتا ہے۔

سنسکرت سے متاثر دہلوی زبان میں سراپا نگاری، جسمانی عشق، آزادروی اور سرمستی، لفظی اور معنوی صنعتوں کا استعمال اور تمثیل کا انداز اپبھرنش کے آخری دور سے ریتی کال تک کی روایتوں کو ان رجحانات سے متاثر بتایا ہے اردو زبان پر فارسی عربی اور ترکی زبانوں کے اثرات کا اعتراف کرتے ہوئے سنسکرت اور ہندوستانی زبانوں کے اثرات کو اہمیت دی ہے اور مذکورہ رجحانات اسی کا نتیجہ ہیں۔ وضاحت کی ہے۔ صنائع لفظی صنائع معنوی، ایہام ذومعنی خیال کو سنسکرت کی دین لکھا ہے۔

تمثیلی رنگ میں بیدل، غنی، ناسخ، ناصر، ذوق، اور نوجوان غالب ہیئت پرستی، تمثیل نگاری اور خیال بندی میں شاہ حاتم، شاہ نصیر، ناسخ، ذوق، اور مومن فارسی میں صائب، سلیم، غنی، ناصر، بیدل، صہبائی کا ذکر کرتے ہوئے ناصر، غنی، ناسخ اور غالب کے یہاں کوئی مخصوص زاویۂ نظر نہیں بتایا ہے۔ اس بنیاد پر موصوف کا خیال ہے کہ

"دہلوی اور لکھنوی دور رنگ نہیں بلکہ زوال کی دو منزلیں ہیں" [1]

ان رجحانات کو مصنف نے دکنی شعراء اور دہلوی شعراء میں بتا کر مدتوں بعد لکھنؤ میں پھولنے پھلنے کی بات لکھی ہے۔ دلی میں ولی کی آمد اور ان سے وابستہ ادبی انقلاب کو تاریخ ادب اردو کا مفروضہ بتلایا ہے۔ [2]

سیاسی پس منظر دلی میں سیاسی افراتفری، مسلم حکمراں خاندانوں کے عروج و زوال سے

---

[1] دو ادبی اسکول۔ طبع دوم۔ علی جواد زیدی۔ ص ۳۰
[2] ایضاً ایضاً ص ۳۰۹

سماجی انتشار کا نقشہ کھینچا ہے۔ اودھ میں اردو شعرا و ادبا کے سرپرست خاندانوں کا ذکر کیا ہے اودھ کے اس خوشحال دور میں دلی کے بلند پایہ شعرا دلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ چلے آئے اور مہاجر شعرا کی بدولت دلی کی ادبی مرکزیت ختم ہو گئی بتلایا ہے۔

دو شہروں کی نوک جھونک میں مصنف نے لکھا ہے کہ مہاجر شعرا کی ایک بڑی تعداد اودھ میں اودھی میں اور برج بھاشا کے خیال اور صناعی کا رجحان اور تمثیل کے دہلوی اور ہند مقامی محاوروں کا چلن ان زبانوں کے سبب ہوا جو دلی میں بھی موجود تھا۔ انشا کی دریائے لطافت کے بیشتر اقتباسات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ لکھنؤ میں موجود دلی والوں نے اپنے آپ کو اہلِ زبان ثابت کیا ہے۔

مصحفیؔ مرزا علی تقیؔ امیر اللہ تسلیمؔ شیام منوہر ناتھ کول مضطرؔ کے اشعار درج کئے ہیں اس طرح لکھنؤ اور دلی والوں کے درمیان نوک جھونک کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مصنف نے اس نوک جھونک میں لکھنؤ اور دلی کی زبان میں توسیع لہجہ شہر اور شاعری پر بحث کیا ہے۔

لکھنؤ کا ادبی مرکز کے عنوان میں لکھنؤ کی سیاسی تاریخ اور ادبی تاریخ پر وضاحت سے لکھا ہے مصنف نے مزید بتلایا کہ لکھنؤ کے نوابی دور میں عیش و عشرت کھیل تماشے اور رقص و سرود بے عملی بے فکری نمائش اور دلی میں مسلم حکمرانوں کے عروج کا نقشہ نظر آتا تھا۔ مصنف کا خیال ہے کہ دہلوی اور لکھنوی سماج مدرسہ اور خانقاہ شریعت کدہ اور مراکز علم و فن کا اثر درباری اثر سے کم نہیں تھا۔ [1]

لکھنؤ میں نفاست پسندی نزاکت محبوب شان نام و نمود ٹھاٹھ باٹھ سماج کا ایک انگ بن گئے۔ اس سبب یہاں تصنع کے عناصر شاعری میں آتے ہیں بتلایا ہے۔ لیکن دہلوی شعرا بھی ان اثرات سے مبرا نہیں تھے یہاں بھی زمانۂ عروج میں یہ عناصر موجود ہیں اور دورِ زوال میں بھی اکثر و بیشتر مل جاتے ہیں۔

بیز لکھنؤ اسکول کے موضوع پر مصنف نے عبد السلام ندوی عندلیب شادانی کے نظریوں پر اظہار خیال کیا ہے۔ ناسخ و آتش کے زمانہ میں مخلوط رنگ کی بنیاد پر دو اسکول قائم کئے ہیں بتلایا ہے۔

---

[1] دو ادبی اسکول طبع دوم علی جواد زیدی ص ۹۵

کئی رجحانات میں لکھنؤ کے داخلی و خارجی رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے اعتدال یا مناسبت اصناف کا فرق بتایا ہے۔ لکھنؤ میں ایہام کے علاوہ تجنیس، ترصیع، تشبیہ، فصاحت، بلاغت، ادا بندی، جیسی صنعتیں لکھنؤ میں تصنع کی حد تک ملتی ہیں بتلایا ہے۔

انشاء، مصحفی، مرزا علی نقی نظر، صغیر علی مروت، میر حسن، محمد امان خان نثار، میر قمر الدین منت، بقاء اللہ بقا، احسن علی احسن، مرزا فخر الدین قمر، احمد خان قمر، سید مہر علی غیور، میر حیدر علی حیران، میر جعفر علی حسرت، شیخ ظہور نوا، مرزا رضا علی مرتعون، مرزا رمضان علی بیگ طپاں، منشی ظہور محمد ظہور، لالہ بینی پرشاد ظریف، طالب علی خان عیش، منو خان غافل، کرامت علی خان فرخ، نوازش ان شعراء کے مختلف ادوار میں کئی طرز وار رجحانوں نمائندگی کا ذکر کیا ہے۔

طرز آتش و ناسخ میں ناسخ و آتش کی خصوصیات اور ان کے حلقوں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ناسخ پر اٹھائے اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے رشید حسن خان اور عبد السلام ندوی کے جوابات دیئے ہیں۔

دلی کا دوسرا روپ میں اسکول سازوں کی مخصوص و محدود نظریات کا ذکر کرتے ہوئے فائز، حاتم، تاجی، مضمون، وغیرہ میں اصناف کے وہی رجحانات بتاتے ہیں۔ جو لکھنؤ میں موجود تھے۔ اشعار کے ذریعہ اپنی بحث کو قوی بنایا ہے۔

حاتم، آبرو، تاجی، فائز، منت، ہدایت، یقین، میر درد، سوز، سودا، قدرت، بیدار، تاباں، حقیر، سرور، سید، عشق، عظیم، فراق، قاسم، کلیم، محب، ممنون، نصیر، ذوق، احسان، بہادر شاہ ظفر تمام شعراء کے کچھ اشعار صنعتوں کی عکاسی کے لئے پیش کئے ہیں۔

باہمی تاثر میں شعر الہند کے تاریخ سے وابستہ نظریہ کو رد کیا ہے۔ عندلیب شادانی اور عبد السلام ندوی کے نظریات پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہ طرز ناسخ و آتش جو باہم مختلف ہے شاگردوں کے یہاں مزید اختلاف لے کر رونما ہوتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ یہ صرف صنف غزل میں محدود ہیں اگر ہم بعینہ طرز کو طرز ناسخ و آتش مان بھی لیں تو شاگردوں کی مختلف طرزوں کو لکھنؤ اسکول میں کیسے سمو سکیں گے۔[1]

مصنف کا یہ مطمع نظر ہے کہ عبد السلام ندوی، شادانی، اور ابو اللیث صدیقی صرف ناسخ اور آتش

---

[1] رواداری اسکول۔ محسن جواد زیدی۔ ص ۱۵

کے زمانے سے لکھنؤ اسکول کا انعقاد کیوں کرتے ہیں اور ان کے شاگردوں پر غور نہیں کرتے۔ لکھنؤ اسکول کی خصوصیات میں زنانہ پن عورتوں کے آرائش وجمال کے اسباب، فارسی تراکیب کی بہتات طویل غزلیں، داخلی جذبات کم خارجی اوصاف زیادہ۔ رعایت لفظی، معاملہ بندی، تشبیہات واستعارات میں نزاکت ولطافت، فحاشی اور بدزبانی پر روشنی ڈال کر دہلوی شعراء کم وبیش ان خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔

غالب، مومن اور ذوق کی مثال دے کر لکھا ہے کہ ایک ماحول سے وابستہ دلی میں کئی رجحانات کارفرما ہیں۔ چند اہم خصوصیات میں عبدالسلام ندوی کے لکھنوی شعرا کی خصوصیات میں ضلع جگت رعایت لفظی، آرائش سامان، زلف، کاکل گیسو، جوڑا، چوٹی، کنگھی، مشاطہ، سرمہ، مسی، غازہ، مہندی، پھول، افشاں وغیرہ زیورات، نسوانی لباس عریانی وغیرہ سے بحث کرتے ہوئے شادانی کی لکھنوی خصوصیات امرد پرستی، زن پرست، محبوب کے لئے مذکر کے صیغے کا ذکر کیا ہے۔

دربار سرکار کا حال میں دہلوی شعراء فائز اور آبرو سے نامدار، جوشش، نعمت، ناجی، میر تقی میر، ہر شاعر کے یہاں ان اوصاف کا عکس ملتا ہے۔

لکھنؤ اور امرد، مذکر صیغے، تصوف وعشق، عشق اور شاعری، عشق وجوانی، ہوس ناپاکی اور پاکیزگی شعروں مثالوں سے دہلوی شعراء کے یہاں ان مضامین کا ذکر کیا ہے۔

شعرائے دلی اور عورت میں معشوق پردہ دار، نقاب، برقع، گھونگھٹ، چلمن، قنات پردہ زخمہ، روزن، بام، بے پردہ معشوق، رقص وسرود اور مذہب، مرد اور رقص وسرود، طوائف کے وظائف، دوسرے طبقوں کی عورتیں، بت ہرجائی، غیر، رقیب، عدو، وصل وانتظار، مدارج محبت، گھریلو عورتیں، اور لباس وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اور دہلوی شعراء کے اشعار پیش کر کے ان مضامین، استعارات اور تشبیہات کا ثبوت دیا ہے۔

دلی کے محبوب کی کچھ شناختیں ہیں جن میں دہلوی زیورات، آویزاں کی محبوبیت، توڑی، توڑا، کان موتی، ٹیکہ، زلف، کنگن، گھنگھرو، خلخال، پازیب، پائل، دوہڑا، مالا، مرکی، نتھنی، مانگ، بازو، پہنچی، تعویذ، انگوٹھی، چھلے، ہار، دست بند، بالا، جھمکے، جھومر، جگنو، زنجیر طلائی، نتھ کا موتی ان لفظوں کا استعمال دہلوی شعراء کے اشعار کے ساتھ بتلایا ہے۔ سامان آرائش میں مشاطہ، آئینہ، آرسی،

مسّی، مہندی، حنا، گلگونہ، غازہ، سرمہ، کاجل، عطر، افشاں، پان، سر کا مسالہ وغیرہ۔

محبوب کے سراپا میں ساق، ناز، چھاتی، پستان، فندق پا، کفِ پا، مژگاں، ذقن، زنخ، زنخداں، چشم، دہن، ابرو، لب، دانت، زلف، جعد، کاکل، مانگ، رخسار، گال، خال، تل، انگلی، رخ، مکھڑا، منہ، دست، ہاتھ، ساعد، جبیں، کمر، پری اور نزاکت و ناز کی دہلوی شعراء کے اشعار میں دکھلایا ہے۔

مضحکہ خیز مبالغے میں ضعف، لاغری، جوش گریہ، شورِ جنوں، اور مضحکہ خیز دہلوی شعراء کے اشعار پیش کئے ہیں۔

توسّل، ہندوانہ رسم و رواج اور ذہبیّت کے مضامین بھی دہلوی شعراء کے یہاں موجود ہیں انھیں اشعار کے ساتھ لکھا ہے۔

چند مشترک خصوصیات میں طویل غزلیں، سنگلاخ زمینیں، خارجی شاعری رعایت لفظی، وضائع ابتذال، معاملہ بندی، سوز و گداز اور واردات قلبیہ وغیرہ لکھنؤ اور دہلوی شعراء کے یہاں موجود ہیں شواہد کے ساتھ لکھا ہے۔

حرف آخر میں یہ اقتباس قابل غور ہے۔ بلکہ پوری کتاب کا خلاصہ ہے :-

"خصوصیات کلام کی تعین کئے بغیر صرف سفینوں اور تذکروں کے انتخابات پر بھروسہ کر کے کوئی اسکول نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ بات انشاء و مصحفی اور ان کے متبعین کے بارے میں بھی سچ ہے۔ اور ناسخ و آتش کے مقلدین کے بارے میں بھی ایسا رجحان یا رجحانات جو ایک مستقل اسکول کی بنیاد بن سکیں، نہ تو انشاء کے لکھنؤ میں پائے جاتے ہیں اور نہ ناسخ کے لکھنؤ میں نہ میر و درد کی دلّی میں موجود ہیں۔ اور نہ نصیر و ذوق کی دلّی میں اس لئے دلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کی ساری بحث غیر منطقی ہے۔ غیر سائنسی اور ناقابل قبول ہے۔ اور ساری بحث کو تاریخ اردو ادب سے خارج کر دینا چاہیے"۔ [1]

دو ادبی اسکول کا سارا مواد عبد السلام ندوی، عندلیب شادانی، ابو اللیث صدیقی کی بحث کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔ علاقائی عصبیت قولاً رد کرنے کا نظریہ مصنف کے علاقائی جذبے کا نمائندہ بن گیا ہے۔ مثلاً شمالی ہند کا جذبۂ فوقیت مصنف کے ان بیانات سے ثابت ہوتا ہے۔

---

[1] دو ادبی اسکول، عیسیٰ جواد زیدی۔ ص ۲۴۶

ملاحظہ کیجئے :۔

" اگرچہ خواجہ گیسو دراز کو علی العموم دکنی ادباء و شعراء کی صف میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ لیکن آپ نے ۷۰ برس کی عمر میں دلیؔ سے حرکت کی تھی۔ اور آپ کے اکتسابات زبان دہلوی کے اکتسابات ہیں "۔ ص۱

ولی دکنی کے تعلق سے لکھتے ہیں ۔

" ایک دیوان یا ایک شاعر کی آمد سے اتنے بڑے ادبی انقلابات کو وابستہ کردینا کسی طرح مناسب نہیں ہے " ص۲

ایک غیر جانبدار نقاد کی حیثیت سے مصنف لسانی بنیاد پر اسکول کی تقسیم کی بات کرے۔ اور اسے گیسو دراز کی تحریروں میں لسانی تفاوت کا عکس دکھائی نہیں دیا۔ تاریخی حقائق سے ثابت ہے کہ بندہ نواز اٹھتر برس کی عمر میں دوبارہ دلی گئے تھے۔ لیکن مصنف کی تحریر سے ظاہر ہے کہ بندہ نواز ۷۰ برس کی عمر میں پہلی مرتبہ دکن کی طرف کوچ کرتے ہیں۔ بندہ نواز کی لسانی خصوصیت میں دکنی زبان، محاوروں، ضرب الامثال اور طرز بیان کا نمایاں فرق ہے۔ علی جواد زیدی کو یہ چیزیں نظر نہیں آئیں۔

۲۔ تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ ولی دکنی کی شاعری کا اثر شمالی ہند کے شعراء پر ادبی انقلاب کا ذریعہ ہے۔ لیکن ولی سے اس انقلاب کو وابستہ کرنا مصنف نے کسر شان یا شمالی ہند کی ہتک تصور کیا ہے۔

۳۔ یہ دو بیانات اس بات کا ثبوت ہیں کہ مصنف خود بھی علاقائی جذبے کا شکار ہوا ہے۔ کئی مقامات پر تصانیف کا نام ہے۔ لیکن مصنفین کا نام نہیں ہے۔

یہ کتاب بہر کیف علاقائی نظریات کو رد کرنے میں کامیاب ہے۔ نیز فکری تفاوت پر اسکول کی تقسیم نہیں۔ لسانی بنیاد پر یہ کام جائز ہے۔ مصنف نے دہلوی اور لکھنؤ شعراء کی مشترک خصوصیات مضامین کی یکسانیت، تشبیہات و استعارات مبالغہ آرائی کے ثبوت میں اشعار کا ذخیرہ اس کتاب میں جمع کیا ہے۔

اردو ادب میں یہ کتاب قابل قدر اضافہ ہے جس نے دبستانی تقسیم کے طلسم کو توڑنے کا کام انجام دیا ہے۔

---

۱ دو ادبی اسکول۔ علی جواد زیدی۔ ص۲۲
۲ ،، ایضاً ،، ،، ص۳۹

لکھنؤ کی لسانی خدمات

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کی لسانی تحقیق ۱۶۳ صفحات پر مشتمل ہے "پیش لفظ" میں سبب تصنیف کے بارے میں جناب ڈاکٹر عبدالستار دلوی صاحب لکھتے ہیں :۔

لکھنؤ کی ان متنوع خاندان کا تقاضا تھا کہ اس کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا اور اس پر نقد و تبصرہ بھی ہوتا۔" [1]

حامد اللہ ندوی لکھتے ہیں کہ :

"میں نے لکھنؤ کی اس لسانی تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے تمہید، تعارف، تبصرہ تمہید میں مختصراً اردو زبان کی نشو و نما اور اس کی عہد بہ عہد ترقی کا حال بیان کیا ہے۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے کر لکھنؤ کے عروج تک ہندو مسلم میں میل جول اور ان کے لسانی ذرائع کا جائزہ اس طرح لیا ہے کہ قاری کسی الجھن میں پڑے بغیر لسانی کے ساتھ زبان کے اس پس منظر کو سمجھ سکے۔" [2]

اسی صفحہ پر آخر میں یہ بیان قابل ذکر ہے :۔

"تعارف میں جیسے جن لکھنوی مصنفین کا ذکر ہے ان کے حالات اردو ادب کی تاریخ میں تفصیل کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اس لیے میں نے ان کے حالات بیان کرنے میں بڑے اختصار سے کام لیا ہے۔"

ان بیانات کی روشنی میں تمہید سے کتاب کی ابتدا ہوتی ہے۔ جس میں مسلمانوں کی آمد سے مختلف ادوار، و حالات میں علاقائی زبانوں پر عربی فارسی کے اثرات کا ردعمل اردو زبان کی پیدائش کا سبب بنا۔ مسلمانوں کے تجارتی قافلوں سے مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہونے تک الفاظ کے لین دین کے عمل سے موصوف کی نظر میں اردو زبان کی ابتداء ہوئی۔ موروثی زبانوں کے رسم الخط کی تقلید اس کی گواہ ہے۔

مسلم حکمرانوں کی سرپرستی میں خاص طور پر مغلیہ دور میں جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب کے عہد میں اس زبان کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

---

[1] لکھنؤ کی لسانی خدمات، حامد اللہ ندوی ص ۲ پیش لفظ

[2] ایضاً ص ۵

اس باب میں موصوف نے اردو کی نشوونما کے لئے بتدریج چار ادوار قائم کئے ہیں پہلے دور میں عربوں کی آمد محمد بن قاسم کی فتح ابوریحان بیرونی محمود غزنوی اور مسعود سلمان کے زمانے شہاب الدین غوری اور پرتھوی راج راسو میں شامل عربی فارسی لفظوں کو ثبوت بنایا ہے۔

دوسرے دور میں اردو کی نشوونما کے لئے حالات کا سازگار ہونا قطب الدین ایبک ابراہیم لودھی شمس خلجی، تغلق اور لودھی خاندانوں کا ذکر کیا ہے۔

تیسرے دور میں اردو زبان کی نشوونما اور ترقی کا دور مغلوں کی آمد سے شروع کیا ہے۔

چوتھے دور کو اردو زبان کی نشوونما اور ترقی کا دور اور اصلاح کا دور بتاتے ہیں جسے بہادر شاہ ظفر کی معزولی پر ختم کیا ہے۔ یہاں پر زبان کی مختلف شاخوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھنؤ کے بابت رقمطراز ہیں:۔

"اہل لکھنؤ کی لسانی خدمات میں اردو زبان کی کم و بیش ہر شاخ شامل ہے اور انشاء سے لے کر مسعود حسین خاں تک اردو کے بیسوں اہل زبان نے اس میں حصہ لیا ہے۔"[1]

تعارف کے باب میں لکھنؤ کے شعراء اور ادباء کے ادبی و لسانی خدمات کا جائزہ تفصیل سے لیا گیا ہے۔ ان کی تصانیف سے اردو شاعری اور اردو زبان میں کس طرح اصلاحات ہوئیں۔ ان پر عالمانہ بحث کی ہے عروض پر ان کی تصانیف کا بھی جائزہ لیا ہے۔ مصنف نے تعارف میں اعتراف کیا ہے کہ شعراء اور ادباء کا جائزہ اختصار سے پیش کیا ہے۔ ذیل میں ہم ان شعراء اور ادباء کی موضوعات سے متعلق تصانیف کا تذکرہ کرتے ہیں۔

نمبر	نام	تصنیف	موضوع
۱	انشاء اللہ خاں انشاء ۱۷۵۶ء تا ۱۸۱۸ء	دریائے لطافت	عروض، قافیہ و معانی اور بیان
۲	شیخ امام بخش ناسخ ۱۷۷۲ء تا ۱۸۳۸ء	کوئی کتاب نہیں لیکن ان کا	اصلاحِ زبان کا کارنامہ اہم ہے
۳	میر علی اوسط رشک ۱۸۰۰ء تا ۱۸۶۷ء	نفس اللغہ	اردو زبان کی اصلاح و ترقی

[1] لکھنؤ کی لسانی خدمات احمد اللہ ندوی ص ۱۹

نمبر	نام	تصنیف	موضوع
۴	مظفر علی اسیر ۱۸۰۰ء تا ۱۸۸۲ء	۱۔ زر کامل	عروض و قوافی ز طوسی کی معیار الاشعار کا ترجمہ
		۲۔ شجرۃ العروض	عروض کے مسائل
		۳۔ رسالۂ اضافت	اضافت کی تعریف، ترکیب اضافی عربی میں علم نحو سے تعلق ہے۔
		۴۔ رسالۂ تشریح الحروف	نایاب
		۵۔ فوائد مظفر	ـــ
۵	قدر بلگرامی ۱۸۴۳ء تا ۱۸۸۴ء	۱۔ قواعد العروض	زبان کی اصلاح و ترقی سے تعلق رکھتی ہیں۔
		۲۔ مصطلحات اردو	
۶	عاشق لکھنوی ۱۸۶۰ء تا ۱۸۹۵ء	بہار ہند	محاورات کی لغت
۷	امیر مینائی ۱۸۲۹ء تا ۱۹۰۰ء	امیر اللغات جلد اوّل	لغت
		۲۔ بہار ہند	اردو مصطلحات و محاورات کی لغت
		۳۔ سرمۂ بصیرت یا معیار الاغلاط	عربی فارسی جو غلط زبان زد عام تھی ان کی تصحیح و تنقیح فرمائی ہے۔
		۴۔ محاورات مصادر اردو	مصادر سے نکلنے والے اردو محاورات کی لغت
۸	اشرف علی اشرف ۱۸۱۸ء تا ۱۹۰۲ء	۱۔ دستور الشعراء	تذکیر و تانیث کے مسائل
		۲۔ مصطلحات اردو	محاورات کی تحقیق
۹	جلال لکھنوی ۱۸۳۲ء تا ۱۹۰۹ء	۱۔ تنقیح اللغات	صحت زبان اور صورت زبان کی بحث
		۲۔ گنجینۂ زبان اردو (گلشن فیض)	لغت نواب کلب علی نثر و نظم کی تعریف

نمبر	نام	تصنیف	موضوع
		۲۔ سرمایۂ زبانِ اردو	لغت۔ (محاورات عام وخاص)
		۳۔ مفید الشعراء	تذکیر و تانیث پر روشنی ڈالی ہے
		۵۔ افادۂ تاریخ	بحث و قواعد تاریخ گوئی
		۶۔ منتخب القواعد (گنجینۂ زبانِ ہندی)	نواب حیدرآباد میر محبوب خاں پر ۳۴ اشعار
		۷۔ رسالۂ عروض و قوافی	مختلف قوافی کی فہرست (قلمی نسخہ)
۱۰	شفق لکھنوی ۱۸۶۲ء تا ۱۹۱۸ء	فرہنگِ شفق	لغت
۱۱	مرزا ہادی رسوا ۱۸۵۸ء تا ۱۹۲۱ء	اردو شارٹ ہینڈ (رسالہ)	اردو شارٹ ہینڈ کے لئے ضروری ہدایات
۱۲	نظم طباطبائی ۱۸۵۲ء تا ۱۹۲۵ء	ا۔ تلخیص عروض و قافیہ (رسالہ)	فن عروض پہ بحث
۱۳	عزیز لکھنوی ۱۸۸۲ء تا ۱۹۳۵ء	عزیز اللغات	لغت
۱۴	نور الحسن نیّر ۱۸۶۵ء تا ۱۹۳۶ء	نور اللغات، تدوین امیر اللغات	چار حصوں پر مشتمل
۱۵	جلیل مانک پوری ۱۸۶۶ء تا ۱۹۴۶ء	ا۔ تاجِ سخن، ۲۔ جانِ سخن ۳۔ روحِ سخن	مجموعے
		۴۔ اردو کا عروض	اردو عروض
		۵۔ معیارِ عروض	اردو محاورات
۱۶	عشرت لکھنوی ۱۸۶۳ء تا ۱۹۳۶ء	ا۔ زبان دانی (رسالہ)	اردو زبان اور الفاظ کی شناخت
		۲۔ اصلاحِ زبان اردو	اردو زبان کے "تحفظ و اردو

نمبر	نام	تصنیف	موضوع
		۳- قواعدِ میر	ار[illegible] ماہیت دہلی لکھنؤ
		۴- شاعری کی پہلی دوسری تیسری، چوتھی کتاب	
		اُصولِ اردو (رسالہ)	اردو صرف و نحو
		۶- جانِ اردو (رسالہ)	اردو زبان کی ابتداء - دہلی لکھنؤ کی مرکزیت
		۷- لغاتِ اردو	لغت چار جلدوں پر مشتمل ہے
۱۷	میر لکھنوی ولادت و وفات نامعلوم	۱- ملک کی زبان المعروف ہندوستان	محاورات، لغت، ارجیے
		۲- محاوراتِ نسواں و خاص بیگمات کی زبان (رسالہ)	بیگماتی زبان - ہندو محاورات
		۳- بازاری زبان اصطلاحات پیشہ وراں	قصابوں کہاروں اور موچیوں کی اصطلاحات
		۴- غلام العلوم و متروکات کلام	محاورات کی تفصیل
		۵- میزان البیان فی تحقیق اللسان	اردو زبان کی ابتداء و ترقی
		۶- مرأۃ میر یعنی میر اللغات (لغت)	محاورات کے معنی اصطلاحات کا ترجمہ
		۷- لغات میر یعنی [illegible] (فارسی)	فارسی محاورات
		۸- گنجینۂ اقوال و خزینۂ امثال	چار ہزار اقوال اور ضرب الامثال
		۹- میر المحاورات	محاورات کے معنی، اقوال اور ضرب الامثال تفصیلاً، تذکیر و تانیث
۱۸	عبدالباری آسی ۱۸۹۳ء تا ۱۹۴۶ء	۱- ترجمہ فرہنگ آنندراج اردو	لغات فارسی لغت و قواعد کا اثر اردو پر

نمبر	نام	تصنیف	موضوع
		۲۔ تذکرہ معرکۂ سخن	شعر و سخن میں عروض، قافیہ اصطلاح
۱۹	مرزا محمد عسکری سنہ ۱۸۶۹ء تا سنہ ۱۹۵۱ء	۱۔ آئینۂ بلاغت	متعلقات نظم و نثر صنائع بدائع لفظی معنوی، علم عروض اسلوب کی ترتیب
۲۰	حسرت موہانی	۱۔ نکاتِ سخن	متروکاتِ سخن، معائبِ سخن، محاسنِ سخن، نوادرِ سخن، اصلاحِ سخن، متروکات، معائب، محاسن، نوادر اصلاحات پر روشنی
۲۱	آرزو لکھنوی سنہ ۱۸۸۲ء تا سنہ ۱۹۵۱ء	۱۔ نظام اردو	قواعد زبان اردو۔ الفاظ زبان اردو کے استعمال با محل پر بحث
۲۲	یاس یگانہ چنگیزی سنہ ۱۸۸۴ء تا سنہ ۱۹۵۶ء	۱۔ چراغِ سخن	عروض و قوافی کی عام بحث گلستان سعدی، نکات عروض میاں ثاقب کی عروض دانی
۲۳	نیاز فتح پوری سنہ ۱۸۸۴ء تا سنہ ۱۹۶۸ء	۱۔ مالہٗ و ما علیہ	شعری محاسن و معائب
۲۴	اثر لکھنوی	۱۔ فرہنگِ اثر	جلال کا سرمایہ زبان اردو کا جائزہ نور اللغات کا ناقدانہ جائزہ
۲۵	مسعود حسن ادیب سنہ ۱۸۹۳ء تا سنہ ء	۱۔ اردو زبان اور اس کا رسم الخط	زبان کے رسم الخط پر بحث
۲۶	مہذب لکھنوی سنہ ۱۹۰۹ء	۱۔ دورِ شاعری	تین حصہ علم عروض، علم بدیع علم بیان

نمبر	نام	تصنیف	موضوع
۲۷	احتشام حسین سنہ۱۹۱۲ء تا سنہ۱۹۷۲ء	۱۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	ترجمہ اردو کی نشوونما۔ درار تقاد
		۲۔ ذوق ادب اور شعور	
		۳۔ ساحل اور سمندر	سفرنامہ
		۴۔ ادب اردو (ہندی)	تاریخ
		۵۔ ادب اور سماج	تنقیدی
۲۸	مسعود حسین خاں سنہ۱۹۱۹ء	۱۔ شعر زبان	تنقیدی
		۲۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو	لسانیات
		۳۔ اردو زبان اور ادب	لسانیات
		۴۔ بکٹ کہانی	مرتبہ بشمول نورالحسن ہاشمی
		بارہ ماسہ افضل	
		قصہ مہر افروز و دلبر	(از عیسوی خان بہادر۔ مرتبہ)

مندرجہ بالا ادباء اور شعراء کی لسانی خدمات پر زیادہ زور دیا ہے۔

لکھنوی زبان اردو میں ان کی اصطلاحات تنقید و تبصرہ، شعر و شاعری اور ادبی خدمات کی
کی تصانیف کا شمار کرنے کے باوجود لسانی میدان میں تغیر و تبدل کے تاثرات، زبان میں متروکات
غلط محاورات کی اصطلاحات میں ان ادباء و شعراء کی تصانیف کے فوائد عروض، و راوزان
میں تصانیف کی اصلاحات کا جائزہ لیا ہے۔

تبصرہ کے باب میں زبان کو اظہار کا ذریعہ بتایا ہے۔[۱] لیکن علم زبان اور لسانیات کی تفصیلی بحث سے پرہیز کیا ہے۔

لسانیات میں تقابلی لسانیات کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اور مزید لکھا ہے کہ
"لسانیات کے جدید اصولوں سے اردو والوں کو روشناس کرانے کا سہرا محی الدین قادری زور کے سر ہے۔"[۲]

آگے اسی صفحہ پر لکھتے ہیں کہ
"زور کے بعد مسعود حسین خاں، شوکت سبزواری، گیان چند جین، گوپی چند نارنگ، عبدالقادر

۱؎ لکھنؤ کی لسانی خدمات۔ ڈاکٹر حامداللہ ندوی۔ صفحہ ۱۲۹
۲؎ ایضاً صفحہ ۱۳۲

سرور اور احتشام حسین کا نام لیا جا سکتا ہے"۔ ؎۱

لیکن امتیازی حیثیت احتشام حسین اور مسعود حسین خاں کو دی ہے"۔ ؎۲

؎۱ لکھنؤ کی لسانی خدمات ڈاکٹر حامد اللہ ندوی ص۱۲۵

صوتیات کی زبان میں اہمیت بتا کر کہتے ہیں۔

"متعارف لکھنوی مصنفین میں تین ایسے ہیں جن کی کتابوں کو خالص صوتیات کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انشا، رسوا اور مسعود حسین خاں"۔ ؎۳

عام بول چال کی آوازوں اور دوسری زبان کے لفظوں کے ذریعہ آنے والی آوازوں کی خصوصیات پر تینوں مصنفین کی تصانیف کا جائزہ لیا ہے۔

رسم الخط اور حروف تہجی میں اردو زبان کے رسم الخط اور اس کی اہمیت کے ساتھ حروف تہجی پر روشنی ڈالی ہے۔

قواعد میں زبان کی صحت کے اصول کا نام دیا ہے۔ اور جائزہ کے متعلق لکھا ہے۔

"جب قواعد کے متعلق بیان کرنا ہوتی ہے تو ایرانی روایت کے مطابق ان کو حسب ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) صوتیات اور علم ہجا (۲) علم صرف (۳) علم نحو (۴) الفاظ سازی"۔ ؎۴

معانی بیان اور بدیع :- معانی اور بیان کی تاریخ کی طرف اشارہ کر کے مخطابت کی پانچ باتوں پر خصوصیت سے توجہ دی گئی ہے۔

مواد جمع کرنا، ترتیب دینا، خیالات کو جامہ پہنانا، یاد کرنا اور خطبہ دینا۔ ان میں تیسری بات یعنی تقریر کے مواد کو الفاظ کا جامہ پہنانا بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ اور اس کو اسلوب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ صحت، صفائی، خوش اسلوبی اور الفاظ کا برمحل استعمال اسلوب کی چار بنیادی خصوصیتیں تھیں"۔ ؎۵

اور بدیع زبان کی وہ لفظی اور معنوی رعایتیں جو زبان اور بیان کے حسن کو دوبالا کرنے میں زرد زیوری کا کام انجام دیتی ہیں"۔ ؎۶

ان باتوں کی روشنی میں چار لکھنوی مصنفین کی تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

؎۱ لکھنؤ کی لسانی خدمات۔ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی۔ ص۱۲۵ ؎۲ لکھنؤ کی لسانی خدمات۔ حامد اللہ ندوی ص۱۲۵

؎۳ " " ایضاً ص۱۳۵ ؎۴ " ایضاً ص۱۴۱

؎۵ " " " ص۱۳۶ ؎۶ ایضاً ص۱۴۲

کا زبانِ زدِ عام ہونا۔ شل بتایا ہے۔ بنیادی خصوصیت دل کو لگنے والی بات بتایا ہے۔ لکھنؤی مصنفین میں اس پر میر اور مسعود حسن ادیب کے کام کو سراہا ہے۔

قدامت پرستی اور جدت پسندی میں الفاظ اور اصطلاحات میں ماحول اور حالات کے ساتھ تغیر و تبدل کے عمل کو قدامت پرستی اور جدت پسندی کے دو گروہ بتائے ہیں۔ اس بحث کا خاتمہ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے اس قول پر کیا ہے۔

"لکھنؤ دبستان کا قیام کسی اور حیثیت سے نہیں زبان و بیان کے لحاظ سے اردو کی تاریخ کا ایک شاندار واقعہ ہے اس دور میں زبان کو نکھار کر اور طرزِ بیان کو سنوار کر ادب کا ایک ایسا پاکیزہ معیار قائم کر دیا گیا جس کی مثال پیش کرنا دشوار ہے۔[۱]

۱۶۵ صفحے سے کتابیات کے ذیل (الف) میں تمہیدی کتابوں کا اندراج مولفین کے درج ہے۔ (ب) میں تعارف کی تاریخی کتابوں کا نام مولفین اور طباعت کے مراکز کے ساتھ دیا ہے۔

(ج) تیسرے کی کتابوں کے نام مولفین اور طباعت کے مراکز کا مذکور ہے۔

۱۷۰ صفحے سے اشاریہ شروع ہوتا ہے۔ اس طرح ۱۸۶ صفحہ پر کتاب کا خاتمہ ہوتا ہے۔

۱۔ اس تحقیقی کتاب میں شعراء و ادباء کی ترتیب سن ولادت اور وفات کے مطابق نہیں ہے۔

۲۔ مہاجر شعراء میں انشاء اللہ خاں انشاء کا ذکر ہے لیکن اسی دور کے مہاجر شاعر مصحفی کی ادبی خدمات کا ذکر نہیں ہے۔

۳۔ انشاء اللہ خاں کا سن ولادت سراج الدولہ کا زمانہ کہا جاتا ہے جو ۱۷۵۶ء اور ۱۷۵۷ء ہے۔ لیکن اس کتاب میں ۱۷۵۶ء لکھا گیا۔

۴۔ ناسخ کا سن ولادت آبِ حیات اور تذکرہ میر حسن کے مطابق [illegible] اور [illegible] ہے اس کتاب میں [illegible] بتایا۔ اور یہ سن کہاں سے اخذ کیا اس کا حوالہ نہیں۔

۵۔ میر علی رشک [illegible] سن ولادت غلط ہے۔ یہ سن کہاں سے حاصل ہوا۔ حوالہ نہیں ہے۔

۶۔ ۵۲ صفحہ پر عروض پر لکھنؤ کے پانچ مصنفین کا ذکر ہے۔ لیکن چار مصنفین کی تصانیف کے نام گنائے گئے ہیں۔

یہ اغلاط کتاب افادیت اور موضوع کو متاثر نہیں کرتے کیونکہ کتاب کا تحقیقی مواد ڈاکٹر

---

[۱] لکھنؤ کی لسانی خدمات ڈاکٹر حامد اللہ ندوی ص ۱۴۳

[۲] مجموعۂ نغز جلد اول ص ۳۰

حامد اللہ نے بہت اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لسانیات کے باب میں لکھنؤ کے شعراء و ادبا و خیالات زبان اور شاعری کی اصلاحات کا ایک اور روپ اس کتاب میں کھلا ہے۔ علاقائی بنیاد پر لسانی خدمات کا یہ کارنامہ لکھنؤ کو دبستانِ لکھنؤ کہنے پر مجبور کرتا ہے۔

اردو نثر کا دہلوی دبستان

ڈاکٹر احمد عبدالرحیم

شیواجی یونیورسٹی میں پیش کردہ مقالہ "اردو نثر کا دہلوی دبستان" ڈاکٹر احمد عبدالرحیم جاگیردار کی تحقیقی کاوش ہے۔ یہ کتاب ۴۸۸ صفحات پر محیط ہے۔

ڈاکٹر غلام عمر کے تعارف اور مصنف کے پیش لفظ سے مقالہ پر انتھک محنت اور دیگر لوازمات کے حصول میں پیش آنے والی مشکلات کا پتہ چلتا ہے۔

موصوف نے کتاب کی ترتیب میں جدید عہد کے سائنٹفک اصولوں کو اپنایا ہے۔ ہر موضوع پر قریب قریب مکمل مواد پیش کیا ہے۔ اس موضوع پر لکھی گئی پچھلی کتابوں سے الگ تحقیق نہیں ہے۔ لیکن اندازِ بیان کی متانت اور اسلوب کی کاریگری سے مصنف قارئین کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر عبدالرحیم نے اردو نثر کی ارتقاء پر بس سلجھے ہوئے انداز سے مواد پیش کیا ہے وہ موصوف کا حصہ ہے۔ اکثر مباحثے میں غیر ضروری باتیں آگئیں۔ لیکن ان سے کتاب کی اہمیت پر اثر نہیں پڑتا۔ البتہ کتابت کی غلطیوں سے اظہار واضح نہیں ہو پاتا۔ اور ایسی غلطیاں اس کتاب میں موجود ہیں۔

اپنے موضوع پر مواد کے اعتبار سے کتاب میں کوئی خامی نہیں ہے۔ اس کتاب پر مبشر علی صدیقی کا بیان قابلِ غور ہے۔

"یہ کتاب اس قابل ہے کہ یونیورسٹی کے طلبا اور عام ناظرین اس سے رہنمائی کا کام لیں۔ اور یقیناً یہ کتاب ایک اچھے رہنما اور رفیق کا کام دے سکتی ہیں" ؎۱

یہ کتاب دبستانی ادب میں یقیناً اضافہ ہے۔ اور اردو ادب میں دبستانوں کی تقسیم کی اہم تاریخ ہے۔

؎۱ جائزے۔ مرتبہ مظفر حنفی (تبصرہ مبشر علی صدیقی) ص ۸۲

تبصرۂ کتب

۳- اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک   خلیل الرحمٰن اعظمی   ۱۹۶۵ء

۴- ترقی پسند ادب - ایک جائزہ   ہنس راج رہبر   ۱۹۶۶ء

(۵) جدید رجحان پر عمومی تبصرہ

کتب

۱- نئے ادبی رجحانات   ڈاکٹر سید اعجاز حسین   ۱۹۵۷ء

۲- جدیدیت کی فلسفیانہ اساس   ڈاکٹر شمیم حنفی   ۱۹۷۵ء

۳- نئی شعری روایت   ڈاکٹر شمیم حنفی   ۱۹۷۸ء

۴- اردو کی اہم تحریکیں ایک جائزہ

اردو زبان پر مختلف تحریکات اور رجحانات کا اثر

کسی بھی زبان کی تاریخ کو ادب کی تاریخ ہونے تک مختلف نظریات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مزاج اور ماحول مذہبی، دینی، مادی اور اعتقاد کی روشنی میں ہر عہد اور زمانے میں حالات سماجی سیاسی حکمت عملی کے پیش نظر اپنی ہیئت صوتی آہنگ میں ڈھلنا پڑتا ہے۔ کسی زمانے میں حالات پر لسانی مینا کاری کا غلبہ ہوتا ہے۔ کسی عہد میں خیال کی اہمیت کسی دور میں ہیئت پر زور دیا ہے۔ کسی وقت براہ راست مواد کو فوقیت دی جاتی ہے۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ زبان کی نشوونما میں مختلف نظریات، رجحانات اور تحریکات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ شعری اور نثری ہر میدان میں یہ ذرائع زبان کو بننے بگڑنے اور سنورنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

ہر زبان کی طرح اردو زبان پر بھی مختلف عہد میں مختلف رجحانات و نظریات اور تحریکات کا اثر ملتا ہے دور قدیم سے اس زبان کی تاریخ کے عہد بہ عہد ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو کہیں دوہے گیتوں کہہ مکرنیوں کا اثر ملتا ہے۔ کسی مقام پر ہندی روایات کے مطابق گیتوں میں اظہار عشق معشوق کی طرف کیا جا رہا ہے۔ اردو شاعری پر کبھی تصوفانہ خیالات اور اثرات کا رنگ غالب ہے۔ کہیں ایہام گوئی کی تحریک سے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اکثر جگہ غزل ریختی کے لباس میں ملبوس ہے۔ کہیں تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کہیں ناسخ کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر فصاحت و بلاغت کے روپ میں مبالغہ آرائی، تصنع کا شکار ہوئی ہے۔ کبھی اصناف سخن اور اصناف ادب کے بیشتر تجربات سے ہیئت کے مختلف روپ میں دکھائی دیتی ہے۔ کہیں اس زبان کی شاعری اور نثر پر ہندی اور سنسکرت کا اثر ملتا ہے۔ کبھی فارسی زدہ تراکیب کی جدتات سے آراستہ و پیراستہ نظر آتی ہے۔

غرض کہ ہر دور میں اور ہر عہد میں یہ زبان عوامی جذبات اور احساسات سے منسلک دور حسب منشاء خیالات کے اظہار کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ دانشور طبقہ اور عوامی طبقہ کے بیچ اتحاد اور یکجہتی کا اٹوٹ انگ ہے

کلاسیکی عہد میں عوامی مزاج کے مطابق ڈھلنے کے باوجود یہ زبان ۱۸۵۷ء کے بعد ایک عظیم انقلاب

سے دوچار ہوئی۔ جسے تاریخ دانوں نے نشاۃ ثانیہ سے منسوب کیا اس زمانے میں اردو زبان نثر و نظم کے روایتی بندھنوں سے یکلخت آزاد ہوئی۔ انداز بیان سے لیکر اظہار خیال تک ہر شعبہ میں تبدیلی آئی حالات کے تقاضے اور مصروفیات کے عمل نے نثر نگاری اور شاعری میں سلیس انداز بیان کو اہمیت دیا شعر فہمی اور شعر گوئی کے انداز میں تبدیلی آئی۔ ادب برائے ادب کے نظریہ کا خاتمہ ہوا اور ادب برائے زندگی شروع ہوا مقفع مسجع تحریروں کا خاتمہ ہوا براست اظہار کی قدر دانی ہوئی۔ قومی زوال نے جہل و خرد کے بڑھتے تقاضوں سے تباہ حالی میں اضافہ کیا۔ اس عہد میں اردو ادب کو سنوارنے اور مسلم قوم کی اصلاح کے پیش نظر سرسید احمد خان نے انگریزی ذریعۂ تعلیم کو اہم قرار دے کر انگریزی اور اردو کی تعلیم عام کرنے کا نعرہ بلند کیا جس نے اردو زبان اور اردو ادب میں کئی اصلاحات کا کام شروع کیا۔ اس تحریک سے پہلے مذہبی نظریات و دین کے پرچار کو عام کرنے کے نظریہ نے زور پکڑا تھا۔ جسے وہابی تحریک کے نام سے مشہور کیا گیا۔ یہ تحریک سرسید تحریک سے پہلے اردو ادب میں تفاسیر قرآن اور مذہبی فلسفہ کی نثر و نظم کو عام کرنے کا نعرہ بلند کر چکی تھی حالات کے پیش نظر اس تحریک کا خاتمہ سرسید تحریک کا عروج ثابت ہوا۔

سرسید تحریک کے بعد اردو زبان میں رومانی تحریک چند لہروں نے دلی سمندر میں تموج پیدا کیا۔ جس نے حسن یا ادب لطیف کا نعرہ بلند کیا ادب برائے ادب کے نظریہ کو تقویت بخشی اور اس گروہ کے شعرا نے ہر چیز میں حسن کی تلاش کو ولیت دی۔ کسی بھی شعبۂ حیات کی جانچ محض حسن قرار پایا۔ اس سوچ کی بنیاد پر شاعری ناول اور افسانے کا دور دورہ ہوا۔

اس تحریک نے یورپ کی طرح اردو کو متاثر ضرور کیا۔ لیکن یورپ کی طرح ادب کو اپنی گرفت لینے سے معذور تھی۔ اسی دوران دوسری جنگ عظیم نے دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کو اپنی تباہ کاری کی زد میں لے لیا۔ اور حال تمدن زبردست تبدیلی رونما ہوئی اس طرح اردو زبان کو ایک اہم نظریاتی تحریک کا سامنا کرنا پڑا جو آگے چل کر ترقی پسند تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ تحریک مارکس کے جدلیاتی مادیت کا نتیجہ تھی۔ جس نے شعور پر مادے کو فوقیت

اور رائج الوقت لب و لہجہ کی نمائندہ تھی۔

اردو ادب میں اس تحریک کا سب سے اہم کارنامہ یہی ہے کہ اس سے وابستہ افراد نے دینی لٹریچر کو عام فہم زبان کا نمائندہ بنایا۔ القاب و آداب کے طویل سلسلے کا طلسم ٹوٹا۔ اور سلیس رواں طرز تحریر کا دور دورہ ہوا۔ خواجہ احمد فاروقی کا خیال ہے کہ

"سر سید کو سہل طرز نگارش کی دین اس تحریک کا وجود ہے" [1]

ہمارے ادب میں اس تحریک کا کوئی خاص تذکرہ نہیں ملتا۔ حالانکہ اس تحریک نے ایک طرف عقائد کی تاریکی میں روشنی پھیلا کر اردو زبان کی سلیس طرز نگارش سے مقبول عام کر دیا تھا۔ اس تحریک کے ذریعہ مذہب کا عربی سرمایہ اردو زبان میں منتقل ہوا اور عوام کے شعور میں بیداری آئی جس سے مسلم معاشرے میں کسی حد تک دینی اعتدال پیدا ہوا۔

اس تحریک کی زبانی اہمیت آغا باقر کے اس بیان سے واضح ہو جاتی ہے:

"مولوی سید احمد شہید بریلوی اور ان کے استاد شاہ عبد العزیز اور شاہ عبد القادر کی کوششوں سے اشاعت وہابیت کی زبردست تحریک شروع ہوئی۔ اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت سی کتب و رسائل لکھے گئے اگرچہ وہ ہندی نگ میں تھے۔ لیکن زبان صاف اور سلیس تھی یہ تحریک بھی اردو کیلئے مفید ثابت ہوئی" [2]

افسوس کہ اس تحریک پر صرف ایک کتاب "اردو ادب میں وہابی تحریک" خواجہ احمد فاروقی کی ملتی ہے جو اس تحریک کی تاریخ کی مختصر روداد ہے۔ اس تحریک پر مزید لکھنے کی گنجائش ہے۔

اردو میں وہابی تحریک

خواجہ احمد فاروقی

خواجہ احمد فاروقی کا یہ مقالہ ۱۹۶۴ء کی مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس این آربر مشی گن ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پڑھا گیا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ کتابی شکل میں "اردو میں وہابی تحریک" ہے۔ یہ کتاب ۱۱۵ صفحات پر مشتمل موضوع کے اعتبار سے قومی زوال کی تاریخ اور ادب کی جامع معلومات کا ذخیرہ ہے۔ ابتداء میں مصنف نے ہندو مسلم مشترک معاشرے سے مسلم قوم میں رائج

---

[1] اردو ادب میں وہابی تحریک۔ خواجہ احمد فاروقی۔ ص ۳۰

[2] تاریخ نثر و نظم اردو۔ آغا باقر۔ صفحہ ۱۵۲

ہونے والے مشرکانہ تصورات ان سے وابستہ بدعتیں اور اسلامی رواج کو متاثر کرنے والے رسم ورواج کا سرسری جائزہ پیش کیا ہے۔

مصنف نے اس تحریک کا اصل مقصد مذہب میں غلط رسم ورواج اور عقائد کو ختم کرنا بتایا ہے۔ اکثر صوفیاء جو ہندو فلسفے سے متاثر تھے یا ہندو مسلم عقائد میں بیچ کی راہ نکالنے کے خواہاں تھے۔ ان کے پیدا کردہ غلط عقائد کا قلع قمع اس تحریک کا مقصد تھا۔ مصنف کے مطابق اس تحریک کے بانی شاہ ولی اللہ ہیں۔

"اٹھارویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہ (۱۷۰۲ - ۱۷۶۰ء) نے اپنی مہتم بالشان تحریک شروع کی۔ یہ تحریک مذہبی بھی تھی، سیاسی بھی، معاشی بھی اور ادبی بھی۔"[۱]

اس تحریک کی ادبی اہمیت مصنف کے اس بیان سے واضح ہوتی ہے۔

"اس وہابی تحریک میں چنداں ادبی محاسن نہیں۔ تاہم اردو نثر کی تاریخ میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ وہابی مصنفین اور اہل قلم نے اردو نثر کے پرتکلف اسلوب کو بالکل بدل دیا۔"[۲]

مصنف نے اس کتاب میں وہابی تحریک کو اردو ادب میں سلیس نثر کا اہم ذریعہ بتایا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"ہمارے عام ادبی مورخوں نے وہابی ادب پر بہت کم توجہ کی ہے لیکن سچ پوچھئے تو وہابیوں کی عسکری شکست کے باوجود ان کا اسلوب تحریر خاصا مقبول رہا ہے۔ اس لئے کہ اس کی سرحدیں مستقبل سے مل گئی ہیں۔ یہ خیال عوام تک پہنچانے کے لئے سادہ اور آسان طرز کی ابتداء سرسید احمد خاں نے کی۔ تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں۔ وہابی ادب کو موجودہ نثر کی ارتقاء میں ایک اہم مقام حاصل ہے اگر وہ نہ ہوتا تو دہلی کالج کی نثر اور سرسید احمد کی تصانیف معرض وجود میں نہ آتیں۔"[۳]

مصنف نے اس کتاب میں شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، سید اسماعیل شہید، سید احمد بریلوی وغیرہ کو وہابی تحریک میں لکھنے والوں میں شامل کیا ہے۔ یہ کتاب وہابی تحریک سے وابستہ نظریات اور اس کی تاریخ کو سمجھنے میں مددگار ہے اور تحقیق کے طلبہ

---

[۱] اردو میں وہابی تحریک، ڈاکٹر محمد احمد فاروقی، صفحہ ۱
[۲] ایضاً صفحہ ۲
[۳] ایضاً صفحہ ۳

زبانوں کی سلیس تحریر کے انداز نے زبان میں سہل نگاری کی روش کے لئے راستہ ہموار کیا۔

اس بنیاد پر نشاۃ ثانیہ سے وابستہ عقائد والوں نے اسے ہندوستان کا نشاۃ الثانیہ کہا ہے۔ حالانکہ اس عہد میں کلاسیکی اور روایاتی ذریعۂ اظہار کے تصنع اور بناوٹی انداز سے انسان خود اکتا گیا تھا۔ اور اس روش سے اکتاہٹ نے غالب نے خطوط میں اس طرز کی بنیاد رکھدی تھی جکری تبدیلی کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے عہد کے بیشتر نقاد اس نحو اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ہندوستان کا نشاۃ الثانیہ ہے۔

اس علمی وادبی تحریک نے پرانے رجحانات کو یکسر بدل ڈالا اور ایک ایسے علمی تحریک کی بنیاد ڈالی جسے حقیقت اور صداقت کی جستجو تھی۔ سچائی کی تلاش اور تکمیل زندگی و ترقی یہ وہ اہم بنیادیں ہیں جن پر سرسید کے تمام علمی کاموں کی بنیاد کھڑی ہے[1]

اس تحریک پر (۱) سرسید تحریک۔ خلیق احمد (۲) اور علی گڑھ تحریک۔ دو کتابیں ملتی ہیں۔

رومانوی تحریک

انیسویں صدی کے ابتدائی نصف میں کیٹس کے شیدائیوں نے ہمارے ادب میں حسن اور خوبصورتی کو حقیقت نگاری کا نام دے کر ادب لطیف کا نعرہ بلند کیا۔ چنانچہ ادب برائے ادب عقلیت کی بنیاد پر ہر شے میں حسن کی تلاش حقیقت پسندی پر معمور ہوئی۔ لیکن اس دعوی نے عملی اور تحریکی روپ اختیار نہیں کیا۔ اس پر پروفیسر آل احمد سرور کا کہنا ہے۔

"ہمارے یہاں رومانی تحریک نہیں ہے۔ رومانی لہریں ہیں۔ جو تنقید میں تاثراتی رنگ دکھاتی ہیں۔ نیاز، ابوالکلام کی طرح مذہبی و علمی مسائل کی چھان بین میں عقلیت سے چلے تھے۔ مگر ادب لطیف نے انھیں اپنی طرف کھینچا اور پھر وہ ادب کو ہی عبادت سمجھتے رہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ادب میں وہ مانوس حسن کے دلدادہ ہیں۔ شاید اسی وجہ سے کہ وہ عربی فارسی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اس نظریے نے انھیں زبان کے معاملے میں خاصا کٹر بنا دیا ہے۔"[2]

رومانی شعراء اور ادباء نے فن میں حسن کو اولیت دی۔ اسلوب سے ہے کہ خیال اور

---

[1] دار المصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات، ڈاکٹر خورشید نعمانی ص۲۲
[2] تنقید کیا ہے؟ آل احمد سرور مکتبہ جامعہ ص۲۲

اور موضوعات تک حسن اور خوبصورتی کو معیاری ادب کہا گیا۔ اسی حسن کی تلاش میں بعض لکھنے والے فنون لطیفہ اور مذہبی تاریخ کے دلدادہ ہو گئے اور انھوں نے منطقی اظہار سے چیزوں کا حسن پیش کرنا نہیں بلکہ چیزوں کو حسین انداز میں دکھانا ہے۔

کیٹس کے اس نظریئے کے سہارے جمالی حس کو بیدار کیا اور یہ ثابت کرنے میں حسن صداقت ہے۔ اور صداقت حسن پر اپنی صلاحیت کو صرف کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ حسن فطرت اور مظاہر فطرت میں رواں دواں ہے۔ "حسین چیز کا بدل مسرت" کے خطاب سے نوازا گیا اسی اصول نے ہمارے ادب کو جمالیاتی تاثراتی اور تقابلی تنقید سے روشناس کیا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ محمد حسین آزاد نے جو فنی حسن پر زور دیا وہ رومانیت کا اثر تھا۔ شبلی کی قدیم اسلامی تاریخ سے دلچسپی ایک طرح کی رومانیت ہے۔ [1] کئی لوگوں نے ماضی کے ورثے اور روایات میں حسن کو تلاش کیا۔ اور رومانیت کا مظاہرہ کیا۔ نیاز فتحپوری اسلوب کی مینا کاری اور ماضی کے جھروکوں میں حسن کی تلاش میں تاثراتی ہو کر رہ گئے۔ اور جمالیاتی تنقید پر بھی یہ تاثر حاوی ہے۔

اس نظریئے کی بنیاد پر شاعری تاریخ نگاری تنقید نگاری میں درج ذیل شعراء اور ادباء نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ عظمت اللہ، فراق، سجاد انصاری جوش، احسان، قرۃ العین حیدر، مہدی افادی، اختر شیرانی، عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی وغیرہ۔ یہ نظریات کوئی تحریکی یا عملی کارکردگی کا نتیجہ نہ تھے۔ اسی وجہ سے بعد میں رومانی شعراء اور ادیب کئی حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ اس رجحان کی ایک بڑی ٹیم بعد میں سرسید تحریک ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر ان کی پیروی پر آمادہ ہو گئی۔

رومانی تحریک نے حالات کے بدلتے ہوئے دھارے کو نیا موڑ دیا۔ مزاج میں تبدیلی پیدا کی اس تحریک سے وابستہ ادباء اور شعراء میں شعوری بیداری اور ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ جمالیاتی جلوا جاگر ہو گئے۔ فنون لطیفہ میں نکھار پیدا ہوا۔ مختلف نظریاتی تحریکوں میں اسلوب کی نمائندگی خوبصورت خیالات، لفظی بندش، جدت ادا اور تراکیب کو عمدہ پیرایہ میں استعمال کیا گیا اور اس طرح ادب میں ایک نئی توانائی بر آئی۔ اس موضوع پر ڈاکٹر محمد حسن کی "اردو میں رومانوی تحریک" قابل ستائش

---

[1] تنقید کے بنیادی مسائل (جمالیاتی تنقید) وحید اختر ص ۱۵۱

اردو ادب میں رومانوی تحریک

ڈاکٹر محمد حسن

ڈاکٹر محمد حسن کی تصنیف "اردو ادب میں رومانوی تحریک" ۳۰۴ صفحات پر مشتمل اردو میں رومانوی ادب کی مختصر مگر جامع تاریخ ہے اور اس کے تنقیدی کردار نظم اور نثری کارناموں کا تجزیہ ہے۔ دیباچہ میں رشید احمد صدیقی نے کتاب کی اہمیت ان الفاظ میں واضح کی ہے۔

> "اس مقالہ کا مقصد ان سوالوں کا جواب دینا نہیں ہے جو رومانویت نے دنیائے ادب کے سامنے رکھے تھے۔ بلکہ ان سوالات کو نئی روشنی میں پیش کر کے رومانوی تحریک کے تاریخی اور ادبی مقام کو متعین کرنا ہے۔"[1]

ڈاکٹر محمد حسن نے ابتداء میں رومانس لفظ کی وجہ تسمیہ مفہوم کی وضاحت یورپین ادب کی تاریخ کی روشنی میں کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ

> "دراصل رومانوی تحریک نے کیٹس کے اس نظریہ پر زور دیا کہ حسن صداقت ہے۔ اور صداقت حسن ہے۔ جمالیاتی تاثر کی اس تلاش میں انھوں نے تنقید و ادب تحسین کے پرانے معیاروں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ نئے اسلوب اور نئے فارم کی تلاش میں شروع ہوئی اور اس تجربے کے ذریعہ اردو ادب کے نئے پیچ سے آشنا ہوا۔"[2]

مصنف نے اس بیان کی روشنی میں رومانوی تحریک کے ادبی کردار کی تاریخ تحریک سے دیار و شعراء کے مقاصد اور اردو کے رومانوی نقادوں کے تنقیدی نظریات کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ شعراء کے کلام کے انتخاب کی روشنی میں ہر شاعر کی خصوصیات رومانویت کے کس پہلو کو نمایاں کرتی ہے۔ ان خصوصیت اور خامیوں پر تنقید و تبصرہ ہے جو موصوف کی غائر نظری اور عمیق مطالعہ کا ثبوت ہے۔

اقبال، جوش، اختر شیرانی، امتیاز علی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، روش صدیقی اور احسان دانش کے یہاں کن جذبوں کی نمائندگی ملتی ہے اور ان میں رومانویت کے کون سے اثرات موجود ہیں۔ ان کی جملہ خوبیوں اور خامیوں سے بحث کی ہے۔

۱؎ اردو ادب میں رومانوی تحریک۔ ڈاکٹر محمد حسن ص۲ دیباچہ

۲؎ ایضاً ص۳۵

ادب میں ابوالکلام سجاد نیاز فتح پوری خلیق مجنوں مہدی افادی عبدالرحمن بجنوری وغیرہ کے تنقیدی مضامین، افسانوں اور تصانیف میں کون سے عناصر کس نہج کی رومانیت کے تاثر کا نتیجہ ہیں۔ ان پر بحث کی ہے۔

ہر ادیب، شاعر افسانہ نگار نقاد وغیرہ کے رومانوی نظریہ کا تجزیہ کیا ہے۔ اس ضمن میں ذیل کے بیانات۔ رومانوی تحریک کے نتائج کا بہترین اظہار ہیں۔

۱۔ "رومانوی اثرات نے کئی لحاظ سے شاعری اور ادب کی بڑی خدمت انجام دی۔ ایسے دور میں جب فن دوسری سماجی علوم کے مقابلے میں ضمنی اور ثانوی سمجھا جانے لگا تھا۔ اور اسے سیاست اخلاق اور مذہبیات نے محض اپنا مجبول آلۂ کار بنانے پر اصرار شروع کر دیا تھا۔ رومانوی ادیبوں نے جمالیات اور فن کے تقاضوں پر زور دیا اور اس بات کو پورے خلوص اور اعتماد کے ساتھ دہرایا کہ فن بذاتِ خود ایک اعلیٰ صنف ہے۔ اور اس کا رشتہ سماج کے دوسرے علوم سے ضمنی نہیں بلکہ ہم پایہ ہے۔" [۱]

۲۔ "رومانویت کا تاریخی مرتبہ یہ ہے کہ اس نے ہماری نئے تعلیم یافتہ طبقہ کو خود آگہی کی روشنی دی۔" [۲]

۳۔ "رومانویت نے فکر کی بنیادوں کو وسیع اور پائندہ کرنے کے بجائے جذباتیت کو رواج دیا۔ اور پھر اس کی لے یہاں تک بڑھی کہ اس جذباتیت میں دور دور تک خیال اور عمل حقیقت اور فکر کے عناصر کا پتہ نہ چل سکا۔ رومانوی ادب بڑی آسانی سے دوسرے کنارے پر آ گیا۔ اس نے صرف جذبے کو اہمیت دی۔ اور اس طرح اپنی فکری کم مائیگی کو بڑی کامیابی سے چھپانے کی کوشش کی۔" [۳]

اس کتاب پر تنقیدی سرمایہ جلد دوم کے مولف عبدالشکور کی رائے قابلِ غور ہے۔

"یہ مقالہ بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے جس کی عبارت شگفتہ اور دل پذیر ہے۔ اور طرزِ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد حسن صاحب نے اس موضوع کا بغائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔" [۴]

۱۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک۔ ڈاکٹر محمد حسن ص ۱۹۸
۲۔ ایضاً ص ۹۹
۳۔ ایضاً ص ۱۹۱
۴۔ تنقیدی سرمایہ جلد دوم۔ عبدالشکور ص ۲۷۷

محمد حسن کی کتاب میں رومانوی تحریک کے آغاز، ارتقا، زوال اور خاتمہ کی تاریخ اور ادبی کردار، کارناموں کی بازیافت کی ہے۔ یہ تصنیف ادبی تاریخوں کی ترتیب میں رومانوی تحریک کے مزاج، ماحول اور تاریخ کا مواد فراہم کرنے میں مددگار ہے۔ ادب کی تحریک کی تاریخوں میں قابل قدر اضافہ ہے۔ لیکن کتاب میں شبلی نعمانی کا عدم تذکرہ کتاب کی اہمیت کو متاثر کرتا ہے۔

ترقی پسند تحریک

یورپ کی بدلتی اقدار کے تحت ترقی پسند خیالات و نظریات کی ابتداء ہندوستان میں ہوئی بقول آل احمد سرور

> "یوں تو ادب میں ترقی پسند عناصر غدر کے بعد سے نمایاں ہیں اور غدر کے پہلے کے ادب میں بھی جا بجا اس کی جھلک ملتی ہے۔ یعنی ترقی پسندی محض آج کل کے ادیبوں کی جاگیر نہیں ہے۔ مگر حالی کے زمانے سے یہ رجحان ادب میں اتنا اہم ہو گیا کہ اس نے ساری فضا کو متاثر کیا۔ حالی کے بعد پریم چند، اقبال اور جوش نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور اس میں بعض مستقل اضافے کئے۔ مگر یہ تحریک باقاعدہ طور پر ۱۹۳۵ء سے شروع ہوئی۔" [1]

اس بنیاد پر ترقی پسند تحریک اپنے زمانے میں بالکل نئی نہیں تھی۔ لیکن اس میں شامل باغیانہ نعروں نے اس تحریک میں کچھ عرصے کے لئے انتہا پسندی کے جذبات پیدا کر لئے تھے۔ سرسید تحریک اس کے مقابلے میں اصلاحی اور ادبی تھی۔ اور متوسط طبقہ کی خواہش کا عملی روپ تھی۔ لیکن یہ اجتماعی نظام کے ساتھ سیاسی نظریات کی دین تھی جو لوگ اپنے عہد میں مارکس کے جدلیاتی فلسفہ سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے ادب میں اسی فلسفے کے تعین کا آغاز کیا۔ [2]

مادیت کو بنیاد بنا کے ادب کو سماج سے قریب ہونے کا نعرہ بلند کیا۔ ادب صرف ادب نہیں۔ ادب زندگی کا عکاس ہے۔ ادب ذہنی عیاشی کا ذریعہ نہیں۔ ادب انسانی مسائل کا حل ہے اس لحاظ سے یورپ میں رہنے والے ہندوستان کے کچھ نوجوان ہم خیال ساتھیوں نے ۱۹۳۵ء میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کا قیام عمل میں لایا اور اپنے مقاصد کی روشنی میں ادب کے

---

[1] تنقید کیا ہے: آل احمد سرور (مکتبہ جامعہ) ص ۱۲۲
[2] ادب اور زندگی۔ مجنوں گورکھپوری ص ۱۳۲

ہر محاذ پر ادب کو زندگی سے قریب کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اپنے کلاسیکی ادب کے اسلوب میں وقتی تقاضوں، قدروں کی روشنی میں لفظی تراکیب میں تبدیلیاں لائی گئیں۔ سرسید تحریک کی طرح آسان اور سہل نثر و نظم نگاری پر زور دیا گیا۔ چند موضوع کو زندگی سے قریب اور حالات کے تقاضہ سمجھ کر ان کے گرد افسانے، ناول، نظمیں، غزلیں سب کچھ پیش کیا گیا۔

عورت، روٹی، بھوک، کسان، سماج، غربت، امیری ان موضوعات سے الگ زندگی اور سماج انھیں نظر نہیں آئی۔ اس تحریک کے مشہور ادیب اور شعراء مثلاً سجاد ظہیر، مجاز، ساحر، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، جاں نثار اختر سب پر مارکس فلسفے کا غلبہ تھا۔ اسی بنیاد پر وہ مادی مسائل کو زندگی کا حل سمجھتے تھے۔ اسی لئے موضوع سے خارج فکر کے محدود دائروں ان لوگوں کا انداز تخاطب ایک جیسا رہا۔ اکثر ان کی نظموں کو شروع کرتے ہی اس کا انجام ذہن میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

حالی سے پہلے یہ نقوش ادب کے مزاج کو تبدیل کرنے اور انسانی مسائل پر ہمدردی کی عکاسی کرنے لگے تھے۔ لیکن ۱۹۳۵ء کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کے طفیل میں اس تحریک نے ایک نظریاتی فلسفہ کا سہارا لے کر ادب کو اس میں قید کرنا اپنا فرض سمجھا۔ لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود ترقی پسند تحریک کے ذریعہ اردو ادب کے مزاج میں ایک نمایاں تبدیلی آئی۔ شاعری کے چند موضوعات کے باوجود تقابلی اور عملی تنقید کا ایک معیار قائم ہوا۔

اچھی شاعری، بری شاعری، داخلیت، خارجیت، انفرادیت، اجتماعیت جیسے مسئلے ادب کے موضوعات بنے۔ اسلوب میں ایک نمایاں تبدیلی آئی۔ سہل اور آسان نثر، نئی تراکیب موجودہ زمانہ سے منسلک تشبیہات و استعارات کے ساتھ تلمیحات کو برتا گیا۔ لفظی گورکھ دھندے سے ادب کو بچایا۔ غزل سے زیادہ نظم، آزاد نظم، قطعات، معریٰ نظم کے سہارے اپنے نظریات کے مطابق موضوع پر اظہار خیال کیا۔

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب

'اردو تنقید میں ترقی پسند تحریک اور اس کے علمبرداروں نے ایک نئی روح پھونک

ادب کو ایک نئے زاویۂ نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ اور اس کو پرکھنے کے لیے نئے معیار قائم کیے۔[۱]

اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک اپنے عہد کی ایک نمائندہ تحریک تھی جس نے فکری تبدیلی اور سماجی ردوبدل میں ادب کو استعمال کیا۔ لیکن چند مخصوص نظریات، حالات اور ماحول کی عین ضرورت کے سبب اس تحریک کو اتنا بڑھاوا ملا۔ لیکن جب حالات نے کروٹ بدلے اور مضمون تبدیلی آئی تو اس تحریک نے اپنے قدموں کے ساتھ دم توڑ دیا۔ اور ان میں سے ایک انتہا پسند گروپ نے ترقی پسند ادب وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس تحریک کے مزاج اور تاریخ کو سمجھنے میں درج ذیل کتابیں اہمیت رکھتی ہیں۔

بہرکیف مختصر یہ کہ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو سائنس سے قریب کرنے کے اہم کردار ادا کیا ہے۔ وقت ترقی دباؤ کا شکار ہیں۔ کیونکہ یہ بدلتے ہوئے زمانے کی قدروں کا تقاضا تھا۔ اگر ترقی پسند تحریک یہ فرض انجام نہیں دیتی تو وقت اور حالات اس فریضہ کو پورا کر لیتے۔

۱۔ روشنائی	سجاد ظہیر
۲۔ ترقی پسند ادب	عزیز احمد
۳۔ ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری
۴۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی
۵۔ ترقی پسند ادب ایک جائزہ	ہنس راج رہبر

ترقی پسند ادب

عزیز احمد

عزیز احمد کی زیر نظر تصنیف ۱۷۵ صفحات پر مشتمل ہے درج ذیل عنوانات کا احاطہ کرتی ہے۔

---

[۱] اردو تنقید کا ارتقاء۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۳۳۳

ہے جتنی ہمیشہ رہی ہے۔ اور میرا تجربہ ہے کہ اشتراکی ملک کا رہنے والا نیا انسان بھی
جب تمام معاشی مسئلے حل کر چکے گا تو وہ ایک باطنی اندرونی خلاء محسوس کرے
گا جس کے لئے وجدانی احساس کی ضرورت ہوگی۔ [۱]

یہ ایسا بیان ہے جو ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ تنقید نگاروں کی انتہا پسندی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ مصنف کی یہ صاف گوئی اخلاقی جرأت کا ثبوت ہونے کے ساتھ اشتراکی نظریے کی عمارت کو منہدم کر دیتی ہے۔

اردو ادب اور جدید تحریک میں مصنف نے غالب، اکبر الہ آبادی اور اقبال کو زیر بحث لایا ہے۔ اور ترقی پسند شاعری کے باب میں اقبال پر اختر حسین رائے پوری کی رائے کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اقبال کی "شاہین" کو جبر قرار دینا بڑی غلطی ہے۔ جبر ایک ایسے فلسفے کے لئے جو خیر و شر دونوں کا قائل ہے۔ (اور اقبال قبل اسلام کے ایرانی فلسفے کے اثرات کی وجہ سے خیر و شر کے تنازعے کے عام سے زیادہ قائل ہیں) ایک ہی معنی رکھتا ہے۔ یعنی دوسروں کے حقوق چھیننا یا دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھانا۔ لیکن اقبال کا شاہین جو آسمان کو زیر پر رکھتا ہے۔ کبوتر کو مارنا نہیں سیکھا۔ وہ بلند پروازی اور خیر کی طاقت کا رمز ہے، جبر کا نہیں۔" [۲]

مصنف نے اس بیان کی روشنی میں اقبال کا تفصیلی جائزہ لے کر ترقی پسند مصنفین کے خیالات کی تردید کر دی ہے۔ حسرت، جوش، فیض، ن م راشد، مجاز اور مخدوم محی الدین کے کلام پر تفصیل سے تبصرہ ہے۔

ترقی پسند افسانہ اور ناول کے باب میں قاضی عبدالغفار، پریم چند، اوپندر ناتھ اشک، دیویندر ستیارتھی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو پر تبصرہ کیا ہے۔ اور راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر کو بہت سراہا ہے۔ ترقی پسند ظرافت میں کنہیالال کپور پر تبصرہ کیا ہے۔ ترقی پسند تنقید، احمد علی، احتشام حسین کا تذکرہ ملتا ہے
اردو میں ناول کے خدوخال کے باب میں عام جائزہ لیتے ہوئے رتن ناتھ سرشار،

---

[۱] ترقی پسند ادب - عزیز احمد - ص ۳۳
[۲] ایضاً ص ۴۹ - ۴۸

عبدالحلیم شرر، سجاد حسین کسمنڈوی، نیاز فتحپوری، سجاد ظہیر وغیرہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

اس کتاب کو ترقی پسند نظریے کے اشتراکی اصولوں کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا۔ مصنف نے کئی مقامات پر اس نظریہ کی خامیوں پر نظر رکھتے ہوئے صاف ستھرے الفاظ میں اپنی بات سمجھائی ہے۔

مصنف نے اپنے عہد میں نئی قدروں اور افکار کے آغاز کی حمایت میں ان سے منسلک ادبی سرمایہ کو رد نہیں کیا۔ اور دورِ جدید سے وابستہ ادبی اور فکری تبدیلیوں کے پیشِ نظر تبصرے اور تنقید کا رویہ اپنایا ہے۔ اسی لئے علی سردار جعفری نے اپنی کتاب میں ان کے پیش کردہ بیانات سے اتفاق نہیں کیا ہے۔

مصنف کو جدید فکری تقاضوں کا علم تھا لیکن ان کی اندھی تقلید کا قائل نہیں تھا۔ اسی سبب کئی مقامات پر اس نے حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

اس کتاب میں نیاز حیدر، سجاد حیدر یلدرم، عصمت چغتائی کا ذکر نہیں ملتا ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے ترقی پسند ادب کی حقیقی تصویر ابھرتی ہے۔ لیکن اشتراکی نظام کے کمزور پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی تاریخ کو سمجھنے میں یہ کتاب مددگار ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

ترقی پسند ادب

علی سردار جعفری

زیرِ نظر تصنیف علی سردار جعفری کی نظریاتی کاوش کا نمونہ ہے۔ دیباچہ سے حرفِ آخر ۲۷۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی فہرست مضامین کے عنوانات اس طرح ہیں۔

۱۔ دیباچہ طبع ثانی ۲۔ حرفِ اول
۳۔ ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ
۴۔ پہلا باب نقطۂ نگاہ

۵۔ دوسرا باب۔ بعض بنیادی مسائل

۶۔ تیسرا باب۔ تاریخی پس منظر

۷۔ چوتھا باب۔ حقیقت نگاری اور رومانیت

۸۔ پانچواں باب۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک

۹۔ چھٹا باب۔ تخلیقی رجحانات ۱۰۔ حرف آخر

یہ کتاب ترقی پسند تحریک کا مکمل خاکہ ہے۔ مصنف کے ذیل کے جملے اس بات کا ثبوت ہیں۔

"میری یہ کتاب کا موضوع صرف نظریاتی مباحث اور ترقی پسند تحریک کے محرکات اور رجحانات تک محدود ہے۔ اس لئے بیشتر ادیبوں اور ان کی تخلیقات کا ذکر صرف حوالوں اور مثالوں کی شکل میں آیا ہے۔"[1]

ترقی پسند مصنفین مارکس کے جدلیاتی مادیت فلسفے کے مبلغ تھے۔ اسی نظریے کی کسوٹی پر مصنف نے ہر شاعر و ادیب کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے مطابق ادب کو سماج اور زندگی سے قریب تر ہونا چاہئے تھا۔ ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ جو اپریل ۱۹۳۶ء لکھنؤ (انجمن کی پہلی کانفرنس) میں منظور ہوا۔

اس کے یہ جملے قابل غور ہیں۔

"ہم ادب کو عوام سے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا مؤثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔"[2]

مصنف نے مارکس کی مادیت کو زندگی کی تعمیر کا اصل روپ سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ زندگی سے منسلک کئی مسائل مادی نقطۂ نظر سے ادبی نہیں ہوسکتے۔ پہلے باب "نقطۂ آغاز" میں مصنف کا خیال ملاحظہ کیجئے۔

"آرٹ اور ادب کا استعمال انسان نے ہمیشہ سے حقیقت کو بدلنے کے لئے کیا ہے۔ کبھی اس ادب کو جادو سمجھ کر استعمال کیا اور کبھی آرٹ سمجھ کر کبھی شعوری طور سے استعمال کیا اور کبھی نیم شعوری طور سے لیکن استعمال ہمیشہ حقیقت بدلنے کے لئے یہ ایک سماجی کردار ہے اور جب کبھی ادب اس کا یہ سماجی

---

[1] ترقی پسند ادب۔ علی سردار جعفری صفحہ ۲۰

[2] ایضاً " صفحہ ۲۲ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۱ء

موضوع کا انتخاب کس طرح کیا جائے مادی نقطۂ نظر کی قیادت میں سماج اور زندگی سے قریب لانے والے موضوع کو برتنے اور عوامی ادب کی تخلیق کے لئے ہیئت کا استعمال آسان زبان میں خوبصورت اسلوب کا نمائندہ ہونا چاہئے۔

مصنف نے ترقی پسند ادب کے نام سے ترقی پسند تحریک کی تاریخ مارکس کے جدلیاتی فلسفے کی حمایت اشتراکیت سے تعلق رکھنے والے موضوعات مثلاً مزدور، کسان، غربت، افلاس مشینی عہد کے تغیر کو افسانہ بنا کر مادی وسائل کا روپ دے دیا ہے۔ کتاب کے آخری صفحے پر ملاحظہ ہو۔

"میں نے ترقی پسند ادب کے نام سے رجحانات کا جائزہ مادی تاریخی اور سماجیاتی (عمرانی) نقطۂ نظر سے لیا ہے۔ یہ نقطۂ نظر میرے لئے عقیدت کے بجائے سائنس کی حیثیت رکھتا ہے"[1]

دنیا کی کسی بھی زبان کا ادب کسی ایک نظریہ کی نمائندگی میں آفاقی ادب نہیں ہو سکتا۔ مصنف نے اپنی کتاب میں عوامی کا مطلب سلیس اسلوب اور آسان زبان کے ذریعہ اظہار کو سمجھایا ہے۔ لیکن آفاقی یا عوامی ادب محدود نظریہ کے تحت کیسا ہی اسلوب اختیار کرے وہ دنیا میں بنی نوع انسان کے لئے مستقل راہ نہیں ہو سکتا۔

ادب حقیقت کو نہیں بدلتا۔ بلکہ حقائق کو زمانے کے مزاج کے مطابق ڈھالتا ہے۔ اس بناء پر ادب پر حقیقت کے بدلنے کا الزام لگانا بے سود ہے۔

اس کتاب کی تشکیل کے دوران ہی ترقی پسند ادب کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ اور مصنف کے سامنے وہ تمام حقائق تھے جس سبب سے ترقی پسند تحریک اور اس کے حامی اپنے اثر کھو چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود علی سردار جعفری نے حقائق سے چشم پوشی کی حکمتِ عملی کے باوجود اس کتاب کے ذریعہ اشتراکی ادب کی تخلیق پر لوگوں کو راغب نہ کر سکے۔

ادب سے سماج اور زندگی کا ہر عہد میں اپنے تقاضوں کے بموجب تعلق رہا ہے۔ یہ نعرہ بھی ترقی پسندوں کا نیا نہیں تھا۔ ترقی پسند ادب اپنے عہد میں کچھ لوگوں کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوا۔ لیکن عوامی ادب نہ بن سکا جس کا دعویٰ علی سردار جعفری کر رہے تھے۔

اس کتاب کا مطالعہ اردو ادب میں تحریکات کی نسبت سے ضروری ہے۔ اس کتاب سے

---

[1] ترقی پسند ادب۔ علی سردار جعفری ص ۲۴۳ سے ۲۴۲

یہ وضاحت بخوبی ہو جاتی ہے کہ ترقی پسند ادب کیا ہے۔ اس کا مقصد اور تخلیقی کارکردگی عیاں ہو جاتی ہے۔

علی سردار جعفری نے جن نظریات کا پرچار اس کتاب میں کیا ہے اس سے کہیں بہتر طریقہ پر "ادب اور زندگی" میں مجنوں گورکھپوری کر چکے تھے۔

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی

خلیل الرحمٰن اعظمی کو علی گڑھ سے اس مقالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔

یہ مقالہ انتساب، تعارف اور مقدمے کے ساتھ تین حصوں میں تقسیم کیا ۴۵۶ صفحات کا ہے تعارف میں رشید احمد صدیقی کے ذیل کے جملے مصنف کی کاوش کی تعریف میں ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس تحریک کے ادبی تقاضوں اور اردو شعر و ادب پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا ہے انھوں نے اس موضوع پر جتنا مواد تاریخی تسلسل کے پیش نظر جس محنت اور دقت نظر سے جمع کیا ہے۔ وہ قابل ستائش ہے۔[1]

یہ کتاب اپنے حصہ اول میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا مکمل تاریخی ارتقاء ہے۔ اس موضوع کے تحت مصنف نے ترقی پسند تحریک کی ابتدا اس تحریک سے وابستہ مختلف ادیبوں اور شعراء کی کانفرنسوں کی مکمل روداد پیش کیا ہے۔ یہ کتاب قرار دادیں تجاویز منشورات کا آئینہ ہے جس میں ترقی پسند مصنفین کی چھ کانفرنسوں کا تاریخی پیکر دکھائی دیتا ہے۔

حصہ دوم میں ترقی پسند ادبی سرمائے کا جائزہ ہے۔ اس باب میں شمیم کرہانی کے گیت سے نہاب ملیح آبادی، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، مطلبی فرید آبادی، علی جواد زیدی، سلام مچھلی شہری، مسعود اختر، اختر انصاری، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، مجاز لکھنوی، جذبی، فراق، فیض، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، مجروح، اختر الایمان، احمد ندیم قاسمی، شاد عارفی، پرویز شاہدی، منیب الرحمٰن، عزیز حامد مدنی، ظہیر کاشمیری، مقبل شفائی وغیرہ شعراء پر تبصرہ ملتا ہے۔

---

[1] اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ ص۔ ایڈیشن ۱۹۷۲ء

مصنف نے اس باب میں ان اقتباسات کی روشنی میں شعرا اور ادبا کے بیانات پر بڑی فکر انگیز تنقید کی ہے۔

پیش لفظ میں مصنف نے اپنے موقف کی پابندی کا تذکرہ کیا ہے۔ اور رشید احمد صدیقی کا شکریہ ادا کیا ہے۔

ترقی پسند تحریک کی مکمل تاریخ کو اور اس کے نظریات کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب اہم ہے۔ اور ترقی پسند ادبی سرمایہ کا منتخب ذخیرہ ہے جس کی مدد سے ہم مختصر طور پر ترقی پسندی ادب کا مکمل جائزہ لے سکتے ہیں۔

ترقی پسند ادب کے نمائندہ شعرا اور ادبا کے نظریاتی شخصی اور تنقیدی اقتباسات کی روشنی میں ان کی فکر کے مزاج اور منہاج کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

یہ کتاب ایک طرف ترقی پسند تحریک کا مکمل مرقع اور دوسری جانب ترقی پسند نظریات کی منزلوں کا انتخاب ہے۔ ترقی پسند مصنفین کے ذاتی اور تنقیدی ادب کا نمونہ ہے۔ یہ کتاب ترقی پسند تحریک کے متعلق ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔

ترقی پسند ادب ایک جائزہ

ہنس راج رہبر

ہنس راج رہبر کی تصنیف ترقی پسند ادب کی تاریخ ایک تنقیدی جائزہ ہے [illegible] صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ

"بیس تیس نوجوانوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی جو انگلینڈ میں رہتے تھے انہوں نے ہماری ادبی اور سیاسی روایت اور تاریخی حالات کا سائنسی تجزیہ نہیں کیا تھا اس لئے ادب کی ترقی پسند تحریک شروع ہی سے گمراہ ہو گئی۔"[1]

انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنم وطن کی آزادی کی جدوجہد اور جدید فلسفے اور ادب پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ادب کے نئے رنگ روپ، فرائڈ واد، تحلیل نفسی، مارکس واد، مادی جدلیات، سماجی اور نظریہ ادب اور سیاست حمایت اور مخالفت مغالطے در مغالطے کی شکل اور تضاد

۱۔ ترقی پسند ادب ایک جائزہ۔ ہنس راج رہبر ص ۱۱

رومان سے انقلاب تک وغیرہ کے عنوانات کی روشنی میں ترقی پسند ادبی تحریک پر ہنس راج
رہبر نے روشنی ڈالی ہے۔ اس عہد میں ہندوستان کے سیاسی حالات اور عوامی
جذبات کے تحت ترقی پسند مصنفین کے قیام کو وقت کی ضرورت قرار دیا ہے سماجی
تغیر افکار کے تبدل کو روایت میں تبدیلی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اور تبدیلی کے اثرات کے
عناصر حالیؔ، محمد حسین آزادؔ، اکبر الٰہ آبادی، ٹیگور اور اقبال کے کلام میں بتلائے ہیں۔
یوروپ میں تخلیق ہونے والے ادب پر ہیگل نشطے فرائڈ، مارکس کے فلسفوں
کے اثرات وہاں کے ادب پر مختلف زاویہ فکر سے رونما ہونے والی تبدیلیوں
کا ذکر کیا ہے۔ ترقی پسند ادب کے فنکاروں کو فرائڈ اور مارکس کے فلسفوں نے کس طرح
متاثر کیا اور انھوں نے ادبی روایت سے کیا بغاوت کی واضح کیا ہے۔

ترقی پسندی کے نام پر عوام دشمن اور سماج دشمن رجحانات کی اس تنظیم اور
تحریک کے ذریعہ نشو ونما ہوتی رہی۔ ادبی روایت کے تاریخی ارتقاء کا ادراک
نہ ہونے کے باعث یہ رجحانات ادیبوں نقادوں اور قارئین کو گمراہ کرتے رہے۔
اور وہ منزل سے دور بھٹکتے رہے۔[1]

اس کتاب میں ترقی پسند ادب کی تمام خامیوں اور اس کے نمائندگی کرنے والے ادیب
و شعراء پر کڑی تنقید کی گئی ہے ان خصوصیات کے پیش نظر تنقید کا موقف اپنایا ہے جس
کے سبب ترقی پسند کی تحریک کی تاریخ اور حقائق سامنے آتے ہیں۔ تحریک کے زوال کے
اسباب اور فنکاروں کی غیر شعوری کارکردگی کا راز ظاہر ہو جاتا ہے۔
فن، معنی، ہیئت اور تیکنیک کے باب میں ترقی پسند ادب کے زوال کے بعد ادب
میں جدیدیت کے مفہوم کا جائزہ لیا ہے۔ مختلف فلسفوں کے زیر اثر اس ادب کے انتخاب
کو پیش کر کے تنقید کی ہے۔ وران تخلیقات کو بے اصولاپن سے تعبیر کیا ہے ضمیمہ میں لکھنؤ
بھیونڈی، دہلی اور مارکس وادی مصنفین کی انجمن کے قیام کے اعلان ناموں کی روداد
پیش کی ہے۔ یہ کتاب ترقی پسند ادبی تحریک کے نشیب و فراز اور خامیوں کو سمجھنے میں
مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اور اردو ادب میں ترقی پسند ادب کی تحریک کی مختصر تنقیدی تاریخ ہے۔

---

[1] ترقی پسند ادب ایک جائزہ ہنس راج رہبر ص ۵۴

جدیدیت کا رجحان

ترقی پسند تحریک سے منسلک شعراء اور ادیب جنھیں چند موضوع سے واقفیت تھی۔ وہ ایک ہی عینک سے انسان کے ہر مسئلے کا حل تلاش کرتے تھے۔ اجتماعی اشتراکیت کی روشنی میں مارکس کے اصول اور تصورات کا دنیا کے سامنے بھانڈا پھوٹ گیا۔ انسانی مسائل کو حل کرنے میں مذہب بیزار مادیت پرست ترقی پسند نظریات اپنے فلسفہ کی روشنی میں دم توڑ چکے تھے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا اسی اثناء میں دنیا کے ہر خطے میں اشتراکیت کی قلعی کھل گئی۔ اکتساب و ادراک سے لبریز ذہن انسانوں نے محدود موضوعات سے اکتاہٹ ظاہر کی۔ کیونکہ آزادی کے بعد غریب ہندوستانیوں سے وابستہ مسائل کا حل قولاً و عملاً ترقی پسند تصورات سے مجروح ہو رہا تھا۔ ان وجوہات کی بنیاد پر سماجی اور وقتی تقاضوں کے احساس سے ترقی پسندوں کے خلقے میں چند انتہا پسند افراد ان نظریات سے منحرف ہوئے۔

خلیل الرحمن اعظمی اور ان کے حامیوں نے ترقی پسند تحریک کی ضروریات کا خاتمہ کر دیا۔ اس ردِ عمل سے سارتر کی وجودیت، انفرادیت، شخصیت کو ابھارنے کا پرچار ہونے لگا۔ ترقی پسند اجتماعیت پر شخصی آزادی انفرادی صلاحیت کو ابھارنے کے لئے فکری آزادی، خارجیت سے وابستہ نظریات پر داخلیت کا غلبہ ہوا۔ سیاسی شاعری یا سیاسی مسائل کی تبلیغ کو ادب سے خارج نہیں کیا۔ لیکن ترقی پسندوں کی طرح تختۂ مشق نہیں بنایا گیا۔

جدید رجحان کے علمبرداروں نے براہ راست انداز تخاطب کو بالراست مخاطبت پر ترجیح دی۔ موجودہ عہد اور سماج سے شاعری اور نثر کا مواد اکٹھا کرنے کو اہمیت دی۔

نئی قدروں سے وابستہ تجربات و مشاہدات سے وابستہ روز مرہ زندگی نئے تشبیہات و استعارات علامات کے ذریعہ بالراست اظہار کو فوقیت دی گئی تاثر برقرار رکھنے کے لئے اسلوب کو سلیس طرز تحریر سے منسلک رکھا۔ لیکن موجودہ عہد کے تقاضوں کے مطابق موضوعات کے انتخاب پر زور دیا گیا سماجی قدروں اور عارضی خارجیت کی بہ نسبت داخلی اور روحانی قدروں کو اطمینان کا ذریعہ بنایا گیا۔ لیکن اس میں شدت کا دخل نہیں ہوا۔ اردو ادب کو جدید غزل نظم اور گیت نے نئی علامات، استعارات، تشبیہات سے مالا مال کیا۔

خود کلامی کے انداز سے روشناس کیا۔ تنقیدی میدان میں تاثراتی تنقید کے بجائے عملی تنقید پر زور دیا
اصنافِ سخن میں جدیدیوں نے غزل پر زیادہ زور دیا (ترقی پسندوں نے غزل کو نظر
انداز کر دیا تھا۔ غزل میں علامات کو زیادہ برتا ہے۔ ڈاکٹر سید عقیل کا کہنا ہے۔

"جدید غزل نے علامتوں کا ایک جال سا بچھا دیا ہے جس میں ہر شاعر اپنے طور پر نئی
علامتیں گڑھتا رہتا ہے۔ بعض اوقات تو خود ایک شاعر کے یہاں اس کی ایک
مرتبہ استعمال کی ہوئی علامت دوسری جگہ دوسرے معنی اور دوسری تعبیر پیش
کرتی ہے چونکہ ان علامتوں کے ساتھ مشترک معنی بھی وابستہ نہیں ہوتے۔ اس
لئے ان کی تاویلات ممکن نہیں۔ جدید غزل کی محبوب علامتیں سایہ، تنہائی،
اندھیرا، روح کا کھوکھلا پن، سورج، پیڑ، پانی، ریت، کیچڑ، پتھر، جنگل وغیرہ
ہیں۔ یہ وہ علامتیں ہیں جو واضح طور پر ملتی ہیں۔ مگر کم از کم انھیں کسی غزل یا نظم
میں دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ جدید غزل یا نظم ہو سکتی ہے"۔[۱]

جدیدیت ادب میں کسی تحریک یا عملی نظریات پر مبنی نہیں ہے۔ اس میں مادیت
کے پرستار بھی ہیں۔ مذہب سے انسیت رکھنے والے بھی اس سے متاثر ہیں سیاسی سماجی عمرانی
مذہبی نفسیاتی وغیرہ ہر مزاج اور ماحول سے وابستہ افراد جدید علامت اور استعارات
کی روشنی میں زندگی سے منسلک مسائل تقاضے امکانات اور خطرات کو موضوع بنا کر ظاہر کر سکتے
ہیں۔

جدیدیت کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید اختر کہتے ہیں۔

"جدیدیت کی مختصر ترین تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ اپنے عہد کی زندگی کا سامنا
کرنا اور اسے تمام خطرات و امکانات کے ساتھ برتنے کا نام ہے۔ ہر عہد میں
جدیدیت ہم عصر زندگی کو سمجھنے اور برتنے کے مسلسل عمل سے عبارت ہوتی ہے"۔[۲]

جدیدیت کے ہم نواؤں نے تشبیہہ، استعارہ اور علامت کو برتنے میں لسانی بنیاد پر
ادب میں لچک پیدا کیا ہے۔[۳]

جدیدیت کوئی تحریک نہیں۔ لیکن رجحان اور جذبہ کی قیادت میں اس نے ادب کو نئے

---

[۱] نئی علامت نگاری، انجمن تہذیب نو الہ آباد، ڈاکٹر سید محمد عقیل ص ۱۲۱
[۲] جدیدیت اور ادب، شعبۂ اردو علی گڑھ، مرتبہ آل احمد سرور، ص ۳۹، ڈاکٹر وحید اختر
[۳] اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت، ڈاکٹر عنوان چشتی، ص ۴۱

موضوعات، نئی تراکیب، علامت کا لسانی استعمال۔ استعارے اور تشبیہ میں نئے انداز کو اپنا کر ترقی پسند موضوعات اور اشتراکی اصطلاحات کے طلسم کو توڑ دیا ہے۔ اور اس رجحان کی کارفرمائی نے کم و بیش موجودہ ترقی پسند اکابرین ادب کو بھی متاثر کیا ہے۔ اپنے لہجے سے برطرف ہونے والے ترقی پسند شعراء اور ادباء پر جدیدیت کا رجحان نے گہرا اثر چھوڑا ہے۔

اردو ادب میں جدیدیت کے رجحان پر لکھی کتابیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس ڈاکٹر شمیم حنفی
۲۔ نئی شعری روایت ـــ ,, ـــ
۳۔ اردو میں جدیدیت کی روایت ڈاکٹر عنوان چشتی

نئے ادبی رجحانات

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

ڈاکٹر سید اعجاز حسین کی کاوش "نئے ادبی رجحانات" ۲۵۲ صفحات پر مشتمل ادب سے وابستہ نئے موضوعات کا اظہار اور جدید اصناف کے تاریخی، سماجی، سیاسی، اور معاشرتی تقاضوں کی نمائندہ ہے ذیل کا بیان اپنے موضوع کی وضاحت ہے۔

"جدید اردو ادب کے رجحانات پیش کرنے سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دور سے پہلے کے رجحانات بھی اختصار کے ساتھ بیان کر دئیے جائیں تاکہ موازنہ میں بھی آسانی ہو اور ہر دور کی اہمیت زیادہ واضح ہو جائے۔"[1]

چند باتوں کے عنوان کے تحت مصنف کا اعتراف انکساری کا نمونہ ہے۔ اور رجحانات کے مفہوم کی تشریح ہے۔

"مجھے اعتراف ہے کہ باوجود کوشش کے بھی تمام رجحانات کا جائزہ میں نہیں لے سکا۔ لیکن اس کا خیال ضرور رہا ہے کہ کوئی اہم رجحان نظرانداز نہ ہونے پائے ممکن ہے کہ مجھے اس میں کامیابی حاصل ہوئی ہو۔ رجحان سے میرا مطلب ایسی تحریک سے ہے جس کی ہر دلعزیزی عام ہو گئی ہو۔ دو چار آدمیوں تک محدود نہ

[1] نئے ادبی رجحانات۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین ص ۵

رہی ہو ادب نے اسے وسعت دے کر کچھ عرصہ کے لئے قبول بھی کر لیا ہو۔" [1]

مصنف نے تمہید اور "نئے رجحانات سے پہلے" عنوانات میں قدیم عہد کے مختلف رجحانات اور اصناف پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی تاریخی اہمیت اور افادیت کا مختصراً ادبی جائزہ لیا ہے ۱۸۵۷ء کے بعد سیاسی خلفشار نے ادب کو متاثر کیا اور سماجی تقاضوں نے ادب کو کن خیالات سے مالا مال کر کے رجحانات کی داغ بیل ڈالی۔ ان رجحانات کے ذریعۂ اظہار میں کون سے اصناف کس ہیئت کے ساتھ نئے آئے۔ سماجی ضروریات، حالات کے تقاضوں یورپین ادب سے وابستہ خیالات پر گہری نظر ڈالی ہے۔ مختلف تحریکات کے ذریعہ فکری تبدیلیوں کا جائزہ لے کر قدیم اصناف میں ہیئت اور خیالات کی تبدیلیوں پر تنقیدی تبصرہ کیا ہے۔

مثبتی عہد اور ذہنی انتشار سے وابستہ تغیر اس کے اثرات، ان کا ردعمل سیاست و ادب پر کن کن صورتوں اور ہیئتوں میں نمودار ہو۔ ان کی تخلیقی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ اصناف جن کا جنم جدید تقاضوں کی بنا پر، ایسے اصناف جو قدیم روش کو چھوڑ کر جدید تقاضوں کی ہمنوائی خیال اور تکنیک انداز میں کرنے پر راغب ہو گئے تمام موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ ادب کی اصلاح آزاد اور حالی سے بیسویں صدی کی موجودہ دہائی تک ہونے والی تبدیلیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ قدیم اصناف میں غزل اور نظم میں ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ سرسید تحریک، ترقی پسند تحریک، رومانوی تحریک کے زیر اثر نظم و نثر کے جملہ اصناف میں رد و بدل ان سے منسلک نئے افکار مثلاً تنقید، فن سیرت، سیرت نگاری، تاریخی رجحان، ناول نگاری، ڈرامہ، مقالہ، مزاحیہ رجحان، صحافتی رجحان، مزاح نگاری، اخبارات، رسائل، پیروڈی، رپورتاژ پر مصنف نے تحقیقی تقاضوں کے تحت بحث کی ہے۔ ادب کی تشہیر کے ذرائع میں اخبارات رسائل کے علاوہ ریڈیو اور سینما کو بھی ادب کے لئے مددگار ذرائع میں شمار کیا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے ہر رجحان کا احاطہ مختصر کہیں تفصیل سے اس کتاب کی خاص خوبی ہے۔ کتاب کی افادیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ زیر نظر تصنیف کا یہ پانچواں ایڈیشن ہے۔ کسی موضوع کو تشنہ نہیں چھوڑا گیا یہاں تک کہ اردو ادب کے معاون اور پرورده ادارے، انجمنیں، اردو اکیڈمیاں، تعلیمی اداروں کی کارکردگی اور معاونت کا تذکرہ کیا ہے

---

[1] نئے ادبی رجحانات۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین ص۔ چند باتیں

نیراں کی ادبی خدمات کا ذکر ہے۔

مذکورہ تصنیف جدید ادب کے مزاج اور ماحول کو سمجھنے اس کے تاریخی حقائق کو سمجھنے کے ساتھ مختلف تحریکات اور نئے اصناف کے تعارف و تفصیل کی نمائندہ ہے اور ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

جدیدیت کی فلسفیانہ اساس

ڈاکٹر شمیم حنفی

ڈاکٹر شمیم حنفی کا تحقیقی مقالہ "جدیدیت کی فلسفیانہ اساس" ...م صفحات کا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ

"یہ کتاب میرے طویل تحقیقی مقالے "بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کے فلسفیانہ اساس" کے ابتدائی چار ابواب پر مشتمل ہے۔ آخری تین ابواب ایک علیحدہ کتاب کی شکل میں "نئی شعری روایت" کے نام سے شائع ہوں گے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مکمل مقالہ پر ڈی لٹ کی ڈگری مجھے دی تھی۔"[1]

مصنف نے پہلا باب جدیدیت کا تاریخی تصور اور ہندوستان میں جدید دور کا آغاز و جدید شاعری کی تحریک کے اسباب اور وجوہات سے فلسفیانہ بحث کی ہے۔ فکری، ارتقائی کے سبب معنی تبدیلیوں کو شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کی روایت کے تناظر میں ایک ذہنی و تخلیقی رویہ کا اشاریہ کہا ہے۔

دوسرا باب "جدیدیت کے فلسفیانہ اساس" اور "بیسویں صدی کے فکری میلانات کا ایک جائزہ ہے۔ یورپ کے سارتر، یونگ، فرائڈ، ہیگل وغیرہ کے فلسفیانہ افکار اور ان کی حقیقت سے بیسویں صدی تک کے عہد میں مختلف میلانات کا وجود مختلف شعبوں میں رد و بدل کے اسباب کا جائزہ لیا ہے۔

تیسرا باب "جدیدیت اور سائنسی عقلیت" بیسویں صدی کے تہذیبی مسائل سائنس اور ٹیکنالوجی سے بحث کرتا ہے موصوف نے سائنسی ایجادات اور ارتقائی حدود سے وابستہ فکری و ذہنی انتشار سے پیدا شدہ مسائل حقیقت سے عقیدت کی ٹوٹ پھوٹ اور فکری

---

[1] جدیدیت کے فلسفیانہ اساس - ڈاکٹر شمیم حنفی - صہ ۱۳

ماحصل کے سبب پر بحث کی ہے۔

چوتھا باب جدیدیت اور اشتراکیت کی حقیقت نگاری، مارکسزم ادبی تصور کی حیثیت سے ترقی پسند تحریک کی فکری بنیادیں" میں مارکس کے جدلیاتی فلسفہ کے اثرات اس کے زیر اثر ادب میں شامل فکری تبدیلیوں پر تنقیدی تبصرہ ہے۔ اس باب میں دونوں عنوانات میں اشتراکی حقیقت نگاری اور ترقی پسند ادب کے نظریہ پر فکر انگیز تنقید کیا ہے اس ادبی نظریہ کے اثرات سے جدیدیت کے رجحان کا سبب مصنف کے تبصرہ کا نچوڑ ہے۔

مصنف نے ہر باب کے ساتھ حواشی اور حوالکی تفصیل سے کتاب میں ایک روایت کو جنم دیا ہے۔ پروف ریڈنگ کی کوتاہی سے کتابت میں غلطیاں در آئی ہیں اسی لئے آخر میں "صحت نامہ" کی ضرورت پیش آئی۔ کتاب کے اکثر مباحث انگریزی کتابوں کے ترجمہ کا نتیجہ ہیں۔

اس کتاب پر وارث علوی کے طویل مضمون شب خون کا اقتباس دیکھئے۔

"کتاب میں بے شمار ایسے مباحث اور غلط بیانیاں ہیں جو ڈاکٹریٹ کے مقالے کو زیب نہیں دیتیں۔ کیونکہ ڈاکٹریٹ کے مقالے عموماً جید عالموں کی رہنمائی میں لکھے جاتے ہیں طالب علم کے ہر باب پر رہنما کڑی نظر ڈالتا ہے بحث کرتا ہے جرح و تنقید و اصلاح کرتا ہے۔ اور جب تک اسے اطمینان نہیں ہوتا اسے بار بار لکھواتا ہے لیکن ہمارے یہاں یہ دستور نہیں گائیڈ کا نام صرف ڈاکٹریٹ کے فارم کی خانہ اور دیباچہ میں شکر گذاری کے کام آتا ہے۔" [۱]

اس کے باوجود ڈاکٹر شمیم حنفی اپنے موضوع کی وضاحت میں کامیاب ہیں اور یہ کتاب ادب میں جدیدیت کے رجحان کو سمجھنے میں مددگار ہے۔

نئی شعری روایت

ڈاکٹر شمیم حنفی

شمیم حنفی کی تصنیف نئی شعری روایت، اردو شاعری میں جدیدیت کے رجحان کی نمائندہ کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ شمیم حنفی کے قول کے مطابق۔

---

[۱] رسالہ شب خون (فروری، مارچ سنہ ۱۹۹۱ء) ص ۴۵

"یہ کتاب اس طویل مقالے کے آخری تین ابواب پر مشتمل ہے جو اب سے چند برس پہلے ترتیب دیا گیا تھا۔ مقالے کی ضخامت کا جبر تھا کہ اسے دو نیم کر دیا جائے پہلا حصہ "جدیدیت کی فلسفیانہ اساس" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس طرح یہ دونوں کتابیں اپنی جگہ مکمل ہونے کے باوجود دراصل ایک ہی زنجیر کے دو حلقے ہیں"[1]

مصنف نے پہلے باب میں نئی شاعری کے مفہوم کو واضح کر دیا ہے۔ یوروپین دانشوروں کے خیالات سے نئی شاعری کے آغاز کو پس منظر کی روشنی میں بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت کو مغربی فلسفیوں کے افکار کا نتیجہ بتایا ہے۔ اردو شعراء میں ن م راشد۔ میراجی کو جدیدیت کے آغاز میں شمار کیا ہے۔ نئی شاعری کے دو تناظر (۱) عصری اور مکانی (ابدی و آفاقی بتلائے ہیں ان کے مضرات سے بحث کی ہے۔[2]

دوسرے باب میں نئی شاعری میں جمالیات کے لوازمات کے زیر تبصرہ فنی و لسانی مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ جدید شاعری میں استعمال ہونے والی نئی تراکیب علامات اور استعارات کے اظہار تخلیقی اور طرز احساس کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

تیسرے باب میں نئی شاعری میں تخلیقی عمل کے پہلوؤں کو اظہار و ابلاغ کے مسائل کو سلجھانے کی سعی کی گئی ہے۔ لگتا ہے یہ کہ جدید شعراء کے منتخب اشعار کے سہارے اپنی بات کو منوانے کی کوشش اس مقالے کا اصل منشا ہے۔

کتاب کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ مصنف نے انگریزی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے لیکن اسلوب میں سلیس طرز تحریر کو روا نہیں رکھا جس سے بعض باتیں جدید شاعری کی طرح مبہم ہیں۔ ڈاکٹر وارث علوی نے شب خون ۱۹۸۱ء مارچ میں اس کتاب پر فکر انگیز تبصرہ کیا ہے۔

"نئی شعری روایت" کہیں ژولیدہ بیانی اور فکری انتشار کا شکار ہو گئی ہے۔ اور اس کے ادبی مباحث اول الذکر کتاب فلسفیانہ مباحث کی طرح الجھے گئے ہیں"[3]

یہ کتاب اپنے موضوع کی وضاحت میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہے اس کا ثبوت

---

[1] نئی شعری روایت۔ شمیم حنفی۔ حرف آغاز

[2] ایضاً

[3] رسالہ شب خون مارچ ۱۹۸۱ء ڈاکٹر وارث علوی (تبصرہ) ص ۴۳

مصنف کا ذیل کا بیان ہے۔

مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ یہ مقالہ ادبی منصب کی ادائیگی نہیں کرتا اس کے مباحث کا دائرہ افکار اور تجربات کی نوعیت کے تجزیے تک محدود ہے۔[1]

اردو کی اہم تحریکیں

یہ حقیقت ثبوت کی محتاج نہیں کہ کسی بھی زبان کا شعروادب اپنے عہد کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لئے مطالعہ کے ضمن میں تخلیقی محرکات اور اس عہد کے سیاسی، سماجی اور تاریخی عوامل کے تجزیے کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہوتی ہے اردو زبان وادب بھی اس کی ایک مثال ہے۔ زبان وادب جامد وساکت شئے نہیں ہے بلکہ نمو پذیر اور جاری وساری ہے۔ وہ مختلف اوقات میں مختلف عوامل کے تحت تغیر پذیر رہا ہے۔ اس تغیر پذیری کا اثر ان مختلف تحریکوں اور رجحانات سے ملے گا جو کہ ہمارے ادب کا ایک حصہ رہی ہیں۔ اور جن سے ایک طرف ادب کے ارتقاء اور رفتار کا اندازہ ہوگا۔ اور دوسری جانب زبان کے اسلوب اور اصناف کے ہر حسن کو خوبصورت اور خوب سیرت بنانے میں بھی ان کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے اردو ادب میں وہابی تحریک کا ذکر کریں گے۔

وہابی تحریک شیخ محمد بن عبدالوہاب کے نام سے موسوم تھی جو کہ عرب کے ایک بزرگ تھے انھوں نے اس تحریک کے ذریعہ اسلام کی اصل روح جو کہ اس زمانہ میں مفقود ہوتی جارہی تھی شریعت سے قریب کرنے کی کوشش کی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے عقائد میں انقلاب پیدا کیا۔ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ نے اس تحریک کو عروج بخشا۔

اس تحریک کے نتیجے میں جہاں مذہب میں قابل ذکر تبدیلیاں آئیں وہیں اردو زبان وادب میں بھی اس کے مثبت اثرات نمایاں ہوئے۔ اس سلسلہ میں خواجہ احمد فاروقی کی تصنیف "اردو میں وہابی تحریک" کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس تحریک کا خوشگوار اثر یہ ہوا کہ زبان میں سلاست وسہل پسندی کا رجحان عام ہوا۔ اور لوگوں نے مشکل پسندی سے نجات پائی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہی اردو زبان کے شاعروں اور ادیبوں میں پہلی بار زندگی اور

---

[1] نئی شعری روایت۔ شمیم حنفی۔ حرف آغاز

ادب کے باہمی رشتہ کو سمجھنے اور اس کی نوعیت پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرنے کی ضرورت پیدا ہوئی۔ ادب کو قوم کی ذہنی بیداری اور اس کی تشکیل و تعمیر کے ایک اہم کردار ادا کرنے کے قابل بنانے کی اس زبردست تحریک کا واضح ترین نقش علی گڑھ تحریک (جسے سرسید کی تحریک بھی کہا جاتا ہے) کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ تحریک بلاشبہ اردو کی سب سے پہلی اور شعوری تحریک تھی جس کی اساس ادب اور زندگی کے باہمی رشتہ کے ادراک پر قائم تھی اس تحریک کو تیز کرنے والوں میں سرسید احمد خان شبلی، حالی، نذیر احمد، محسن الملک، ذکاء اللہ، وقار الملک اور چراغ علی وغیرہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

زبان و ادب میں نئے موضوعات سے روشناس کرنے حقیقت پسندی پر زور دینے کا رجحان پیدا کیا گیا۔ اور زبان کو آسان اور عام فہم انداز میں پیش کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔ اس موضوع پر نسیم قریشی کی تصنیف "علی گڑھ تحریک" کا جائزہ لیا گیا ہے۔

رومانی ادب کی ابتداء ہر چند کہ یورپ میں ہوئی لیکن اردو ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ رومانی ادب میں اندرونی تجربہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ رومانیت دراصل یک ادبی اسلوب ہی نہیں بلکہ اس میں ایک انداز فکر بھی ہے رومانی ادیب کی تخلیق میں اس کے ذاتی تجربات کی تازگی بھی ملتی ہے اس میں رومانی ادب میں جذبۂ احساس کی سب سے بڑی اہمیت ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن کی تصنیف "اردو ادب میں رومانوی تحریک" میں تحریک کے تاریخی سبب عروج و زوال کے ساتھ اردو شعراء و ادباء کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کو بلا شبہ اردو شعر و ادب کی سب سے بلند اور قوی شعوری تحریک قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس نے ہماری ادبی دنیا کو انقلابی تبدیلیوں سے روشناس کرانے کا نہایت آفریں کارنامہ انجام دیا۔ اس صنف میں عزیز احمد کی کتاب "ترقی پسند ادب" شاہ سر تحیقوں کی تصنیف ترقی پسندی کا تفصیل جائزہ لیا گیا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی کتاب "اردو میں ترقی پسند تحریک" اس تحریک کے منفی اور مثبت نتائج سے بحث کرتی ہے۔ اور ہنس راج رہبر کی کتاب "ترقی پسند تحریک کا جائزہ" اس تحریک کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے۔

سب سے آخر میں جدیدیت کے رجحان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جدیدیت کا رجحان جیسے شعوری تحریک کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ادب میں ایک واضح رجحان کی نشاندہی کرتا ہے۔

ڈاکٹر شمیم حنفی کی دو کتابیں "جدیدیت کی فلسفیانہ اساس" اور "نئی شعری روایت" پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس رجحان کی تاریخ قلم بند کرتے ہوئے شعرا اور ادبا کی نئی تراکیب اور نئے لہجہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

تحریکات کے موضوع پر عموماً مختلف کتابیں اپنے نظریات اور رجحانات کی حمایت میں صرف مثبت پہلوؤں سے بحث کرتی ہیں اور ان کے منفی نتائج پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔

بابِ ششم۔ اصنافِ ادب کی تاریخیں۔

(عمومی جائزہ)

۱۔ صنفِ نظم پر عمومی تبصرہ

۱۔ نظم ۲۔ نظم معرّا

۳۔ آزاد نظم ۴۔ نثری نظم

کتب پر تبصرہ

اردو شاعری میں نظم معرا اور آزاد نظم

حنیف کیفی سنہ ۱۹۸۲ء

۲۔ غزل پر تبصرہ۔

غزل کی تاریخ پر لکھی گئیں کتب پر تبصرہ

اردو غزل کی نشو و نما ڈاکٹر رفیق احمد سنہ ۱۹۴۵ء

اردو غزل ڈاکٹر یوسف حسین خان سنہ ۱۹۵۲ء

غزل اور مطالعہ غزل ڈاکٹر عبادت بریلوی سنہ ۱۹۶۰ء

۳۔ مثنوی کی صنف پر عمومی تبصرہ / کتب پر تبصرہ

۱۔ تاریخ مثنویات اردو — حافظ جلال الدین ۱۹۳۵ء
۲۔ اردو مثنوی کا ارتقاء — پروفیسر عبدالقادر سروری ۱۹۳۹ء
۳۔ اردو مثنوی شمالی ہندوستان میں — ڈاکٹر گیان چند جین ۱۹۶۹ء
۴۔ اردو مثنوی کا ارتقاء — ڈاکٹر سید عقیل ۱۹۶۳ء
۵۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
۶۔ مثنوی کا فن اور اردو مثنویاں — نجم الہدیٰ ۱۹۷۴ء

۴۔ ریختی۔ ریختی پر عمومی تبصرہ / کتب پر تبصرہ

۱۔ تذکرہ ریختی — تمکین کاظمی
۲۔ دکن میں ریختی کا ارتقاء — بدیع حسینی
۳۔ ریختی کا تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی ۱۹۷۷ء

۵ شہر آشوب۔ عمومی تبصرہ / تبصرہ کتب

۱۔ شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ — ڈاکٹر نعیم ۱۹۷۹ء
۲۔ شہر آشوب۔ — ڈاکٹر سعد اللہ خاں ۱۹۸۵ء

آغاز، ارتقاء، اور اہمیت

۶۔ رباعی۔ رباعی پر عمومی تبصرہ / تبصرہ کتب

اردو رباعی — ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۱۹۸۵ء
اردو رباعیات — ڈاکٹر سلام سندیلوی ۱۹۶۳ء

۷۔ قصیدہ ۔ قصیدہ نگاری پر عمومی تبصرہ / تبصرۂ کتب

۱۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر محمود الٰہی ۱۹۵۳ء

۲۔ اردو میں قصیدہ نگاری — ڈاکٹر ابو محمد سحر ۱۹۵۸ء

۸۔ مرثیہ ۔ مرثیہ صنف پر عمومی تبصرہ / تبصرۂ کتب

۱۔ اردو مرثیہ کا ارتقاء ابتداء سے انیس تک — ڈاکٹر مسیح الزماں ۱۹۶۸ء

۲۔ اردو مرثیہ کی روایت — ڈاکٹر مسیح الزماں ۱۹۶۸ء

۳۔ اردو مرثیہ — سفارش حسین رضوی ۱۹۶۵ء

۴۔ اردو مرثیہ کے پانچ سو سال — خاص نمبر ماہنامہ نیا راہی ۱۹۷۰ء

۹۔ سلام ۔ صنف پر تبصرہ / تبصرۂ کتب

۱۔ سلام نگاری (غیر مطبوعہ) — سید تقی حیدر رضوی

۱۰۔ گیت صنف پر تبصرہ / تبصرۂ کتب

۱۔ اردو گیت — ڈاکٹر قیصر جہاں ۱۹۷۰ء

۲۔ اتر پردیش کے لوک گیت — ڈاکٹر اطہر علی ۔۔۔ء

۱۱۔ سانیٹ ۔ عمومی تبصرہ / تبصرۂ کتب

۱۔ اردو شاعری میں سانیٹ — ڈاکٹر حنیف کیفی ۱۹۷۵ء

۱۲۔ مختلف اصناف نظم پر سرسری تبصرہ

الف ۔ واسوخت

ب ۔ ساقی نامہ

ج ۔ نوحہ

د ۔ قطعہ

ہ ۔ مسمط

صحافت پر تبصرہ

تبصرۂ کتب

١۔ ہماری زبان میں صحافت کی تاریخیں — امداد صابری اور دیگر — سنہ ١٩٥٣ء
٢۔ تاریخ اردو صحافت (چار جلدیں) — امداد صابری — سنہ ١٩٧١-٧٢ء
٣۔ روح صحافت — سنہ ١٩٦٨ء
٤۔ اخبار نویسی کے ابتدائی اصول — بلجیت سنگھ — سنہ ١٩٦٨ء
٥۔ جنوبی ہند میں اردو صحافت — افضل الدین اقبال — سنہ ١٩٨٠ء

تبصرہ نگاری پر عمومی تبصرہ

کتاب

کتاب شناسی — ڈاکٹر انصاری — سنہ ١٩٨١ء

انشائیہ نگاری پر عمومی تبصرہ

تبصرۂ کتب

١۔ انشائیہ — ڈاکٹر آدم شیخ — سنہ ١٩٦٨ء
٢۔ انشائیے — ڈاکٹر حسین

رپورتاژ نگاری پر عمومی تبصرہ

کتاب۔ اردو میں رپورتاژ نگاری — ڈاکٹر عبدالعزیز — سنہ ١٩٧٧ء

خاکہ نگاری پر تبصرہ

کتاب۔ اردو میں خاکہ نگاری — ڈاکٹر صابرہ سعید — سنہ ١٩٧٦ء

خطوط نگاری پر تبصرہ

تقریظ پر عمومی تبصرہ

اصناف ادب پر تبصرہ

(اصناف ادب کی منتخب تاریخوں پر ایک نظر)

۴۔ اردو ڈرامہ کا تحقیقی مطالعہ — ڈاکٹر عشرت رحمانی سنہ ۱۹۷۷ء

تبصرۂ کتب

۵۔ اردو ڈرامہ کا مطالعہ — ڈاکٹر اخلاق اثر سنہ ۱۹۶۹ء

۶۔ یک بابی ڈرامہ — فصیح احمد صدیقی سنہ ۱۹۶۲ء

۷۔ پہلا ایک بابی ڈرامہ (چار جلدیں) — فصیح احمد صدیقی سنہ ۱۹۶۳ء

۸۔ اردو ڈرامہ، روایت اور تجربہ — عطیہ نشاط سنہ ۱۹۷۳ء

(۶) تنقید کے فن پر عمومی تبصرہ / تبصرۂ کتب

۱۔ کاشف الحقائق (دو جلدیں) — امداد اثر

۲۔ اردو شاعری پر ایک نظر — کلیم الدین احمد سنہ ۱۹۴۰ء

۳۔ اردو تنقید پر ایک نظر — کلیم الدین احمد سنہ ۱۹۴۲ء

۴۔ تنقیدی سرمایہ (دو حصے) — مولوی عبدالشکور سنہ ۱۹۵۲ء

۵۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ — سید احتشام حسین

۶۔ اردو تنقید کا ارتقاء — ڈاکٹر عبادت بریلوی سنہ ۱۹۵۶ء

طنز و مزاح ÷ عمومی تبصرہ / تبصرۂ کتب

۱۔ طنز و ظرافت — غلام احمد فرقت کاکوروی سنہ ۱۹۵۰ء

۲۔ طنزیات و مضحکات — رشید احمد صدیقی سنہ ۱۹۶۲ء

۳۔ اردو ادب میں طنز و مزاح — ڈاکٹر وزیر آغا سنہ ۱۹۶۶ء

۴۔ اردو شاعری میں طنز و مزاح — محمد یونس فہمی سنہ ۱۹۶۹ء

۵۔ طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور سنہ ۱۹۶۳ء

(۸) فن سوانح نگاری عمومی تبصرہ تبصرۂ کتب

۱۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء — ڈاکٹر الطاف فاطمہ سنہ ۱۹۶۵ء

۲۔ سوانح نگاری اور سیرت نگاری — ڈاکٹر سید شاہ علی سنہ ۱۹۶۲ء

۳۔ اردو میں سوانح نگاری کا ارتقاء — ڈاکٹر ممتاز فاخرہ سنہ ۱۹۷۸ء

ل۔ حمد و ثنا

م۔ نعت و دعا

ن۔ مستزاد

۲۔ نثری اصناف۔ داستان پر عمومی تبصرہ / تبصرۂ کتب

۱۔ فنِ داستاں گوئی — کلیم الدین احمد سنہ ۱۹۴۴ء

۲۔ اردو زبان اور فنِ داستاں گوئی — کلیم الدین احمد سنہ ۱۹۶۵ء

۳۔ ہماری داستانیں — سید وقار عظیم آبادی سنہ ۱۹۵۷ء

۴۔ داستان سے افسانہ تک — سید وقار عظیم آبادی سنہ ۱۹۸۰ء

۳۔ ناول پر عمومی تبصرہ / تبصرۂ کتب ۱۸۹۵ء

۱۔ ناول کی تاریخ و تنقید — علی عباس حسینی سنہ ۱۹۵۶ء

۲۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ — احسن فاروقی سنہ ۱۹۶۲ء

۳۔ اردو ناول نگاری — سہیل بخاری سنہ ۱۹۶۲ء

۴۔ تاریخی ناول فن اور اصول — ڈاکٹر علی احمد فاطمی سنہ ۱۹۸۱ء

۴۔ افسانہ۔ عمومی تبصرہ کتب پر تبصرہ ۱۹۱۷ء تا

۱۔ دنیا کے افسانہ — پروفیسر عبد القادر سروری سنہ ۱۹۳۵ء

۲۔ افسانہ — مجنوں گورکھپوری سنہ ۱۹۳۵ء

۳۔ اصول فسانہ نگاری — سید اویس احمد ادیب سنہ ۱۹۵۵ء

۴۔ فنِ افسانہ نگاری — سید وقار عظیم الدین سنہ ۱۹۶۶ء

۵۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سنہ ۱۹۸۱ء

(۵) ڈرامہ۔ عمومی تبصرہ / تبصرۂ کتب

۱۔ ناٹک ساگر — نورالٰہی محمد عمر سنہ ۱۹۲۵ء

۲۔ اردو ڈرامہ نگاری — بادشاہ حسین سنہ ۱۹۵۵ء

۳۔ اردو ڈرامہ کی تاریخ و تنقید — ڈاکٹر عشرت رحمانی سنہ ۱۹۶۵ء

نظم

ادب میں نظم کا مطلب شاعری یا کلام موزوں ہے جس میں غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، قصیدہ، مسمط، تمام اصناف کا شمار ہوتا ہے لیکن اصناف سخن کے زیر عنوان نظم وہ صنف ہے جس میں شاعرانہ تخلیق مسلسل اور مربوط ہو۔ جس کے اندر خیال اور مقصد کا جز ہو۔ یہ صنف بعد میں وجود میں آئی ہے۔ لیکن اس کے آثار پرانی اردو میں دکنی ادب کی مثنویوں میں ملتے ہیں۔ قلی قطب، فائز اور حاتم کے یہاں مثالیں ملتی ہیں ویسے نظم کی ابتدا نظیر اکبرآبادی سے ہوتی ہے۔

نظم کے ہر شعر میں ردیف و قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔ قطعہ بندی نظم میں ہر بند کے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں ردیف قافیہ برتا جاتا ہے۔ نظم کی تکنیک ہر صنف سے مربوط کی جا سکتی ہے۔

اردو میں نظم سب سے پہلے کرنل ہالرائڈ کی صدارت میں منعقد مشاعرہ میں پڑھی گئی کرنل کی صدارت میں محمد حسین آزاد نے ۸ مئی ۱۸۷۴ء کو اپنی نظم شام کی آمد اور رات کی کیفیت سنائی۔ موضوع کے مطابق کئی مشاعرے ہوئے اور آزاد، حالی نے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ اس کے بعد منظوم ترجمے بھی کیے گئے۔

مولوی اسماعیل میرٹھی، نادر، وسیم، اسلم، سیمی، اکبر الہ آبادی، نظم طباطبائی، موہن دتاتریہ کیفی، عبدالحلیم شرر کے منظوم ترجمے مشہور ہوئے۔

مسمط کے مختلف بندوں میں ایک خیال کو مختلف انداز میں ادا کرنے کا فن جوش ملیح آبادی کے یہاں ملتا ہے۔ وضاحتی، سادہ، براہ راست اسلوب میں چکبست، سرور، شوق، سیماب اور محروم کی نظمیں قابل ذکر ہیں۔ اختر شیرانی کے یہاں جمالیاتی اور بیانیہ انداز موجود ہے۔ ترقی پسند شعرا میں

سردار جعفری، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، وامق جونپوری کی بامقصد بیانیہ نظمیں ملتی ہیں۔

اقبال کی نظموں میں خطابیہ اور حفیظ جالندھری کے یہاں بیانیہ انداز موجود ہے نظم میں علامتی اور ڈرامائی اظہار اختر الایمان اور فیض کے یہاں ملتا ہے۔ بیانیہ انداز ان کے یہاں بھی موجود ہے لیکن اسی انداز سے چونکا دینے کا ہنر ان شاعروں میں موجود ہے۔ گویا فیض اور اختر الایمان سے نظم کی ہیئت میں تبدیلی نہیں آئی۔ لیکن مقصدیت کی رو سے نظم نکھر گئی ہے۔

علامت اور استعارے کے سہارے ان شعراء نے اچھی تخلیقات پیش کی ہیں ورنہ ترقی پسند مجاز سے ساحر تک چند موضوعات کے سہارے بیان اور خطاب سے اظہار کرتے آئے ہیں۔ جوش کی خطابت میں جوش اور جذبہ ہے اور اسی لئے وہ انقلابی شاعر بھی کہلائے۔ فراق کے یہاں بیانیہ انداز لیکن فطری جمالیات کا امتزاج ان کی نظموں میں ایک تاثر اور لذتیت پیدا کردیتا ہے۔

__معریٰ نظم__ :- قافیہ ردیف کی پابندی کے بغیر وزن کے پیمانے میں کلام موزوں نظم معریٰ کی صنف بن جاتی ہے۔ مولانا حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں اردو شاعری کے عنوان پر نظم کی اصلاح میں حالی کے خیال کے مطابق یورپ میں "مقفیٰ" نظم کی بہ نسبت غیر مقفیٰ نظم کا زیادہ رواج ہے۔ قافیہ ردیف سے شعر کا حسن بڑھتا ہے یہ بات بجا ہے۔ لیکن قافیہ اور ردیف کی پابندی اظہار خیال میں خلل پیدا کرتے ہیں۔ جذبات، احساسات، مشاہدات اور تجربات کے اظہار میں یہ پابندی فطری جذبہ میں مبالغہ آرائی یا اصلیت کی عکاسی سے قاصر ہوتی ہے۔ اصلاح کے اس نعرے پر محمد اسماعیل میرٹھی، نظم طباطبائی، عبدالحلیم شرر، عظمت اللہ خاں نے اس ضمن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن ان کی بغاوت کے اثرات موثر نہ ہوئے۔

__آزاد نظم__ :- جس میں ہر مصرع کا اپنا ایک وزن ہو اور بحر مختلف ہو۔ اس طرح ایک مصرع بڑا دوسرا چھوٹا یا پہلا مصرع چھوٹا دوسرا بڑا ہو۔ پوری نظم میں مصرعے مختلف بحر میں ہوں لیکن وزن کے پابند ہوں۔ اس نظم کا اشارہ بھی حالی نے اپنی اصلاح میں کیا تھا۔ لیکن اس نظم کو ارتقائی روپ میں ترقی پسند شعراء نے سب سے پہلے رائج کیا۔ چنانچہ سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی نے اس صنف کو عام کیا ہے۔ اس ہیئت میں م۔ن۔ راشد، میراجی، تصدق حسین خالد، فراق، مخدوم، اختر الایمان، سلام مچھلی شہری، مسلم جواد زیدی، سردار جعفری، نیاز حیدر اور مختار صدیقی وغیرہ نے کامیاب

نظمیں لکھیں۔

آزاد نظم کی کچھ معنوی خصوصیات ہیں گو اس میں فن شاعری کی پابندی سے بغاوت کی گئی ہے۔ تشبیہ، استعارے، اور علامت کے سہارے مقصد کا اظہار براہ راست ہوتا ہے۔ رمز و کنایہ کے سہارے مفز کا اظہار اس ہیئت کا ایک حسن ہے۔ آزاد نظم میں آہنگ ہوتا ہے لیکن آہنگ ہر مصرع کی اپنی بحر اور آہنگ ہے۔

مختصر نظم :- تین چار مصرعوں میں معنوی اور مقصد کا اظہار مختصر نظم ہے۔ معریٰ اور مقفیٰ دونوں انداز میں لکھی جاتی ہے۔ نیز آزاد ور نثری پیکر میں بھی کم سے کم مصرعوں میں اظہار بیان مختصر نظم کا موجد ہوتا ہے۔

نثری نظم :- شاعرانہ نظم میں ایجاز، اختصار اور وحدت کے امتزاج کو نثری شاعری کہتے ہیں۔ اس میں آزاد نظم کی طرح مصرعوں کی مختلف بحر ہوتی ہے لیکن اس میں آواز کی اشاریت، پیکریت کا حسن اظہار کی شدت اور آہنگ کا تنوع آزاد نظم کی طرح نہیں ہوتا۔ حالانکہ اس میں غنائی شاعری کی تمام خصوصیات ہوتی ہیں۔ اس میں داخلی قوافی اور کہیں کہیں عروضی وزن بھی جھلکتا ہے یہ اعلیٰ درجہ کی غنائی نظم کے برابر ہوتی ہے۔ اردو ادب میں نثری نظموں میں آواز کی اشاریت، لہجہ کا زور اور اسلوب کے اظہار سے آہنگ پیدا کیا ہے لیکن آواز کی اشاریت لہجے کی کاٹ والی نظموں میں کوئی قدر نہیں ہے۔ علی مظفر احمد لاری، حسن شہیر، محمد حسن اور سجاد ظہیر کی کئی نظمیں محض معمولی درجے کی کہی جا سکتی ہیں۔ بلراج کومل، خورشید الاسلام، اعجاز احمد، حسن شہیر، سجاد ظہیر اور ڈاکٹر محمد حسن کے یہاں بیشتر نظمیں ہیں جن میں شدید اور نمایاں آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ ان نثری نظموں میں لطیف آہنگ احساس ہوتا ہے۔ جوش کے یہاں جلوہ کی نثری ترتیب کے بیش نظر نظموں کا مطالعہ آج کی نثری نظموں میں آہنگ کی کمی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

عروضی آہنگ اور خالص نثری ترتیب میں سجاد ظہیر کی نظم دیار قابل مطالعہ ہے جس طرح آزاد نظم میں تجنیس ہوتی ہے ہم مخرج الفاظ کا ترنم کا ہے گاہے قافیہ کا امتزاج بھی ہوتا ہے اور آہنگ مسلسل نہیں رہتا بلکہ برقرار رہتا ہے۔ قوافی کا استعمال مستقل نظام کے تحت نہیں آتے۔ بلکہ آواز کے زیر و بم کے ساتھ درمیان یا شروع میں کہیں بھی آسکتے ہیں۔ اسی طرح ہم آہنگ نثر میں عروضی

اور باقاعدہ شاعری کی دو خصوصیات ہوتی ہیں بحر اور قافیہ کا التزام ہونے کے باوجود بعض خصوصیات نثر کی ہوتی ہے۔ قافیہ کسی شعری نظام کے تابع نہیں رہتا۔ اس اصول کی روشنی میں اردو کی نثری نظموں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی نثری نظموں پر تجنیس صوتی، الفاظ کا ترنم اور قافیہ کا امتزاج ہے۔ لیکن بحر کی بے ربط آہنگ زیادہ حاوی ہے اور اس بنیاد پر کسی نثر کو شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ نثری نظم کی بنیاد بول چال کے آہنگ پر نہیں ہے۔ بلکہ اس آہنگ کو کسی نہ کسی وزن بحر سے قریب ہونا چاہیے۔ مگر آہنگ آزاد نظم کے آہنگ سے کم درجہ کا ہے جس پر نثریت کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال مسعود حسین خاں کے ترجمے میں موجود ہے۔ خارجی طور پر آہنگ کی مثال خورشید الاسلام، اعجاز احمد، سجاد ظہیر، بلراج کومل کے یہاں ہیں۔

نثری نظم کے آہنگ اور ہیئت پر کوئی فیصلہ کن بات نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ یہ صنف اردو میں آج بھی اپنے مراحل سے گزر رہی ہے۔ مستقبل میں اس صنف سے معنوی اظہار کا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک معمہ ہے۔ یہ ہیئت آنے والے زمانہ میں اردو شاعری میں کوئی مقام پا سکے گی یا نہیں اس کا فیصلہ آنے والی نسلیں کریں گی۔

اردو میں نظم جدید نظم، نظم معریٰ، مختصر نظم، اور نثری نظم پر مزید لکھنے کی گنجائش ہے۔

۱۔ اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت ڈاکٹر عنوان چشتی

۲۔ شعر چیزے دیگر است عتیق حنفی

اردو میں نظم معرّا اور آزاد نظم

ڈاکٹر حنیف کیفی

حنیف کیفی کی تصنیف "اردو میں نظم معرّا اور آزاد نظم" ۵۰۲ صفحات پر محیط ہے اردو ادب میں نظم معرا اور آزاد نظم کی ابتدا سے

اس میں ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک جدید نظم میں ہونے والے تجربے اور ان کا پس منظر نظم کے باب میں تبدیلیوں کی نوعیت، کامیاب تجربوں کی ضروریات اور خصوصیات کے تاریخی حقائق سے بحث کی گئی ہے۔

اردو شاعری میں ہیئت کے تجربوں کا باقاعدہ آغاز، بحر کے استعمال کی ساخت، ترائیلے کی ابتدا

کے اسباب، اردو نظم معرّا اور آزاد نظم کا رواج کب اور کیسے ہوا ان جملہ موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ انگریزی بلینک ورس کی تعریف اور مفہوم کی وضاحت ارتقائی تاریخ کے حقائق کی روشنی میں اردو نظم معرّا کا فرق بتایا ہے مختلف عہد میں اس کی ہیئت سے اردو نظم معرّا کا ماخذ بتا کر انگریزی اور اردو نظم معرّا کے فرق کو واضح کیا ہے۔

اردو میں نظم معرّا کا وجود اور اس کی تحریک پر مباحث تاریخ ساز محاکمے سے ابتدائی دور کی نظم معرّا کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس کے عبوری عہد میں پر موضوع پر تحقیقی مواد پیش کیا ہے۔ تنقیدی پہلوؤں سے نظم معرّا کو سمجھنے کا معیار مقرر کیا ہے۔ آزاد نظم کی ابتدا ۱۹۳۶ء سے لکھا ہے اردو آزاد نظم کا پس منظر اور اس کی ابتدا پر سیر حاصل بحث کے ساتھ آزاد نظم کے شعرا میں چند شعرا تصدق حسین خالد، ن م راشد، میراجی اور دیگر شعرا کی آزاد نظم نگاری پر تبصرہ کیا ہے۔ نظم معرّا ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کے باب میں اس کی ترویج و ترقی میں آزاد نظم کو حصہ دار بتایا ہے

حنیف کیفی کے مطابق

> اردو آزاد نظم نے اپنی ترقی کی منزلیں آناً فاناً طے کیں۔ اس کے برعکس نظم معرّا کا ارتقا سست رفتاری کے ساتھ اور رک رک کر ہوا جبکہ اسے آگے بڑھانے کی باقاعدہ کوششیں بھی کی گئیں۔[۱]

یہ کتاب نظم معرّا اور آزاد نظم کی ابتدا سے ارتقا تک مکمل تاریخ ہے۔ اردو ادب میں نظم کے دونوں اصناف میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

غزل

اردو ادب میں شاعری کی سب سے زیادہ پسندیدہ صنف غزل ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہتے ہیں[۲] غزل نے اردو شاعری کو دنیا کے شعر و ادب میں بلند مقام عطا کیا ہے۔

غزل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کی باتیں کرنا ہے۔

ادبی اصطلاح میں غزل وہ صنف شاعری ہے جس میں عشق و محبت کا ذکر ہو۔ لیکن ایک مدت سے

۱۔ اردو میں نظم معرّا اور آزاد نظم۔ حنیف کیفی ص۵

۲۔ مانیات تو خالی۔ رشید احمد صدیقی۔ اردو شاعری پر ایک نظر۔ ص۱۶

عشق و محبت کے علاوہ اخلاقی سیاسی تصوف انسانی تجربات کے مضامین نظم کئے جا رہے ہیں۔ کیونکہ اس کا ہر شعر ایک الگ مفہوم کا نمائندہ ہوتا ہے۔ ایک واقعہ اور تجربہ کا اظہار ہوتا ہے۔ مثنوی، قصیدہ، نظم میں واقعات شعری تسلسل سے منسلک ہوتے ہیں۔ غزل میں ایک شعر تاریخ کے طویل زمانے کو سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لئے غزل کے اشعار دوسری صنفوں کی بہ نسبت ہر خاص و عام کی زبان زد عام ہو جاتے ہیں اس طرح غزل کا ہر شعر ایک مستقل وجود کا علمبردار ہوتا ہے وہ اپنے مفہوم کے اظہار میں دوسرے شعر کا محتاج نہیں ہوتا۔

اردو میں غزل اکثر بحروں میں کہی جاتی ہے۔ تقریباً ۱۲ بحروں میں غزل ہر دور میں رواں رہی ہے۔ رمز و کنایہ، استعارہ اور علامت کے سہارے اس صنف میں اشعار کے ذریعہ طنز اور اشارے کئے جا سکتے ہیں۔ ادب میں اس صنف کی مخالفت بھی ہر دور میں ہوتی رہی ہیں۔ غزل کی ابتدائی تاریخ دکن سے شروع ہوتی ہے جس میں قلی قطب شاہ اور ولی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مختلف ادوار میں غزل مختلف مراحل سے گزری ہے۔ اسے ولی نے تصوف کا لباس پہنا کر دہلی روانہ کیا دہلی والوں نے ایہام گوئی، رعایت لفظی، معاملہ بندی سے نوازا فائز سے حاتم تک یہ معاملہ بندی لہ ایہام گوئی کا شکار ہوئی۔

میر اور سودا نے جمالیات و قنوطیت کے جذبوں سے مالا مال کیا۔ غالب نے گہرائی و گیرائی کے ساتھ حسب استعداد کسی نے جمالیات کا روپ عطا کیا۔ کسی نے تجربات و مشاہدات کی مضمون آفرینی سے سیراب کیا۔ کسی نے اسلوب کے پیرائے سے لب و لہجہ میں شیرینی بخشی۔

ناسخ وغیرہ نے اپنے اصلاحی عمل سے اسلوب اور حسن و عشق کے مضامین کا بندرانہ پیش کیا۔ داغ امیر مینائی نے لب و لہجہ میں بانکپن پیدا کیا۔ ترقی پسند دور میں اعتراضات کے بادل چھا گئے۔ ترقی پسندوں نے اس صنف کو رد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مجبوراً غزلیں کہتے رہے اس سے پہلے جمالیات کا جامہ جوش، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، احسان بن دانش دے چکے تھے۔ ترقی پسندوں نے اسے سیاست اور سماج سے قریب کیا۔

غزل عصر حاضر میں جدید رجحانات سے متعارف ہوئی۔ انھوں نے غزل کو خارجیت سے داخلیت کی طرف رواں کرنے کا عزم کیا۔ لیکن یہ داخلیت تصوف کے مدارج کی نہیں بلکہ انسانی تجربات و مشاہدات میں وقتی تقاضوں سے ابھرنے والے خیالات کو سمونے کا عزم کیا ہے نئی اصطلاحیں، تراکیب، استعارہ،

لہ لکھنؤ کا دبستان شاعری۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔ صـ ۳۳

ودا استعارہ شعری پیکر کا وجود بخشا ہے ۔ اور علامت کی کیفیت سے روشناس کیا ہے ۔ [1]

ان تمام حالات کی روشنی میں غزل کا دامن وسیع تر ہوتا رہا اور غزل آج اردو ادب کی سب سے اہم صنف بن گئی ہے ۔ حالی کی اصلاح کا نعرہ ٹھیک تھا کیونکہ وہاں سے غزل پر مختلف انداز سے سوچنے کا راستہ ملا ہے [2] یہاں سے غزل میں ہر قسم کے مضامین بیان کرنے کا شعوری عمل شروع ہوتا ہے ۔

ان واقعات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہے کہ غزل اردو ادب کی مستقل اور اہم صنف ہے ۔

ہمارے ادب میں اس صنف پر متعدد تاریخیں تنقیدی حیثیت سے لکھی جا چکی ہیں ۔ ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے ۔ لیکن اس صنف کی مکمل اور جامع تاریخ جس میں عروج اور ادوار کی تقسیم کا سلسلہ دور جدید پر ختم ہوا ۔ نیز مختلف ادوار کی غزلوں کا اسلوب و آہنگ کا فرق واضح کیا جائے ۔ اشعار کے موازنے سے غزل کے ارتقائی مدارج کا جائزہ لیا جائے ۔ غزل کی صنف پر ایسی اصنافی تاریخ کی کمی محسوس ہوتی ہے ۔

درج ذیل کتابیں غزل پر لکھی گئی ہیں

۱ ۔ اردو غزل کی نشو و نما — رفیق حسین
۲ ۔ اردو غزل — ڈاکٹر یوسف حسین خاں
۳ ۔ غزل اور مطالعۂ غزل — ڈاکٹر عبادت بریلوی
۴ ۔ اردو غزل کے ۵۰ سال — ڈاکٹر عبدالاحد خاں
۵ ۔ غزل اور درس غزل — اختر انصاری

اردو غزل کی نشو و نما

ڈاکٹر رفیق حسین ،

ڈاکٹر رفیق حسین کا مقالہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے پیش کیا گیا جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا ۔ یہ کتاب ۱۴ ابواب کے ۳۴۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ پیش لفظ ڈاکٹر امرناتھ جھا چیرمین پبلک سروس کمیشن سابق وائس چانسلر الٰہ آباد یونیورسٹی کا ہے ۔ انھوں نے لکھا ہے ۔

مجھے بڑی مسرت ہے کہ موصوف کو میری وائس چانسلری کے زمانہ میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری پانے کا شرف حاصل ہوا ۔ کتاب سے مصنف کا وسیع مطالعہ فکر و نظر کی بلندی

---

[1] جدید شعری روایت ۔ ڈاکٹر شمیم حنفی ص۲۰
[2] مقدمہ شعر و شاعری ۔ الطاف حسین حالی ص۱۲۰

اصابت رائے اور آزادیٔ خیال صاف نمایاں ہیں :-

"مجھے انتہائی مسرت ہے کہ یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ اور اس کا مجھے یقین ہے کہ اردو تنقید میں اس تصنیف کے تعارف سے ایک بڑا قابل قدر اضافہ ہوگا۔ اور اسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔"[1]

ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب صدر شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی کے تعارف سے چند جملے ملاحظہ کیجیے۔

"غزل کا پس منظر اور اس کی تاریخی و سماجی ارتقاء پر جو روشنی اس کتاب میں ڈالی گئی ہے وہ ریسرچ کرنے والوں یا غزل پر مضمون لکھنے والوں کو بہت سی تیرہ و تاریک وادیوں میں بھٹکنے سے بچا سکتی ہے۔"[2]

مختصر تبصرہ ڈاکٹر سعید حسن صاحب نے کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

"یہ کتاب شگفتگی سلاست اور طرز بیان کے لحاظ سے نہایت دلچسپ ہے مجھے قوی امید ہے کہ یہ کتاب مقبول عام ہوگی اور ڈاکٹر صاحب کی محنت ناظرین سے خراج تحسین حاصل کرے گی۔"[3]

عرض مصنف میں مصنف کا بیان ہے۔

"تاریخ ادبیات کی کتابوں میں بھی بڑے سطحی تبصرے ملتے تھے غزل کی خصوصیات پر بھی بس یوں ہی سی چند سطریں لکھ دی گئی تھیں۔ کلیات اساتذہ کا مطالعہ بھی سطحی تھا۔ ہر شاعر کے کلام پر چند سطروں میں نقطوں کے الٹ پھیر سے رائے لکھ دی جاتی تھی۔ اشعار کی صحیح تعداد بھی تحریر نہیں تھی۔ شعراء کے حالات بھی ناکافی تھے ان کی ولادت و وفات کی تاریخوں میں بھی بڑا اختلاف تھا۔ ان تمام باتوں سے متاثر ہوتا تھا لیکن موقع نہ ملتا تھا کہ کچھ لکھوں۔ حسن اتفاق سے الٰہ آباد یونیورسٹی نے مجھے ۱۹۷۵ء میں ریسرچ اسکالر مقرر کیا تو مجھے اپنی دلی خواہش پوری ہوتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے اپنی ریسرچ کا موضوع اردو میں رنگ تغزل پسند کیا۔"[4]

پہلا باب۔ شاعری میں شاعری کی منطقی تعریف جذباتی منظر کشی لکھا ہے سرود زندگی اصغر گونڈوی

---

[1] اردو غزل کی نشو و نما - ڈاکٹر رفیق حسین پیش لفظ ص ۵ اور ص ۶

[2] ایضاً ص ۸ اور ص ۹ .... تعارف ص ح

[3] ایضاً

[4] ایضاً (عرض مصنف ص ۱۱ ص ۱۲)

کے اشعار کو ذہن کے سامنے لا کر ایک کیف روحانی فضا پیدا کرنے کا ذریعہ بتایا ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب کی ہماری شاعری میں جو موضوع اختیار کیا وہ نہایت موزوں اور باثر کلام لکھا ہے۔ عزیز لکھنوی نے مشاطۂ سخن کے مقدمہ میں شعر کے ذریعہ جذبۂ طوفان اور ولولہ انگیز لکھا ہے۔ مغربی اور مشرقی مفکرین کی شاعری کی تعریف بیان کی ہے نثر یا نظم میں فرق بتلایا ہے۔ شاعری کو محسوس کرنے اور خطابت کو سینے سے منسوب کیا ہے۔

مباحثہ وزن میں اوزان کے متعلق حالی سے پیشتر یورپین نقد نگاروں کو اوزان سامنی سف بتلایا ہے نظم اور نثر میں صرف وزن کا فرق بتایا ہے وزن کو شعر کے لئے بے کار اور ناخوشگوار جھاگ کہا ہے۔ وزن کو موسیقیت خوبصورتی اور متاثر کرنے کا ذریعہ بتلایا ہے۔ مباحثہ قافیہ کی مخالفت کرنے والوں میں جوش اور حالی کے تاثرات بیان کئے ہیں۔ یورپ کے نقادوں کے نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے قافیہ کی حمایت کی ہے۔

دوسرا باب — غزل میں اردو شاعری کے مختلف اصناف کا ذکر کرتے ہوئے صنف غزل کو فوقیت دی ہے۔ غزل اقسام مسلسل اور غیر مسلسل غزلوں کے ذریعہ فرق واضح کیا ہے۔ غزل میں یک لفظ کے مختلف انداز سے اظہار کا ذکر کیا ہے۔

غزل کی ساخت اور اس کی اجزائے ترکیبی میں پہلا شعر ہم قافیہ ہم وزن کو مطلع مطلع اولیٰ اور ثانی۔ آخری شعر جس میں شاعر کا تخلص آئے اسے مقطع لکھا ہے۔

تیسرا باب — غزل کی تخلیق اور دوسری زبانوں کی عشقیہ شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ مضامین کے اعتبار سے غزل کے مختلف رنگ اور موضوعات کا ذکر کیا ہے۔

چوتھے باب میں غزل کی خصوصیات بیان کی ہیں۔

۱۔ پہلی خصوصیت آسان صنف قاری کے لئے اور شاعر کے لئے مشکل صنف بتلایا ہے۔

۲۔ دوسری خصوصیت نظم میں سب سے چھوٹی نظم ہے دو مصرعوں میں مضمون کا احاطہ بتلایا ہے۔

۳۔ اختصار اور مصوری

۴۔ جذبات نگاری

۵۔ اخلاقی تعلیم اور پند و نصائح

۶۔ مناظر فطرت (۷) اصلیت (۸) یونیورسل اپیل عام پسندی تمام خصوصیات کے اظہار میں اشعار بطور نمونہ پیش کیا ہے۔

پانچواں باب۔ غزل کا آرٹ یا فن میں فنون لطیفہ کے اصولوں پر غزل کی پرکھ بتائی ہے۔ آمد اور آورد کی تقسیم پر مضامین میں برجستگی، شگفتگی، اصلیت کا ذکر کیا ہے۔ غزل کس طرح کہی جاتی ہے۔ قافیہ کی تلاش، مصرعوں کی موزونی، الفاظ کا تغیر، خیال بدلنے کی ضرورت، غزل کے معائب و محاسن میں فارسی زبان سے مستعار بتلایا ہے۔

چھٹا باب۔۔ سب سے پہلا غزل گو میں محمد حسین آزاد کے حوالے سے ولی کا ذکر کیا لیکن جدید تحقیق کی بنیاد پر محمد قلی شاہ قطب کا حوالہ دے کر وجدی کو اردو کا پہلا غزل گو شاعر نصیر الدین ہاشمی دکن اردو سے منسوب کیا ہے۔ محمود شیرانی کے حوالے سے شیخ فرید شکر گنج کا ذکر کرتے ہوئے امیر خسرو کو پہلے غزل گو کی حیثیت دی ہے۔ اور ادبی سرمایہ زبان کے اعتبار سے قلی قطب شاہ کو غزل کا پہلا شاعر لکھا ہے۔

ساتواں باب:۔ اردو غزل کی نشوونما میں پہلا دور قلی قطب شاہ سے ولی اورنگ آبادی تک اس میں قلی قطب شاہ، وجہی، ظل اللہ عبداللہ قطب شاہ، ابوالحسن تانا شاہ، شاہی، نصرتی، بحری، شمس الدین ولی، اور سراج کا ذکر کیا ہے اور ابتدائی دور کی عام خصوصیات میں کلام کی بنیاد جذبات عاشقانہ سیدھی سادی پیار محبت کی باتیں، مسلسل غزلوں کا رواج، ہندی شاعری کے اثرات عورتوں کی زبان سے اظہار عشق، ہندی تمثیلات، دقیق فارسی اور عربی الفاظ سے پاک ہے۔ افعال ضمائر و حروف میں فرق ہے نے کا استعمال زیادہ ہے۔ املا کے اختلاف میں جوں کو جیوں، توں کو تیوں، کوں کو کوں، اوزان و بحور میں بعض حروف گرا دیتے تھے۔ متحرک کو ساکن کو متحرک کر دیتے تھے۔ ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی ترکیب توصیفی فارسی اور غیر ملکی الفاظ کے بجائے ہندی کو ترجیح دیتے تھے۔ معشوق کو سجن، موہن، پیتم، سندر، پی، پیو، سر یجن وغیرہ لکھتے تھے۔ ابتدائی دور میں مذکورہ خصوصیات گنائی ہیں۔

اٹھواں باب:۔ دوسرا دور شاہ آبرو حاتم کا زمانہ ہے۔ مبارک، آبرو، مرزا مضمون، ناجی، آرزو، فغاں اور حاتم کا ذکر کیا ہے۔ اس دور کی خصوصیات الفاظ و عبارت آرائی، کسی شاعر کو وں

کے دور سے اچھا نہیں لکھا ہے فارسی الفاظ کی کثرت اور ہندی الفاظ کے اخراج سے غزل شیرینی اور ترنم سے محروم ہو گئی۔ عاشقانہ خیالات کا اظہار مردوں کی زبان، نیا طرز ادا، ایہام گوئی کا رواج عام ہوا۔ زبان کی صفائی کی طرف رجحان طبع ضرور ہوا۔ شاعروں کا کلام و طرز بیان ایک سطح پر نہیں رہا۔ قواعد عروض، قوافی کی سختی سے پابندی کی گئی۔ عشق و محبت کی آزادانہ اور طرحدار روش باقی نہیں رہی۔ قنوطیت کی جھلک نمایاں ہونے لگی تھی۔

نواں باب۔ غزل کا تیسرا دور ہے۔ اس دور کے تمام شعراء کی خصوصیات بیان کی ہیں۔

دسویں باب میں لکھنؤ اور میں دہلی شعراء کے اجتماع کا ذکر بتلایا ہے۔ اور اگلے باب میں لکھنؤ اسکول کی ابتداء پر روشنی ڈالی ہے۔

گیارہواں باب۔ اردو غزل کا پانچواں دور لکھنؤ اسکول کی ابتداء ناسخ و آتش کا زمانہ ہے اس دور کی غزل گوئی لکھنؤ کے ہاتھوں ہوئی۔ اس دور کی نام نہاد خصوصیات معنی آفرینی، نازک خیالی استادی و شاگردی کی پابندیوں نے اصلاحوں، محاورات اور الفاظ کی قید و بند نے خیالات کی روک تھام کی۔

بارہواں باب۔ لکھنؤ اور دہلی اسکول کی غزل گوئی کا موازنہ ہے اس باب میں عبدالسلام ندوی کی چند خصوصیات کے شمار کو کسوٹی نہیں بنایا۔ اور تذکیر و تانیث کا الزام دونوں اسکول کے شعراء پر عائد کیا ہے۔ شعرائے لکھنؤ کی فارسی تراکیب کو کلام کا عیب نہیں کہا بلکہ غیر ملکی زبان کی ترکیبوں کو صحیح نہیں لکھا ہے۔ عبدالسلام کے نظریہ کو رد کرتے ہوئے دہلوی شعراء کو لکھنؤ سے بلند پایہ بتلایا ہے۔

تیرہواں باب۔ اردو غزل کا چھٹا دور۔ ذوق، مومن، اور غالب کے زریں کارنامے ہیں۔ پس منظر کے بعد ذوق، مومن، اور غالب کے کلام پر تفصیل سے بحث کیا ہے۔ ذوق کی قصیدہ گوئی اور غزلیات کے رنگ پر تبصرہ۔ مومن کے جمالیاتی رنگ اور بیان پر تبصرہ کیا ہے کلام میں انفرادیت انوکھے اور نرالے انداز بیان، معنی آفرینی اور نازک خیالی کی ستائش کی گئی ہے اس دور میں غزل کی عام خصوصیات اس طرح بیان کیا ہے۔ غزل کے لئے یہ ترقی کا دور ہے۔ روحانی شاعری کی ابتداء کے علاوہ غزل کی پژمردگی اور افسردگی کو ختم کیا۔ تصنع اور تکلف کے برخلاف نازک خیال اور معنی آفرینی

لطف واثر، معنویت، اور علوئے تخیل کو الفاظ پر ترجیح دی۔ نئی تراکیب، نئی تشبیہات استعارے، رمز و کنایہ غزل میں معنوی خصوصیات کی ترقی ہوئی۔ ہندی الفاظ اور مقامی خصوصیات شیرینی، ترنم اور سادگی کا اضافہ ہوا۔ تصوف کے گہرے اور سچے مسائل کو سمویا گیا۔ بازاری اور ہوسناکی کے علاوہ متانت آمیز شوخی اور طنزیہ انداز بیان کا سرمایہ اکٹھا ہوا۔ اصلیت اور حقیقت میں آزادانہ طور پر شبہات کا اظہار کیا گیا۔ چھوٹی بحر کی غزلیں صاف سادہ اور بلند ہوئیں۔ ناہمواری کا خاتمہ اور انفرادیت کا مظاہرہ ہوا۔ حقیقت کا اعتراف ذاتی کمزوریوں کی بنا پر کیا گیا۔

چودھواں باب۔ اردو غزل پر سرسری تنقیدی نظر ہے۔ اردو غزل پر کئے گئے اعتراضات کا جائزہ کیا ہے۔ پہلا اعتراض غزل میں رزمیہ شاعری کا وجود نہیں۔ قوم کی گری ہوئی حالت کو ابھارنے اور سنوارنے کے قابل نہیں۔

۲۔ غزل میں عشق و محبت کا مسلسل بیان نہیں ہوتا۔ ہر شعر الگ ہوتا ہے۔

۳۔ غزل میں گل و بلبل، شمع و پروانہ، شیریں و فرہاد، لیلیٰ مجنوں کے علاوہ کیا دھرا ہے

۴۔ غزل میں ہندوستانی عنصر نہیں۔ غیر ملکی تلمیحات اور الفاظ کی بھرمار ہے۔

ان اعتراضات کے جواب بہت سنجیدگی اور غور و فکر سے دیئے گئے ہیں۔ اور یہ تلقین کی ہے کہ غزل میں کچھ معائب ہیں۔ ان کو دور کیا جائے۔ نئے خیالات و جذبات جدت طبع سے مالا مال کرنا چاہئے۔

خاتمۂ کتاب میں اردو غزل، امیر خسرو کے دور سے اور میر و داغ تک کا ایک مختصر سا جائزہ لیا ہے اور غزل میں برتی جانے والی صنعتوں پر تبصرہ کیا ہے۔ طنز آمیزی، شوخی، لفظی و معنوی خصوصیات کا اعادہ کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب ۴۳۵ صفحات پر ختم ہوتی ہے ضمیمہ ۱ میں تعداد غزلیات اور اشعار۔ ۲ میں فہرست ماخذات ۴۳۹ تک، اشاریہ ۴۵۹ تک ہے۔

یہ کتاب غزل کی تاریخ اور تنقید پر بہترین کتاب ہے۔ اس کتاب میں کچھ اغلاط ہیں۔ مثلاً

۱۔ ص ۱۱۰ پر مصنف نے قلی قطب شاہ کو پہلا غزل گو شاعر لکھا ہے۔ لیکن خاتمہ کتاب ص ۴۱۴ پر اردو غزل کی ابتداء امیر خسرو نے کی لکھا ہے۔

۲۔ اس مقالہ کو ذوق، مومن، اور غالب پر ختم کر دیا ہے۔ جسے غزل کی ادھوری تاریخ کہہ سکتے ہیں

۳۔ مختلف ادبی تاریخوں اور تذکروں کی رائے بغیر کسی اختلاف کے نقل کر دی گئی ہے مصنف نے اپنی ذاتی رائے پیش نہیں کیا۔

۴۔ موضوع کے مطابق ہر دور کے شعرا پر تقابلی تبصرہ کرنا چاہئے تھا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔

۵۔ غزل کی مقبولیت و ترقی کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ غزل پہلے دور، دوسرے دور کے بعد تیسرے دور تک پہنچ چکی ہے۔ یہ نتائج بلا کسی دلیل کے کیسے اخذ کئے گئے اس پر کوئی تبصرہ نہیں ہے۔

۶۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے شعر الہند میں جو اعتراضات ناسخ و آتش کے شاگردوں پر عائد کئے ہیں مصنف نے ان کے جواب میں مماثل اشعار دلی کے شعراء کے پیش نہیں کئے۔ میر، سودا، انشاء کے اشعار پیش کئے ہیں۔ جیسے مولوی عبدالحق نے ادبی بددیانتی کہا ہے۔[1]

ان کمزوریوں کے باوجود یہ کتاب اپنے عہد میں اردو غزل پر ایک اہم کتاب ہے۔ اردو غزل پر یہ پہلا مقالہ ہے۔

اردو غزل

ڈاکٹر یوسف حسین خان

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تصنیف "اردو غزل" صنف غزل کی خصوصیات کا تنقیدی جائزہ ہے اور ولی اورنگ آبادی سے فیض احمد فیض تک جدید عہد تک تقریباً ۱۱۹ شعراء کی معروف غزلیات کے انتخاب کا گلدستہ ہے۔ "اردو غزل پر تبصرہ" کے زیر عنوان مؤلف نے غزل کی تاریخ کی روشنی میں جملہ خصوصیت کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ مصنف کے تنقیدی موقف کا نمائندہ ذیل کا بیان ہے۔

"میں نے غزل کی توجیہ رمز و اشارہ سے کی ہے جو تخیل اور جذبے کی زبان ہے۔ میں سمجھتا ہوں غزل پر جو کچھ لکھا جائے اس میں بھی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ غیر ضروری تفصیل نہ پیدا ہو جو ذوق سلیم پر گراں گذرے۔"[2]

کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف غزل کی خصوصیت اس کی حقیقت اور بو رماس پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ذیل کا بیان بطور ثبوت قابل غور ہے۔

"مولانا الطاف حسین حالی نے جو غزل پر جو نکتہ چینی کی وہ اصلاحی تحریک کے تحت تھی نہ کہ ادبی

[1] رسالہ اردو۔ اردو غزل اور اس کی نشوونما۔ عبدالحق (جنوری ۱۹۲۵ء)
[2] "اردو غزل" ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ دیباچہ

مقاصد کے تحت "۱۔

موصوف نے غزل میں برتے جانے والے موضوعات مضامین پر مختصراً رمز وکنایہ کی انفرادیت تشبیہ استعارے کی لطافت اس لئے پیدا ہونے والا رنگِ تغزل اور تاثر پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

شعر میں جمع کے صیغے کے استعمال کو رمزیت کا ایک وسیلہ شمار کیا ہے۔ زبان کے ہر لفظ کو ایک جوہری قوت کا مالک کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک غزل میں آہنگ احساس اور آہنگ سماعی ربط کا قائم رہنا ضروری ہے۔ غزل کی ہر بحر کو رمز و ایماں کا ذریعہ تسلیم کرتے ہیں۔

"غزل کا ہر وزن ہر بحر اپنے اندر ایک قسم کا رمز و اشارہ رکھتی ہے۔"۲

خان صاحب نے میر، غالب، ذوق، مومن، کے منتخب اشعار کو دلیل بنا کر تشریح کے ذریعہ اپنے بیانات کو ثابت کیا ہے۔ ان منتخب اشعار سے واضح ہے کہ موصوف اردو کے غزل گو شعراء اور ان کے کلام کے تقاضوں، مزاج اور اجزائے ترکیبی سے واقف ہیں۔

غزلیات کے انتخاب والے حصہ میں منتخب کلام، موصوف کے ذوق اور تنقیدی نظر کی گہرائی و گیرائی کا ثبوت ہے۔ اس انتخاب کی روشنی میں موصوف کا یہ قول غور طلب ہے۔

"غزل گو شاعر کے دل کو رمز و ایہام اس لئے بھی عزیز ہوتی ہیں کہ وہ جس قسم کا اثر پیدا کرنا چاہتا ہے وہ انھیں سے ممکن ہے۔"۳

اس کتاب کی اہمیت "تنقیدی سرمایہ" کے مصنف عبدالشکور نے اس طرح واضح کی ہے۔

"یوسف حسین صاحب کی دوسری تنقیدی کتاب کا نام "اردو غزل" ہے اور اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان میں یہ ایک معرکہ کی تصنیف ہے۔"۴

صنف غزل کو سمجھنے اور پرکھنے میں یہ کتاب قاری کی رہنمائی اور فنی کسوٹی کا بہترین نمونہ ہے۔ اور ہمارے ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

غزل اور مطالعۂ غزل

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تالیف "غزل اور مطالعۂ غزل" موضوع کے مطابق ۶۴۳ صفحات پر مشتمل ذیل کے

۱۔ "اردو غزل" ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ ص ۱۶۷ ۴۔ تنقیدی سرمایہ عبدالشکور ص ۱۵۵
۲۔ ایضاً ص ۱۶۹
۳۔ ص ۳۳ تا ۳۴

عنوانات کی تفصیل ہے۔

۱۔ صنف غزل (۲) غزل اور تغزل (۳) غزل کا جمالیاتی پہلو (۴) اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ
۵۔ جدید اردو غزل (۶) غزل کے رجحانات
۷۔ اردو غزل میں ہیئت اور تجربے

مؤلف نے مندرجہ بالا عنوانات کے غزل پر ہونے والے اعتراضات کے جواب اور صنف غزل کی خصوصیات اس صنف میں گاہے گاہے ہونے والی تبدیلیوں اور ہر دور کے تقاضوں کے بموجب خیالات میں ردّ و بدل، مختلف ادوار میں مختلف روایات تحریکات اور اصناف کی بازگشت جمالیات، فلسفہ تصوّف، معاملہ بندی، ایہام گوئی اس صنف سے منسلک تشبیہ، استعارہ، تضاد، علامت، تلمیح مختلف صنائع بدائع کے لباس نے کیسے سنوارا، لوازمات شعری اور تفکر سے وابستہ گہرائی و گیرائی ہر نکتہ کو مصنف نے تبصروں سے سنوار کر مباحثوں سے ثابت کر کے تنقیدی پہلوؤں سے غزل کی انفرادیت اور مقبولیت کی وضاحت فلسفیانہ انداز سے کی ہے۔ اور کسی موضوع کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ ذیل میں موصوف کا بیان اس کی تصدیق کرتا ہے۔

"صنف غزل کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس نے اپنے ذہنی و فکری تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی کے سیاسی اور سماجی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔" [۱]

مصنف نے اس کتاب میں غزل کو نئے موضوعات سے نوازنے والی مختلف تحریکات اور اصنافی ہیئتوں سے متعارف کرنے والے، گہرائی و گیرائی سے لبریز کرنے والے، ایہام گوئی، معاملہ بندی، ریختی کے جال میں پھانسنے والے تصوّف، فلسفے اور صنائع بدائع کی جملہ خوبیوں سے مالا مال کرنے والے شعراء کے نام بنام تذکرے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ تفصیل سے ان کی کارگزاری کا جائزہ لیا ہے۔ منتخب اشعار کو دلیل بنا کر ثبوت فراہم کئے۔

غزل کی ڈھائی سو سالہ ارتقائی تاریخ کی ابتدا قلی قطب شاہ اور ولی دکنی سے ناصر کاظمی تک۔ غزل سے وابستہ خوبیوں اور خامیوں کو پیش کر کے کتاب کو تاریخ و تنقید کا آئینہ بنا دیا ہے۔ طویل تبصروں اور مباحثوں کے سبب موضوعات کے پیش نظر اکثر باتوں کا اعادہ ہو گیا ہے جو اس کتاب کی خامی کہی جا

---

[۱] غزل اور مطالعۂ غزل۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۵۵

سکتی ہے۔ مصنف نے اس کا اعتراف پیش لفظ میں اس طرح کیا ہے۔

اس کتاب کے مختلف حصوں میں خیالات کے دہرائے جانے کا احساس ہو سکتا ہے لیکن چونکہ ان میں سے ہر ایک حصہ کی بنی بھی ایک وحدت ہے۔ اس لئے ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ اس کی افادیت پر کوئی حرف نہیں آتا ہے۔ صنفِ غزل اور تنقیدی پہلو پر کتاب اپنے عہد کی نمائندہ تصنیف کہی جا سکتی ہے۔

آزاد غـــزل

غزل کی پسندیدہ اور اہم صنف پر دورِ قدیم سے ترقی پسند تحریک تک اہم تبدیلیوں کا ذکر صنف غزل میں کیا جا چکا ہے۔ اسی صنف میں ترقی پسند دور کے انتہا پسند شعراء نے انگریزی کی آزاد نظم کے مطابق اردو میں آزاد نظم اور آزاد غزل کے تصور کو عام کیا۔

"آزاد غزل کا خیال آزاد نظم سے ماخوذ ہے۔" [1]

آزاد غزل میں آہنگ کے تعین کو برقرار رکھ کر عروضی قواعد کے مطابق وتفوں اور ارکان کی تعداد پر بھی دھیان دیا جاتا ہے۔ دونوں مصرعوں کو بحر کے اوزان کا پابند نہیں بنایا جاتا اس میں مصرعوں کو چھوٹا بڑا کر کے ارکان کی تعداد میں رد و بدل کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔" [2] مثلاً درج ذیل شعر دیکھیے۔

یوں کبھی جی لیتے ہیں جینے والے
کوئی تصویر سہی آپ کا پیکر نہ سہی
مظہر امام

اس شعر کا مصرعہ اولی میں تین ارکان فاعلاتن فعلاتن فعلن میں بمصرعۂ ثانی میں چار ارکان فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن ہیں۔ یعنی دو مصرعوں میں ارکان کی تعداد میں تبدیلی آگئی ہے۔ ثابت یہ ہوتا ہے کہ آزاد غزل بحر کے بنیادی اصول مساوی الارکان سے انحراف کرتی ہے۔ اس میں مصرعہ اولی اور مصرعۂ ثانی دونوں میں سے کسی ایک میں ارکان کے کم زیادہ ہونے کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ اسی طرح غزل کے ہر شعر میں مصرعہ اولی اور ثانی کے ارکان کا کم اور زیادہ ہونا روا رکھتے ہیں۔ ویسے آزاد غزل ادب میں تجربے کے دور سے گزر رہی ہے اور اردو میں غزل کا پیکر شعر میں جمالیاتی قدروں کا پابند ہے اور آزاد غزل میں اس پابندی سے بغاوت ہے۔ اس لئے فی الحال یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں

---

[1] غزل اور مطالعۂ غزل۔ پیش لفظ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۸
[2] اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت۔ ڈاکٹر عنوان چشتی ص ۱۹۷

کہ آزاد غزل کی صنف اردو ادب میں پسندیدہ صنف بن کر روایتی یا کلاسیکی غزل کی طرح نمایاں کردار ادا کرے گی یا نہیں اس کا فیصلہ آنے والا وقت کر سکتا ہے۔

آزاد غزل کا تصور اردو ادب میں روایات سے بغاوت کا ردعمل ہے۔ اس میں ادب کا وہ ترجمان طبقہ پیش پیش تھا جو محدود موضوعات پر شاعری کرنے کا عادی تھا۔ ویسے ہمارے ادب میں ان کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ مظہر امام، کرامت علی کرامت، یوسف جمال، زریشہ ثانی، مسعود شمس، بدیع الزماں خاور وغیرہ۔ اس صنف میں مشق سخن کر چکے ہیں۔ آگے کسی کی امید نظر نہیں آتی کیونکہ یہ صنف عوامی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔

جدید غزل

کلاسیکی غزل میں اصلاح کے نعرے کے بعد ایک طبقہ نے غزل کو تنقید کا ہدف بنایا اور نظم کو عملاً اہمیت دینے پر آمادہ ہو گیا۔ ان لوگوں میں سے ایک طبقہ انتہا پسندوں کا تھا جو خط مستقیم کی شاعری سے اکتا گیا تھا۔ ورد ردعمل کے طور پر انھوں نے غزل کو ذریعۂ اظہار کے لئے محبوب صنف قرار دیا قدیم اصطلاحوں سے پرہیز کر کے ماحول اور حالات سے وابستہ اشیاء کو استعارہ تشبیہ اور علامت کے روپ میں اشعار میں سمویا۔ وقتی تقاضوں سماجی قدروں زمانے کی رفتار کے مطابق اصطلاحوں کا استعمال غزل کے لئے معقول تھا۔ جدید غزل کی تعریف خلیل الرحمٰن اعظمی سے سنئے۔

"جدید تر غزل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس غزل پر آپ کسی قسم کا لیبل نہیں لگا سکتے نہ کسی ایک صفت یا کیفیت کے دائرے میں اس کو مقید کر سکتے ہیں۔ اس لئے گذشتہ دور کے غزل گویوں کی طرح اس دور کے غزل کہنے والوں کو آپ ان اصطلاحوں کی مدد سے نہیں سمجھ سکتے جیسے صوفی شاعر، رند شاعر، تجربات کا شاعر، عشق حقیقی کا شاعر، عشق مجازی کا شاعر، ہوسناکی اور معاملہ بندی کا شاعر، سیاسی شاعر، غم جاناں کا شاعر، غم دوراں کا شاعر، قنوطی شاعر، رجائی، زبان و محاورہ کا شاعر وغیرہ وغیرہ"[1]

جدید غزل کی تعریف اپنے ماحول سے مزاج کے مطابق مواد فراہم کرتی ہے قدیم اصطلاحوں سے یک لخت منحرف نہیں۔ بلکہ ان کو جدت کے روپ میں پیش کرنے کی قائل ہے۔ استعارہ در استعارہ

---

[1] جدیدیت اور ادب۔ مرتبہ آل احمد سرور ص ۲۵۵ جدید تر غزل۔ خلیل الرحمٰن اعظمی

اور علامت ور علامت رمز و کنایہ کے سہاروں سے مادی وسائل سے تخیل کا مواد لینے پر آمادہ کرتی ہے
تجربات اور مشاہدات کا ردعمل انسانی زندگی کو نفسیاتی، سیاسی، سماجی اور مذہبی دائروں میں کن کن
انداز سے کس طرح متاثر کیا ہے۔ اسلوبی نزاکت سے لسانی آہنگ کے مطابق ارکان کی پابندی
کے ساتھ شعر کے پیکر میں ظاہر کرتا ہے۔ اس غزل میں ارکان کا کم زیادہ ہونا جرم بن جاتا ہے۔ بحر
کے مطابق شعر کے ہر مصرع کو مساوی الوزن ہونا ضروری ہے اس طرح یہ غزل عروض کے قوانین
سے صوتی اور لسانی آہنگ کی پابند ہو جاتی ہے۔

جدید غزل موجودہ دور میں انسانی جذبات اور احساسات کی بھرپور نمائندگی میں کامیاب ہے۔
یہ گل و بلبل کی داستان اور حسن و عشق میں بعید از قیاس باتوں پر بھروسہ کر کے خیال کو شعری پیکر
میں نہیں ڈھالتی۔ بلکہ تجربات، مشاہدات اور تجزیات سے ماخوذ نتائج پیش کرنے کی قائل ہے۔
اسی لئے یہ غزل معاشرے سے منسلک ہو کر خاص و عام کو متاثر کرنے میں کامیاب ہے۔ انڈو پاک
کے شعراء میں ظفر اقبال، افتخار جالب، پروین شاکر، صغیر ملال، ناصر کاظمی، زیب غوری، بشیر بدر، شہپر رسول
وغیرہ بقول ڈاکٹر سید عقیل

جدید غزل ایک اصطلاحی صورت اختیار کرتی ہے جس سے مراد وہ غزل ہے جو فی زمانہ
ایک خاص مزاج اور مکتب خیال سے وابستگی کے باعث وجود میں آرہی ہے۔ [۱]

نثری غزل

صنف غزل کی تیسری ہیئت نثری غزل ہے۔ تجربہ ہنوز جاری ہے اردو ادب میں صنف
شاعری غیر عروضی ہے۔ حالانکہ شعریت اور زبان کا تخلیقی استعمال ہوتا ہے۔ نثری ٹکڑوں میں حروف
الفاظ اور تراکیب سے مربوط ہونے سے نثری آہنگ کے ابھرنے کا خیال شعری آہنگ کی برابری نہیں کرسکتا
کیونکہ رکن کی تکرار اور ترتیب سے ابھرنے والا آہنگ تمام لحاظ سے مکمل اور مترنم ہوتا ہے۔ اسی لئے اسے
غیر عروضی تجربہ کہا گیا ہے کیونکہ اس میں نثری آہنگ کو شعری آہنگ کا نعم البدل سمجھا گیا ہے۔ [۲]
اس طرح اس صنف میں شعری آہنگ سے انحراف کیا گیا ہے۔ موسیقی کے مزاج، عروض کی پابندیوں
پر شعری آہنگ کے تاثر کو اس میں غیر ضروری سمجھا گیا۔ دیکھنا ہے کہ یہ صنف مستقبل میں ادب پر اپنا

۱۔ نئی علامت نگاری۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل ص ۱۱
۲۔ اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت ص ۱۹۵ تا ص ۱۹۶ ڈاکٹر عنوان چشتی
۳۔ ایضاً ص ۱۹۷

تسلسل قائم رکھنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ یہیں ابھی تک ایسے میں اثر آفریں اشعار نظر نہیں آئے۔ نہ ہی ایسا خیال باندھا گیا جو متاثر کرسکے یا مثال بن سکے۔

اس طرح آزاد غزل، جدید غزل اور نثری غزل تینوں صنفوں میں ہمارے یہاں کچھ نظمیں کے ذریعہ اور تصانیف ان اصناف کی بابت مزید معلومات فراہم ہوسکتی ہے۔ اس ذیل میں ہمارے تاریخی ذخیرہ میں ذیل کی تصانیف ملتی ہیں۔

۱۔ جدید غزل (۲) نثری غزل نمبر ماہنامہ شاعر

'اردو ادب آزادی کے بعد' مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام علی گڑھ سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کی کتابی شکل ہے۔

۱۔ جدید اردو غزل	ڈاکٹر سلامت اللہ خاں
۲۔ اردو غزل	ڈاکٹر وارث کرمانی

مثنوی

مثنوی عربی لفظ مثنی سے بنا ہے جس کے معنی دو ہیں لیکن اصطلاح میں شاعری میں ان اشعار کو کہتے ہیں جن میں ہر دو مصرعے آپس میں مقفیٰ ہوں۔ مثنوی اپنے مضامین کے مطابق اس طرح تقسیم کی جاتی ہے۔ عشق و محبت کی منظوم داستان کو عشقیہ مثنوی، جنگ و جدل کے واقعہ کو رزمیہ مثنوی، اخلاقی نصائح، اخلاقی مثنوی، تصوف کے مضامین ہوں تو صوفیانہ مثنوی ہو سکتے ہیں۔

مثنوی واقعات کا ایک تراشیدہ سلسلہ ہے جس میں خلاف قیاس اور خلاف عادت تیں بھی آجاتی ہیں۔ لیکن ان واقعات کے دوران ربط و تسلسل کے ساتھ اس کے ارتقا میں زندگی کے بہت حسین و قبیح پہلو سامنے آتے ہیں اور مختلف اصناف شاعری کی جھلک اس کے مختلف اجزا میں دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً مثنوی میں کہیں ڈرامائی انداز ملے گا۔ کہیں مرقع نگاری، کہیں ہدیہ شاعری کی شگفتگی، ورزمیہ شاعری کی اثر آفرینی، رزمیہ کا زور بیان، قصیدہ کی شان و شوکت، غزل کی دل گدازی غرض کہ اس ایک صنف میں مختلف اصناف کے مختلف پہلو مدغم ہوتے ہیں۔

مثنوی کی خصوصیت حقیقت نگاری سے وابستہ ہے۔ مضمون کچھ ہی ہو حقیقت پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس کا ہر شعر اپنے پہلے شعر سے مربوط ہونا چاہیے۔ مکان و زمان کے علاوہ 'مواقع'

مناظر اور نفسی کیفیات کی تشریح شاعر اپنی فنکارانہ قوت سے اس میں خاص لطف اور نزاکت پیدا کرسکتا ہے۔

مثنوی کی ہیئت ترتیب قوافی پر منحصر ہوتی اس کے ہر شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے۔ بلکہ ہر شعر بذاتِ خود مطلع ہے اور ہر مطلع کے قوافی مختلف ہوتے ہیں مثنوی کے لیے کم و بیش سات بحور کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق اردو میں سات پسندیدہ وزن کے علاوہ مندرجہ ذیل بحروں میں بھی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔

۱۔ بحر متدارک مثمن مخبون (فعلن فعلن فعلن فعلن) میر کی جوشِ عشق

۲۔ بحر متقارب مثمن اثرم مقبوض (فعل فعولن فعل فعولن) مومن کی کیف آتشیں

۳۔ بحر متقارب مثمن اثلم (فعلن فعولن فعلن فعولن) حالی کی کلمۃ الحق

رنگین کے یہاں مزید دو بحروں مثنویاں ملتی ہیں۔

۱۔ مفتعلن فاعلن، مفتعلن فاعلن

۲۔ فعلن فعلن فعلن فع یا فعلن فعلن فاع فعل [1]

"مثنوی گوہر جوہری" غلام سرور عرف شہدائے اللہ جوہری نے حسب موقع دو بحریں (بحر ہزج مسدس مقصور یا محذوف اور بحر متقارب مثمن مقصور) استعمال کی ہیں۔

ہمارے ادب میں مثنوی کی ابتدائی تاریخ دکن سے شروع ہوتی ہے بلکہ اور صنف سے پہلے مثنوی کی صنف رائج ہوئی۔ دکن کی قدیم تاریخ میں نظامی کی کدم راؤ پدم راؤ شاہ میرانجی کا خوش نامہ شاہ برہان الدین کی وصیت الہادی، غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال وجہی کی قطب مشتری ابن نشاطی کی پھول بن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ولی ویلوری کی رہ مجلس اور سراج اورنگ آبادی کی بوستانِ خیال بھی دکن کی اچھی مثنویوں میں شمار ہوتی ہیں۔

شمالی ہندوستان میں جب اردو شاعری کا دور دورہ ہوا تو شاہ مبارک کی مثنویوں کے بعد اس فن کو میر تقی میر اور مرزا سودا نے ترقی دی۔ ان کے بعد مصحفی نے میر کی "دریائے عشق" کو اپنے انداز میں لکھا۔ میر حسن نے معرکۃ الآرا مثنوی سحر البیان اور دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم لکھی۔

---

[1] اردو مثنوی شمالی ہند میں، سنہ ۱۹۶۹ء انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، ص۴۷ ڈاکٹر گیان چند جین

واجد علی شاہ، مرزا شوق وغیرہ نے بھی اچھی مثنویاں لکھی ہیں۔

محسن کاکوروی، الفت، فغاں، محسن، حالی، شبلی نے بہترین مثنویاں لکھی ہیں۔

اقبال نے ساقی نامہ کے عنوان سے بطرز مثنوی ایک نظم لکھی۔ حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام کے نام سے تاریخ اسلام پر لاجواب مثنوی لکھی ہیں۔ جوش اور علی سردار جعفری نے بھی سیاسی رنگ میں اچھی مثنویاں لکھی ہیں۔ دور قدیم میں یہ صنف نہایت پسندیدہ صنف تھی۔ موجودہ دور میں اس صنف پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی ہے حالانکہ الطاف حسین حالی فرماتے ہیں۔

"مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور کارآمد صنف ہے" [1]

ہمارے ادب میں اس صنف پر درج ذیل کتابیں لکھی گئی ہیں۔

۱۔ تاریخ مثنویات اردو	جلال الدین جعفری	۱۹۵۳
۲۔ مثنویات اردو	امیر احمد	۱۹۲۶
۳۔ اردو مثنوی کی ارتقاء	ڈاکٹر عبدالقادر سروری	
۴۔ اردو کی تین مثنویاں	خان رشید	
۵۔ اردو مثنوی کا ارتقاء شمالی ہند میں	سید عقیل	
۶۔ ہندو شعراء کی اردو مثنویاں	عطاء اللہ پالوی	
۷۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند جین	
۸۔ اردو کی منظوم داستانیں	فرمان فتح پوری	
۹۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویات۔	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	

تاریخ مثنویاتِ اردو

مولوی حافظ جلال الدین احمد جعفری

مؤلف کی کتاب جناب مولوی حافظ جلال الدین احمد جعفری نے اس موضوع کو ۲۲۰ صفحات میں سمویا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں یہ کتاب اشاعت پذیر ہوئی۔ ابتداء میں ایک مقدمہ ہے جس میں صنف مثنوی کی عام تاریخ موضوعات، لوازم اور عروض پر تنقیدی او تحقیقی بحث کی گئی ہے بعد ازاں

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری - الطاف حسین حالی ۱۹۵۳ء (علمی کتب خانہ جامع مسجد دہلی)

اردو مثنویات کی تاریخ کا سلسلہ ملتا ہے لیکن مکمل تاریخ نہیں صرف چند سطروں میں ابتدائی مثنویوں کی تاریخ ناتمام ہونے کے علاوہ واقعات اور ترتیب کی بنیادی غلطیوں سے بری الذمہ نہیں ہے۔

فاضل مؤلف کا بیان ہے کہ "اردو مثنویات کی ارتقائی تاریخ اہل ادب کے سامنے پیش کر دی جائے جس کے متعلق یہ امید ہے کہ یہ انتخاب ہر طرح مفید اور کافی سمجھا جائے گا:"

لیکن مصنف کا مقصد ادھورا ہے۔ کیونکہ اس سے ہرگز اردو مثنویات کی ترقی کا صحیح اندازہ نہیں ہوپاتا۔ موصوف نے کل ۱۷ مثنوی نگاروں کا ذکر کیا ہے۔ سراج اورنگ آبادی سے داغ دہلوی تک حالانکہ سراج سے پہلے ایسے کئی شعراء گزرے ہیں جن کی مثنویات کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اور جن پر اس دور میں بھی کئی مضامین لکھے جا چکے تھے اور ادب کی تاریخ کتابوں میں بھی ان کا ذکر موجود تھا۔ مزے کی بات یہ بھی ہے کہ سراج سے داغ دہلوی تک مؤلف کی نظر میں صرف سولہ شعراء مثنوی نگار کی حیثیت سے انتخاب میں آتے ہیں کئی شعراء کے زمانوں کے درمیان چند اہم اور قابل ذکر شعراء کو ترک کر دیا ہے اس طرح سے یہ کتاب باضابطہ اور مکمل تاریخ مثنویات کا خاکہ پیش کرنے سے قاصر ہیں

سراج سے قبل بعض مثنوی نگاروں کا ذکر اشارتاً چند سطروں میں دیباچہ میں آتا ہے لیکن اس سے مثنویوں کی تدریجی ترقی کا حال معلوم نہیں ہو سکتا ہے۔

منتخب شعراء کے مختصر حالات اور ان کی صرف ایک ایک مثنوی کے نمونے درج کئے گئے ہیں۔ او رمعمولی تنقید و مختصر تبصرہ سے موضوع کا حق ادا نہ ہو سکا۔ کئی مشہور شعراء کا تذکرہ اور نہ ہی کلام کے نمونے موجود ہیں۔

ابتداء سے لے کر موجودہ دور یعنی ۱۹۳۵ء تک کے شاعروں کا تذکرہ اور ان پر تنقید ان کے لسانی بیانی عروضی اور موضوعاتی تغیرات پر تبصرہ کیا جاتا تو یہ کتاب اپنے وقت کی نمائندہ ہو جاتی کیونکہ اس موضوع پر تحقیق و توسیع کا وسیع میدان موجود تھا

مثنویات

مرتبہ: سید امیر احمد علوی

امیر احمد علوی کی یہ تالیف ۱۰۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مرتب نے کم و بیش ایک سو مثنویات کے مختصر نمونے اپنی رائے کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ انتخاب میں ایسی مثنویات شریک نہیں ہیں جو مذہبی موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ مثنویات جو فصاحت و بلاغت نیز ادب کی چاشنی سے محروم ہیں شامل انتخاب نہیں۔ ابتداء میں حسب روایت مختصر تمہید ہے جس میں مرتب نے مثنوی پر عروضی اور تاریخی حیثیت سے بحث کی ہے۔ لیکن یہ تمہید بہت ہی مختصر اور ناکافی ہے اگر اس میں مثنویوں کا انتخاب سنین کے ساتھ پیش کیا جاتا تو مناسب ہوتا اور مثنوی کے عہد بہ عہد ارتقاء کا خاکہ ذہن نشین ہوتا اس کے باوجود بلند پایہ مثنویوں کا فقدان ہے جو اس کتاب میں ہونا چاہیے تھا۔ بعض ایسی مثنویوں کو جگہ دی گئی ہے جن کے چند انتخابی اشعار تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔

لائق مؤلف نے ایسے ہی اشعار کو نقل کر دیا ہے۔ ایسی مثنویاں مکمل ان کی نظروں سے نہیں گزری ہوں گی۔ اسی وجہ سے مثنویوں پر ذاتی رائے قیاساً ناقص معلوم ہوتی ہے۔ شعراء کے حالات مثنویوں کے سنین درج کرنے میں بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً وجدی کی مثنوی تحفۂ عاشقان کا سنہ تصنیف ۱۱۶۰ھ غلط ہے ۱۱۵۳ھ میں یہ مثنوی مکمل ہوئی ہے۔ مصرعۂ تاریخ یہ ہے۔

"یہ مجھا نوائے تحفۂ عاشقاں"

مؤلف بعض مثنویوں کے صحیح سنین سے ناواقف ہے۔ کیونکہ ترتیب ٹھیک نہیں ہے۔ اس سبب سے بھی مثنویوں کے ارتقاء کا اندازہ موضوع، زبان و بیان سے صحیح نہیں ہوتا۔ کتاب کا موضوع اہم ضرور ہے لیکن تحقیق و تنقید و تبصرہ اور مواد کے لحاظ سے بلند پایہ نہیں کہا جا سکتا اس موضوع پر اصولی اور علمی تحقیق مزید کام کی متقاضی ہے۔ لیکن اپنے دور کا پہلا قدم ہے۔ اس لحاظ سے قابل تعریف نہ سہی لیکن قدر کے قابل ضرور ہے۔

مشہور شعراء کے علاوہ مثنوی کے موضوعات کے لحاظ سے بھی اس کتاب کو مکمل نہیں کہہ سکتے اپنا مثنوی کے موضوعات کے لحاظ سے کوئی بھی داخل ہے۔ اردو کے مشہور اساتذہ سودا، قائم، مصحفی اور انشاء کی متعدد ہجویہ مثنویات موجود ہیں۔ مثنوی کے اس موضوع کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ قابل مؤلف نے مثنوی کے موضوعات کے شمار میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

اس کتاب میں مثنویات کی فہرست سنین کے مطابق نہیں ملتی۔ اس لئے اپنے موضوع اور کوئی سے

اعتبار سے تحقیقی و تنقیدی مواد مزید کاوش کا متقاضی ہے۔

مؤلف نے بعض شاعروں کے حالات اور سنین غلط درج کئے ہیں مثلاً (۱) نصرتی کی مثنوی گلشنِ عشق کے دو کردار منوہر اور مدمالتی ہیں۔ مؤلف نے مدمالتی کو مالتی لکھا ہے۔

(۲) ملا وجہی کو معاصر ابو الحسن تاناشاہ لکھا گیا ہے اور وجہی کا زمانہ زیادہ تر محمد قلی قطب شاہ ۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ کے عہد میں گزرا ہے اسی کے آخر زمانہ میں ۱۰۱۸ھ میں وجہی نے "قطب مشتری" لکھی ہے۔ ابو الحسن تاناشاہ کا زمانہ ۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۸ھ کا ہے۔

(۳) ذوقی اور بحری معاصرِ سراج لکھا گیا ہے۔ حالانکہ سراج کا زمانہ کسی قدر بعد کا ہے۔

(۴) جس دور میں یہ تالیف لکھی گئی اس دور میں تحقیق نے کئی پوشیدہ باتوں کا انکشاف کیا تھا۔ اسی دور میں عبد الحق نے رسالۂ اردو میں دکن کے کئی گمنام اور مشہور شعراء کو اردو میں متعارف کرو یا تھا پھر بھی مؤلف نے جا بجا غلطیاں کی ہیں۔ یہ حیرت کا مقام ہے۔

مثنوی کی تاریخ کا ارتقاء اس زمانہ کے لیے نیا موضوع اس لیے تھا کہ اس صنف کی تاریخ موجود نہیں تھی۔ لیکن ادب کی تاریخوں سے ادبی رسائل تک اس موضوع پر کافی مواد موجود تھا۔ پھر بھی مؤلف کے بیانات میں کسی حد تک کذب و اختراع کے عناصر پائے جاتے ہیں۔

اس کتاب میں دکنی شعراء کی مثنویات پر زیادہ تحقیق کی گئی ہے۔ کیونکہ شمالی ہند کے شعراء کا ذکر خال خال ملتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام کمزوریوں کے پیش نظر اس تاریخ کو مثنویات کی نمائندہ تاریخ نہیں کہا جا سکتا۔

اردو مثنوی کا ارتقاء

مرتبہ: عبد القادر سروری

عبد القادر سروری کی مرتب کردہ کتاب اردو مثنوی کے ارتقاء کی تاریخ کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۰ء میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں منظر عام پر آیا۔ کتاب کے متعلق مصنف کا بیان ہے کہ

اس میں اردو مثنوی کی پیدائش سے لے کر موجودہ زمانے تک اس کی ترقیوں اور تبدیلیوں

---

[۱] اردو مثنوی کا ارتقاء - عبد القادر سروری - دیباچہ طبع دوم ص ۵

کی مختصر تنقیدی تاریخ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر عہد کے عام رجحانوں اور خصوصیتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو مثنویاں عام طور پر دسترس میں ہیں ان کے اقتباسات دینا تحصیل حاصل تھا۔ لیکن قدیم مثنویوں میں سے اکثر ابھی شائع نہیں ہوئیں اس لئے ایسی مثنویوں کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں۔ اس کی وجہ سے زبان اور انداز بیان کی جو تبدیلیاں ابتدا سے اس وقت تک ہوتی رہی ہیں وہ نظر کے سامنے رہیں گی۔ اس طرح یہ چھوٹی سی کتاب اردو شاعری کی ایک صنف کی ارتقائی تاریخ بھی ہے۔ اور زبان کی عہد بہ عہد ترقی کے مطالعہ کا دیباچہ بھی۔" [1]

فہرست مضامین یہ ہیں۔

۱۔ مثنوی کا مقام اصنافِ شعر میں

۲۔ اردو مثنوی کے اولین نمونے (۳) طویل مثنویاں (۴) قدیم مثنویوں کا عروج

۵۔ بیجاپور کی مثنویاں (۶) گولکنڈہ کی مثنویاں

۷۔ دکن میں مغلیہ عہد کی متصوفانہ مثنویاں

۸۔ دورِ متوسط کی ابتدائی مثنویاں

۹۔ مثنویاں اپنے عروج پر

۱۰۔ مثنوی جدید دور میں

(۱) مثنوی کا مقام اصناف شعر میں :- دوسرے اصناف کے بارے میں مثنوی تو تسلسل خیال اور اظہار کی اچھی صنف بتلایا ہے۔ دکن میں بیجاپور، گولکنڈہ اور شمال میں لکھنؤ کے سیاسی تنزل کے عہد میں مثنویوں کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ دکن میں قدیم ترین دور میں مثنوی کی صنف کا موازنہ غزل، قصیدے اور رباعی سے کرتے ہوئے مثنوی کو اظہار کے خیال کی بنیاد پر فوقیت دی ہے مثنوی کی اہم خصوصیت واقعات نگاری بتاتے ہیں۔ اور مثنوی کے اسلوب اور طرزِ بیان کو شعری نزاکتوں اور ادبی لطافتوں کے استعمال کی گنجائش کا ذریعہ بتلایا ہے۔ بیان اور اس کی توضیح و تشریح، ڈرامائی مواقع، مربوط خیال اسی صنف کو لکھا ہے

اردو مثنوی کے اولین نمونے میں صوفیائے کرام کے دور کا ذکر کرتے ہوئے قدیم ترین مثنوی

---

[1] اردو مثنوی کا ارتقاء - عبدالقادر سروری - دیباچہ طبع دوم ص۳

کے نمونے بابا شیخ فرید شکر گنج بتایا ہے ۔ امیر خسرو کی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں مثنوی کے قافیہ کی ترتیب میں بتا کر ان کی ایک نظم کو مثنوی کی شکل ملتی ہے ۔

بابا کبیر داس حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی نظم اور ملفوظات کو مثنوی کے قافیہ میں بتا کر مثنوی مانا ہے ۔ بہاء الدین برناوی شیخ عثمان کی چتراولی منظوم قصوں کو مثنوی بتلایا ہے ۔

طویل تر مثنویاں میں گجرات اور دکن کو اس فن کا مرکز مانا ہے ۔ شاہ علی جیو گام دھنی میاں خوب محمد چشتی کی خوب ترنگ کا حوالہ دیا ہے شاہ میراں جی کی مثنوی کی حمد کا حوالہ دیا ہے ۔

قدیم مثنویوں کا عروج میں ۹۸۶ھ سے بیجاپور اور گولکنڈہ کو شمار کیا ہے اس عہد میں سب سے زیادہ مثنویاں لکھی گئی ہیں ۔ ابراہیم عادل شاہ ابراہیم کے جانشین محمد اور علی سکندر عادل شاہ، عادل شاہی قطب شاہی سلاطین خاندانوں کے عہد میں ملا غیاثی، فیروز، سید محمود ان خاندانوں کے ہر بادشاہ کے عہد میں ادبی کارکردگی پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

بیجاپور کی مثنویاں میں ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں اردو ادب کے فروغ میں سیکڑوں مثنویوں کا ذکر کیا ہے مقیمی کی چندر بدن و مہیار کی خوبی، زبان و بیان اور تلمیحات پر روشنی ڈالی ہے ۔ سراج اورنگ آبادی، ابن نشاطی وغیرہ کے حوالے سے اس مثنوی کے خیال اور تلمیح کا ذکر کیا ہے ۔ غواصی کی سیف الملوک اور بدیع الجمال کو چندر بدن مہیار کے بعد کی مثنوی لکھی ہے ۔ امین کی بہرام و حسن بانو دولت نے مکمل کی صنعتی اور رستمی کی قصۂ بے نظیر اور خاور نامہ، ملک خوشنود کی ہشت بہشت اور یوسف زلیخا، ارزق کی علی نامہ اور گلشن عشق، شاہ ملک کی احکام الصلوٰۃ، امین الدین کی محبت نامہ یا محب نامہ، رموز السالکین، نظم وجودیہ اور نظم قربیہ، ہاشمی کی زلیخا مثنوی کا حوالہ دیا ہے حکمران سکندر کے عہد میں سیوا کی روضۃ الشہداء، مومن کی اسرار عشق کا حوالہ دیا ہے ان کی ادبی خوبیوں کا جائزہ لیا ہے ۔

گولکنڈہ کی مثنویاں میں محمد قلی کے عہد سے ملا وجہی کی قطب مشتری، احمد کی لیلی مجنوں، حسن شوقی کی ظفر نامہ نظام شاہ، میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ، محمد افضل کی بکٹ کہانی، سلطان عبد اللہ کے عہد میں غواصی اور ابن نشاطی کی سیف الملوک، پھول بن، طبعی کی بہرام گل اندام کا ذکر کیا ہے ۔ ان مثنویوں کی صنعتی اور ادبی خوبیوں کا جائزہ لیا ہے

دکن میں مغلیہ عہد کی متصوفانہ مثنویوں کے باب میں سیاسی پس منظر کے بعد عبد الولی عزلت

اور ولی ویلوری کی روضۃ الشہدا، رتن پدم، بحری کی من لگن اور وجدی کی پنچھی باچھا، عشرتی کی دیپک پتنگ، چیت لگن، عاجز کی قصہ ملکہ مصر و فتح کی قصہ زلیخا، تالی، صعیفی کی ہدایت ہندی، ذوقی کی وصال العاشقین، حضرت غوث پاک کی منقبت، مولانا عبدی کی محشر نامہ، دردنامہ، خواب نامہ پیغمبر، وفات نامہ بی بی فاطمہ، ولی اورنگ آبادی کی تعریف اور سورت کا ذکر کیا ہے۔

دور متوسط کی ابتدائی مثنویوں مصنف لکھتے ہیں کہ عہد متوسط میں مثنوی لکھنے والا کوئی شاعر نظر نہیں آتا۔ لیکن میر اور سودا کی مثنویوں کو سراہا ہے۔ سراج اورنگ آبادی کی بوستان خیال، نوازش علی خاں شیدا کی روضۃ الاطہار اور اعجاز احمدی، ساتی کی قصہ مرور و شمشاد، مولانا باقر آگاہ ویلوری کی ریاض الجنان، ہشت بہشت، محبوب القلوب، مثنوی روپ سنگار، گلزار عشق وغیرہ مثنویات، شاہ حمید سے غلام قادر شاہ کی رموز العاشقین، مراد شاہ کی قصۂ چہار درویش کا ذکر کیا ہے۔

مثنوی اپنے عروج پر میں دہلی اور اودھ کے ادبی ماحول کے پس منظر کی روشنی میں مرزا علی لطف کی نیرنگ عشق، میر حسن کی سحر البیان، رموز العارفین اور گلزار ارم، مرزا محمد تقی خاں ہوس کی لیلیٰ مجنوں، مصحفی کی بحر المحبت، رنگین کے علاوہ دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم، تلق کی طلسم الفت، شوق کی بہار عشق، زہر عشق، فریب عشق، حاتم علی بیگ مہر کی داغ نگار، داغ دل مہر، اور شمع بزم مہر کی معراج المضامین، محمد معصومین، صبا کی شکار نامہ، واجد علی شاہ، امیر کی نور تجلی، ابر کرم، داغ کی فریاد داغ، تسلیم اور محسن کی مثنویوں کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ منشی ملوہا کی نہا بہار ... باب ختم ہوتا ہے۔

"مثنوی جدید دور میں" کے عنوان میں انگریزوں کے تسلط کے بعد سے شروع کیا ہے پس منظر کے بعد آزاد کی موسم زمستان، شب قدر اور ابر کرم وغیرہ۔ حالی کی برکھا رت، شکوۂ ہند، حب وطن کی داد حالی کی مقدمہ شعر و شاعری کے حوالے سے مثنوی کو اصناف سخن میں سب سے مفید و بکار آمد صنف بتایا ہے۔"[1]

اسماعیل کے بچوں کی نظموں کا، اکبر الہ آبادی، شوق قدوائی کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں مثنوی مثالی اور مخصوص اسلوب کی مثنویوں پر روشنی ڈالی ہے۔ مختصر مثنوی لکھنے کے طریقہ کا سبب بتایا ہے۔ یہ مختصر ہے مگر جامع ہے۔ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل تصنیف مثنوی کے موضوع پر مکمل تاریخ کہی جا سکتی ہے۔

کتاب کی ایک خوبی یہ ہر عہد میں مثنوی صنف کی زبان اور اسلوب کی تبدیلیوں کی وضاحت ہے۔ کہیں کہیں حوالوں کا فقدان ہے۔ لیکن تاریخ اردو ادب میں وہ حوالے عام ہیں۔

---

[1] اردو مثنوی کا ارتقاء - عبد القادر سروری ص ۱۲

اردو مثنوی کی اس تاریخ میں دکن اور شمالی ہند کی سماجی سیاسی تاریخ کی احاطہ بھی ہوا ہے۔
ایک، دو مقام پر کتابت کی غلطی ہوئی ہے صفحہ ۱۳۰ پر حالی کی مثنویاں کے بجائے خاص کی مثنویاں ہیں۔
ڈاکٹر عبد القادر سروری نے مختصر سہی اس کتاب کو مثنوی کی بہترین تاریخ بنا دیا ہے۔

اردو مثنوی شمالی ہند میں

ڈاکٹر گیان چند جین

مصنف ڈاکٹر گیان چند جین کی زیر نظر کتاب "اردو مثنوی شمالی ہند میں" طبع اول ۱۹۶۹ء کا ایڈیشن ہے۔ مصنف نے اس مقالہ پر سنہ ۱۹۶۰ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کتاب میں شمالی ہند میں اردو مثنوی کے آغاز و ارتقاء کا عہد بہ عہد جائزہ لیا ہے۔

پہلے باب میں اردو مثنوی کا سیاسی و سماجی پس منظر کے زیر عنوان قدیم عہد کی تاریخ اور مسلم حکومت کی بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے میر کی مثنوی ہنگ نامہ سے چند اشعار بطور ثبوت پیش کئے ہیں۔ [1]

ایسے ماحول میں موصوف نے شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتداء بتائی ہے [2]

اٹھارویں صدی کو علمی و مذہبی نقطۂ نظر سے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تسلی بخش ہی نہیں بلکہ فرحت بخش دور لکھا ہے۔ دہلی میں شاہ ولی اللہ کے خاندان اور لکھنؤ میں مُلّا بحر العلوم کا ذکر کیا ہے [3]

دوسرا باب صنف مثنوی پر قائم کیا ہے۔ مثنوی کی تعریف ان لفظوں میں کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

"مثنوی نظم کا وہ ہیکر ہے جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں۔ لیکن ہر شعر کے بعد قافیہ بدلتا جائے۔ دو دو ہم قافیہ مصرعوں کی رعایت سے اس کا مثنوی طے پایا ہے [4]

مثنوی کا موازنہ دیگر صنفوں سے کرتے ہوئے مثنوی کو غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، ترکیب بند پر فوقیت دی ہے۔ مثنوی کے اوزان بحور کے ساتھ کچھ مثنویوں کا نام لکھا ہے۔ مثنوی کے اصول نقد میں لکھتے ہیں کہ

"حالی نے پہلی بار مثنوی کی پرکھ کے اصول قائم کر کے بڑی خدمت کی ہے لیکن شعر کی تنقید میں باقاعدہ اصول بنانا تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ مصنف نے مثنوی کے تنقیدی

---

[1] "اردو مثنوی شمالی ہند میں" گیان چند جین ص ۱۹
[2] ایضاً ص ۲۳
[3] ایضاً ص ۲۴
[4] ص ۵۵

اصول حالی کے نقل کر دیے ہیں۔[1]

ان اصولوں کی روشنی میں نسیم، شوق، اور میر حسن کے اشعار پیش کیے ہیں[2]

تیسرے باب میں اردو مثنوی کے موضوع پر (۱) دیو پری کی داستانیں جس میں عشق کا نمایاں مقام ہے (۲) وارداتِ عشق ان میں قصے کا عنصر بہت کم ہوتا ہے (۳) معرفت (۴) مذہب (۵) تاریخ و سوانح (۶) رزم (۷) اخلاق و فلسفہ۔ لیکن مثنوی کے کثرت سے عشقیہ مضامین کا احاطہ کرتی ہے دکن کی مثنویوں میں تصوف کے خیال کا اعتراف کیا ہے۔ مثنوی پر تبصرہ کرتے ہوئے کچھ احتیاط لازم قرار دی ہیں عشقیہ مثنویوں میں میر، میر حسن، نسیم، شوق، مرزا، داغ، منیر، اثر، رنگیں اور انوس وغیرہ کی مثنویوں سے مثالی اشعار پیش کیے ہیں۔[3]

چوتھا باب:۔ "اردو مثنوی کا ارتقاء" میں ایران اور دکنی عہد کی اردو مثنویوں پر تبصرہ کرنے کے بعد شمالی ہند سے افضل کی بکٹ کہانی کو پہلی مثنوی بتایا ہے۔ فائز، حاتم، زکی، آبرو، میر، سودا، میر ضاحک، مصحفی، حکیم اور بسمل کے اشعار پیش کیے ہیں۔ علیشی، شعور، جرأت، اور رنگین کا ذکر کیا ہے۔ میر حسن، ناسخ، انشا، مومن، قلق، شوق، میر، ضمیر اور ناسخ کے حوالے پیش کیے ہیں اٹھارویں انیسویں صدی میں امیر مینائی، شوق قدوائی، نسیم، شمس، شایاں، حفیظ جالندھری، رواں، آزاد، حالی، اقبال، کیفی، علی سردار جعفری اور جاں نثار اختر کو مثنوی نگار بتایا ہے۔[4]

پانچواں باب:۔ شمالی ہند کے ابتدائی مثنوی نگار اس میں مختلف حوالوں سے بابا فرید شکر گنج کے اشعار دیے ہیں۔ خسرو، کبیر، قطبن، مرگاوتی، شیخ عثمان جبر اولی، عبد القدوس گنگوہی کے ذکر کے بعد افضل کی بکٹ کہانی کا ذکر ملتا ہے۔ شیخ عبد اللہ امین، محبوب عالم، شیخ جیون، میر جعفر زٹلی، اسماعیل امروہوی، فائز دہلوی، جعفر علی خان زکی، شاہ مبارک آبرو، فضائل علی خان، شاہ حاتم، شاہ آیت اللہ جوہری، محمد فقیر درد مند پر تفصیلی تبصرہ کا اضافہ کیا ہے۔

چھٹا باب:۔ میر و مرزا کا دور میں باقاعدہ مثنوی کے آغاز کا اعتراف شمال میں کیا ہے[5] میر اور سودا کی مثنوی نگاری کا تنقیدی اور تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ اور سودا سے زیادہ اہم مثنوی نگار میر کو ثابت کیا ہے۔ سوز، جعفر علی حسرت، بسمل فیض آبادی، قائم چاندپوری پر تبصرہ موجود ہے

ساتواں باب:۔ میر حسن اور ان کے معاصرین، راسخ، میر اثر کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

---

[1] اردو مثنوی شمالی ہند میں۔ گیان چند جین۔ صفحہ ۹۸ تا ۱۱۸، [4] اردو مثنوی شمالی ہند میں۔ گیان چند جین، صفحہ ۱۵۱۔۱۸۱

[2] ایضاً صفحہ ۸۵۔۸۴، [5] ایضاً ۱۹۱

[3] ایضاً صفحہ ۱۱۷۔۹۰

نیز کلام سے مثالیں پیش کی ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کی مثنویوں کا تنقیدی تجزیہ لے کر مصحفی، جرأت، انشا، رنگین، لطف، محبت، افسوس، عبرت، اور عشرت نیز نگار کی مثنویوں پر تبصرہ کیا ہے۔

آٹھواں باب: نسیم اور ان کے معاصرین کے کلام تنقیدی تبصرہ ہے۔ اصولِ تنقید کی روشنی میں یہ جائزہ لیا ہے۔

نویں باب میں واجد علی شاہ کے دور میں لکھی گئی مثنویوں کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیا ہے اس میں دیگر شوق، صہبا، واجد علی شاہ اختر، امیر وغیرہ کی مثنویوں کے انتخابی اشعار ہیں۔

دسواں باب: قدیم رنگ مثنویوں کا آخری دور ہے اس میں تسلیم، جلالی، میر، امیر اور داغ کی مثنویوں سے مثالیں اخذ کر کے تبصرہ کیا ہے۔

گیارھواں باب: "جدید رنگ کی شاعری نے سب سے پہلے مثنوی کے روپ میں جنم لیا۔[1] لاہور میں پڑھی گئیں مثنویاں محمد حسین آزاد، حالی کو اس رنگ کا روح رواں بتایا ہے۔ شاد عظیم آبادی، مرزا رسوا، نظم طباطبائی، شوق قدوائی، شیخ احمد علی مسلی، اقبال، سردار جعفری، کیفی اعظمی تک مثنوی کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ لیکن حالی اور سردار جعفری، کیفی اعظمی کو زیادہ سراہا ہے۔

خاتمہ میں "شمالی ہند میں اردو مثنوی" کے ساڑھے سات سو سال کے جائزے کی بازگشت ہے قدیم جدید رنگ پر خام تبصرہ ہے۔ طویل اور مختصر مثنویوں پر حاشیہ آرائی کی ہے اور مثنویوں کو اردو شاعری کا گرانقدر سرمایہ بتایا ہے۔[2]

یہ کتاب اپنے موضوع کے مطابق مثنوی کے ارتقاء کی بہترین تاریخ ہے بعض مقامات پر مثنوی کے تنقیدی اصول میں میر، سودا، اور میر حسن کی مثنویوں کا مختصراً جائزہ پیش کیا ہے۔ لیکن چھٹویں اور ساتویں باب میں تحقیقی جائزے میں زبان و بیان کے علاوہ خیالات کا بھی اعادہ ہو گیا ہے۔

اردو مثنوی کا ارتقاء

ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی

ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی کی تصنیف "اردو مثنوی کا ارتقاء" شمالی ہند میں سنہ [illegible] سے سنہ [illegible] تک دو سو سال کی مثنوی نگاری کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں مصنف

---

[1] اردو مثنوی شمالی ہند میں، گیان چند جین، ص ۲۸۲

[2] ایضاً ص ۶۹۴

ـــہ مثنوی کی تعریف ٹیکنک، موضوعات، خوبیاں و خرابیاں، مثنوی اور دوسرے ہم پلہ اصناف سخن سے موازنہ کیا ہے۔ یہ باب ہر چند کہ مختصر لیکن اہم ہے۔ دوسرا باب مثنوی کی تاریخ فارسی و اردو مثنوی کی ابتداء۔ تمام ادوار برابر کے سیاسی و سماجی پس منظر، شمالی ہند کی مثنویوں میں سودا، حاتم، میر، میر شیر علی افسوس، محبت، میر حسن، مصحفی، انشاء، جرأت، راسخ عظیم آبادی، رنگین، ہدایت، جعفر علی حسرت، مومن اور داغ کی مثنویاں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں دبستان لکھنؤ کی مثنویاں وہاں کا سیاسی و سماجی پس منظر، ادبی اصطلاحات مثنوی پر لکھنویت کا اثر وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے ناسخ، نسیم، نثر، منیر، قلق، محسن، شوق، احسن اور دوسری مثنویوں منجملہ رسوا کی مثنویوں پر سیر حاصل بحث ہے

چوتھے باب میں (الف) مثنوی اور جدید میں نئے خیالات اور نئی تحریکات منجملہ حالی، شبلی، اقبال و حفیظ جالندھری کی مثنوی نگاری پر بحث ہے۔

(ب) میں "مثنوی ترقی پسند دور میں" کے عنوان کے تحت ترقی پسند کیا ہے اور سردار جعفری اور کیفی اعظمی کی مثنوی نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پانچویں باب میں مثنوی میں مقامی رنگ پر بحث کی گئی ہے

چھٹے باب میں مثنوی اور تجربے کے عنوان کے تحت ابتدائی دور سے دورِ جدید تک منجملہ محمد حسین آزاد سے سردار جعفری تک بحث کی گئی ہے۔

ساتویں باب میں کردار نگاری پر بحث کرتے ہوئے المیہ و طربیہ کردار نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور میر محبت، میر حسن، اور مرزا شوق کی کردار نگاری پر بحث کی گئی ہے۔

آٹھویں باب میں مثنوی میں ذوقِ فطری عناصر پر بحث کرتے ہوئے مستقل اور غیر مستقل ہستیاں، جادو اور جادوگر، بزرگانِ دین کی کرامات اور معجزات پر بحث کرتے ہوئے میر، میر حسن، نسیم، اختر، تو ستر، قلق، منیر، شوق، عباس حسین اور فیض اسد خان کی مثنویوں میں ذوقِ فطری عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ان اسباق کی تفصیل ہر چند کہ طول کلامی پر مبنی ہے لیکن اسے اس لئے گوارا کیا گیا کہ قاری کے ذہن ان تمام موضوعات جن کا احاطہ اس کتاب میں کیا گیا ہے تفصیل کے ساتھ آجائیں اور اسے سمجھنے میں آسانی ہو۔

ہر کتاب کی اصل غایت و مقصد کا اندازہ مصنف کے درج ذیل بیانات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"مثنوی نگاروں کی طرز فکر اور ان کی تخلیق کا جائزہ سماجی، سیاسی اور اقتصادی پس منظر کے ساتھ ہی لیا گیا ہے۔ اور اس لئے کسی بھی رجحان یا نئے دور کی ابتداء کے وقت ہر دور کے سیاسی سماجی اقتصادی آسانیوں اور دشواریوں کا تذکرہ ضروری سمجھا گیا ہے صرف فن اور تحقیق کی کسوٹی پر مثنوی نگاروں کو کہیں نہیں پرکھا گیا ہے۔" ؎۱

مصنف کا یہ بیان قابلِ قدر ہے۔ ان حقائق سے چشم پوشی کسی اچھے تنقید نگار کے لئے ممکن نہیں۔ اس مقالے کی ایک دوسری خصوصیت یہ بھی ہے کہ مشہور مثنویوں پر نسبتاً کم لکھا گیا ہے۔ اور چند ایسی مثنویوں کو روشنی میں لانے کی کوشش کی گئی ہے جنھیں عام طور سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک قابلِ قدر کوشش ہے۔

دو سو سال طویل اور اہم دور کو محدود اور مختصر تحریر میں قید کرنا اکثر خامیوں سے چشم پوشی کا سبب رہا ہے۔ لیکن ڈاکٹر سید محمد عقیل کی یہ کاوش قابلِ تحسین ہے کہ انھوں نے یہ کام بغیر کسی شدید لغزش کے پورا کر لیا۔ گیان چند جین کی "اردو مثنوی شمالی ہند میں" کے ساتھ ساتھ یہ کتاب بھی تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ اور اردو مثنوی نگاری کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اردو اکاڈمی اتر پردیش نے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۳ء میں شائع کیا ہے۔

"مثنوی نگاروں کی طرز فکر اور ان کی تخلیق کا جائزہ سماجی، سیاسی اور اقتصادی پس منظر کے ساتھ ہی لکھا گیا ہے۔ اور اسی لئے کسی بھی نئے رجحان یا نئے دور کی ابتداء کے وقت اس دور کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی آسانیوں اور دشواریوں کا تذکرہ ضروری سمجھا گیا ہے۔ صرف فن اور تحقیق کی کسوٹی پر مثنوی نگاروں کو کہیں نہیں پرکھا گیا ہے۔" ؎۲

ہندوستانی قصّوں سے ماخوذ اردو مثنویاں
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تصنیف "ہندوستانی قصّوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" تاریخی، نیم تاریخی

؎۱ اردو مثنوی کا ارتقاء۔ بار دوم۔ ڈاکٹر عقیل رضوی صفحہ ۱۲

؎۲ ایضاً صفحہ ۱۲

اخلاقی، قصوں کی تفصیل کا آئینہ ہے۔ یہ مثنویاں مذہبی روایات اور ہندو مسلم مشترک تہذیب و معاشرت کا نمونہ ہیں۔ یہ کتاب ۴۴۳ صفحات پر محیط ہے اور ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی ہے۔ مقدمہ میں مصنف نے دکن اور شمالی ہندوستان میں لکھی گئیں مثنویوں کا تاریخی خلاصہ پیش کیا ہے۔ اردو کی اوّلین مثنوی دکن میں نظامی کی کدم راؤ پدم راؤ" اور شمالی ہندوستان میں افضل کی "بکٹ کہانی" کو سند مانا ہے مصنف کے مطابق تصنیف کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ثابت ہوتا ہے۔

"اردو مثنویوں کی قدر و قیمت جاننے اور تاریخ ادب میں ان کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا جائزہ تاریخی و معاشرتی پس منظر کے ساتھ لیا جائے۔ اردو ادب نے فارسی سے بہت کچھ لیا۔ اس میں ایرانی اور اسلامی روایات کا رنگ بھی کچھ گہرا ہے۔ لیکن یہ ہندوستان سے بیگانہ محض نہیں ہے۔ اس نے یہاں کے ماحول معاشرت اور تہذیب و تمدن کے اثرات بھی قبول کئے ہیں۔ اردو کی دوسری اصناف سخن کی طرح ہماری مثنویاں بھی اخذ و تحول، اختلاط اور اشتراک کا پتہ دیتی ہے۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ کے بعد یہاں تہذیبی اور معاشرتی سطح پر کارفرما ہے۔ قدیم مثنویوں میں عموماً قصے کہانیاں بیان کی جاتی تھیں۔ جن کا گہرا تعلق قومی روایات، مذہب اور معاشرت سے ہوتا تھا۔ ہماری مثنویاں چونکہ مشترک اور ملی جلی معاشرت کے زیر اثر لکھی گئیں اس لئے اس میں اسلامی قصے کہانیوں کے علاوہ ہندوستانی لوک کتھاؤں اور عوامی روایتوں سے متاثر ہونے کا بھی رجحان پایا جاتا ہے۔" [1]

کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ اوّل حصے کے پہلے باب میں پورا یک قصے "مثنوی" "ل دمن" سے مثنوی "ستیہ وان ساوتری" باب دوم میں قدیم لوک کہانیاں (الف) دکنی مثنویاں ہیں۔ ابتداً "کدم راؤ پدم راؤ" سے کام روپ اور کلا کام تک (ب) شمالی ہندوستان کی مثنویاں جس کی ابتدا "سنگھاسن بتیسی" سے مثنوی ہنس جواہر تک کل ۳۳ مثنویوں کی تفصیل ہے۔ باب سوم میں نیم تاریخی قصے جس کی ابتدا "قصہ راجہ" سے مثنوی سراپا سوز تک کل ۴۴ مثنویوں کا تذکرہ ہے۔ باب چہارم میں ہند ایرانی قصے" کی ابتدا انشاطی کی پھول بن سے گلزار نسیم تک کل تین مثنویوں کے تصوف پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

---

[1] ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ص

مثنویوں کے قصّوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

حصہ دوم صفحے سے شروع ہوتا ہے جس میں اکثر مثنویوں پر ملنے والی تاریخی معلومات مع تفصیل صفحہ اور سطر نمبر نشاندہی کی گئی ہے۔ تصنیف کی اصل خوبی مثنوی کہانیوں سے ماخوذ مثنویوں کا نثری خلاصہ ہے۔

۱۔ مصنف کی یہ کتاب صنف مثنوی پر تحقیق کرنے والے احباب کے لئے زریں معلومات کا ذخیرہ ہے مصنف نے قصّوں کا تاریخی نیم تاریخی ایرانی ادب اور ہندوستانی واقعات کی اصل کو بیان کرتے ہوئے ان کا خلاصہ پیش کیا ہے۔

۲۔ مثنویوں کی تفصیل میں قصّے نثر و نظم میں لکھے گئے کتنے شعراء اور ادباء نے ان قصوں کو کن عنوانات سے لکھا۔ ان کے نسخے ہندوستان اور یورپ کی کن کن لائبریریوں میں موجود ہیں۔ ہر بات پر مفصل معلومات پیش کی گئی ہے۔

۳۔ قصّوں سے ماخوذ مثنویوں کے ہندوستانی واقعات کو اسلامی نقطہ نظر سے کس طرح کن کن عنوانات سے لکھا گیا اس کا اظہار مصنف کی تحقیق اور عمیق نظری کا ثبوت ہے۔

۴۔ مثنویوں کا خلاصہ نثر یا نظم میں ہندوستانی زبانوں کے علاوہ یورپ کی کن کن زبانوں میں کب اور کیسے ہوا یہ معلومات مصنف کی تحقیقی کاوش کا ثبوت ہے۔ واقعات کی وضاحت کے لئے منتخب مثنویوں کا انتخابی نمونہ مصنف کی دیدہ ریزی کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب مثنویوں کی تاریخ، قصّوں کی اصل شعراء اور ادباء کے مختلف اسالیب کا آئینہ دار ہے۔

یہ تصنیف اردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے

مثنوی کا فن اور اردو مثنویاں

نجم الہدیٰ

مثنوی کا فن اور اردو مثنویاں" نجم الہدیٰ کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ۲۳۲ صفحات پر محیط یہ کتاب بہار اردو اکیڈمی کی مالی امداد کا نمونہ ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں مثنوی کے فن سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف نے مثنوی کے فن پر سنجیدگی سے تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ مثنوی کے فن میں

فنکار کو موضوع کے مطابق مثنوی میں واقعات اور کردار کو برتنا چاہئے۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے گاہے بگاہے مصنف نے محققین وناقدین کے خیال سے استفادہ کیا ہے۔ اور تضادات والتباسات کے موڑ پر صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔

دوسرے حصے میں، اردو کی قدیم وجدید مثنویوں کے انتخابی پیکر کو سامنے رکھ کر جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے مثنوی کے صنف کی ماہیت اور وسعت موضوع کے امکانات پر تبصرہ کیا ہے۔ اسی بنا پر کتاب کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ اور مثنوی کی مکمل تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ اسی اغراض کے پیش نظر مصنف نے یہ کتاب لکھی ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مظفر حنفی کی رائے کے مطابق

"اس کتاب میں تمام اہم محققین اور ناقدین کی آراء سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔" [۱]

ریختی

ریختی کو خالص اردو صنف سخن ہونے کا دعویٰ ہے کیونکہ اس صنف میں اشعار کے ذریعہ عورتوں کے محاورات، لب ولہجے، ناز وادا سے عورتوں کی زبان میں اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ اس میں ہوس کے جذبات سے عشق کا اظہار معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ قدیم عہد سے ہندوستانی گیت اور دوہے میں عورت کی طرف سے اظہار عشق معیوب نہیں تھا۔ اردو میں شمالی ہند کے ابتدائی دور میں خسرو کی شاعری اس کا ثبوت ہے۔ لیکن اسے ہم مکمل ریختی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ عندلیب شادانی نے ریختی کی سات خصوصیات لکھی ہیں [۲] جن کو رباعی ترمیم کے ساتھ پانچ اہم خصوصیات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ریختی میں پردہ نشین بیگمات اور خانگیوں کے محاورے اور اصطلاحیں استعمال کرنا جائز ہے۔ اس میں فارسی تراکیب و اضافت سے پرہیز کیا جاتا ہے۔

۲۔ عشق کا اظہار اور اقرار دونوں صورتوں میں عورت کی طرف سے ہونا چاہئے۔ بعض اوقات جذبۂ ہم جنسی میں تحت محبوب عورت ہو سکتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی مرد محبوب ہوتا ہے۔

۳۔ اس صنف میں عورتوں کو امور خانہ داری میں پیش آنے والی باتوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

---

[۱] ۔ وفاحتی کتابیات ۔ جلد اول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ، مظفر حنفی ص۸۹
[۲] ریختی کا تنقیدی ۔ عندلیب شادانی ، مشمولہ تحقیق کی روشنی میں ص ۱۱۱۔۱۱۲

۴۔ عشق ہوس آمیز جذبہ ہے۔ اس لئے اس کے بیان میں فحاشی سے پرہیز کرنا ضروری نہیں ہے۔

۵۔ عورتوں کے لباس، آرائش، زیورات، رسوم اور توہم پرستی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ بیان کسی بھی صنف میں ادا نہیں ہوسکتا۔ مثلاً غزل، قصیدہ، مستزاد، مثنوی وغیرہ۔

اردو میں ریختی کی ایجاد کا دعویٰ رنگین نے کیا ہے۔ لیکن مندرجہ بالا اصولوں کی روشنی میں ہاشمی کی ریختی میں تمام خصوصیات ملتی ہیں۔ یہ عتیق حنفی اسے لکھنؤ کی ایجاد کہتے ہیں۔ اور میر حسن کو اس کا موجد لکھتے ہیں۔[1]

آج کی شاعری میں اس صنف کا رواج نہیں رہ گیا ہے لیکن ساجد ریختی لکھنوی مقیم بھوپال نے اس صنف کی طبع آزمائی کی ہے۔ اس صنف سخن پر درج ذیل کتابیں موجود ہیں۔

۱۔ دکن میں ریختی کا ارتقاء	بدیع حسینی
۲۔ تذکرہ ریختی	سید تمکین کاظمی

تذکرہ ریختی

سید تمکین کاظمی

تذکرہ ریختی سید تمکین کاظمی صاحب کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔ جسے ۱۹۳۰ء میں مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن نے شائع کیا تھا۔ یہ ایک مختصر تذکرہ تھا جو ۲۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ریختی گو شعراء کا یہ تذکرہ اپنے دور میں اردو ادب کے خزانے میں ایک اضافہ ہے۔ قابل مؤلف نے ابتداء میں ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں ریختی کی ایجاد اور ابتداء سے بحث کی گئی ہے ۱۹۳۰ء تک کی دریافت کا حاصل کلام ریختی کی طرز میں لکھنے والا پہلا شاعر ہاشمی بیجاپوری ہے اس شاعر کا ذکر بعض تذکروں میں ملتا ہے۔ دلیل کے طور پر کچھ اشعار پیش کئے گئے ہیں جنہیں ناکافی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ کسی شاعر کو فن کا نمائندہ ٹھہرانے کے لئے دو چار شعر اس کے فنکار ہونے کا ثبوت بحیثیت فنکار پیش نہیں کرسکتے۔

مؤلف کی محنت کا ثبوت اس بات سے ضرور ملتا ہے کہ اس نے تمام شعراء جو ریختی کے چند اشعار رواروی میں کہہ گئے ہیں۔ اور مصنف کو اس کی سن گن مل گئی وہی اشعار پیش کرکے اس فنکار کو ریختی سے منسلک کردیا ہے لیکن کسی فن کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے یہ تنہا کافی نہیں ہے۔

---

[1] دکن میں ریختی کا ارتقاء بدیع حسینی ص ۲ "شعر چیزے دیگر است" عتیق حنفی ص ۱۱۳

مؤلف نے ریختی کی حمایت اپنی پوری صلاحیت کے ساتھ کی ہے، ساتھ ہی یہ مشورہ بھی پیش کیا ہے کہ اس صنف کو فن شاعری میں زندہ اور ادب میں قائم رکھا جائے خیر یہ مشورہ ۱۹۳۰ء کا ہے۔ مصنف نے اسوقت اسے بہتر سمجھا ہوگا۔

کسی کی حمایت یا مشورے سے خارزار گلزار نہیں بن سکتا۔ خواہ اس کی حمایت کرکے گلزار بنانے والے کیسے ہی پاکباز متقی کیوں نہ ہوں۔ ادب میں وہی صنف زندہ رہتی ہے جو اپنے پس منظر سے سوا روشنی پھیلاتی ہے۔

اس تالیف کے سبب کچھ پرانے الفاظ و محاورات جو اپنے دور میں صرف زبانوں تک محدود تھے۔ تحریری نقش بن گئے ہیں۔ اس لحاظ سے زبان سے رنگا رنگی کے شائقین و قارئین کو ان شعراء کی صلاحیت کی داد دینی چاہیے۔ کیونکہ انھوں نے الفاظ و محاورات کو اپنی زبان کے اوزان میں ڈھال کر اشعار میں برتا ہے۔

اس کتاب کے آخر میں ایک مختصر فرہنگ موجود ہے جس میں پرانے الفاظ و محاورات جو زبان زد خاص نہیں تھے۔ تاہم معنی و مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے۔ تاریخی حقائق کا جائزہ لکھنے والا اپنی تحقیق کی بنیاد پر سچ سمجھ کر پیش کرتا ہے۔ لیکن بعد میں کئی باتیں خارج از بحث ہو جاتی ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ کسی بھی ادب یا زبان کے ابتدائی دور میں اس میں رائج اصناف کو بطور یادگار ہی نہیں بلکہ ادب کے مزاج اور ماحول کے معاشرتی اسباب میں بناؤ بگاڑ کا گواہ بن کر زندہ رہنا چاہیئے۔

اس لحاظ سے ریختی کا یہ مختصر اہم تاریخی کارنامہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ کسی زمانے میں ریختی کی تحریک شعراء میں زور پکڑ گئی تھی اور اس وقت معاشرے کا مزاج کن خلاقی بے قدریوں کا شکار تھا۔ اس دور کے ادب پر نظر ڈالنے سے یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ پست اقوام عیش و عشرت کا شکار ہو کر بزدلی اور لفاظ فنکاروں کو جنم دیتی ہے۔

ریختی کی صنف اسی دور کی شاہد ہے۔ نہیں معلوم کیوں مصنف نے اس فن کی وکالت اچھی تاریخ سمجھ کی ہے۔

دکن میں ریختی کا ارتقاء

از بدیع حسینی

بدیع حسینی کا یہ تحقیقی مقالہ ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ اصناف سخن کے روپ میں اردو شاعری

دلکشی رکھتی ہے۔ کیونکہ ان اصناف کے پس پشت تہذیبی، مذہبی، نفسیاتی اور معاشرتی افکار کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

ریختی بھی اردو کی معروف صنف شاعری ہے جو شمالی ہند میں اور جنوبی ہند میں یکساں مقبول تھی۔

زیر نظر کتاب ریختی کے دکنی دور پر محیط ہے۔ بدیع حسینی نے بڑی کاوش اور جانفشانی سے یہ کام کیا ہے۔ کتاب کے ابتدا میں صنف ریختی کی تعریف اور اس کے موضوع کی مفصل وضاحت ہے۔ ریختی کی ابتدائی تاریخ اور اس کے ہندی شاعری سے رشتہ کی بھی کسی حد تک نشاندہی کی گئی ہے جس میں تہذیبی اور لسانی جھلکیاں نظر آتی ہے

۱۔ دکن میں ریختی کے آغاز و ارتقاء پر محققین میں اتفاق رائے نہیں ہے۔ شادانی دکنی ریختی کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ اور تمکین کاظمی کو پہلا دکنی ریختی گو کہتے ہیں۔

۲۔ بدیع صاحب نے لطفی کو پہلا ریختی گو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ تحقیق بھی دلائل کی محتاج ہے۔

مصنف نے بڑی محنت سے یہ ثابت کیا ہے کہ نہ صرف دکنی ریختی کا وجود ہے بلکہ اس کی ایک مستقل تاریخ ہے جو طویل زمانے پر محیط ہے۔

۳۔ مطالعہ کے دوران یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ریختی کی ادبی اہمیت کے باوجود سماجی و ثقافتی اہمیت بھی ہے اور کچھ وجوہات کی بناء پر سماجی اور ثقافتی اہمیت کو علمی نقطۂ نظر کی قدردانی کا احساس مصنف کے دل میں موجود ہے کیونکہ بڑی حسن و خوبی سے سماجی ثقافتی اور اخلاق زندگی سے متعلق معنی خیز نتائج مصنف نے اخذ کیے ہیں۔

۵۔ ریختی کی سماجی اہمیت کے پیش نظر مصنف نے تاریخ کی مدد سے دکن میں ریختی کے تاریخی و سماجی پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔ تاکہ پڑھنے والے کو اس صنف شاعری کی سماجی و ثقافتی اہمیت کو تاریخی پس منظر میں دیکھ کر خود ریختی کی سماجی اہمیت کا اندازہ ہو جائے۔

۶۔ مقالہ نگار نے ریختی کی تہذیبی اہمیت کے پیش نظر اس عہد کے نظریہ حیات، عوامی زندگی، رسم و رواج توہمات اور زندگی سے متعلق چند موضوعات مثلاً پیار و محبت کے رشتے، لباس، نام، زیور، آرائش جمال کی مختلف کیفیات، ساز و موسیقی اور لوازمات و دسترخوان پر روشنی ڈالی ہے۔

۷۔ شعراء کے تذکرے کو دکنی دبستانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) دبستان بیجاپور (۲) دبستان گولکنڈہ دور انتشار اور عہد آصفی ان میں سے بیشتر شعراء حضرات تمکین کاظمی، سخاوت مرزا اور حفیظ قتیل روشناس کروا چکے ہیں لیکن حسینی نے اس میں مزید اضافہ بھی کیا ہے شہباز، ولی ابو فتح شاہ تراب چشتی، گنۃ، نج میراں اور نیازی کو ریختی کے شاعروں کی حیثیت سے پہلی بار روشناس کرایا گیا ہے اور ان کے غیر مطبوعہ کلام کے نمونے پیش کئے ہیں۔

تذکرہ میں شعراء کے تفصیلی حالات نہیں ہیں۔ مصنف نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ اور اس کی معقول وجہ بھی پیش کر دی ہے۔

اس قسم کی کمزوریوں کو نفس موضوع اور اس کی سماجی و تہذیبی اہمیت کے تجزیہ نے دور کر دیا ہے۔ موضوع کا تجزیاتی انداز مصنف کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ لسانی اعتبار سے بھی ریختی ایک مستقل موضوع ہے۔ اور ریختی کا لسانی مطالعہ سماجی لسانیات کا اہم جزو ہے۔

مصنف نے ریختی کی لسانی خصوصیت کو اشارۃً پیش کیا ہے۔ لیکن موضوع کی اہمیت کے پیش نظر کافی نہیں۔ اس کے لئے ایک باب مستقل ہونا چاہیے تھا۔

مجموعی اعتبار سے کتاب تحقیق ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے

ریختی کا تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی خلیل مشیر

ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی مشیر کا مقالہ "ریختی کا تنقیدی مطالعہ" ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ریختی کے ارتقاء کی عہد بہ عہد تاریخ اور فنی خصوصیات کا تذکرہ ہے۔ ریختی کی تاریخ کو سمجھانے کے لئے مصنف کا بیان ملاحظہ کریں۔

"اس مقالہ میں ریختی کی نوعیت اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے تاریخی، معاشی اور سماجی حالات کو سامنے رکھا گیا ہے۔" [۱]

ریختی کی صنف کی خصوصیات اور خامیوں کے علاوہ تنقیدی اور تحقیقی ہے پہلا باب سیاسی اور سماجی پس منظر کے عنوان سے لکھنؤ کے مسلم حکمرانوں کے عروج و زوال کا ذکر ہے خوش حالی کے دور

---

[۱] ریختی کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی مشیر۔ ص

ہیں جاہل اور کاہل قوموں کے مشاغل شوق و ذوق کے لوازمات فکری تبدیلی کے ساتھ اقدار کی تبدیلی کا
ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ان وجوہات اور کمزوریوں کا پیش کیا ہے۔

دوسرے باب میں لکھنؤ میں اردو شاعری کا بیان ہے۔ معاشرہ، ماحول اور مزاج کا جائزہ فراغت
بدحالی دونوں پس منظر میں لیا ہے اسباب اور وجوہات کی بناء پر شاعرانہ خیالات کی تشریح ہے۔
لکھنؤ کی شاعری میں معاملہ بندی اور دیگر اصناف سخن کی مقبولیت کا سبب بیان کیا ہے۔

تیسرا باب ریختی صنف کے لحاظ سے ریختی کی تعریف کی ہے۔

"ریختی اردو شاعری کی ایک مخصوص اور منفرد صنف سخن ہے جس میں عورتوں کی زبان محاورے
اور روزمرہ میں عورتوں کے معاملات احساسات اور جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔" [1]

ریختی کو زوال آمادہ سوسائٹی کے مذاق کا ترجمان لکھا ہے۔" [2]

ریختی کے عیوب اور خامیوں کو معاشرے کی بداعمال کا نتیجہ بتایا ہے۔ ریختی کی زبان کو تصنع اور تکلف
سے تعبیر کیا اور مصنوعی بتایا ہے۔ معاشرے کی کمزوریوں پر گہری نظر رکھ کر ریختی کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

چوتھا باب ریختی کے موضوعات اور اس کا تجزیہ سماجی، اقتصادی اور اصلاحی پہلو کو سامنے رکھ کر
کیا ہے۔ عورتوں کے حالات، معاملات، آرائش جمال کے اسباب عورت کی افتاد طبع، مزاجی کیفیت
اور عام رجحانات ریختی کے موضوعات بتایا ہے۔

لکھنؤ کے ماحول میں عورت کے مقام کو ہر پہلو سے واضح کر کے جنسی بے راہ روی سے ریختی کے وجود
کو برقرار رکھا ہے۔

پانچواں باب ریختی میں عورت۔ چھٹا باب ریختی میں جنسی پہلو۔ ساتواں باب ریختی کا آغاز و ارتقاء
آٹھواں باب ریختی کا آغاز دکن میں ریختی کا تنقیدی جائزہ مصنف کی کاوش کا گواہ ہے۔

دکن میں ہاشمی، عرفی، اور خواصی، اشرف، رحیم اور رحمن، خاکی، لائق، اور قیس کے انتخابی کلام
کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔

نواں باب میں ریختی کا ارتقاء دلی اور لکھنؤ میں رنگین کے ہاتھوں ہوا بتلایا ہے رنگین، انشاء،
ذلیل، بقا، عصمت، نازنین وغیرہ کے کلام کی روشنی میں تنقید کی ہے۔

دسویں باب میں ریختی کے غدر کے بعد لکھنؤ میں ریختی گوئی جس میں تصور، آفاق، نازک، عابد مرزا بیگم

---

[1] ریختی کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی مشیر صفحہ ۱۰۴

[2] " " ایضاً صفحہ ۱۰۵

محسن و عنقا اور رنید وغیرہ کی ریختی گوئی پر عمیق نظری سے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے دیگر مقامات پر ریختی گو شعراء جس میں ثریا و پری بیگم رقاصہ، تمکین، آشوب، راحت، عشرت، شبنم وغیرہ کے کلام پر تنقید کی ہے۔

گیارہویں باب میں ریختی کی زبان کی خصوصیات اور نامانوس الفاظ کی فرہنگ میں عورتوں کی زبان خصوصیات اور خامیوں کو نظر میں رکھ کر تنقیدی تبصرہ کیا ہے۔ الفاظ کے معنی دے کر قاری کو پریشان ہونے سے بچایا ہے۔

بارہواں باب ریختی کا زوال اور اردو ادب میں اس کا مرتبہ میں حالات کی بدلتی ہوئی قدروں اور وقت کے تقاضوں اور شاہان اودھ کے زوال سے ریختی کے زوال کو منسوب کیا ہے۔

"ریختی میں جہاں فحش نگاری ہے۔ وہیں نسوانی جذبات کی صحیح ترجمانی بھی موجود ہے"[۱]

صنف ریختی کی تنقید پر یہ پہلی کتاب ہے جس میں تمام زاویوں سے تنقید ملتی ہے۔ ریختی کا نیا کردار سمجھ میں آتا ہے۔ بدحال معاشرے کے کمزور پہلوؤں کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ ادب سے ریختی کی وابستگی کا سراغ ملتا ہے۔ اس لئے یہ کتاب اصناف کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہے۔

شہر آشوب

شہر آشوب ہیئت کے اعتبار سے غزل اور قصیدوں میں ملتے ہیں۔ لیکن سودا نے اسے مخمس میں لکھنا شروع کیا ہے کے لئے سب سے مقبول وزن بحر یعنی "مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن" ہے۔ شہر آشوب کی ابتدا فارسی میں ایسے قطعات اور رباعیات سے ہوئی جن میں مختلف پیشوں کے لڑکوں کے حسن اور اداؤں کا بیان ہوتا تھا۔ اس کے بعد قطعات یا رباعیات میں مختلف طبقوں کا پیشہ وروں کا ذکر ہمدردی یا تضحیک کے ساتھ [illegible] لگا۔ پھر نظم میں مختلف پیشہ وروں یا معاشرے یا شہر یا عہد کے حال زار اور تباہی کا بیان کیا جانے لگا۔ اردو میں شہر آشوب کی یہ صورت رواج پائی۔[۲] شہر آشوب عمیق حنفی کے مطابق

"شہر آشوب بے ثباتی عالم بربادی و تباہی شہر کا ماتم کرنے کے لئے لکھے جاتے ہیں"[۳]

شہر آشوب میں کسی شہر کی بربادی، معاشرے کی مضحک شخصیات کی بداعمالی کا ذکر عام اور خاص کردار میں پائی جانے والی کمزوریوں کا بیان اور قومی پستی کا ماتم کیا جاتا ہے۔ سودا کے شہر آشوب میں یہ

۱؎ ریختی کا تنقیدی مطالعہ - ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی نمبر ص ۲۹۳ گاہ رسالہ شب خون - جولائی اگست ستمبر [illegible] ص ۳
۲؎ شعر چند نے دیدہ است - عمیق حنفی ص ۱۳۳
ڈاکٹر گیان چند جین

تمام باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

اردو میں شہر آشوب قدماء کے عہد میں زیادہ لکھے گئے۔ میر، سودا، آتش کے شہر آشوب قابلِ ذکر ہیں۔ سودا نے اس فن کو جلا بخشی اور بام عروج پر پہنچایا۔ اور ان پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔

موجودہ عہد میں "سخن آشوب" شمس الرحمٰن فاروقی نے شہر آشوب کی نہج پر لکھا ہے۔ یہ شہرِ سخن کی بربادی کا مرثیہ ہے[1]

اردو میں اس فن پر دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ — ڈاکٹر نعیم احمد

۲۔ شہر آشوب، آغاز، ارتقا، اہمیت — سعداللہ خان

شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ

ڈاکٹر نعیم احمد

شہر آشوب ڈاکٹر نعیم کا مقالہ ہے۔ مصنف نے ۳۴۰ صفحات میں شہر آشوب کی روایت، محرکات، تعارف، تجزیہ، ادبی اہمیت سے بحث کی ہے۔

باب اول میں شہر آشوب کی روایت کا بیان ہے۔ شہر آشوب کی تعریف ترکی فارسی زبانوں میں رائج مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے اردو شہر آشوب کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

"شہر آشوب اردو کی وہ کلاسیکی صنفِ سخن ہے جس میں ہیئت کی کسی خاص پابندی کے بغیر سیاسی معاشرتی اور اقتصادی بحران کی وجہ سے عوام وخواص کی بربادی کا حال بیان کیا گیا ہو۔"[2]

دوسرے باب میں شہر آشوب کی روایت ترکی اور فارسی زبان میں درج ہے۔ اردو شہر آشوب کے تاریخی محرکات کا ذکر ہے۔ اس میں سے ۱۸۵۷ء سے متاثر ہو کر تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، اقتصادی، علمی اور ادبی حالات کا تذکرہ ہے۔ ان حالات کو شہر آشوب کا محرک بتایا ہے۔[3]

باب سوم میں ۱۸۵۷ء سے قبل کے شہر آشوب کا بیان ہے۔ میر جعفر زٹلی، محمد شاکر ناجی، درگاہ قلی خان، اشرف علی خان فغاں، سودا، غلام حسین ہدایت، حاتم، شیخ ظہوری، شاہ آیت اللہ جوہری، قیام الدین قائم، حکیم کبیر احمد جعفر علی حسرت، نواب آصف الدولہ، شاہ کمال الدین کمال، میر تقی میر، شیخ غلام علی راسخ،

---

[1] شعر غیر شعر اور نثر، شمس الرحمٰن فاروقی ص ۱۲۳
[2] شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ۔ ڈاکٹر نعیم ص ۱۱۱
[3] ایضاً ص ۱۶

شیخ غلام علی ہمدانی مصحفی، ولی محمد نظیر، سعادت یار خاں رنگین، میر یار علی جان صاحب، محمد جعفر راغب، رائے پچھمی نارائن شفیق، میاں حاجی تجلی، بہادر شاہ ظفر وغیرہ کے شہر آشوب پر تنقیدی بیان ہے۔

۱۸۵۷ء کے شہر آشوب میں امان علی سحر، محمد رضا برق، الطاف حسین حالی، بہادر شاہ ثانی ظفر، محمد ظہور ظہور، سید عنایت علی خاں عاقل، میر مہدی مجروح، سید اسمٰعیل حسین منیر، وجاہت حسین وجاہت کے شہر آشوب پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس باب میں جو انتخاب دیا ہے وہ مصنف کی وسعت نظر کو بتاتا ہے۔

باب چہارم میں شہر آشوب کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل اور ۱۸۵۷ء سے متعلق مادوں میں سماجی خلفشار، تہذیبی بے راہ روی، معاشرتی پستی، معاشی بدحالی، شاہی گھرانوں، غریب عوام تک کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ہر طبقے کے لوگوں کا حال، شاہ و گدا، طبیبوں، نجومیوں، فنکاروں، مصاحبوں، پیشہ وروں، سوداگر، مہاجن، شاعروں، رقص و نغمہ کے ماہروں، مذہبی رہنماؤں، مولوی، علما، پیشہ وروں کو اپنی اجرت کی وصولی میں طاقتوں کا استعمال کرنا، شہر کی تباہی و بربادی پر شہر آشوب سے منتخب بیانات اخذ کر کے لوگوں کی حالت زار کا سراغ لگایا ہے۔

باب پنجم میں شہر آشوب کی ادبی اہمیت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

"شہر آشوب زندگی پر تبصرہ بھی ہے اور تنقید بھی۔ یہ نظمیں خیال آرائی کا نتیجہ نہیں بلکہ معاصر دور کے حالات کی تخلیق ہے۔ اس لئے یہ صنف سخن اپنے دور کی عکاس ہے۔"[۱]

شہر آشوب میں پیشوں کی رعایت سے الفاظ کا جو استعمال ہوا ہے وہ اردو میں صرف اسی صنفِ سخن کی خصوصیت ہے۔"[۲]

"شہر آشوب کا مطالعہ ایک اور اعتبار سے بہت اہم اور دلچسپ ہے۔ ان شعراء نے محاورات کا کافی استعمال کیا ہے۔"[۳]

شہر آشوب میں انسانی ذہن کے ان جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے امکانات سب سے زیادہ ہیں عام انسانی ہمدردی، خلوص، ذہنی و جذباتی ہم آہنگی اور مختلف طبقات کے مشترک مقاصد پر زور دیئے جانے کی وجہ سے اس کی جڑیں قومی اور عمومی جذبات کی سرزمین تک پیوست ہیں۔ اور یہ زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہے۔"[۴]

یہ کتاب شہر آشوب کی تاریخ و محرکات کے علاوہ ادبی اہمیت پر اہم مواد فراہم کرتی ہے۔ شہر آشوب

۱؎ شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ۔ ڈاکٹر نعیم ۔ صفحہ ۴۷۲
۲؎ ایضاً ص ۴۸۴
۳؎ ایضاً ص ۲۷۶
۴؎ شہر آشوب کا تحقیقی مقالہ۔ ڈاکٹر نعیم صفحہ ۴۹

کو ماحول کا عکاس بتا کر موجودہ عہد کے فنکاروں کو بھی دعوتِ فکر دیتی ہے۔ صنف شہر آشوب پر سب سے پہلے ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک مفصل مضمون ملتا ہے۔ اور کوئی مقالہ نہیں لکھا گیا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضمون کی روشنی میں فاضل مقالہ نگار نے اپنے مقالہ کی اساس رکھی ہے۔ اس سے روشنی اور راہ ملی ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ اس سے ہماری ادبی و تہذیبی تاریخ کو ٹھیک طور پر سمجھنے میں مدد ملے گی۔"

یہ حقیقت ہے کہ اس کا مطالعہ اس عہد کی تاریخ کو پیشِ نظر کر دیتا ہے اور اس دور کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔

شہر آشوب آغاز، ارتقاء، اہمیت

ڈاکٹر سعد اللہ

ڈاکٹر سعد اللہ کی تالیف "شہر آشوب" موضوع کے آغاز، ارتقاء اور اہمیت پر ایک تحقیقی مقالہ ہے۔

مقالہ نگار نے مقدمہ زبان، ادب، اور زندگی کو ایک دوسرے سے قریب ثابت کیا ہے۔ اقسام ادب میں نظم و نثر اور ان سے منسلک اصناف کا تذکرہ کرتے ہوئے شہر آشوب کی صنف کی تحقیق اور ضرورت پر بحث کی ہے۔ تعارف شہر آشوب، وجہ تسمیہ، مختلف مفہوم، ابتدائی، وسطی اور موجودہ مفاہیم پر دیگر زبانوں سے تقابلی تجزیہ کیا ہے۔

شہر آشوب کا آغاز فارسی زبان میں بتا کر مسعود سعد سلمان کو موجد شہر آشوب لکھا ہے۔ ان حالاتِ زندگی کے ساتھ انتخاب قطعات، شہر آشوب، مثنوی کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں۔ فارسی شہر آشوب نگاروں کے حالات اور انتخاب نام بنام درج کئے ہیں۔ ترکی شہر انگیز، اور عربی شہر آشوب پر مختصر تبصرہ بھی قلمبند کیا ہے۔

اردو میں "شہر آشوب" کو مقالہ نگار نے چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور وفات عالمگیر ۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء اس دور میں شہر آشوب سلطنت مغلیہ کے دورِ زوال کا تاریخی پس منظر ہے اور ادب میں شہر آشوب کا بانی جعفر زٹلی کو ثابت کیا ہے۔ اس دور میں جعفر زٹلی سے میرؔ، سوداؔ، جعفر خاں احسنؔ، اور کچھ نامعلوم شہر آشوب کا انتخاب پیش کیا ہے۔ اس دور میں سوداؔ کے شہر آشوب کو سراہا ہے۔

دورِ دوم میں ۱۸۵۷ء کی تاریخ، زوال اور اسباب پر تفصیل سے تبصرہ کرتے ہوئے غدر کے زمانے اور دہلی

لکھنؤ میں اس صنف میں لکھے گئے معروف شعراء کے منتخب شہر آشوب کی جھلکیاں نقل کی گئی ہیں جن میں آزردہ، افسردہ، عزیز، عیش اور حقانی قابلِ ذکر ہیں۔

دورِ سوم میں غدر کے بعد ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء سے آج تک چہارم دور کے شعراء کی نظمیں، غزلیں، رباعیات، قطعات، تصانیف، اخبار اور رسائل سے اخذ کرکے نقل کیا ہے۔ ہر دور میں شاعر کا تعارف، مختصر حالات اور چند خصوصیات پر مقالہ نگار کی توجہ اور کاوش کا ثبوت ہیں۔

مذکورہ مقالہ میں درج ذیل باتیں قابلِ توجہ ہیں۔

۱۔ مقالہ نگار کا ۷۰، ۸۰ صفحات پر مشتمل فارسی شہر آشوب نگاروں کا انتخاب اور تفصیلات اردو شہر آشوب کے آغاز و ارتقاء اور اہمیت کے بیچ غیر ضروری ہے۔

۲۔ فرقہ وارانہ فسادات پر واقعاتی نظمیں، قطعات، رباعیات کی شمولیت مقالہ نگار کی تحریر کردہ شہر آشوب کی تعریف کے تقاضوں کے موجب نہیں ہے۔

ذیل کے شعراء کا انتخاب شاہد ہے۔

کیفی اعظمی، سکندر علی وجد، مجاز، ڈاکٹر منیب الرحمٰن اور سیماب وغیرہ

۳۔ مصنف کا قول ہے۔

"اردو شاعری کی نشو و نما کے ساتھ اردو شہر آشوب کا آغاز ہوا، اور اس دور کے تقریباً ہر قابلِ ذکر شاعر نے شہر آشوب لکھا ہے"[1]

اس قول کے مطابق مقالہ نگار نے ذیل کے شعراء کو نظر انداز کیا ہے۔ یا ان شعراء نے شہر آشوب کو مشقِ سخن نہیں بنایا۔

نصیر، انشاء، ناسخ، اور جلیل وغیرہ

اکثر کتابت کی غلطیاں مفہوم کو متاثر کرتی ہیں اور کتابت کی افادیت کو مجروح کرتی ہیں۔

فہرست مضامین

موجودہ شہر آشوب غلط ہے۔	لکھا ہے موجد شہر آشوب
ص۳ فتنہ چنگیز خانی	چنگیزی
ص۴ صف	صنف

---

[1] شہر آشوب۔ آغاز۔ ارتقاء۔ اہمیت۔ ڈاکٹر اسعد ارشد ص۳

ص۵۶۹ اہل حرف وصنعت	اہل حرفت وصنعت
ص۵۷۲ ناطق گلاوٹھوی ش ۱۲ ع ۱ دس پنج	دس پانچ
ص۵۷۳ ڈاکٹر سعید اللہ خاں ش ۱۱ ع ۱ اوس	اس
ص۵۷۳ سطر ۱۲ نقادوں سے عام	نقادوں سے عوام
ص۵۷۵ ساحر ش ۱۲ ع ۱ اس	اسی
ص۵۷۶ بڑا اب دان	بڑا ابلی دان
ص۵۷۸ تحسین بیدل ش ۱۲ ع ۲ پڑگئی	پڑگئی

خسرو پر مقالہ نگار کا ذیل کا بیان مبالغہ آرائی کا شکار ہے۔

"وہ مثنوی میں نظامی، قصائد میں ظہیر فاریابی اور غزل میں سعدی کے ہم پلہ مانے جاتے تھے۔"

ان خامیوں کے باوجود "شہر آشوب" ایک مبسوط تحقیقی مقالہ ہے۔ شہر آشوب کی تاریخ کا تنقیدی نیز تحقیقی اہمیت کا حامل ہے۔ شہر آشوب کے مطالعہ میں مددگار اور معاون ہے۔

رباعی

رباعی قدیم صنف ہے۔ ہر شاعر نے اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس صنف کی ایجاد ایران میں ہوئی اور ایرانی اس صنف کو رودکی کی ایجاد کہتے ہیں اس کو ترانہ یا دوبیتی بھی کہتے ہیں۔[1]

رباعی میں عام طور پر چار مصرعوں کے سلسلے سے ایک مضمون بیان کیا جاتا ہے۔ ہر مصرعہ دوسرے مصرعے سے مربوط رہتا ہے۔ تیسرا مصرع بغیر ردیف و قافیہ کا ہوتا ہے باقی پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں ردیف اور قافیہ لازم ہے۔ یا صرف قافیہ کا استعمال بھی دوسری صنفوں کی طرح جائز سمجھا جاتا ہے۔

خواجہ نظام حسن قطان نے رباعی کے لئے اوزان مقرر کر دیا ہے۔ ان اوزان کے دائروں کی ترتیب کے تحت بحر ہزج کے سوائے رباعی کسی بحر میں رباعی تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ حالانکہ بحر ہزج مثمن سالم کے دو اوزان یعنی اخرب واخرم کے علاوہ اسی بحر کے دوسرے اوزان میں کئی شعراء کی رباعیات ملتی ہیں۔ لیکن عروضیوں نے انھیں رباعیاں تسلیم نہیں کیا۔ بحر ہزج سالم

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن۔

---

[1] شہر آشوب۔ ڈاکٹر سعید اللہ [illegible] شعر حصہ دیگر [illegible] تحقیق نمبر ۱۱ کلکتہ جامعہ

اسی وزن کی بنیاد پر رباعی کے لئے دس ارکان نکالے گئے اس میں ایک رکن مفاعیلن سالم ہے ور باقی ۹ ارکان زحافات کے ساتھ مستعمل ہیں۔

دس ارکان درج ذیل ہیں۔

۱۔ مفاعیلن ۲۔ مفاعلن ۳۔ مفاعیل ۴۔ مفعولن ۵۔ مفعول ۶۔ فعول ۷۔ فاعلن ۸۔ فعل ۹۔ فاع ۱۰۔ فع۔

یہ ارکان اپنی ترتیب سے رباعی کے ۲۴ اوزان بناتے ہیں ان میں ہر ایک وزن مربع الارکان ہوتا ہے یعنی چار رکن پر مشتمل ہوتا ہے۔

نجم الغنی کا خیال ہے "اگر رباعی کے ان ۲۴ اوزان پر ترتیب کی الٹ پھیر سے اوزان نکالے جائیں تو بیاسی ہزار نو سو چالیس اوزان ہو سکتے ہیں" [۱]

اردو ادب میں رباعی کی ابتدا دکن سے ہوئی ہے۔ ولی اور سراج سے پہلے بھی اس صنف کے نمود خال نظر آتے ہیں۔ متقدمین میں میر سودا' انشا' اور مصحفی کے علاوہ کئی شعرا نے رباعی پر طبع آزمائی کی ہے۔ یہ صنف فنکاروں کے لئے ایک چیلنج ہے۔ بعض شعرا نے محض اپنی استادی منوانے کے لئے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔

لکھنؤ میں میر انیس کی رباعیات قابل ستائش ہیں۔ دکن میں امجد حیدر آبادی نے بھی رباعیات میں شہرت حاصل کی ہے۔ جوش اور فراق کے یہاں بھی رباعیات ملتی ہیں۔

رباعیات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

۱۔ اردو میں رباعیات	ڈاکٹر سلام سندیلوی
۲۔ اردو رباعی	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
۳۔ رباعی	نگار کا اصناف ادب نمبر

اردو رباعیات

ڈاکٹر سلام سندیلوی

ڈاکٹر سلام سندیلوی کی کتاب "اردو رباعیات" صنف رباعی کی منظم تاریخ ہے۔ موصوف کے بیان کے مطابق۔

---

[۱] بحر الفصاحت ۱۹۲۳ء لکھنؤ صفحہ ۲۸۱

"اس مقالہ میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ان تمام مشہور شعراء کی رباعیات مختلف ادوار کی ترتیب سے شامل کر دی جائیں جنہوں نے رباعیاں کہی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مقالہ رباعی گو شعراء کی رباعیات کا محض مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ رباعی کی ایک مسلسل اور مربوط تاریخ بھی ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رباعی اپنے ابتدائی دور میں کس شکل میں تھی، اس کے بعد اس کا کس طرح بتدریج ارتقاء ہوا۔ اور کس طرح اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اور اب موجودہ دور میں رباعی میں کون سی قدریں پائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ ایسے شعراء شامل ہو گئے ہیں جنہوں نے رباعی میں کوئی نمایاں کام نہیں کیا ہے۔ لیکن اگر ان کو مقالہ سے خارج کر دیا جاتا تو ایک تاریخی خلاء واقع ہو جاتا۔ اس لئے ان کی شمولیت ناگزیر تھی۔"[1]

مصنف نے باب اوّل میں رباعی کی ایجاد پر روشنی ڈالی ہے۔

باب دوّم میں فارسی شعراء کی رباعیات پر بحث کی ہے۔ رباعی کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کر کے پہلے دور میں دکنی اور شمالی ہند کے متقدمین شعراء کی رباعیات کو جمع کیا ہے۔ اور ان کی رباعیات کی خصوصیات اور خصوصیات پر باب سوم میں تبصرہ ہے۔

باب چہارم میں دور متوسط اور دور متاخرین کے شعراء کی رباعیات کو شامل کیا ہے۔ اس میں دہلی اور لکھنؤ دونوں علاقوں کے شعراء شامل ہیں۔ اس ذیل میں لکھنؤ کے مرثیہ گو شعراء بھی آ گئے ہیں۔

باب پنجم میں دور جدید کے شعراء کی رباعیات پر تبصرہ ملتا ہے۔ لیکن اس میں دور جدید کے تمام شعراء کی رباعیات نہیں ہیں۔ جن شعراء نے رباعی کے فن کو ترقی دی ہے ان شعراء پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے مصنف کے قول کے مطابق رباعی کی صنف اس عہد میں چمکی ہے۔

باب ششم میں رباعی کے فن پر تفصیل سے تبصرہ کیا ہے۔ جس میں علم عروض، رباعی کی بحر، زحافات، تقطیع سے بحث کرنے کے بعد رباعی کی مشکلات، مصرعوں کی ترتیب، زبان اور اس کے طرز بیان پر روشنی ڈالی ہے۔

باب ہفتم میں رباعی کے موضوعات سے بحث کرتے ہوئے مشہور رباعی گو شعراء کے مضامین کے نکات کو واضح کیا ہے۔ ان مضامین کے تفصیل بیان کو مذہبی، اخلاقی، فلسفیانہ و صوفیانہ، عشقیہ و خمریہ، سماجی تصورات، سیاسی خیالات اور شخصی و سوانحی حالات جیسے موضوعات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے

---

[1] اردو رباعیات۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی صفحہ ۹ دیباچہ

باب ہشتم میں اردو رباعی کی وسعت سے بحث کرتے ہوئے اسے شاعری کی ایک شاخ ثابت کیا ہے۔ آخر میں اردو رباعی کی مقبولیت اور اس کے مستقبل پر تبصرہ کیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں ہر دور کی ادبی خصوصیات اور ادبی ماحول کے پیش نظر حسب ضرورت شعراء کے حالات زندگی کا جائزہ لیا ہے۔

اردو میں پہلی بار رباعی کی ایجاد فنی لوازم، دوسرے اصناف کے مقابلے میں رباعی کی امتیازی خصوصیات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اور رباعی کے امکانات سے بحث ہے۔ اس بنیاد پر یہ کتاب اردو ادب میں صنف رباعی پر گراں قدر اضافہ ہے۔

اردو رباعی (فنی و تاریخی ارتقاء)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحقیقی کاوش "اردو رباعی (فنی و تاریخی ارتقاء)" ۲۵۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ

"تو مجھے "اردو رباعی" کے عنوان پر مقالہ جمع کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس طرح جو کام میں نے ۱۹۵۶ء میں شروع کیا تھا۔ اس کو جنوری ۱۹۵۸ء میں مفصل و منظم طریقہ سے ترتیب دینے کا موقع مل گیا۔"[1]

رباعی کے فنی لوازم، خصوصیات کے ذیل میں مفہوم کی وضاحت کے ساتھ رباعی کی صنف کا مقابلہ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، مستزاد، دوبیتی وغیرہ اصناف سے کیا ہے۔ تقابلی تنقید سے مصنف کی رائے کا اندازہ ہوتا ہے۔ رباعی پر مختلف شعراء کی آراء سے بحث کی ہے۔ رباعی کی وجہ تسمیہ، اوزان بحر سے تاریخی معلومات ملتی ہے۔

مقالہ نگار نے "فارسی رباعی آغاز و ارتقاء" فارسی ادب میں رباعی کی ابتداء اور تاریخ اس کے ذیل میں آنے والے موضوعات و اسباب اور رباعی نگار شعراء پر تبصرہ کیا ہے۔ "اردو رباعی اور دکنی شعراء" میں اردو رباعی کا آغاز دکن سے ثابت کیا ہے۔ محمد قلی قطب کو پہلا رباعی نگار، ولی دکنی اور سراج کا تذکرہ کیا ہے۔ "شمالی ہند میں اردو رباعی کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے پہلے تک" کے زیر عنوان دبستان دلی میں درد سے بیان تک، دبستان لکھنؤ میں آتش سے انشاء تک رباعی کے فن پر مواد پیش کیا ہے۔

[1] اردو رباعی (فنی و تاریخی ارتقاء) ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص دیباچہ

رباعی کا اہم دور غالب' ذوق' ظفر' انیس اور دبیر تک کے عہد کو بتایا ہے۔ اور مومن کی رباعیات کی خصوصیات پر تنقیدی تبصرہ ہے۔ "اردو رباعی کا دور جدید ۱۸۵۷ء سے پہلی جنگ عظیم تک" کے باب میں حالی' اکبر' اسماعیل' مجروح' شاد' امیر' پیارے صاحب رشید' داغ' سرور' ریاض' شوق' نظم طباطبائی' چکبست' عزیز کی رباعی نگاری کا جائزہ سلجھے ہوئے انداز میں کیا ہے۔ "اردو رباعی پہلی جنگ عظیم کے بعد" اس باب میں فانی' جوش' اور ان کی رباعیات کی مقبولیت و خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔

امجد حیدرآبادی' فراق کی رباعی نگاری پر تفصیل سے تبصرہ کیا ہے۔ جگت لال رواں' تلوک چند محروم' سیماب' دل' آغا قزلباش' حامد حسن قادری' اثر' شاد' اخگر' جذب' الہام' اثر صہبائی' صفیہ شمیم کی رباعیات پر تحقیقی مواد پیش کیا ہے اور رباعی کی اہمیت اور مستقبل کے بارے میں پر امید ہیں۔

رباعی کی صنف پر موصوف کا بیان قابل ذکر ہے۔

"رباعی کا اردو شاعری پر یہی سب سے بڑا احسان ہے کہ اس نے اردو شاعری کے عام لب و لہجہ کو سنجیدہ بنانے میں مدد دی۔"[۱]

یہ کتاب رباعی کی مکمل اور مختصر تاریخ ہے۔ رباعی پر کام کرنے والے طلباء کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔"

قصیدہ

ادب میں قصیدہ کی صنف اہم ہے۔ قصیدہ اصطلاحاً اشعار کا وہ مجموعہ ہے جس میں شخص مدح سرائی یا ہجو کی جائے۔ پند و نصیحت' تعریف اور شکایت بھی کی جاتی ہے۔ اس میں اشعار کی تعداد پر کوئی قید نہیں۔ لیکن غزل کی طرح پورے قصیدہ میں ردیف اور قافیہ کی پابندی شرط ہے۔ تمہید میں کچھ اشعار کے ذریعہ ممدوح کی مدح سے پہلے موسم بہار کی منظر کشی یا عشق و محبت یا کوئی اور موضوع پر مشتمل اشعار لکھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد خوش اسلوبی سے مقصد کا اظہار کیا جاتا ہے۔

خطابیہ قصیدے میں ابتدا سے مدح یا ہجو وغیرہ سے اصل مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ اس میں تمہید نہیں ہوتی۔ قصیدہ میں چار چیزیں اچھی ہونی چاہئے۔

(۱) مطلع کہ سامع سن کر خوش ہو جائے۔ اور اس قدر محظوظ ہو کہ باقی اشعار سننے کی خواہش پیدا ہو۔

۱۔ اردو رباعی "فنی و تاریخی ارتقاء" ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۲۵

(۲) قصیدہ کا گریز اچھا ہو۔ کیونکہ دو مختلف مضامین میں ربط پیدا کرکے موضوع کی طرف بڑھنا آسان بات نہیں ہے۔

(۳) حسن طلب یعنی کسی چیز کی طلب یا خواہش میں شاعر کو عزتِ نفس کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ اسلوب میں تشبیہ، استعارے اور دیگر صنعتوں کے سہارے جادو بیانی کی صفت ہونی چاہئے۔ تاکہ ممدوح قصیدہ نگار کی حاجت روائی پر مجبور ہو جائے۔

(۴) مقطع بہت عمدہ ہو۔

قدیم دور میں اکثر قصیدے حرف ردیف سے مشہور ہوئے۔ مثلاً قصیدہ کا حرف آخر اگر کاف ہے تو کافیہ، لام ہو تو لامیہ۔ بعض قصیدے مضمون سے مشہور ہوئے۔ جیسے مدحیہ، فخریہ، عشقیہ وغیرہ۔

قصیدہ نگاری میں شاعرانہ قابلیت علمی لیاقت کو بڑا دخل ہے۔ کیونکہ اس کے اسلوب میں الفاظ کی شان و شوکت، تشبیہ و استعارہ، صنائع و بدائع، مبالغہ اور علوم و فنون کی اصطلاحیں مضامین کے زیر اثر پروان چڑھتی ہیں۔

قصیدہ کی صنف عرب کی دین ہے لیکن اردو ادب میں ایران سے اپنی تمام روایت کے ساتھ آئی ہے۔ اس لئے عرب کے قصائد کی سادگی اور دعائیہ کلمات اس میں رائج نہیں ہوئے۔ بلکہ ایران کی مبالغہ آرائی اور اسلوب کی گل کاریاں اس میں در آئی ہیں۔ ہمارے یہاں قصیدہ گوئی کا آغاز گولکنڈہ کے محمد قلی قطب شاہ کی قصیدہ گوئی سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن دکنی دور کے یہ قصائد مشہور نہ ہوئے۔

شمالی ہند میں سودا کے عہد میں قصیدہ کا عروج نظر آتا ہے۔ سودا نے ہر میدان میں اشہب قلم دوڑایا ہے۔ اس کے وہاں حمد و نعت، منقبت و مدح، ہجو، شہر آشوب سب ہیں۔ مدحیہ قصیدوں کے بہت اچھے شاعر تھے۔ لیکن ہجو کی مقبولیت سے یاد ثابت ہوئی۔ سودا کو زور بیان میں لفظی تشبیہ و استعارے کے ذریعہ واقعہ نگاری میں مضمون آفرینی میں ملکہ بھی حاصل تھا۔ ان کے بعد انشاء اللہ خاں انشاء زباندانی کی صلاحیت کی بنا پر عربی، فارسی، ترکی اور پشتو سب زبانوں کے الفاظ برتتے تھے۔ ان کے قصائد سخت زمینوں میں ہیں۔ انشاء کے بعد ذوق نے قصائد میں شہرت حاصل کی۔ ان کے یہاں قصیدہ فطری سادگی سے نہیں بلکہ پر تکلف، پُر شکوہ عبارت ہے ان کے یہاں الفاظ کی شان و شوکت سے خوبصورت تراکیب، چست بندشیں، تشبیہ و استعارے، مبالغہ آرائی جیسی صنعتیں عام ہیں۔

ذوق کے دور میں مومن اور غالب نے بھی کچھ قصائد کہے ہیں۔ غالب کی جدت پسند طبیعت نے قصیدہ کو نیا رنگ دیا۔ بعد کے دور میں منیر، امیر، داغ، جلال کے قصائد ملتے ہیں۔ لیکن قصائد میں سودا اور ذوق کے بعد کسی کو شہرت نہیں ملی۔ ہجویہ قصائد میں شہر آشوب کی بنا پر سودا مشہور ہیں۔

قصیدہ کی صنف ملوکیت کے ماحول میں ترقی پذیر ہوتی ہے۔ اس میں سلاطین کی مدح بیان کی جاتی تھی قصیدہ نگار کو انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا۔ عصر حاضر میں وہ باتیں کہاں؟

اردو ادب میں اس صنف پر درج ذیل کتابیں ہیں۔

۱۔ اردو میں قصیدہ نگاری	جلال الدین
۲۔ اردو میں قصیدہ نگاری	ڈاکٹر ابو محمد سحر
۳۔ اردو میں قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر محمود الٰہی

اردو میں قصیدہ نگاری

Hasnain Sialvi

ڈاکٹر ابو محمد سحر

ڈاکٹر ابو محمد سحر کا یہ مقالہ ۱۹۵۸ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ۴۲۱ صفحات پر محیط ہے۔ جو ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ قصیدہ کی صنف پر یہ کتاب جامع تاریخ ہے جس میں قصیدہ کے فن کی تاریخ مندرجہ ذیل درج ہے لکھا ہے۔

"قصیدہ کی تنقید و تاریخ پر اپنے طرز کی اس پہلی کتاب کو چونکہ پڑھنے والوں کے ایک وسیع حلقے کے لئے دلچسپ اور کارآمد بنانا مقصود تھا۔ اس لئے اس کا لحاظ رکھا گیا تھا کہ حجم حد سے تجاوز نہ کر جائے دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ قصیدہ کے متعلق تمام اہم باتیں اس میں سمٹ جائیں۔"[1]

مصنف نے دیباچۂ دوم میں لکھا ہے۔

یہ کتاب انیس قصیدہ نگاروں کے جائزے پر مشتمل ہے جو قصیدہ کے تنقیدی و تاریخی مطالعہ میں نتیجہ خیز تھے۔[2]

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو مصنف نے قصیدے کی تعریف سے لے کر عناصر ترکیبی، قصیدے کی اقسام اور دیگر امور پر بحث کی ہے۔ قصیدہ کے ایک عنصر تشبیب پر ذیل کا بیان

---

[1] اردو میں قصیدہ نگاری ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ (دیباچہ طبع دوم ص)

[2] ایضاً ص ۶

قابلِ غور ہے۔

"دراصل قصیدہ کا یہی وہ حصہ ہے جس سے اس کے دائرہ عمل میں وسعت اور تنوع پیدا ہوتا ہے"[۱]

مصنف نے صنف قصیدہ کی حیثیت کو واضح کرنے کے ساتھ پس منظر میں عہد قدیم کے دکنی قصائد کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس بحث میں دکن کے اہم قصیدہ نگاروں کا انتخاب قابل ستائش ہے۔ سودا اور ان کے معاصرین انشاء، ور مصحفی کا زمانہ ذوق اور ان کے معاصرین منیر اور امیر کا زمانہ میں ہر شاعر کے انتخابی اشعار پر مبنی تنقید کی ہے۔ جو خامیوں اور خوبیوں کا آئینہ ہے۔ سودا پر یہ بیان قابل غور ہے۔

"کہیں کہیں تعقید اور ژولیدہ بیانی کھٹکتی ہے۔ لیکن یہ ایک جزوی نقص ہے۔ سودا نے قصیدہ گوئی میں غیر معمولی قدرت و مہارت حاصل کی ہے۔ انھوں نے مختلف النوع مضامین، معاشرتی و ملکی حالات اور تاریخی واقعات کو قصیدہ میں داخل کر کے اس کو وسعت و ہمہ گیری عطا کی اور اردو میں قصیدہ گوئی کا ایک اعلیٰ معیار قائم کر دیا"۔[۲]

ذوق پر لکھا ہے۔

ذوق نے قصیدہ گوئی میں کوئی خاص جدت نہیں کی۔ بلکہ عموماً سودا کے قائم کئے ہوئے راستے پر چلتے رہے۔ لیکن ان کا فن تقلیدی ہونے کے باوجود صناعی اور فنکاری کا ایک کامیاب نمونہ ہے"۔[۳]

دور جدید کے قصیدہ نگاروں میں اسمٰعیل میرٹھی، حالی، عزیز، اقبال، سہیل، نجم آفندی، شفیق جونپوری کا ذکر ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی، حالی اور اقبال پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ قصیدہ کی تاریخی و ادبی حیثیت میں حالی کے قصیدے پر تنقیدی خیالات کا تجزیہ کرتے ہیں۔

"قصیدے کو صحیح طور پر اس زمانے کی شاعرانہ روایات، مذہبی اعتقادات سماجی شعور اور معاشی تقاضوں ہی کے پس منظر ہی میں سمجھا جا سکتا ہے جس میں اس کی ابتدا اور ترقی ہوئی"۔[۴]

مصنف کا یہ بیان بے لاگ تنقید کا آئینہ ہے۔

"قصیدہ ایک مخصوص سماج کی پیداوار اور محدود طبقہ کی میراث تھا۔ سماجی اور ادبی تبدیلیوں کے ماتحت اس کا ختم ہونا یقینی تھا۔ اس کا خاتمہ خود اس کی اقسام اغراض و مقاصد اور حدود و امکانات پر ایک بہت بڑی تنقید ہے"۔[۵]

---

[۱] اردو میں قصیدہ نگاری ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ صفحہ ...
[۲] ایضاً
[۳] ایضاً
[۴] اردو میں قصیدہ نگاری ڈاکٹر ابو محمد سحر صفحہ ...
[۵] ایضاً

یہ کتاب قصیدہ کے فن کو سمجھنے اور جانچنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہم قصیدہ کی تاریخ سے صرف واقف ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کی فنی باریکیوں اور خوبیوں سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو جاتے ہیں۔ لہذا موجودہ عہد میں قصیدہ کے فن کو سمجھنے اور اس کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

اردو میں قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر محمود الہی

"اردو میں قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ" ڈاکٹر محمود الہی کی اہم تصنیف ہے۔ اپنے پیش لفظ میں وہ یوں رقمطراز ہیں۔

"آج سے کوئی پندرہ سال پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مجھے اس مقالے پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری عطا کی۔ اسی وقت سے میں اس کی اشاعت کے لیے فکر مند تھا۔ مگر علمی اور تحقیقی مقالوں کی اشاعت میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان پر قابو پانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔" [۱]

آٹھ ابواب پر مشتمل مقالے کے پہلے باب میں قصیدہ کی اصطلاح مختلف مفہوم عربی و فارسی ادب کی روشنی میں رائج مفہوم سے اردو ادب کی مفہوم کی وضاحت سے ذیل کا نتیجہ نکالا ہے۔

"قصیدہ موضوعات کے لحاظ سے اپنی وسعت کے باوجود ایران اور ہندوستان میں تنگ دامن رہا۔" [۲]

قصیدہ کے ارتقاء پر جامع تبصرہ اور تنقیدی جائزہ اس باب کا اصل منشاء ہے۔

تیسرا باب اردو قصیدہ کا ابتدائی دور دکن میں قصیدہ نگاری کی ابتدا و ارتقاء کے ضمن میں قطب شاہی اور عادل شاہی ادوار کے ممتاز قصیدہ نگاروں محمد قلی قطب شاہ، نصرتی، غواصی اور ولی کو موضوع بنا کر دکنی قصیدہ نگاری کا جائزہ پیش کرتا ہے۔

چوتھے اور پانچویں باب میں شمالی ہندوستان میں قصیدہ کی سو سالہ تاریخ ابتداء اور ارتقاء کا خلاصہ ہے اس میں حاتم سے ذوق تک معروف شعراء کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ مصنف کی کاوش کا ثبوت ہے۔ سودا اور ذوق کو قصیدہ نگاری کے اہم ستون بتایا ہے۔

چھٹا باب مصحفی انشاء سے مومن و غالب تک کے معروف شعراء کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات

---

[۱] اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ۔ ڈاکٹر محمود الہی۔ ص ۹
[۲] ایضاً ص ۵۲

اور خامیوں کا تنقیدی تجزیہ ہے۔ غالب کے علاوہ مصحفی اور انشاء کی قصیدہ نگاری پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔

ساتواں باب متاخرین کے آخری عہد سے بحث کرتا ہے۔ اور دبستانِ لکھنؤ میں قصیدہ نگاری میں ہوتی سے آتش تک کے دور کے ممتاز شعراء کا تنقیدی جائزہ ہے۔ گویا بحر قلق اور منیر کو ضمناً زیرِ بحث لایا ہے۔

آٹھواں باب گزشتہ ابواب کا خلاصہ اور قصیدہ نگاری کے کچھ پہلوؤں پر تبصرہ ہے۔ اسی باب میں غدر کے بعد سے بیسویں صدی کی پہلی دہائی تک کے مدحیہ قصیدہ نگاری میں حالی، شبلی، اسماعیل میرٹھی اور نظم طباطبائی کا شمار کیا ہے۔ قصیدہ کی ادبی اہمیت پر مصنف کا ذیل کا اقتباس فکر انگیز ہے۔

"بادو صنف قصیدے ہماری ادبیات کا قیمتی سرمایہ ہے۔ وہ ماضی کے ورثے کا بڑا جاندار حصہ ہیں اور اپنی ادبی شان و شکوہ، انداز بیان کی آراستگی، تخیل کی بلند کاری اور اپنے عہد کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی کامیاب عکاسی کی بناء پر اردو قصیدہ کا مطالعہ ادب کے ہر طالب علم کے لئے ناگزیر رہے گا۔"[1]

اس کتاب میں مقالہ نگار نے موضوع کے پیشِ نظر اردو شاعری کی ابتداء سے جدید عہد کی قصیدہ نگاری کی تاریخ اور اہم رجحانات سے وابستہ تبدیلیوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ مقالہ نگار کی کاوش قابلِ داد ہے۔ کیونکہ موصوف نے کئی اہم اور غیر معروف قصیدہ نگاروں کی تخلیقات جو منظرِ عام پر نہیں تھیں، اپنی محنت سے انکشاف کر کے مقالہ کی اہمیت کو مستحکم کیا ہے۔ ولی، حاتم، مصحفی، انشاء، جرأت کی قصیدہ نگاری پر تبصرہ اس کا ثبوت ہے۔

غالب کی قصیدہ نگاری پر ذیل کا بیان مصنف کی تحقیقی فکر کی صلاحیت کا نمونہ ہے۔

"غالب اردو قصیدہ میں بھی ایک اجتہادی شان رکھتے ہیں۔"[2]

یہ تصنیف اردو قصیدہ نگاری کی جامع تاریخ اور تنقیدی نبید پر قصیدہ کی کسوٹی ہے۔ اردو قصیدہ کی تاریخ میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

مرثیہ

عربی زبان میں مرثیہ نظم کی اس صنف کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کے اوصاف و فضائل بیان کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ واقعہ کربلا سے پہلے عرب کے شاعر اپنے مرنے والوں کے لئے مرثیے لکھتے تھے۔ لیکن واقعہ کربلا کے بعد تمام شعرائے ایران کی نگاہیں اس واقعہ پر مرکوز ہو گئیں۔ اسی بنا پر مرثیہ سے مراد وہ نظم جس میں واقعہ کربلا اور متعلقہ واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

---

[1] اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر محمود الٰہی ۵۰۰

[2] ایضاً 〃 صفحہ ۳۴۲

مرثیہ پر معاشرت تہذیب کا گہرا اثر ہے۔ معاشرے سے مرثیہ کی یہ وابستگی اس موضوع اور ہیئت میں تبدیلی اور ترقی کی ضمانت دار ہے۔ مرثیہ کی کوئی مستقل نوعیت نہیں۔ کیونکہ غزل، مثنوی، مستزاد، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، ترکیب بند اور ترجیع بند وغیرہ بہت سی ہیئتوں میں مرثیے ملتے ہیں۔ لیکن ابتدائی دور کے مرثیوں میں مخمس اور مسدس کی ہیئت زیادہ اپنائی گئی ہے مرثیہ کے اجزائے ترکیبی چہرہ، ماجرا، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین ہیں۔

ان کے ارتقاء کے بارے میں ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں۔

> مرثیہ کے ان اجزاء کا تعین ایک دن میں نہیں ہوا۔ اور نہ یہ کسی ایک فرد کا کارنامہ ہے اس ڈھانچہ کی تشکیل ارتقائی طور پر ہوئی ہے [1]

اس بیان کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں مرثیہ ایک رزمیہ نظم ہے۔ اردو ادب میں کسی دوسری صنف میں رزمیہ مضامین کی گنجائش نہیں ہے۔ اردو ادب کی اس خامی کو مرثیے نے پورا کیا۔ حق و باطل کی کشمکش، جنگ کی تیاریاں، اسلحہ کے نام ان کے استعمال، مناظر نگاری میں میدان جنگ کا نقشہ، موسم اور حالات کا جائزہ، جنگی طریقے، تلوار اور گھوڑے کی تعریف، جذبات، نفسیات وغیرہ کے نقشے محاسن کے ساتھ مرثیہ میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ایسی مثال دوسرے اصناف ادب میں نہیں ملتی۔

اردو مرثیہ کا ابتداء دکن سے وابستہ ہے۔ آج تک کی تحقیق کے مطابق قلی قطب شاہ گولکنڈہ کے بادشاہ نے مرثیہ نگاری شروع کی۔ اس کے بعد ملا وجہی اور غواصی کے مرثیہ نگاری کا ثبوت ملتا ہے۔ عہد جہانگیری میں شجاع الدین نوری کا نام اس صنف میں نمایاں طور پر لیا جاتا ہے۔ ہاشم علی برہانپوری، رام راؤ، سیوا اور کاظم علی قدیم مرثیہ نگاری میں مشہور ہیں۔

شمالی ہندوستان اردو کی ترقی کے آغاز میں سب سے پہلے روشن علی سہارنپوری کی ایک طویل نظم روضۃ الشہداء کے ڈھنگ پر لکھی ہوئی ملتی ہے۔ جس کا عنوان عاشور نامہ ہے۔ ان کے بعد شاہ حاتم، آبرو، یکرنگ، قائم دہلوی، میر محمد مہدی مسکین اور رضا سے کی مرثیہ نگاری کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی دور میں لکھنؤ میں گدا علی گدا، خلیفہ محمد علی سکندر اور فضل علی فضلی کے مرثیے نظر آتے ہیں۔

دوسرے دور میں میر تقی میر کے مرثیے بھی ملتے ہیں۔ لیکن اسی دور میں سودا نے اس صنف کو بلند کیا۔ مسدس کی ہیئت میں سب سے پہلے سودا کے مرثیے ملتے ہیں۔ سودا کے بعد لکھنؤ میں مرثیہ نگاروں کا ایک

---

[1] اردو مرثیہ کا ارتقاء ڈاکٹر مسیح الزماں (۱۹۶۸ء) کتاب نگر لکھنؤ، ص ۲۹۹

انجوم نظر آتا ہے۔ افسردہ، ناظم، ضمیر، خلیق اور فصیح خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بعد کے دور میں دبیر، انیس، انس اور مونس نظر آتے ہیں۔

لیکن اس دور میں انیس اور دبیر نے اس فن کو ایک وقار بخشا۔ ہر موضوع پر طبع آزمائی کی۔ اور صنائع بدائع دیگر صنعتوں کے ذریعہ اس صنف کو چار چاند لگائے۔ انیس اور دبیر کے بعد نفیس، رشید، وحید، اوج اور نعش نے مرثیے لکھے ہیں۔ شاد عظیم آبادی، عارف لکھنوی، شمیم امروہوی بھی اس دور کے مرثیہ گو ہیں۔ شاد نے مرثیہ میں تصوف کو داخل کیا۔ جوش، حفیظ، سیماب، نقل اور نجم وغیرہ نے بھی اچھے مرثیے لکھے ہیں

عصر حاضر میں بھی مرثیہ نگاروں کی ایک صف موجود ہے۔ اور یہ صنف ہنوز جاری ہے۔ کیونکہ مرثیوں کے بغیر مجلس عزا کا انعقاد ناممکن ہے۔ اس بنیاد پر مرثیہ کی صنف اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اور اس میں مزید ارتقاء حالات کے مطابق ہوتا رہے گا۔ اس صنف پر ہمارے ادب میں تاریخی و تنقیدی کتابیں لکھی گئی ہیں۔

مرثیہ پر درج ذیل کتابیں ملتی ہیں۔

۱۔ اردو مرثیہ	سفارش حسین رضوی	۵۔ دکن میں مرثیہ نگاری	ڈاکٹر رشید موسوی
۲۔ اردو مرثیہ کی روایت	ڈاکٹر مسیح الزماں	۶۔ مرثیہ انیس و دبیر	ڈاکٹر حسین فاروقی
۳۔ دکن میں اردو مرثیہ کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	۷۔ المیزان	احسن فاروقی
۴۔ اردو میں اردو مرثیہ کا ارتقاء	ڈاکٹر اکبر حیدری	۸۔ اردو مرثیہ کا ارتقاء	ڈاکٹر مسیح الزماں

اردو مرثیہ کا ارتقاء
(ابتداء سے انیس تک) ڈاکٹر مسیح الزماں

یہ کتاب ڈاکٹر مسیح الزماں کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر مصنف کو الہ آباد یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ (ڈی فل) کی ڈگری عطا کی ہے۔ ایک دیباچہ، چھ ابواب، فہرست ماخذ اور اشاریہ کے ۴۰۸ صفحات پر محیط ہے۔ یہ کتاب ابتداء سے میر انیس کے عہد تک اردو مرثیہ کی تاریخ ہے۔ دیباچہ میں مصنف رقمطراز ہیں۔

"یہ بات سب جانتے ہیں کہ اردو مرثیہ کی اب تک کوئی تاریخ مرتب نہیں ہوئی۔ نہ اس کی تدریجی ترقی اور عہد بہ عہد خصوصیات کا خاطر خواہ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس موضوع پر چند رسالے ملتے ہیں۔ ان کا موضوع محدود ہے۔ میرا یہ مقالہ اس قسم کی پہلی کوشش ہے۔"[1]

۱۔ اردو مرثیہ کا ارتقاء۔ مسیح الزماں، دیباچہ

اعتراف میں مصنف نے مقالہ کی تیاری میں مدد کرنے والوں کے ناموں کی فہرست دی ہے۔

پہلا باب ابتدائیہ دکن میں عزاداری و مرثیہ گوئی سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں دکن کی خود مختار سلطنت کا مختصر تاریخی جائزہ لے کر دکن میں ایرانی اثرات سے رسم عزاداری کا انعقاد بتلایا ہے۔ بہمنی نامہ (آذری) ہفت اقلیم عزاداری عامرہ کے توسط سے عزاداری کا رواج بتلایا ہے۔ اور آذری کو پہلا مرثیہ گو لکھا ہے۔ ۱؎

رسم عزاداری کو صرف شیعہ فرقے کے مسلمانوں کے ساتھ مخصوص بتلایا ہے۔ ۲؎

اردو کا پہلا مرثیہ گو قلی قطب شاہ کو تسلیم کیا ہے۔ اردو زبان کی کم عمری کا ذکر کرتے ہوئے بلند پایہ مرثیہ گو لکھا ہے۔ ۳؎
عادل شاہی کے دور میں تاریخی پس منظر کے بعد مرزا کو اس عہد کا پہلا مرثیہ گو لکھا ہے۔ اورنگ زیب کے زمانے کے پہلے ماتم علی برپا ہوئی۔ درگاہ قلی کی رثائی خدمات سے بحث کی ہے ان کو اردو مرثیے کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت دی ہے۔ دونوں کی مرثیہ نگاری میں صنعت، لب و لہجہ زبان و بیان خوبیاں اور طرز ادا انفرادیت کا ذکر کیا ہے۔ ۴؎

دہلی میں عزاداری اور مرثیہ گوئی کے عنوان میں شمالی ہندوستان کی تاریخ مغلیہ عہد کا پس منظر پیش کیا ہے۔
اور شمالی ہند و ستان کی مجلسی زندگی عزاداری کو اعلیٰ کے درجے میں بتایا ہے لیکن اورنگ زیب کے عہد میں عزاداری کے رواج کو عام بتایا ہے۔ کربل کتھا کے حوالے سے فضلی کو شمالی ہند کا پہلا مرثیہ گو لکھا اس عہد کے مرثیوں کی اہم خصوصیت لحن و آہنگ کا سوز و بکا بتلایا ہے۔ اس دور کے دیگر مرثیہ گویوں میں لطف اللہ خاں ندیم، مسکین، حزیں اور غمگین کا ذکر ہے۔

اٹھارویں صدی میں یک رنگ قائم، ہوش، دار، عاصی محمد تقی، اشرف الدولہ کے علاوہ سودا اور میر تقی میر کی مرثیہ گوئی پر تبصرہ کیا ہے۔ سودا کی بہت تعریف کی ہے۔

اس باب کے خاتمہ پر اٹھارویں صدی کے دہلوی مرثیے سے حسب ذیل باتوں کا اندازہ لگایا ہے۔
دہلی اور دکنی مرثیوں میں ایک تفاوت بتایا ہے۔ سودا، میر اور محب کے مرثیوں میں سماجی زندگی کی جھلکیاں ہیں۔

دوسرا باب لکھنؤ میں عزاداری اور مرثیہ کا آغاز ہے۔ مختلف مقامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھنؤ مرثیہ کی فضا کے لئے اچھی ثابت کیا ہے۔ لکھنؤ میں عزاداری کا رواج اور امام باڑہ کا قیام شجاع الدولہ کے زمانے سے بتلایا ہے۔ ۵؎

۱؎ اردو مرثیہ کا ارتقاء۔ مسیح الزماں ص [illegible]
۲؎ ایضاً ص [illegible]
۳؎ ایضاً ص [illegible]
۴؎ ایضاً ص [illegible]
۵؎ اردو مرثیہ کا ارتقاء۔ مسیح الزماں ص ۱۳۱

لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کا آغاز حیدر سے بتلایا ہے۔ سکندر گدا، احسان، افسردہ سے مراثی کے نمونے پیش کیا ہے۔ خاتمہ پر لکھنوی مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"لکھنؤ میں عزاداری اور دوسرے معاشرتی اثرات نے مرثیہ کو پورے واقعہ کربلا پر محیط کرنے کے بجائے اسے چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کرنے کا رجحان پیدا کیا۔" [1]

ان مرثیوں کے کرداروں کو معاشرت سے قریب بتلایا ہے۔

تیسرا باب دورِ تعمیر ہے۔ اس میں خلیق، فصیح، ضمیر اور دیگر کی مرثیہ نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ ان شعراء نے مرثیوں کو زبان و بیان اور جدت کا لباس عطا کیا۔ اس پر تبصرہ کیا ہے۔

خاتمہ پر دورِ تعمیر کی سب سے بڑی خصوصیت، ادبی محاسن، شاعرانہ خصوصیات، مضمون آفرینی، مناظر اور واقعات کے بیان میں تسلسل، روانی، ربط و گہرائی، جذبات نگاری کا میدان ہموار کیا۔ اس دور میں مرثیہ کی ہیئت اور اندرونی ساخت کی تنظیم ہوئی۔ بتلایا ہے۔

چوتھا باب ۔ دورِ عروج میں انیس کی مرثیہ نگاری اور محاسن کلام سے بحث کی ہے۔ میر انیس کی مرثیہ نگاری میں جذبات نگاری، کردار نگاری، مناظر قدرت، تشبیہ، استعارات، تلمیح، فصاحت و بلاغت اور دیگر خصوصیات پر تبصرہ کیا ہے۔

پانچواں باب ۔ دبیر اور ان کے ممتاز معاصرین کا ہے۔ اس میں دبیر کی مرثیہ نگاری کا جائزہ اور محاسن کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ ان کے معاصرین میں عشق، تعشق کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔

چھٹا باب ۔ مرثیہ کا فنی و معنوی ارتقاء میں ابتدا میں مرثیہ میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں۔ ان کی شکل معین نہیں غزل کے علاوہ دوسری شکلوں میں بھی مرثیے کہے جاتے تھے۔ [illegible]
ساخت اور اجزائے ترکیبی پرانے عہد کے مرثیوں کی ساخت کو اہمیت نہیں دی۔ بعد میر ضمیر کے دور سے مرثیہ کے اجزاء چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین [illegible] ہے۔ لسانی ساخت میں عروض و قواعد کی پابندی کے علاوہ عقیدت کے جذبات کے اظہار کا ذکر کیا ہے۔

مرثیہ اور ایپک میں ایپک کی ارتقاء، وسعت، کلاسیکی تصور، مشابہت، اختلاف [illegible] کلاسیکی [illegible] پر تفصیل و صراحت کی گئی ہے۔ مرثیہ میں حقیقت نگاری، منظر نگاری، واقعہ آفرینی پر تبصرہ کر کے [illegible] کا سلسلہ ایک جگہ ملایا ہے۔

---

[1] اردو مرثیہ کا ارتقاء ۔ مسیح الزماں [illegible]

۱۔ اس کتاب میں علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد سوم" کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن علی گڑھ تاریخ ادب اردو صرف جلد اول منظر عام پر آئی ہے اس کے بعد کوئی جلد اشاعت پذیر نہیں ہوئی۔

۲۔ مصنف نے دہلی کے مرثیہ گویوں کو دکنی مراثی سے فائدہ نہ اٹھانے کی وجہ پر مغرور لکھا ہے کہ دہلوی شعراء ادب میں کسی کی رہنمائی نہیں چاہتے تھے۔[1]

۳۔ مصنف نے مرثیہ کی صنف کو صرف شیعوں کی عزاداری میں محدود کر دیا ہے۔ حالانکہ ان علاقوں میں سنی مسلمان بھی مرثیہ گو اور مرثیہ خواں ہوئے ہیں۔ مرثیہ سننے میں بھی سنی مسلمانوں کی خاصی تعداد رہتی تھی۔

۴۔ ص۱۱ پر تلازمے کو تازمے لکھا گیا ہے۔ کتابت کی غلطیاں ہیں۔

۵ یہ کتاب مرثیے کی مکمل تاریخ نہیں کہی جا سکتی۔ کیونکہ کتاب" ابتدا سے انیس تک ہے۔ انیس سے بعد بھی مرثیہ گوئی کے فن میں ترقی ہوئی۔

ان خامیوں کے باوجود اپنے موضوع کے اعتبار سے مرثیہ کی صنف پر ایک اہم تاریخی کتاب ہے۔ مصنف نے حوالوں اور کلام کے نمونوں کے ساتھ مرثیہ کے ارتقائی منازل کو طے کیا ہے۔ اس ادب کی تاریخ میں یہ اہم اضافہ ہے۔

اردو مرثیہ

ڈاکٹر سفارش حسین رضوی

سفارش حسین رضوی کی تالیف "اردو مرثیہ" دراصل اردو مرثیہ کی تاریخ ہے۔ مؤلف نے "اردو مرثیہ" کی تاریخ کو عہد اور ادوار کی روشنی میں دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ دکن جس میں دکنی مرثیہ گوئی کا آغاز اجمالی نقطۂ نظر سے بیان کیا ہے اور سولہویں صدی سے بیسویں صدی تک کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔

دوسرا حصہ شمالی ہندوستان کی مرثیہ گوئی کا مرقع ہے۔ اس میں شمال کی مرثیہ گوئی پر اجمالی تبصرہ ہے۔ اور ابتدائی تاریخ سے بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی تک کے مرثیہ گو شعراء کے انتخابی کلام کا عکس اور ان کی کارکردگی کا فرداً فرداً مختصر جائزہ ہے۔

یہ کتاب ۳۰۳ صفحات پر مشتمل ہے مرثیہ کی ابتدا دکن سے بتائی ہے۔ اور مرثیہ پر تنقید کی ابتدا بھی دکن سے ہوئی ہے۔ سفارش حسین کے مطابق

"رضا گجراتی جس کے متعلق خیال ہے کہ برہانپور کا رہنے والا ہے اچھا مرثیہ گو تھا۔ اس نے مرثیہ گوئی

---

[1] اردو مرثیہ کا ارتقاء۔ مسیح الزماں ص۲۳۵
[2] ایضاً ،، ،، ص۱۲۵

کے سلسلے میں محققین سے اختلاف کیا ہے ۔ ۔ ۔ اس طرح مرثیہ پہلی بار تنقید کی گئی۔ لگ بھگ اسی وقت شمالی ہند میں سودا نے اس کا آغاز کیا تھا۔

موصوف نے اس عہد میں گجرات اور برہان پور کو مرثیہ کا مرکز بتایا ہے۔ مؤلف نے ابتداء سے بیسویں صدی تک یعنی قلی قطب سے کشن پرشاد تک دکن کے تقریباً ۱۵۹ شعراء کے مختصر حالات، کلام کی خصوصیات اور خصوصیات کے پیش نظر کلام کا انتخاب مرثیہ کی تاریخ اور ارتقاء کا نمونہ پیش کیا ہے۔ شمالی ہندوستان میں مرثیہ کی تاریخ اور ارتقاء کا عمیق نظری سے جائزہ لیا ہے۔ اور اٹھارویں صدی کے پہلے نصف میر محمد قائم سے بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی تک محمد امیر احمد خان تحر تک تقریباً دو سو بارہ شعراء کے مختصر حالات، کلام کی خصوصیات اور ان خصوصیات کی روشنی میں کلام کا انتخاب کتاب کی افادیت میں انفرادیت برقرار رکھتا ہے۔

مرثیہ کی دیگر تاریخوں کے علاوہ اس تاریخ کی اہمیت اپنے مختصر اور غیر بیانات سے مستحکم ہے۔ اردو مرثیہ کی تاریخ اور ارتقاء کے منازل کی تفصیل سے منتخب شعراء کی خصوصیات کتاب کے تنقیدی پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ یہ کتاب اپنے عہد میں مرثیہ کی تاریخ کا آئینہ ہونے کے ساتھ ادب میں قابل قدر اضافہ ہے۔

اردو مرثیہ کے پانچ سو سال

ماہنامہ "نیا دور" کا یہ خاص نمبر کتابی شکل میں ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ ابتدا میں مرثیہ کی تاریخ میں تبصرہ ہے۔ اس میں مرثیہ کی ابتدا، مرثیہ کا موضوع، اردو، عربی، [illegible] میں اس صنف شاعری کی نوعیت اور ارتقاء کے متعلق اچھی بحث ملتی ہے۔

۱۔ لکھنؤ میں میر انیس اور مرزا دبیر کے عہد میں اس فن میں جو ترقی ہوئی اور ان دونوں کے بعد ان کے خاندان کے دوسرے مرثیہ گویوں نے اس صنف میں جو اضافے کئے ان کا تذکرہ ہے۔

۲۔ موجودہ دور میں اردو مرثیہ کی ترقی اور مستقبل میں اس کے ارتقاء کے امکانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳۔ [illegible] مرثیہ کے عنوان کے تحت حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ کی وفات پر اور حضرت فاطمہؓ کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر مرثیہ درج ہے۔

۴۔ فرزدق کا مشہور قصیدہ حضرت امام زین العابدین کے متعلق اور اہل بیت کی عمومیت پر [illegible] ابی طالب کے چند اشعار ملتے ہیں۔

۱؎ اردو مرثیہ ۔ سفارش حسین رضوی ۔ ص [illegible]

۵ اس کے بعد اردو کے ہر دور کے شعرا کے سلام، مناقب، مناجات، مراثی، قصائد اور رباعیات و قطعات کا انتخاب دیا گیا ہے۔

۱۔ فاضل مرتب کے نزدیک مرثیہ واقعہ کربلا کے غم انگیز پیرایۂ اظہار ہی سے مراد ہے۔ اس لئے انھوں نے اسی نوعیت کا کلام منتخب کیا اور سے کتاب کی زینت سمجھ لیا۔ اس ضمن میں انھوں نے یہ بھی غور نہیں کیا کہ مرثیہ کے پانچ سو سال میں مناجات، مناقب، قصائد، رباعیات اور قطعات چہ معنی دارد؟

۲۔ مرثیہ کے پس منظر میں اسلام کی جو تاریخ پیش کی گئی ہے اس میں شیعی نقطۂ نظر حاوی ہے۔

۳۔ مختلف عہد کے مرثیہ گو شعرا پر جو رائے پیش کی ہے۔ اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔

۴۔ انیس و دبیر کے متعلق شبلی کی رائے سے بھرپور اختلاف کیا گیا ہے۔ حالانکہ مصنف کی رائے خود قابل اختلاف ہے۔

۵۔ کتابت و طباعت کی غلطیاں کہیں معافی کے لائق نہیں ہے خصوصاً عربی اشعار غلط لکھے گئے ہیں۔

۶۔ رسالہ کے مرتبین شاید اس امر سے واقف ہیں کہ "موازنۂ انیس و دبیر" میں شبلی کی رائے ذوقی اختلاف کا شکار نہیں ہے اور عقیدت مندی سے مرعوب نہیں ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس کتاب کو مرثیہ کی مکمل تاریخ نہیں کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس میں مرثیہ کا تاریخی پس منظر تشنگی کا شکار ہے۔

اردو مرثیہ کی روایت

ڈاکٹر مسیح الزماں

ڈاکٹر مسیح الزماں کی تحقیقی کاوش "اردو مرثیہ کی روایت" ۴۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں کے مطابق

> اس کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں اردو مرثیہ کی عہد بہ عہد ترقی مدنظر رکھی گئی ہے۔ اور ہر عہد کے بہت سے مرثیہ گویوں میں صرف نمائندہ شعرا کو شامل کیا گیا ہے۔[۱]

ابتدا میں مصنف کا مقدمہ اردو مرثیہ کی عہد بہ عہد تاریخ اور ارتقاء کا نمونہ ہے۔ اس مختصر مقدمہ میں خاص اور خصوصیات کے پیش نظر جامع تبصرہ نے مرثیہ پر تنقید کا ایک معیار مقرر کیا ہے۔ مفہوم اور وجہ تسمیہ

---

[۱] اردو مرثیہ کی روایت ڈاکٹر مسیح الزماں صفحہ ۵ (دیباچہ)

اور موضوعات کی وضاحت مرثیہ کی صنف کا مکمل تعارف ہے۔ ہر عہد کی مرثیہ نگاری کا سرسری جائزہ مرثیہ کی جامع تاریخ اور روایت کا خاکہ ہے۔ اس کتاب میں ہر عہد کے مرثیہ نگاروں کے مرثیوں کا انتخاب ادبی معیار کے مطابق ہے۔ مصنف نے دکنی مرثیہ میں سلطان محمد قلی قطب شاہ سے درگاہ قلی خاں تک کے اہم مرثیہ نگاروں کے بہترین مرثیوں کا انتخاب پیش کیا ہے۔

دہلوی مرثیہ نگاران میں مسکین سے میر تقی میر تک کے نمائندہ مرثیہ گویوں کا کلام منتخب کیا ہے۔ لکھنوی مرثیہ حیدری سے مرزا جعفر علی فصیح تک چیدہ شعراء کے مرثیوں کو اپنے انتخاب میں شامل کیا ہے۔

مقدمہ کے ساتھ مرثیوں کا یہ انتخاب صنفِ مرثیہ کا معیاری انتخاب ہے۔ ہر مرثیہ کے مطالعہ سے مصنف کا ذوقِ فن جھلکتا ہے۔ قدیم مرثیوں کو دیکھنے سے علم ہوتا ہے کہ عہدِ قدیم میں مرثیہ کا فن مکمل تھا۔ مصنف کا مقصد ذیل کے بیان سے واضح ہو جاتا ہے۔

"اردو پڑھنے والوں کو قیاسات اور مفروضات سے حقیقت کے قریب لانے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ممتاز مرثیہ گویوں تک ان کی رسائی ہو۔ وہ مرثیے ان کے سامنے آئیں جو ذاتی ذخیروں اور قدیم کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔" [1]

یہ کتاب مرثیوں کا بہترین انتخاب ہے۔ مرثیوں کا ایک خاص معیار ہے اس لئے صنف مرثیہ پر تحقیقی کام کرنے والے طلبہ کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

سلام

مرثیہ کا غزل نما شکل سلام ہے۔ مرثیہ شہدائے کربلا کے کارنامے اور اوصاف حمیدہ کا مکمل بیان ہے۔ اہل بیت کے کردار و ان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا من وعن روایتی بیان ہوتا ہے۔ لیکن سلام میں غزل کی طرح ہر شعر کا مکمل مفہوم ہوتا ہے۔ اس میں کردار نگاری، سیرت اور کارناموں کے وسیع بیان کو ایک شعر میں ودیعت کیا جاتا ہے۔ کربلا میں پیش آنے والے واقعات اور کردار کا اظہار ہر شعر میں مختلف انداز سے کیا جاتا ہے ہر شعر اپنے مفہوم کی مکمل ادائیگی کا نمائندہ ہوتا ہے۔ ایک سلام میں تقریباً سات اشعار اور زیادہ سے زیادہ ۲۲ اشعار اور کبھی کبھی اس سے زیادہ اشعار بھی ہوتے ہیں۔

حفیظ جالندھری اور جوش کے سلام اس کا ثبوت ہیں۔ مرثیہ کی ہیئت میں مثلث، مخمس، مسدس اور

---

[1] اردو مرثیہ کی روایت۔ مسیح الزماں۔ صفحہ ۳ (دیباچہ)

مسمط کی طرز کو اپنایا جاتا ہے۔ لیکن سلام میں غزل کی صنف کے مطابق دو مصرعوں سے شعر کو پابند کر دیتے ہیں۔ غزل کے لئے جو بحریں رائج ہیں ان ہی بحروں کا استعمال سلام کے لئے کیا جاتا ہے۔ اس بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ مرثیہ کی جدید ہیئت سلام ہے۔ انسانی مصروفیت اور وقتی تقاضوں نے مرثیوں میں وقت کی طوالت کو گوارہ نہیں کیے۔ اس لئے سلام وقتی تقاضوں کی دین ہے۔ سلام میں تغزل کا رنگ مرثیہ کا جاہ و جلال مثنوی کردار اور قصیدہ کا التزام پایا جاتا ہے۔

کربلا کے شہیدوں کے ہر کردار کا بانکپن، شجاعت، جوانمردی، عجز و انکسار، اور جاہ و جلال نیز مکالمہ کا انداز سلام میں ملتا ہے۔ اس فن کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے

انیس و دبیر سے پہلے امیر، خلیق اور جلال کے یہاں مرثیے ملتے ہیں۔ اس فن میں قتیل لکھنوی، نجم آفندی نے توجہ کی ہے۔ لیکن سیماب اکبر آبادی جوش ملیح آبادی، وزیر لکھنوی اور نسیم امروہوی خصوصیت کے ساتھ سلام کہے ہیں۔ سیماب نے تو سلام نگاری میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ موجودہ عہد میں کم و بیش ہر شاعر نے روایت کے مطابق کچھ نہ کچھ سلام کہے ہیں۔ مجلس عزا میں آج کل مرثیہ کی بہ نسبت سلام کو اہمیت دی جا رہی ہے اور یہ اس عہد کا تقاضا ہی نہیں بلکہ ضرورت ہے۔

اردو میں اس صنف پر باقاعدہ کوئی تصنیف نہیں ہے۔ نہ اس کے کوئی اصول و ضوابط مقرر ہیں۔ مرثیہ کا موضوع اور غزل کی ہیئت سلام کا وجود ہیں۔ سلام پر ایک غیر مطبوعہ مقالہ لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے اپنے مقالے[1] میں سلام پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ تاہم اس فن پر مزید لکھنے کی ضرورت ہے۔ اور اس صنف کو تاریخی حیثیت دینا ضروری ہے۔

اردو سلام نگاری

سید تقی حیدر رضوی

زیر نظر تحقیقی مقالہ سید تقی حیدر رضوی کی کاوش کا نتیجہ ہے جس کے پہلے باب میں سلام کا صنف سخن کی حیثیت سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ساتھ ہی دنیا کے اساطین ادب اور سربرآوردہ علماء کے خیالات کی روشنی میں ادب کے مفہوم کی وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو موضوع سے خارج ہے۔

اس باب میں اصناف سخن کی تشکیل، ہیئت اور مواد پر بحث اور مروجہ اصناف سخن کا مختصر تعارف

---

[1] اردو شاعری میں تشیع اثر۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی

موجود ہے۔ سلام کے لغوی معنی اور مروجہ مفاہیم کی روشنی میں اس کے اصطلاحی مفہوم کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں سلام نگاری کے ابتدائی دور سے متعلق تحریکات اور سلام نگاری کے آغاز کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو سلام نگاری کی ابتداء دکن سے وابستہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل نام گنوائے گئے ہیں ملا وجہی، غواصی، قاضی محمود بحری، ولی اورنگ آبادی، بابک جی، روزبہ رسیک، ذرد، شاہ قاسم، مرزا بیجاپوری، غنچہ شاہی، معین برہانپوری، شاہ حسین ذوقی۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے جیسی ہے کہ مقالہ نگار اپنے مقالہ میں بتاتے ہیں کہ صنف سلام جدید شاعری کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ لیکن دکن کے سیکڑوں سال پرانے شعراء کو سلام نگار کہتے ہیں۔

تیسرے باب میں شمالی ہند میں اردو کے ابتدائی دور کا جائزہ اور اس دور کے سلام نگاروں کی درج ذیل فہرست پیش کرتے ہیں۔ شاہ مبارک آبرو، مصطفےٰ خاں یک رنگ، فضل علی خاں فضلی، کرم علی، میر سید عبداللہ مسکین، خواجہ برہان الدین عاصی، مرزا علی نقی ندیم، خلیفہ محمد علی سکندر، شیخ قیام الدین علی قائم، میر محمد علی محب، مرزا محمد رفیع سودا، میر تقی میر، غلام حسین ضاحک اور میر حسن شامل ہیں۔ افسوس ہے کہ ان شعراء کے سلام ہماری نظروں سے نہیں گزرے ہیں آخر میں شمالی ہند کے بعد کے دور کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالہ نگار ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مرثیہ نگاروں کے دوش بدوش سلام نگاروں کو بھی عروج ملا یہ بیان بے بنیاد ہے۔ دوسرے میر مستحسن خلیق نے اپنے صاحبزادے میر ببر علی انیس کو یہ ہدایت فرمائی کہ غزل کو سلام کیجئے۔ یہ جملہ بلیغ تھا۔ پھر بھی اس کا تواتر نہیں دیا گیا۔

آخری باب میں سلام نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ناقدین کی رائے کی روشنی میں صنف سلام کی ادبی اور فنی حیثیت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم اس میں مقالہ نگار کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔

مقالہ نگار کو اس امر کا اعتراف ہے کہ محدود وسائل سے سلام نگاری کا یہ جائزہ لیا گیا ہے۔ بہر حال سلام نگاری پر یہ پہلی کوشش ہے جسے تحقیقی صورت میں دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

گیت

گیت ہندوستانی ادب میں موسیقی کی قدیم ترین اصطلاح کہتے ہیں۔ بلکہ ایک طرح سنگیت کی اصطلاح کو گیت

سے منسوب کرتا ہے۔ سنگیت کو وہ دو لفظوں کا مرکب لیتے ہیں۔ سم اور گیت۔ ان کے یہاں سم کا مطلب عمدہ اور گیت کا مطلب نغمہ اور جو نظم سُر تال اور ید کی پابند ہو اسے سنگیت کہتے ہیں۔ ہندو دھرم میں گیت مذہبی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی بنیاد پر ہندی ادب سام وید کے مقدس گیتوں کو وید کی گیت کہتا ہے۔ جن گیتوں میں عوامی جذبات کا بے ساختہ اظہار ہو جائے انھیں لوک گیت کے زمرے میں شامل کرتا ہے۔ اور لوک گیتوں کی دو قسمیں بتاتا ہے۔ مارگ گیت دوسرا دیشی گیت۔ مارگ گیت میں شدھ راگ رنیاں اور دیشی گیت میں ہلکے پھلکے گانے جیسے دادرا، ٹھمری، ٹپا وغیرہ۔

اردو میں گیت کی صنف سنسکرت ادب سے در آئی ہے۔ گیت کی خصوصیات کے سلسلے میں ڈاکٹر عنوان چشتی فرماتے ہیں۔

"گیت کی اہم خصوصیات میں موسیقیت، نودا ظہاریت، داخلیت، جذبے کی شدت اور وحدت نیز ہیئت کا اختصار شامل ہے۔ گیت شاعری اور موسیقی کے نقطۂ اتصال سے جنم لیتا ہے۔"[۱]

قیصر جہاں رقمطراز ہیں کہ

"گیت کا مرکزی وصف نغمگی ہے۔ دراصل جب احساس مترنم الفاظ میں سمو دیا جاتا ہے اور مترنم الفاظ ترتیب وار لائے جاتے ہیں تو گیت جنم لیتا ہے۔"[۲]

عمیق حنفی کہتے ہیں کہ

"داخلیت کے اشتعال، خلوص اور دردمندی کا آہنگ، سادگی کے ترنم اور ارتفاع جذبہ کی شدت گیت کے لئے لازمی ہے۔"[۳]

گیت میں الفاظ کی ترنم ریزی، داخلیت اور احساس کی شدت ہے۔ اردو میں دور قدیم سے گیت اور گیت نما غنائی نظمیں ملتی ہیں۔ خسرو کی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں اسی صنف کی شاخیں ہیں۔ کیونکہ ان میں نسوانیت، لوچ اور بول چال کی زبان کے اطوار پائے جاتے ہیں۔ پندرھویں صدی میں میرا بائی کے گیتوں میں بھگتی کے جذبے نے سپردگی، بے قراری، محبت اور جسم کی پکار میں نغمگی کی کیفیت پیدا کی ہے۔

دکنی دور کی قدیم شاعری میں کئی عشقیہ نظموں میں ہندی روایات کے امتزاج کے ساتھ غنائیت، لوچ اور سپردگی، عام بول چال کی زبان کی صفات ملتی ہیں۔ ان نظموں کو خصوصیات کی بنا پر گیت نما نظمیں کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس دور میں گیت کی کوئی واضح اور متعین شکل نہیں تھی۔ بہر حیثیت یہ گیت لکھے جاتے تھے۔

---

[۱] اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت۔ ڈاکٹر عنوان چشتی ص ۲۴۵۔
[۲] اردو گیت۔ قیصر جہاں ص ۱۵ [۳] شعر چیزے دیگر است ص ۲۳۲ تا ۲۳۳ عمیق حنفی

اس کی مثالیں غواصی، وجہی کے یہاں موجود ہیں۔ شمالی ہند میں گیت نما نظموں کا سرمایہ دکنی دور سے زیادہ دلکش دکھائی دیتا ہے اس کی مثالیں امانت کے یہاں ملتی ہیں۔

ایک مدت تک اردو میں ہر وہ ہیئت گیت سمجھی جاتی تھی جس میں گیت کی کچھ اہم خصوصیت پائی جاتی ہیں۔ کسی بھی ہیئت کی غنائی شاعری کو گیت کا نام دے دیا جاتا تھا کیونکہ گیت کی خارجی خصوصیت کی کوئی نشاندہی نہ کوئی شناخت مقرر کی گئی تھی۔

انیسویں صدی کے درمیانی عہد میں گیت کی ہیئت کی تکمیل کے لئے ٹیک کی بندش کی موجودگی کو خالص گیت کا معیار بنایا گیا۔ یہ امتیاز گیت نما نظموں کو جدا کرتا ہے۔ ٹیک کی بندش یا ٹیپ کا مصرع اکا سہارا لے کر خالص گیت کہے جانے لگے۔ ان میں نسوانیت لوچ، حسن اور غنائیت، خود سپردگی، بے قراری اور جذبے کی شدت شامل رہی۔

عوامی زبان میں گیتوں کا سلسلہ ساغر نظامی، ڈاکٹر مسعود حسین خان، خاطر غزنوی، صولت رسول، ناصر شہزاد، قتیل شفائی اور نگار صہبائی کے یہاں مختلف تجربوں کے ساتھ جاری رہا۔ بحر کے تنوع کے دلکش تجربات کا مظاہرہ الطاف مشہدی، ندا فاضلی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے گیتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ منیر نیازی، قیوم نظر، شہاب جعفری کے گیتوں میں بندوں کے مصرعوں کی تعداد اور ترتیب و قوافی کی پابندی سے انحراف ملتا ہے۔

گیت نما نظموں میں عظمت اللہ خاں، حفیظ جالندھری، تنویر نقوی، اختر شیرانی، مصطفیٰ زیدی اور ندا فاضلی نے صوتی آہنگ غنائیت کا لحاظ رکھتے ہوئے اچھی نظمیں لکھی ہیں۔

گیتوں کے اسلوب میں حسنِ بیان سے زیادہ انفرادیت حسنِ بیان کو دخل ہوتا ہے۔ غنائیت جذبے کی وحدت اور شدت، خود اظہاریت اور داخلیت، بحر اور قوافی کے آہنگ، تشبیہ و تمثیل، استعارہ، جذبہ، احساس، خیال ایک دوسرے میں پیوست ہو کر فنی اسلوب اختیار کر لیتے ہیں۔

گیتوں کی زبان میں داخلی یا معنوی، خارجی یا ہیئتی انفرادیت، حروف کی غنائیت سے مخصوص انداز میں لفظی موسیقی میں تبدیل ہو کر نغمہ کی صورت اپنا لیتی ہے۔ اسی لئے عام طور پر ایسے گیت زیادہ مشہور ہوتے ہیں جن میں عورت کی طرف سے اظہارِ محبت، خود سپردگی، بے قراری اور جذبے کی شدت کی وضاحت ہوتی ہے۔ لیکن کچھ ہوں گیت قومی اور معاشرتی سطح پر جوش و جذبے کو ابھارنے کا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان میں داخلی جذبے کو دخل ہوتا ہے۔ خارجی بنیاد پر یہ گیت عوامی اور علاقائی زبان سے لوچ اور غنائیت حاصل کرکے

سماجی و معاشرتی اقدار کے تحت انسانی وجود کو ابھارتے ہیں۔ انسانوں کو قربانی اور غیر معمولی کاموں کے لئے وقتی طور پر تیار کر لیتے ہیں۔ یہ ملک و وطن، قوم کی محبت، طبقاتی وقار، عزت و ناموس کے جذبات بھڑکاتے ہیں انھیں سننے والا وقتی طور پر جان تک قربان کرنے سے گریز نہیں کرتا۔

کچھ گیت سماجی اور معاشرتی رسم و رواج کے موقعوں پر محفلوں میں گائے جاتے ہیں۔ یہ سادہ زبان عام بول چال اور عورتوں کی زبان کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ان میں خارجی عوامل اور وقتی اثرات کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن موقعہ محل کے اعتبار سے یہ گیت بہت دلکش ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا باتوں سے وضاحت ہو جاتی ہے کہ گیت ایک ایسی صنف سخن ہے جس کے ذریعہ داخلی اور خارجی جذبات کا اظہار سادہ و عوامی زبان میں کیا جاتا ہے۔ غنائیت، آہنگ، سپردگی، لوچ، حسن بیان، جذبے کے شدت کی دین ہے۔ اس لئے عورتوں اور مردوں کے جذبات، واردات قلبی کی عکاسی اس صنف سے ہوتی ہے۔ ہر زبان میں گیت "واردات قلبی کی بنیاد پر خارجی کیفیت کا اظہار، لوچ اور جذبے کے تاثر سے پوشیدہ جذبات کے اظہار کی تلافی کرتا ہے۔ گیت براہ راست عوامی زبان و جذبات کے سہارے عوام تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اور محبت کے اظہار میں احساسات و جذبات کا نمائندہ ہے۔

اردو میں اس صنف کی تاریخ و تحقیق پر ڈاکٹر قیصر جہاں کی تصنیف "اردو گیت" اہم کارنامہ ہے۔ اس تصنیف میں اردو گیت کی تاریخ دور قدیم سے آج تک آجاتی ہے۔

ڈاکٹر عنوان چشتی نے "ہیئت کے تجربے" اور "اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت" میں "اردو گیت" میں گیت کی ہیئت پر کیا کیا تجربے ہوئے ہیں اس پر کافی مواد فراہم کیا ہے۔ گیت کی خصوصیات اور گیت کی اہمیت پر تبصرہ کیا ہے۔

ان حضرات سے پہلے بسم اختر بیگم نے اردو گیت پر اپنے تحقیقی کام کو "نگار" میں مضامین کی شکل میں مسلسل طور پر پیش کیا ہے۔

ان کے علاوہ گیت پر مختلف تصانیف میں مواد ملتا ہے۔

۱۔ شاعری اور تصویر سیفری	سید صفدر
۲۔ نئی شاعری کا مزاج	ڈاکٹر وزیر آغا
۳۔ تنقید و احتساب	ڈاکٹر وزیر آغا

گیت پر تصانیف حسب ذیل ہیں۔

١۔ قیصر جہاں — اردو گیت

٢۔ بسم اللہ بیگم — (غیر مدون)

٣۔ اردو کے لوک گیت — (اتر پردیش) — ڈاکٹر اظہر علی

۴۔ کوکن کے لوک گیت — میمونہ دلوی

اردو گیت

ڈاکٹر قیصر جہاں

ڈاکٹر قیصر جہاں کا مقالہ "اردو گیت" آٹھ ابواب پر مشتمل ذیل کے عنوانات سے گیت کی صنف پر مکمل کتاب ہے۔

پہلے باب میں گیت کی تعریف سے خصوصیات پر تبصرہ ہے اس ذیل میں انگریزی اور ہندی کے نقادوں کی آراء سے استفادہ کیا ہے۔ مقالہ نگار کی رائے کے مطابق

"گیت لمحاتی پرجوش اور شدید جذبے کا اظہار ہے۔ اس لئے اختصار اس کی لازمی شرط ہے۔ شدید جذبہ دیرپا نہیں ہوتا۔ اس لیے جہاں جذبے کی تان ٹوٹے گیت کو وہیں ختم ہو جانا چاہئیے طوالت سے گیت کا حسن مجروح ہو جاتا ہے۔"[1]

دوسرا باب لوک گیت کی تعریف، خصوصیت و روایت سے بحث کرتا ہے۔ اردو، ہندی لوک گیتوں کی بنیاد کا تحقیقی جائزہ ہے۔ تیسرا باب گیتوں کے موضوعات پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ مختلف موضوعات کے گیتوں کا انتخاب کتاب کی شان کو دوبالا کر دیتا ہے۔ چوتھے باب میں گیت کی فنی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے اچھے گیت میں سادگی سلاست غنائیت اور اختصار کی اہمیت کو واضح کرنے کے بعد مناظر فطرت، حب الوطنی، تہواروں اور مختلف طبقوں کے گیتوں کو نقل کیا ہے۔ اور صوتی آہنگ کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

پانچواں باب اردو گیت کا ارتقاء ۱۹۴۷ء تک خسرو سے نظیر اکبر آبادی تک شمالی اور جنوبی ہند کے شعراء کے کلام جو گیت کی تعریف کے مطابق نقل کیا ہے۔ ان کی خصوصیات پر تنقیدی تبصرہ قیصر جہاں

---

[1] اردو گیت۔ قیصر جہاں۔ صفحہ ۲۰

کی تنقیدی صلاحیت کا نمونہ ہے۔

چھٹا باب اردو گیت ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک ذیل میں بہادر شاہ ظفر سے آمانت تک کے گیت نگاری پر روشنی ڈالی ہے

ساتویں باب میں عظمت اللہ خاں افسر اور اندرجیت کی گیت نگاری میں اور گیتوں کو ہندی بحروں سے قریب لانے کا تذکرہ کیا ہے عظمت اللہ خاں اور ان کے معاصرین کے گیتوں کا انتخاب ہے۔ نیز گیت کی ہیئت، مواد کی تبدیلیوں اور موضوع کی وسعت پر بحث ہے۔ آٹھویں باب میں میراجی کے گیتوں کی خصوصیات اور معاصرین کے گیتوں کی خصوصیات کا جائزہ ہے۔

یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے گیت کی تاریخ کا تنقیدی سرمایہ ہے۔ ادب میں اس سے پہلے اردو گیت پر چند مضامین کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ کتاب ادب میں گیت کے موضوع پر گراں قدر اضافہ ہے۔

اتر پردیش کے لوک گیت

ڈاکٹر اظہر علی فاروقی

ڈاکٹر اظہر علی فاروقی کی تحقیقی کاوش "اتر پردیش کے لوک گیت" ہے۔ ۲۲۲ صفحات پر محیط ہے۔ علاقائی تہذیب، روایات، معاشرتی اقدار اور تاریخی حقائق کی ترجمان ہے۔ مصنف نے "اپنی بات میں" اپنی کاوش اور مختلف طبقوں کے حوالہ جات کی تمام روداد پیش کی ہے۔ "عمومی جائزے" میں لوک گیت کی تعریف اور مختلف اقسام کا تذکرہ کرتے ہوئے موصوف گیت کی اہمیت اس طرح واضح کرتے ہیں۔

"فطرت کا یہ تقاضا ہے گیت انسان کے وجود کے ساتھ جنمے ہوں گے۔ کب اور کس طرح اس کا صحیح صحیح وقت بتانا ظلمات کو تلاش کرنے سے کم دشوار نہیں۔"[1]

مصنف نے علاقائی نہج پر لوک گیت سے وابستہ تاریخ بیان کی ہے۔ لوک گیت کی زبان تجزیہ کیا ہے۔ لوک گیت کے مضامین سے بحث کی ہے۔ ان سے وابستہ افراد کا تذکرہ ساس، بہو، نند، جٹھانی وغیرہ کا ذکر ہے جغرافیائی سیاسی حالات اور حادثات کا اظہار کیا ہے۔

لوک گیتوں میں استعمال ہونے والے موسیقی آلات اسباب کا جائزہ لیا ہے۔ زبان، کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرنے میں بے لاگ، واضح اور برجستہ تبصرہ پیش کیا ہے۔

---

[1] اتر پردیش کے لوک گیت۔ اظہر علی فاروقی ص۹

حصہ دوم میں طرزِ معاشرت تمدنی اور قبائلی رسوم و رواج پر گائے جانے والے گیتوں میں ہندو مسلم مختلف ذاتوں، برادریوں، طبقوں مثلاً بھی ورون، ڈفالیوں، گدیوں، گھوسیوں اور دھوبیوں کا تاریخی پس منظر کے ساتھ اور تہذیبی، علاقائی، جغرافیائی کیفیات کی روشنی میں تنقید و تبصرہ کے ساتھ گیتوں کا انتخاب پیش کیا۔

حصہ سوم میں (تقریباتی سنسکار) گیت کے عنوان کے تحت علاقائی، مذہبی، نیم مذہبی، ناؤنی عوامی اور موسمی گیتوں کے تعلق سے مفصل تاریخ بیان ہے۔ رسم و رواج اور سماجی لحاظ سے وضاحت کی ہے۔ بعض بعض مقام پر نقشوں کے ذریعہ علاقوں کی نشاندہی کی ہے۔

حصہ چہارم میں پیشہ ور ذاتوں کے گیتوں کا انتخاب ہے۔ ان کے رسم و رواج، تقریبات، میلے تماشوں، عقیدت مندانہ جذبات کی نمائندگی کرنے والے گیتوں کا اچھا انتخاب کیا ہے۔ ذاتوں قبائل کی تاریخی حیثیت ان میں پرورش پلنے والے جذبات، عقیدت سے وابستہ احساسات کا اظہار منتخب گیتوں سے عیاں ہوتا ہے

کتاب مختلف علاقوں میں لفظوں کے رائج مفہوم، بگڑی ہوئی ہیئت کی تشریح اور وضاحت مصنف کی محنت کا ثبوت ہیں۔ لوک گیتوں کا یہ مرتب ذخیرہ، علاقائی لوک گیتوں کی تعریف و تاریخ، تہذیب، معاشرت، رسم و رواج، تقریبات، عوامی جذبات اور احساسات کا آئینہ دار ہے۔ اس ضمن میں مصنف کا قول نقل ہے

"لوک گیت محض جمع کرلینے سے یہ بات تو ناممکن ہے کہ ہم ماضی کے اس عوامی، تہذیبی سرمایہ کو نیست و نابود ہونے سے بچالیں۔ لیکن وہ بات اور جذبہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جو دیہات کی کھلی فضا اور کشادہ جنگلوں میں سننے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ لطف پڑھنے سے زیادہ سننے میں ہے" [1]

مصنف نے سنسکار اور چکی گیت جمع کرنے میں بڑی کاوش کی ہے۔ اس کو انھوں نے نقش اوّل کہا ہے۔ دعا، اس پر اضافہ کی امید ظاہر کی ہے۔ ناساز گار حالات پر انوری کے ایک شعر کو نقل کیا ہے۔ دراصل یہ ایک قطعہ ہے لیکن مصنف نے دوسرا اور تیسرا مصرع حذف کردیا۔

قطعہ یوں ہے۔

ہر بلائے کز آسماں آید
گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بر زمیں نارسیدہ می گوید
خانۂ انوری کجا باشد

---

[1] اتر پردیش لوک گیت - اطہر علی فاروقی ص ۱۵

مصنف نے الفاظ کی فرہنگ متن کے نیچے دے دی ہے اگر اسماء، اماکن، تقریبات، رسوم وغیرہ کی فہرست بھی دے دی جاتی تو مفید ہوتا۔

زیر نظر کتاب گیت کی صنفی تاریخ میں ایک مفید اضافہ ہے۔

سانیٹ

اردو شاعری میں سانیٹ انگریزی ادب میں سانیٹ کی ہیئت اور تکنیک کے مطابق لکھے گئے اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ صنف اردو میں انگریزی ادب سے آئی ہے۔ سانیٹ ۱۴ مصرعوں کی مسلسل نظم کا نام ہے۔ اس میں بندوں کی تعداد اور قوافی کی ترتیب مختلف ہوتی ہے۔ انگریزی میں سانیٹ کے لئے کوئی بحر مخصوص ہے اور اردو میں سانیٹ کے لئے کوئی ایک بحر مخصوص نہیں ہے لیکن ۱۴ مصرعوں کی پابندی اردو میں تسلیم کی گئی ہے۔

سید احتشام حسین اپنے مضمون "سانیٹ کیا ہے؟" میں رقمطراز ہیں کہ

"سانیٹ ۱۴ مصرعوں کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک بنیادی جذبہ یا خیال دو ٹکڑوں میں پیش کیا جاتا ہے۔"[۱]

حنیف کیفی نے اپنی کتاب "اردو شاعری میں سانیٹ" کی مذکورہ بالا تعریف کو تسلیم کیا ہے۔ ن م راشد کے خیال کے مطابق

"اردو شاعری میں سب سے پہلا سونیٹ اختر جونا گڑھی نے لکھا تھا۔"[۲]

سانیٹ کی صنف اپنے اصولوں کی روشنی میں قوافی کی مختلف ترتیب کی بدولت سخت مشکل بن جاتی ہے۔ چودہ مصرعوں میں خیال کا مکمل احاطہ بھی اس صنف پر طبع آزمائی سے محروم کر دیتا ہے۔ بقول ڈاکٹر عنوان چشتی۔

"اردو میں سانیٹ کی عدم مقبولیت کے کئی اسباب ہیں اس میں بحر اور قوافی کا نظام سخت ہے۔ اس کی پابندی شعری تجربہ کو منتشر کرتی ہے۔ اور شعری تجربہ کی اہمیت تازگی اور توانائی کو مخصوص اور طے شدہ سانچے میں ڈھلنے پر مجبور کرتی ہے۔"[۳]

اس صنف پر اردو ادب میں بہت کم مواد فراہم ہوتا ہے ڈاکٹر عنوان چشتی کی کتاب ہیئت کے تجربے کے علاوہ اس صنف کی مکمل معلومات حنیف کیفی کے تحقیقی [illegible] "اردو شاعری میں سانیٹ"

---

[۱] سالنامہ نگار ۔ پاکستان جنوری ۱۹۶۲ء سید احتشام حسین ص ۲۴۲ [۲] [illegible] نظم ۔ مرتبہ محمد حسن عسکری ص ۹۶

[۳] اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے ۔ ڈاکٹر عنوان چشتی ص ۱۸۵

سے ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں اس صنف پر صرف ہی ایک کتاب موجود ہے۔ اس پر مزید لکھنے کی گنجائش ہے

۱۔ اردو شاعری میں سانیٹ۔ حنیف کیفی بریلوی

اردو شاعری میں سانیٹ

ڈاکٹر حنیف کیفی

حنیف کیفی کا تحقیقی مقالہ "اردو شاعری میں سانیٹ" ۲۴۷ صفحات پر محیط ہے۔ پیش لفظ میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی رائے کتاب کی اہمیت کی وضاحت کرتی ہے۔

"اردو میں سانیٹ کے عروج و زوال کی یہ داستان اپنے اندر دلچسپی کا خاصہ سامان رکھتی ہے۔ حنیف کیفی صاحب سے پہلے کسی نے اردو میں کسی ایسی ادبی صنف پر جو تجربہ کے طور پر اپنائی گئی ہو۔ اتنی توجہ صرف نہیں کی۔ شروع کے دو ابواب انگریزی ادب میں سانیٹ کی ارتقائی تصویر پیش کرتے ہیں۔

جو اپنی معلومات کی اہمیت کے اعتبار سے ادب کا تقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لئے خاصے مفید ثابت ہوں گے۔ بعد کے چار ابواب میں اردو سانیٹ کی ابتدا اور ارتقاء کی تفصیل پیش کی گئی ہے اور تمام ضروری ماخذ کو کھنگال کر نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ مصنف کی رائے ہر جگہ جچی تلی، مناسب اور متوازن ہے"[۱]

مصنف نے دیباچہ میں مقالے کی تفصیل کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے اور مقالہ میں لائبریریوں اور ان کے ناظم حضرات کا شکریہ ادا کیا ہے۔ چھ ابواب کی اس کتاب کا اول باب سانیٹ کیا ہے؟ تمہید، لغوی اور اصطلاحی مفہوم، اقسام، عروضی حیثیت، موضوعات، حدود اور امکانات، وغیرہ عنوانات کی روشنی میں سانیٹ کے فن پر روشنی ڈالتا ہے۔

باب دوم میں انگریزی سانیٹ کی نشوونما، سانیٹ کی ابتدائی نشوونما اور اطالوی سانیٹ انگریزی سانیٹ کے نقوش اولین، عہد زریں، شعراء مابعد، دور حاضر کے موضوعات سے سانیٹ کی کی ابتدا اور عہد حاضر تک انگریزی سانیٹ کی نشوونما کا جائزہ لیا ہے۔ اس باب میں مختلف ادوار کی نشاندہی کی گئی ہے اور انگریزی ناقدین کی آراء کا ترجمہ پیش کیا ہے۔

باب سوم سے پنجم تک تین ابواب میں اردو سانیٹ کے عمومی جائزے میں نمائندہ شعراء پر تنقیدی

---

[۱] اردو شاعری میں سانیٹ۔ حنیف کیفی پیش لفظ گوپی چند نارنگ ص۱۱

صوبوں کے پیشِ نظر خصوصی بحث کی گئی ہے اس طرح اردو سانیٹ کی ابتدا سے آج تک کے ارتقا میں پس منظر، عوامل، وجود آغاز، زمانی تقسیم اور مختلف ادوار میں شعراء کے نقطۂ نظر کی وضاحت سے ایک تاریخ مرتب ہو گئی ہے۔

چھٹے باب میں سانیٹ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ سانیٹ پر صنفِ سخن کی حیثیت سے بحث کی گئی ہے اور پچھلے ابواب کے اصولوں کی روشنی میں نتائج اخذ کئے ہیں اردو انگریزی سانیٹ کا موازنہ کرتے ہوئے اردو کی چند اصناف سخن سے مماثلت کا حوالہ دیا ہے اس صنف کی شاعرانہ قدر و قیمت کے ساتھ اس عدمِ مقبولیت کے اسباب کی وضاحت کی ہے۔ ماضی و حال کی روشنی میں مستقبل پر اپنی رائے پیش کی ہے اس کتاب میں کتابیات کی فہرست کے علاوہ فرہنگ اصطلاحات کے عنوان سے انگریزی اصطلاحات اور ان کے اردو مترادفات درج کئے ہیں جن سے قاری کی رہنمائی ہوتی ہے۔ اور کتاب کا معیار بلند ہو جاتا ہے اس کتاب میں مصنف کا بیان قابلِ غور ہے۔

"اردو شاعری میں سانیٹ" اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو ادب میں پہلا تحقیقی و تنقیدی مقالہ ہے۔ اور اس کی تشکیل و تکمیل کے لئے انگریزی اور اردو کی متعدد تنقیدی کتب، تواریخ ادب اور شعراء کے دواوین کے مطالعے کے علاوہ سیکڑوں رسائل کی ورق گردانی کی گئی ہے"[1]

یہ کتاب سانیٹ کی صنف پر نقشِ اولین کی حیثیت رکھتی ہے اور اردو اصناف ادب کی تاریخ میں گرانقدر اضافہ ہے۔

حمد و ثنا اور مناجات

منظوم انداز میں خدائے وحدہٗ کی بزرگی و برتری، اس خالقانہ صلاحیتوں اور ربوبیت کی صفات کا اعتراف۔ خدا کی تمام صفات کا ذکر کائنات میں اس کی صفات کا مختلف انداز میں مظاہرہ، اس کے مختلف روپ کا بیان اس ذات واحد کی تعریف و توصیف کو حمد اور ثناء کہتے ہیں۔

اس کی ہیئت نظم اور غزل، مسدس، مثنوی، مرثیہ وغیرہ ہر صنف کا اشتراک رکھتی ہے۔ کیونکہ ہر شاعر مرثیہ، مثنوی، قصیدہ کی ابتدا خدا کی تعریف سے کرتا ہے۔ ہر شاعر اپنے مجموعہ یا دیوان کی ترتیب میں اولیت حمد اور ثناء کو دیتا ہے۔ یہ خدا کی برتری، بلندی اور بزرگی کا اعتراف ہے اور اس کی بندگی کے تقاضوں

---

[1] اردو شاعری میں سانیٹ۔ حنیف کیفی۔ ص۱۲۔ دیباچہ

میں سے ایک حق ہے۔ اسی لئے ہر شاعر جو مسلمان ہے کسی بھی زبان میں شاعری کرتا ہو۔ لیکن وہ کلام کی ابتداء حمد و ثناء سے کرتا ہے۔ اسی لئے اس صنف کا خالص ہیئت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

دورِ قدیم کے شعراء مثنوی نگاروں نے مثنوی کی رائج بحروں میں حمد لکھی اور مثنوی کی بحر کے مطابق اسے اپنی مثنوی کی ابتدا بنائی۔ قصیدہ گو شعراء نے قصیدوں کے انداز میں حمد و ثناء بیان کی ہے۔ مرثیہ گو نے اپنے مرثیہ کی بحر کے مطابق حمد کہکر مرثیہ کی زینت بڑھائی ہے۔ مجموعۂ کلام اور دیوان کی ابتدا میں غزل کی بحر میں حمد و ثناء لکھی گئی ہے۔ اس بنیاد پر ثابت ہے کہ حمد و ثناء ہر ہیئت اور ہر بحر میں کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ہر فنکار ایک فریضہ سمجھکر اس پر مشق سخن کرتا ہے۔

دعا:- حمد و ثنا میں تعریف و توصیف کے مراحل سے گذرنے کے بعد بعض حمد میں خدا سے عزت اور توقیر مانگتے ہیں یا بعض شعراء حمد و ثناء کی جگہ دعا پر اکتفا کرتے ہیں اور خدا سے منظوم دعا مانگتے ہیں۔ دعا مانگنے کے لئے جیسا کی خدا کی صفات، تعریف و توصیف کے بعد عرضِ مدعا کا عمل اپناتے ہیں۔ حمد و ثناء کی طرح دعا بھی صنف سخن کی ہر بحر میں کہی گئی ہے۔ اردو میں جتنی بحریں رائج ہیں اکثر بحروں میں دعا ملتی ہے۔

اردو میں جتنی کتابیں ہیں ان میں حمد و ثنا اور دعا کے اصول اور قواعد کا کوئی ذکر نہیں ملتا کیونکہ اس کا تعلق راست جذبات اور دل کی گہرائیوں سے ہوتا ہے۔ بندگی، اطاعت فرمانبرداری، تعریف، مدحت، توصیف یہ تمام جذبے اصول و قواعد کے محتاج نہیں ہیں۔ ادب اور احترام کے حدود میں جذبات کا اظہار اور نیت کا مظاہرہ خود قواعد اور اصول ہیں۔ لیکن ہمارے ادب میں حمد و ثناء اور دعا جیسی صنفوں پر کافی کام کیا جا سکتا ہے تمہید اور تائید جیسے اصول بنائے جا سکتے ہیں۔

حمد اور دعا کی ابتداء کیسی ہو۔ انتہا کس طرح کی جائے یہ ہمارے لئے غور کرنے کا مقام ہے۔ جذبات کے اظہار میں تسلسل کے ساتھ تعریف و توصیف اور دعا کے آداب کا بیان جذبات میں ہم آہنگی کے ساتھ ہونا چاہئے۔ اس مسئلہ پر سوچنے کی ضرورت ہے۔

نعت

اصنافِ سخن میں نعت کو بھی ایک صنف کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس میں حضور نبی اکرم ﷺ کے اوصافِ حمیدہ کا اظہار شعر میں کیا جاتا ہے۔ سیرت و کردار، عادات و اطوار کا جائزہ اور حضور کی تعریف و

توصیف کے لئے واحد صنف ہے دورِ قدیم میں اکثر شعراء مثنوی میں پہلا درجہ حمد و ثناء کو اور دوسرا درجہ نعت کو دیتے تھے۔ کثر قصیدہ میں بھی اس روایت کو دہرایا جاتا تھا۔ بعض مرثیہ گو شعراء نے بھی اس بنیاد پر نعت لکھی ہے۔

نعت کی ہیئت بھی ہر صنف کے ساتھ اسی صنف کی بحریں ملتی ہے۔ اکثر شعراء نے صنف کی بحریں مختلف بحروں میں بھی نعت کہی ہے لہذا نعت کی صنف بھی مخصوص بحور کی پابند نہیں ہے۔ بلکہ ہر شاعر نے اپنی صنفی بحروں میں کہا ہے۔ زیادہ شعراء نے اس کے لئے غزل کی بحریں اپنائی ہیں۔ اساتذہ اور متقدی شعراء میں کثر شعراء اپنے مجموعے یا دیوان کی ابتداء حمد و ثناء سے کرتے ہیں اور حمد و ثناء کے بعد دوسرا درجہ نعت کو دیتے ہیں۔ یہ رسولؐ سے عقیدت کا مظاہرہ بھی ہے اور ایک روایت کا اعادہ بھی ہے۔ ایک موضوع کے تحت نعت یا حمد و ثنا صنعتی خصوصیات سے معمور بھی ہوتی ہیں۔ آسان و سہل زبان میں مخصوص موضوع کی نمائندہ ہیں۔ اوزان کی پابندی سے بحروں کے اصول اور قواعد کی ہم نوا ہیں۔ خیالات کا اردو میں عقیدت مندی کے جذبات کا اظہار ہیں۔ اس لئے انھیں صنف کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ تو دوں میں نعت تقریباً ہر شاعر نے کہی ہے۔ لیکن نعت کا مجموعہ ظفر علی خاں اور ماہر لقادری نے پیش کیا ہے۔ نعت پر ابھی ہمارے یہاں کام کرنے کی گنجائش ہے۔

تاریخ

صاحب بحر الفصاحت نجم الغنی نے اسے بھی ایک صنف قرار دیا ہے [1] کسی واقعہ کی تاریخ حساب جمل سے یعنی حروف کے ابجدی اعداد سے نظم کی جائے یا کسی شخص کی تاریخ وفات مدسنین کے نظم میں ایک مصرعہ کے اعداد یا اشعار کے اعداد سے اخذ کی جائے اسے قطعہ تاریخ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اردو میں فارسی تقلید میں قطعہ کی شکل میں زیادہ کہی گئی ہے۔ بعض اوقات مثنوی میں بھی مادۂ تاریخ اخذ کیا گیا ہے۔

قطعہ تاریخ میں مادۂ تاریخ اوزان کی قید میں لفظوں سے ظاہر کرنے کے لئے فن شاعری میں مشاق شعراء کا کام ہوتا ہے۔ اکثر اساتذہ نے ایسے قطعات کہے ہیں قدیم عہد میں رباعی کے اوزان میں بھی مادۂ تاریخ ظاہر کئے ہیں۔

---

[1] بحر الفصاحت نجم الغنی صہ ۹۹

اکثر تاریخ حرف حرفوں اور لفظوں میں بیان کردی جاتی ہے۔ ایسی تاریخ ملفوظی یا صوری تاریخ کہلاتی ہے۔ کبھی کبھی تین اردو مصرعوں میں چوتھا مصرعہ فارسی کا ہوتا جس سے مادۂ تاریخ اخذ کرتے ہیں۔ بعض شعراء کے یہاں آخری کے دو مصرعوں سے تاریخ اخذ کی گئی ہے۔ قطعہ تاریخ پڑھتے وقت یا لکھتے میں شاعر وضاحت کر دیتا ہے کہ فلاں تاریخ اور سنہ کن مصرعوں کے اعداد سے اخذ کئے گئے ہیں۔

نوحہ

نوحہ کا بنیادی مقصد اجتماعی ماتم ہے[1] اکثر نوحے سلام اور مسدس کی ہیئت میں ملتے ہیں۔ لیکن اسے کئی آدمی مل کر پڑھتے ہیں۔ اس میں آخری ٹکڑا ٹیپ ہونے کے سبب اجتماعی ترنم کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اس لئے نوحے مستزاد کی ہیئت میں زیادہ لکھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی مرثیہ یا سلام کی ردیف میں ماتمی لفظ ہوں۔ مثلاً ہائے ہائے۔ ہائے حسین اسے کبھی نوحہ کہا جاتا ہے۔ نوحہ کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں۔

۱۔ "واویلا" تیرہ کی مرثیے ایسے ہیں جن کی ردیف واویلا ہے۔ واویلا کی سرخی ہے ڈ ڈاکٹر چراغ نے اسے ایک صنف میں شمار کیا ہے[2]

۲۔ "ماتم" جس نوحے میں سینہ کوبی تال اور ٹھیکے سے کی جائے۔

ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی کے مطابق وہ نوحے کی دوسری صنف ماتم ہے۔ موصوف کے مطابق کچھ ماتمی نوحے ایسے ہیں جن میں فارسی مصرعوں سے ماتم کی کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔ مثلاً واویلا، واویلا۔ لیکن ماتم ہیئت میں نوحے کے بجائے مرثیہ سے مرثی ہوتی ہے ایسے نوحے کی ابتداء نجم آفندی سے ہوئی۔ ان کے بعد نفل نقوی نے ایسے نوحے لکھے تھے۔

ماتمی جلوس مجلس عزا کی اہم ضرورت اور فرض کو پورا کرنے کے لئے یہ صنف زندہ رہے گی۔

ساقی نامہ

ایسی نظم یا اشعار جس میں ساقی کو مخاطب کیا جائے ساقی نامہ کہلاتے ہیں۔ اس کے لغوی معنی خمریات کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ لیکن مفہوم کے معنی الگ ہیں اس میں فلسفہ، اخلاقیات،

---

[1] رسالہ شب خون (جولائی۔ اگست ستمبر) گیان چند جین صفحہ ۲۳
[2] اردو مرثیہ کا ارتقاء۔ ڈاکٹر مسیح الزماں / ڈاکٹر چراغ علی صفحہ ۱۹۵

سیاسی افکار انسانی کردار کی پستی و بلندی کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اسی نظم کے ذریعہ شاعر اپنا ذاتی نظریہ پیش کرتا ہے۔ علامہ اقبال کے ساقی ناموں میں سیاسی و اخلاقی نظریات کا پرتو موجود ہے۔

ساقی نامہ کی ابتدا عہد قدیم سے ہوئی ہے۔ اکثر مثنویوں کی ہر فصل کی ابتدا میں چند اشعار میں ساقی مخاطب ہے۔ زیادہ تر ساقی نامے مثنوی کی ہیئت میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی غزل کی ردیف ساقی ہو، اسے بھی ساقی نامہ کہہ سکتے ہیں۔ لہ ایسی مثال اقبال کے یہاں موجود ہے۔ نظم یا مثنوی میں لکھے ہوئے ساقی ناموں کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہے۔ مثلاً میر حسن کی مثنوی کی ہر فصل کی ابتدا میں ایک دو اشعار میں ساقی سے خطاب ہے [2] لیکن طباطبائی کا ساقی نامہ "شقشقیہ" تقریباً اٹھارہ سو اشعار پر مشتمل ہے [3] جوش کی اکثر نظموں میں ساقی پر کچھ اشعار ملتے ہیں۔ عہد جدید میں علی سردار جعفری کا ساقی نامہ قابل ذکر ہے۔

قطعہ

اس میں مطلع نہیں ہوتا یعنی مصرعے مقفیٰ نہیں رہتے لیکن تمام اشعار کے مصرعۂ ثانی مقفیٰ ہوتے ہیں۔ غزل کی طرح اس کی کوئی مخصوص بحر نہیں۔ اور نہ ہی محدود مصرعوں کا پابند ہوتا ہے۔ بحر الفصاحت میں قطعہ کی کم سے کم تعداد دو اشعار اور زیادہ سے زیادہ ایک سو ستر بتائی گئی ہے اکثر قصیدوں میں پہلی منزل قطعہ ہوتی ہے۔ سودا، ذوق، غالب کے قصائد میں اکثر پہلے قطعہ ملتا ہے۔ دراصل یہ عربی کی تقلید ہے۔ کیونکہ عربی قصائد کی یہی روایت رہی ہے۔

لیکن اردو میں قطعہ میں مطلع نہ ہونے کی روایت سے انحراف کیا گیا ہے۔ [4]

بانگ درا میں اقبال کی نظم نمود صبح، بال جبریل میں، لینن، کلیات چکبست میں حب قومی اور رضا سیماب اور جوش کی اکثر مطلع وار قطعہ کی نظمیں ملتی ہیں۔ ہمارے یہاں قطعہ پر تحقیق کام ہو رہا ہے لیکن اس صنف میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

واسوخت

فارسی زبان کا مضارع واسوختن سے مستعار واسوخت کے اصطلاحی معنی معشوق سے بیزار ہونا ہے

لہ رسالہ شب خون ۱۹۹۰ء شمارہ ۱۲۸ (جولائی، اگست، ستمبر) ڈاکٹر گیان چند جین صفحہ ۲
[2] مثنوی سحر البیان میر حسن۔ [3] رسالہ شب خون، ڈاکٹر گیان چند جین صفحہ ۲
[4] ایضاً صفحہ ۱۳

واسوخت میں محبوب کو اس کی بے وفائی پر شکوے شکایات کی صورت میں جلی کٹی سنا کر خبردار کیا جاتا ہے کہ عاشق اسے ٹھکرا کر دوسری حسین تر محبوب سے عشق کر رہا ہے۔ اس پر پہلی محبوبہ عاشق کی خوشامد کر کے رسے راضی کر لیتی ہے۔

"واسوخت کا شاعر بدتمیزی تو نہیں کرتا۔ لیکن معشوق کے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اسے اپنی اہمیت اور خودداری کا احساس دلاتا ہے۔" [۱]

واسوخت کا دوسرا نام قدما کے یہاں سوز ملتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے اسے فارسی شعرا اور نفوسی یا وحشی کی ایجاد لکھا ہے۔ [۲]

پروفیسر محمد حسن نے مسعود حسن رضوی کی بیاض کے حوالے سے شائع شدہ مضمون معاصر ۱۹۵۱ء میں اردو کا پہلا واسوخت نگار آبرو کو بتلایا ہے۔ [۳]

محمد حسین آزاد نے واسوخت میں سراپا داخل کرنے کا سہرا امانت کے سر باندھا ہے۔ لیکن ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق جرأت کے واسوخت میں سراپا ملتا ہے۔ [۴]

واسوخت میں نسوانی لباس اور آرائش جمال سے وابستہ لوازمات کا بیان تفصیل سے کیا جاتا ہے۔ اس صنف کی ہیئت مقرر نہیں۔ کیونکہ قدما کے یہاں مثمن اور مسدس میں واسوخت ملتے ہیں۔ آبرو، میر اور امانت کے واسوخت مسدس میں ہیں۔ لیکن مومن نے غزل میں بھی واسوخت کہا ہے۔ اس صنف کی روش آج کل کی شاعری میں ختم ہو چکی ہے۔ لیکن اکثر شعرا کی نظموں میں طنز و شکایات کے روپ میں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

اردو کی تاریخوں میں اس صنف کا ذکر موجود ہے لیکن اس فن پر کوئی تصنیف نہیں ملتی۔

مُسَمَّط

مسمط کے معنی پرونے کے ہیں۔ اور شاعری میں چند مصرعوں کو ایک بحر کی لڑی میں پرو کر بند کی تشکیل کرتے ہیں۔ اسی لئے اس صنف کو مسمط کہا جاتا ہے۔ مسمط میں مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن، متسع اور معشر یعنی مصرعوں کی تعداد تین سے دس تک مسمط میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں ہر شکل کے بند کے مصرعوں کی تعداد کے مطابق اس شکل کا نام سطور بالا میں دیا گیا ہے۔

---

[۱] شعر غیر شعر اور نثر، ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی (؟) ... عتیق حنفی صفحہ ۱۲۳ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۸۳ء [۲] آب حیات محمد حسین آزاد صفحہ ۲۰۶
[۳] ڈاکٹر محمد حسن۔ دیوان آبرو کا مقدمہ صفحہ ۱۱ [۴] رسالہ شب خون جولائی اگست تحریر گیان چند جین صفحہ ... ۱۹۶۵ء

اسی مناسبت سے ہر بند کی ترتیب ہوتی ہے۔

ہر بند میں بحر کے مطابق مصرعوں کا وزن ایک ہوتا ہے۔ اور ہر بند کا وزن بھی ایک ہوتا ہے۔ پہلا بند مطلع ہوتا ہے۔ اور دوسرے تمام بندوں میں آخری مصرع مطلع کے قوافی میں کہا جاتا ہے۔ اور باقی مصرعوں میں دوسرے قوافی استعمال ہوتے ہیں مثلاً مثلث کے پہلے بند کے تینوں مصرعوں میں الف قوافی آئے ہیں۔ دوسرے بند کے دو مصرعوں میں ب قوافی آسکتے ہیں۔ لیکن تیسرے یعنی آخری میں بند اول کے آخری مصرع میں الف قوافی کا استعمال ہی کرنا پڑے گا یہی ترتیب تمام شکلوں میں جاری رہتی ہیں۔ چاہے مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن، مقنع، یا معشر ہو۔ لیکن قدماء نے ان اشکال میں قوافی کی ترتیب میں بعض مقامات پر تبدیلیاں کی ہیں انھوں نے ٹیپ کے دونوں مصرعوں کو باہم مقفیٰ کیا۔ اور ہر بند کے آخری مصرع میں پہلے بند کے قافیہ کے التزام میں ترک کر دینے سے مسدس کی ہیئت میں لچک اور روانی پیدا ہوئی اور انیس و دبیر کے کئی کامیاب مرثیے اس کی مثال ہیں۔

نظیر اکبرآبادی کی کئی نظمیں اس ہیئت کے تجربوں کی گواہ ہیں۔ انھوں نے اردو کی بحور کے علاوہ اردو ہندی کی مشترک بحروں میں بڑی روانی اور فراوانی سے اظہار کیا ہے اور ان بحروں کے تنوعات کا لحاظ رکھا۔

درج ذیل نظمیں اس بات کا ثبوت ہیں۔

ہولی کی بہار، بنجارہ نامہ، پری کا سراپا، برہا کی آگ، مہادیو جی کا بیاہ، چڑیوں کی تسبیح، اور نانک وغیرہ۔

ہندی اور اردو کی مشترک بحروں کا یہ تجربہ ان کی تخلیقی صلاحیت کی دین تھی جس کو انھوں نے اسلوب کے ذریعہ خیال اور جذبے سے ہم آہنگ کیا۔ اس نقطۂ نظر سے "مہادیو جی کا بیاہ" قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ کیونکہ یہ نظم ہندی کے مختلف بحروں میں ہے۔[۱] اور شروع میں چھ شعروں کا ایک ابتدائیہ ہے۔ جو دوہے کے بحر میں ہے۔ پہلے بند میں سات مطلع ہیں۔ جو ایک ترتیب و قوافی میں ہیں۔ اس کے بعد ایک مطلع دوسری بحر اور دوسرے قوافی میں ہیں۔ نظموں کے تمام بندوں میں ایسا ہی ہے۔

اس طرح مسمط کی ترقی یافتہ شکل کا سہرا بھی قدماء کے سر پر باندھا جاسکتا ہے۔ مسمط کی صنف

---

[۱] اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت۔ ڈاکٹر عنوان چشتی۔ ص ۵۹

میں مسدس حالی مشہور نظم ہے۔ لیکن یہ ایک بحر میں ہے جس کو صرف مسمط کی شکل کہہ سکتے ہیں۔

مسمط ایک ایسی صنف ہے جس کے ذریعہ خیال اور واقعہ کو وسعت دے کر مختصر بھی کیا جا سکتا ہے مثنوی کی طرح اس کے ذریعہ واقعہ کو طول بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن فنی نقطہ نظر سے اس صنف میں اظہار کا طریقہ وہ شاعر اپنا سکتا ہے جو قادر الکلام ہو۔

اردو ادب میں اس صنف کا شمار برائے نام نہیں۔ کیونکہ قدما نے اس میں اچھی اچھی نظمیں اور مسدس کا اضافہ کیا ہے۔ اور ادب کے ذخیرہ کو بڑھایا ہے۔ ہمارے یہاں اس صنف پر کوئی خاص کتابیں نہیں ملتیں۔ بلکہ مختلف کتابوں میں اصناف سخن کے باب میں اس پر مختصر معلومات فراہم کی گئی ہے۔

مستزاد

کسی بھی صنف کے شعر یا مصرعوں کے ساتھ بڑھائے ہوئے ٹکڑے کو مستزاد کہتے ہیں یعنی کسی صنف کی مخصوص ہیئت میں اوزان کے ساتھ کسی ٹکڑے کا اضافہ مستزاد ہوتا ہے۔ وزن کی پابندی کے ساتھ اس میں قافیہ اور ردیف کی پابندی ضروری ہے۔ شعر میں بڑھائے ہوئے ٹکڑے شعر یا مصرع کے مفہوم سے وابستہ رہتے ہیں۔ نجم الغنی نے اس کی دو قسمیں بتائی ہیں۔[1] (۱) مستزاد عارض (۲) مستزاد لازم

مستزاد عارض میں شعر کا مضمون بڑھائے ہوئے فقرے پر منحصر نہیں ہوتا۔ مستزاد فقرے کی ہر ہیئت کے ساتھ ملتے ہیں۔ اسی لئے عروضی اسے باقاعدہ کوئی صنف تسلیم نہیں کرتے۔ مستزاد لازم میں اضافہ کیا ہوا ٹکڑا شعر کے مضمون پر منحصر ہوتا ہے۔ مستزاد ٹکڑوں میں اشعار کو پڑھتے ہوئے قوافی اور بحر کے مختلف آہنگ کو آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

دور قدیم سے مستزاد ٹکڑے ہر صنف کے ساتھ ملتے ہیں۔ مثلاً عشق اورنگ آبادی نے رباعیات کے ساتھ، سودا نے رباعی، مربع بند کے ساتھ، بہادر شاہ ظفر کے یہاں غزل، انشاء، شیدا اور قدیم شعراء کے یہاں مستزاد کی مثالیں ملتی ہیں۔ ہمارے ادب میں مستزاد پر کسی بھی قسم کا کام نہیں ہوا۔ شاید اسے مستقل طور پر کوئی ہیئت تسلیم نہیں کیا ہے جب کہ اس صنف کی تاریخ پر لکھنے کی گنجائش اور ضرورت ہے۔

---

[1] بحر الفصاحت ۱۹۲۰ء لکھنؤ، نجم الغنی۔ صفحہ ۱۱۶

اصنافِ ادب کی تاریخیں

دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان ماحول اور حالات کے مطابق معاشرتی، علاقائی اور آفاقی اقدار میں رائج فلسفوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ یہ نوع انسان کے جذبات اور احساسات کے اظہار کا نمائندہ ہوتی ہے۔ انسانی قدریں، علاقائی تہذیب، قومی نظریات، ذاتی صفات، نسلی امتیازات اخلاقی اقدار، فطری صفات، نفسیاتی تقاضے انداز فکر کے مطابق زبانی اظہار میں جذب رہتے ہیں ہیں۔

زبان طریقۂ اظہار میں اسلوب کے اصول اور ضابطوں کے عمل سے صوتی آہنگ، فصاحت اور بلاغت کا آئینہ بن جاتی ہے۔ جس کو اسلوب کہتے ہیں۔ اسلوب اظہار شدہ بات میں تاثر کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسلوب لفظی آہنگ کے اصولوں کے تحت مختلف ذرائع اظہار کو اپناتا ہے جو مختلف کارکردگی سے خصوصیت کے ساتھ زبان کے ذخیرہ میں ادب سے وابستہ صنف کہلاتی ہے۔ صنف اپنی کثرت سے ادب میں اصناف کی اصطلاح سے مشہور ہوتی ہے۔

اردو زبان دوسری زبانوں کی طرح اپنے صوتی آہنگ اور نثری امتزاج سے ادبی تنوع کے ساتھ کئی ایک اصناف کی مالک ہے۔ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اردو زبان کا دائرۂ فکر اور دائرۂ کار دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

ادب اور سماج کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اردو زبان بھی مختلف ادوار میں اپنے سماج اور وقتی تقاضوں کا ذخیرہ رکھتی ہے۔ کلاسیکی ادب سے عصر حاضر تک کے ادب میں یہ زبان ایک بہترین ادبی زبان کے روپ میں انسانی جذبات و احساسات کا اظہار صنف سخن کے ذریعہ اپنے دائرے کو وسعت دے رہی ہے۔ اردو ہر عہد میں وقتی تقاضوں اور اخلاقی قدروں کے بموجب اصناف ادب کے ذریعہ ادبی کارکردگی سے اپنا ایک کردار بنا چکی ہے۔ اس میں مختلف ادوار میں مختلف اظہار کے نمایاں اوصاف نظر آتے ہیں۔ اس کی ادبی تاریخ مسرت سے ہو کر بصیرت کے کئی کردار روشن کر رہی ہے

ادب زندگی کا آئینہ ہے۔[1]

ادب کے آئینے میں زندگی کے کئی کردار اور روپ بنتے بگڑتے جا رہے ہیں۔ اردو میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی دونوں کرداروں کے اوصاف مختلف ادوار میں پائے جاتے ہیں اور دونوں کبھی

---

[1] ادب اور زندگی ۔ مجنوں گورکھپوری ص ۱۵

تحریکوں کے روپ سے کبھی رجحانات کے توسط سے مزاج اور ماحول کے تحت اسلوب میں تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں کبھی زبان کی خوبصورتی، کبھی مواد کی ذخیرہ اندوزی نے زبان کو مالا مال کیا ہے اس طرح اردو زبان ادبی مزاج شناسی کے کئی روپ میں اظہار کا ذریعہ ثابت ہوئی ہے جنھیں ادب زبان میں اصناف ادب اور اصناف سخن کی اصطلاحات سے یاد کرتے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر ارتقا پذیر زبان اپنے ابتدائی دور میں قصے کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔ اور یہ قصے کہانیاں اظہار بیان کے خصوصی طرز تحریر کے سہارے ادبی معیار کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اور اساطیری ادب کے نام سے مشہور ہو کر اپنے دور کی معاشرت، تہذیب، اخلاقی اقدار، زبان و بیان کی خصوصیت سے اپنے دور میں رائج اقدار کا تعین بن جاتے ہیں۔ ایسے ترقی فکر کا ترقی یافتہ خاکہ ادب کی ایک صنف داستان کہلاتا ہے۔

داستان:- ادب کی یہ صنف محض تفریح طبع کا ذریعہ تھی کیونکہ اس میں اصل و قصہ یا قصہ میں قصہ در قصہ کی ضمنی کہانیاں جنم لیتی ہیں مقصد سامع اور قاری کو انجام کا اشتیاق بنا رہتا ہے۔

۱۔ اس میں اکثر کردار اتفاقات کی روشنی میں اور غیبی سے سہارا لیتے ہیں۔

۲۔ داستان کی دوسری اہم خصوصیت مافوق الفطرت عناصر پر مشتمل ہے۔ مثلاً جن، دیو، پری، طلسمات کے زیر اثر حیرت انگیز واقعات کا رونما ہونا اور اتفاقات سے ان قوتوں کو یاد کیا۔

۳۔ داستان کے کردار اونچے طبقے بادشاہ و نوابین سے تعلق رکھتے ہیں عوامی کردار مرکزی کردار کے حالات کے مطابق منسلک ہوتے ہیں۔

۴۔ داستان میں مرکزی خیال عشق و حسن ہے۔ عشق اور حسن کی خصوصیات دنیا میں مثالی ہونا ضروری ہے۔

۵۔ اسی لئے داستان کے ناولوں میں تنوع اور رنگا رنگی نہیں ہوتی۔ بلکہ یکسانیت پائی جاتی ہے۔

اردو میں داستان نگاری کی تاریخ کی ابتدا دکن سے شروع ہوتی ہے مثنویوں کے روپ میں منظوم داستانیں ہیں اور نثری داستانوں کا سراغ بھی دکن میں ملتا ہے مثلاً کدم راؤ پدم راؤ، نظامی، غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال، مقیمی کی چندر بدن و مہیار، غواصی کا طوطی نامہ، جنیدی، ماہ پیکر، ابن نشاطی پھول بن، نصرتی گلشن عشق، طبعی کی بہرام و گل اندام، منظوم داستانیں ہیں۔

نثری داستان میں ملا وجہی کی سب رس ہے۔ شمالی ہند میں میر تقی میر شعلۂ عشق اور دریائے عشق راحج میر اثر وغیرہ کی منظوم داستانیں ہیں۔ نثر میں میر عطا حسین خاں تحسین، نوطرز مرصع کی نثری داستان ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں لکھنے والے میر امن باغ و بہار، گلکرائسٹ، قصص مشرقی، حیدر علی حیدری طوطا کہانی، آرائش محفل، میر بہادر حسین نثر بے نظیر، اخلاق ہندی، مظہر علی خاں ولا، بتیال پچیسی مرزا کاظم علی جوان، شکنتلا، خلیل خاں رشک امیر حمزہ وغیرہ کی داستاں مشہور ہیں۔

ان کے علاوہ انشاء اللہ خاں انشاء رانی کیتکی، مرزا رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب داستان اور ناول کے بیچ کی کڑی کہی جا سکتی ہیں۔

داستانوں میں مقصد تفریح طبع ضرور تھا لیکن اس صنف میں قاری اور سامع میں ہمت، حوصلہ اور توانائی کے جذبات اور احساسات بیدار ہوتے تھے ان داستانوں کا آج بھی یہ تاثر ہے کہ پڑھنے والا کیف و سرور کے ساتھ ہمت، حوصلہ اور توانائی کی خواہش کرتا ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے ادب میں ایک فن کی حیثیت سے داستان ہمیشہ زندہ رہے گی۔

اس فن کی تاریخ پر ہمارے ادب میں بہت کچھ تحقیق ہو چکی ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے داستانوں کی خامیاں اور خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ لیکن اس موضوع پر آج بھی مزید کام کی ضرورت ہے۔

ہمارے ادب میں داستانوں پر درج ذیل کتابیں ملتی ہیں۔

۱۔ داستان سے افسانہ تک — وقار عظیم

۲۔ فن داستان گوئی — مجنوں گورکھپوری

۳۔ داستان گوئی — ڈاکٹر کلیم الدین احمد

۴۔ ہماری نثری داستانیں — ڈاکٹر گیان چند جین

فن داستان گوئی

کلیم الدین احمد

اس کتاب کے مؤلف پروفیسر کلیم الدین احمد ہیں۔ اس تالیف میں "طلسم ہوش ربا" "بوستان خیال" کا ذکر ہے مختصر داستانوں میں "باغ و بہار" "فسانۂ عجائب" اور "آرائش محفل" کے علاوہ منظوم داستانوں میں مثنوی

"میرحسن" اور گلزار نسیم کا ذکر ملتا ہے۔ داستانیں افسانے "قصہ کہانیاں ہر زمانے میں مقبول رہیں۔ حالات کے اعتبار سے وقت کے تقاضوں پر داستانیں افسانوں اور ناولوں کی صورت میں اختیار کرتی ہیں ۱۹۳۶ء سے پہلے کا دور ایسا ہی تھا۔ اس دور میں داستان گوئی کے خاتمے نے نئی قدروں میں افسانوی اور ناول کے اثرات چھوڑے۔ غالباً اسی ارادے سے داستان کی یاد تازہ کرنے کے لئے کلیم الدین نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بہت عمیق نظری سے مندرجہ بالا داستانوں کا جائزہ پیش کیا گیا۔ ان داستانوں میں اپنے زمانے کی اقدار اور معاشرت کا عکس نمایاں کیا گیا ہے۔

اس دور میں داستان سے بیزاری کا اظہار۔ لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے "کلیم الدین صاحب کا یہ جملہ داستان کی قدر و قیمت کو بڑھا دیتا ہے۔

اگر ہم غور سے سوچیں تو شاید یہ حقیقت سمجھ میں آجائے کہ اردو میں افسانوں کا ناول کے مقابلے میں داستانوں کا زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ ہماری ناسمجھی یا لاعلمی ہے کہ ہم اس قیمتی سرمائے کی قدر و قیمت سے بالکل واقف نہیں اور اس طرف پوری توجہ نہیں کرتے"[۱]

یہ کتاب فنِ داستان گوئی کا مکمل احاطہ نہیں لیکن جو کچھ اس فن کے بابت اظہار خیال کیا گیا وہ فنی تاریخ کا قابلِ قدر نمونہ ہے۔

باغ و بہار، فسانۂ عجائب اور آرائش محفل کے محاسن و معائب کا دل بستگی سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں بعض اعتبار سے باغ و بہار ہماری زبان کی معرکۃ الآراء داستان ہے۔

فن مثنوی سحرالبیان اور گلزار نسیم پر بھی مؤلف کے خیالات قابل قدر ہیں۔ کیونکہ ان پر تنقید کے دوران مثنویوں کے بیانات کا مقابلہ میر امن کے قصے سے کرتے ہیں جیسا اس باغ و بہار کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مصنف کا یہ خیال آج بھی ایک زندہ حقیقت ہے کہ اردو میں اچھے ناول بہت کم ہیں۔

مصنف نے اپنے دور میں جدید افسانوں پر بہت کرخت لہجے میں تنقید کی ہے اور اس دور کے جدید افسانے کو ادب لطیف میں کثافت کا اضافہ بتلایا ہے۔

---

[۱] فن داستان گوئی۔ پروفیسر کلیم الدین

اردو زبان اور فن داستان گوئی

کلیم الدین احمد

کلیم الدین احمد کی تصنیف کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۴۹ء میں منظر عام پر آچکا تھا۔ اس تصنیف کی فہرست اس طرح ہے۔

بس ایک بات۔ کلیم الدین احمد ۱۔ داستان کیا ہے؟ ۲۔ داستان کی ٹیکنک ۳۔ طلسم ہوش ربا ۴۔ بوستان خیال ۵۔ مختصر داستانیں ۶۔ منظوم داستانیں۔ خاتمہ

یہ تصنیف ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے

"بس ایک بات" کے موضوع پر مصنف نے داستان ناول اور افسانے سے بحث کی ہے اور تجزیہ تنقیدی نتائج بھی اخذ کئے ہیں۔

ایک جگہ رقم طراز ہیں۔

"اردو ناول پر کوئی جامع کتاب نہیں ملتی۔ ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو موجودہ ذخیرے کا جائزہ لے۔" [1]

۱۔ داستان کیا ہے کے عنوان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس موضوع کے مطابق مصنف داستان کی تعریف، داستان میں خامی وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ جس میں غالب کے وہ اشعار موجود ہیں جو انہوں نے داستان کی تعریف میں کہے ہیں۔

۲۔ داستان کی ٹیکنک پر داستان کے جملہ اصناف، اسٹائل پرانی اور نئی داستانوں کے چند اقتباسات کے تنقید کی ہے۔ ادب سے داستان کا تعلق بتاتے ہوئے داستان کو ادب کی ایک صنف بتایا ہے۔ دوران تنقید ہماری داستانوں کی خامیاں بتاتے ہوئے ان کا موازنہ کیا گیا ہے۔ نثری اور منظوم دونوں داستانوں سے حوالے لئے ہیں۔

۳۔ طلسم ہوش ربا پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے۔

"اردو میں داستان گوئی کی معراج داستان امیر حمزہ ہے" [2]

داستان امیر حمزہ کی جلد صفات بتا کر طلسم ہوش ربا کی خوبیوں سے بحث کی ہے اور لکھتے ہیں۔

"طلسم ہوش ربا معمولی کھانا نہیں۔ ایک عظیم الشان دعوت ایک شاہی دعوت ہے" [3]

---

[1] اردو زبان اور فن داستان گوئی۔ کلیم الدین احمد۔ صالف بس ایک بات

[2] ؎ ؎ ایضاً

[3] ؎ ؎ ایضاً ؎ صـ ۴۳

ان کی نظر میں اس مثنوی کے نقص بھی ہیں ۔ ملاحظہ ہو ۔

"طلسم ہوش ربا کا غالباً سب سے اہم نقص یہ ہے کہ اس میں جادو گر اور جادوگری کی ناقابل یقین داستان ہے" لہ

۴ - بوستانِ خیال کے عنوان پر اس مثنوی کے چند اقتباسات کے ساتھ تنقید کی ہے اور صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔

بوستانِ خیال اور داستان امیر حمزہ کی عناصر ترکیبی میں کچھ زیادہ فرق نہیں ۔ لہ دونوں کی مناسبت ص ۱۲۹ پر اشعار کے حوالے سے یہی ثابت کی گئی ہے

۵ - مختصر داستانیں کے عنوان کے تحت کم و بیش تمام چھوٹی داستانوں کا ذکر کیا ہے ۔ باغ و بہار نو طرز مرصع وغیرہ پر بحث ہے ۔

۶ - منظوم داستانوں میں کچھ دکنی اور شمالی ہند دونوں کی منظوم داستانوں کا احاطہ کیا ہے

خاتمہ پر داستانوں کی تمام اچھائیاں بیان کرتے ہوئے ناول اور افسانے کا ذکر بھی کیا ہے اردو ادب میں داستانوں کی اہمیت کو مانتے ہوئے لکھا ہے ۔

" اگر ہم ذرا غور سے سوچیں تو شاید یہ حقیقت سمجھ میں آجائے کہ اردو میں افسانوں اور ناولوں کے مقابلے میں داستانوں کا زیادہ قیمتی سرمایہ ہے " لہ

داستان کے موضوع پر اپنے وقت کی پہلی کتاب ہے اس میں کلیم الدین احمد کا جارحانہ اسٹائل کہیں کہیں بڑے پتے کی بات کرتا ہے اور ان کا تنقیدی انداز بھی اپنی شخصیت کا نمائندہ ہے ۔ اس کے بعد گیان چند جین کی تصنیف "ہماری نثری داستانیں" لکھی گئی ہے ۔

داستان سے افسانہ تک

سید وقار عظیم الدین

سید وقار عظیم کی تصنیف "داستان سے افسانے تک" اردو ادب میں داستان ناول اور افسانے کی تفصیل جاننے کی مربوط تاریخ ہے جو ذیل کے عنوانات پر مشتمل ہے ۔

۱ - داستان سے افسانے تک

لہ اردو زبان اور فن داستان گوئی - کلیم الدین احمد - ص ۔۔

لہ ۔۔ ۔۔ ایضاً ۔۔ ۔۔ ص ۱۳۰

لہ ۔۔ ۔۔ ایضاً ۔۔ خاتمہ ص ۲۰۱

۲۔ داستانی عہد کی مختصر کہانیاں
۳۔ قصہ گو حالی
۴۔ اردو ناول کا ارتقاء
۵۔ عورتوں کے ناول
۶۔ شرر کا ایک کردار شیخ علی وجدی
۷۔ امراؤ جان ادا سے ٹیڑھی لکیر تک
۸۔ تقسیم کے بعد ناول
۹۔ ہمارے مختصر افسانے میں زندگی اور فن کا امتزاج
۱۰۔ مختصر افسانے میں روایت اور جدت
۱۱۔ مختصر افسانے کے پچیس سال
۱۲۔ پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ
۱۳۔ منٹو کا فن
۱۴۔ تقسیم کے بعد افسانہ
۱۵۔ افسانہ نگاروں کی نئی پود وغیرہ

مندرجہ بالا عنوانات کے تحت مصنف نے عموماً اور افسانے کے ضمن میں خصوصاً ٹیکنک لوازمات اور اسلوب پر بہترین تبصرہ کیا ہے ہر موضوع کو عنوان کی روشنی میں تنقیدی کسوٹی پر ادب کی معیاری داستانوں، ناولوں اور افسانوں پر تبصرہ کیا ہے۔ تینوں اصناف کی خامیوں اور خصوصیات پر باریک بینی سے ہر پہلو کو اجاگر کیا۔ قدیم عہد سے جدید عہد تک ہر صنف کے نشوونما، ارتقاء اور زوال پر روشنی ڈالی ہے ادوار کی تقسیم میں مصنف نے اپنے عمیق مطالعہ کا ثبوت دیا ہے۔ نئی پود کے افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی اور اے حمید تک کے عہد پر کتاب کو ختم کیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت ملاحظہ کیجیے :

"اردو داستان کی تخلیقی اور زندہ عناصر کو سب سے پہلے کلیم الدین نے پیش کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر گیان چند جین کی قابل قدر تخلیقی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" شائع ہوئی۔

لیکن زیر نظر کتاب اپنی پیش رو کتابوں سے مختلف ہے وقار صاحب نے فسانہ اور قصے کی دیوی کو ہر روپ اور ہر لباس میں دیکھا ہے۔ "داستان سے افسانہ تک روح فسانہ نے کتنے پیرہن بدلے ہیں یہ کتاب اسی اجمال کی تصنیف ہے اور ایسی تفصیل جس میں تخلیقی رنگ ہے۔ تاریخی سمت ہے بدلتے ہوئے ادوار پر گہری نگاہ ہے۔ اور تخلیق کی قوت ہے۔" [1]

یہ کتاب داستان، ناول اور افسانے کے تاریخی نشیب و فراز کو عیاں کرتی ہے۔ اور حالات کے مطابق مزاج اور ماحول کو کے تقاضوں کو نمایاں کرتی ہے۔ اردو ادب کی صنف داستان نگاری پر یک قابل قدر اضافہ ہے۔

---

[1] داستان سے افسانے تک۔ وقار عظیم ص۱۲

ہماری داستانیں

سید وقار عظیم

سید وقار عظیم کی تالیف "ہماری داستانیں" ۴۸۴ صفحات پر محیط ہے ۱۹۶۴ء کی مطبوعہ ہے پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ پیش لفظ میں تالیف کا سبب یوں ہے۔

"ہماری داستانیں" میری ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو نثر کی سب سے عجیب و غریب اور بعض حیثیتوں سے سب سے زیادہ دلکش اور سب سے اہم صنف کے مطالعہ کے بعد میں مختلف وقتوں میں لکھتا رہا ہوں"۔ لہ

مؤلف نے "ہماری داستانیں" کے عنوان داستان کی اہمیت، و حقیقت کو واضح کیا ہے۔ اکثر داستانیں جو اس کتاب کا موضوع ہیں ان کے وجود کی تاریخی حیثیت پر تبصرہ کیا ہے۔ ان میں بوستانِ خیال پر زیادہ تفصیل سے میر امن پر اور سرور کی داستانوں کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔

پہلے ایڈیشن میں "باغ و بہار" رانی کیتکی" داستانِ امیر حمزہ" آرائشِ محفل" اور حاتم کے مہمات" بیتال پچیسی" مجموعہ نورتن" فسانۂ عجائب کا ذکر ہے۔

دوسرے ترمیم شدہ ایڈیشن میں شرارِ عشق" شگوفۂ محبت" گل و صنوبر قصہ اگر و گل سرشار کی الف لیلی کے اضافے ہیں۔ ان داستانوں میں باغ و بہار کی شہرت کا سبب اس کے اسلوب اور اپنے عہد کے معاشرتی پہلو کو بتایا ہے۔ فسانۂ عجائب اور باغ و بہار پر تقابلی تنقید سے دونوں داستانوں کی خوبیوں اور خامیوں کو ظاہر کرکے باغ و بہار کی شہرت پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ مذکورہ مثنویوں کے مختصر خلاصے اسلوب کی تکنیک کی خوبیوں اور خامیوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

مختلف مقامات پر موجود نسخوں کے فرق کو واضح کیا ہے۔ "داستانِ امیر حمزہ" پر تنقیدی تبصرہ کیا ہے۔ داستان امیر حمزہ فورٹ ولیم اور لکھنؤ کے نسخوں کے فرق کو نقل کرکے سیر حاصل بحث کی ہے۔ گل و صنوبر قصہ اگر و گل اور سرشار کی الف لیلی پر مختصر مگر جامع تبصرہ ہے۔ باغ و بہار فسانۂ عجائب" رانی کیتکی کے کئی کرداروں پر شخصی اور اخلاقی کمزوریوں اور خوبیوں کے پیشِ نظر تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ داستانوں کو اپنے عہد کی طرز معاشرت کا نمائندہ بتایا ہے۔

یہ کتاب داستان کی صنف پر تاریخ اور تنقید کا حسین امتزاج ہے اور ادب میں ایک بہترین اور قابلِ قدر اضافہ ہے۔

لہ ہماری داستانیں سید وقار عظیم صہ (دوسرا ایڈیشن)

ناول

ناول ادب کی ایک اہم صنف ہے جو انسانی زندگی کی مختلف گتھیوں کو سلجھانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ کام ڈرامہ سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ڈرامہ اظہار کے مقصد کے لئے اسٹیج کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے مخلوط فن کہتے ہیں۔ یہ خالص ادبی چیز نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ناول خالص ادبی صنف ہے۔

کیرتی کرافورڈ نے ناول کو پاکٹ تھیٹر کہا ہے کیونکہ ناول میں ڈرامہ کی طرح پلاٹ، کردار، لباس اور مناظر موجود رہتے ہیں اس کے باوجود یہ اسٹیج کا محتاج نہیں ہے ناول نگاری کے عناصر درج ذیل ہیں

۱۔ <u>پلاٹ یا ترتیب قصہ</u>:۔ ناول واقعات کے آئینہ میں کردار کی عکاسی کرتا ہے اور کردار سے وابستہ واقعات کا اظہار ہے اس کو ناول کا پلاٹ کہہ سکتے ہیں۔

۲۔ <u>کردار یا اشخاص یا قصہ</u>:۔ واقعات انسانی زندگی میں پیش آتے ہیں اور انسان واقعات سے دوچار ہونے پر خاص حالات میں خاص عمل کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ رونما ہونے والے اعمال انسانوں کے کردار بن جاتے ہیں۔ اور ناول میں کردار کا مقام حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ <u>مکالمہ</u>:۔ واقعات کے دوران حالات کی روشنی میں مختلف قسم کے کردار آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ اس گفتگو کو مکالمہ کہتے ہیں۔

۴۔ <u>منظر نگاری</u>:۔ کردار مختلف واقعات سے دوچار ہو کر حالات کی ایماء پر ماحول کے مطابق کام کرتے ہیں جس سے ناول کے ارتقاء میں مدد ملتی ہے۔

۵۔ <u>اسلوب</u>:۔ ناول نگاری کے فن میں اسلوب کی بڑی اہمیت ہے۔ ناول میں قابل توجہ امور تمام عناصر کو آپس میں ملانے کے لئے زبان کا استعمال ہیں۔ زبان و بیان الفاظ کے سہارے سے ماحول کی عکاسی کردار کی صلاحیت شخصی روداد، مناظر کی دلکشی کا اظہار ہو بہو منشاء کے مطابق ہونا چاہیے۔

۶۔ <u>فلسفۂ حیات</u>:۔ ناول نگار فلسفۂ حیات کے تحت ناول میں مقصدیت کو برقرار رکھتا ہے۔ مقصد کے مطابق وہ فلسفۂ حیات کو بلا واسطہ یا بالواسطہ پیش کرتا ہے۔ اس کے سامنے کچھ مسائل ہوتے ہیں۔

اور ناول نگار کا کوئی نہ کوئی نصب العین ہوتا ہے جس کی تکمیل کے لئے وہ ناول لکھتا ہے۔ مندرجہ بالا عناصر ناول نگاری کی کسوٹی ہیں۔

اردو میں ۱۸۵۷ء کے بعد حالات و معاشرت کے بدلتے ہوئے دھارے نے مزاج اور ذہن میں ماحول کے مطابق ایک انقلاب برپا کیا۔ اس تبدیلی نے اپنے عہد کے مفکر اور دانشوروں کو انگریزی ادب سے قریب تر کر دیا۔ انگریزی ادب میں معاشرتی اصلاح کا کام ناول کے ذریعہ ہوا تھا۔ حالات کی تنگی.. اردو سے داستان گوئی کا خاتمہ کر چکی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے حالات کے تقاضے پر حالات سے قریب معاشرتی کمزوریوں کا حل ناول کے اصلاحی پہلو کو سمجھا گیا۔ حالات کے مختلف تقاضوں نے ناول نگاری کے فن پر آمادہ کر لیا۔ جس کی ابتدا مولوی نذیر احمد سے ہوئی۔ مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح نذیر احمد کے اچھے ناول ہیں۔ وہ عربی کے عالم تھے۔ اس لئے ناولوں کے نام ٹھیٹ عربی ہیں۔ لیکن ناول کی زبان دلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کا استعمال حسن خوبی سے کیا ہے۔ انھوں نے انگریزی ناولوں کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اس لئے ان کی ناولوں میں ناول کی خصوصیات ٹھیٹ طرق سے نہیں ملتی۔ ان کے ناولوں میں مذہبی، معاشرتی اور اصلاحی جذبے نے مقصدیت کو عریاں کر دیا ہے۔ اور وہ خود تقریر یں شروع کر دیتے ہیں۔ ان تقریروں کے سبب بعض مقامات پر پڑھنے والا اکتا جاتا ہے۔ ان کی ناولوں کے کردار ابتدا سے کامل ہوتے ہیں وہ ترقی و تنزل کے مقامات سے دوچار نہیں ہوتے۔

منشی سجاد حسین کی مشہور ناولوں میں حاجی بغلول، دھوکا، میٹھی چھری، کایا پلٹ، شیخ چلی، پیاری دنیا اور احمق الذی ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ کی زندگی کے نقائص کو مذکورہ ناولوں میں مخصوص ظریفانہ انداز میں لطائف و حقائق کے پردے میں پیش کیا ہے۔

نواب سید محمد آزاد اور جوالا پرشاد برق نے اسی نہج پر ناول لکھے ہیں۔ یہ عہد اردو کی مزاحیہ ناولوں کا تھا۔

ظرافت نگاری میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد آج بھی مشہور ہے۔ سرشار نے کئی ناول لکھے۔ کڑم دھم، کامنی، رنگے سیار، طوفانِ بدتمیزی، اور کھڑ بڑی دلہن وغیرہ۔ لیکن مقبولیت کے اعتبار سے فسانۂ آزاد آج بھی زندہ ہے۔

فسانۂ آزاد کچھ نقائص کے باوجود خوجی کے کردار اور زبان و بیان میں ظرافت کی بدولت اچھے

ناول میں شمار ہو سکتا ہے۔

سرشار کے بعد عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگاری کے مشہور ہوئے۔ شرر کے اسلوب میں وہ انفرادیت نہیں تھی۔ جدید رنگ کی آمیزش سے ان کی عبارت صاف ستھری، دلکش و رنگین ہے جملوں کی تراش خراش میں جدت طرازی کے عناصر ہیں۔ شرر کا اصل موضوع تاریخی رومان ہے۔ مگر ان میں تاریخی حیثیت سے کوئی جان نہیں کیونکہ تاریخ ناولوں کے لوازمات سے شرر کے ناول خالی ہیں۔ موضوع اور نتائج کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ ان ناول کے ہیرو لباس میں مختلف لیکن مسلمان ہونے کے سبب ذہنیت عادات و خصائل میں ایک سفت کے مالک ہیں۔ بہادر، غیور، صادق، جانباز، فرض شناس اور خوبصورت ہونے کے باوجود دو کاموں کے اہل ہیں (۱) جنگ کرنا (۲) عاشق ہونا۔

فتح اندلس، منصور موہنا، فلورا فلورنڈا، ملک العزیز ورجینا، ایام عرب، حسن کا ڈاکو وغیرہ مشہور ہیں۔ شرر کے بعد مرزا محمد ہادی رسوا کے دو ناول بہت مشہور ہیں۔ شریف زادہ میں ان واقعات کی ترتیب اور انداز تبلیغ کی بنا پر ناول کی خصوصیت متاثر ہوئی ہیں لیکن امراؤ جان ادا ناول کے اعتبار سے بہت کامیاب ہے۔ اس میں طرز معاشرت اور جذبات انسانی کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ ترتیب ربط، تسلسل، کردار نگاری پورے عروج پر ہے۔

حکیم محمد علی نے بھی جعفر و عباسہ، دیول دیوی، اختر حسینہ ناولیں لکھیں ہیں۔ لیکن ان کا شمار دوسرے درجے میں ہوتا ہے۔ مولانا راشد الخیری نے طبقۂ نسواں کی حالتِ زار، مردوں کی بالادستی کے پیش نظر کئی ناول لکھے۔ جن میں صبح زندگی، شام زندگی اور شب زندگی مشہور ہوئے۔ ان کے یہاں پند و نصیحت اور اعتدالی کے عناصر زیادہ ہیں۔ نیاز فتحپوری نے افسانوں کے علاوہ دو ناول بھی لکھے ہیں۔ شاعر کا انجام اور شہاب کی سرگذشت اسی دور میں یلدرم حیدر کے افسانے اور ناولٹ مشہور ہوئے۔ میدان عمل اور گئودان ان کے بہترین ناول ہیں۔

سدرشن نے بھی ناول لکھے لیکن انھیں شہرت نہیں ملی۔ نیاز علی حیدر کی شمیم دو ناول میں شمیم بہت اچھا ناول ہے۔ اس کا ہیرو شمیم تمام محاسن کا مالک ہے۔ حجاب علی امتیاز نے بھی دو مختصر ناول لکھے ہیں۔ اسی دور عصمت چغتائی کا ناول ضدی بہت مشہور ہوا۔ لیکن اسی دور سجاد ظہیر کا ناول لندن کی ایک رات "ترقی پسند دور کا سب سے اچھا ناول منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد کرشن چندر

کا شکست بہت عمدہ ناول ہے۔

کرشن چندر نے افسانہ نگاری کے باوجود ناول نگاری میں بھی انفرادی رنگ پیدا کیا۔ ان کے ناول میں کردار ماحول کے اعتبار سے خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں، گاؤں اور شہر کے کردار اپنی استعداد کے مطابق مکالمے ادا کرتے ہیں۔ کرشن چندر کے علاوہ رضیہ بٹ، عفت موہانی اور ایم اسلم کے ناول مشہور ہوئے۔ رضیہ سجاد ظہیر کا ناول "دلدل" بھی بنگال کے قحط کا عکاس ہے۔

اردو میں ناول نگاری کا مستقل ارتقا ترقی پسند عہد میں بام عروج پر تھا۔ لیکن ترقی پسند ادیبوں نے اپنے نقطۂ نظر میں عورت، کسان، محنت کش طبقہ، زمینداری، سرمایہ داری کے دائروں سے باہر کوئی موضوع تلاش نہیں کیا۔ رومانی ناولوں میں کئی ناول نگار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ لیکن ان میں نادرہ خاتون کو شہرت ملی، طنز و ظرافت میں شوکت تھانوی کے ناولوں کے کردار بھی اچھوتے ہوتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی "آگ کا دریا" اردو ادب میں بہترین ناول کہا جا سکتا ہے۔ اس میں ناول کی خصوصیت اور فلسفیانہ مباحثوں سے اکتاہٹ نہیں ہوتی۔

ان ناولوں کے باوجود ہمارے ادب میں اچھے سماجی اصلاحی ناولوں کی ضرورت ہے۔ ناول نگاری کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ لیکن مکمل ناولوں کا فقدان ہے۔ ناول کے فن پر ہمارے ادب میں درج ذیل کتابیں ملتی ہیں۔

(۱) اردو ناول کی تاریخ و تنقید۔ علی عباس حسینی (۲) اردو ناول نگاری۔ سہیل بخاری
(۳) اردو ناول کا ارتقا۔ ڈاکٹر مجتبیٰ حسین (۴) اردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔ احسن فاروقی
(۵) تاریخ ناول فن اور اصول۔ ڈاکٹر طلعت احمد فاطمی۔

ناول کی تاریخ اور تنقید

علی عباس حسینی

ناول کی تاریخ و تنقید ناول کے موضوع سے متعلق ۵۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ علی عباس حسینی نے سید مسعود حسن رضوی ادیب اور ڈاکٹر سید حفیظ کے ایماء پر یہ کتاب لکھی۔ لکھتے ہیں کہ۔

"بظاہر اس تصنیف میں بعض ابواب میں بے جا ایجاز ہے۔ اور بعض میں ناروا اطناب لیکن اس میں دماغ

کا قصور کم ہے۔ ناول کا زیادہ فن کی بحث میں اختصار سے اس لئے کام لیا گیا ہے کہ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی دو کتابوں میں اور پروفیسر مجنوں گورکھپوری اور حضرت جمیل احمد کنڈھائے پوری نے اپنی اپنی کتابچوں میں اس وادیٔ خشک کی اچھی طرح پیمائش کر دی تھی۔[1]

ابتدا اور ارتقا پر بحث کرتے ہوئے ناول کو قصے کی ایک ارتقائی منزل کہا ہے۔[2] قبائلی عہد سے انسانی دماغ کے ارتقاء کا جائزہ لے کر قصے کہانیوں میں علاقائی تہذیبی مزاج کے مطابق کرداروں کی تخلیق ثابت کیا ہے۔ مختلف عوامل کے لحاظ سے کہانیوں قصوں اور داستانوں اور ناولوں کے کردار کی خامیاں اور خوبیاں بیان کی ہیں۔ موصوف نے ناول کی تاریخ میں کئی یوروپین مصنفین کی رائے پیش کی ہے۔ بیکر کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ ناول اور دیگر موضوعات کے فرق کو سمجھا کر ناول کے اقسام پر پوری روشنی ڈالی ہے۔ دکنی اور گجراتی مثنویوں کے کردار اور منظر نگاری کو اردو ناول کے عناصر بتایا ہے۔[3]

تیسرے باب میں انگریزی ناول نگاری کی صفات اور انگریزی کے اچھے ناول نگاروں پر تبصرہ کیا ہے۔

یوروپین ناولوں کا جائزہ اچھے پہلو سے لیا ہے۔

چوتھے باب میں فورٹ ولیم کالج اور اس سے وابستہ ادبا کے داستانوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

غدر کے بعد کے کچھ ناولوں کا ذکر ہے۔

پانچویں باب میں رتن ناتھ سرشار کی تصنیفات اور ان کے کردار کا تجزیہ کیا ہے۔ آزاد، خوجی، قرن، ظہورن کی خصوصیات پیش کی ہیں۔ عبدالحلیم شرر اور ان کی تاریخی ناولوں کا تجزیہ کیا ہے۔

ساتویں باب میں عباس حسین ہوش، مرزا ہادی رسوا، مولانا راشد الخیری کی ناول نگاری اور ان کے مشہور کرداروں کا تجزیہ کیا ہے۔

آٹھویں باب میں پریم چند اور ان کے ناولوں پر تبصرہ ہے۔

نویں باب میں مرزا سعید، فیاض علی، محمد مہدی تسکین، پنڈت کشن پرشاد کول، نیاز فتحپوری، نواب محمد حسین، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی اور دیگر خواتین کی ناول نگاری کے فن کا جائزہ لیا ہے۔

دسویں باب میں اردو میں ترقی پسند نظریے کی بنیاد پر اردو کے ترقی پسند ناول نویسی کا جائزہ لیا ہے۔

زیر نظر تالیف اپنے موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔ مگر اس میں ایجاز ہے۔ ناول کے فن کے لئے انگریزی

---

[1] ناول کی تاریخ اور تنقید۔ علی عباس حسینی صفحہ (پیش لفظ)

[2] ایضاً صفحہ ۱

[3] ایضاً صفحہ ۱۵۶

ادب کو مشعلِ راہ بتایا گیا ہے۔

"انگریزی ناول نویسوں پر قدرے تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اس لئے کہ ہندوستانی ناول کا منبع و مخرج وہی ہے۔" لہ

اردو ناول کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اگر یہ خامیاں دور ہو گئیں تو مستقبل قریب میں ہماری زبان مختصر افسانوں کی طرح ناول کے میدان میں بھی دوسری زبانوں سے بازی لے جائے گی۔" لہ

مصنف نے بڑی کاوش اور عرق ریزی سے مواد جمع کیا ہے۔

اردو ناول کی تنقیدی تاریخ

خواجہ احسن فاروقی

خواجہ احسن فاروقی کی تصنیف "اردو ناول کی تنقیدی تاریخ" حصہ اول تمہید سے شروع ہوتی ہے۔ موصوف نے داستانی عہد کی اہم داستانوں پر طائرانہ تبصرہ کیا ہے۔ باب اول میں اردو ناول کی ابتدائی تاریخ کا احاطہ داستانوں سے حالات اور ادوار کے تقاضوں کو ناول کی ضرورت بتایا ہے۔ دوسرے حصہ میں "نذیر احمد کے تمثیلی افسانوں" کے عنوان سے ادب میں تمثیل نگاری کی وضاحت کی ہے۔ اور ناول میں تمثیل نگاری کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اس بحث میں یورپین دانشوروں کی آرا سے استفادہ کرتے ہوئے ناول نگاری کے اہم پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ حالات کے پس منظر اور معاشرتی حقائق سے نذیر احمد کی ناولوں کے کرداروں پر تنقیدی تبصرہ اپنے موضوع کے مطابق ہے۔

حصہ دوم کے ابتدائی دور کا تعین ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۰ء کے ناول نگاروں کے فن کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں سرشار، ورناول نگار پر "عظمت" کے عنوان سے ناول نگاری کے فن کا سرشار کی تصنیف "فسانۂ آزاد" کی روشنی میں تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ کرداروں کی خامیوں اور خصوصیات پلاٹ وغیرہ پر تنقید کی ہے "شرر اور ناول نگاری کا سلیقہ" کے عنوان سے شرر کی ناول نگاری پر تنقید ہے۔ یہ باب مصنف کے عمیق مطالعہ کا ثبوت ہے۔

لہ ناول کی تاریخ و تنقید علی عباس حسینی صفحہ ۳
لہ ایضاً صفحہ ۳۵۰

"سرشار اور شرر دونوں نے اردو ناول نگاری میں ایک ایک عنصر کا اضافہ کیا۔ سرشار نے جیتے جاگتے انسانوں کی تخلیق میں اپنی فطری قوت دکھائی اور شرر نے اپنے سلیقہ سے شعوری فنکاری کی طرف قدم بڑھایا۔"[1]

باب سوّم میں "رسوا اور ناول نگاری کا فن" ہے۔ رسوا کی ناول نگاری میں فنی خصوصیات کے تعمیری پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ رسوا کے ناولوں کے اہم کرداروں کی روشنی میں فنکارانہ خوبیوں و خامیوں کا جائزہ مصنف کے اس بیان سے رسوا کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔

"مرزا رسوا کو اردو ناولوں کا جد امجد نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں امراؤ جان ادا اردو ناول نگاری کی سنگ بنیاد ضروری ہے اور ہمیشہ مانی جائے گی۔"[2]

باب چہارم میں مصنف نے ناول نگاری کے ابتدائی دور کا مجموعی جائزہ لیا ہے۔ مختلف ناول نگاروں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ حصہ سوّم دورِ انحطاط ۱۹۰۰ تا ۱۹۲۰ تک کے ناول نگاری کے فن پر تنقیدی تبصرہ ہے۔ باب اوّل میں "جدید ناول کے رجحانات" پر اہم تبصرہ ہے۔ مصنف کے مطابق

"اردو ادب کی تاریخ میں یہ دورِ جدید مختصر افسانے کا دور کہلائے گا۔"[3]

اس عہد میں پریم چند سے قرۃ العین حیدر تک اہم ناول نگاروں کے فن پر تبصرہ کیا ہے۔ باب دوّم میں ضروریات اور مستقبل کے عنوان سے مصنف نے ناول نگا[ری] کے تقاضوں اور اس کے مستقبل پر اہم تنقید کی ہے۔ یہ کتاب ناول کے فن پر تنقیدی نقطۂ نظر سے ناول نگاری کے اہم پہلو فاش کرتی ہے۔ مصنف کی دوربیں نظر یورپین ادب کے آئینہ میں اردو ناول نگاری کی تنقید کے لوازمات اکٹھا کرتی ہے۔ ناول کی صنف پر اردو ادب میں یہ کتاب گراں قدر اضافہ ہے۔

اردو ناول نگاری

سہیل بخاری

سہیل بخاری نے اپنی کتاب "اردو ناول نگاری" کے باب اوّل "ناول کا فن" سے بحث کی ہے۔ ناول کی تعریف اور مفہوم کے تعین سے ناول نگار کا نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ اور ناول کے اجزائے

---

[1] اردو ناول کی تنقیدی تاریخ — خواجہ احسن فاروقی ص ۱۴۱

[2] ایضاً ص ۱۸۳

[3] ایضاً ص ۲۰۹

ترکیبی پر تبصرہ کیا ہے۔

باب دوم میں "اردو میں ناول نگاری کی ابتداء" کے عنوان سے داستانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے "مراۃ العروس" مولانا نذیر احمد کی ناول کو پہلا ناول تسلیم کیا ہے [1]

باب سوم "اردو ناول کا پہلا دور" سے بحث کرتا ہے۔ اور نذیر احمد، سرشار، شرر، محمد علی طبیب سجاد حسین، مرزا رسوا، راشد الخیری، سرفراز حسین عزمی، پریم چند، مرزا سعید اور فیاض علی کی ناول نگاری پر تبصرہ کیا ہے۔ محمد مہدی تسکین، کشن پرشاد کول، نیاز فتحپوری، آغا شاعر، علی عباس حسینی، عظیم بیگ، شوکت تھانوی، ظفر عمر، ایم اسلم اور نسیم حجازی کی ناول نگاری کا جائزہ لیا ہے۔

باب چہارم میں "اردو ناول کے پہلے دور پر تنقید" کے عنوان سے مذکورہ ناول نگاروں کی ناول نگاری پر تنقید کی ہے۔ مختلف نقادوں کی آراء سے استفادہ کرتے ہوئے اس عہد کی ناول نگاری پر بے لاگ تبصرہ کتاب کی افادیت کو ظاہر کرتا ہے۔

باب پنجم میں "ناول نگاری میں نئے رجحانات" پر زرین خیالات کا اظہار ترقی پسند ادب سے وابستہ نظریات اور حقائق کا آئینہ ہیں۔

باب ششم "اردو ناول کا دوسرا دور" شروع ہوتا ہے۔ اس میں قاضی عبدالغفار سے انتظار حسین تک کے عہد تک کی ناول نگاری پر تبصرہ کیا ہے۔

باب ہفتم میں اردو ناول کے دوسرے دور پر تنقید کا ذکر ہے۔ ہر مصنف کے منتخب ناول کی خصوصیات، خامیاں نیز کردار اور پیش نظر حالات کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے تنقیدی تبصرہ کتاب کی شان ہے۔

باب ہشتم میں اردو ناول کا جائزہ اور تاریخ کے عنوان سے اردو ناول کی ابتداء سے ناول نگاری کے ارتقاء کا سرسری جائزہ دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مصنف کا مشورہ فکر انگیز ہے۔

"اردو میں سائنسی ناولوں کی طرف ابھی تک کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے ہمارے ناول نگاروں کیلئے اس صنف میں بہت کچھ گنجائش ہے۔ امید ہے کہ موجودہ دور کے ناول نگار اس صنف کی جانب بھی مائل ہوں گے۔" [2]

یہ کتاب اردو ناول نگاری کی صنف کی منظم تاریخ ہے۔ اور ادوار کی تنقید سے ناول نگاری کے فن تک ایک ایسا راستہ دکھاتی ہے جس سے موجودہ ناول نگار بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔ لہذا اردو ادب میں ناول کی صنف میں یہ قابل قدر اضافہ ہے

---

[1] اردو میں ناول نگاری۔ سہیل بخاری۔ صفحہ ۴۹

[2] " " ایضاً صفحہ ۲۸۹

تاریخی ناول فن اور اصول

ڈاکٹر علی احمد فاطمی

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے "تاریخی ناول فن اور اصول" کے مقالے کو ڈی فل ڈگری کے لئے لکھا تھا۔ یہ مقالہ ۱۲۰ صفحات کا تاریخی ناول کے فن اور اصول سے بحث کرتا ہے۔ مقالہ نگار کا بیان ہے

"تاریخی ناول کے فن پر اردو میں نہیں کے برابر لکھا گیا ہے۔ اس احساس کے تحت اور شرح کے ساتھ کسی حد تک اتفاق کرنے کے خیال نے اس مقالہ کو وسعت بخشی اور اب اس مقالہ کو اپنے تئیں سجا کر اور سنوار کر کتابی شکل میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔"[1]

ناولوں کی اقسام پر بحث کرنے کے بعد مقالہ نگار کا قول ہے کہ

"ایک ہوشمند زندہ دل مؤرخ کے لئے یہ تقاضا شدید ہو جاتا ہے کہ وہ ماضی کے انھیں کارناموں کی تلاش و تجزیہ کرے جس کی روشنی سے حال کو تقویت پہنچی ہو۔"[2]

مصنف کی رائے کے مطابق

"تاریخ کے ذریعہ ہم اپنی سماجی و تہذیبی زندگی کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔"[3]

اس بات کو تقویت دینے کیلئے مصنف نے یورپین مصنفین کے اقتباسات[4] اور پروفیسر جگدیش اور سیتا پال بکھر کے بیانات نقل کئے ہیں۔ تاریخی ناول نگاری میں اسلوب کی اہمیت پر زور دے کر عبدالحلیم شرر کی تاریخی ناول نگاری کا تجزیہ کیا ہے۔ محمد طیب علی اور سجاد حسین کا ضمناً تذکرہ کیا ہے۔

مصنف نے بڑی کاوش سے تاریخی ناول نگاری کے اصول اور فن پر تحقیقی مواد پیش کر کے تاریخی ناول نگاری کے موضوع پر دعوتِ فکر دینے کی کوشش کی ہے۔ اور اپنے اصول کی بنیاد پر مصنف کا یہ بیان قابلِ غور ہے

"رخصت ہوئی بیسویں صدی میں تاریخی ناولوں کی بہت کمی ہے۔ بڑی حد تک قاضی عبدالستار اور کسی حد تک عصمت چغتائی (ایک قطرۂ خون) نے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ آج کا ماحول تاریخی ناول نگار پیدا کرنے کے حق میں ہے یا نہیں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"[5]

تاریخی ناول نگاری کے اصولوں کی بنیاد پر مصنف کی یہ رائے ہے کہ تاریخی ناول نگاری کے اصول اپنی جگہ اپنا جواب ہیں۔ اس سے ہر قاری کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ تاہم یہ بات اہم ہے کہ موجودہ عہد میں اس فن پر یہ کتاب تاریخی ناول نگاری کے لئے مشعلِ راہ ضرور ہے۔

---

[1] تاریخی ناول فن اور اصول - ڈاکٹر علی فاطمی ص ۱۱ [2] ایضاً ص ۱۷ [3] ایضاً ص ۱۲۵ [4] ایضاً ،، ۱۲۵ [5] ایضاً ص ۲۲۴

اردو ناول کا ارتقاء

ڈاکٹر مجتبیٰ حسین

ڈاکٹر مجتبیٰ حسین کی کتاب "اردو ناول کا ارتقاء" ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مصنف کے چند مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں پہلا مضمون نقاد ہے۔ اس میں مصنف نے ناقد کو لکھنے والے اور قاری کے درمیان ایک کشمکش کا ذریعہ بتایا ہے۔ نظریاتی تنقید عملی تنقید ادبی تنقید پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"اگر ہم مڑ کر اس تیسرے فرق پر نظر ڈالیں جو ادیب و قاری کے درمیان ملتا ہے تو ہمیں اجنبی نہیں معلوم ہوتا۔ وہ ہمارے اجتماعی شعور کا نمائندہ جو ہمیں میں ہے۔ مگر اسے ہم اس وقت پہچانتے ہیں جب وہ ادیب کی صحبت سے اٹھ کر ہمارے قریب آنے لگتا ہے۔" [1]

مصنف مزید لکھتا ہے کہ

"اس حیثیت سے تنقید نگار ادب سے زیادہ معاشرے کا ایک اہم سمبل ہے۔" [2]

ناقد کو غیر جذباتی دیانتدار اور غیر جانبدار بتایا ہے۔

ادب میں نظریہ کا صرف ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی، ادب کا جمالیاتی پہلو، معاشرتی پہلو، نفسیاتی اور فلسفیانہ تاویلات سے فرد کی داخلی زندگی کا رشتہ ادبی نظریات سے منسلک کیا ہے۔ کانٹ ڈراون کے نظریات سے بحث کی ہے۔ نظریات کے تعلق سے فرماتے ہیں۔

"یہ نظریات ہر دور میں اپنے اپنے نظام معاشرت کے تحت اخلاقیات، سیاست، تاریخ اور ادب کو متاثر کرتے ہیں۔" [3]

اصلیت نگاری، حقیقت نگاری پر بحث کرتے ہوئے ادب کا رشتہ سماج سے استوار کرتے ہیں۔ ادب میں نظریہ کی حمایت کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں۔

"ادیب کا سماجی تجزیہ ایک شعور ایک نظریئے کے ماتحت ہوتا ہے۔" [4]

نئی اور پرانی نسل میں ادبی تخلیقات کے پیش نظر لکھنے والے اور پڑھنے والے کے درمیان ذہنی سمجھوتا یا اعتماد کی یقین دہانی ضروری ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعہ ادیب اپنی اہمیت کو برقرار رکھتا ہے نئی اور پرانی نسلوں کے درمیان خصوصیتوں کا تعین کرتے ہوئے معاشرتی اور سماجی قدروں پر نظر رکھتے ہیں۔

---

[1] اردو ناول کا ارتقاء۔ ڈاکٹر مجتبیٰ حسین صفحہ ۲۵ تا ۱۲
[2] ایضاً ،، صفحہ ۲۵
[3] ایضاً صفحہ ۲۷
[4] ایضاً صفحہ ۵۵

آخر میں ادب میں نسلی امتیازات پر زیادہ زور دینے سے اجتناب کرنے کو بہتر بتاتے ہیں۔

اردو میں بچوں کے ادب میں بچوں کی شاعری سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آسان سہل زبان بچوں کی ذہنی اور جذباتی زندگی سے میل رکھنے والے موضوعات پر توجہ دلاتے ہیں۔ مزید بچوں کی نفسیات کا مطالعہ پر زور دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ادیبوں نے بچوں کے ان معاملات پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ ایسا بتلاتے ہیں۔

"ہمارے ادب میں بھی وہ ادیب نہیں پیدا ہوئے ہیں جو عظیم المرتبت ہونے کے ساتھ ساتھ ہی ماہر نفسیات بھی ہوں۔ اور بچوں سے دوستی کر سکیں۔ ابھی بچوں کا ادب کوئی سعدی کوئی ڈیل ڈیپ DAINALD E F نہیں پیدا کر سکا ہے۔ اردو ادب و نثر دونوں ان کے منتظر ہیں"[1]

مجتبیٰ حسین کی کتاب کا نام غلط رہنمائی کرتا ہے۔ یہ مختلف مضامین کا ایک مجموعہ ہے۔ اس میں صرف ایک مضمون اردو کا ہے۔ اس کو دوسری کتابوں کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔

افسانہ

انسان کو ہر دور میں حالات اور زمانے کے تقاضوں نے وقت سے سمجھوتے کے قابل بنایا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عیش کوشی، بیکاری، آرام طلبی کے سبب انسان داستان سننے اور پڑھنے میں مصروف رہتا تھا۔ گویا داستان ذہنی مصروفیت اور وقت گزاری کا بہترین ذریعہ تھا۔ لیکن سیل زمانہ کی گردش نے مشینوں کی ایجاد سے انسانوں کو کام کی مصروفیت عطا کی۔ اس وقت ذہنی تفریح طبع کے لئے انسان داستانوں کے مافوق الفطرت کارناموں اور باتوں سے اکتا گیا۔ کیونکہ وہ رفتہ رفتہ سائنسی عہد میں حقیقت کا قائل ہونے لگا تھا۔ اسی سبب باتوں سے منسلک کردار سماجی رسم و رواج سماجی اقدار معاشرتی قدریں حقیقی زندگی میں مختلف مسائل پیدا کر کے انسان کو حقیقت سے قریب تر کی۔ نتیجہ میں انسان تجربہ اور مشاہدے کو اہمیت دینے لگا۔ اسی بنا پر داستان سے اکتا گیا۔ اور ذہنی تفریح کے لئے حقیقت کا روپ سماج اور معاشرت، تاریخ، عمرانیات ہر شعبے میں دیکھنے لگا۔ مشاہدہ اور تجربہ نے مجبور کیا کہ وہ لفاظی، مافوق الفطرت، کارنامے، غیر مرئی قوت کے مظاہرے، کو حقیقت کی کسوٹی پر کس کر دیکھے۔ ان حالات نے داستان کا خاتمہ اور ناول کی ابتدا کی۔ کیونکہ اس میں پلاٹ، کردار، کہانی، ماحول

---

[1] اردو ناول کا ارتقاء۔ ڈاکٹر مجتبیٰ حسین ص ۱۰۱

سے اخذ کی جانے لگی ہے۔

تاریخی بنیاد پر بھی کردار سامنے سے قریب ہوتے تھے۔ اسی اثنا میں زمانے کی رفتار نے مشینوں کے ذریعہ معروف تر آدمی کو مصروف ترین کر دیا۔ وقت کی تنگی نے فرصت کی اجازت نہیں دی اور تھکا ہوا انسان ناول سے اکتانے لگا لیکن ذہنی تفریح و طبع نے ناول کی طوالت و طول کو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سمجھنے اور دیکھنے پر مجبور کیا۔ اس طرح مختصر کہانی "واقعات" کردار اور پلاٹ کی بنیاد پر افسانے کے لباس میں وقتی تقاضوں سے پیدا ہوئے۔ افسانے کی اہم خصوصیت اختصار ہے۔ واقعات کردار اور پلاٹ کی شمولیت کے باوجود نظریات کے مطابق مکمل کہانی جو گھنٹہ یا آدھا گھنٹہ میں ختم ہو جائے۔ افسانہ کہلاتی ہے۔ افسانے کا موضوع دلکش پرکشش ہونا چاہیے۔ جو اپنی کشش اور دلکشی سے قاری کا دل موہ لے یا متوجہ کرے۔ تاکہ قاری اسے پڑھنے پر آمادہ ہو جائے۔

افسانے کے موضوعات زمانے کے تقاضوں کے موجب معاشرت، سماج، مناظر قدرت سے قریب تر ہونا چاہیے بلکہ کہانی کا پلاٹ وقتی کشمکش، حالات کے اعتبار سے ماخوذ ہونا چاہیے۔ افسانہ نگار انسان کی سیاسی، سماجی، مذہبی، علمی، فنی، اقتصادی اور مذہبی زندگی کے روشن اور تاریک پہلوؤں کو اجاگر کر سکتا ہے۔ مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں کسانوں، مزدوروں، دیہاتی ماحول اور وہاں کی کراہتی ہوئی زندگی، متوسط طبقے اور گھرانوں سے کہانی کے پلاٹ، کردار اور واقعات اخذ کرکے منفی و مثبت دونوں نتائج سے درس دے سکتا ہے۔

وقار عظیم آبادی اپنی تصنیف "داستان سے افسانے تک" میں افسانے کی مقبولیت کے اسباب اس طرح بیان کرتے ہیں۔

۱ ۔ اس میں ناول، ڈراما، شاعری اور فنون لطیفہ کی خصوصیات ایک جگہ موجود ہیں۔

۲ ۔ اس کے پڑھنے میں اتنا کم وقت صرف ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے تھکے ہوئے دماغ کے لئے اسے بہترین مشغلہ سمجھتا ہے۔

۳ ۔ موجودہ زمانے کے رسالوں نے اس کو ترقی دی ہے۔

۴ ۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ اس میں بھی رفتہ رفتہ سائنس کی روح داخل ہو رہی ہے۔ اردو میں افسانہ نگاری کی ابتدا پریم چند سے ہوئی ہے۔ دیہاتی ماحول غربت و افلاس روزمرہ واقعات سے مواد فراہم کرتے ہیں۔

پنڈت سدرشن کے اصلاحی نقطۂ نظر سے زبان اور خیال سادہ ہیں۔ دیہات اور شہر دونوں

ان کے افسانوں کا موضوع ہیں۔ سلطان حیدر جوش نے بھی افسانہ جوش اور فکر جوش دو مجموعے لکھے ان کی زبان میں شگفتگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے انگریزی افسانوں کا بھی ترجمہ کیا ہے خیالستان اور حکایات واحتسابات دو مجموعے ہیں۔

نیاز فتحپوری کے نگارستان اور جمالستان میں بھی اچھے افسانے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کے خواب و خیال، سمن پوش دو مجموعے ہیں علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری کے میدان میں کافی شہرت ہوئی ہے۔ ان کے افسانوں میں دلکشی کے ساتھ ظرافت نگاری کا لطف بھی ملتا ہے۔ ترقی پسند مصنفین میں کرشن چندر، سعادت حسین منٹو عصمت چغتائی، پطرس، فرحت اللہ بیگ، بخاری، عظیم بیگ، چغتائی مشہور ہوئے۔

طنز و ظرافت میں رشید احمد صدیقی اپنا شستگی اور ستھرے پن اور لطیف اشارے سے قاری کے ذہن میں کھلبلی مچا دیتے ہیں۔ مزاحیہ افسانہ نگاری میں شوکت تھانوی اور کنہیا لال کپور بہت مشہور ہوئے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی، اختر حسین رائے پوری، حسن عسکری، ممتاز، خواجہ احمد عباس بھی اردو کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔

اردو ادب میں افسانہ نگاری کے میدان میں موجودہ عہد میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ مختصر افسانہ، منی افسانے بڑی دلچسپی سے پڑھے جانے لگے ہیں جدیدیت کے رجحان کے علاماتی اور استعاراتی انداز بیان میں مقصد کی بات کہنے کا مختصر انداز اس دور میں اپنایا جا رہا ہے۔ نئے عہد کے افسانہ نگاروں میں قمر رئیس، قمر انور، سلام بن رزاق وغیرہ مشہور ہوئے ہیں۔

افسانہ کی صنف موضوع اور اظہار کے اعتبار سے بہت اہم صنف ہے۔ سماج معاشرے، ماحول کی عکاسی میں افسانہ ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اردو میں اس صنف پر درج ذیل کتابیں لکھی گئی ہیں۔

۱۔ داستان سے افسانہ تک — وقار عظیم

۲۔ افسانہ کی حمایت میں — شمس الرحمٰن فاروقی

۳۔ دنیائے افسانہ — پروفیسر عبد القادر سروری ۱۹۳۵ء

۴۔ افسانہ — مجنوں گورکھپوری ۱۹۳۷ء

۵۔ اصول افسانہ نگاری — اویس احمد ادیب ۱۹۵۵ء

۶۔ فن افسانہ نگاری — سید وقار عظیم ۱۹۶۷ء

دنیائے افسانہ

عبدالقادر سروری

عبدالقادر سروری کی تصنیف "دنیائے افسانہ" ۱۹۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ افسانے کے مفہوم اور تاریخ کی تفصیل ہے۔ بقول عبدالقادر سروری

"کتاب کی ترتیب کے متعلق صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ پہلے پانچ باب عام افسانوں سے متعلق ہیں۔ افسانوں کی اقسام میں سے صرف ناول اور مختصر قصے پر تفصیلی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیونکہ یہی دو اصناف اس وقت اردو میں مروج ہیں۔ کتاب کو اردو افسانے اور مختصر قصے کی تاریخ اور تبصرے پر ختم کیا گیا ہے۔" [1]

مصنف نے افسانوں کی اہمیت کے باب میں افسانے کو فنونِ لطیفہ کے ذیل میں شمار کیا ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ

"اس فن کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں باوجود کثرت کی نئی معلومات اور نئی کیفیات کا اضافہ ہر وقت ہو سکتا ہے۔ شاعری کی طرح یہ فن بھی انسان کے ولولوں سے تعلق رکھتا ہے۔" [2]

حقیقت اور افسانہ میں افسانہ کے مفہوم کی وسعت بیان کرتے ہوئے افسانہ نگار کے خیالی راستوں کا سلسلہ فلسفی یا سائنسدان کے حقائق اور تجربات کے راستوں سے ملایا ہے۔ افسانوں کی پیدائش کے عنوان میں انسانی مشغلے کی فکری قوت کو قصہ گوئی کہانیاں، داستان، حکایت، ڈراما اور ناول سے رجوع کیا ہے۔ یونانی ادیبوں کا حوالہ دیا ہے۔ افسانوں کی قسمیں قصہ گو، تمثیل حکایات، مختصر کہانیاں، ناول، تاریخی، معاشرتی، مقصدی، نفسیاتی ناول کی وضاحت کی ہے۔ یورپ کے افسانوی ادب کی تقسیم پر بحث ہے۔

افسانے کا ارتقاء داستان سے افسانے تک یورپ، یونان کے نثری اور نظم کے افسانوی ادب پر مختصر لکھا ہے "ناول کی پیدائش میں" لفظ ناول کے مفہوم کی تشریح ابتداء اور ارتقاء پر روم، یونان اور انگریزی ادب سے استفادہ کیا ہے۔ "ناول کے موضوع پر" اسے دیگر فنون سے وسیع بتا کر شاعری

---

[1] دنیائے افسانہ۔ عبدالقادر سروری صد دیباچہ
[2] ایضاً

اور ناول کے موضوع کو ایک لکھا ہے۔ ناول کے عناصر میں اشخاص قصہ پلاٹ مکالمہ مقصد یا فلسفۂ حیات، اسلوب بیان، زمان و مکان کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ تمہید، واقعات جوش یا تحریک، عروج انکشاف، خاتمہ کو نامہ نگار نے ناول کی منازل، ناول کی خصوصیات میں واقعات کو پیش کرنے کا ڈھنگ موضوع، صداقت کی سفارش کی ہے۔

مشاہدہ، مواد کی تلاش، ڈرامائی پیشکش، مقصد اور فنی تکمیل، ناول نگار کے فرائض گنائے ہیں۔ مختصر قصوں کی ارتقائی تاریخ، یورپ کے پرانے عہد سے اپنے عہد تک مختصر قصوں کا فن، مشرق اور قصہ گوئی، منظوم قصے، نثری افسانے، فورٹ ولیم کالج کی کوشش، اس عہد کے افسانوں کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔ اردو ناول ۱۸۵۷ء کے بعد میں سرشار، نذیر، شرر، رسوا، راشد الخیری، ظفر عمر، سجاد حیدر، نیاز فتحپوری کی ناول نگاری پر تبصرہ کیا ہے۔ (اردو افسانوں کے مستقبل میں) افسانہ نگاری کے معیار کو بلند کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں ہر موضوع پر خاطر خواہ مواد فراہم کر کے افسانے کی تاریخ مرتب کی ہے۔ نیز افسانے کے مفہوم کی وسعت کو عیاں کیا ہے۔ افسانے، داستانوں، ناول وغیرہ کے اجزائے ترکیبی پر بحث کی ہے۔

فن افسانہ پر اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب اردو ادب میں کسی افسانے کی تاریخ اور تنقید کو سمجھنے میں معاون و مددگار ثابت ہوگی۔

افسانہ

مجنوں گورکھپوری

مجنوں گورکھپوری کی کتاب "افسانہ" صنف افسانہ پر دو مقالات کا مجموعہ ہے۔ پہلا مقالہ "افسانہ اور اس کی غایت" اگست ۱۹۳۵ء میں بسلسلہ اردو ہفتہ علی گڑھ میں پڑھا گیا تھا۔ مقالہ کی تمہید میں افسانہ کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے۔

"سب سے پہلے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ افسانہ سے میری مراد محض مختصر افسانہ نہیں ہے۔ میں نے اس کا مفہوم وہ سمجھا ہے جو انگریزی لفظ FICTION کا ہے جس کے تحت طویل داستانیں، مختصر افسانے، قصے اور حکایتیں سب ہی کچھ آجاتے ہیں۔" [1]

---

[1] "افسانہ"، مجنوں گورکھپوری ص ۵-۴

مصنف نے افسانہ کیا ہے میں افسانہ نگار کو واقعات کی ترتیب، کردار نگاری، نقطۂ خیال، اسلوب بیان کی اہمیت پر متوجہ کیا ہے۔ ہر موضوع پر یورپین افسانہ نگار اور نقادوں کے حوالے کی روشنی میں تبصرہ کیا ہے۔ افسانے کی غایت کے عنوان میں افسانہ کو فطری جذبات اور میلانات کو ابھارنے کا ذریعہ بتایا ہے۔ سماج اور ماحول سے مواد کی فراہمی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دوسرا مقالہ اردو افسانہ ہے جو ۱۹۳۵ء میں اردو لٹریری کانفرنس کلکتہ میں پڑھا گیا تھا۔ اس کی تمہید میں افسانہ کو انسان کی زندگی کا لازمی جزو بتایا ہے۔

"غرضکہ افسانے کی حقیقت اور اس کی غایت کا اصل راز انسان کی تخیل پرستی میں ہے۔ چونکہ انسان اور اس کے خارج و باطن کی کشمکش دونوں شریک ازلی ہیں اس لئے ابتدا ہی سے افسانہ اس کی زندگی کا لازمی جزو رہے۔"[۱]

اس بیان کے تحت مثنویوں کو منظوم افسانہ لکھا ہے۔ اور مختلف شعراء کی مثنویوں کے موضوع کا تعارف پیش کیا ہے۔ افسانہ منثور میں "سب رس" "شعلۂ عشق" باغ و بہار وغیرہ داستانوں پر مختصر تبصرہ کیا ہے۔ سرشار، شرر، نذیر احمد، راشد الخیری کی ناول نگاری جدید اردو افسانہ کے ذیل میں پریم چند، نیاز، سدرشن، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کیا ہے۔ مصنف نے جس عہد میں یہ مقالات لکھے اس وقت افسانہ میں داستان، ناول، قصوں کا شمار ہوتا تھا لیکن آج افسانہ بذات خود انفرادی صنف ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے افسانے کے فنی اجزاء کی معلومات ہوتی ہے۔ اپنے عہد میں یہ کتاب افسانہ کے فن پر اہم تصنیف تھی۔ آج بھی افسانے کی صنف پر اس کتاب کو اہم درجہ دیا جاسکتا ہے۔

اصول افسانہ نگاری

اویس احمد ادیب

یہ کتاب "اصول افسانہ نگاری" فن افسانہ نگاری کے اصولوں کی وضاحت کرتی ہے۔ اویس احمد ادیب کے مطابق

"یہ کتاب "اصول افسانہ نگاری" ترتیب دی گئی ہے تاکہ افسانہ نگار حضرات کو "افسانہ نگار" کے فرائض اور افسانے کے عناصر اور منازل کے معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔

---

[۱] افسانہ، مجنوں گورکھپوری ص ۴۷

اور وہ پست افسانے لکھنے کے بجائے فنی تکمیل کے ساتھ افسانے لکھنے لگیں۔[1]

اس کتاب کے باب اوّل میں مختصر افسانے ناولٹ یا مختصر ناول اسکیچ یا خاکے کی تعریف اور وضاحت ہے۔

باب دوّم میں افسانے کی سرخی ابتدا اور تحریک منتہا، نکتاف اور خاتمہ اور ہر فنی نکات کا اظہار ہے۔

باب سوم میں موضوع کی تلاش مطالعہ اور مشاہدے کے ساتھ سرقہ اعادہ اور پلاٹ پر مختصر بحث ہے۔

باب چہارم میں کردار نگاری کی فنی باریکیوں نیز ہیرو ہیروئن کے کردار، ذیلی اور ثانوی کردار، غیر ضروری کردار پر بہتر تبصرہ ہے۔

باب پنجم میں مکالمہ کی ٹیکنک میں شگفتگی اور ظرافت کی حکمت پر بحث کی گئی ہے۔

باب ششم میں افسانے میں یا علاقائی رنگ کے مطابق فنی حقیقت، ماحول اور تخیل پر مختصر مگر جامع تبصرہ کیا ہے۔

باب ہفتم میں افسانہ کی طوالت اور اختصار کے موضوع میں ربط و تخیل کی حقیقت اتحاد زمان و مکان کے موضوع کو سمجھایا گیا ہے۔

باب ہشتم میں افسانہ کے فن کی تکمیل تک وحدت اسلوب، پیش کش اور انفرادیت کو واضح کیا ہے۔

باب نہم میں افسانوں یا کہانیوں کے پلاٹ میں فرسودہ مواقع اور غیر متوقع صورتوں پر تبصرہ کیا ہے۔

باب دہم میں عشقیہ افسانے اور صنفِ نازک کے عنوانات کے مطابق لکھے جانے والے افسانوں میں حقیقت سے وابستہ ماحول سے پیوستہ باتوں پر زور دیا گیا ہے۔

یہ کتاب فن افسانہ نگاری کی ٹیکنک پر بھرپور مواد پیش کرتی ہے۔ صنف افسانہ کے فنی تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس لئے ادب میں افسانہ کی صنف میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

فن افسانہ نگاری

سیّد وقار عظیم

---

[1] اصول افسانہ نگاری۔ اویس احمد ادیب صفحہ نمبر دیباچہ

وقار عظیم کی تصنیف "فن افسانہ نگاری" کا دوسرا ایڈیشن ہے ۔ افسانے کے فنی لوازمات اور اجزائے ترکیبی کا جائزہ ہے مصنف نے افسانے کی حقیقت اور مفہوم کی وضاحت میں یورپی نقادوں کی آرا ء سے نقل کی ہیں ۔ اور افسانے میں وحدت کے تاثر کو اہمیت دی ہے ۔ افسانے کو مختلف صنف ثابت کرنے کے ناول اور ڈرامے کے فرق کو واضح کیا ہے ۔ طویل اور مختصر افسانے پر جامع تبصرہ کیا ہے ۔ بقول مصنف

"مشاہدے اور تجربات کے علاوہ ایک اور چیز جیسے مواد کے فراہمی کے سلسلے میں افسانہ نگار کے لئے ضروری بتایا گیا ہے ۔ ذاتی مطالعہ اور محاسبہ ہے" [۱]

افسانہ نگار کے فرائض و رذمہ داری پر سنجیدگی سے تبصرہ کیا ہے ۔ افسانے میں پلاٹ کی اہمیت اور اقسام پر بعض طویل تبصرہ اور افسانے کی ترتیب کے انتخاب میں افسانہ نگار کو اہم نکات کی جانب متوجہ کیا ہے ۔ افسانے میں کہانی کی فنی ترتیب و رفضابندی تمہید اور خاتمہ کے ضمن میں مدلل بحث سے سیرت کشی کرداروں میں رومان کی حقیقت رومانس کے عنصر کی ابتداء اور ارتقاء کا تاریخی جائزہ لیا ہے ۔

جمالیات اور رومانیت کے موضوع کو یورپین نقادوں کی آرا سے سمجھانے کی کوشش کی ہے ۔ افسانے میں حقیقت کی نوعیت کو سمجھایا ہے ۔ مقامی رنگ کے بابت اپنے عہد کی قدروں اور حالات کے تقاضوں کا تذکرہ کیا ہے ۔ افسانہ اور افسانہ نگار کے ذیل میں کامیاب افسانے کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے ۔ بقول مصنف

"افسانے میں ہر قدم پر ہر خیال میں ہر کردار کے پیش کرنے میں اس کی فنی ترتیب کے انتخاب میں زندگی کو ایک مخصوص نظر سے دیکھنے میں افسانہ نگار اپنی فطرت اور اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے کام لیتا ہے ۔ اور یہ مخصوص نقطۂ نظر اس کے اسلوب پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ اسلوب اور نقطۂ نظر دونوں افسانے کی شخصیت اور انفرادیت کے نمائندے ہیں" [۲]

وقار عظیم نے قاری اور افسانہ نگار کے بیچ نازک مرحلوں اور ذہنی مفاہمت کے اسباب کو بڑی عمدگی سے سمجھایا ہے ۔ اس کتاب میں افسانے کے اجزائے ترکیبی کا افسانے کی خصوصیات اور خامیاں بیان کی ہیں ۔ افسانہ نگار کے لئے مواد کی فراہمی' افسانے کی پرکھ' جانچنے کی کسوٹی اور تنقید کے

---

[۱] فن افسانہ نگاری - وقار عظیم ص ۹۵ [۲] ایضاً ص ۲۵۶

سے طریقۂ کار کے باب کھول دیئے ہیں۔ اس بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ صنف افسانہ پر یہ کتاب گراں قدر اضافہ ہے۔

اردو افسانہ روایت اور مسائل

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی معرکۃ الآرا تالیف ہے۔ جو ۶۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ افسانے کے فن اور ماہیت کا تحقیقی اور تنقیدی خاکہ ہے۔ موصوف ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کی تحقیقی کارکردگی اور سیمیناروں کے مباحثے اردو ادب سے دلچسپی کا ثبوت ہیں۔ "اردو افسانہ روایت اور مسائل" اسی سلسلے کی اٹوٹ کڑی ہے۔ موصوف نے افسانہ کے سیمیناروں میں پڑھے گئے مقالات کو کتابی شکل میں ہمارے سامنے یکجا کر دیا ہے جس میں اردو افسانہ فن تکنیک اور روایت سے متعلق کل چھ مضامین پریم چند فکر و فن سے متعلق پانچ مضامین عہد ساز افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر پر کل ۱۲ مضامین موجود ہیں یہ مضامین اپنے موضوع اور ترتیب کے لحاظ سے افسانے کی تاریخ تکنیک کے اصولوں پر تنقیدی مواد پیش کرتے ہیں۔

افسانے کی اہمیت پر موصوف نے کتاب کے "ابتدائیہ" میں لکھا ہے۔

"اردو کی نثری اصناف میں افسانے کو جو مرکزیت حاصل ہے۔ اور بیسویں صدی میں اس صنف نے جو ترقی کی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے اس قابل ہے کہ اس پر توجہ کی جائے۔ ایک طرف تو ماضی کی شاندار روایت ہے۔ اور دوسری طرف افسانے کے اظہاراتی تجربے فنی بلندیاں اور نئے نئے مسائل ہیں جو قابل غور ہیں۔"

ان مضامین کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ متعدد نگاروں فنکاروں نے فن کا جائزہ لیا ہے۔ بقول عبدالقوی دسنوی

"پروفیسر نارنگ نے اسے اور زیادہ مفید بنانے کے لئے بعض اہم نقادوں کے اہم مطبوعہ مضامین بھی شامل کر دیئے ہیں اور بعض نقادوں سے نئے مضامین لکھوا کر اس میں اضافہ بھی کیا ہے اور اسطرح یہ کتاب اور زیادہ جامع اور مکمل ہو گئی ہے جس کے

لئے پروفیسر نارنگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ [1]

اس میں شک نہیں کہ گوپی چند نارنگ کی یہ تالیف موضوع کے مطابق افسانے کی روایت کی منظم تاریخ ہے۔

ڈرامہ

ڈرامہ اور ناول میں بڑی حد تک مماثلت ہے۔ پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نویسی، منظر نگاری، فلسفۂ حیات کے زمرے میں داخل ہیں۔ ناول اور ڈرامہ کے ذریعۂ اظہار میں فرق اتنا ہے کہ ناول میں اظہار کے لئے زبان اہم ذریعہ ہے۔ اور ڈرامہ اسٹیج ہونے کے مرحلے میں حرکت و عمل کے ذریعہ ذہنوں کو متاثر کرتا ہے۔ ناول پڑھنے یا سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ ڈرامہ کا تعلق دیکھنے سے ہے۔ ناول جذبات کو اکسانے میں صرف زبان کی فصاحت و بلاغت کا سہارا لیتی ہے۔ ڈرامہ دلکش منظر، مکالمہ اور اداکاری کی بنیاد پر ماحول ہموار کرتا ہے۔ اور جذبات کو اکسانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ڈرامہ کا ذریعۂ اظہار اداکار ہوتا ہے جس کو زبان، منظر اور اداکاری کا سہارا ملتا ہے۔

ناول میں کردار کو صرف زبان کی مدد ملتی ہے۔ لیکن ناول نگار اپنے کرداروں میں بیانات کے سہارے تاثر پیدا کرتا ہے۔ اپنے بیانات کے ذریعہ سماج کی عکاسی، نقطۂ نظر اور رائے کا اظہار کرتا ہے۔ ڈرامہ کے لئے بیان دینا، تشریح کرنا، رائے کا اظہار فنی جرم ہے۔ ڈرامہ نگار اداکار کی اداکاری اور مکالمہ کے زور پر منظر سے ماحول کا اظہار کرتا ہے۔

ایک کامیاب ڈرامہ کا پلاٹ اچھا ہونا چاہیئے۔ ناول کا پلاٹ صرف بیان اور منظر نگاری کی دین ہے۔ لیکن ڈرامہ کا تعلق تماشائی سے ہوتا ہے۔ اور ڈرامہ اسٹیج پر منظر، ماحول کی روشنی میں بیانات کا سہارا لیتا ہے۔ اس لئے ڈرامہ مفید اور مختصر ہونا چاہئے۔ فضول چیزوں کو ڈرامہ سے خارج کرنے سے اسٹیج پر کئی وسائل کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔ اہم اور خاص باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف سین اور مناظر کو اس طرح پیش کیا جائے کہ ڈرامہ کا مقصد پورا ہو جائے اور بڑے سے بڑے واقعات کا اظہار آسانی سے ہو جائے۔

ایک کامیاب ڈرامہ کا پلاٹ اچھا ہونا چاہیئے ڈرامہ واقعات اور ماحول کے مطابق کردار نگاری ہونی چاہیئے کیونکہ کردار کے سہارے ماحول کا عکس عیاں ہوتا ہے۔ قدیم عہد کے واقعات میں جدید

---

[1] جائزے (مرتب مظفر حنفی) تبصرہ عبدالقوی دسنوی ص ۲۳۲

ماحول کا کردار ڈرامہ کی موت ہے۔ ڈرامہ میں کردار اپنے عہد، ماحول اور واقعات کا عکاس ہوتا ہے محدود دائرے میں کردار نگاری، اختصار شخصی اثرات سے مبرّا عملی اعتبار سے اپنے عہد اور معاشرے کا نمائندہ ہونا چاہئے۔ مکالمہ کی وابستگی کردار کو عہد سے وابستہ واقعات کی روشنی میں کرنا چاہئے۔ خود کلامی کے مقام پر اس عہد کی قدروں اور کردار کی صلاحیت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ ڈرامائی طنز، اخفا اور تعجب کے اظہار میں کرداروں کا جائزہ بھی ضروری ہے ورنہ ڈرامہ ناکام ہو سکتا ہے۔

اردو ادب میں ڈرامہ نگاری کی صنف پر انگریزی ڈرامہ نگاری کے اثرات ہیں کیونکہ ہمارے یہاں ڈرامہ انگریزی سے آیا ہے۔ سنسکرت ناٹک یا سوانگ کے اثرات موجود ہیں لیکن اتنے خاص نہیں۔

پروفیسر سید مسعود حسن کے مطابق

"واجد علی شاہ زمانے تک اردو میں ڈرامہ کا وجود نہ تھا۔ اس اہم صنف کی ادبی بنیاد ڈالنے کا فخر ان کے لئے اٹھ رہا تھا۔ انھوں نے ولیعہدی کے دنوں میں رادھا کنہیا کی داستان محبت پر مبنی ایک چھوٹا سا ناٹک لکھا۔ جو ہماری خوش قسمتی سے اب تک موجود ہے۔ فنی اعتبار سے اس کا درجہ کچھ بھی ہو اردو کا پہلا ڈرامہ ہونے کی حیثیت سے وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ حضرت مصنف ڈرامہ کے ساتھ ساتھ اداکاروں کے لئے ہدایتیں لکھتے گئے ہیں۔"[1]

مسعود حسن صاحب نے اردو کے پہلے ڈرامہ کا نام "افسانۂ عشق" بتایا ہے جو محل کی چار دیواری میں کھیلا گیا تھا۔ لیکن سید آغا حسین امانت لکھنوی کے "اندر سبھا" کو اردو کا پہلا ڈرامہ تسلیم کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ پہلی بار عوام کے لئے اسٹیج کیا گیا۔ اور اپنے عہد میں بہت مقبول ہوا۔ گو اس کی نثر بہت پر تکلف پر تصنع اور مقفّیٰ عبارتوں نیز رعایت لفظی کا استعمال بکثرت ہے۔ لیکن اندر سبھا کی مقبولیت سے متاثر ہو کر مداری لال نے بھی اندر سبھا ڈرامہ لکھا۔ لیکن ادبی نقطۂ نظر سے وہ امانت سے آگے نہ بڑھ سکا۔

رونق بنارسی اور حسینی میاں نے سیٹھ پسٹن جی پارسی کی تھیٹر کمپنی کے لئے ڈرامے لکھے۔ سیٹھ بالی والا پارسی کی وکٹوریہ کمپنی میں منشی ونائک پرشاد طالب بنارسی ڈرامے لکھتے تھے۔ انھوں نے اسٹیج پر منظوم روش سے ہٹ کر نثر کا استعمال کیا۔ اور ہندی گانوں کی جگہ اردو گیتوں کو رائج کیا۔ ان کا ڈرامہ "لیل و نہار" ادبی اور فنی لحاظ سے کامیاب ہے۔ اور تمام گیت اردو میں۔

کاؤس جی پارسی کی الفریڈ تھیٹر کے ڈرامہ نویس سید مہدی حسن احسن لکھنوی تھے۔ اور ہیملیٹ کا ناد فرزند

---

[1] لکھنؤ کا اسٹیج۔ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی۔ (دیباچہ)

چندراولی' دل خراش' بھول بھلیاں اور چلتا پرزہ مشہور ڈرامے ہیں۔ آغا محمد شاہ حشر کشمیری کے ڈرامے بہت مشہور ہوئے انھوں نے کئی کمپنیوں کے لئے ڈرامے لکھے۔ اور شیکسپیر کے نام سے ایک تھیٹر قائم کیا۔ آفتاب محبت ان کا پہلا ڈرامہ ہے جس کا سن تصنیف ملتشتبہ ہے۔ مارِ آستین، مرید شک' اسیر حرص، ہیملیٹ یا خونِ ناحق، بیلی جیپری' دامِ حسن کنگ لیریا سفید خون، کنگ جان یا صید ہوس' خوبصورت بلا' سلور کنگ یا جرمِ وفا' خود پرست' بلوہ منگل' یہودی کی لڑکی' بھارت منی' انوکھا مہمان' شبرکی گرج' ماتر بھگتی' بنجا گیرت' ہندوستان' ترکی حور' پہلا پیار' آنکھ کا نشہ' سیتا بن باس' رستم و سہراب' سماج کا شکار' دل کی پیاس

آغا حشر کشمیری کے ڈراموں کی کامیابی پہلے ایکٹ سے ہو جاتی تھی۔ لیکن بعد کے ایکٹ میں جلد بازی سبب پلاٹ پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ان کے ڈراموں میں اشعار کی کثرت ذہنی بوجھ بن جاتی تھی۔ اور اکثر ڈرامہ کے مزاحیہ حصے میں فحاشی کی حد تک مذاق روا کر دیا تھا۔

۱۹۲۳ء کے بعد مولوی عبدالماجد کا رود ِ دیشتیاں' مرج موہن کیفی کا مختصر ڈرامہ راج دلاری حکیم شجاع کے باپ کا گناہ' بھارت کا لال' آخری فرشتوں' جانباز اچھے ڈرامے ہیں

عہدِ حاضر میں عابد حسین کا "پردۂ غفلت" صالحہ عابد حسین کا "بنیادی حق" اور "زندگی کا کھیل" عسین قریشی کا "نقشِ آخر" "نفرت کا بیج" ابراہیم جلیس کا "اجالے سے پہلے" اچھے ڈرامے ہیں۔

اردو میں اس صنف پر اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔

۱۔ ناٹک ساگر	نور الٰہی اور میاں صاحبزادہ محمد عمر
۲۔ نا اردو ناٹک	
۳۔ اردو میں ڈرامہ نگاری	بادشاہ حسین
۴۔ ڈرامہ کی تاریخ و تنقید	ڈاکٹر عشرت رحمانی
۵۔ اردو ڈرامہ نگاری تحقیق اور تنقید کی روشنی میں	ڈاکٹر قمر اعظم
۶۔ اردو ڈرامہ	ڈاکٹر نامی
۷۔ ریڈیائی ڈرامہ	ڈاکٹر اخلاق اثر
۸۔ ڈرامہ کا فن	ـــ ـــ ـــ
۹۔ یک بابی ڈرامہ	فصیح احمد صدیقی
۱۰۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج	ڈاکٹر مسعود حسین رضوی ادیب

۱۱۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج ۱۲۔ اردو ڈراما اور اسٹیج ڈاکٹر مسعود حسین رضوی ادیب

ناٹک ساگر

نور الٰہی و محمد عمر

۱۹۲۶ء کی اس نایاب کتاب کا سرورق یوں ہے۔

ناٹک ساگر۔

یعنی۔ دنیائے ڈراما کی تاریخ جس میں

دنیا بھر کے مشاہیر ڈراما نگاروں اور ایکٹروں کی سوانح حیات جملہ ممالک عالم میں اسٹیج کے عروج اور زوال کے اسباب اور فنی ڈراما کی ارتقائی کیفیت بیان کرکے ڈراما اور اسٹیج کے محاسن و عیوب آشکار کئے گئے ہیں۔ از

نور الٰہی

محمد عمر

میاں نور الٰہی اور صاحبزادہ محمد عمر کی ۱۹۲۶ء کی تصنیف اپنے موضوع کے اعتبار سے واحد تصنیف ہے۔ ۴۴۴ صفحات پر محیط ہے۔ دیباچہ میں دونوں مصنفین نے کتاب میں مندرجہ فن ڈراما کے عنوانات پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ڈراما کی اقسام اور ان کی صفات بیان کی ہیں۔ دیباچہ کے ابتدا میں لکھتے ہیں۔

"بعض حضرات دیباچہ کو محض ایک رسم یا خودستائی کا ایک نظر فریب اسلوب خیال کرتے ہیں ممکن ہے کہ تجربہ کے اعتبار سے یہ قول غلط نہ ہو۔ مگر ہمارے عندیہ میں دیباچہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ دورانِ تصنیف میں کچھ باتیں مصنف کے ذہن میں ہوتی ہیں جن کے اظہار کے لئے وہ موقعہ اور محل کے انتخاب ہی میں محو ہوتا ہے کہ کتاب "تمام شد" کی سر منزل پر پہنچ جاتی ہے اور مصنف مجبور ہو۔ تاہے کہ دیباچہ کو متن کے تنگیٔ دامن کا پردہ پوش بنائے۔ یہی ضرورت ان سطور کے باعث ظاہر ہونے کا عذر ہے۔[1]

مقدمہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی زور قلم کا نتیجہ ہے۔ فرخ سیر کے عہد میں میاں نواز دہلوی کو اردو میں شکنتلا کا ترجمہ بطرز ناٹک کرنے پر پہلا ڈراما نگار بتایا ہے۔ خواجہ امانت لکھنوی کو اندر سبھا کی بنیاد پر دوسرا ڈراما نگار تسلیم کرتے ہیں:[2] مقدمہ نگار کیفی لکھتے ہیں۔

"ناٹک ساگر کی تعریف یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ یہ وہ کتاب ہے جو اردو ادیبوں اور ڈراما نویسوں اور اسٹیج یعنی تھیٹر کے ہر قسم کے متعلقین کے لئے روزنامچہ ہدایات کا کام دے گی۔ یورپ کے ڈراما کی عہد بہ عہد ترقی اس کا عروج وارتقاء اور تنزل فن تمثیل یعنی ایکٹری کا لباس و سینری وغیرہ۔"[3]

کیفی دہلوی نے مقدمہ میں ڈراما کی تاریخ اور خصوصیات میں ہندوستانی اسٹیج سنسکرت اسٹیج یونانی اسٹیج

---

[1] دیباچہ۔ ناٹک ساگر۔ نور الٰہی۔ محمد عمر ص۱ [2] مقدمہ ناٹک ساگر برج موہن دتاتریہ کیفی ص۴

[3] ایضاً ،، ،، ص۹

یورپی اسٹیج' ہندی اسٹیج' اور اردو اسٹیج کے ڈرامہ نگاروں نیز ان کے اداکاروں پر مختصر مگر مفید خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کی اہمیت اور خصوصیت یہ ہے کہ دنیائے ادب کی تاریخ اور اہم ملک میں ڈرامہ کی ابتدائی تاریخ معاشرتی اور سماجی نوعیت پر ناٹک کی قدر و قیمت' لوازمات میں موسیقی مشہور اداکاروں کے حالات اور بیرت ڈراموں کی خصوصیات اقسام کی روشنی میں ٹریجڈی' کامیڈی ڈراموں کی تاریخ خصوصیات اور دیکھنے والوں پر اس کے اثرات غرضکہ ڈرامہ پر کوئی موضوع تشنہ نہیں رکھا ہے۔

باب اول میں۔ یونان میں ڈراموں کی ابتدا ڈرامہ کی اقسام اور ان میں حصہ لینے والے اداکاروں کی خصوصی معلومات ملتی ہے۔ یونانی تھیٹر اس کی جغرافیائی معلومات ملتی ہے اس پر اخراجات کی بھرپائی کا ذکر کیا ہے۔

باب دوم میں۔ روم اور اٹلی میں ڈرامہ کی ابتدائی تاریخ معاشرت اور اقدار کی روشنی میں ڈراموں کا انعقاد اور علاقائی ٹریجڈی' کامیڈی کی خصوصیات کو مدنظر رکھ کر تبصرہ کیا ہے۔ مذہبی اخلاقی ڈراموں میں حصہ لینے والے اداکاروں کے حالات بتائے ہیں۔

باب سوم۔ اسپین میں ڈرامہ کی ابتداء وہاں کی معاشرتی' سماجی اور مذہبی قدروں کے پیش نظر ڈراموں میں جھلکیاں ملتی ہیں۔ اداکاروں کی خصوصیات پر سیر حاصل تبصرہ ملتا ہے۔

باب چہارم میں پرتگال کے ڈراموں کا بیان مختصر اور کسی خاص موضوع پر ہے۔

باب پنجم میں۔ فرانس میں ڈرامہ کی ابتداء' علاقائی خصوصیات' ڈراموں کی اقسام' اداکاروں کی اہمیت اور خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ڈراموں کے زوال کے اسباب کا ذکر کیا ہے۔

باب ششم میں۔ انگلستان میں ڈرامہ کی تاریخ ذاتی کشمکش کا اظہار۔

فصل دوم میں شیکسپیئر اور اس کے ڈراموں کی خصوصیات (شیکسپیئر)

فصل سوم میں شیکسپیئر کی ڈرامہ نگاری اور اسٹیج ہوئے ڈراموں کی فہرست پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے (شیکسپیئر)

فصل چہارم میں شیکسپیئر کے معاصرین اور متقدمین کے کارہائے نمایاں اور اداکاروں کا ذکر کیا ہے۔ قانون اور اسٹیج ہنری ہشتم کے زمانے میں سیاست' عوامی تفریح و طبع بن گئی تھی۔

فصل پنجم میں۔ انگلستان میں ڈرامہ کا عہد جدید سترہویں صدی سے بتایا ہے۔ چارلس دوم کے زمانے میں ماحول' حالات' اخلاقی صورت حال' مذہبی غیر اخلاقی ڈراموں پر بحث ہے۔

فصل ششم میں انگلستان میں اسٹیج کے عروج پر خاطر خواہ بحث کی ہے۔ ڈراموں کے اسٹیج کرنے میں تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔ عوام کی دلچسپی کس موضوع پر تھی۔ وہاں کے اداکاروں کی خصوصی اداکاری کا

تذکرہ کیا ہے۔

فصل ہفتم میں عہدہ کموڈر میں ڈرامہ کے ابتدائی ایام اس کی ترقی کا ذکر کیا ہے۔ اس دور میں دوسری زبانوں کے ترجمے اور نئے تجربات اسٹیج پر پیش کئے گئے ہیں۔ اور اس پر اثرات بتلائے ہیں۔

فصل ہشتم میں اواخر عہد وکٹوریہ کے ڈرامہ نگاروں کا ذکر ہے۔ جس میں سر ولیم شونک، گلبرٹ، سٹرلی گرنڈی، ہنری آرتھر جونز، ولنز، وائلڈ، جارج برنارڈ شا قابل ذکر ہیں۔ اس عہد میں اسٹیج کی نئی تحریکوں، تھیٹر وں میں ہونے والے ردو بدل پر تبصرہ کیا ہے۔

فصل نہم میں متفرقات کے عنوان سے مرگ مفاجات کے عنوان پر مرنے والے اداکاروں کی موت کیسے واقع ہوئی [illegible] کا ذکر کیا ہے کچھ نام درج کئے جاتے ہیں۔

[illegible] ۱۶۷۳ء میں فالج گرا۔ پارٹ کرتے ہوئے فالج گرا۔ وہ مرگیا ۱۸۱۷ء میں بٹرٹن فقریں [illegible] مبتلا تھا۔ اسی حالت میں اسٹیج پر آیا۔ تین دن میں مرگیا ۱۸۳۳ء [illegible] پانڈ اسٹیج پر گرا اور ٹھنڈا ہوگیا ۱۸۳۰ء میں مسٹر مکلن کو اسٹیج پر فالج ہوا۔ اور مرگئی۔ انگلستان میں ایسے اداکاروں کی بہتات ہے۔ جو اسٹیج پر موت کے شکار ہوئے۔ ایکٹروں کی تنخواہیں۔ ڈراموں کی قیمت ایکٹروں کی عمر ایکٹروں کے ناشتہ وغیرہ پر مکمل معلومات دی ہے۔

باب ہفتم۔ میں جرمنی و آسٹریلیا میں ڈراموں کی ابتدائی تاریخ ڈراموں پر مختلف تحریک کے اثرات مدرسی و تھیٹر کے ڈراموں کا ذکر کیا ہے۔ گوئٹے اور اس کے خیالات پر اظہار کیا ہے۔

باب ہشتم۔ میں سویڈن اور ناروے میں ڈرامہ کی ابتدا، عروج و زوال کے اسباب اور اداکاروں کے حالات پر ہے۔

باب نہم میں۔ روس میں ڈرامہ کی ابتدائی تاریخ، عروج و زوال کے اسباب بیان کئے ہیں۔

باب دہم۔ ہالینڈ اور بلجیم میں ڈرامہ کی ابتدائی تاریخ عروج و زوال پر دو صفحات کا مواد ہے۔

باب یازدہم میں امریکہ میں ڈرامہ کی ابتدا، مشرقی اسباب، مذہبی اور مختلف اداکاروں اور [illegible] پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب دوازدہم۔ میں ہندوستان عہد قدیم میں اندرا اور برہما کے تولے سے نٹ وید سام وید یجروید اتھروید کی خصوصی صفات سے ڈرامہ کا آغاز پڑتا ہے [illegible] دور میں ڈرامہ کی دو اقسام بتائے ہیں۔

[illegible] روپک [illegible] اب روپک ناٹک کو ڈرامہ کا اعلیٰ نمونہ بتایا ہے۔

ہندوستانی ناٹک میں اسٹیج کی جانے کی شرائط کا ذکر کیا ہے مثلاً ہیرو اونچی ذات کا ہو۔ اس عہد میں کچھ باتوں کی نمائش بھی ممنوع تھی۔ جیسے نہانا، بوس رینا، موت، جنگ کا منظر۔ ڈرامہ کی ترتیب یوں بتاتے ہیں۔

"ہر ڈرامہ ایک تمہید سے شروع ہوتا ہے جس میں حاضرین کو بتایا جاتا ہے کہ کون ڈرامہ کا مصنف ہے۔ کون لوگ پارٹ کریں گے۔ ڈرامہ میں واقعات سے قبل ایسے واقعات بیان کئے جاتے ہیں جن کا جاننا حاضرین کے لئے ضروری ہوتا ہے۔" [1]

ڈرامہ کی نمائش سے مدعا میں مختلف باتوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈرامہ میں آنے والی اصطلاحوں کا مفہوم واضح کیا ہے۔ انشاء و زبان میں تحریر صاف، شستہ، فصیح و بلیغ الفاظ کے استعمال پر زور دیا ہے۔ سینری کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ہندی یونانی ڈرامہ کا موازنہ کرکے کچھ خامیوں اور خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قدیم ہندی ڈرامہ اور ڈرامہ نگاروں کی تاریخ وضاحت سے پیش کیا ہے۔ کالیداس او ماس کے ڈراموں مہاراجہ شری ہرش دیو، بھوبھوتی، عنوان رام چندرجی کا سپہ سالار، نرائن بھٹ، رام بھدر دکشی کے راج شنکر، پراچیڈ، بٹڑیو، لامہابھارت کے کنجن اچاریہ مراری، وشاکادت، کرشن مسر کے پرابھنانجان وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ہندی ڈرامہ کے زوال کے اسباب میں مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن کوئی خاص بات نہیں بتائی گئی۔ شاہان اسلام اور ہندوستانی فنکاروں کو دئے گئے انعامات کا ذکر ہے۔ عہد جدید کے دور ماضی میں واجد علی شاہ سے شروع کیا ہے اور آغا حسن امانت اندر سبھا پر تفصیلی بحث کی ہے۔ امانت کی کامیابی کے بعد مداری لال کا ذکر ہے۔

پارسی اور اردو ڈرامہ قیصر باغ کی چار دیواری کے بعد میں پسٹن جی فرام تورشید جی بالا والا، کاوس جی کھٹاؤ اور مہراب جی کے کچھ ڈراموں کا ذکر کیا ہے۔ بالی وال والا، کا میڈی نما کے بعد الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے قیام میں کاوس جی ڈرامہ نگار احسن بیتاب کا ذکر ہے۔

نیو الفریڈ تھیٹر کے قیام میں مہراب جی نے احسن کا چلتا پرزہ پیش کیا اور آغا حشر کاشمیری کے درج ذیل ڈراموں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ شہید ناز ۲۔ مرید شک ۳۔ میٹھی چھری ۴۔ خواب ہستی

---

[1] ناٹک ساگر۔ نورالٰہی۔ محمد عمر ص ۳۱۹

۵۔ ٹھنڈی آگ	۶۔ اسیر حرص	۷۔ سید ہوس	۸۔ سفید خون
۹۔ خوبصورت بلا	۱۰۔ خود پرست	۱۱۔ سلور کنگ	۱۲۔ شام جوانی
۱۳۔ تصویر وفا	۱۴۔ نعرۂ توحید	۱۵۔ جرم نظر	۱۶۔ ترکی حور

۱۷۔ ہندوستان قدیم و جدید

ہندی میں سورداس، گنگا اترن، بن دیوی، سراون کمار، سیتابن، بمبئی پارسی تھیٹریکل کمپنی نیو ملی کمپنی میں پیش کیے گئے ڈراموں پر حافظ عبداللہ کا گمان ظاہر کیا ہے۔ جشن پرستان، فرخ بھاء، فاطمہ ستم بانی انجام ستم، فتنۂ خانم، یوسف ناٹک، عاشق جانباز، زہرہ و بہرام، انصاف محمود، ہیر رانجھا، نور جہاں وغیرہ مرزا نظیر بیگ کے نل دمن، رام لیلا، ماہی گیر، فسانہ، سروش سخن، ابوالحسن۔ منشی غلام حسین دیوانہ جو ایک ایکٹر بھی تھا۔ ان کے تائید یزدانی اور مہر جبیں کا ذکر کیا ہے۔ منشی ابراہیم محشر انبالوی کے درج ذیل ڈراموں کا ذکر ہے۔

آتشی ناگ، جوشِ توحید، دشمن ایمان، نگاہِ ناز، جنگ جرمن، غریب ہندوستان، خود پرست، سنہری خنجر، ہار اعدا، دوزخی حور، رسیلا جوگی، بیکسی کی جلی، شکنتلا، میرا بابا۔

منشی رحمت اللہ لاہور کے ایکٹر کے۔ درد جگر، باوفا قاتل اور محبت کے پھول کا ذکر ہے۔ ابرٹ تھیٹر میں منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی کے رام ناٹک، رام چرتر مانس، مرزا لیاس کے نور جہاں اور نورِ اسلام، ہند سنجری، اور سرکاری جاسوس، آغا شاعر قزلباش کے حور جنت کی اور درج ذیل نامعلوم ڈرامے کے نام گنائے ہیں۔

پرہلاد بھگت، بیرتری، ظلم وحشی، سنگین بکاؤلی، ماں کی بیٹی، جلوۂ امید، جوہر شمشیر، لنک داہ، فتح جنگ، دھوپ چھاؤں، خونی منظر، آبِ ابلیس، فادر سٹے، امرت، سنہری فریب، میٹھا زہر، زنجیر گوہر، روز قیامت، خونی ہیرا، حشر محشر، دورنگی دنیا، تبدیل قسمت، قیمتی انگوٹھی، نل دمن، اور راشٹر آف منگولیا۔

تبصرے۔ واجد علی شاہ، امانت، طالب، احسن، بیتاب، وغیرہ کے ڈراموں میں اشعار اور کردار کے مکالموں پر اچھا تبصرہ ملتا ہے۔

دورِ حاضرہ میں مولوی عبدالماجد کا زہر و پشیمانی، مائل دہلوی کے چند گیت، تیغ ستم، حکیم احمد شجاع کا باپ کا گناہ اور ان کے تنقیدی نکات کا ذکر کیا ہے۔

دورِ گذشتہ ۱۹۱۳ء میں سید تفضل حسین جو لیس سیزر کو اردو زبان میں ڈھالا محمد حسین آزاد کا ناتمام ڈرامہ اکبر جس کو ناشر نذیر احمد فراق دہلوی نے مکمل کیا۔ جو ڈرامہ نگاری سے واقف نہ تھے۔ اس پر تنقید کا ذکر کیا ہے۔

سیاسی ڈراموں میں زخمی پنجاب یا کشن چند زیبا، حکیم اظہر دہلوی کا بیداری، سید دلاور شاہ کا میدان کا پنجاب سیل راما فیئر ٹر دہلی میں اسٹیج ہوا منشی احمد حسین خاں ایڈیٹر اردو ماہور کا "حسن کا بازار" گلوب میں اسٹیج ہو۔ خواجہ حسن نظامی کا "گرا بع زادہ" زیر طبع تھا۔ اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

کچھ ترجمے ہوئے ڈراموں کا ذکر کرنے کے بعد سنیما کا اثر تھیٹر کے موضوع سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے۔ سینما کو جنٹو ماتم کی ایک صورت بتایا جس کا تعلق فقط آنکھ سے ہے۔ [1]

ہندی ڈرامہ میں اس عہد میں ڈرامہ نگاری پر تبصرہ کیا ہے۔ شرون کمار، سیتا وان سا وتری، ملوا منگل پریم چند جتن، بال کرشن، دان ویر کرن، گنگا اترن وغیرہ ڈراموں کا مختصر تعارف لکھا ہے۔

بنگالی ڈرامہ میں پاترا، میکائل مدھو سودن اور دتا پر تبصرہ کر کے ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی حالات زندگی اور ان کے ڈراموں کا ذکر کیا ہے۔ بنگالی ڈرامہ پر تنقید کے ساتھ اس مستقبل سے بحث کی ہے۔ قانون ڈرامہ کے ایکٹ ۹ء کے ہنگامے کر دار و نما سے کھلائے ہیں۔

باب سیزدہم میں ـــ ایران میں ڈرامہ کی تاریخ اور روایت پر تبصرہ ہے۔ دورِ جدید میں کچھ روسی ڈراموں کے ترجمے ایرانی ڈراموں پر ت کا اثر اور ڈرامہ نگاروں کے کارناموں پر تبصرہ کیا ہے۔

یہ کتاب بیٹے عہد میں چین اور جاپان کے ڈراموں کی تاریخ پر مختصر تبصرہ ان کی خصوصیات تھیٹر اور زوال کا ذکر شامل ہے

باب پانزدہم میں عرب، ترکی، افغانستان، سیلون، افریقہ، آسٹریلیا میں ڈرامہ کی حیثیت پر تبصرہ کیا ہے۔

یہ کتاب اپنے عہد میں موضوع کے اعتبار سے تشنہ نہیں ہے لیکن بعض علاقوں میں ڈراموں کے ارتقاء کا خاکہ عیاں نہیں ہو پاتا۔

صفحہ ۲ پر نظیر بیگ کے ڈراموں کی فہرست میں نل دمن شامل ہے۔ لیکن نامعلوم ڈراموں کی فہرست میں بھی صفحہ ۲۷ پر نل دمن شامل ہے۔

تھیٹروں میں اسٹیج کئے گئے ڈراموں کی خامیوں اور خوبیوں پر فنی تبصرہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ڈراموں اور ناٹک کی تاریخ دنیا کے ہر خطے سے منسلک ہیں۔ لیکن ڈرامہ پر فنی، علاقائی، جغرافیائی اور دیگر امور کے تحت

---

[1] ناٹک ساگر۔ نور الٰہی محمد عمر صفحہ ۲۴۳

تنقید کا فقدان ہے۔

ان خامیوں کے باوجود یہ اپنے دور کی واحد کتاب ہے۔ جو اس موضوع پر لکھی گئی۔ اور تاریخی اعتبار سے مکمل کہی جا سکتی ہے۔ اپنے عہد میں اردو زبان میں یہ پہلی کتاب تھی۔ جو ڈرامہ کے فن پر جامع حیثیت سے لکھی گئی ہے۔ لہ

اردو ڈرامہ تاریخ اور تنقید

ڈاکٹر عشرت رحمانی

ڈاکٹر عشرت رحمانی کی یہ تالیف عہد آغاز سے دور حاضر تک ڈراما کے آغاز اور اردو ڈرامہ نگاری کی اہم تاریخ اور جدید تنقید ہے۔

اس کتاب کی ابتداء "فریاد کی لے" سے ہوتی ہے جس میں مؤلف نے تالیف کا مقصد واضح کیا ہے۔ ڈرامہ کا فنی کردار میں ڈرامہ کا فن اور تھیٹر کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ ڈرامہ کی اقسام اور فنی لوازمات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ ڈرامہ اور تھیٹر میں تھیٹر کی عمارت اور آراستگی، آرائشی لوازمات، اسٹیج کی اداکاری، تماشائی کے ذوق اور موسیقی پر معلومات فراہم کی ہیں۔ برصغیر ہندو پاک میں ڈرامہ کی ابتداء، قدیم ہندی ناٹک، اس کا اسٹیج اور مناظر اور اردو ڈرامہ کے محرکات کا بہترین جائزہ پیش کیا ہے۔ اردو ڈرامہ کی اجزائے ترکیبی پر بحث کرتے ہوئے سنسکرت ڈرامہ کی روایت، بھانڈوں کی نقلیں، سوانگ اور لیلائیں، کرشن لیلا، کٹھ پتلیاں پر مفصل مواد اس کتاب میں موجود ہے۔

پیشکشی کے سلسلے میں لکھا ہے۔

"اسلام میں مذہبی طور پر تمثیل اور نقالی ممنوع قرار دی گئی ہے۔ اس لیے رام لیلا اور کرشن لیلا کی طرح اسلامی نظریات وغیرہ کی پیش کش کے سلسلے میں اداکاری کو کبھی گوارا نہیں کیا گیا۔" ۲ہ

اردو ڈرامہ کی پیدائش اور تھیٹر کی تاریخ سے عہد بہ عہد تبدیلیوں اور تدریجی ارتقاء پر مدلل بحث نے کتاب کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔

اردو ڈرامہ نویسی کا تنقیدی جائزہ ڈرامانگاروں کی فنی خصوصیت و خامیاں کا ظہور، تھیٹر کے فنکاروں پر نکتہ چینی اور نمونے ڈراما سے متعلق دیگر اور نکات پر تحقیقی معلومات وغیرہ اس کتاب کی اس خوبی ہے۔ قدیم ڈرامہ اور اس عہد میں تھیٹر کی خصوصیات تھیٹر کے نقائص اور ڈرامہ کی مروجہ ... ڈرامہ اور تھیٹر کے

لہ ۔ رسالہ اردو۔ جولائی ۱۹۳۰ء۔ مولوی عبدالحق کا تبصرہ ۲ہ اردو ڈرامہ تاریخ و تنقید ڈاکٹر عشرت رحمانی صفحہ

زوال کے لازمی اسباب مستقبل میں اس فن پر توقعات اور امکانات پر روشنی مؤلف کی عمیق نظری اور عرق ریزی کا ثبوت ہے۔

اردو ڈرامہ کے مختلف ادوار کے جائزے میں ادبی ڈرامہ، ناٹک، ریڈیائی ڈرامے کا سرسری جائزہ دیا ہے۔

اردو ڈرامہ نگاری پر مؤلف کے درج ذیل بیان فکر انگیز ہے۔

"اردو ڈرامہ کا آغاز اور ابتدائی تربیت کا اندازہ تقریباً وہی ہوا جو اردو غزل کا تھا" [1]

مؤلف کی زیر نظر تالیف موجودہ عہد میں ڈرامہ کے فن پر اہم معلومات کا خزانہ ہے۔ ڈرامہ کی تاریخ نقائص اردو میں ڈرامہ نگاری کا خاکہ اس کتاب سے عیاں ہوتا ہے۔ ڈرامہ پر تاریخ اور تنقید کی روشنی میں یہ تالیف اہم ہے۔

اردو میں ڈرامہ نگاری

سید بادشاہ حسین

سید بادشاہ حسین کی تصنیف "اردو ڈرامہ نگاری" اردو ڈرامہ نگاری کی تاریخ اور تنقید ہے۔

موصوف نے ڈرامے کی ابتدا انسانی فطرت کے مطابق بتائی ہے۔ ڈرامہ کے اجزائے ترکیبی، لوازمات اور ڈرامہ کی اقسام کا مکمل تعارف پیش کیا ہے۔ کرداروں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈرامہ کو اسٹیج کرنے کی مشکلات، تھیٹر کے نقائص، تھیٹر کی عمارت، تماشائیوں کے خیالات اور اسٹیج ہونے تک ڈرامہ کی خامیوں اور خصوصیات سے بحث کی ہے۔ اردو ڈرامہ کی پیدائش کے باب میں مختصراً تبصرہ کر کے اندر سبھا کی ڈرامائی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ قدیم اردو ڈراموں پر بعض اہم خصوصیات پر تبصرہ کیا ہے۔

طرز قدیم کے علمبردار کے باب میں رونق بنارسی سے عباس علی اور ریاض کے ڈراموں کا تذکرہ کیا ہے۔ شیکسپیر ڈراموں پر تبصرہ کیا ہے۔ شیکسپیر ڈراموں کے ترجمے اردو میں کن ڈرامہ نگاروں نے کن ناموں سے کیا ہے، تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے قدیم سنسکرتی اور دوسرے ڈراموں کا ترجموں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ قدیم ناٹک کمپنیاں کے عنوان سے ڈرامہ کی ابتدائی تاریخ کا احاطہ کیا ہے۔ اور مختلف تھیٹر کمپنیوں کی کارکردگی پر تبصرہ کیا ہے۔

طرز جدید کے پیش رو میں شوق قدوائی سے رتن ناتھ کی ڈرامہ نگاری پر تبصرہ کیا ہے۔ طرز جدید کے پیرو میں عبدالماجد سے محمد نعیم الرحمن تک ڈرامہ نگاری کی خصوصیات اور خامیوں کا جائزہ لیا ہے۔ فلم اور اردو ڈرامہ کے

---

[1] اردو ڈرامہ تاریخ و تنقید۔ ڈاکٹر عشرت رحمانی ص ۳۸۲

عنوان میں فلم کمپنیوں اور ڈراموں کی اہم خصوصیات اور خامیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اردو ڈرامہ کے مستقبل میں مصنف نے ڈرامہ کی مقبولیت اور ذوق بیدار کرنے کے بابت مفید مشورہ دیا ہے۔

بادشاہ حسین کے مطابق :-

"اسی سلسلے میں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے۔ کہ ہم نے تمام ڈرامہ نگاروں کے پورے ڈراموں کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ایک وجہ تو یہ کہ اس چھوٹی سی کتاب میں ان تمام کے تفصیلی تذکرہ کی گنجائش نہ تھی"۔ [۱]

مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں یہ کتاب اردو ڈرامہ کی مکمل تاریخ نہیں بلکہ عمومی جائزہ ہے۔ اس موضوع کے ابتدائی دور کی اہم تصنیف ہے۔

اردو ڈرامہ کا ارتقاء

ڈاکٹر عشرت رحمانی

ڈاکٹر عشرت رحمانی کی تصنیف "اردو ڈرامہ کا ارتقاء" ۴۸۳ صفحات پر محیط ہے۔ "اندر سبھا" سے انارکلی تک کا - اور آغا حشر کاشمیری کی ڈرامہ نگاری کے فن کا خصوصی جائزہ لیا ہے۔

بقول ڈاکٹر عشرت رحمانی :-

"یہ کتاب اردو ڈرامے کے اسی سفر کی داستان ہے جس میں اس کی خوبیوں اور خامیوں کا تذکرہ اور مفصّل بے لاگ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور عہد بہ عہد کی تدریجی ترقی تبدیلی اس کے کارکنان، اداکاروں، ہدایت کاروں اور مصنفوں وغیرہ کا اجمالی ذکر کر کے مختلف ابواب کے تحت اسٹیج کے وسائل و مسائل سامنے لائے گئے ہیں۔ نیز قدیم ڈرامہ نگاروں کے ذیل میں ان کے نمونے بھی پیش کرنا ضروری ہے"۔ [۲]

مصنف نے ڈرامہ کے آغاز کی تاریخ، پس منظر، اثرات، اور نتائج کا تذکرہ کیا ہے۔ ڈرامہ کے جملہ اجزائے ترکیبی، فنی لوازمات پر تاریخ کی روشنی میں تحقیقی تبصرہ اور فنی جائزہ لیا ہے۔ ڈرامہ کی ارتقائی تاریخ میں "اندر سبھا" سے انارکلی تک مشہور ڈرامہ نگاروں کے مشہور ڈراموں پر اکثر مناظر کی روشنی میں ان کی خوبیوں اور خامیوں پر تنقید کی ہے۔

---

[۱] اردو میں ڈرامہ نگاری - سید بادشاہ حسین دیباچہ ص ۔ [۲] اردو ڈرامہ کا ارتقاء ڈاکٹر عشرت رحمانی ص ۹

[illegible] شیریں اور ان کی فنی صلاحیتوں کا کئی ڈراموں سے انتخاب پیش کرکے معاصرین و متاخرین ڈرامہ نگاروں کے ڈراموں کے انتخاب کی روشنی میں تقابلی تنقید کتاب کو مستند فنی اور تحقیقی اہمیت کا حامل بنا[illegible] ہے۔ ارمان [illegible] کے انتخاب شدہ مناظر اس کی خصوصیات اور کمزوریوں پر ٹیکنیکی اور تاثراتی تبصرہ مصنف کے تنقیدی شعور کا ثبوت ہے۔

[illegible] ڈرامہ کی تاریخی تفصیل، لوازمات [illegible] کا اظہار دور جدید میں پولس کے ڈرامے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اسٹیج [illegible] تھیٹروں کی تاریخی اہمیت ان پر اسٹیج ہونے والے ڈرامے تمام موضوعات کا تاریخی و تنقیدی جائزہ [illegible] مصنف [illegible] ڈرامہ کی تدریجی ارتقاء کی تاریخ مرتب کردی ہے۔

[illegible] مستند تاریخ [illegible] تنقید کی کسوٹی ہے۔ اس کا مطالعہ ادب کے طلبہ کے لئے اشد ضروری ہے۔
[illegible] ڈرامہ کی مختصر جدید ڈرامہ نگاروں کی تحقیقات تصانیف کا مکمل مرقع کتاب کی اہمیت کو ڈرامہ کی تاریخ پس اور تصانیف سے منفرد کردیتا ہے۔

اردو ڈرامے کا مطالعہ

ڈاکٹر اخلاق اثر

[illegible] کتاب ڈاکٹر اخلاق اثر کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ جو اردو ڈرامہ اور تھیٹر کے مختصر تاریخی پس منظر سے شروع ہوتی ہے۔

[illegible] مؤلف نے سماجی قدروں کو نظر انداز کرکے اردو ڈرامے کو نقصان پہنچانے والے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ مغرب کی ترقی یافتہ تھیٹر کی بلندی کو نہ چھونے والے وجوہات ان تمام اسباب کا اظہار ہیں۔
[illegible] کار اور ہدایت کاری" کے موضوع کو اہمیت دیتے ہوئے لکھا گیا ہے۔ کہ اسٹیج ڈراموں، فلمی ڈراموں اور ریڈیو ڈراموں میں ہدایت کار کا کیا مقام ہے۔ ہدایت کاری کن خوبیوں کی بنیاد پر ہدایت کار کو ڈرامہ کی کامیابی کی منزلت تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

قابل مؤلف نے "ریڈیو ڈرامہ اور اسٹیج ڈرامہ" کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے دونوں کی ساخت اور متاثرت اور مقاصد کو بیان کیا ہے۔ جو اس کتاب کی جان ہیں۔
"ریڈیو ڈرامہ" کے روپ میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ ان ریڈیو ڈراموں کے لئے مواد کہاں سے حاصل کیا جا[illegible]

ہے۔ ریڈیو ڈراموں کا روپ دینے کے لئے کتنی کوششیں درکار ہیں۔

"اردو ریڈیو ڈرامہ کی تاریخ" میں ریڈیو ڈراموں کا آغاز ہندوستان میں نشریات کے آغاز کے ساتھ ہو چکا تھا۔ مصنف کے اس خیال سے اتفاق رائے ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ مصنف کی یہ دلیل اس کا اقرار نہیں ہے۔ کہ ریڈیو ڈراموں کی تاریخ "مرتب کرنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ اس لئے اس کی بہت سی کڑیاں اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتیں۔ اور اس کی تاریخ اب ادھوری ہے۔

آخر کے تین مضامین "اردو کا پہلا ڈرامہ" "چند حقائق" "چند تاریخ" میں مصنف اردو کے پہلے ڈرامے پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا پیش کرنے کے بعد اردو ڈرامے کی تاریخ کو ادھوری کہنے پر مجبور ہے۔ اور مطالعہ کے طریقۂ کار کی فرسودگی پر اردو کا پہلا ڈراما کون سا ہے۔ یہ فیصلہ ناممکن ہے۔" خورشید، شمشاد، موس، ڈاکٹر اخلاق اثر کی یہ کتاب ۱۹۸۳ء میں منظر عام پر آئی۔ اس سے پیشتر مختلف تصانیف "ریڈیو ڈرامے کی تاریخ" مکاتیب "احتشام" اقبال اور شبستاں محل کے نام قابل ذکر ہیں "اردو ڈرامہ کا مطالعہ" موصوف کا دلچسپ موضوع ہے۔ لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب اردو ادب کے اصناف میں ایک اضافہ ہے۔ اس کے باوجود اردو ڈرامہ پر مزید آج بھی تحقیق کی ضرورت ہے۔

اردو کا پہلا ایک بابی ڈرامہ

ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی

پروفیسر فصیح احمد صدیقی کا تحقیقی مقالہ "اردو کا پہلا یکبابی ڈرامہ" یکبابی ڈرامہ ... جستجوؤں میں سے پہلا حصہ ہے جسے یکبابی ڈرامہ کی تاریخی، تنقیدی و تحقیقی جائزہ کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں اس حصے میں موصوف نے یکبابی ڈرامہ کی تعریف اور مفہوم کا تعین تحقیقی مشاہدہ کی روشنی میں کیا ہے۔

باب اول میں قدیم ہندوستانی ڈرامے "بھرت منی" اور "ناٹیہ شاستر" پر تاریخی اور تحقیقی تبصرہ کیا ہے۔

دوسرے باب میں "سنسکرت میں یکبابی ڈرامے" پراکرت ڈرامے قدیم ہندوستانی ڈرامے کے زوال کے سبب کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

باب سوم میں "اردو ڈرامہ کی پیدائش" اس پر مغربی تہذیب کے اثرات عروج اور دھرمیس کی روایت جان عالم سلطان واجد علی شاہ اختر کے احسانات اردو ڈرامہ کی تاریخ پر حقائق سے واضح کیا ہے۔

باب چہارم میں "اردو کا پہلا ڈرامہ کی تلاش" اس کا سفر بنگال کی طرف گوپی چند درجہ عمر خورشید نند مہا راد دھا کنھیا کے حصہ کے ڈرامائی کیفیت پر بحث کی ہے۔

باب پنجم میں اردو کے پہلے یک بابی ڈرامہ کا تعین اس کی تکنیک اور لوازمات پر تحقیقی اور تنقیدی خیالات پیش کیا۔ اردو یک بابی ڈرامہ حصہ دوم ۱۹۶۳ء اپریل

اس حصہ میں جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء تا حصول آزادی ہند ۱۹۴۷ء تک کے تقریباً ۲۹۴ اردو یک بابی ڈراموں پر فرداً فرداً بحث کی ہے۔ اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کر کے پہلے حصہ میں ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۸ء میں لکھے گئے یکبابی ڈراموں کا تاریخی تحقیقی اور تنقیدی جائزہ مصنف کے وسیع مطالعہ کی گواہی دیتا ہے۔ دوسرے حصہ میں ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۷ء تک کے سیاسی پس منظر کے پیش نظر ادبی تحریکات اور اردو طویل ڈراموں کا اجمالی جائزہ لیا ہے ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء اردو یک بابی ڈراموں کی تاریخی حیثیت محاسن اور معائب پر تنقیدی تبصرہ ہے۔

اردو یک بابی ڈرامہ حصہ تیسرا۔ مئی ۱۹۷۳ء

آزادئ ہند ۱۹۴۷ء کے بعد یکبابی ڈراموں کا تفصیلی جائزہ ہے۔ اس کتاب میں ۲۰۰ یکبابی ڈراموں کا فرداً فرداً تحقیقی، تاریخی اور تنقیدی محاکمہ ہے مصنف نے اس عہد کے معاشرتی سیاسی اور معاشی پس منظر کے پیش نظر اردو کے ادبی پس منظر کو بیان کیا ہے۔ اور دور حاضر کے نمایاں یک بابی ڈراموں، دیگر یکبابی ڈراموں کے مجموعی محاسن و معائب پر تنقیدی تبصرہ کیا ہے۔ اس ضمن میں یک بابی ڈرامہ کے مستقبل پر بے لاگ تبصرہ ہے۔ ضمیمہ میں ان ڈراموں کی فہرست دی ہے۔ ضمیمہ ۲ میں اردو کے قدیم ترین ڈرامہ پر بحث اور اس کے لئے پرتو احمد فاروقی کے بیان کو نقل کر کے تبصرہ کیا ہے۔

اردو یکبابی ڈرامہ

ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی

ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی کی یہ کتاب اپنے موضوع کے مطابق ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک یکبابی ڈرامہ کی تاریخ، تحقیق اور تنقیدی جائزے کا ذخیرہ ہے مصنف کے مطابق

"اس کتاب میں ۲۹۴ یکبابی ڈراموں پر فرداً فرداً بحث کی گئی ہے اس امر کے قوی امکانات ہیں کہ متعدد ڈرامے اس فہرست میں شامل ہو سکے۔ میں اپنی بے بضاعتی اور کم ہمتی کا اعتراف اردو کا پہلا یکبابی ڈرامہ میں کر چکا ہوں" [1]

دیباچہ کے علاوہ حصہ اول میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک قومی لیستی کے پس منظر کی روشنی میں اردو زبان سے وابستہ ادبی تحریکات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ فورٹ ولیم سے منسلک ادیبوں کی ادبی خدمات اور مختلف حالات کی تاریخ

---

[1] اردو یک بابی ڈرامہ۔ فصیح احمد صدیقی۔ دیباچہ

پر تبصرہ کیا ہے۔ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۹ء کے عہد میں لکھے گئے مختلف یک بابی ڈراموں کا جائزہ لیا ہے۔ خامیوں اور خوبیوں کی روشنی میں تنقیدی تبصرہ کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔

حصہ دوم میں ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۳ء تک کے یک بابی ڈراموں کا احاطہ کرتا ہے۔ سیاسی اور معاشی پس منظر میں حالات کے تقاضے کے پیش نظر طویل ڈراموں کا اجمالی جائزہ لینے کے ساتھ اس عہد میں کامیاب اور نمایاں یک بابی ڈراموں کے محاسن اور معائب تنقیدی

مصنف نے یک بابی ڈرامے کی ابتدائی تحقیق میں جانفشانی اور عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے۔ تنقیدی تبصرے سے یک بابی ڈرامہ کی پرکھ کا معیار قائم کیا ہے۔ تاریخ کی روشنی میں وقت کے تقاضے کے موجب تنقید میں احتیاط سے کام لیا ہے۔ یک بابی ڈرامہ کی تاریخ مرتب کردی ہے۔ یہ ڈرامہ کی صنف میں یک بابی ڈرامہ کی کسوٹی اور منظم تاریخ ہے۔ ادب میں یک بابی ڈرامہ کی تشنگی کا سدِ باب ہے۔

اردو یک بابی ڈرامہ

فصیح احمد صدیقی

اس کتاب میں اردو یک بابی ڈرامے کی تیکنک اور تمثیل سے بحث کی گئی ہے۔ اردو یک بابی ڈرامے کے فکری فنی اور میکانکی روپ کو اجاگر کیا ہے اس ذیل میں انگریزی اور اردو کے ڈرامہ نگاروں نقادوں، دانشوروں کی آراء سے استفادہ کیا ہے ۔ ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ

"تمام زیر نظر مقالہ میں اردو ڈرامہ نگاروں اور نقادوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کے حوالوں کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا گیا ہے"[1]

مصنف نے اس کتاب میں تیکنک کے نکات پر باریک بینی سے مواد پیش کیا ہے۔ یک بابی ڈرامہ کی قسام تعین ہے تمثیل کے طور پر خود کا لکھا ہوا ڈرامہ "آگ میں پھول" نقل کرکے یا اسے ترتیب کے ساتھ تیکنک پر ایک تجرباتی یک بابی ڈرامہ بتلایا ہے۔ فنی اور فکری تیکنک کے میکانکی پہلوؤں کا اظہار مصنف کی کاوش اور دلچسپی کا ثبوت ہیں۔

چاروں حصوں میں پہلا اور چوتھا حصہ تاریخ اور تنقید کی روشنی میں ڈرامے کے فن پر مکمل مواد فراہم کرتے ہیں اور اردو ادب میں یک بابی ڈرامہ کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ تیسرا اور چوتھا حصہ تاریخ او

---

[1] اردو یک بابی ڈرامہ حصہ چہارم۔ فصیح احمد صدیقی (دیباچہ)

تحقیق کا عملی ثبوت ہیں۔ ان حصوں سے اردو ڈرامہ کے تاریخی کردار نیز پس منظر کا راز فاش ہوتا ہے۔ اور اردو ادب میں یک باب ڈرامہ کی حیثیت کے تعین کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ ہر حصہ اپنی جگہ ایک مکمل مقالہ اور تاریخ حقیقت کا آئینہ دار ہے۔

اردو ادب کے ڈرامہ کی خامیوں اور خوبیوں کا مرقع ہے بعض مقامات پر تبصرے اور تاریخی حقائق اپنی طوالت کے سبب گراں گزرتے ہیں۔ دلچسپی برقرار نہیں رہتی اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ لیکن تحقیقی حقائق ڈراموں کی اصلیت کو سمجھنے کے لئے اسے گوارا کرنا ضروری ہیں۔ اسلوب مطالعہ کی دلچسپی برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔

فصیح احمد صدیقی کی یہ کتابیں اپنے موضوع اور مواد کے سبب اردو ادب میں یک بابی ڈرامہ کی منظم تاریخ اور فنی تقاضوں کا آئینہ ہیں۔ لہٰذا اردو ادب میں ان کتابوں کو گراں قدر اضافہ سمجھنا چاہیئے۔

اردو ڈرامہ روایت اور تجربہ

ڈاکٹر عطیہ نشاط

ڈاکٹر عطیہ نشاط کی تصنیف "اردو ڈرامہ روایت اور تجربہ" مصنف کے قول کے مطابق

"یہ مقالہ ڈاکٹر مسیح الزماں صاحب کی نگرانی میں تیار ہوا ہے۔"[1]

باب اول میں یہ مقالہ اردو ڈراموں کے رجحانات کی وضاحت کرتا ہے۔ اردو ڈرامہ کے آغاز سے عہد حاضر تک نمایاں رجحانات کی روشنی میں اردو ڈرامہ کی ابتدائی تاریخ سنسکرت اور یونانی ڈراموں کے اصول پیش کرتا ہے۔ اور ڈرامہ کی روایت کا واضح تصور پیش کرتا ہے۔

دوسرے باب میں مغربی ڈراموں کے ابتدائی اثرات کی روشنی میں بمبئی میں ڈراموں سے غیر ملکیوں کی دلچسپی کا تذکرہ اور اس کے ردعمل سے اردو ڈراموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک اہم ڈرامہ نگاروں کی خصوصیات کو عیاں کیا ہے۔ پارسی تھیٹر کے چلتے ڈرامے خورشید کے علاوہ آرام اور ظریف حافظ محمد عبداللہ، نظیر بیگ اور رونق وغیرہ پر تبصرہ اس کتاب کی انفرادیت کا ضامن ہے۔ اس تبصرہ میں اسٹیج اور اداکاری اور پیش کش پر تبصرہ مقالہ کی اہمیت کو بڑھاتا ہے۔

تیسرے باب میں بیسویں صدی کے مشہور ڈرامہ نگاروں کا ذکر ملتا ہے۔ جن کی ڈرامہ نگاری سے

---

[1] اردو ڈرامہ روایت اور تجربہ ڈاکٹر عطیہ نشاط ص ۱۲

پارسی تھیٹر کو شہرت نصیب ہوئی مثلاً مہدی حسن احسن لکھنوی آغا حشر وغیرہ ڈرامہ کی روایت پر بحث کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں اردو کے ادبی ڈراموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ محمد حسین آزاد مرزا ہادی رسوا شرر عبدالماجد چکبست کیفی اور پریم چند کی کوششوں کو سراہا گیا ہے۔ اس باب میں پارسی تھیٹر سے وابستہ اردو ڈراموں کی روایت سے علیحدگی کے موضوع اور ناکامی کے اسباب پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

پانچویں باب میں اصلاح کے رسمی آغاز کو زیر قلم لاکر شوقیہ تھیٹر کے رواج اور تھیٹر کے متعلق لوگوں کے نقطہ نظر میں تبدیلی پر تبصرہ کیا ہے۔ مغربی ادب سے واقف ڈرامہ نگاروں کے ڈراموں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

چھٹے باب میں ڈراموں کی نئی تلاش کو اجاگر کیا ہے۔ اور اردو میں جدید ڈرامائی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ساتویں باب میں پورے مقالے کا ماحصل پیش کیا گیا ہے اور اردو کی روایت کے قیام کو واضح کیا ہے۔ ساتھ تجربہ کی خواہش نکلنے والے راستوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

مقالہ نگار کا بیان ہے کہ

"جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا یہ مقالہ اردو ڈرامہ کی تاریخ نہیں ہے اس لئے ڈرامہ نگاروں کے سب ڈراموں کا جائزہ لینے کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اور نہ یہ کوشش رہی ہے کہ ہر ڈرامہ نگار کا نام ضرور آجائے۔ جہاں جس نے اس کی روایت کی تعمیر یا تبدیلی میں کوئی نمایاں حصہ لیا ہو یا جن ڈرامہ نگاروں کو لیا گیا ہے ان کے یہاں سے مثالیں پیش کرنے کا مقصد صرف ان خصوصیات کو واضح کرنا ہے۔ جو ڈرامہ کی ساخت یا ترکیب سے متعلق ہیں۔"[1]

ڈرامہ کی روایت اور تجربے کی تاریخ اس مقالے سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ ڈرامہ کی صنف پر اردو ادب میں یہ مقالہ قابل قدر اضافہ ہے۔

تنقید کا فن

تنقید کے فن کی ابتدا دور قدیم میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں طنز یہ داد کے عمل سے ہوتی ہے۔ کچھ تذکروں میں شعرا پر دی گئی معلومات رائے میں تنقیدی عناصر موجود ہیں۔ لیکن اردو تنقید کی ابتدا

---

[1] اردو ڈرامہ روایت اور تجربہ ڈاکٹر عطیہ نشاط ص ۱۲ [2] اردو تنقید ... عبادت بریلوی ...

آبِ حیات سے باقاعدہ ہوتی ہے۔ آبِ حیات اردو کا پہلا تذکرہ ہے جو تاریخی کردار کا مالک ہے۔ اسی لیے بعض تبصرہ نگار آبِ حیات کو تذکرے اور تاریخ کے بیچ کی کڑی کہتے ہیں۔ کیونکہ آبِ حیات سے ادب میں تنقیدی شعور تحریر میں آیا ہے۔ اسی لیے اردو ادب میں پہلا نقاد مولانا محمد حسین آزاد ہیں۔ لیکن محمد حسین آزاد کے تنقیدی نظریات تاثراتی اور تقابلی ہونے کے باوجود تنقید کے تقاضوں کا خاطر خواہ اظہار نہیں ہیں۔

تذکروں کے مقابلے میں یہ تنقیدیں ان تقاضوں کو کسی حد تک پورا کرتی ہیں۔ اور آبِ حیات میں تنقید کو بحیثیت ایک فن کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔

اردو میں تنقید کو بحیثیت ایک فن کے معائب و محاسن کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے تغیر نے پیدا کیا ہے۔

انگریزی ادب کے مطالعہ نے اس فن کے ارتقاء میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ انگریزی ادب کی طرح اس فن میں مختلف پہلوؤں سے کلام اور تخلیق کو پرکھنے کے معیار مقرر ہوئے۔ اور تنقید کے مختلف انداز اپنائے گئے۔ مختلف پہلوؤں کے ساتھ تنقید میں 'تاثراتی تنقید' تقابلی تنقید' جدید تنقید' سائنٹفک تنقید' نفسیاتی تنقید' جمالیاتی تنقید اور تاریخی تنقید کے پیمانے بنائے گئے۔ اور ان پہلوؤں کی روشنی میں تنقیدی معیار مقرر ہوئے۔

محمد حسین آزاد کی آبِ حیات کے بعد سرسید تحریک کے زیرِ سایہ تنقیدوں سے نئی تنقید کی ابتدا ہوئی۔ اور تنقید پر سماجی زندگی کے اثرات نے روایات اور نظریات کے بت کا طلسم توڑا۔ سلیس انداز میں تنقید کا مواد سرسید کے رسالے "تہذیب الاخلاق" نے پیش کیا۔ اس تحریک کی حمایت میں حالیؔ اور شبلیؔ نے عملاً حصہ لیا۔ حالیؔ نے سوانح نگاری اور مقدمہ شعر و شاعری میں اپنے تنقیدی نظریات پھیلائے۔ شبلی نے تاریخ اور مذہب کے باوجود شعر العجم میں اپنی تنقیدی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔

آزادؔ نے آبِ حیاتؔ کے بعد مقدمہ دیوانِ ذوقؔ میں عملی اور تاثراتی تنقید کا پرچار کیا۔ وحید الدین سلیمؔ' امداد امام اثرؔ اور مہدی افادی کے تنقیدی نظریات سرسید تحریک کے ساتھ وابستہ رہے۔ تنقید کے فن سے تحقیق بھی متاثر ہوئی۔ اور محققینِ ادب کی ایک صنف نے تحقیق کے میدان میں تنقید سے کام لینا شروع کیا۔ اس صنف کے پہلے ادیب بابائے اردو عبدالحق تھے۔ انھوں نے تحقیقی کتابوں پر تنقیدی تبصرے لکھے۔ اپنے تحقیقی عمل میں مختلف شعراء اور ادباء پر تحقیق کے ساتھ تنقید کے بھی جوہر دکھائے۔ پھر پنڈت موہن دتاتریہ کیفی' پروفیسر محمود شیرانی' حبیب الرحمٰن خاں شیروانی' سید مسعود حسن ادیب' پروفیسر حامد حسن قادری' ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ' مولانا سید سلیمان ندوی' مولانا عبدالماجد

دریابادی وغیرہ نے اپنے تحقیقی کاموں کو تنقیدی زاویوں سے پورا کیا۔ تنقید میں مغربی اثرات کے عمل دخل سے کچھ تبدیلیاں آئیں۔ ان تبدیلیوں کا عکس۔ عبداللہ دسروری، نجیبت اور عظمت اللہ خاں کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ مغربی ادب کے اخذ و ترجمہ کا سلسلہ اردو میں شروع ہوا اور اس عمل سے مغربی تنقید کے عناصر بہت کم نمایاں ہوئے۔ ان میں عبدالرحمٰن بجنوری، عبدالقادر سروری، محی الدین قادری زورؔ کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ تاثراتی اور جمالیاتی تنقید کی لہریں نیاز فتحپوری، فراقؔ اور مجنوں گورکھپوری کے یہاں رواں دواں ہیں۔ مجنوں کی سائنٹفک تنقید کا سلسلہ ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ مادیت اور اشتراکیت کے زیر اثر ترقی پسند تنقید کی ابتدا ہوئی۔ اس میں تنقید کے ہر پہلو کا جائزہ مادی اور اشتراکی نظریات کے تحت لیا جاتا ہے۔ اور ان نظریات کی روشنی میں ادب کے بنیادی تقاضوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے بانی سجاد ظہیر ہیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر اختر رائے پوری، سید احتشام حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی، عزیز احمد، علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب کی تنقید کے ستون ہیں۔ ان کے بعد ادب میں ایک ایسا گروہ ہے جس نے ترقی پسند تحریک کی حمایت نہیں کیا۔ اور مخالفت بھی کھل کر نہیں کر پایا۔ اور ترقی پسند ادیبوں کے ادبی کارناموں کی حوصلہ افزائی بھی کیا۔ لیکن اس گروہ نے اپنی تنقیدی نظریات میں قدیم اقدار جدید روشنی سے منور کر کے تنقیدی امکانات کا وسیع تصور پیش کیا ہے۔ ان میں رشید احمد صدیقی، محمد حسین ادیب، آل احمد سرورؔ، سید وقار عظیم اور اختر انصاری وغیرہ ہیں۔

کلیم الدین احمد جدید تنقید کے گمان میں دور قدیم سے ترقی پسند تحریک تک کے تنقید نگاروں کے کارناموں سے نالاں ہیں۔ اور انھوں نے اپنی کتاب اردو شاعری پر ایک نظر اور اردو غزل پر ایک نظر میں جارحانہ انداز سے تنقید کی کمزوریوں اور شعر و شاعری پر تنقید کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک جو ایک مقصد اور مخصوص نظریات کے مطابق تنقید کی قائل تھی۔ رو بہ زوال ہوئی۔ در جدید رجحان کے تحت جدید شاعری کا کردار ابھرا۔ اس عہد کے جدید تنقید نگاروں نے ترقی پسند مصنفین اور ان کے نظریات سے اختلاف کے ساتھ ادبی قدروں کا مفہوم بنی نوع انسان کے جذبات کا اظہار ٹھہرایا۔ ترقی پسندی کے کے خلاف اسی گروہ میں سے ایک انتہا پسند گروہ نے ترقی پسند نظریوں پر ضرب لگائی اور ان میں سب سے پہلا نام خلیل الرحمٰن اعظمی کا ہے۔ ان کے تنقیدی رویہ کی پیروی کرنے والوں میں ناصر کاظمی، ظفر اقبال، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر وحید اختر، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، مظفر حنفی، عمیق حنفی

ڈرزورتھ کرولی و ریب ڈزرتی وغیرہ ہیں۔

اردو ادب میں تنقید کی صنف نے کئی ردوبدل اور تبدیلیوں کا سامنا کیا ہے۔ اور مختلف تحریکوں اور ادوار میں کئی فلسفوں کا شکار ہوئی ہے۔ اردو میں تنقیدی نظریات اور تنقیدی تاریخ میں درج ذیل کتابیں ملتی ہیں۔ (۱) تنقید کے بنیادی مسائل - مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور

۲- تنقیدی نظریات اول دوم - مرتبہ سید احتشام حسین

۳- اردو تنقید پر ایک نظر - کلیم الدین احمد

۴- اردو تنقید کا ارتقاء - ڈاکٹر عبادت بریلوی

۵- جدید تنقید - شارب ردولوی

۶- تنقیدی سرمایہ - پرنسپل عبدالشکور

۷- کاشف الحقائق - امداد اثر

۸- اردو ادب کی تنقیدی تاریخ - احتشام حسین

کاشفُ الحقائق

از :- امداد اثر

ان کتابوں میں امداد امام اثر نے اردو زبان اور شاعری پر تنقید و تبصرہ کیا ہے۔ یہ کتاب نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ مختلف ابواب میں اردو زبان و شعر ہر جس انداز میں تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اس سے ان کے تنقیدی نظریات کا سراغ ملتا ہے۔ مثلاً وہ اردو شاعری کو فارسی کا چربہ خیال کرتے ہیں۔ لیکن ملک اور وطن کے مزاج کے مطابق اردو شاعری کو سنسکرت کی شاعری کا انداز پیدا کرنا چاہیئے تھا۔[۱] وہ شاعری کو حالی کیطرح اخلاق و تمدن، سوسائٹی میں انقلاب لانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

ملاحظہ ہو۔

"نہ صرف فارسی کی شاعری ترقی کر جائے بلکہ قومی معاملات، اخلاق و تمدن میں بھی حسب مراتب انقلابات ظہور میں آئیں گے۔"[۲]

"ان کے خیال میں شاعری امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ کا بیان ہے۔"[۳]

اور شاید اسی لئے وہ ہر شاعر کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں شاعری کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ (۱) داخلی (۲) خارجی

گویا جذبات اور احساسات کے تابع شعر کا اظہار ہوتا ہے۔ اسکا لئے اصناف سخن کو اہمیت دے کر

۱؎ کاشف الحقائق - امداد اثر جلد اول صفحہ ۱۸۲-۱۸۱
۲؎ ایضاً ص ۹
۳؎ اردو تنقید کا ارتقاء عبادت بریلوی (دوم) صفحہ ۲

کہتے ہیں۔ ہر صنف کا اپنا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ ہر صنف کو برتتے میں اس کا پابند ہونا واجب ہے۔[1]
ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ

"شاعری الہام غیبی سے خالی نہیں ہو سکتی ہے۔ جو شاعری الہام غیبی سے خالی ہو وہ شاعری نہیں ہے۔
تک بندی ہے۔"[2]

اسطرح آزاد کے خیال سے بھی اتفاق کرتے ہیں۔ لیکن پند و نصائح کو غزل میں داخل کرنے کے مخالف
ہیں۔ اس کام کے لئے دوسرے اصناف کو رجوع کرتے ہیں[3] اس طرح اس معاملے میں حالی کے مخالف ہیں۔
یہاں حالی کے اصلاح غزل پر ایک قسم کا تنقیدی رویہ کار فرما ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے جو خامی نظر آتی ہے وہ یہ کہ تنقیدی رویہ میں شعوری کیفیت برائے نام ہے مثلاً
۱۔ "سودا تیرا کیا کہنا یہ شاعری نہیں سحر نگاری ہے۔"[4] صفحہ ۲۳۶
۲۔ "سبحان اللہ اشعار بالا کیا خوب ہیں۔"[5]
۳۔ "سبحان اللہ کیا حسن کلام ہے۔"[6]

کاشف الحقائق میں تنقید کا جائزہ تاثراتی نتائج کی پیداوار ہے اصولوں کی بنیاد پر تنقیدی رویہ عملی
تنقید کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے۔

بعض شعر پر تحسینی کلمات، بعض شعرا پر طویل تبصرہ، دو ٹوک فیصلہ کرنے کا موقع فراہم نہیں کرتا۔
کئی مقامات پر عملی تنقید میں اپنے اصولوں کے پابند ہیں۔ لیکن ان جذبات کے تحت اصولوں سے روگردانی کر
جاتے ہیں۔

اپنے عہد میں یہ ایک زبان و ادب پر بہترین تنقیدی کتاب تھی۔ بعض جملے اور مقامات ان کے تاثراتی پن
کا ثبوت دیتے ہیں۔

اردو شاعری پر ایک نظر

کلیم الدین احمد

یہ تصنیف کلیم الدین احمد کی ہے۔ عوامی پبلیکیشن کراچی کا ایڈیشن ہے۔ ایک مقدمہ اور تمہید کے ساتھ
ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ پہلا ایڈیشن اور دوسرا ایڈیشن دونوں کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ دوسرا
ایڈیشن ۱۹۸۵ء کا ہے۔

---

[1] کاشف الحقائق جلد دوم، امداد امام اثر صفحہ ۳۲
[2] ایضاً صفحہ ۱۴۶-۱۴۷
[3] ایضاً صفحہ ۵۵
[4] کاشف الحقائق، امداد امام اثر صفحہ ۲۳۶
[5] ایضاً صفحہ ۲۳۱
[6] ایضاً صفحہ ۹۴

۱۔غزل۔ قطعہ ۔(۲) میرؔ، دردؔ، اور سوداؔ (۳) ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ

۴۔قصیدہ، ہجو۔ (۵) سوداؔ، ذوقؔ

۶۔ مثنوی۔ (۷) میر حسنؔ، نسیمؔ اور شوقؔ (۸) مرثیہ۔

۹۔ انیسؔ و دبیرؔ (۱۰) متفرق اصناف (۱۱) خاتمہ (۱۲) ضمیمہ۔نظیر اکبرآبادی

مقدمہ محمد افضل الرحمٰن کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔موصوف نے نقّاد کا دائرہ کار وسعتِ شاعری بتایا ہے۔

"اگر کسی زبان میں پیمانۂ شاعری بلند نہ ہو تو اس کے نقّاد کا دائرہ بھی لازمی طور پر محدود ہو جائے گا" [۱]

"شاعری صرف جذبات کی ترجمانی نہیں۔ایک فن، ایک صناعی بھی ہے" [۲] کتاب پر رائے فرماتے ہیں۔

"یہ مقالہ اصنافِ شاعری کی تنقید ہے۔اردو شاعری کی تاریخ نہیں" [۳]

غرض کہ ہر معاملے میں کلیم الدین احمد نے جارحانہ انداز اپنایا ہے اس کتاب سے ماخوذ درج ذیل بیانات سے مصنف کی نیک نیتی اور بددیانتی کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔"غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے" ص ۳۰

۲۔"میر کی قوتِ حاسہ مخصوص و محدود قسم کی تھی۔میر کی دنیا تنگ تھی" ص ۵۲

۳۔میر کے کلام میں خامیاں بھی ہیں۔لیکن اصل نقص کلام کی ناہمواری کا ہے۔اس کا متعدد حصہ نہایت ہی پست اور مبتذل ہے" ص ۸۹

۴۔ذوقؔ پر رد طراز ہیں "انھوں نے اپنی غزلوں میں محض قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے" ص ۱۱۵

۵۔ غالبؔ کے بابت دیکھئے "لیکن غالب نے بھی غزل کے نقائص کو رفع نہیں کیا" ص ۱۲۸

۶۔غالبؔ کے کلام میں چند مخصوص نقائص بھی ہیں۔ایک تو ان کے کلام کی مخصوص ناہمواری ان کا کوئی خاص اندازِ بیان نہیں" ص ۱۲۸

۷۔مومنؔ کے تعلق سے کہتے ہیں "نازک خیالی کسی شاعر کا منتہائے خیال نہیں ہو سکتی۔مومن میں بھی نقص ہے۔وہ نازک خیالی معنی آفرینی کو اکثر اصل شاعری تصور کرتے ہیں" ص ۱۵۱

---

[۱] اردو شاعری پر ایک نظر۔کلیم الدین احمد۔ ص ۳
[۲] ایضاً ص ۵
[۳] ایضاً ص ۱۳

۸۔ میرحسن کے دو اشعار پر تنقید کا انداز دیکھئے۔

سوا ان کمالوں کے کتنے کمال	مروّت کی خو آدمیت کی چال
رذالوں سے نوزوں سے نفرت اسے	سدا قابلوں سے تھی الفت اسے

تنقید ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"اسے دیکھ کر ہر ذی فہم یہی کہے گا کہ ایسے کامل جانور دنیا میں نظر نہیں آتے" ص۲۵

۹۔ مثنوی پر رائے کا انداز ملاحظہ ہو۔

"اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر صرف الفاظ اور نازک خیالی پر اکتفا کیا جائے تو بعض اردو مثنویاں اعلیٰ پیمانے کی ٹھہریں گی" ص۱۱

۱۰۔ شاعر کے لئے ہدایت ملاحظہ کیجئے۔

"شاعر کے لئے اشد ضروری ہے کہ وہ طوفان جذبات و تصورات کو قابو میں لا سکے اور انھیں پرکھ سکے" ص۱۱

(۱۱) شاعر کے لئے یہ ہدایت بھی قابل غور ہے۔

شاعر اپنے جذبات کو نہیں بھولتا۔ وہ شاعرانہ تخیل میں اپنی ہستی فنا نہیں کرتا۔ اس لئے مختلف نقائص رونما ہوتے ہیں" ص۲۳

(۱۲) مرثیہ گو شعرا پر اظہار خیال ملاحظہ ہو۔

"رزم کے بعض صحیح اصول سے مطلقاً آشنا نہیں" ص۲۳

۱۳۔ انیس و دبیر پر حاشیہ آرائی دیکھئے۔

"انیس و دبیر کے مراثی میں وہ تمام نقائص موجود ہیں جو عموماً صنف مرثیہ میں پائے جاتے ہیں" ص۲۵

۱۴۔ انیس کے مراثی میں سیرت نگاری کا وجود نہیں" ص۲۵

"انیس واقعہ نگاری میں کمال رکھتے ہیں۔ انسانی کردار افعال خصوصاً جنگ و نزاع تو نہایت جوش و صفائی سے بیان کرتے ہیں" ص۲۶

دونوں بیانات میں تضاد نمایاں ہے یکجہتی تضاد کی مثالیں دیکھئے۔

"جن تجربات کی درد و ترجمانی کرتے ہیں غیر مانوس ہیں۔ اور اکثر درد ان تجربات کو اس جوش و وجد کے ساتھ محسوس کرتے ہیں جو میر کا حصہ ہے" ص۹۳

"درد کا ہر لفظ اثر میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔" ص ۹۹

سودا کے متعلق تضاد ملاحظہ ہو۔

الفاظ، بندشیں، استعارے خود قابل تعریف کیوں نہ ہوں۔ ان سے کسی شاعر کی برتری ثابت نہیں ہو سکتی۔" ص ۹۹

"ان کے کلام میں ایک بے پایاں زور بھی ہے جو میر اور درد کو میسر نہیں۔" ص ۱۱۱

کلیم الدین صاحب کی اس کتاب کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے عہد میں اچھی شاعری کی کسوٹی، انگریزی ادب اور مغربی قدروں کے نفاذ کو سمجھا ہے۔ اس کا ثبوت فاضل مصنف کا یہ بیان ہے۔ "اردو ادب شعراء کی مغربی ادب سے ناآشنائی۔" ص ۱

اس بیان کے علاوہ محمد حسین آزاد، حالی، اقبال، اکبر وغیرہ پر حاشیہ آرائی کا رویہ مغربی ادب کے معیار پر موقوف ہے۔

کلیم الدین احمد نے جس دور میں یہ خیالات پیش کئے وہ سماجی افراتفری اور ادبی انتشار کا عہد تھا۔ ترقی پسند تحریک کا زور تھا۔ سماجی اقدار سے ادبی خیالات کے نشیب و فراز تک یورپ سے استفادہ ایک سند تھی۔ اس عہد میں کلیم الدین احمد کے علاوہ اور بھی لوگ اس خیالات کے حامی تھے۔ لیکن کلیم الدین احمد کے جارحانہ اقدام نے ہر شاعر پر مغرب سے استفادہ نہ کرنے یا مغربی ادب سے ناآشنائی کے سبب شاعرانہ خیالات سے اصناف کی قدر و قیمت تک ہر میدان میں ہمارے ادب کو غیر شعوری طور پر معتوب کر دیا تھا۔ لیکن ادب کے اصولِ تنقید بھی ایسی تنقید کے مخالف نہیں ہیں کیونکہ کسی بھی ادب میں فنکار کے عہد، اقدار اور معاشرے سے منسلک سماجی ماحول کے پیش نظر تقاضوں پر تنقیدی اصول کا نفاذ کیا جاتا ہے۔ کلیم الدین احمد کے تنقیدی نظریات اسی خامی سے لبریز ہیں۔ ان نظریات پر مغربی اقدار اور اصولِ تنقید کا ملمع چڑھا ہوا ہے۔

اس کتاب پر تنقید کے تعلق سے مولوی عبدالحق کے یہ جملے بڑے معنی خیز ہیں۔ موصوف نے کتاب سے حوالہ اخذ کیا ہے۔

"اردو شعراء اگر نظم کے صحیح مفہوم سے واقف ہوتے تو یہ مشکل آسان ہو جاتی۔" لہ

عبدالحق فرماتے ہیں۔

لہ اردو شاعری پر ایک نظر - کلیم الدین احمد صفحہ ۲۷

"لیکن پوری کتاب میں شاعری کا صحیح مفہوم کیا ہے بتایا نہیں گیا"۔ [۱]

اس کتاب پر تبصرہ کے دوران فرماتے ہیں

کتاب کے اول صفحہ پر یہ الفاظ فاضل مصنف کے قلم سے نکلے ہیں۔

"شاعری کی ہندوستان میں قدر و منزلت نہیں"۔ ص ۲ آخری صفحہ پر لکھا گیا ہے۔

"اردو شاعری کا مستقبل امید افزا نظر نہیں آتا"۔ [۳]

یہ کتاب اپنے عہد میں تنقیدی نظریات کو روشناس کرانے میں اور تنقیدی نظریات کو متعین کرنے میں بھی ناکام رہی ہے لیکن اس کتاب سے کچھ باتیں سوچنے کا موقع ملتا ہے۔ اس بنیاد پر تنقیدی مطالعہ میں اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب سے استفادہ ضروری نہیں ہے۔

اردو تنقید پر ایک نظر

کلیم الدین احمد

کلیم الدین احمد کی تصنیف ہے پیش لفظ کے ساتھ ۲۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ شائع کردہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۶۵ء کا ہے۔ تمہید میں مصنف کا پہلا جملہ "اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے" تیسرا جملہ "تنقید اردو ادب میں ناگزیر لسط ہے"۔ ص ۱

اردو شعرا اور اردو تنقید کے خلاف جارحانہ رویہ "اردو شاعری پر ایک نظر" سے مزید ہے۔ تمہید کے بعد اردو تذکروں پر عموماً اور چند مشہور تذکروں پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی ہے۔ "خم خانۂ جاوید" نئے تذکروں میں "آب حیات"، "گل رعنا"، "شعر الہند" وغیرہ موضوع بحث ہے۔

موضوع کے مطابق عنوانات اس طرح ہیں۔

۱۔ پرانی تنقید اور سہند

۲۔ غلطی ہائے مضامین۔ حالی، حسن شبلی، عبدالحق، پیروی، مغربی

۳۔ ترقی پسند تحریک۔ آل احمد سرور، تین ترقی پسند نقاد، اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین۔

۴۔ اردو ادب کی تاریکیں۔ ۵۔ اردو میں تبصرہ نگاری۔ ۶۔ خاتمہ۔

---

[۱] رسالہ اردو جنوری ۱۹۲۲ء عبدالحق ص ۱۴۳ [۲] اردو شاعری پر ایک نظر۔ کلیم الدین احمد ص ۱ [۳] ایضاً ص ۲۲۲

ضمیمہ :- ۱۔ رشید احمد صدیقی

۲۔ ترقی پسند ادب پر دو کتابیں۔

۳۔ تاثراتی تنقید

تذکروں پر کلیم الدین احمد کی جارحانہ رائے کا اندازہ اس قول سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

"ان تذکروں کی اہمیت تاریخی ہے۔ ان کی دنیائے تنقید میں کوئی اہمیت نہیں۔ ۔ ۔ ۔ جہاں تک تنقید کا واسطہ ہے ان تذکروں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔"[۱]

تنقید میں ذاتی رائے پر کوئی پابندی نہیں۔ لیکن مصنف نے ذاتی رائے کا اظہار کرنے میں بے باکی اور جارحیت کی نمائندگی کی ہے۔ تذکروں پر اظہار رائے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"خصوصاً تمہیدوں میں ضرورت سے زیادہ لفاظی ہے۔ جس سے احساس لطیف کو صدمہ پہنچتا ہے۔"[۲]

محمد حسین آزاد کے متعلق یہ قول ہے۔

"آزاد کی افتاد طبیعت اور تحقیق میں زیادہ مناسبت نہیں تھی۔ ان کی طبیعت میں عجلت اور بے صبری تھی۔ اس لئے کامیابی ممکن ہی نہ تھی۔"[۳]

گل رعنا کے مصنف پر تنقید کا رویہ دیکھیے۔

مصنف گل رعنا کے خیال میں تنقید ایسا کام ہے جس میں دماغ پر زیادہ زور نہیں دینا پڑتا۔"[۴]

شعر الہند کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

میں نے بہت غور کیا لیکن مجھے "شعر الہند" کی تالیف کی وجہ سمجھ میں نہ آئی کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عبد السلام صاحب کو شعر و شاعری سے کوئی مناسبت نہیں۔ ان کی طبیعت خشک اور بے رنگ ہے۔ اور یہ خشکی و بے رنگی ہر جگہ ایسی پھیلی ہوئی ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت جلد اکتا جاتی ہے۔"[۵]

کلیم صاحب کی نظر میں تذکرے تنقید کے اعتبار سے بے کار ہیں صرف آب حیات کو پرانے تذکرے کے سبب اہمیت دیتے ہیں۔ ص۵۹ اور مزید کہتے ہیں۔

"یہ اردو کی تنقید کی تاریخ "سعی لاحاصل" ہے۔ ص۸۵

غلطی ہائے مضامین کے عنوان میں حالی پر لکھتے ہیں۔

---

۱ اردو تنقید پر ایک نظر۔ کلیم الدین احمد ص۲۹ ۲ ایضاً ص۳۲ ۳ ایضاً ص۴۶ ۴ ایضاً ص۵۱ ۵ ایضاً ص۷۱

"حالی خیالات تو اخذ کر لیتے ہیں لیکن ان پر غور و فکر نہیں کرتے۔ ان کی جانچ پڑتال نہیں کرتے وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ بعض باتوں میں تضاد ہے۔"[1]

حالی کے خیالات کی روشنی کا تنقیدی جائزہ لے کر لکھا ہے۔

"حالی اتنے ہی زیادہ اس طبع آزمائی پر نا اہل ہیں جن علوم کی قابلیت اور جن فطری صلاحیتوں کی اس سلسلے میں ضرورت تھی وہ ان میں نہ تھیں۔"[2]

شبلی پر رائے دیتے ہوئے ان کی تنقید پر رائے زنی کرتے ہیں۔

"شبلی مشرقی حدود کے اندر بھی لغزشیں، زبردست لغزشیں کر جاتے ہیں وجہ یہ ہے کہ وہ باتیں صحیح کہتے ہیں۔ لیکن ان باتوں کے منطقی نتائج سے آگاہ نہیں ہوتے۔"[3]

عبدالحق کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اگر وہ چاہتے تو انگریزی ادب، مغربی اصول تنقید سے بہت کچھ واقفیت حاصل کر سکتے تھے اس واقفیت کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے بھی انھوں نے یہ واقفیت حاصل نہ کی یہی ان کی سب سے بڑی کمی ہے۔"[4]

پیروی مغرب کے زیر عنوان عبدالرحمن بجنوری ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور عبدالقادر سروری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اس میں بعض نتائج بہت صحیح ہیں لیکن تنقید کا جارحانہ رویہ تنقید کی شخصیات سے ہمدردی پر آمادہ کرتا ہے تنقید نگار سے نہیں۔

ترقی پسند تحریک کے عنوان سے ترقی پسند تحریک کا مکمل جائزہ لے کر اسے مارکسی نقطۂ نظر کی دین اور اسی فلسفے کی حمایت کا نتیجہ بتایا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"ان نعروں میں نہ کچھ رنگ آمیزی ہوتی ہے۔ اور نہ ادب اگر کچھ ہے تو دماغی اور جذباتی بوکھلاہٹ ہے۔ اور جہاں دماغی اور جذباتی بوکھلاہٹ ہو وہاں ادب کا گذر ہو تو کیسے؟"[5]

"یہ نظریے مارکس اور اس کے متبعین سے لئے گئے ہیں لیکن ترقی پسند مصنفین انھیں اس شد و مد سے بیان کرتے ہیں۔ گویا انھوں نے یہ خیالات خود سوچ کر پیدا کئے ہیں۔ وہ ان خیالات کو الہامی سمجھتے ہیں۔"[6]

ہر ترقی پسند مصنف طوطے کی طرح ایک طرح کی باتیں ایک طرح کی زبان میں دہراتا ہے اسے احساس

---

[1] اردو تنقید پر ایک نظر۔ کلیم الدین احمد ص ۹۳ [2] ایضاً ص ۱۰۵ [3] ایضاً ص ۱۱۹ [4] ایضاً ص ۱۲۶ [5] ایضاً ص ۱۵۵ [6] ایضاً ص ۱۵۱۔

کبھی نہیں ہوتا کہ اس قسم کی تکرار مہمل بھی ہے اور مضحک بھی۔" [۱]

ترقی پسند ادب کا تنقیدی جائزہ بہت سوجھ بوجھ سے لیا ہے۔ اور ترقی پسندوں کے بارے میں ہر بات حقیقت پر مبنی ہے۔ ترقی پسند تنقید پر ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ترقی پسند نقاد بعض مغربی خیالات کو اخذ کر کے ان کی تشہیر کرتے ہیں وہ خود ادب، فنون لطیفہ کی ماہیت، ان کے اغراض و مقاصد ان کے اصول ان کی اہمیت پر غور و فکر نہیں کرتے وہ ادب سے زیادہ اشتراکیت سے واقف ہیں۔" [۲]

کلیم الدین نے ترقی پسندوں پر یہ صاف اور دو ٹوک بات اس وقت کہی ہے جس وقت ترقی پسند ادب عروج کے مدارج میں تھا۔ یہ جائزہ کتنا صحیح ہے کتاب کے مطالعہ سے واضح ہو سکتا ہے۔ مصنف نے آل احمد سرور کی تنقید کا جائزہ لے کر یہ فیصلہ کیا ہے۔

"سرور صاحب فیصلے کے نام سے گھبراتے ہیں۔ اور عدالت، فوجداری، جج، منصف، وکیل وغیرہ کو کھینچ لاتے ہیں۔" [۳]

سرور صاحب کی تنقیدوں کی روشنی میں غور کیجئے تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ نظریہ ہر چیز کی تحسین سکھاتا ہے۔ کلاسیکی چیز بھی اچھی ہے اور رومانی چیز بھی اچھی ہے۔ قدیم ادب بھی اچھا ہے۔ اور جدید ادب بھی اچھا ہے۔ انفرادی رجحان بھی اچھا ہے۔ اور سماجی رجحان بھی اچھا ہے۔" [۴]

سرور صاحب کے تنقیدی مضامین پڑھنے پر کلیم صاحب کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ سرور کے بارے میں صحیح نتائج نکالے گئے ہیں۔

میں ترقی پسند کے عنوان پر مجنوں گورکھپوری کو مارکسی خیالات کا پرچار کرنے والا کہتے۔ اور یہ جھوٹ بھی نہیں ہے۔ احتشام صاحب کو ان کے بیان کی روشنی میں مارکسی فلسفہ سے آگے کچھ نظر آتا نہیں آتا۔ ملاحظہ ہو۔

"نقاد کو مارکسی فلسفہ سے واقف ہونا چاہئے۔ احتشام صاحب اس فلسفہ سے آگے نہیں دیکھتے۔" [۵]

اس کے بعد اختر حسین رائپوری کو اسی فلسفہ کا نمائندہ کہتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخیں کے عنوان پر اپنے وقت کے مطابق بہت صحیح تبصرہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"یہ سچ ہے کہ اردو ادب کی اس وقت تک کوئی کامیاب تاریخ نہیں لکھی گئی۔ اس کمی کا احساس کچھ لوگوں کو ہوا۔ لیکن کسی کو بھی اس کمی کو رفع کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔" [۶]

۱؎ اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد ص ۱۵۶ ۲؎ ایضاً ص ۲۱۶ ۳؎ ایضاً ص ۲۲۳ ۴؎ ایضاً ص ۲۲۴
۶؎ ایضاً ص [illegible] ۵؎ ایضاً ص [illegible]

اس باب میں کامیاب تاریخ کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

"وہی تاریخ کامیاب ہوگی جو اردو ادب کی ابتدا اور ترقی کے مختلف مدارج کو صحیح اور روشن طور پر واضح کرسکے اور اس کی ابتدا اور ترقی کے اسباب سیاسی تاریخی معاشرتی ادبی اسباب تفصیل کے ساتھ بیان کرسکے۔"[۱]

اردو تبصرہ نگاری پر ان کا بیان قابل قدر ہے۔

"تبصرہ ایک فن ہے۔ اور فن تنقید کی ایک شاخ اردو میں عموماً نقاد اس کے اصول اور اغراض و مقاصد سے واقفیت نہیں۔ اسی وجہ سے اردو تبصرہ نگار میدان تبصرہ میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں کرسکتے۔"[۲]

خاتمہ کے عنوان سے تنقید کا جائزہ مختصر پیش کیا ہے ضمیمہ کے عنوان میں رشید احمد صدیقی کے تنقیدی نظریات پر بحث کی ہے۔ ضمیمہ ۲ میں ترقی پسند ادب علی سردار جعفری اور عزیز احمد کے تنقیدی نظریات اور تنقیدی خیالوں پر بحث ہے حسن عسکری پر بھی تنقید موجود ہے۔

کلیم الدین احمد کی یہ کتاب ۱۹۴۲ء میں ایک اہمیت کی حامل تھی۔ آج بھی اس کے کچھ جارحانہ اقتباسات کو نظر انداز کیا جائے تو بعض باتیں بہت صحیح اور حقیقت ہیں۔ تنقید پر بحث کرنے کے دوران بعض نتائج بڑے اہم ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

تنقیدی سرمایہ (حصہ اول)

مولوی عبدالشکور

"تنقیدی سرمایہ" پرنسپل عبدالشکور کی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ پیش لفظ کے مطابق اس تالیف کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ زیر نظر تالیف ۱۹۵۱ء کا شائع شدہ دوسرا ایڈیشن ہے پچھلے ایڈیشن کے تشنہ حصوں کی اس ایڈیشن میں تکمیل کی گئی ہے۔ یہ تالیف ۱۲۱ صفحات پر مشتمل درج ذیل مضامین کا احاطہ کرتی ہے۔

۱۔ تنقید کیا ہے؟	۲۔ ہمارا قدیم تنقیدی سرمایہ
۳۔ اردو میں تنقید کی ابتدا	۴۔ اردو تنقید کا عارضی زوال
۵۔ اردو تنقید کی ترقی کا پہلا دور	۶۔ اردو تنقید کی ترقی کا دوسرا دور

---

[۱] اردو تنقید پر ایک نظر کلیم الدین احمد صفحہ ۲۷

[۲] ایضاً صفحہ ۲۱۳

۷۰ - اس تنقیدی سرمایہ پر طائرانہ نظر

(۱) تنقید کیا ہے؟ میں مؤلف نے شاعری کیا ہے؟ شعر کسے کہتے ہیں؟ اور شاعری کا جوہر اصلی کیا ہے؟ کے مفاہیم کی وضاحت تنقیدی پہلو سے کی ہے۔ شیلے، ورڈز ورتھ، جانسن، کارلائل، آرنالڈ اور پو کے بیانات سے اپنے بیانات کو قوی بنایا ہے۔ تنقید کی اہمیت اور انسان میں تنقیدی مادّے کا اظہار مصنف کی زبانی سنئے۔

"تنقید کا مادّہ جبلی ہے۔ جو فطرت نے لوازمات بشری کے ساتھ ہمیں عطا کیا ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح کہنا یہ ہوگا کہ انسان تو انسان بعض جانور بھی جانچنے اور پرکھنے کے اہل ہیں۔" [۱]

(۲) ہمارا قدیم تنقیدی سرمایہ کے عنوان سے (۱) نکات الشعراء میر تقی میر، (۲) تذکرہ ہندی (۳) عقد ثریا، غلام ہمدانی مصحفی، (۴) گلشن ہند لطف، (۵) گلشن بے خار، مصطفےٰ خان کے تذکروں میں تنقیدی اقتباسات اور عناصر سے تفصیل بحث کی ہے۔ اور خاطر خواہ نتائج اخذ کئے ہیں۔

(۳) اردو میں تنقید کی ابتدا میں آزاد، حالی اور شبلی کا شمار کیا ہے بقول مصنف

"اردو ادب کے اس تنقیدی دور میں آزاد، حالی اور شبلی آتے ہیں۔" [۲]

مؤلف نے ان کی تصانیف سے ماخوذ اقتباسات کی روشنی میں تنقیدی طریقۂ کار اور اصولوں کو روشن کیا ہے۔

(۴) اردو تنقید کا عارضی زوال، لالہ سری رام، امداد اثر، عبدالرحمٰن بجنوری، محمود شیرانی، محمد یحییٰ تنہا، عبدالحئی کی تصانیف کے جائزے سے تنقیدی شعور کی خامیوں اور خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے۔

(۵) "اردو ترقی کا پہلا دور" میں سید سلیمان ندوی، نصیر الدین ہاشمی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مسعود حسین رضوی، جعفر علی خان اثر، عبدالسلام ندوی، عبدالحق، رام بابو سکسینہ، حامد حسن قادری، نیاز، عندلیب شادانی، فراق گورکھپوری، سید اعجاز حسین اور عبدالقادر سروری، کی تصانیف پر ان کے تنقیدی خیالات کی روشنی میں تبصرہ کیا ہے۔

۶ - اردو تنقید کی ترقی کا دوسرے دور میں رشید احمد صدیقی، کلیم الدین احمد، محی الدین قادری زور کی تصانیف سے ماخوذ اقتباسات کی روشنی میں ان کی تنقیدی ٹیکنک اور طریقۂ کار کو عیاں کیا ہے۔

۷ - "تنقیدی سرمایہ" ایک طائرانہ نظر میں موضوع کے مطابق زیر تنقید نقادوں کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ اور لکھتے ہیں۔

---

[۱] تنقیدی سرمایہ - حصہ اول - عبدالشکور ص ۱۲
[۲] ایضاً " ص ۲۰

"تنقید کے میدان میں ان کی خدمات کا مفصل جائزہ اس کتاب کے دوسرے حصہ میں لیا جا جائے گا۔"[1]

مؤلف کے اس بیان کی روشنی میں مشہور نقادان سخن پر موصوف کے تحریر شدہ جملے ہم نے دوسرے حصے کے تبصرے میں نقل کیا ہے جن سے مؤلف کی تنقیدی آرا اور نقاد سخن کے نظریات اور خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ تالیف اردو کی تنقیدی تاریخ کا تذکروں کے عہد سے موجودہ دور تک ارتقائی مدارج کی تصویر ہے۔ مصنف نے اقتباسات کی مدد سے نقادوں کے تنقیدی شعور کا جائزہ لے کر زیادہ تر معقول اور متوازن نتائج اخذ کئے ہیں۔

اس کتاب سے اردو کی تنقیدی تاریخ اور نظریات کی نمائندہ تنقیدیں اور ان کے حامیوں کا ادبی کردار نمایاں ہوتا ہے۔ "تنقیدی سرمایہ" اردو ادب کے تنقیدی گلستاں میں مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کا نذرانہ ہے۔

تنقیدی سرمایہ (حصہ دوم)

مولوی عبدالشکور

"تنقیدی سرمایہ" حصہ دوم مولوی عبدالشکور عصر حاضر کے نقادانِ سخن کی تصنیف ہے۔ اور مضامین کا مفصل تنقیدی تبصرہ ہے۔ یہ کتاب ۲۰۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف حالی اور ان تصانیف کو اردو تنقید کی پہلی اور ٹھوس کتابیں قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"یہ "مقدمہ شعر و شاعری" اور "یادگار غالب" فن تنقید پر اردو میں پہلی مکمل عالمانہ اور معیاری تصانیف ہیں۔"[2]

اس کتاب میں درج ذیل نقادوں کے تنقیدی مضامین اور تصانیف کی روشنی میں ان کی ادبی خدمات اور تنقیدی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

(۱) برج موہن دتاتریہ کیفی (۲) کشن پرشاد کول (۳) اختر حسین رائپوری (۴) مجنوں گورکھپوری (۵) احتشام حسین (۶) ڈاکٹر عبدالعلیم (۷) سجاد ظہیر (۸) عزیز احمد (۹) آل احمد سرور (۱۰) عبدالمالک آروی (۱۱) اختر اورینوی (۱۲) سردار جعفری (۱۳) عبادت بریلوی (۱۴) یوسف حسین خاں (۱۵) شیخ محمد اکرام (۱۶) خواجہ احمد فاروقی (۱۷) ڈاکٹر مسعود حسین (۱۸) ممتاز حسین (۱۹) ابواللیث صدیقی (۲۰) ڈاکٹر ظہور الحسن ہاشمی (۲۱) ڈاکٹر محمد حسن

---

[1] تنقیدی سرمایہ حصہ اول عبدالشکور صفحہ ۲
[2] دوم ایضاً صفحہ ۱

(۲۴) محمد حسن عسکری (۲۵) راجندر ناتھ شیدا (۲۶) محمد احسن فاروقی وغیرہ

مصنف کا بیان ہے کہ

"ان چوٹی کے تنقید نگاروں کے علاوہ ممتاز حسین، سردار جعفری، شکیل الرحمٰن، اسلوب احمد انصاری، خلیل الرحمٰن اعظمی، ظہیر کاشمیری وغیرہ ایسے سرگرم عمل نقاد ہیں جن سے بجا طور پر بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔"[1]

مصنف نے ہر نقاد کے تنقیدی جائزہ میں اس کے تنقیدی نظریات کی وضاحت، تنقیدی طریقۂ کار پر اہم بیانات دیئے ہیں۔ تبصرہ میں حصۂ اول اور دوم میں زیر بحث نقادوں پر مصنف کے بیانات کی روشنی میں نقادوں کے تنقیدی نظریات، ادبی خدمات اور ادبی اہمیت روشن ہو جاتی ہے۔ ذیل میں مشہور نقادوں پر مصنف کے خیالات قابل غور ہیں۔

"حالی پہلے شخص تھے جنہوں نے اردو میں باقاعدہ تنقید کی طرف توجہ کی ان سے پہلے تنقید اصل معنی میں تنقید نہ تھی۔" ص ۲۲۴

"محمد حسین آزاد نے آب حیات لکھ کر اردو ادب میں نئی تنقید کا باب کھولا۔" ص ۲۳۲

"شبلی عجیب و غریب اوصاف کا مجموعہ تھے۔ وہ بیک وقت بلند پایہ مؤرخ بھی تھے۔ ادیب بھی، شاعر بھی تھے، اور ناقد بھی۔" ص ۲۳۸

"نصیر الدین ہاشمی دکن کے نامور ادیب اور نقاد ہیں۔ ان کی تنقیدوں میں تحقیق کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ ہم انہیں بجائے ناقد کے محقق کہیں تو مناسب ہوگا۔" ص ۲۵۳

"سکسینہ صاحب کی تنقیدوں میں ان کے ذاتی اعتماد اور وثوق کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔" ص ۲۵۵

"عبدالحق تنقید کے دوران وہ لسانی خوبیوں اور کمزوریوں کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کی نظر کلام کے داخلی اور خارجی دو قسم کے حسن پر رہتی ہے۔" ص ۲۶۲

"نیاز [illegible] [illegible] مضامین اکثر طویل ہوتے ہیں ان میں زبان کا زور اور توانائی کافی موجود رہتی ہے [illegible] [illegible] معلوم تک نہیں رہتا۔" ص ۲۷۵

"کلیم الدین احمد [illegible] معیار کو اردو شاعری پر چسپاں کرنا چاہتے ہیں۔" ص ۲۸۳

"اختر حسین صاحب کی تنقید عالمانہ، منطقی اور ٹھوس ہوتی ہے۔ وہ روس کے اثرات سے بڑی حد تک متاثر ہیں۔" ص ۲۸۹

---

[1] تنقیدی سرمایہ حصۂ دوم عبدالشکور ص ۱۹

"مجنوں گورکھپوری پر ایک طرف تو کلاسیکی اردو ادب کا بہت گہرا اثر ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی تنقید اکثر بہت تاثراتی ہو جاتی ہے" ص ۹۵

"آل احمد سرور صاحب ادب کے صرف ایک ہی حصے کو سائنٹفک بنانا پسند کرتے ہیں۔ ادب کا دوسرا حصہ ان کے نزدیک سائنس کی ہم عنانی نہیں کر سکتا" ص ۱۰۲

"یوسف حسین خاں کی تنقیدیں بہت سلجھی ہوئی اور عالمانہ ہوتی ہیں" ص ۱۵۱

اس کتاب میں مصنف نے اکثر نقادوں کی تنقیدی صلاحیت پر رائے زنی کی ہے۔ بقول مصنف تنقیدی سرمایہ کے دونوں حصوں میں تقریباً دو ڈھائی سو برس کے ادبی تنقید کا احاطہ ہے۔

"فن نقادیر یہ اجمالی نظر تقریباً دو ڈھائی سو برس کے ادبی کارناموں پر محیط ہے" [1]

دونوں حصے اس طرح تنقید کی تاریخ کا عہد بہ عہد ارتقاء کا آئینہ ہیں اور اس آئینہ میں مصنف کے اسلوب اور تنقیدی نتائج عیاں ہیں۔

اردو تنقید کا ارتقاء

ڈاکٹر عبادت بریلوی

اردو تنقید کا ارتقاء ڈاکٹر عبادت بریلوی کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جس پر ان کو لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۴۷ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔

اردو تنقید کے جائزہ کے سلسلے میں زبان، اظہار بیان، مواد اور پیشکش کے لحاظ سے قابلِ قدر تصنیف ہے۔ زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے بسیط مقدمے و ۲۱ صفحات اور مواد کے مطابق ۴۴۴ صفحات پر محیط ہے۔

اس میں نو ابواب ہیں۔ ہر باب مختلف فصلوں میں منقسم ہے۔ مضامین کی فہرست اس طرح ہے۔

پہلا باب: "فن تنقید" اس میں تنقید کی اہمیت، ادب اور تنقید، تنقید کی تعریف، تنقید کا صحیح مفہوم، تنقید کے متعلق نظریے، تعریف و تحسین، تشریح، تجزیہ، تنقیدی نظریات کا اختلاف، تنقید کے دو پہلو، تنقید اور سماج، تنقید اور جمالیات، سائنٹفک تنقید، جمالیاتی تنقید، حسن اور افادے کی بحث، مغربی نظریات جدید اسکول اور نئے تجربے، تنقید مشرق، تنقید کا مقصد۔

[1] تنقیدی سرمایہ حصہ دوم عبدالشکور ص ۲

دوسرا باب :- "تنقید قدیم" - اس میں اردو میں تنقید کی روایت پر فارسی کے اثرات، مشاعرے، مشاعروں میں اعتراضات، اعتراضات کے نمونے منظومات میں تنقیدی خیالات، تذکرے، تذکروں میں تنقید کے پہلو، شخصیت اور ماحول، سوانح، تنقیدی اشارے، کلام پر رائے، تذکرہ نگاروں کی صاف گوئی، فارسی شاعروں کا مقابلہ، اصلاح، ادبی تحریکوں کا ذکر، اشعار کا انتخاب، شعر و شاعروں کے متعلق فنی مباحث، تذکروں کی تنقیدی اہمیت، اساتذہ کی اصلاحیں۔

تیسرا باب :- "عہد تغیر کی تنقید" ہے اس میں عہد تغیر کی اہمیت، غدر کے اثرات، سماجی زندگی میں تبدیلیاں، سرسید کی اصلاحی تحریک، ادب میں تغیرات، نئی تنقید کی ابتدا، حالی کی تنقیدی تصانیف، مقدمہ شعر و شاعری، حیات جاوید، یادگار غالب، حیات سعدی، تقریظیں اور تبصرے مختلف تصانیف پر بحث کے بعد عہد تغیر کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھا باب :- "متبعین" ہے "اس میں مختلف نظریاتی تنقید کے تنقید نگاروں پر تبصرہ وحید الدین سلیم اور ان کی تنقید، اثر اور مہدی تک کا جائزہ لیا گیا ہے"۔

پانچواں باب :- "تحقیق اور تنقید" ہے۔ اس میں تحقیق و تنقید کا تعلق اردو میں تحقیق کی ابتدا، عبدالحق سے مولانا عبدالماجد دریاآبادی تک محققین کے تنقیدی شعور اور کارناموں پر تبصرہ ملتا ہے۔

چھٹا باب :- "مغرب کے اثرات" انگریزوں کی آمد سے تہذیب و تمدن پر مرتب اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے سرسید تحریک، ادب کی نئی کروٹ، مغرب کے اثرات، گہرے نقوش، اقبال کے تنقیدی نظریات سے نیاز فتحپوری کی تاثراتی تنقید اور مغربی اثرات پر تبصرہ کیا ہے۔

ساتواں باب :- "مغرب کے اثرات" ہے۔ تاثراتی تنقید میں شعور و فہم کی جھلک جس میں فراق اور مجنوں کی تاثراتی تنقید، خصوصاً مجنوں کی تنقیدی سائنٹفک رجحان، ترقی پسند تحریک، تنقیدی رجحانات، ترقی پسند نقاد میں سجاد ظہیر سے کلیم الدین احمد کے تنقیدی نظریات کا جائزہ لیا ہے۔

آٹھواں باب :- "جدید رجحانات" میں جدید رجحانات کی ابتدا، سیاسی، سماجی حالات، نوجوانی تحریکیں، حقیقت نگاری کا نیا رجحان، اشتراکی حقیقت نگاری، ادب کے متعلق بنیادی ادب ایک سماجی فعل، ادب کا افادی پہلو، طبقاتی کشمکش کی ترجمانی، مخالفت، عینیت پسندی کا نیا رجحان، ہمدوی پسند، نئے اعتراضات، حقیقت نگاری کا دوسرا رجحان، تاریخی، عمرانی، ادخالی، اور روایاتی تنقید، علوم کی طرف توجہ

دوسرے جدید رجحانات، نفسیاتی رجحان، علم تجزیۂ نفس اور تنقید وغیرہ پر تبصرہ ہے۔

نواں باب :۔ ادبی تاریخیں اور رسالوں کا ہے۔ ادبی تاریخوں کی روایت تذکرے اور تاریخوں کے بیچ کی کڑی آبِ حیات اور گلِ رعنا اور ان کا انداز تنقید، دکنی ادب کی تاریخیں، دکن میں اردو کی تنقید، نثر کی تاریخیں، داستان تاریخ اردو، شعر الہند، تاریخ اردو، مختصر تاریخ ادب اردو، تاریخوں کی تنقید کا جائزہ رسالے رسالوں کی اہمیت، بعض مشہور رسالے تنقید کے جدید سے جدید رجحانات کے ترجمان، تبصرہ نگاری، تبصرہ نگاری تنقید کی ایک شاخ، اس کی خصوصیات، اردو میں تبصرہ نگاری کی اہمیت، تبصرہ نگاری کا ارتقاء، تنقید کے تاریخی ارتقاء سے ہم آہنگی اور موجودہ حالات و مستقبل۔

فاضل مصنف نے انتہائی کاوش و احتیاط کے ساتھ کتاب تصنیف کی ہے۔ تنقید کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ کسی بات کی تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ ہر بات کی جامع و مانع اور مکمل تعریف و توضیح ہے۔

مختلف مباحث پر سیر حاصل بحث ہے۔ تنقیدی لحاظ سے بہترین جائزہ ہے۔ نظم و نثر پر جدید تحریکات کے اثرات کی مختصر مگر جامع وضاحت کی ہے۔ تنقیدی مسائل پر تشفی بخش خیالات فکر و نظر کو ایک حد تک مطمئن کر دیتے ہیں۔ کہ کوئی سوال نہیں اٹھتا۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اردو ادب اور اصناف تنقید پر اتنی مکمل اور جامع کتاب اس سے پیشتر نہیں لکھی گئی۔ تنقیدی تجزیات کا حاصل نظریات کی تشریحات، تاریخی اور تحقیقی ماخذ نہیں اور تحقیقی شعور کے لحاظ سے ہر موضوع سے واضح کیا ہے۔ اس وضاحت سے ایک خاص تنقیدی نقطۂ نظر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

تدریسی، تحقیقی اور تاریخی کام کرنے والوں کے لئے ایک مفید کتاب ہے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

زبان سلیس اور رواں دواں ہے۔ شستہ اور صاف ہے دلکش ہے۔

مضامین اور مواد کی خشکی کو زبان کی لطافت و سلاست اور سنجیدہ طرزِ بیان سے ایسا دل آویز بنا دیا ہے کہ قاری کو محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ایک خاص فن کی کتاب پڑھ رہا ہے۔

مختصر یہ کہ ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

سید احتشام حسین

سید احتشام حسین کی تصنیف "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" تنقید کی تاریخ ہے۔ ادب کی اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس میں ذیل کے موضوعات سے بحث اور تبصرہ ہے۔

۱۔ اردو ادب اور زبان کی ابتدا ۲۔ دکن میں اردو ۳۔ دلی اٹھارویں صدی میں
۴۔ اردو نثر کی ابتدا اور تشکیل
۵۔ اودھ کی دنیائے شاعری ۶۔ نظیر اکبرآبادی اور ایک خاص روایت کا ارتقاء
۷۔ قدیم دلی کی آخری بہار۔
۸۔ اردو نثر، فورٹ ولیم اور اس کے بعد نئے دور پہلے
۹۔ نظم و نثر، نیا شعور اور نیا نثری ادب نشاۃ الثانیہ کی اردو شاعری۔ ۱۰۔ نظم میں نئی سمتیں
۱۱۔ نثر کے نئے روپ، موجودہ ادبی صورتِ حال۔

اس کتاب میں موجودہ زبان کی ابتدا سے موجودہ عہد تک تقریباً تمام قابل ذکر شعراء و ادباء ناقدین، ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، مرثیہ گو، نظم اور غزل گو شعراء مزاح نگار وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس کتاب میں کئی اصناف سخن پر بحث ہے۔

اردو ادب کی تحریکات پر تفصیل سے بحث ہے اصناف سخن، تحریکات اور تاریخ، منطقی اور فلسفیانہ انداز میں تبصرہ ہے۔

چودھواں باب:۔ اردو ادب کی تاریخ اور تنقید کا خلاصہ ہے۔ اس میں یہ بتلایا ہے جاگیردارانہ عہد سے دورِ حاضر تک اردو ادب کس طرح انسانی آواز، عوامی مطالبات، سماجی انصاف اور وطن پرستی میں نظم و نثر کے اظہار سے عوام تک پہنچا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے چند شعراء کا مختصر تذکرہ ہے مثلاً اسماعیل میرٹھی، نیاز حیدر، اور نریش کمار شاد وغیرہ اس کے باوجود مصنف اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

یہ کتاب اردو ادب کی تنقیدی تاریخ میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

سوانح اور سیرت نگاری

سوانح اور سیرت نگاری بھی موجودہ عہد میں ایک صنف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قدیم عہد میں مثنوی اور قصیدہ نگاری میں سوانح اور سیرت کے مختصر خاکے نظر آتے ہیں۔ شخصی کرداروں سے صفات اور عیوب کا عکس جھلکتا ہے کچھ کتابوں میں شخصیات کے کردار پر بیانات ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت اس عہد کی تاریخ سے منسلک ہے۔ سوانح اور سیرت نگاری کا فن شخصیات کے اعمال سے وابستہ ہے۔

سوانح میں شخصی جاہ و جلال، خد و خال، سراپا کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور سیرت اس کے اوصاف حمیدہ کی وضاحت ہے۔ شخصی کردار سے وابستہ تمام صفات کا بیان ہے جس میں انسان کے حسن سلوک، کردار کی بلندی، عادات و اطوار، ذاتی کمزوریاں، نفسی کمزوریاں حسب نسب کا جائزہ، ذاتی معروفیت، پسندیدہ وسائل، ناپسندیدہ مشاغل اور پسندیدہ مشاغل کا جائزہ ہر پہلو سے لیا جاتا ہے۔

ان صفات اور کمزوریوں کا بیان، شخصیت کی صورت و سیرت کا سراپا بن جاتا ہے۔ اور قاری شخصی حرکات و اعمال کے مطالعہ سے ایک نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ یہ نتیجہ قاری کو شخصیت سے متاثر بھی کر سکتا ہے اور اس سے نفرت پر بھی آمادہ کر سکتا ہے۔

سوانح اور سیرت کچھ تو آثار مثنوی اور قصائد میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ عہد تغیر میں ۱۸۵۷ء کے بعد حالی نے اس پر توجہ کی ہے۔ حیات سعدی، حیات جاوید، یادگار غالب میں انھوں نے اس فن کو تمام خصوصیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایک طبقہ کا آج بھی یہ خیال ہے کہ غالب کو حالی نے دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔ شبلی نعمانی نے بھی اس فن پر خصوصی توجہ کی۔ اور تاریخ اسلام کی کئی معتبر ہستیوں کی سوانح اور سیرت لکھی ہے۔ ان کی تصانیف میں الفاروق، المامون، سیرت امام ابو حنیفہ ہیں۔ سیرت النبیؐ بڑی کاوش سے لکھنا شروع کی تھی۔ اور دو جلدیں ہی لکھ سکے۔ ان کے انتقال کے بعد بقیہ پانچ جلدیں سید سلیمان ندوی نے مکمل کیا۔ بابائے اردو عبدالحق نے "چند ہمعصر" میں شخصیات کی سیرت کے اظہار میں مکمل سراپا پیش کیا ہے۔ اور سیرت نگاری کے فن میں بھی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ جوش نے اپنی سوانح اور سیرت بقلم خود "یادوں کی بارات" پیش کیا ہے۔ اور بڑی بے باکی سے اپنی خامیوں اور خوبیوں کا اظہار کیا ہے۔

اردو میں ادبی شخصیات کے علاوہ مذہبی شخصیات، بزرگ، رہنما، صوفیائے کرام اور صحابہ کی سوانح اور سیرت نگاری پر بہت کتابیں ملتی ہیں۔ ادبی شخصیات میں تحقیق کے طلبہ نے اپنے موضوعات کے مطابق شخصیات کی سوانح اور سیرت کا احاطہ کیا ہے۔ اردو ادب میں اس فن کے اصول، قواعد و ضوابط پر تفصیلی معلومات کے لئے درج ذیل کتابیں

موجود ہیں۔ ۱۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء: ڈاکٹر الطاف فاطمہ

۲۔ فن سوانح نگاری اور سیرت نگاری: ڈاکٹر سید شاہ علی

۳۔ اردو میں سوانح نگاری کا ارتقاء: ڈاکٹر ممتاز فاخرہ

اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء

از الطاف فاطمہ

آنسہ الطاف فاطمہ کی زیر نظر تالیف ۳۲۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنفہ نے مقدمہ میں اپنی کاوش میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے مقالہ کی تیاری میں مددگار اصحاب کا تذکرہ کیا ہے۔

پہلا باب فن سوانح نگاری اور اس کی مختصر سرگزشت پر ہے جس میں یہودی عیسائی لٹریچر میں سوانح نگاری کے بابت لکھا ہے۔ ناول اور سوانح نگاری میں فرق بتلایا ہے۔ انگریزی ادب کی سوانح نگاری کے فن کو سراہا ہے۔ خطوط آپ بیتی اور روزنامچوں سے ماخوذ مواد کو سوانح عمری کا مستند مواد تسلیم کیا گیا ہے[۱]

اس باب میں مغرب میں فن سوانح نگاری کے ارتقاء کی تاریخ اور مشرق میں فن سوانح نگاری کا تصور اور اس کی مختلف شاخیں بتا کر تفصیل سے لکھا ہے۔

دوسرے باب میں اردو سوانح نگاری حالی سے پہلے کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ اور مختلف حوالے پیش کئے ہیں۔

تیسرے باب میں حالی اور ان کا فن سوانح نگاری کی خصوصیات اور خامیوں پر مدلل بحث ملتی ہے۔ حالی کی فنی شخصیت ملاحظہ کیجئے۔

"جزئیات کے انتخاب اور صداقت کی تلاش میں حالی کسی سوانح نگار سے پیچھے نہیں"[۲]

چوتھے باب میں شبلی اور ان کے فن سوانح نگاری پر مستند مواد ملتا ہے۔ ان کی خامیاں خوبیاں اور تاریخی موضوع پر عمدہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ شبلی کے تعلق سے مصنف کا یہ بیان قابل غور ہے۔

"وہ فن سوانح نگاری سے بخوبی واقف تھے۔ اور اس کے مطابق چند نظریے بھی رکھتے تھے۔ اور علوم و فنون کی صف میں بیا گرافی کا ایک خاص درجہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ادبی

---

[۱] اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء۔ ڈاکٹر آنسہ الطاف فاطمہ ص ۳۴

[۲] ایضاً ص ۱۴۶

سے ادنیٰ آدمی کے حالاتِ زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لئے دلیلِ راہ بن سکتے تھے۔ ؎۱

پانچواں باب عہدِ سرسید میں دوسرے سوانح نگار میں مرزا حیرت دہلوی، احمد حسن خاں، مولوی احمد الدین، احمد حسین الہ آبادی، مولوی ذکاء اللہ، فیروز الدین، سراج الدین احمد ایڈیٹر چودھویں صدی، عبدالحلیم شرر، منشی احمد الدین فوقی، خواجہ غلام الثقلین، نذیر احمد، قاضی سلیمان اور عبدالرزاق کانپوری کا ذکر کیا ہے۔

احمد حسین الہ آبادی کی تصانیف حیاتِ سعدی، حیاتِ نورالدین محمود کی حیاتِ ذوق، حیاتِ سلطان صلاح الدین ایوبی، مرزا حیرت کی حیاتِ طیبہ، حیاتِ فردوسی، سیرتِ محمدیہ، حیاتِ طیبہ شاہ اسماعیل شہید کی سوانح عمری وغیرہ پر مصنفہ کے بیان کے مطابق

"عہدِ سرسید کے ان سوانح نگاروں میں ایک بات اور بھی قابلِ ذکر نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اپنے ہیرو کی قدر افزائی یورپین مورخین اور مستشرقین کی آراء اور حوالوں سے کرنا چاہتے ہیں۔" ؎۲

اس باب میں مصنفہ نے ہر مصنف کی قابلِ قدر تبصرہ کیا ہے جس سے سوانح نگاری کے فن کے قواعد و اصولوں پر غور و فکر کیا جا سکتا ہے۔ اور موصوفہ کی رائے سے اتفاق و اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔

ساتواں باب آپ بیتیاں ہے۔ موصوفہ کے قول کے مطابق

آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری بھی فنِ سوانح نگاری سے ہی متعلق ہے۔ اگرچہ مکاتیب اور سفرنامہ بھی کسی شخص کے ذاتی حالات کا حصہ بن سکتے ہیں، مگر نصب العین کے اعتبار سے یہ دونوں اصناف سوانح میں داخل نہیں۔ ؎۳

اس قول سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری فنِ سوانح نگاری کے زمرے میں نہیں۔ یہ مصنفہ کا ذاتی نظریہ ہی نہیں بلکہ اصول او ضابطہ کے مطابق ہے۔ لیکن آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری سے فنِ سوانح نگاری کے مواد کو سنوار کر اس قالب میں ڈھال سکتے ہیں۔

اس کتاب میں موصوفہ آبِ حیات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ

"اگرچہ آبِ حیات کا بنیادی مقصد تاریخِ ادب تیار کرنا تھا لیکن اس میں شخصیت نگاری کے عناصر اس درجہ صحت مندانہ صورت میں ملتے ہیں کہ ہم اس کو قدیم و جدید سیرت اور شخصیت نگاری کی شعوری کڑی کہہ سکتے ہیں۔" ؎۴

یہ مصنفہ کی ذاتی رائے ہے۔ اس رائے سے قاری کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ یہ تصنیف اردو کے

؎۱ اردو میں سوانح نگاری کا ارتقاء ص ۴۸   ؎۳ ایضاً ص ۴۹
؎۲ ایضاً ص ۱۶۰
؎۴ ایضاً ص ۲۲۱

فن سوانح نگاری میں ایک اضافہ ہے۔

اردو میں سوانح نگاری

ڈاکٹر سید شاہ علی

اردو سوانح نگاری [۱] ڈاکٹر سید شاہ علی کا مقالہ ہے۔ جو ۳۴۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ دیباچہ اور کتابیات کے علاوہ دیگر عنوانات درج ذیل ہیں۔

۱۔ فن سوانح نگاری ۲۔ اقسام سوانح نگاری۔ ۳۔ اردو میں سوانح نگاری کا آغاز
۴۔ حالی اور شبلی کا سوانحی دور ۵۔ حالی اور شبلی کا دور (معاصر تصانیف)
۶۔ جدید دور۔ ۷۔ اختتامیہ، سوانح نگاری کا درجہ اردو ادب میں

دیباچہ میں مصنف نے اپنے موضوع کے متعلق مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے اساتذہ اور رہنماؤں کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اور اپنے مقالے میں مختلف ابواب کے موضوعات پر اس طرح بیان دیا ہے۔

"ابتدائی دو ابواب میں اصول، مسائل، خصوصیات اور اقسام سوانح نگاری کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ بعد کے ابواب میں اردو سوانح عمریوں خصوصاً اردو کے دو بڑے سوانح نگاروں حالی اور شبلی ہی کی سوانحی تصانیف پر ان اصولوں کا اطلاق کیا گیا ہے جو شبلی ہی کے الفاظ میں اپنی سعی و محنت کی تماشا گاہ ہے۔" [۲]

اس بیان کی روشنی میں ابتدائی دو ابواب اصول، مسائل، خصوصیات اور اقسام سوانح نگاری پر مصنف نے اعتماد اور ذمہ داری کے ساتھ مواد پیش کیا ہے۔ اور اپنے تبصرہ سے سوانح نگاری کے تحت آنے والے عناصر پر منفی و مثبت دونوں پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے مصنف کا کہنا ہے کہ

"مختلف شعبۂ زندگی سے منسلک شخصیات کے حالات اور کارنامے مختلف ہوں گے۔" [۳]

موصوف نے سوانح نگاری کی درج ذیل اقسام بتلائی ہیں اور ان کی خصوصیات سے بحث کی ہے۔

۱۔ خود نوشت سوانح عمری ۲۔ یادداشت بشمول روزنامچہ اور مراسلہ
۳۔ شخصی مرقعے۔ ۴۔ نو تعمیری سوانح عمریاں اور تذکرے
۵۔ تاجرانہ مقاصد کے تحت شائع کردہ سوانح عمریاں ۶۔ قاموسی یا اجتماعی سوانح نگاری

---

[۱] اردو میں سوانح نگاری۔ ڈاکٹر سید شاہ علی استاد شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی ص۔
[۲] ایضاً ص۔۹

۷۔ سوانح نگاری، ناول اور افسانہ نگاری

ان اقسام کی سب سوانح عمریوں کے درمیان نازک فرق اور ان کے مطالعہ سے قاری پر پڑنے والے تاثر سے نتائج کو اخذ کیا ہے۔ مذہبی شخصیات، شاعروں، سائنسی سیاسی شخصیات کی سوانح عمریوں کے اثرات عوام تک ان کو پہنچانے معاشی اور معاشرتی نکات پر تبصرہ کیا ہے۔

باب "اردو میں سوانح نگاری کا آغاز" میں عربی اور فارسی میں سوانح نگاری پر مثالیں دے کر بحث کی ہے۔[۱] ان کے علاوہ دکن میں مثنویوں میں لکھی سوانح عمریوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مرثیوں، شاعروں کے تذکروں اور مختلف تذکروں میں سوانح عمریوں پر حوالوں کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ تذکرہ ریختہ گویاں، آب حیات، مجالس رنگین پر تفصیل سے لکھا ہے۔ مذہبی اور تاریخی سوانح عمریوں میں ترجمہ تاریخ الخلفاء، ضیاء الابصار وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ خطوط غالب کے حوالے سے مختلف شخصیات کے ابھرتے خدوخال کو سوانح نگاری کا جز تسلیم کیا ہے۔[۲]

سر سید کی سوانح نگاری پر مختصر تبصرہ ہے۔

حالی اور شبلی کا سوانحی دور کے باب میں ان کی خصوصیات اسلوب اور خامیوں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

جدید دور کے باب میں مذہبی رہنماؤں اور سیاسی رہنماؤں اور جنگ آزادی کے مجاہدین کی لکھی سوانح عمریوں کا تذکرہ کیا ہے۔

"سوانح نگاری کا درجہ اردو ادب میں" کے باب میں مندرجہ ذیل جملہ قابلِ ذکر ہے۔

"اگر اردو نثر کی ساری کائنات کا جائزہ لیا جائے تو کیا بلحاظ مقدار اور کیا بلحاظ نوعیت اردو سوانح نگاری اس کا سب سے بڑا حصہ معلوم ہوتی ہے۔"[۳]

موصوف نے اردو نثر کی ترقی کو سوانح نگاری کا اہم رکن ثابت کیا ہے اور اردو میں سوانح نگاری کی خامیوں کو بھی گنوایا ہے۔

یہ تصنیف فن سوانح نگاری کے عنوان پر سیر حاصل مواد فراہم کرتی ہے۔ لیکن موصوف نے ایک مقام پر فن سوانح نگاری کے باب میں لکھا ہے کہ مختلف شخصیات شعبہ ہائے زندگی میں مختلف مظاہرے کرتی ہیں جن سے ان کی اصل شخصیت کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن اس کی کوئی کسوٹی نہیں بتائی جس کی

۱۔ اردو میں سوانح نگاری۔ ڈاکٹر سید شاہ علی ص ۱۲ تا ۱۱۱
۲۔ ایضاً ص ۱۴۲
۳۔ ایضاً ص ۳۰۹

بنا پر ایسی شخصیات کے کارناموں کی حقیقت تک پہنچا جائے۔ بہر حال اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ اردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ جو تحقیقی کام کرنے والے طلبہ کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی

اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء

سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۷۵ء

ڈاکٹر ممتاز فاخرہ

ڈاکٹر ممتاز فاخرہ کا تحقیقی مقالہ "اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء" کتابی شکل میں درج ذیل موضوعات کے مطابق ابواب کا تعین ہے۔

۱۔ فن سوانح نگاری۔

۲۔ پس منظر۔ اردو ادب میں سوانح عمری کی روایت حالی، شبلی اور ان کے معاصرین کا دور۔ ابتدا سے ۱۹۱۴ء تک۔ ۳۔ اردو میں سوانح نگاری ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۷ء تک

۴۔ اردو سوانح نگاری ۱۹۴۷ء تا حال ۵۔ خود نوشت سوانح عمریاں

۶۔ قلمی خاکے، سوانحی مجموعے، سوانحی تراجم اور نیم سوانحی تراجم۔

۷۔ کتابیات۔

کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ موصوف نے ڈاکٹر فاخرہ کی تحقیقی محنت اور کاوش کو سراہا ہے ڈاکٹر سیفی پریمی کا بیان اس کی تصدیق ہے۔

"۱۹۴۷ء تک اس باب میں مواد کی فراہمی چنداں دشوار نہ تھی۔ مگر اس کے بعد عہد حاضر تک نقوش کی تلاش کارے دارد۔ میرے نزدیک باب چہارم، پنجم اور ششم ڈاکٹر فاخرہ کی لگن، محنت، مطالعہ اور تنقیدی شعور کی واضح اور خصوصی علامت ہیں۔ خاکے، نیم سوانحی مجموعے پر مختصر اظہار خیال اور تقریباً شمار و تعداد کو سفینۂ قرطاس پر لانا کبھی نہ صرف قارئین بلکہ مضمون نگار حضرات کے لئے پہیلی کرنا کا کام دے گا۔ ڈاکٹر فاخرہ کو اس تحقیقی اور تنقیدی کارنامے پر مبارکباد ملنی چاہیئے۔"[1]

ڈاکٹر سیفی پریمی کے بیان میں کتاب کی جملہ خوبیوں کا نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ تذکرہ ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کی روشنی میں تحقیقی طلبہ کے لئے مشعلِ راہ کا کام کرتی ہے اردو میں سوانح نگاری

---

[1] جائزے۔ مرتبہ مظفر حنفی (تبصرہ سیفی پریمی) ص ۴۲

کی منظم تاریخ ہے۔

طنز و مزاح

ہر زبان میں اپنے تہذیبی و معاشرتی سیاسی و سماجی ادبی اور ثقافتی مزاق کے مطابق طنز و مزاح کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ سنجیدگی اور متانت کے روپ میں خوش مزاجی و حاضر جوابی کا مظاہرہ مذاق اور طنز کے ساتھ مخاطب کو کام کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ طنزیہ اور مزاحیہ جملے بعض اوقات تلوار کی دھار سے زیادہ تیزی دکھاتے ہیں۔ ساتھ ہی طنز اور مزاح کے عناصر انسانی فطرت میں شامل رہتے ہیں مزاج اور ذوق کے اعتبار سے صلاحیت کے موجب عمل کرتے ہیں۔ اردو میں اور زبانوں کی طرح طنز و ظرافت کا ذخیرہ نظم اور نثر دونوں خزانوں میں موجود ہے۔

طنز کی ابتدا نظم سے ہوئی ہے۔ جعفر زٹلی کے اشعار میں طنز کے نشتر موجود ہیں۔ یہ دربات ہے کہ متاثر نہیں کرتے۔ دراصل اسوقت زبان فصاحت و بلاغت کے زیور سے آراستہ و پیراستہ نہیں ہوئی تھی۔ بیان میں تاثر کا ذریعہ الفاظ کی نشست و برخاست فصاحت و بلاغت پر منحصر ہے۔ جعفر زٹلی کے بعد قدماء کے کلام میں اکثر اشعار معشوق پر طنزیہ ملتے ہیں۔ اکثر مزاحیہ پیرایہ میں ایسی مثالیں غالب اور داغ کے یہاں کثرت سے مل جاتی ہیں۔

عہد تغیر میں اکبر الہ آبادی، غلام احمد فرقت کاکوروی مشہور ہیں اور دونوں اپنے فن میں انفرادیت رکھتے ہیں۔ اکبر طنز سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ اور زبان چٹکیلے پن سے اسی طنز میں مزاح کا لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ ویسے طنز کا خاص میدان ہے غلام احمد فرقت ہنسی میں طنز کی رو کو لے کر چلتے ہیں۔ مزاحیہ انداز میں راجہ مہدی علی خاں کا کلام بھی قابل غور ہے۔ ان کی زبان ادبی کم اور سطحی زیادہ ہے۔ دلاور فگار نے چند ملک میں فی الحال واحد شخصیت ہے جنہوں نے اس فن میں انفرادیت قائم کی ہے۔ اور طنز و مزاح زبان و بیان کے انداز میں مزاح اور مفہوم میں طنزیہ عناصر کی شمولیت کی ہے۔ طنزیہ کلام کو ایک معیار عطا کیا ہے۔ حالانکہ آج کل ہزل کے نام پر طنز و مزاح کے شعراء بہت نظر آتے ہیں۔ ان میں یوسف ناظم پر توجہ کی جا سکتی ہے۔ لیکن طنزیہ کلام کو مزاح کے ساتھ ادبی معیار عطا کرنے والی شخصیت فی الحال دلاور فگار کے اور کوئی نظر نہیں آ رہی ہے۔

نثری میدان میں طنز و ظرافت کی ابتداء داستانی کرداروں کے مکالموں سے ہوتی ہے۔ لیکن بحیثیت ایک

فن کے طنز و مزاح کا نثری نمونہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کی فسانۂ آزاد ہے۔ فسانۂ آزاد میں پنڈت نے طنز اور مزاح کی چاشنی اپنی طرز تحریر میں نمایاں کی اور آزاد جیسے طنزیہ اور خوجی جیسے مزاحیہ کرداروں کو جنم دیا ہے۔

"پطرس کے مضامین" پطرس کی تحریر کی نمایاں خصوصیت مزاح اور طنز ہے۔ مزاحیہ زبان میں طنزیہ نشتر کے گھاؤ مارنا اور زبان کے ادبی معیار کو برقرار رکھنا پطرس کی اہم خصوصیت ہے۔

ان کے بعد کنہیا لال کپور اس میدان میں مزاحیہ انداز کی نثر نگاری کی بہترین مثال ہیں۔ ان کی تحریر میں دل کو ٹھیس لگی زبان کا کردار مزاحیہ انداز میں ایک انفرادیت برقرار رکھتا ہے۔ سنگ و خشت اور دیگر مضامین کے مجموعے میں انھوں نے معمولی طنز کو بھرپور مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے کرشن چندر کی "ایک گدھے کی سرگزشت" میں طنز و مزاح کا مظاہرہ کرنے کے بعد سبکدوش ہو گئے لیکن ان کی تحریروں میں سنجیدگی اور متانت کے باوجود طنزیہ عناصر موجود ہے۔ فکر تونسوی کے یہاں طنز زیادہ ہے۔ لیکن انھوں نے اس میں اپنی شناخت نہیں بنائی۔ لیکن ابن انشا نے اور مشتاق یوسفی نے طنز و مزاح میں سیاسی و سماجی کمزوریوں کا اعادہ جدید فکر کے ساتھ کیا ہے۔ یوسف ناظم اسی قبیل کے ادیب ہیں ہمارے یہاں کچھ انشائیہ نگاروں کے یہاں طنزیہ جملوں میں ہلکا مزاح ملتا ہے۔ جو انشا کی خصوصیت کا ایک جزو ہے۔

رشید احمد صدیقی کی نثر نگاری نے طنز و مزاح کے فن کو اردو میں ایک انفرادیت عطا کی ہے۔ انکی طنز و مزاح نگاری متانت کے ساتھ ادبی معیار کی کسوٹی ہے۔ فصاحت و بلاغت کے سہارے طنزیہ جملوں کا انتخاب لفظی مینا کاری سے مزاحیہ انداز پیدا کرنا رشید احمد صدیقی جیسی شخصیت کا کام ہے۔ اردو ادب میں طنز و مزاح نگاری کی تاریخ پر نہیں بلکہ اس کی ترتیب پر درج ذیل کتابیں ملتی ہیں۔

۱۔ ظرافت اور چند ظریف ہستیاں — تمنا مظفرپوری

۲۔ اردو میں طنز و مزاح (نظم و نثر) — غلام احمد فرقت کاکوروی

۳۔ اردو ادب میں طنز و مزاح — ڈاکٹر وزیر آغا

۴۔ اردو شاعری میں طنز و مزاح — محمد یونس فہمی

۵۔ طنزیات و مضحکات — رشید احمد صدیقی

۶۔ طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور

اردو ادب میں طنز و مزاح

غلام احمد فرقت کاکوروی

غلام احمد فرقت کاکوروی کی کتاب "اردو ادب میں طنز و مزاح" دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ۴۲۴ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ پہلا حصہ نظم میں طنز و مزاح کی ابتدا سے کنہیا لال کپور تک کے عہد کا انتخاب ہے۔

زیر نظر کتاب حصہ نثر ہے۔ جس کی فہرست حصہ نظم یعنی پہلے حصے میں پیش کی گئی ہے۔ غلام احمد فرقت کاکوروی نے اس حصے میں غالب کے خطوط کے ظریفانہ اقتباسات کو نقل کیا ہے۔ غالب کی تحریر میں طنز و مزاح کے عناصر کا بیان ہے۔

"اودھ پنچ" کے نثر نگاروں کے دور اوّل سے منشی سجاد، مرزا مچھو بیگ، ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، احمد علی شوق، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی جوالا پرشاد برق کے مضامین اور اقتباسات کا انتخاب طنز و ظرافت کی چاشنی سے لبریز تحریری کارناموں سے ثابت کیا ہے۔ اودھ پنچ کے دوسرے دور سے حکیم ممتاز حسین عثمانی، دستگیر، مولانا آزاد، ظفر علی خاں، سلطان حیدر جوش، عبد الماجد دریابادی، خواجہ حسن نظامی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، ریاض خیرآبادی، سید محفوظ علی بدایونی، قاضی عبد الغفار، سجاد انصاری، مرزا فرحت اللہ بیگ، ملا رموزی، میاں عبد العزیز، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، حاجی لق لق، آوارہ، کنہیا لال کپور، کرشن چندر، غلام احمد فرقت، تمکین کاظمی، ایم اسلم، نیاز فتحپوری، ناکارہ حیدرآبادی، سعادت حسن منٹو اور مصنف کے نثری کارناموں کا ذکر ہے۔ مذکورہ ادیبوں کے نثری انتخاب میں غلام احمد کی ظریفانہ طبیعت اور صلاحیت کو خاصا دخل ہے۔ اس لئے یہ کتاب طنز و مزاح کی ایک منظم تاریخ ہے۔

حصہ نظم میں مقدمہ دونوں حصوں کے شعرا و ادبا یعنی نظم و نثر کا تنقیدی معیار اور کسوٹی ہے۔ غلام احمد کے ظریفانہ اسلوب نے طنز و مزاح کی تاریخ نظم و نثر کو ظریفانہ بیان سے خوش گوار کر دیا ہے اور ان کے طنزیہ جملوں نے تنقید کو میٹھا بنایا ہے۔

مصنف نے "عرض کرنے سے پہلے" کے عنوان سے دیباچہ حصہ نظم میں جو جملے لکھے ہیں۔ وہ ان کی ظریفانہ صلاحیت اور خوش مزاجی کا ثبوت ہیں۔ مثلاً

"اگر یہ کتاب کسی انعام کی مستحق قرار پائے تو اس کے ذمہ دار ان حضرات کی بالغ نظری ہوگی

جن کو تاریخ کتابوں سے شغف ہے۔[۱]

یہ کتاب ادب میں طنز و مزاح کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہے۔

اردو ادب میں طنز و مزاح

غلام احمد فرقت کاکوروی

اس کتاب کی ابتدا اقسام ظرافت سے ہوتی ہے۔ ظرافت کی تعریف بتا کر ہزل، پھکڑ، فحاشی ضلع جگت، پھبتی، فقرہ بازی، لطیفہ، تمسخر، مزاح، طنز، ریختی، ہجو، خمریات وغیرہ کی مختصر تعریف کی ہے۔

اردو شاعری میں طنز و مزاح کے عناصر ابتدا سے ملتے ہیں۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے کہ

"اردو شاعری میں سب سے پہلے ہم کو ظرافت کا پرتو واعظ اور محتسب پر طنز کی صورت میں اس وقت ملتا ہے جب اردو زبان کے منہ سے دودھ کی بو آتی تھی۔ اور جب اردو شعراء کا کلام نیم فارسی یا نیم ہندی کے گہوارے میں پروان چڑھ رہا تھا۔ اور اردو کو برائے نام ہی اردو کہا جا سکتا تھا۔ چنانچہ قلی قطب شاہ کے وقت سے جسے اب تک صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس وقت تک تمام شعراء کے یہاں کم و بیش واعظ اور محتسب پر طنز ملتا ہے۔"[۲]

اردو میں طنز و مزاح کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور جعفر زٹلی سے شروع کر کے سودا پر ختم کیا ہے۔ سودا کو انکی ہجویات اور شہر آشوب کی خصوصیات کی بنا پر مسلم الثبوت استاد تسلیم کیا ہے۔

دوسرے دور میں صرف غالب کے خطوط اور اشعار میں طنز و ظرافت کے عناصر کو تسلیم کیا ہے۔

تیسرا دور اکبر الہ آبادی سے شروع کیا ہے۔ اکبر کی طنزیہ شاعری اور مزاحیہ لب و لہجہ کا جائزہ لیا ہے۔ اسی دور میں اودھ پنچ کے ایڈیٹر سجاد حسین، رتن ناتھ سرشار، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، نواب محمد آزاد، عبدالغفور شہباز، منشی جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق اور طوری

---

[۱] اردو ادب میں طنز و مزاح۔ غلام احمد فرقت کاکوروی ص۱

[۲] ایضاً ص ۲۳

احمد علی کسمنڈوی کو شامل کیا ہے۔

دورِ حاضر (یعنی چوتھا دور) میں محفوظ علی بدایونی، سلطان حیدر جوش، مولانا ظفر علی خاں، اس دور کے آخری مزاح نگاروں میں فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، ملا رموزی، اور کنہیا لال کپور کو اہم طنز و مزاح نگار بتلایا ہے۔

ریختی گو شعراء اور ہجویات، طنز و مزاح کے شعراء کی فہرست چاروں ادوار سے پہلے پیش کی ہے جس میں انشاء، مصحفی، رنگین، جان صاحب، نظیر اکبرآبادی، اور غالب وغیرہ کو شمار کیا ہے۔

ملا رموزی کے بارے میں لکھا ہے۔

"ملا رموزی کی شہرت ان کی گلابی اردو پر مبنی ہے۔ وہ اس کے موجد اور خاتم تھے۔" [۱]

اقبال کے کچھ طنزیہ اشعار، جوش کی کچھ طنزیہ نظمیں سامنے رکھ کر مصنف نے اپنا جائزہ پیش کیا ہے طنز و مزاح کے نثر نگاروں میں نئے عہد کے منتخب ناموں میں خواجہ حسن نظامی، قاضی عبدالغفار، نیاز فتحپوری، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، غلام احمد فرقت کاکوروی وغیرہ خاص ہیں۔

یہ تصنیف مزاح نگاری کی تاریخ اور تنقید کا آئینہ ہے۔ مصنف خود ایک اچھا طنز و مزاح کا شاعر اور انشاپرداز تھا۔ اس لئے اس نے فن کی باریکیوں کو بہتر طریقہ سے سمجھا ہے۔

طنزیات و مضحکات

رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی اردو ادب میں طنز و مزاح سے انشائیہ نگاری تک انفرادی شخصیت کے مالک ہیں۔ مرحوم نے اس فن میں بھی انفرادیت زورِ قلم سے منوائی ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تالیف "طنزیات و مضحکات" اپنے موضوع کی مکمل نمائندگی کرتی ہے مؤلف کا بیان اس کا ثبوت ہے۔

"بعض لوگوں کا تذکرہ ضرورت سے زیادہ طویل اور بعضوں کا سرے سے غائب۔ دونوں برابر اور یاروں کی تصنیف مفت! انشاء پردازی کا یہ "تاریخی" نہیں "ساختی" تصور ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم، مولوی ولایت علی بمبوق، مرحوم چودھری محمد علی ردولوی کے مضامین کے باوجود تلاش کے دستیاب نہ ہوسکے اور جو ٹھیک ٹھیک طنزیات کے تحت میں آتے نہ تھے اسلئے نظر انداز کر دیئے گئے۔" [۲]

---

[۱] اردو ادب میں طنز و مزاح - غلام احمد فرقت کاکوروی ص۳ [۲] طنزیات و مضحکات رشید احمد صدیقی ص۲

یہ کتاب طنزیات و مضحکات کے معیار پر انشاء پردازوں اور شعراء کی تخلیقات سے بحث کرتی ہے۔
ابتداء میں رشید احمد صاحب نے یونانی رومی انگریزی اور فارسی زبان کے ادب میں طنز و مزاح کی حیثیت کو تاریخی شواہد سے واضح کیا ہے۔ اور مذکورہ زبانوں کے ادب میں طنزیات و مضحکات کے مفہوم اور ذرائع اظہار پر اپنے منفرد اسلوب سے رنگ بھر دیا ہے۔ فارسی ادب سے نظم اور نثر کا انتخاب مختصر موضوع کے مطابق ہے۔ طنزیات اردو کے عنوان میں سوداؔ کی ہجویات کو باقاعدہ اردو میں طنزیات و مضحکات کی ابتداء تسلیم کیا ہے۔ سوداؔ کی ہجویات، اور "اودھ پنچ" سے منسلک ادیبوں کے انتخاب اور تصانیف و مضامین کے مزاحیہ کرداروں پر ان کے اسلوب کی روشنی میں تنقید و تبصرہ کیا ہے۔

رقعات غالبؔ میں طنز و مزاح کے اہم اقتباسات کو نقل کرکے ان کی اہمیت اور انفرادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ "اودھ پنچ" میں سرشارؔ سے جوالا پرشاد برقؔ تک کی طنز نگاری اور مزاح پر تنقید کی روشنی میں ان کرداروں کی خوبیوں اور خامیوں کی اخلاقی کمزوریوں اور بلندیوں سے ماخوذ نتائج واقعی رشید صاحب کا حصہ ہیں۔

اکبرؔ الٰہ آبادی کے کلام کی روشنی میں ان کی طنز و مزاح پر تبصرہ کیا ہے۔ عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، شبلیؔ، قاضی عبدالغفار، خواجہ حسن نظامی سے مرزا فرحت اللہ تک تمام انشاء پردازوں اور شعراء کے انتخابی کلام اور اقتباسات کو نقل کرکے ان ادیبوں کی جملہ خوبیوں اور خامیوں کے پیش نظر طنز و مزاح نگاری کی فنی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔

رشید صاحب کے تبصرے کے ساتھ تنقیدی جملوں کی دروبست مطالعہ کے دوران ایک لطف پیدا کردیتی ہے۔ رشید صاحب ایک پائے کے طنز و مزاح نگار ہیں لیکن اپنی تصنیف میں اپنے بابت کچھ نہیں لکھا۔ اور اپنے مقام کا تعین کرنے سے قاصر رہے۔ یہ موصوف کی ادبی انکساری ہے۔ ورنہ موصوف کی طنز و مزاح نگاری آج بھی اپنا جواب آپ ہے۔

یہ کتاب طنز و مضحکات کی تاریخ میں ایک اولین تصنیف ہے۔ اور رشید صاحب کے تنقیدی شعور کا بہترین اظہار ہے۔ اور رشید صاحب نے اس کتاب میں اپنا شمار نہیں کیا جس کے سبب ان کا مرتبہ اور اہمیت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اور خامی ہے۔ اپنے قلم سے اپنی تعریف نہیں کرنا۔ ان کے مرتبہ کو مستحکم کردیتا ہے۔

اردو ادب میں طنز و مزاح

ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا کا مقالہ "اردو ادب میں طنز و مزاح" ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ طنز و مزاح کی مفصل تاریخ ہے۔ مصنف کے بیان کی روشنی میں یہ بات قابل غور ہے۔

"طنز و مزاح کا یہ سرمایہ نہ صرف کسی زبان کی نشو و نما اور ارتقاء کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ اہل زبان کے تدریجی ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے۔"[1]

پہلے باب "مزاح اور مزاح نگاری" میں مصنف نے مزاح کو انسانی فطرت کی اہم خصوصیت بتایا ہے۔ ہنسی کے مختلف زاویوں کا جائزہ "ارسطو، تھامس ہابز، برگساں اور فرائڈ" وغیرہ کے حوالوں سے پیش کیا ہے۔ مزاح کی اقسام، مزاح اور طنز میں فرق، مزاح نگاری کے عناصر، انگریزی، فارسی اور عربی ادب میں تلاش کیا ہے۔

دوسرے باب میں "اردو شعر" کا ذکر ہے اس میں شعراء کے کلام میں زاہد سے چھیڑ چھاڑ کو طنز و مزاح کی ابتداء بتلایا ہے۔ ہجویات، شہر آشوب کے بیان میں میر اور سودا کو شامل کیا ہے نظیر کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری، ریختی میں انشا، رنگین، غالب کے کلام میں طنز و مزاح پر تبصرہ ہے۔ "لسان العصر" اکبر الہ آبادی، شبلی، ظریف، مولانا ظفر علی خاں، اقبال اور جوش کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔

تیسرے باب "اردو نثر میں طنز و مزاح" میں

"اردو نثر میں ظرافت کے ابتدائی نقوش اردو کی بعض قدیم داستانوں میں ملتے ہیں۔"[2]

قدیم داستانوں، غالب کے خطوط "نذیر احمد کی ناول نگاری، سرسید کے مضامین، پنڈت رتن ناتھ سرشار، سجاد حسین، سید محمد آزاد وغیرہ اور رشیدی دور میں مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم، قاضی عبد الغفار اور ملا رموزی کا ذکر کیا ہے۔ مصنف نے جدید دور تک طنز و مزاح کی ایک تاریخ مرتب کی ہے۔

چوتھے باب میں اردو ادب کے مزاحیہ کرداروں سے بحث ہے۔ خوجی، حاجی بغلول، چچا چھکن، مرزا جی اور بد حواس شوہر وغیرہ۔ مصنف نے ان کرداروں کی خامیوں اور خوبیوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

پانچواں باب اردو ڈرامہ میں طنز و مزاح کے عناصر کا سراغ دیتا ہے۔ مصنف نے ڈرامہ میں امیر

---

[1] اردو ادب میں طنز و مزاح - ڈاکٹر وزیر آغا ص ۱۶-۱۵

[2] ایضاً ص ۱۲۳

طرح، تاریخی جائزہ لے کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ

"اردو کے قدیم ڈرامہ نگاروں میں غالباً حسینی میاں ظریف پہلے ڈرامہ نگار تھے جنہوں نے ڈرامہ کی سنجیدہ فضا میں مزاحیہ سین کے داخلے سے تبدیلی پیدا کی۔"[1]

چھٹے باب میں اردو صحافت میں طنز و مزاح کا اظہار ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ اردو صحافت میں طنز و مزاح کا رواج اودھ پنچ کے اجراء سے ہوتا ہے۔"[2]

اس باب میں طنز و مزاح کی تاریخ کے ساتھ ادب میں صحافت کی تاریخ بھی روشن ہوتی ہے۔ اور ظفر علی خان کے "زمیندار" اخبار سے طنزیہ صحافتی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔ صحافت میں ابوالکلام آزاد کے "الہلال" محمد علی جوہر کے ہمدرد اخبارات کے مزاحیہ مضامین اور شاعروں کا تذکرہ کیا ہے۔

یہ کتاب ادب میں طنز و مزاح کی تاریخ کو سمجھنے اور اس کی خامیوں کو پرکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ قدیم عہد سے عہد حاضر تک۔ طنز و مزاح کی تاریخ ڈرامہ کا جائزہ اور صحافت کا کردار ادب کے گوشوں کو روشن کرتا ہے۔ ادب میں یہ تصنیف ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

اردو شاعری میں طنز و مزاح

(۱۹۴۷ء کے بعد)

محمد یونس فہمی

محمد یونس فہمی کا یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں طنز و مزاح کی ماہیت ہنسی اور اس کے محرکات انگریزی ادب سے وابستہ دانشوروں کے اقوال ہیں۔ ورقلام احمد فرقت کاکوروی کی کتاب اردو ادب میں طنز و مزاح" کی مدد سے ظرافت کی اقسام کی تعریف کی ہے۔

دوسرے باب میں آزادی کے بعد سیاسی و سماجی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کو قدیم عہد سے جوڑ کر موضوع کی وضاحت کی ہے۔

تیسرے باب میں ان اسباب و علل پر مواد پیش کیا ہے جو طنز و مزاح کی ترقی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آزادی کے بعد اردو شاعری میں طنز و مزاح نے جتنی ترقی کی ہے کسی عہد میں اس کی مثال نہیں ملتی اس ضمن میں کئی مثالیں دی ہیں۔

چوتھے باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے میں انڈو پاک کے ممتاز شعراء کے کلام پر بحث ہے۔

---

[1] اردو ادب میں طنز و مزاح۔ ڈاکٹر وزیر آغا ص ۲۴۹۔
[2] ایضاً ص ۲۶۹

اور دوسرے عہد میں حیدر آباد کے شعراء کے کلام پر تبصرہ ہے آخر میں عہد قدیم سے جدید عہد تک کے طنز و مزاح گو شعراء کے کلام کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

یہ کتاب اردو ادب میں ۱۹۷۷ء یعنی آزادی کے بعد کی اہم تاریخ ہے ادب میں ایک اضافہ ہے۔

طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور

ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور کا یہ تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں (اپریل ۱۹۷۸ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس مقالہ پر ان کو پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی گئی ہے۔ یہ تحقیقی کاوش ۲۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ فہرست مضامین کے بعد "حرف چند" کے عنوان سے گوپال متل کا تعارفی جائزہ ہے جو ڈاکٹر قمر رئیس کے تعریفی کلمات سے شروع ہوتا ہے۔ قمر رئیس کے تاثرات کو پڑھکر اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ستائش بے جا سے کام لیا گیا ہے۔ صفحہ نمبر ۵ سے پیش لفظ کی ابتداء ہوتی ہے جس میں ۲/۳ ڈاکٹر عبدالغفور صاحب کے درج ذیل جملے قابل غور ہیں۔

(۱) چونکہ اردو کے مزاحیہ اور ظریفانہ ادب میں اس طرح کی تفریق تقسیم اور حد بندی کبھی نہیں ہوئی۔ راقم حروف نے اس خلاء کو پر کرنے کے لئے پرانے کلاسیکی ادب سے لے کر حالیہ دور تک ہر قسم کی تحریر اور اسلوب نگاری کا بغائر مطالعہ کر کے انگریزی ادب سے وہ تمام باتیں جو اردو ادب میں سما سکتی ہیں یکجا کر کے منظم اور باقاعدہ ترتیب و تدوین کی ہے۔ جو نہ صرف طالب علم بلکہ نقاد اور اسکالر کے لئے بھی کام آئیں گی۔"[1]

۲۔ ان جملوں کی روشنی میں مرحوم "انشائے لطیف" کے باب میں مزاح خالص مزاح، مزاحیہ صورت، واقعہ ستم ظریفی تک ہر قسم کے مزاح کی تعریف کرتے ہیں۔ مثالیں بھی پیش کی ہیں جن سے مفہوم گنجلک ہو جاتا ہے انتہائی مختصر تعریف، ادب لطیف سے کوئی نسبت استوار نہیں کرتی۔

مندرجہ بالا اقتباس "بغائر" کی جگہ غائر ہونا چاہئیے۔

۱۔ بذلہ سنجی کے باب میں تحریف نگاری، دندان شکن جواب، چشمک میں بھی طنز و مزاح کے عناصر مرحوم کو نظر آئے۔ تیسرا باب طنز کا ہے جس میں برجستہ گوئی، زیر لب تبسم، موشگافی، اور گفتگو جیسی شامل ہیں۔ ان میں طنز کا عکس بعض اوقات یہ افعال (حرکات) حیرت و استعجاب اور صرف مزاح کے جذبے کی پیداوار ہوتے ہیں۔

---

[1] طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور ص۵

۳- اردو کی منظوم نظموں کے باب میں مختلف اصناف کو خصوصی اصناف لکھا گیا ہے ان میں "سوتی تکرار" میں مزاح کے جراثیم تلاش کئے گئے ہیں۔

پانچویں اور چھٹے باب میں انداز بیان اور تعریض و تعریض کے عنوان سے مختلف لب و لہجہ اور انداز بیان میں زبان و بیان کی کمزوری میں طنز و مزاح کے وجہ بندی مختلف عنوانات کے تحت کی ہے۔ دو چار سطروں میں تعریف کردی ہے۔

صفحہ ۱۲۳ کے تحت "ادب میں جنسیات" میں ذیلی عنوانات امرد پرستی، لذتیت، عریانیت، حسن و عشق اور فحش نگاری وغیرہ ہیں۔ ان سے عارضی کیف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ اسے طنز و مزاح کے کس خانے میں رکھتے ہیں؟

"چرکنیات" نئی اصطلاح ہے۔ یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ "چرکین" کوئی شاعر ہوا ہے یا یہ فرضی تخلص ہے۔ اس ضمن میں مائل کا کوئی ذکر نہیں۔ جنسی شاعری، لذتیت اور فحش گوئی، عریانیت کے کئی اشعار زبان زد ہیں مثلاً ہنسانے والے اشخاص میں جنگلی، کندہ ناتراش، اجڈ، گنوار، گاؤدی، غیر مہذب، غیر شائستہ بھی شریک ہیں۔ غیر شعوری طور پر ذاتی خوبیوں یا کمزوریوں کی تقسیم اس فن میں کہاں تک مناسب ہے۔ صفحہ ۱۸۱

صفحہ ۱۹۰ طنزیہ مکاتیب کے باب میں غالب کو ایک خاص مقام دیا گیا ہے۔ اور کنہیالال کپور کے ایک مکتوب کے سہارے مرحوم خود بھی اس ادب لطیف کی صف میں شریک ہو جاتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی اور قاضی عبد الغفار خاں جیسے خطوط نگاروں کا ذکر نہیں ملتا۔

صفحہ ۲۱۱ اکبر الہ آبادی کا ذکر صرف ظرافت یا مزاح نگاری میں کیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ ایک ممتاز طنز نگار شاعر ہیں۔ اور ان کی شاعری کا بڑا حصہ طنزیہ ہے۔

صفحہ ۲۲۳ پر مزاحیہ شاعری کے باب میں اکبر الہ آبادی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۹۴ دکنی ادب کی تاریخ کی تکرار مزاح نگاری پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔ وہ کہتے ہیں۔

"ولی پہنچا اور دلی کی زبان پر اثر انداز ہوا۔ ایک دو اشعار کو مثال بنا کر بعض سنجیدہ شعراء کو طنزیہ شاعر بنا دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے یہاں طنزیہ عناصر ملتے ہیں۔

صفحہ ۲۲۲ ڈاکٹر علامہ اقبال ۔

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں   نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

ص۲۲۲ الطاف حسین حالی ؎

شیخ اللہ رے تیری عیاری　　　　کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز

ص۲۲۴ شبلی نعمانی ؎

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا　　　　لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ص۲۲۵ شاد عارفی ؎

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو　گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

ص۲۳۱ میر ؎

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں　　　　تحفۂ روزگار ہیں ہم لوگ

اس باب میں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ ص۲۳۲ پر شاد عارفی کا ذکر دوبارہ آیا ہے۔ مثال میں کوئی شعر نہیں ہے۔ نظموں کا حوالہ دیا گیا ہے۔

ان شعراء کے ادبی مقام کے تعین سے قطع نظر مثالاً ایک دو شعر دینا چاہئے۔ غالب نے کون سا قصور کیا تھا۔ ان کے کئی اشعار ان جذبوں کا اظہار ہیں مثلاً ؎

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ　　پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ص۲۳۲ ایک دو مضامین مکالماتی یا نوک جھونک کی بنیاد پر چند طنزیہ نثر نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں یہ حضرات ہیں۔ ابوالکلام آزاد، احمد ندیم قاسمی، سلمیٰ صدیقی، علی عباس حسینی وغیرہ۔

درج ذیل طنز نگار اور شعراء کا تعارف ناکافی ہے۔ اختصار تفہیم میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

ص۲۳۳ جلال الدین اشک جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی دور کے ممتاز طنز نگار شاعر بھی کی۔ "تشیلان کا انتقام" یہاں ایک سوال اٹھتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا ابتدائی دور اردو ادب میں کس حیثیت کا حامل ہے؟

ص۲۳۴ موسیٰ کلیم برق آشیانوی شاعر بھی ہیں اور اچھے مزاح نگار بھی۔ عبارت سلیس، برجستہ محاورے الفاظ کی بندش، دلکش انداز، ایک تبسم مکرر ارشاد۔

ص۲۳۵ مسرور جمال۔ طنزیہ مزاحیہ مضامین لکھتی رہی ہیں۔ خمار گندم اور ایم اے خان نوجوان مزاح نگار ہیں۔

گستاخی معاف - علی جواد زیدی - ان سے طلنے۔

ص ۲۴۶ بحیثیت مزاحیہ نگار کے ڈاکٹر قمر رئیس، کرشن کمار طور، کنہیا لال کپور، جوابی مکتوب کے طفیل
خواجہ عبدالغفور بھی شامل ہیں۔

اس کتاب میں ترتیب کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ "رشک محل بیگم" کے بعد علامہ یہ نام ص ۲۲۲ پر بھی ہے
ترتیبی شعراء اور نثر نگاروں میں موجود ہے۔

اس کتاب کا نام "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" ہے لیکن طنز و مزاح کی اقسام کی تعریفیں مقرر کرکے
مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔ تنقیدی جائزہ کہیں نہیں لیا گیا۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خامی یہ ہے تمام ابواب میں مرحوم
نے ادب میں ظریفانہ تفریق و تقسیم اور حد بندی نہیں کی۔ بلکہ جس پہلو کو پسند کیا اور جو بھی انداز اسے بھایا دل کھول
کر تعریف کردی۔

پیش لفظ میں مصنف نے پرانے کلاسیکی دور سے حال تک کا جائزہ کوئی اصول کی روشنی میں پیش نہیں
کیا۔ تقسیم اور درجہ بندی کے لحاظ سے تعریف کا اقرار اور تنقید کا فقدان ہے۔ طنز و مزاح کی ادبی تاریخ کا
کوئی تعین نہیں ہوا۔ لیکن اس کتاب کے سبب شاید اس کو سمجھنے اور ادبی پابندیاں مقرر کرنے میں آنے والی نسل
کے لئے ایک راستہ ملتا ہے۔

نہیں ہے جس کی بنیاد پر طالب علم نقاد اور اسکالروں کے کام آئے۔

بقول خود ادب میں پہلی بار اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ لیکن اس میدان میں انھیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

صحافت

صحافت عربی زبان کا لفظ ہے۔ موجودہ عہد میں اس کے معنی اخبار نویسی سے لئے جاتے ہیں۔ اخبار
کی طباعت چھاپہ خانے کی محتاج ہے۔ اس لئے چھاپہ خانے کے قیام کے بعد ہندوستان میں اخبارات کا
سلسلہ شروع ہوا۔ اردو زبان میں صحافت کا سلسلہ بقول امداد صابری ۱۸۵۰ء سے بہت پہلے شروع ہو
چکا تھا۔ [1]

یہ حقیقت ہے کہ اٹھارویں صدی میں ۱۸۱۰ء میں مولوی اکرام علی نے "اردو اخبار" کلکتہ سے جاری
کیا تھا اور انھوں نے ۱۸۱۲ء میں اردو رسم الخط کا پہلا مطبع کا قیام عمل میں لایا۔ مولوی اکرام نے ۱۸۱۰ء

---

[1] تاریخ صحافت اردو - امداد صابری - ص ۵ (حصہ اول)

میں ''جام جہاں نما'' نام سے اخبار نکالا جس کے ایڈیٹر سدا سکھ تھے۔ یہ اخبار ۲۳ جنوری ۱۸۸۸ء میں بند ہو گیا۔ اس کے ایک سال بعد اردو اور فارسی زبانوں میں ایک ہفتہ وار ''شمس'' جاری ہوا۔ ۱۸۳۵ء میں فارسی کے بجائے اردو عدالتی زبان بن گئی۔ اور دہلی میں لیتھوگرافی پرنٹنگ پریس کا آغاز ہوا۔ اس طرح ۱۸۳۶ء سے ''دہلی اخبار اردو'' جاری ہوا جسے ہم خالص اردو اخبار نویسی کا دور کہہ سکتے ہیں۔ یہ اخبار ۱۸۵۷ء تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد ۱۸۳۷ء میں ''سید الاخبار'' دہلی سے چھپنا شروع ہوا۔ پھر ۱۸۴۰ء میں مدراس سے ''جامع الاخبار'' کی اشاعت ہوئی۔

۱۸۴۴ء میں دہلی سے ''نور مشرق''، ۱۸۴۵ء میں سینٹ اسٹیفن کالج کے پروفیسر رام چندر نے ''فوائد الناظرین'' جاری کیا۔ اسی سال پنڈت دھرم نرائن نے ''قران السعدین'' کا اجرا کیا۔ پروفیسر رام چندر نے ایک ماہنامہ رسالہ ''محب ہند'' نکالا جس میں اہم معاملات اور مسائل پر مضامین لکھے جاتے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں آگرہ کا ہفتہ وار ''اسعد الاخبار'' شروع ہوا۔ ۱۸۴۸ء میں مدراس سے ''اعظم الاخبار''، ۱۸۴۹ء میں ''مالوہ اخبار''، اسی دور میں مرزاپور سے ''خیر خواہ ہند'' شائع ہونے لگا۔ ۱۸۵۰ء میں دہلی سے ''دار السلام''، ''گلزار ہمیشہ بہار'' قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام اخبارات ہماری صحافت کے ابتدائی خاکے ہیں۔ جو ۱۸۵۷ء سے قبل کی صحافت کے نمونے ہیں۔ ان میں خبروں کا اجتماع مقصود تھا۔ یہ کسی شعبے کے متعلق کسی خاص پالیسی کے نمائندے نہیں تھے۔ لیکن غدر کے بعد اخبارات کا سلسلہ ایک سیلاب کی طرح رواں دواں ہوا اور اردو اخباروں میں سیاسی مسائل پر بہت احتیاط اور سوچ بوجھ سے قلم اٹھایا جاتا تھا۔

مغربی علوم کی اشاعت پر زیادہ زور دینے سے زبان سادہ اور سہل ہونے لگی۔ ''اودھ اخبار'' ''سائنٹفک سوسائٹی میگزین'' اور سر سید احمد خاں کے ''تہذیب الاخلاق'' نے اپنے دور کی صحافت کو متاثر کیا۔

''منشی نول کشور کا ''اودھ اخبار'' ۱۸۸۵ء میں شروع ہوا۔ اور ''اودھ پنچ'' ۱۸۷۷ء سے جاری ہوا۔

۱۹۰۲ء میں تین اردو روزنامے ''اودھ اخبار''، ''پیسہ اخبار'' اور ''صلح کل'' جاری ہوئے۔

۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے ''الہلال'' کا اجرا کیا۔ اس میں سیاست، مذہب اور معاشرت پر بے باک اور بے لاگ تنقیدی تبصرے ملتے ہیں۔ اسی عہد میں بجنور سے ''مدینہ''، لکھنؤ سے ''ہمدم''، دہلی سے ''ہمدرد'' اور کانپور سے ''آزاد'' جاری ہوئے۔ ۱۹۱۵ء میں ابوالکلام آزاد نے ''البلاغ'' بھی شروع کیا۔ ۱۹۱۹ء میں ''حقیقت'' لکھنؤ سے اور ''پرتاپ'' لاہور سے جاری ہوئے۔

۱۹۰۹ء میں لالہ لاجپت رائے نے "وندے ماترم" اور مولانا ظفر علی خاں نے "زمیندار" نام کے اخبارات نکالے ۱۹۲۳ء مہاشے خوشحال چند نے "ملاپ" سوامی شردھانند نے "تیج" کا اجراء کیا۔ ۱۹۲۷ء میں "سیاست" اور "انقلاب" نامی اخبارات جاری ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے زیر سرپرستی "سرفراز" اور جمعیۃ العلماء ہند دہلی سے "الجمعیۃ" کی اشاعت ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں کلکتہ سے محمد عثمان آزاد نے "انجام" شروع کیا۔ ۱۹۳۷ء میں خوشتر گرامی نے رسالہ "بیسویں صدی" جاری کیا

۱۹۴۵ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی سرپرستی اور قیادت میں لکھنؤ سے "قومی آواز" شائع ہونے لگا۔

اردو صحافت کے ارتقاء کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں اردو روزناموں کی تعداد ۹۷ر تھی۔ جو ہندوستانی زبانوں میں تعداد کے اعتبار سے دوسرا نمبر تھا۔ آج اردو اخبارات اور رسائل کی تعداد ہندی سے زیادہ ہے۔ کیونکہ اس دور میں اخبارات کا سلسلہ علاقائی زبانوں میں محدود ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن اردو زبان ہر علاقے میں مسلمانوں کی نمائندہ ہے۔ اس لئے ہر صوبے سے اردو کے اخبارات اور رسائل کا سلسلہ جاری ہے۔ اور ہندی زبان اپنے علاقوں میں محدود ہوتی جا رہی ہیں اور ہندی سرکاری زبان ہوتے ہوئے بھی اپنے علاقوں کی نمائندہ بن کر رہ گئی ہے۔ آج کل اردو اخبارات کا شمار مختلف ریاستوں میں ساتھ تمام ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد میں پہونچ چکا ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ اور اصول و ضوابط کے موضوع پر کچھ کتابیں ملتی ہیں لیکن موجودہ دور میں صحافت کے جدید تقاضوں کی بنیاد پر تشفی بخش مواد نہیں ملتا ہے۔ پھر بھی کسی حد تک صحافت کی تاریخ اور اصولوں سے واقفیت ہو جاتی ہے اس اعتبار سے درج ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ اردو صحافت کی تاریخ اوّل، دوم، سوم — امداد صابری
۲۔ جنوبی ہند کی اردو صحافت ۱۸۵۷ء سے پیشتر — ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال
۳۔ اخبار نویسی کے ابتدائی اصول — بلجیت سنگھ
۴۔ اودھ میں اردو صحافت — عتیق صدیقی

تاریخ اردو صحافت (حصہ اول)

امداد صابری

تاریخ اردو صحافت جلد اول، امداد صابری کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس میں مغل کے دور سے ۱۸۵۷ء کے قبل تک کی خبر رسانی کے طریقے، اخبارات کی تاریخ اور اردو ایڈیٹروں کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ امداد صابری نے اس کتاب کو جناب حافظ حاجی عبدالحکیم صاحب کے نام معنون کیا ہے اور ان کے مختصر حالات زندگی بھی درج کئے ہیں۔ اس کتاب کے ضرورت تالیف کے بیان کے بعد درج ذیل کتب کا ماخذ میں شمار کیا ہے۔

۱۔ منتو سمرتی
۲۔ تاریخ بھاتی
۳۔ انجیل شریف
۴۔ تزک تیموری
۵۔ تزک جہانگیری
۶۔ قدیم تاریخ ہند عثمانیہ
۷۔ ایڈمنسٹریشن آف سلطنت دہلی
۸۔ طبقات اکبری
۹۔ تاریخ ہند ذکاءاللہ
۱۰۔ ملفوظات خواجگان چشت
۱۱۔ تاریخ الفخری
۱۲۔ زمزم نامہ خیر شاہی
۱۳۔ واقعات دارالحکومت دہلی مولوی بشیرالدین
۱۴۔ مضمون کیفی۔ رسالہ اردو اپریل ۱۹۳۵ء
۱۵۔ ماثرالامراء
۱۶۔ سفرنامہ مطامس راہ
۱۷۔ مغلیہ پالیسی ڈاکٹر سرف
۱۸۔ شیواجی لالہ لاجپت رائے
۱۹۔ انڈین پریس مارگریٹا بارنس
۲۰۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا
۲۱۔ خطبات و مقالات گارساں دتاسی
۲۲۔ مدراس میں اردو
۲۳۔ حیات جاوید۔ مولانا حالی
۲۴۔ مرحوم دہلی کالج۔ مولانا عبدالحق
۲۵۔ تاریخ نثر اردو۔ احسن مارہروی
۲۶۔ نادرات غالب
۲۷۔ عود ہندی، غالب
۲۸۔ شری پیشوا جے مارچتیر
۲۹۔ اسلامک کلچر جنوری ۱۹۳۵ء
۳۰۔ جہاں نما۔ کلکتہ
۳۱۔ آئینہ سکندر کلکتہ
۳۲۔ ماہ عالم افروز کلکتہ
۳۳۔ اخبار لدھیانہ
۳۴۔ سلطان الاخبار کلکتہ
۳۵۔ دہلی اردو اخبار
۳۶۔ سراج الاخبار
۳۷۔ محب ہندوی

۳۸ ۔ فوائد شائقین دہلی ۔۔۔ ۴۴۔ آبِ حیات ۔ محمد حسین آزاد

۳۹ ۔ دھرم جیون لاہور ۔۔۔ ۴۵۔ تاریخ نظم ونثر اردو

۴۰ ۔ نصرت الاخبار دہلی ۔۔۔ ۴۶ ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ربار ی

۴۱ ۔ اردوئے معلیٰ علیگڑھ ۔۔۔ ۴۷۔ تاج التواریخ مولانا نصرت علی

۴۲ ۔ رجسٹر ٹیپو ریسیپر ۱۹۷۴ء۔۱۹۷۶ء ۔۔۔ ۴۸ ۔ غدر دہلی کے اخبار خواجہ حسن نظامی

۴۳ ۔ ہندی جرنلزم ۔ رام ناتھ بھٹناگر ۔۔۔ ۴۹ ۔ مضمون غدر کے چند اخبار ۔ رسالہ اردو برہان

ماخذ کے بعد غدر سے قبل اور بعد کے ان اخبارات کی ایک فہرست دی گئی ہے ۔ جو کتاب کی ترتیب میں مددگار ثابت ہوئے ۔ یہ کتاب ۵۵۲ صفحات پر مشتمل ہے ۔

تاریخ صحافت اردو جلد سوم :۔ مولف نے تیسری جلد میں ۱۸۵۸ء سے ۱۹۰۰ء تک کے اخبارات کی تاریخ ایڈیٹروں کے حالات اور اس دور کے تاریخی سیاسی، سماجی، اور ادبی حالات بیان کئے ہیں۔ حضرت مولانا حسرت موہانی کے نام اس کتاب کو معنون کیا ہے ۔ مولانا کے حالات زندگی ۲۰ صفحات میں ہی بیان کئے ہیں ۔ تالیف کی دقتیں کے عنوان کے تحت دوران تالیف پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کیا ہے ۔

معاون اخبارات پہلی اور دوسری جلد کے علاوہ اس طرح ہیں ۔

۱ ۔ تیرہویں صدی آگرہ شوال ۱۲۵۶ھ شعبان رمضان ۱۲۹۰ھ

۲ ۔ زبانِ آگرہ محرم، صفر، ربیع الاول ۱۳۰۱ھ ۳۔ گلدستہ بہار

۳ ۔ محبوب الکلام حیدرآباد دکن

۴ ۔ محبوب الکلام حیدرآباد دکن یکم ستمبر ۱۳۲۳ھ

۵ ۔ حامی سخن ذی قعدہ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ

۶ ۔ معیار سخن بمبئی دسمبر ۱۹۱۳ء

۷ ۔ ترقی سخن بمبئی جنوری، فروری، مارچ ۱۹۱۲ء

۸ ۔ نہالِ سخن بریلی ۔ فروری ۱۹۱۳ء

۹ ۔ گلدستہ منظر لکھنؤ اگست ۱۹۲۲ء

۱۰۔ ضیاء الاسلام مرادآباد ۵ مارچ ۱۹۱۱ء

۱۱۔ گلدستۂ معیار لکھنؤ جنوری ۱۹۱۲ء

۱۲۔ گلدستۂ معراج سخن مدراس، جون ۱۹۱۵ء

اس کتاب کی ترتیب کے دوران مطالعہ شدہ کتابوں، اخباروں، رسالوں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ بعد ازاں ۱۸۵۷ء تک کے ہفتہ وار روزنامہ اخبارات کی تفصیل جاری کرنے والوں کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے ان کی حالات زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

ہماری زبان میں صحافت کی تاریخیں

٭ امداد صابری ٭

اردو زبان میں صحافت کا سلسلہ بقول امداد صابری ۱۸۳۶ء سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ موصوف نے تاریخ صحافت اردو میں قدیم ہندوستان میں خبر رسانی کے ذرائع وسائل پر بحث کرتے ہوئے مغلوں کے دور سے ۱۸۵۷ء تک کے مختلف اخبارات کا ذکر کیا ہے لیکن پہلے حصہ میں ۱۸۵۷ء سے قبل ہندوستان میں خبر رسانی کے سلسلے پر تحقیقی بحث کی گئی ہے۔ اسی تاریخ کے جلد دوم اور سوم میں ۱۸۵۷ء سے اور ۱۹۰۰ء کے بعد اخبارات کا سلسلہ ہندوستان کی زبان میں شروع ہوا جس میں اردو کو بطور خاص مثال بنایا گیا ہے۔[1] ان تاریخوں میں صحافت کیا ہے؟ ان اصولوں کو مدنظر رکھ کر صحافت کے قوانین کی روشنی میں اخبارات کی تقسیم نہیں کی گئی۔ صرف پرانے اخباروں کو دلیل بنا کر اخبارات کے ناموں سے تاریخی معلومات کو اہمیت دی گئی ہے۔ جیسا کہ تعریف حقائق سے براہ راست آگاہی کا نام ہے۔[2]

اس طرح اردو صحافت کے قدیم دور کا جائزہ لینے میں امداد صابری ناکام نہیں ہیں مگر کامیاب بھی نہیں ہوئے ہیں۔ امداد صابری کی صحافت کی تاریخیں تقریباً چار جلدوں پر مشتمل ہیں۔ کسی علاقہ میں کون سے زمانے میں کون سا اخبار نکلتا تھا یہ معلومات ان میں ملتی ہیں۔ لیکن اخبار اپنے مقاصد اور عوامی نمائندگی کے پیش نظر کتنا کامیاب ہوا یا نہیں ان باتوں کا تسلی بخش جواب نہیں ملتا۔ تاریخ صرف معلومات تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ معلومات کی روشنی میں اصول اور ضوابط طے کر چلتی ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے "تاریخ صحافت اردو" جلد دوم اول۔ امداد صابری[3] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۴ ص ۹۴
[2] ایضاً جلد دوم امداد صابری

عوام میں سیاسی، سماجی، اور معاشرتی کمزوریوں کی وضاحت کرتے ہوئے شعور کو بیدار کرتی ہے
دنیا میں رہنے اور بسنے والی مختلف اقوام ان کی تہذیب، تمدن اور سیاسی شعور اخلاقی بلندیوں پر
صحافت کا جائزہ اپنی قوم یا اپنی زبان سے منسلک قاری اور سامع میں اصلاح کی روح پھونکتا
ہے۔ ساتھ ہی اپنے پیش کردہ مواد سے دوسرے وسائل کو متاثر کرتا ہے۔ ایسے جذبات اور
احساسات کی روشنی میں ہماری صحافت کی تاریخیں کمزور ہیں۔

ان جذبات اور احساسات کے پیش نظر "جنوبی ہند میں اردو صحافت ۱۸۵۸ء سے پیشتر" ڈاکٹر
محمد افضل الدین اقبال کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس تاریخ میں مکمل طور پر تاریخی جائزہ نہیں
پیش کیا گیا۔ اور ذاتی رائے بحیثیت ایک صحافی کے پیش کی گئی ہے۔ اس تاریخ میں دنیا کی مختلف صحافتوں
پر بلا ضرورت بحث کی گئی ہے۔

کتاب کا موضوع "جنوبی ہند میں اردو صحافت" کے عنوان سے انصاف نہیں کیا گیا۔ دنیا کے مختلف
جرائد اور اخبارات کی مثالیں دے کر تاریخ کے مواد میں اضافہ کیا گیا ہے اور مدراس میں اخبارات
اور چھاپے خانے کے عنوانات کو طوالت دی گئی ہے۔

"اخبار نویسی کے ابتدائی اصول" اپنے موضوع کے اعتبار سے بھرپور مواد رکھتی ہے اور صحافیوں
کے لئے ایک مشعل راہ بن سکتی ہے۔ اخبار نویسی میں صحافی کے فرائض اور مختلف ذرائع سے
اخبارات کو کامیاب کے ساتھ چلانے کا مشورہ اصول اور ضابطے کی روشنی میں بہت اچھے انداز
سے پیش کیا گیا ہے۔ تصاویر کے ذریعہ بعض چیزوں کا اظہار تدریسی عمل کا فرض پورا کرتا ہے۔

بلجیت سنگھ نے اس تصنیف میں غیر ضروری تاریخی معلومات کا رعب بٹھانے کی کوشش نہیں
کی۔ بلکہ صحافی اور صحافت کے تحت مند اصول بتا کر اردو صحافت کی تاریخ میں ایک اصولی تصنیف کا
اضافہ کیا۔ صحافت کے فرائض اور صحافی کا فرض اس بات کو دھیان میں رکھ کر مصنف نے ہر موضوع
کا آغاز کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ کتاب بیجا طوالت سے بچ گئی۔ اور اپنے اصول کی روشنی میں
ایک بہترین مختصر تاریخ بن گئی ہے۔

روحِ صحافت

امداد صابری

اردو صحافت کی تاریخ میں امداد صابری کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں صابری صاحب نے اردو صحافت میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ انھوں نے تاریخ کے ساتھ صحافت کے باریک نکات اور طریقہ کار کو اجاگر کرکے ادبی دنیا میں اپنے آپکو زندۂ جاوید کرلیا ہے۔

زیر نظر کتاب روحِ صحافت ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی بدولت اخبارات اور رسائل کی تاریخ کی بہت سی گمشدہ کڑیوں کو ملانے میں مصنف کامیاب ہوگئے ہیں۔ مولانا نے پچھلی صدی کے اخبارات اور رسائل کی تاریخ چھان بین کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے اور اخبار نویسوں کے حالاتِ زندگی بھی اس میں شامل کرلئے ہیں۔

یہ تصنیف تیرہ مضامین پر مشتمل ہے۔

۱۔ حضرت مولانا نامر جلال صاحب کے مختصر حالاتِ زندگی

۲۔ سببِ تالیف

۳۔ اردو اخبارات و رسائل کا آغاز اور ان کی نوعیت

۴۔ اردو اخبارات کے ابتدائی عہد کے حالات و مسائل

۵۔ قدیم علمی و صنعتی انجمنوں کے اخبارات و رسائل

۶۔ چند حریت پسند اخبار

۷۔ چند اخبار و رسائل جن کا ذکر تاریخ اردو صحافت میں نہیں ہے۔

۸۔ انگریزوں کا ہندوستانیوں کے ساتھ توہین آمیز سلوک

۹۔ اینگلو انڈین اخبارات کی ہندوستانیوں اور ان کے اخبارات سے مخالفت

۱۰۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی کہانی، کوہ نور لاہور کی زبانی

۱۱۔ ہندوستانی اخبارات قانونی شکنجے میں

۱۲۔ حجاز کی صحافت   ۱۳۔ حرفِ آخر

مندرجہ بالا عنوانات کے تحت ہر مضمون اردو صحافت کے قدیم طریقۂ کار، مسائل اور عصری حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ صحافت کی تاریخ کو نمایاں کرتا ہے نیز صحافت کی زبان، صحافی کی کاوش

اور گوشوں اور صحافی کے کردار کا آئینہ دار ہے۔ ان مضامین سے جہاں صحافت کی تاریخ ہم پر عیاں ہوتی ہے۔ وہیں غلامی سے نجات تک ہماری صحافت کی خامیاں اور خصوصیات بھی روشن ہوتی ہیں۔

قدیم عہد میں ضرورت کے مطابق اخبار و رسائل کی اشاعت وقتی تقاضوں کے پیشِ نظر اخبارات و رسائل کا اجراء حالات اور اقدار کی تبدیلی کے باعث اخبارات و رسائل میں ادبی، سیاسی، سماجی، معاشی افکار کا ذخیرہ صنعت و حرفت کے موضوع، تاریخ و جغرافیہ کی معلومات پر مبنی مضامین کا ذخیرہ تھے۔ امداد صابری نے ان مضامین میں شامل کئی باتوں کو اپنی پچھلی تصانیف "تاریخ صحافت اردو" میں زیرِ بحث لایا ہے لیکن تصنیف میں ان باتوں کا اعادہ نئے گوشوں کی تلاش لئے ہوئے ہے۔

روحِ صحافت میں بقول مصنف یہ بیان غور طلب ہیں۔

"روحِ صحافت کے پانچویں مضمون چند اخبارات و رسائل کا ذکر "تاریخ صحافت اردو" میں نہیں ہے۔ ان کی ترتیب دینے میں مجھ کو جناب تنویر علوی صاحب دہلی کالج نے بڑی اعانت فرمائی۔"[۱]

آگے چل کر مصنف نے لکھا ہے۔

"تاریخ صحافت اردو" میں ان مذکورہ اخباروں میں "اخبار سفیر پنجاب" "لاہور" اور "مطلع الانوار گوجرانوالہ" ایسے تھے جن کا ذکر تاریخ صحافت اردو کی پہلی جلد میں نہیں تھا۔ ان اخبارات سے میں نے استفادہ کیا۔ اور کچھ مفید مطلب چیزیں اخذ کیں۔"[۲]

ان بیانات سے مصنف کا مقصد واضح ہوجاتا ہے۔ اس کے باوجود مصنف کا یہ اعتراف ہے۔

"روحِ صحافت" میں میں نے حسب ذیل چار مضامین کا اضافہ کیا ہے۔

۱۔ انگریزوں کا ہندوستانیوں کے ساتھ توہین آمیز سلوک

۲۔ اینگلو انڈین اخبارات کی ہندوستانیوں اور ان کے اخبارات سے مخالفت

۳۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی کہانی کوہِ نور لاہور کی زبانی

۴۔ ہندوستانی اخبارات قانونی شکنجے میں۔"[۳]

ان مضامین کی افادیت کا اندازہ ہماری صحافت کی تاریخ پر غور کرنے سے بخوبی ہوجاتا ہے اس کتاب میں "حجاز کی صحافت" کے زیرِ عنوان مضمون کتاب کی انفرادی حیثیت کو برقرار رکھتا ہے۔ کیونکہ اس مضمون کے مطالعہ سے ہم عرب کی صحافت کی تاریخ اور صحافت کے طریقۂ کار سے متعارف ہوتے ہیں۔

۱۔ روحِ صحافت۔ مولانا امداد صابری۔ ص۳۳۶

۲۔ ایضاً ص۳۳۸

۳۔ ایضاً ص۳۴۴

حالانکہ اس مضمون کا تعلق ہماری صحافت سے نہیں تاہم پریس کے تقاضوں کو پورا کرنے کا فرض عائد ہوتا ہے لیکن ہماری صحافت کا جہاں یورپین صحافت سے کئی معاملات میں سمجھوتا ہوا ہے وہاں عرب صحافت کی تاریخ پر سرسری نظر رکھنا کیا برا ہے۔

روحِ صحافت کا مطالعہ یکسوئی کا متقاضی ہے۔ اردو صحافت کی دنیا میں یہ ایک مفید اضافہ ہے۔

جنوبی ہند میں صحافت کی تاریخ

ڈاکٹر افضل الدین اقبال

مؤلف ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال نے اس تاریخ میں ۱۸۵۷ء سے پہلے جنوبی ہند میں صحافت کی تاریخ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس کا "پیش لفظ" ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ ریڈر جامعہ عثمانیہ نے لکھا ہے کر دیباچہ میں کتاب کی کاوش کے دوران جن لوگوں سے مدد لی گئی۔ مؤلف نے ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔

تاریخ کا آغاز "صحافت کیا ہے"؟ سے ہوتا ہے۔ اس میں صحافت کا تعارف ہے۔ لیکن یہ موضوع سے ہٹ کر دنیا کی صحافت کے آغاز کی کہانی ہے جس میں ہندوستان کی صحافت کا آغاز شمالی ہند میں انگریزی صحافت کی ابتداء، مدراس میں صحافت کی ابتداء، بمبئی میں صحافت کی ابتداء اور حیدرآباد، بنگلور، میسور میں صحافت کی ابتداء، علاقائی زبانوں کی صحافت کی ابتداء، ہندوستان اور جنوبی ہند میں فارسی اخبارات کی ابتداء کے ابواب قائم کئے گئے ہیں۔

ہندوستان میں اردو صحافت کی ابتداء تاریخ کا دوسرا باب ہے جس میں بنارس، لکھنؤ، لاہور، سیالکوٹ، ملتان، بمبئی، بنگلور، حیدرآباد میں طباعت و اشاعت کی تاریخ کے ساتھ شہری پیمانے پر نکلنے والے اخبارات پر تبصرہ ہے۔

اصل موضوع بعد میں زیر بحث اس عنوان سے آیا ہے "جنوبی ہند میں اردو صحافت کی ابتداء" اس باب میں مختلف گوشوں سے مصنف نے ابتداء کیا ہے۔

صفحہ ۷۴ سے "مدراس کے قدیم اردو اخبارات" کا باب شروع کیا گیا ہے جس کا سلسلہ صفحہ ۱۰۶ تک جاری ہے۔ پھر جنوبی ہند کی قدیم اردو کا ایک جائزہ کے بعد چھاپے خانوں کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے جس کا احاطہ صفحہ ۱۵۰ تک ہے۔ اس کے بعد مدراس کے قدیم مطابع کا سلسلہ ۱۱۹ تک ہے۔

مؤلف نے اپنے مقالے "مدراس میں اردو" کا خاصہ مواد اس کتاب میں شامل کر لیا ہے۔ مطالعہ کے بعد کاوش کی قدردانی کا خیال کبھی پیدا نہیں ہوتا۔

اخبار نویسی کے ابتدائی اصول :- بحیثیت سنگ میل کی کاوش کا تیجہ ہے۔ اس کتاب میں صحافت کی خصوصیات کے ساتھ نامہ نگار کی خصوصیات میں خبر دینے کے اصول اور ضابطوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اور صحافی کو موضوع پر عنوان کس طرح قائم کرنا چاہئے بتایا گیا ہے۔ خبروں کی اقسام اور علاقائی گشت کے ذریعہ خبریں حاصل کرنے پر بھی معقول تبصرہ ہے۔ اشتہار روزانہ اخبار کے لازمی اعمال چھپائی اور پس منظر پر بھی اچھا تبصرہ ہے۔ مجموعی اعتبار سے مختصر اور مفید تاریخ ہے۔ جو اصول اور ضابطے کی روشنی میں اچھی ثابت ہوگی۔

تبصرہ نگاری

تبصرہ نگاری کا فن تنقید سے مختلف ہے۔ لیکن کلیم الدین احمد نے کہا ہے کہ

"یہ تنقید کی ایک شاخ ضرور ہے" [1]

اردو تنقید میں ایک نظریہ کے مطابق جملہ محاسن و عیوب کا اظہار کیا جاتا ہے اور نظریہ کو بنیاد بنا کر اصلاح کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ تبصرہ نگار زیر تبصرہ عناصر پر چند اہم باتیں لکھتا ہے۔ مثلاً کسی کتاب پر تبصرہ کے دوران تبصرہ نگار ایسی باتیں بیان کرتا ہے جس سے اندازہ ہو جائے کہ زیر تبصرہ کتاب کا مختصر تعارف، مختلف لوازمات حاصل کیا ہے۔

تعارف پیش کرنے کے لئے کچھ تنقیدی خیالات کا سہارا بھی ضروری ہے۔ لیکن اسے باقاعدہ تنقید کا دفتر نہیں کھولنا چاہئے۔ اس بنیاد پر کہہ سکتے ہیں۔ تبصرہ نگار کتاب کا تعارف یا زیر تبصرہ شخصیت کا تعارف اس انداز سے کرتا ہے کہ مختصراً محاسن و معائب سے واقفیت ہو جائے اور ساتھ ہی اس میں پیش کئے ہوئے حالات و معاملات کا پتہ چل جائے۔

تبصرہ نگار کسی نظریے یا مقصد کے تحت اس عمل پر کاربند ہوتا ہے لیکن اسے مطلقاً تنقید نہیں کہہ سکتے۔ اردو میں تبصرہ نگاری کا آغاز غدر کے بعد ہوا ہے۔ اس صنف کو حالی نے سب سے پہلے تقویت پہنچائی ہے۔ حالی نے اخبارات و رسائل پر بہت سے لاگ تبصرے کئے ہیں جنہیں "مقالات حالی" میں دیکھا جا سکتا ہے۔

---

[1] اردو تنقید پر ایک نظر۔ کلیم الدین احمد ص ۲۳

ان کے تبصروں میں عام طور پر خصوصیات کا اظہار ہوا ہے۔ اور دوسرے نقادوں نے اسی طرز کو اپنایا
مہدی افادی کی تبصرہ نگاری اسی نہج کی گواہی دیتی ہے۔ ان کے بعد بابائے اردو عبدالحق، پنڈت کیفی
پروفیسر محمود شیرانی، پروفیسر مسعود حسن رضوی، حامد حسن قادری، سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی
ان ادباء نے تبصرہ نگاری میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ لیکن ان محققین میں عبدالحق نے شعوری طور پر
اس فن کو قدآور بنایا۔

تبصرہ نگاری کی تاریخ میں عبدالحق کا رسالہ "اردو" ایک اہمیت کا حامل ہے عبدالحق نے اس
رسالے میں اپنے عہد کی تمام شائع شدہ تصانیف ادبی و نیم ادبی تاریخیں سیاسی، سماجی سب پر بے لاگ
تبصرہ کیا ہے اور اپنے لکھنے والوں سے بھی ایسے ہی تبصرے کرائے ہیں۔ ان کے تبصروں میں ادبی بددیانتی کا
معمولی گمان بھی نہیں ہوتا۔ ان کے بعد ترقی پسندوں کی ایک نسل نے اپنے نظریات کے مطابق تبصرہ نگاری پر
توجہ دی ہے۔ ان میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری وغیرہ ہیں۔ لیکن ان کی تبصرہ
نگاری میں اشتراکیت اور مارکسیت تنقید کی لہریں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے تبصرے "نیا ادب" میں شائع ہوتے
تھے[1] اس کے علاوہ ہمایوں، ادبی دنیا، ادب لطیف، جامعہ، معارف، نگار، ساقی، آج کل میں معیاری
تبصرے شائع ہوتے ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی، وقار عظیم آبادی کے تبصرے بعض رسائل میں ملتے ہیں۔ موجودہ عہد میں
نقادانِ سخن اور محققینِ ادب میں آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، خورشید الاسلام، خلیل الرحمٰن
اعظمی مرحوم، محققین میں ڈاکٹر قاضی عبدالودود، رشید حسن خاں، ڈاکٹر شیخ فرید وغیرہ کے تبصرے تحقیقی
رسائل میں تحقیقی کتابوں پر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس عہد میں تنقید نگار اور محقق اکثر و بیشتر رسائل
میں تبصرہ کرتے ہیں جن میں آجکل، شاعر، شب خون، آہنگ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری
کے فن پر فنی معیار کے مطابق فی الحال ایک ہی کتاب موجود ہے۔

۱۔ کتاب شناسی ظ۔ انصاری

کتاب شناسی

ظ۔ انصاری

---

[1] اردو تنقید کا ارتقاء۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۲۴۲

ظ انصاری کی کتاب "شناسی" ۳۰۳ صفحات پر مشتمل تبصرہ نگاری کے فن کی نمائندہ ہے۔ کتاب کی ابتداء "من کہ یک تبصرہ نگار" سے ہوئی ہے جس میں تبصرہ نگار نے اپنی تبصرہ نگاری کی داستان قلمبند کی ہے۔ اور اس فن پر اپنے مطالعہ کی روداد چند حوالوں کی وساطت سے پیش کی ہے۔ مصنف کے ذیل کے جملے کتاب کی تفصیل اور تعارف کے شاہد ہیں۔

"کوئی دو سو کتابوں کے تبصرے جو مختلف تبصروں اور اخباروں میں خصوصاً "اردو بلٹز" میں "خدا لگتی" کے عنوان سے چھپے تھے۔ اور بعض اشتعال انگیز بھی ثابت ہوئے تھے۔ جمع نہ ہو سکے تو میں نے الگ الگ ذات برادری کے کوئی سو تبصرے چھانٹ لئے۔ اور یہاں چن دیئے۔ ان میں سے بعض کو "تبصرے" کے خانے میں رکھنا بے اصولی سمجھا جائے گا۔"[۱]

تبصرہ نگار نے اس بیان کے بعد تبصرہ نگاری کے فن کی تاریخ پر مختصر مگر جامع تبصرہ کیا ہے۔ مختلف کتابوں کے مقدمات/رسائل سے ماخوذ تبصروں کے ضمن میں سر عبدالقادر، حسرت اور عبدالحق کا تذکرہ کیا ہے۔ رسائل میں اودھ پنچ، اردوئے معلیٰ، رسالہ اردو، نگار، معارف، جامعہ، اور ادبی دنیا" میں شائع شدہ تبصروں کو سراہا ہے۔ ان کے علاوہ آجکل، تحریک، گفتگو، شب خون، معیار وغیرہ کے تبصروں کی ستائش کی ہے۔

مصنف نے تبصرہ نگار کے فرائض اور تبصرہ نگار کا کام کے باب میں تبصرہ نگاری کے اہم نکات بتا کر تعارفی، علمی، تعریفی تبصروں کے نکات کا تعین کیا ہے۔ جو مصنف کی سوجھ بوجھ کا ثبوت ہے۔ تبصروں کے نکات میں مصنف کا نظریہ واقعی قابل تعریف ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"سکڑے تو تبصرہ، پھیلے تو تنقیدی مقالہ یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ اور دوسرا نکتہ اسی کے ساتھ یہ کہ تبصرہ میں تبصرہ نگار خود کو اتنا نمایاں کرے کہ جتنا کتاب کے تعارف کے لئے اور اس کی پہچان میں ناپ تول، جانچ پڑتال یا یوں کہئے کہ مرتبان پر قیمت وغیرہ کا لیبل لگانے کے لئے لازم ہے۔"[۲]

تبصرہ نگار نے ان نکات کی روشنی میں ملک کے چیدہ زیادہ معروف اور کم غیر معروف لکھنے والوں میں ناول نگاروں کے ناول، رسائل کی کارکردگی، شعراء کے مجموعے، نقادوں کے تنقیدی مجموعے، مؤلفین کی تالیف، انشائیوں کے مجموعے وغیرہ بے لاگ تبصروں سے زیر تبصرہ کتابوں میں اردو

---

[۱] کتاب شناسی - ظ انصاری ص ۱۔
[۲] ایضاً ،، ص ۴۶

پھونک دی ہے۔ لیکن کچھ شعراء اور ادباء سے ادبی مروت اور ادبی رو داری کا حسن سلوک روا رکھا ہے۔ مثلاً قیصر الجعفری کے کلام میں ترنم اور غنا کی تعریف (صفحہ ۲۸۱ تبصرہ سنگ آشنا) رؤف خیر کے اقرار میں تکرار کی شکایت (صفحہ ۲۰۹) بیکل کی فنکارانہ پہچان کا اعتراف (۲۸۲) کئی کتابوں اور مجموعوں پر دو ٹوک فیصلہ قاری کو متفق کرنے میں مددگار نہیں ہوتا۔ ان خامیوں کے باوجود تبصرہ کے فن پر یہ کتاب تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ تبصرہ نگاری کے فن پر اس سے قبل اس نہج کی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔

انشائیہ نگاری

انشائیہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے انگریزی لفظ ESSAY کا بدل ہے یعنی کسی موضوع پر کوشش کرنا، مکمل اور جامع تفتیش اس کا مقصد نہیں ہے بلکہ زندگی کے کسی پہلو سے منسلک چند گوشوں کو سنجیدگی اور متانت سے ابھارنا، منظر عام پر لانا۔

انشائیہ، مضمون، مقالہ اور تنقید میں بنیادی اور اصولی فرق ہے۔ ان میں ہر صنف اپنے مقاصد کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ مثلاً مضمون میں زندگی کے ہر شعبے سے بحث کی جا سکتی ہے۔ علمی، معلوماتی، سیاسی، مذہبی اور نفسیاتی وغیرہ۔ لیکن انشائیہ میں مضامین کی طرح فلسفیانہ ٹھوس مواد نہیں ہوتا۔ بلکہ انشائیہ مضمون نگاری کا ایسا پہلو ہے جس میں مصنف اپنے ذاتی اور انفرادی تجربات کو پیش کرتا ہے اور اس پیش کش میں اپنی شخصیت کو نمایاں کرتا ہے۔ اس طرح انشائیہ میں ایک قسم کا داخلی رنگ پایا جاتا ہے اور مضمون نگاری پر خارجی ماحول کے اثرات ہوتے ہیں اسی طرح انشائیہ اور مقالہ میں اسلوب کا فرق ہوتا ہے۔ تنقید اور انشائیہ کے اسلوب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

دنیائے ادب میں انشائیہ اہم صنف تسلیم کی جاتی ہے عصر حاضر میں افسانہ کی مقبولیت کا راز اختصار ہے وہی معاملہ انشائیہ کی مقبولیت کا ہے۔ لیکن انشائیہ اپنے اسلوب میں مختلف رنگ سے نمایاں ہوتا ہے۔ زندگی کے پیچیدہ اور سنگین مسائل کو ظریفانہ انداز بیان سے سنجیدگی پر مائل کرنے والی صنف ہے۔ جو چند لمحات کے لئے دنیاوی تفکر سے نجات دلا کر تھوڑے وقفہ کے لئے جمالیاتی موجوں میں غرق کر دیتی ہے۔

انشائیہ اظہار خیال کے لئے اچھی صنف ہے۔ لیکن اردو ادب میں اپنے صحیح مقام پر نہیں ہے۔

اس میں اختصار کی بنیاد پر اسلوب کے سہارے ذاتی تجربہ کا بیان جامعیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور ہر کوئی اس میدان میں مشق آزمائی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے اختصار میں جامعیت پُر مغز اور بصیرت افروز باتیں ہوتی ہیں انشائیہ میں مصنف کی شخصیت کا عکس ہونا چاہئے۔ یہ ذاتی اور داخلی وسائل سے شخصیت اور روح کی جلوہ گری کا عکس بن جاتی ہے۔ انشائیہ ذاتی تجربہ کا اظہار ہے جس میں ٹھوس، دقیق، علمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور سائنسی مباحث سے پرہیز کیا جاتا ہے اور ان باتوں کا پابند رہ کر انشائیہ نگاری ہر ادیب کے بس کی بات نہیں ہے۔

انشائیہ اپنے اسلوب کی روشنی میں فرحت کا ذریعہ ہے۔ انشائیہ نگاری کا مقصد انبساطی اور نشاطی مسرت اور لذت کا ضمانت دار ہے۔ عنوان کے لحاظ سے انشائیہ جدید اور عوامی ہوتا ہے۔ جو اپنے انکشاف پر شگفتگی اور رنگین بیانی سے انوکھا اور دلکش ہوتا ہے۔ انشائیہ میں اشاریت اور رمزیت بھی ہوتی ہے جس سے قاری متاثر ہوتا ہے۔ اور فرحت بھی حاصل کرتا ہے۔ انشائیہ میں اختصار کو طوالت پر، غیر منظم انداز کو منظم انداز پر داخلی تجربات کو خارجی اور نظریاتی بحث پر، اسلوب میں فرحت و انبساط پر ظریفانہ انداز بیان علمی، ادبی اور تحقیقی طرز بیان پر فوقیت دی جاتی ہے۔

اردو ادب میں قدماء کے یہاں محمد حسین آزاد کی تصانیف آبِ حیات اور نیرنگِ خیال میں بعض مقامات پر انشائیہ کا رنگ ملتا ہے۔ جس کو ہم شعوری انشائیہ نگاری کی تیکنیک نہیں کہہ سکتے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے یہاں "چند ہم عصر" میں بعض جگہوں میں انشائیہ کا عکس نظر آتا ہے۔ نیاز فتحپوری کی نگارستان میں انشائیہ کی خصوصیت موجود ہے۔ سجاد حیدر یلدرم کے یہاں یہ فن ان کے اسلوب میں نکھر گیا ہے۔ غالب کے خطوط کے کئی جملے اور حصے انشائیہ کی گواہی دیتے ہیں۔

سرسید کے یہاں "تہذیب الاخلاق" رسالے میں مضامین میں زور استدلال کی کرشمہ سازی کئی مضامین کو انشائیہ نگاری میں شمار کر سکتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے مضامین دیا سلائی، آسمان کی آواز، سیم لا، گلاب تمہارا کو انشائیہ کی صنف میں شمار کر سکتے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کو بھی انشائیہ نگاروں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ نذیر احمد کا حلیہ اور ایک وصیت کی تعمیل اس کے گواہ ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے کئی مضامین انشائیہ نہیں لیکن انشائیہ سے قریب ہیں۔ کرشمۂ قدرت، چڑیا چڑے کی کہانی، فطرت کی بزم نشاط، حکایات بادہ تریاقی بہترین مثالیں ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے کئی مضامین انشائیہ کے عمدہ نمونے کہے جا سکتے ہیں ان کے انشائیہ میں ظرافت کا رنگ غالب ہے۔ کرو اور استحانات وغیرہ میں انشائیہ کی رنگین جھلک موجود ہے۔ احمد شاہ بخاری پطرس کو بھی انشائیہ نگاروں کی صف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

لاہور کا جغرافیہ کتے وغیرہ "پطرس کے مضامین" میں کئی مضامین انشائیہ کی نہج پر ملتے ہیں۔

دورِ حاضر میں ہندوستان و پاکستان میں اچھے انشائیہ نگاروں وزیر آغا، مشتاق یوسفی، ابن انشاء، وزیر آغا وغیرہ کے انشائیہ قابل مطالعہ ہیں۔

ہمارے یہاں اس صنف پر کچھ کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس میدان میں مزید لکھنے کی گنجائش ہے۔ انشائیہ پر درج ذیل کتابیں موجود ہیں۔

۱۔ اردو ایسے	ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی
۲۔ انشائیہ	محمد حسنین
۳۔ اردو میں انشائیہ نگاری	ڈاکٹر آدم شیخ
۴۔ اردو انشائیے	ڈاکٹر وزیر آغا

انشائیہ

ڈاکٹر آدم شیخ

ڈاکٹر آدم شیخ کی شخصیت خصوصاً بمبئی کے ادبی حلقے میں محتاج تعارف نہیں۔ موصوف برہانی کالج میں پروفیسر کے فرائض انجام دے رہے تھے اور بمبئی یونیورسٹی میں بورڈ آف اسٹڈیز کے چیئرمین کی حیثیت سے اردو کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ "انشائیہ" موصوف کی اہم تصنیف ہے جس کی اہمیت عرض ناشر کے اس بیان سے واضح ہے۔

"اس مجموعہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انشائیہ نگار کا بھی اردو ادب میں ایک مقام ہوتا ہے جس کا اب تک کھل کر اعتراف نہیں کیا گیا۔"[1]

یہ کتاب صنفِ انشائیہ کی تاریخ اور تنقید کا آئینہ ہے۔ اور ۲۰۲ صفحات پر محیط انشائیہ کے موضوع کی تعریف اور اصولوں کی روشنی میں تنقید و تبصرہ کا فرض پورا کرتی ہے" اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں"

---

[1] انشائیہ ڈاکٹر آدم شیخ ص ۹

سے کتاب کی ابتداء ہوتی ہے جس میں مصنف کا اعتراف ہے کہ

"انشائیہ میری پہلی تالیف ہے۔ اپنی ناتجربہ کاری اور ناپختگی کے باوجود میں نے بُرے بھلے خیالات کو اہل علم وادب نواز حضرات کے سامنے پیش کرنے کی ہمت کی ہے مجھے اس کا مکمل اعتراف ہے کہ "انشائیہ" کے مواد کی ترتیب اور انداز بیان کو ایک مبتدی طالب علم کی کوششوں سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔" ۱ے

اس انکساری کے ساتھ "خط وخال" کے باب میں انشائیہ کی شناخت اور حدود کے تعین کے لئے نیاز فتحپوری، احتشام حسین، سید صفی مرتضیٰ، عبدالماجد دریابادی، اصغر گونڈوی، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، اختر علی عبادت بریلوی کے خیالات نقل کئے ہیں۔

مغربی ادیبوں میں جانسن کی تعریف کو ادب میں زیادہ اہمیت دینے کی وجہ بتائی ہے۔ اسی ضمن میں انشائیہ نگار کے مزاج اور فرائض کی نشاندہی کی ہے۔ "فکر وفن کے رشتے" میں موصوف نے عربی وفارسی ادب کے قرون وسطیٰ کے عہد کے خطوط، مقالاتِ حمیدی اور قابوس نامہ کے نقل شدہ جملوں کو انشائیہ کی ابتداء لکھا ہے۔ در یورپ کے مانٹین، بیکن، تھامس، جانسن، چسٹرٹن وغیرہ سے فکری رشتے کو اردو کی انشائیہ نگاری کا فکری ورثہ ثابت کیا ہے۔

"نئے اور پرانے چراغ" میں اردو کے انشائیہ کی ابتداء سرسید سے بتایا ہے۔ محمد حسین آزاد، شرر، نیاز فتحپوری، ناصر علی، مہدی افادی، سجاد انصاری، خلیقی، خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، مشتاق احمد یوسفی، ڈاکٹر وزیر آغا، اور احمد جمال پاشا وغیرہ کی انشائیہ نگاری کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ مختصراً لیکن جامع انداز میں لیا ہے۔ اور مذکورہ انشائیہ نگاروں کے بہترین انشائیوں کا انتخاب [illegible] تا [illegible] موصوف کی غائر نظری ثبوت ہے۔

ڈاکٹر آدم شیخ کی یہ تالیف اپنے موضوع کے حدود میں مختصر تنقید کے باوجود منظم تاریخ کہی جاسکتی ہے۔ جس سے انشائیہ نگاری کی ابتداء سے لے کر عہد حاضر تک کے انشائیہ نگار سامنے آجاتے ہیں۔

صنف انشائیہ اور چند انشائیے

ڈاکٹر سید محمد حسنین

۱ے انشائیہ۔ ڈاکٹر آدم شیخ۔ ص۱۳

ڈاکٹر سید محمد حسنین کی تصنیف "انشائیہ اور چند انشائیے" ایک جامع مقالہ ہے اس میں صنف انشائیہ کی
جامع تاریخ و توصیف، انشائیہ نگار کے فرائض اور صنف انشائیہ کا دیگر اصناف سے موازنہ پیش کیا
گیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ تاثر کے بیان سے واضح ہے۔

"اس مجموعہ کو پیش کرتے ہوئے ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ اس سے پہلے اس صنف پر ایسی جامع
عالمانہ اور واضح نگاہ نہ ڈالی گئی تھی۔ انشائیہ نگاری پر ڈاکٹر سید محمد حسنین کا بصیرت افروز
اور پُر مغز مقالہ ہمارے ادبی شعور کے ایک بند دریچہ کو کھول دیتا ہے۔ اس مقالہ میں ادبی
اور غیر ادبی تحریروں کی جیسی شناخت کرائی گئی ہے۔ اور فن و معیار کی جیسی اہم قدریں
موصوف نے ہمارے سامنے رکھی ہیں اس کا اندازہ اس کے مطالعے سے ہو سکے گا۔"[1]

مصنف نے حتی الامکان کوشش کی ہے صنف انشائیہ کی وضاحت ہو جائے۔ اسی بات کے پیش
نظر انشائیہ کا انتخاب مولانا محمد حسین آزاد سے شاہ اکبر علی اکبر قاصد تک کیا گیا ہے۔ اردو کے معروف اور
غیر معروف انشائیہ نگاروں کے انشائیوں کا انتخاب ہے۔

اس کتاب کا مقدمہ ۴۲ صفحات پر محیط ہے۔ نثری ادب کی اس خاص صنف انشائیہ کی اصطلاحی
تعریف کی ہے۔ کہانی کی مختلف صورتوں سے بحث کرتے ہوئے مضمون (انشائیہ) کی وضاحت کی ہے۔
اس میں جن باتوں پر تنقید کی گنجائش ہے ان کا نمایاں ذکر ہے۔

انشائیہ اور مقالے کے فرق کو واضح کیا جائے۔ انشائیہ نگار، مقالہ نگار اور شاعر کے لئے لازمی
شرائط کیا ہیں بیان کئے ہیں۔ انشائیہ کی وسعت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انشائیہ نگار کے لئے موضوع
کی کوئی پابندی نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ یہ بصیرت افروز پُر مغز مقالہ ہے۔ ہمارے ادبی شعور کو بیدار کرتا ہے۔ نئے قلمکاروں
کے لئے چراغ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

رپورتاژ کی صنف

لفظ "رپورتاژ" انگریزی سے اردو زبان میں آتا ہے۔ اس کا لغوی مفہوم روداد یا واقعہ نگاری ہے۔
لیکن بحیثیت ایک فن یا صنف کے اس کا مفہوم کسی کانفرنس کی روداد، ذاتی تجربے کی تفصیل، کسی خبر کو افسانوی
اسلوب، ناول کی طرز یا کہانی کی ہیئت میں لکھا جائے۔ عہد قدیم میں "رپورتاژ" کی جھلکیاں فرشتہ اور بیگ کی

---

[1] صنف انشائیہ اور چند انشائیے۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین۔ ص

تصنیف "دلی کا آخری یادگار مشاعرہ" کے خیالی پیکر میں ابھرتی ہیں۔ لیکن ہم اسے رپورتاژ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اس روداد کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ رپورتاژ کسی کانفرنس، جلسے، ذاتی تجربے یا خبر کی حقیقت کی افسانوی روداد ہے۔ قاری پر اس کے مطالعہ سے عیاں ہو جائے کہ یہ کسی واقعہ، کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال اور لکھنے والے کے تجربے کی اہم روداد ہے۔

اس طرح افسانہ، ناول، کہانی سے یہ ہیئت مختلف ہو جاتی ہے۔ فسانہ، ناول، کہانی میں کسی واقعہ میں حقائق اور مقاصد کے عناصر کا ہونا شرط نہیں ہے۔ نہ ہی کسی واقعہ کی پیش کردہ روداد کے مقاصد کا عمیق مشاہدہ شرط ہے۔ اردو ادب میں یہ صنف نوعمری کے دور میں عروج پر آئی اور زوال پذیر ہو گئی کیونکہ اس صنف کا وجود ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھا۔ اور اس تحریک کے بعد اس پر کسی کی توجہ نہیں ہے۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس۔

"ایک ادا، مستقل نثری صنف کی حیثیت سے اردو میں رپورتاژ نگاری کا وجود ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ اسی تحریک کے زیر سایہ اس نے آغاز و ارتقاء کے مراحل طے کر کے اپنے علاحدہ وجود کو منوایا ہے اور جدید نثری ادب میں اپنی ضرورت اور اہمیت کا سکہ جما لیا ہے۔"[۱]

مندرجہ بالا بیان کی تصدیق عبدالعزیز کے بیان سے ہوتی ہے۔

"اس طرح ترقی پسند مصنفین نے مروجہ نثری بیانیہ کی کوکھ سے ایک نئی صنف کو تخلیق کیا۔ اور یہ اس تحریک کا تاریخ ساز کارنامہ ہے کہ موضوعات کے مسائل، ہیئت، اسلوب اظہار کی کائنات کے ساتھ ساتھ ایک نئی صنف کا اردو ادب میں اضافہ کیا۔ دنیا کی تحریکات میں بیسویں صدی میں شاید ہی کسی تحریک کو یہ فخر حاصل ہوا ہو کہ اس نے نئی صنف کی ایجاد کی ہو۔"[۲]

اس صنف کی ابتداء اور ایجاد کا سہرا سجاد ظہیر کے سر جاتا ہے۔ انھوں نے "یادیں" کے عنوان سے اپنے ذاتی تجربات اور فکری سرمایہ کو رپورتاژ کے پیکر سے نوازا۔ اس میدان میں کرشن چندر کے "پودے"، تاجور سامری کا "ے اس فن کو آگے بڑھایا۔ قدرت اللہ شہاب "یا خدا"، پرکاش پنڈت، کپت کبیر، سید محمد سادقو" اور رضیہ سجاد ظہیر، زہرہ جمال، صفیہ اختر، عصمت چغتائی، عادل رشید، قرۃ العین حیدر، عبداللہ ملک ابراہیم جلیس وغیرہ نے، فسانوں اور ناول کی طرز میں رپورتاژ لکھے۔

اردو ادب میں اس فن کے مزید ارتقاء پر کوئی واضح بات نہیں کہی جا سکتی۔ تحقیقی لحاظ سے

---

[۱] اردو میں رپورتاژ نگاری - عبدالعزیز - پیش لفظ ڈاکٹر قمر رئیس - ص ۔۔
[۲] ایضاً " ص ۲۳

بھی اس فن پر مزید لکھنے کی گنجائش ہے۔

رپورتاژ کے تعلق سے ڈاکٹر سید اعجاز حسین لکھتے ہیں۔

"رپورتاژ کی بنیاد واقعات پر ہوتی ہے وہ مفروضہ یا تخیلی باتوں پر تیار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس کا تعلق براہ راست تاریخ سے ہے۔" [1]

فی الحال اس فن پر ایک کتاب ملتی ہے۔

۱۔ اردو میں رپورتاژ نگاری — عبدالعزیز

اردو میں رپورتاژ نگاری

ڈاکٹر عبدالعزیز

اردو میں رپورتاژ نگاری "عبدالعزیز" کا مقالہ کتابی شکل میں ۲۷۰ صفحات پر محیط ہے۔ عرض حال میں مقالہ نگار نے اعتراف کیا ہے کہ

"اس کتاب میں ظاہری و باطنی بہت سی کمزوریاں ہیں۔ بعض موضوعات کو تشنہ چھوڑ دیا ہے۔ اور چند نئے مباحث اور موضوعات کو چھیڑا ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ احتساب نہایت شدید کریں تاکہ بحث کی راہیں کھلیں۔ اور ایک تشنہ موضوع پر نقاد متوجہ ہو سکیں۔ اور میری آراء سے بہتر فنی اصول متعین ہو سکیں۔" [2]

پیش لفظ ڈاکٹر مظفر رئیس کی زور قلم کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے رپورتاژ کے وجود کو ترقی پسند تحریک کی دین لکھا ہے۔ اور مقالہ نگار کی کاوش پر رقمطراز ہیں۔

"انھوں نے مقدمہ میں رپورتاژ کی فنی ساخت کا تجزیہ اس کی اقسام کا مطالعہ اور دوسری نثری اصناف سے اس کا موازنہ دقت نظر سے کیا ہے۔ اس کتاب سے پہلی بار اردو میں اس صنف ادب کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا۔" [3]

مقالہ نگار نے مقدمہ کے عنوان میں تاریخی پس منظر میں مختلف سماجی اور ادبی تحریکات کا ذکر کیا ہے۔ ابتدائی نقوش اور وجہ تسمیہ میں اردو ادیبوں کی کارگزاری اور رپورتاژ کی ایجاد اور تعریف کا تعین کیا ہے۔ اور رپورتاژ کو واقعہ نگاری روداد نگاری سے مختلف صنف ثابت کیا ہے۔

---

[1] نئے ادبی رجحانات۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین۔ ص ۲۳۲۔
[2] اردو میں رپورتاژ نگاری۔ عبدالعزیز ص ۵۔
[3] ایضاً ص ۱۰

"رپورتاژ مخصوص خبر یا مواد لئے ہوتا ہے۔ لیکن قاری کو یہ احساس نہیں ہوتا۔

رپورتاژ کی یہ خوبی اسے رپورٹ اور مختصر افسانے ناول سے الگ کرتی ہے۔ ترقی پسند مصنفین نے اسی مقصد کے حصول کے لئے اس صنف کی اختراع کی۔ اور اسے اس دور میں بلکہ آج بھی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔"[۱۱]

موصوف کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اس صنف کی ایجاد ترقی پسند مصنفین کا کارنامہ ہے نئی مطالعہ اور ہیئت کے ضمن میں رپورتاژ کے ارتقاء کا عہد افسانوی ادب کے عروج کا زمانہ بتایا ہے۔ رپورتاژ اور دیگر نثری اصناف کا موازنہ میں افسانہ اور ناول سے رپورتاژ کا مقابلہ ممکن بتایا ہے۔ ان کے بیچ تاثر کی مماثلت کو دلیل بتایا ہے۔ رپورتاژ کا پیش منظر میں ترقی پسند مصنفین کے اجلاس اور کانفرنس کے انعقاد کا تذکرہ کرتے ہوئے سجاد ظہیر کی "یادیں" کو پہلا رپورتاژ لکھا ہے۔[۱۲]

تحریک ترقی پسند مصنفین کی رپورتاژ نگاری کا جائزہ لے کر رپورتاژ کی اہمیت کو اس طرح واضح کیا ہے۔

"رپورتاژ نے ایک میڈیا بن کر ترقی پسند تحریک اور دیگر تحریکوں کو غیر معمولی تقویت دی ہے"[۱۳]

مقالہ نگار کے ساتھ مخصوص رپورتاژ نگاروں کے رپورتاژ پیش کیا ہے جن میں "یادیں" سجاد ظہیر "بمبئی سے بھوپال تک" عصمت چغتائی "ایک ہنگامہ" صفیہ اختر "کیت کبیر سنو بھائی سادھو" کرشن چندر "پودے" "بھول کی پتی ہیرے کا جگر" انور عظیم "سفر ہے شرط" ڈاکٹر قاضی عبدالستار ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس" اطہر اثر "چھٹا دریا" شکر تونسوی "پو پھٹے" خدیجہ مستور "سرخ زمین اور پانچ ستارے" خواجہ احمد عباس "پانچ دسمبر کی رات" زہرہ جمال "دل کی بپتا" سید ضمیر حسین دہلوی وغیرہ ان رپورتاژ پر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

یہ کتاب رپورتاژ کی صنف کا تعارف اور منظم تاریخ ہے۔ مصنف نے تنقیدی رویہ میں تجزیے کی خوبی پیدا کر دی ہے۔ اکثر مقام پر کتابت کی غلطیوں سے مفہوم سمجھنے میں پریشانی ہوتی ہے۔ مثلاً

ص۲۲ "یہ اس تحریک کا تاریخ ساز زمانہ ہے" ساز کی جگہ سازی چاہیے۔ سطر ۱۲

ص۲۷۹ اندر یت بجائے اندر بیت چاہیے۔ سطر ۳

ص۲۷۹ تلے صبح بجائے طلوع صبح ہونا چاہیے۔ آخری سطر

---

۱۱ اردو میں رپورتاژ نگاری - عبدالعزیز - ص۲۳۔

۱۲ ایضاً ص۲۶

۱۳ ایضاً ص۱۵

ان خامیوں سے کتاب کی افادیت متاثر نہیں ہوتی مجموعی اعتبار سے یہ کتاب اصناف کی تاریخ میں ایک اضافہ ہے۔

خاکہ نگاری

خاکہ نگاری کی صنف اپنے تقاضوں کی روشنی میں سیرت، صورت اور سوانح کا وہ روپ ہے جس میں انشائیہ کا گمان ہوتا ہے لیکن بحیثیت ایک صنف کے خاکہ نگاری اپنی انفرادیت رکھتی ہے۔ خاکہ نگاری شخصیت کو الفاظ و بیان کے بل پر عیاں نہیں کرتی بلکہ از سرِ نو شخصیت کے خدوخال، رنگ و روپ، کردار کے خارجی اور داخلی پہلوؤں کی جھلکیاں پیش کرتا ہے۔ شخصیت کی مسلّم اور نمایاں خصوصیات جو قاری کے شعور سے اوجھل ہوں ان کا اظہار اسلوب کی مینا کاری سے شخصیت کا آئینہ ہو۔ دوسری طرف داخلی کمزوریوں اور خوبیوں کا مرقع ہو۔ لیکن ان تمام خصوصیات کی وضاحت مختصر اور جامع انداز میں ہونا ضروری ہے ورنہ خاکہ نگاری پر انشائیہ، سوانح اور سیرت نگاری کا دھوکا ہوتا ہے۔ بقول آمنہ صدیقی۔

"شخصی خاکہ نگاری مکمل داستانِ حیات نہیں ہوتا بلکہ فرد کی نمایاں خصوصیات کا عکاس ہوتا ہے۔ اس میں تفصیل سے زیادہ اجمال اور توضیح سے زیادہ ایہام ہوتا ہے"۔

خاکہ نگاری کا فن اردو ادب میں بحیثیت ایک فن کے ارتقاء پذیر نہیں ہوا بلکہ اکثر ادیبوں، انشاء پردازوں، انشائیہ نگاروں، تاریخ دانوں، تنقید نگاروں نے شخصیات پر مدت کے دوران ایسے خاکے پیش کیے ہیں جن پر اس فن کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس کی ابتداء میر صاحب کے "نکات الشعراء" سے ہوتی ہے۔ جس میں موصوف نے شعراء کے حالات اور کرداریں تصویر کشی کی ہے۔

انشاء کی دریائے لطافت میں بھی کردار نگاری کی جھلکیاں، خاکہ نگاری کے تقاضوں کو پورا کرنے میں محمد حسین کی آبِ حیات میں شعراء کے حلیے، عادات و اطوار، نظریات و عقائد کا اظہار اس فن کی نشو و نما کے مطابق ہے۔

مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا میں خانم کے کردار کی جھلکیاں اور رام راؤ جان ادا کی تصویر خاکہ نگاری کا نمایاں ثبوت ہے۔ فرحت اللہ بیگ، عبدالحق کے علاوہ رشید احمد صدیقی کے مضامین میں خاکہ نگاری کا فن نکھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اردو میں خاکہ نگاری کے فن پر صرف ایک کتاب لکھی گئی ہے مزید اس فن پر

لکھنے کی ضرورت ہے۔

"اردو ادب میں خاکہ نگاری" اس عنوان سے صابرہ سعید کا مقالہ جو مختلف موضوعات پر لکھا گیا ہے۔ اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

اردو ادب میں خاکہ نگاری

ڈاکٹر صابرہ سعید

ڈاکٹر صابرہ سعید کا یہ مقالہ "اردو ادب میں خاکہ نگاری درج ذیل عنوانات پر مشتمل ہے۔

- پیش لفظ
۱۔ اپنی بات ۔۳۔ خاکہ کی ماہیت اور فن
۴۔ خاکہ نگاری ایک صنف ادب ۵۔ خاکہ کی اقسام ۶۔ انگریزی ادب میں خاکہ کی روایت
۷۔ اردو میں خاکہ نگاری کا تاریخی جائزہ
۸۔ اردو میں خاکہ نگاری کا ارتقاء
۹۔ اردو کے خاکہ نگار ایک تنقیدی جائزہ
۱۰۔ مستقبل کے امکانات۔

اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر مغنی تبسم کی رائے قابل غور ہے

"مقالہ نگار کے بعض خیالات اور آراء سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی اور مستقل تصنیف ہونے کے اعتبار سے یہ کتاب حرف اول ضرور ہے حرف آخر نہیں ہے۔"[1]

خاکہ نگاری کی ماہیت اور فن محرکات اور موضوع کے ضمن میں مصنفہ نے خاکہ نگار کی حیثیت متعین کرکے خاکہ نگاری کے تقاضوں اور فرائض سے روشناس کرایا ہے۔ موصوفہ کی رائے کے مطابق

"خاکہ نگار کا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ دیانتداری اور صاف گوئی سے کمزوریاں اور خوبیاں دونوں بیان کرے"[2]

موصوفہ نے قاری اور خاکہ نگار کے درمیان تال میل کے اسباب پر روشنی ڈال کر خاکہ کے محرکات اور موضوع کے اظہار کو تجربات اور مشاہدات میں اضافہ کا سبب لکھا ہے۔ مقالہ نگار خاکہ نگاری

---

[1] اردو ادب میں خاکہ نگاری۔ ڈاکٹر صابرہ سعید ص
[2] ایضاً ” ” ص۱۱

کے لئے مواد کی فراہمی کا ذریعہ خطوط، محافرات، اظہار اسلوب سیرت اور تضاد زبان وبیان کو بتاتی ہیں۔

خاکہ نگاری میں اختصار، وحدت، تاثر، کردار نگاری اور منظر کشی کو اہم خیال کرتی ہیں نثار احمد فاروقی، آمنہ صدیقی، سید محمد حسین، شمیم احمد کرہانی وغیرہ نے خاکہ کی تعریف اور اس کی وضاحت یوں کی۔

"خاکہ کی کوئی ایسی جامع تعریف کرنا ممکن نہیں ہے جو اس کے تمام فنی اور ادبی پہلوؤں پر حاوی ہو۔ البتہ اس کے بنیادی اصول اور اہم خدوخال کی یوں نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ کہ خاکہ ایک صنف ادب ہے۔ اس کا سانچہ انشائیہ ہوتا ہے، اور اس میں کسی شخصیت (حقیقی یا خیالی) کی زندگی، سیرت وصورت اور کارناموں کی کچھ جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔[1]

موصوفہ نے خاکہ نگاری اور انشائیہ نگاری، سوانح نگاری، مختصر افسانہ، پیروڈی کے فرق کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔ خاکہ کی اقسام میں

۱۔ تعارفی خاکے ۲۔ سرسری خاکے ۳۔ تاثراتی خاکے۔

مدحیہ اور توصیفی، بیانیہ اور سنجیدہ، کرداری خاکہ کا بیان اقتباسات کی دلیلوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری کے اولین نقوش میر کی نکات الشعراء، اور انشاء کی دریائے لطافت میں کردار نگاری کی جھلکیاں کو بتایا ہے۔ محمد حسین آزاد، عبدالحق، خواجہ حسن نظامی کو خاکہ نگاری سے وابستہ کیا ہے۔ اردو میں خاکہ نگاری کے ارتقاء میں فرحت اللہ بیگ، آغا حیدر حسن، محمد شفیع، بشیر احمد ہاشمی، خواجہ غلام السیدین، عبدالرزاق کانپوری، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری سے بحث کی ہے۔

نئے ادبی رجحانات اور خاکہ میں عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، مالک رام، شوکت تھانوی، اعجاز حسین، غلام احمد فرقت کاکوروی، رئیس احمد جعفری، عبدالمجید سالک، علی جواد زیدی، اور ترلوک، کارشاد وغیرہ کی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ اردو خاکہ نگاری ایک تنقیدی جائزہ میں مندرج ادباء کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ مصنفہ نے لکھا ہے کہ خاکہ نگاری پر ابھی متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ تاریخی حقائق کی روشنی میں خاکہ نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ لہٰذا یہ کتاب موجودہ عہد میں اردو میں خاکہ نگاری کے موضوع پر ایک عمدہ کوشش ہے۔

---

[1] اردو ادب میں خاکہ نگاری - صابرہ سعید - ص ۲۵

تقریظ

تقریظ کی صنف کو تبصرہ نگاری کی روایت کہا گیا ہے۔[1] تبصرہ نگاری میں کتاب کے تعارف، محاسن و معائب کی معلومات کا مختصر عکس دکھائی دیتا ہے۔ لیکن تقریظ میں زیرِ نظر کتابوں کے محاسن سے بحث کی جاتی ہے۔ کتاب کی خامیوں اور معائب سے تقریظ کو کوئی سروکار نہیں۔ اس طرح تقریظ بکیطرفہ حکمت کی کارسازی کا نتیجہ ہے۔ اس صنف نے تبصرہ نگاری کی صنف کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچائی۔ لیکن روایتی فن کی حیثیت سے تبصرہ نگاری کی مددگار ثابت ہوئی۔ اس کے ذریعہ کتاب کے محاسن تبصرہ نگاری کو ہاتھ آئے ہیں۔ شعلہ کے بعد کئی ادیبوں نے تبصرہ کے لئے تقریظ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کی مثال حالی کی تصنیف "مقالاتِ حالی" میں ملتی ہے۔ حالی نے بعض تبصروں کو تقریظ کے نام سے شائع کیا ہے۔ ان کے علاوہ سید سلیمان ندوی نے بھی اپنے کئی تبصروں کو تقریظ کا نام دیا ہے۔

اردو میں تقریظ کے اصول اور ضوابط پر کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ دورِ قدیم کی مختلف بیاضوں میں اس کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ان تبصروں کو تقریظ نہیں کہہ سکتے۔ نظریات کے دور و محاسن کے باب میں تقریظ کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں لیکن ان تبصروں کو تقریظ نہیں کہہ سکتے۔ اس فن کو زندہ رکھنے کے لئے اس پر تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ تقریظ اور تبصرہ نگاری کے بیچ نازک فرق کی وضاحت اور اس کے اصول و قواعد پر کام کرنے کی گنجائش ہے۔

خطوط نگاری

دنیا کی ہر زبان کا طرۂ امتیاز خطوط نگاری کی صنف ہے کیونکہ اس صنف کی بدولت سلام و پیام، محبت و عداوت، شکوے شکایات، غم و غصہ، رنج و الم، نجی معاملات، ترکِ تعلق، اخلاق و میل جول، نفرت و حقارت، پند و نصیحت، تاکید و حکم، لین دین کا تقاضا، عاجزی و انکساری، خواہش، سراپا اور ضابطۂ حیات کے کئی امور میں جذبات و احساسات کے اظہار میں قدرے آسانی ہوتی ہے۔ خطوط مخاطب "مخاطب" کو متاثر و مطمئن ہی نہیں کرتے۔ بلکہ ہمدردی اور مدد کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔ مزاج پرسی پر رانی کرتے ہیں خطوط نگاری کی صنف کے ذریعہ انسانی نفسیات کا تجزیہ بہ آسانی ہو سکتا ہے مثلاً

تاج ور رقیق خطوط تند مزاجی اور بد مزاجی کے مظہر ہوتے ہیں۔ طنز و مزاح کی چاشنی تحریر، مزاج میں زندہ دلی

---

[1] اردو تنقید کا ارتقاء۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ص ۵۹

چلبلاپن، خوش مزاجی اور بے حسی کی گواہی دیتی ہے۔ شیریں، شگفتگی فصیح و بلیغ لفظوں کی تحریر خیال، تہذیب و تمدن، تکلف تصنع کا ثبوت دیتی ہے۔

تراکیب و بندش کے طرز جملوں کا اجتماع جدت طرازی کا نمونہ بن جاتے ہیں۔ انکساری و عاجزی کا اظہار لکھنے والے کی غربت، احساس کمتری، مجبوری، معذوری، بیچارگی کا اعلان کرتا ہے۔ یہ تکلف انداز طنز و ظرافت میں ڈوبا ہوا تخاطب، خطابِ محبت، ملنساری، قدر و منزلت کی علامت ہوتا ہے۔ اور لکھنے والے کی کامیاب خوش حال زندگی کا پتہ دیتا ہے تسلی، دلاسہ، پند و نصیحت، حکم و ارشاد کا رویہ شخصی بزرگی، انا، بڑائی اور سنجیدگی کے شاہد ہیں۔ اور رشتہ کی فوقیت کا پیغام ہیں، ادبی اسلوب کے سہارے، جذبات و احساسات کا اظہار خط کو تصنع سے پر کر دیتا ہے۔ اسی لئے خطوط نگاری میں آسان سلیس رواں الفاظ و جملوں کو برتا جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں ہماری خطوط نگاری پر فارسی کا گہرا اثر تھا۔ اسی سبب خطوط کی طرز نگارش میں بے جا القاب و آداب کا لا متناہی سلسلہ ملتا ہے۔ جن کو پڑھنے سے تصنع اور تکلف کے عناصر کا بوجھ ذہن پر بارگراں ہوتا ہے۔ القاب و آداب کے جال سے باہر نکلنے تک مافی الضمیر اور غرض کے اظہار سے دلچسپی برقرار نہیں رہتی۔ دل جوئی، ہمدردی کا جذبہ مفقود ہو جاتا ہے۔ اسی پر خط اپنے پڑھنے والے کو راضی برضا کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔

اردو میں خطوط نگاری کا یہ طرز مدت دراز تک رائج رہا لیکن دورِ متقدمین میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کی جدت پسند طبیعت نے اس صنف میں اپنی خطوط نگاری سے ایک نئی روح پھونکی۔ انھوں نے القاب و آداب کے طویل سلسلے کو بالکل مختصر کر دیا۔ تکلف و تصنع سے بھرپور القاب و آداب طرز تحریر کے تکلف کو ترک کر دیا۔ جناب، میاں، صاحب، محترم، برادرم جیسے القاب کا استعمال کیا۔

کتابت میں سلیس رواں جملوں کو اپنایا۔ تکلف کی جگہ بے تکلفی کا انداز تخاطب کو جاری کیا۔ ان کے خط کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ روبرو بیٹھے گفتگو، شکوے شکایت سے طنز و مزاح سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ غالب نے عزیزوں، بزرگوں، احباب، شاگردوں کو خطوط لکھے ہیں۔ ان میں شاگردوں اور دوستوں کے خطوط میں ان کے اسلوب کی گل کاری اور بیان کا زور عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ عود ہندی غالب کے خطوط کا مجموعہ ہے خطوط نگاری کی صنف پر اس مجموعہ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

غالب کے اس طرزِ نگارش کا خطوط نویسی پر زبردست اثر مرتب ہوا۔ اور خطوط نویسی میں غالب کی تقلید کی گئی ہے۔ اور غالب کی طرح خطوط لکھنے کی روش عام ہو گئی۔ بعد کی نسلوں نے اس طرزِ تحریر کو خطوط نگاری کے لئے جائزہ کر لیا۔ اور آج تک غالب کی پیروی کے نمونے ملتے ہیں۔

غالب کے بعد مولانا شبلی نعمانی کی خطوط نگاری کا چرچا ہوا۔ لیکن مولانا کے یہاں اسلوب اور طرزِ نگارش میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی۔ بلکہ مہدی افادی کے خطوط میں غالب کے اندازِ بیان کا عکس ملتا ہے اور ان کے خطوط بھی ادب میں ایک اہمیت کے حامل ہیں۔

مولانا ابو الکلام آزاد کے خطوط سنجیدگی اور متانت کے اعتبار سے ان کے شخصی اظہار کا نمونہ ہیں۔ انھوں نے تحریکِ آزادی کے زمانے میں احمد نگر جیل سے اپنے دوستوں، سیاسی ساتھیوں کو کئی انداز سے خطوط لکھے۔ خطوط میں ایک نئی تکنیک اپنائی کہ خط بظاہر خیریت کے مضمون سے پر ہوتا تھا۔ لیکن اس خط کے ہر جملے کے دوسرے تیسرے یا چوتھے الفاظ نکال کر ترتیب دینے پر کوئی خفیہ پیغام یا کسی اہم مقصد کا اظہار ہوتا تھا۔ اور تحریک سے وابستہ شخص اسے آسانی سے سمجھ لیتا تھا۔ "غبارِ خاطر" ان کے خطوط کا مجموعہ ہے جس میں ایسے خفیہ خطوط سے اجتناب کیا گیا ہے۔ لیکن اور خطوط سے انکی طرزِ تحریر، اظہار مقصد اور اسلوب کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس صنف میں رشید احمد صدیقی نے ایک انوکھا انداز اپنایا ہے۔ کیونکہ وہ ادب میں طنز و ظرافت کے ایک معیاری فنکار ہیں۔ طنز و ظرافت میں ان کا اپنا ایک اسلوب ہے اسی اسلوب سے فائدہ اٹھا کر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ انھوں نے خطوط نگاری میں بھی کیا ہے۔ انھوں نے دوست احباب اور ادبی شخصیتوں کو عمدہ خطوط لکھے ہیں۔ غالب کے بعد مکاتیب رشید اردو میں صنف نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں کیونکہ ان میں نوک جھونک اور ظرافت کا ذو معنی تاثر اپنی مثال آپ ہے۔ انھیں پڑھنے والا ہنستے ہنستے سنجیدگی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

اردو میں منظوم خطوط نگاری کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ لیکن بہت کم اور نہ ہونے جیسی۔ کیونکہ منظوم خط شاعرانہ فنی خوبیوں کے ساتھ اظہار خیال کا پابند ہوتا ہے۔ اور یہ صلاحیت ہر شاعر میں نہیں کہ وہ دلی جذبات منظوم کرنے پر قادر ہو۔ اکبر الہ آبادی نے اپنے بیٹے کو منظوم خط لکھا تھا۔ جب ان کا بیٹا لندن میں مزید تعلیم کے لئے مقیم تھا۔ اور وہ وہاں کی تہذیب سے متاثر ہو کر کچھ خطوط ارسال کیا تھا۔

اقبال نے جاوید کے نام (اپنے بیٹے) کو منظوم خط لکھا تھا جس میں بیٹے کو کچھ نصیحت کی تھی۔ دراصل منظوم خط کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں اپنے مافی الضمیر کا حسب منشاء اظہار انتہائی مشکل کام ہے۔ مختلف باتیں، شکوے شکایات، پند و نصیحت، غرض مدعا سب کچھ نظم کے پیکر میں احساس اور جذبات کی صحیح عکاسی نہیں ہو سکتی۔

اردو میں اس صنف پر اصول اور ضابطہ کے پیش نظر کوئی اہم کام نہیں ہوا ہے۔ خطوط نگاری کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ القاب و آداب کا صحیح استعمال تخاطب، انداز بیان میں طرز تحریر کا خیال کیا ہونا چاہیے۔ اس روشنی میں خطوط نگاری پر مزید لکھنے کی گنجائش ہے۔ ہمارے ادب میں درج ذیل کتابیں خطوط کے مجموعے کی شکل میں ملتی ہیں۔

۱۔ اردوئے معلّیٰ	مرزا اسد اللہ خاں غالب
۲۔ عودِ ہندی	مرزا اسد اللہ خاں غالب
مکاتیب شبلی (دو جلد)	مرتبہ دار المصنفین اعظم گڑھ، خطوط شبلی بعطیہ فیضی کے نام
غبار خاطر	مولانا ابو الکلام آزاد
مکاتیب رشید	رشید احمد صدیقی ملک رام
گویا دبستان کھل گیا	چودھری محمد علی ردولوی
خطوط مہدی افادی	بیگم مہدی افادی۔
مکاتیب سعید محمد احمد	ضمیر حسین

کتابیات

کتابیات

نمبر شمار	نام کتب	مصنف/مرتب/مؤلف	سنہ اشاعت	مرکز اشاعت
۱	آب حیات	محمد حسین آزاد	سنہ ۱۹۰۷ء	نول کشور پرنٹنگ پریس لکھنؤ
۲	آب حیات کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر مسعود حسن ادیب رضوی	سنہ ۱۹۶۳ء	فروغ اردو لکھنؤ
۳	آرٹ اِن پوئٹری	شہاب الدین رحمت	سنہ ۱۹۵۷ء	اورنگ آباد
۴	اتر پردیش کے لوک گیت	اظہر علی رضوی	سنہ ۱۹۸۱ء	ادارہ انیس اردو الہ آباد
۵	ادب اور زندگی (بار چہارم)	مجنوں گورکھپوری	سنہ ۱۹۶۵ء	کری کو پریس الہ آباد
۶	اخبار نویسی کے ابتدائی اصول	بلجیت سنگھ	سنہ ۱۹۶۹ء	بہادر گڑھ ضلع رہتک ہریانہ
۷	افسانہ	مجنوں گورکھپوری	سنہ ۱۹۳۶ء	شعبۂ اردو علی گڑھ
۸	ارباب نثر (بار دوم)	مولوی سید احمد	سنہ ۱۹۳۰ء	انجمن ترقی اردو ہند دہلی
۹	اصولِ افسانہ نگاری	اویس احمد ادیب	سنہ ۱۹۵۵ء	عثمانیہ پریس حیدرآباد
۱۰	اودھ میں اردو صحافت	عتیق احمد صدیقی		لکھنؤ
۱۱	افاداتِ سلیم	وحید الدین سلیم		
۱۲	اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقاء	ڈاکٹر اکبر حیدری	سنہ ۱۹۷۳ء	فروغ ادب لکھنؤ
۱۳	السلاطین	پروفیسر رام چندر		
۱۴	اردو ادب آزادی کے بعد	ڈاکٹر خورشید الاسلام	سنہ ۱۹۷۳ء	شعبۂ اردو علی گڑھ
۱۵	اردو ادب کی تاریخ	سید ابو العاصم رضوی	سنہ ۱۹۷۵ء	مجلس ترقی اردو دہلی
۱۶	اردو ادب کی تاریخ	ڈاکٹر نسیم قریشی	سنہ ۱۹۵۵ء	آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی
۱۷	اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ	ڈاکٹر سلیم حامد رضوی	سنہ ۱۹۷۳ء	ادارہ ادب بھوپال
۱۸	اردو ادب میں رومانوی تحریک	ڈاکٹر محمد حسن	سنہ ۱۹۵۵ء	دانش محل امین پارک الہ آباد
۱۹	اردو ادب میں طنز و مزاح	ڈاکٹر وزیر آغا	سنہ ۱۹۶۷ء	مکتبہ جامعہ دہلی
۲۰	اردو ادب میں طنز و مزاح نثر	غلام احمد فرقت کاکوروی	سنہ ۱۹۷۴	فروغ ادب لکھنؤ

۲۱ اردو ادب میں طنز و مزاح (نظم) غلام احمد فرقت کاکوروی سنہ ۱۹۶۳ء فروغ ادب لکھنؤ

نمبر	کتاب	مصنف	سنہ	ناشر
۲۲	اردو ادب میں صدیوں کا حصہ	ڈاکٹر زصرت مہدی	سنہ ۱۹۸۲ء	اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد
۲۳	اردو رباعی کی فنی و تاریخی ارتقاء	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	سنہ ۱۹۵۵ء	ندارد
۲۴	اردو رباعیات	ڈاکٹر سلام سندیلوی	سنہ ۱۹۶۲ء	مکتبہ جامعہ اردو دہلی
۲۵	اردو اور فارسی کے یورپین شعراء	ڈاکٹر رام بابو سکسینہ	سنہ ۱۹۴۱ء	انجمن ترقی اردو ہند دہلی
۲۶	اردو تنقید پر ایک نظر (بار دوم)	کلیم الدین احمد	سنہ ۱۹۷۹ء	سرفراز قومی پریس لکھنؤ
۲۷	اردو تنقید کا ارتقاء (بار دوم)	ڈاکٹر عبادت بریلوی	سنہ ۱۹۵۷ء	سود یشو پریس دہلی
۲۸	اردو افسانہ اور روایت	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	سنہ ۱۹۷۳ء	مکتبہ جامعہ دہلی
۲۹	اردو زبان پر انگریزی ادب کا اثر	سید عبد اللطیف	سنہ ۱۹۲۵ء	انجمن ترقی اردو دہلی
۳۰	اردو زبان اور فنِ داستان گوئی (بار دوم)	کلیم الدین احمد	سنہ ۱۹۷۵ء	سرفراز پریس لکھنؤ
۳۱	اردو زبان کا ارتقاء (بار دوم)	ڈاکٹر شوکت سبزواری	سنہ ۱۹۷۷ء	سود یشو پریس دہلی
۳۲	اردو ڈرامہ روایت اور تجربے	ڈاکٹر عطیہ نشاط	سنہ ۱۹۷۳ء	نصرت پبلشرز لکھنؤ
۳۳	اردو ڈرامہ کا تحقیقی مطالعہ	ڈاکٹر عشرت رحمانی	سنہ ۱۹۷۶ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
۳۴	اردو ڈرامہ کا مطالعہ	ڈاکٹر اخلاق اثر	سنہ ۱۹۸۰ء	ادارۂ ادب بھوپال
۳۵	اردو ڈرامہ کی تاریخ و تنقید	ڈاکٹر عشرت رحمانی	سنہ ۱۹۷۵ء	کریمی پریس الہ آباد
۳۶	اردو ڈرامہ نگاری	ڈاکٹر بادشاہ خاں	سنہ ۱۹۵۵ء	کتاب نگر دہلی
۳۷	اردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	سنہ ۱۹۵۲ء	انجمن ترقی اردو علی گڑھ
۳۸	اردو غزل کی نشو و نما	ڈاکٹر رفیق حسین	سنہ ۱۹۳۵ء	کریمی پریس الہ آباد
۳۹	اردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	سنہ ۱۹۴۲ء	جوان پبلیکیشن لکھنؤ
۴۰	اردو شہ پارے	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	سنہ ۱۹۳۵ء	ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد
۴۱	اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت	ڈاکٹر عنوان چشتی	سنہ ۱۹۸۰ء	کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی
۴۲	اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے	ڈاکٹر عنوان چشتی	سنہ ۱۹۷۵ء	انجمن ترقی اردو دہلی
۴۳	اردو شاعری میں سانیٹ	ڈاکٹر حنیف کیفی	سنہ ۱۹۷۵ء	مکتبہ جامعہ اردو دہلی
۴۴	اردو شاعری میں طنز و مزاح	محمد یونس فہمی	سنہ ۱۹۷۹ء	حیدرآباد

نمبر	کتاب	مصنف	سنہ	ناشر
۴۵	اردو شاعری میں نظم معرا اور آزاد نظم	ڈاکٹر حنیف کیفی	سنہ ۱۹۸۲ء	مکتبہ جامعہ اردو دہلی
۴۶	اردو کی ادبی تاریخ (بار دوم)	پروفیسر عبدالقادر سروری	سنہ ۱۹۵۷ء	اعلیٰ پریس دہلی
۴۷	اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام	مولوی عبدالحق	سنہ ۱۹۳۹ء	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد
۴۸	اردو کی لسانی تشکیل	ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ	سنہ ۱۹۸۵ء	شعبۂ اردو علی گڑھ
۴۹	اردو لٹریچر	ڈاکٹر گراہم بیلی	سنہ ۱۹۳۳ء	ادارۂ ادبیات حیدرآباد
۵۰	اردو لسانیات کا خاکہ	پروفیسر احتشام حسین	سنہ ۱۹۶۳ء	اردو پبلشنگ ہاؤس الہ آباد
۵۱	اردو میں لسانیاتی تحقیق	ڈاکٹر عبدالستار دلوی	سنہ ۱۹۷۱ء	گوکل پریس بمبئی ۲
۵۲	اردو کے غیر مسلم شعرا اور ادیب	جگدیش چندر مہتہ	سنہ ۱۹۷۲ء	دہلی
۵۳	اردو کے ہندی ادیب	سید قاسم علی	سنہ ۱۹۴۳ء	دہلی
۵۴	اردو مثنوی کا ارتقاء (بار دوم)	پروفیسر عبدالقادر سروری	سنہ ۱۹۷۹ء	سب رس کتاب گھر حیدرآباد
۵۵	اردو مثنوی شمالی ہندوستان میں	ڈاکٹر گیان چند جین	سنہ ۱۹۶۹ء	انجمن ترقی اردو ہند
۵۶	اردو مثنوی کا ارتقاء	ڈاکٹر سید عقیل	سنہ ۱۹۸۶ء	الہ آباد
۵۷	اردو میں رپورتاژ نگاری	ڈاکٹر عبدالعزیز	سنہ ۱۹۷۷	مکتبہ جامعہ دہلی
۵۸	اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر محمود الٰہی	سنہ ۱۹۷۳ء	مکتبہ جامعہ دہلی
۵۹	اردو میں قصیدہ نگاری (بار دوم)	ڈاکٹر ابو محمد سحر	سنہ ۱۹۷۲ء	انجمن ترقی اردو ہند دہلی
۶۰	اردو مرثیہ	سفارش حسین رضوی	سنہ ۱۹۷۵ء	فروغ ادب لکھنؤ
۶۱	اردو مرثیہ کا ارتقاء	ڈاکٹر مسیح الزماں	سنہ ۱۹۶۸ء	کتاب نگر لکھنؤ
۶۲	اردو مرثیہ کی روایت	ڈاکٹر مسیح الزماں	سنہ ۱۹۷۹ء	کتاب نگر لکھنؤ
۶۳	اردو میں وہابی تحریک	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	سنہ ۱۹۷۹	سلسلۂ مطبوعات شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی
۶۴	اردو گیت	ڈاکٹر قیصر جہاں	سنہ ۱۹۷۷ء	مکتبہ جامعہ دہلی
۶۵	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی	سنہ ۱۹۷۲ء	انجمن ترقی اردو ہند دہلی
۶۶	اردو میں خاکہ نگاری	ڈاکٹر صابرہ سعید	سنہ ۱۹۷۶ء	مکتبہ جامعہ دہلی
۶۷	اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء	ڈاکٹر ممتاز فاخرہ	سنہ ۱۹۷۸ء	مکتبہ جامعہ دہلی

۶۸	اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء	ڈاکٹر ممتاز الطاف فاخر	سنہ ۱۹۷۵ء	انجمن ترقی اردو ہند دہلی
۶۹	اردو میں سوانح نگاری	ڈاکٹر سید شاہ علی	سنہ ۱۹۷۳ء	شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی
۷۰	اردو نثر کا دہلوی دبستان	ڈاکٹر عبدالرحیم	سنہ ۱۹۷۶ء	مکتبہ جامعہ دہلی
۷۱	انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ	سنہ ۱۹۶۵	اردو پریس بمبئی
۷۲	اردو ناول کا ارتقاء	ڈاکٹر مجتبیٰ حسین	سنہ ۱۹۷۳ء	نازپبلشنگ ہاؤس پہاڑی بھوجلہ دہلی
۷۳	اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احسن فاروقی	سنہ ۱۹۷۶ء	فروغ اردو لکھنؤ
۷۴	اردو کا پہلا کیبابی ڈرامہ (اوّل)	ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی	سنہ ۱۹۷۱	ادارۂ ادب اردو بمبئی
۷۵	اردو کیبابی ڈرامہ (دوم)	ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی	سنہ ۱۹۷۲ء	ادارۂ ادب اردو بمبئی
۷۶	اردو کیبابی ڈرامہ (سوم)	ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی	سنہ ۱۹۷۳ء	ادارۂ ادب اردو بمبئی
۷۷	اردو کیبابی ڈرامہ (چہارم)	ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی	سنہ ۱۹۷۳ء	ادارۂ ادب اردو بمبئی
۷۸	باقیات فانی	رشید احمد صدیقی	سنہ ۱۹۴۸ء	شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
۷۹	بدایوں کے چند ادباء و شعراء	مبشر علی	سنہ ۱۹۷۵ء	فروغ اردو دہلی
۸۰	بہار میں اردو زبان کا ادب اور ارتقاء	ڈاکٹر اختر اورینوی	سنہ ۱۹۵۷ء	پٹنہ
۸۱	بہار میں اردو نثر کا ارتقاء	مظفر اقبال	سنہ ۱۹۶۰ء	"
۸۲	بحر الفصاحت	نجم الغنی	سنہ ۱۹۲۷ء	نول کشور پریس لکھنؤ
۸۳	بنگال میں اردو ادب	وفا راشدی	سنہ ۱۹۵۵ء	مکتبہ اشاعت اردو حیدرآباد
۸۴	بمبئی میں اردو	ڈاکٹر میمونہ دلوی	سنہ ۱۹۷۰ء	مکتبہ جامعہ اردو دہلی
۸۵	باغ و بہار	میرامن (مرتبہ عبدالحق)		انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد
۸۶	پطرس کے مضامین (بار دوم)	پطرس بخاری	سنہ ۱۹۰۳ء	ادبی دنیا اردو بازار دہلی
۸۷	پنجاب میں اردو	ڈاکٹر محمود شیرانی	سنہ ۱۹۲۹ء	کریمی پریس لاہور
۸۸	تاریخ ادب اردو	ادارۂ ادبیات حیدرآباد	سنہ ۱۹۴۰ء	ادارہ ادبیات حیدرآباد
۸۹	تاریخ اردو ادب اوّل	جمیل جالبی	سنہ ۱۹۷۷ء	جے کے آفسیٹ پریس دہلی
۹۰	تاریخ اردو ادب دوم	جمیل جالبی	سنہ ۱۹۸۲ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی

۹۱ تاریخ اردو صحافت (حصہ اول)	امداد صابری	سنہ ۱۹۵۳ء	چوڑی والان دہلی
۹۲ تاریخ ادب اردو (بار دوم)	ڈاکٹر رام بابو سکسینہ	سنہ ۱۹۳۳ء	نول کشور پریس لکھنؤ
۹۳ تاریخ اردو صحافت (دوم)	امداد صابری	سنہ ۱۹۶۱ء	جدید پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی
۹۴ تاریخ اردو صحافت (سوم)	امداد صابری	سنہ ۱۹۶۲ء	جدید پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی
۹۵ تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر نذیر احمد عباد اللہ	سنہ ۱۹۵۱ء	شعبۂ اردو علی گڑھ
۹۶ تاریخ ادب کی تدوین	علی جواد زیدی	سنہ ۱۹۸۲ء	نظامی پریس لکھنؤ
۹۷ تاریخ نثر اردو	مولوی احسن مارہروی	سنہ ۱۹۳۰ء	دہلی
۹۸ تاریخ فرشتہ	ابوالقاسم فرشتہ	سنہ ۱۹۳۲ء	جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۹۹ تاریخ ادبیات گورکھپور	ڈاکٹر سلام سندیلوی	سنہ ۱۹۸۳	مکتبہ جامعہ اردو دہلی
۱۰۰ تاریخ ادبیات اردو	ڈاکٹر محمد صادق	سنہ ۱۹۶۴	اردو پریس دہلی
۱۰۱ تاریخ اقلیم ادب	ڈاکٹر انصار اللہ		شعبۂ اردو علی گڑھ
۱۰۲ تاریخ نظم و نثر اردو	آغا باقر	سنہ ۱۹۲۳ء	شیخ مبارک علی لوہاری دروازہ لاہور
۱۰۳ تاریخ مثنویات	حافظ جلال احمد جعفری	سنہ ۱۹۳۵ء	جعفری پریس الہ آباد
۱۰۴ تاریخی ناول فن اور اصول	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	سنہ ۱۹۸۰ء	مکتبہ جامعہ اردو دہلی
۱۰۵ ترقی پسند ادب	عزیز احمد	سنہ ۱۹۴۵ء	انجمن ترقی اردو ہند دہلی
۱۰۶ ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	سنہ ۱۹۵۷ء	انجمن ترقی اردو ہند دہلی
۱۰۷ ترقی پسند ادب ایک جائزہ	ہنس راج رہبر	سنہ ۱۹۶۷ء	آزاد کتاب گھر دہلی
۱۰۸ تذکرہ انڈو یورپین شعرائے اردو	سردار علی	سنہ ۱۹۴۴ء	ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد
۱۰۹ تذکرۂ ریختی	تمکین کاظمی	سنہ ۱۹۳۰ء	مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد
۱۱۰ تذکرۂ یورپین شعرائے اردو	ڈاکٹر رام بابو سکسینہ	سنہ ۱۹۵۸ء	سودیشی پریس دہلی
۱۱۱ تذکرہ شعرائے اورنگ آباد	سردار علی	سنہ ۱۹۲۷ء	ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد
۱۱۲ تذکرہ یورپین شعرائے اردو	خواجہ محمد یوسف	سنہ ۱۹۶۱ء	ادارہ دارالمصنفین اعظم گڑھ
۱۱۳ تعارف تاریخ اردو ادب	شجاعت علی سندیلوی	سنہ ۱۹۶۳ء	سرفراز پریس لکھنؤ

نمبر	کتاب	مصنف	سنہ	ناشر
۱۱۴	تحقیق اور اس کے مسائل	رشید حسن خاں	سنہ ۱۹۷۸ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ
۱۱۵	تنقید کے بنیادی مسائل	ڈاکٹر آل احمد سرور	سنہ ۱۹۶۷ء	شعبۂ اردو علیگڑھ
۱۱۶	تنقید کیا ہے؟	ڈاکٹر آل احمد سرور		کتابی دنیا دہلی
۱۱۷	تنقیدی سرمایہ (اوّل)	مولوی عبدالشکور	سنہ ۱۹۵۱ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ
۱۱۸	تنقیدی سرمایہ (دوم)	مولوی عبدالشکور	سنہ ۱۹۵۵ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ
۱۱۹	تخلیقی عمل	ڈاکٹر وزیر آغا	سنہ ۱۹۷۵ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ
۱۲۰	تذکرۂ مخطوطات	ادارۂ ادبیات حیدرآباد	سنہ ۱۹۶۲ء	حیدرآباد
۱۲۱	جائزۂ تاریخ ادب اردو	شرافت حسین مرزا	سنہ ۱۹۶۰ء	شعبۂ اردو علیگڑھ
۱۲۲	جائزے	مظفر حنفی	سنہ ۱۹۸۴ء	مکتبہ جامعہ دہلی
۱۲۳	جدید اردو لسانیات (بار دوم)	ڈاکٹر امیر اللہ شاہین	سنہ ۱۹۸۳ء	کتاب نگر دہلی
۱۲۴	جدید اردو تنقید اصول و نظریات	شارب ردولوی	سنہ ۱۹۶۹ء	کتاب پبلشرز لکھنؤ
۱۲۵	جدیدیت اردو ادب	ڈاکٹر آل احمد سرور	سنہ ۱۹۵۹ء	شعبۂ اردو علیگڑھ
۱۲۶	جدیدیت کی فلسفیانہ اساس	ڈاکٹر شمیم حنفی	سنہ ۱۹۷۵ء	مکتبہ جامعہ اردو دہلی
۱۲۷	جنوبی ہند میں اردو صحافت (ق سنہ ۱۸۵۷ء)	افضل الدین اقبال	سنہ ۱۹۸۰ء	جام باغ روڈ حیدرآباد
۱۲۸	حیاتِ جاوید	مولانا الطاف حسین حالی		شعبۂ اردو علیگڑھ
۱۲۹	خطباتِ دتاسی	گارساں دتاسی	سنہ ۱۸۷۷ء	انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد
۱۳۰	خمخانۂ جاوید (اوّل)	لالہ سری رام	سنہ ۱۹۰۸ء	دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی
۱۳۱	خمخانۂ جاوید (دوم)	لالہ سری رام	سنہ ۱۹۰۹ء	دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی
۱۳۲	خمخانۂ جاوید (سوم)	لالہ سری رام	سنہ ۱۹۱۱ء	دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی
۱۳۳	خمخانۂ جاوید (چہارم)	لالہ سری رام	سنہ ۱۹۱۲ء	دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی
۱۳۴	دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات	ڈاکٹر خورشید نعمانی	سنہ ۱۹۷۷ء	رحیمی پریس بمبئی
۱۳۵	داستانِ اردو	نصیر الدین خاں خیال	سنہ ۱۹۱۶ء	ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد
۱۳۶	داستانِ تاریخ اردو (طبع چہارم)	ڈاکٹر سید حامد حسین قادری	سنہ ۱۹۴۱، ۱۹۶۶ء	آگرہ پریس آگرہ

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	سنہ	ناشر
۱۳۷	داستان زبانِ اردو	ڈاکٹر شوکت سبزواری	سنہ ۱۹۶۰ء	انجمن ترقی اردو پاکستان
۱۳۸	داستانِ ادب حیدرآباد	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	سنہ ۱۹۶۰ء	ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد
۱۳۹	داستان سے افسانہ تک (بارِ دوم)	سید وقار عظیم	سنہ ۱۹۶۰ء	مکتبہ جامعہ اردو دہلی
۱۴۰	درسِ بلاغت	شمس الرحمٰن فاروقی	سنہ ۱۹۷۱ء	کتابستان الہ آباد
۱۴۱	دریائے لطافت	انشاء اللہ خاں (مرتبہ مولوی عبد الحق)	سنہ ۱۹۱۶ء	الناظر پریس لکھنؤ
۱۴۲	دستور الفصاحت	احد علی (مرتبہ امتیاز علی عرشی)		
۱۴۳	دکن میں اردو (بارِ دوم)	نصیر الدین ہاشمی	سنہ ۱۹۲۳ء	ادارہ ادبیات حیدرآباد
۱۴۴	دکن میں ریختی کا ارتقاء	بدیع حسینی		
۱۴۵	دکن میں مرثیہ کا ارتقاء	ڈاکٹر رشید موسوی		
۱۴۶	دکنی ادب کی تاریخ (بارِ سوم)	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	سنہ ۱۹۶۰ء	اردو اکیڈمی سندھ کراچی
۱۴۷	دکنی ہندو اور اردو	نصیر الدین ہاشمی	سنہ ۱۹۵۸ء	نیو بک امپوریم اردو بازار دہلی
۱۴۸	دلّی کا دبستانِ شاعری	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	سنہ ۱۹۶۵ء	انجمن ترقی اردو پاکستان
۱۴۹	دورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعراء	مولوی عبد الشکور	سنہ ۱۹۴۳ء	انجمن ترقی ہند اورنگ آباد
۱۵۰	دو ادبی اسکول (بارِ دوم)	علی جواد زیدی	سنہ ۱۹۶۰ء	مکتبہ جامعہ دہلی
۱۵۱	دنیائے افسانہ	پروفیسر عبد القادر سروری	سنہ ۱۹۳۵ء	مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد
۱۵۲	دیوانِ آبرو	ڈاکٹر محمد حسن	سنہ ۱۹۵۵ء	شعبۂ اردو علیگڑھ
۱۵۳	دیوان زادہ	حاتم دہلوی		
۱۵۴	دیوانِ فائز	ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب	سنہ ۱۹۶۴ء	انجمن ترقی اردو علیگڑھ
۱۵۵	ذکرِ میر	میر تقی میر	سنہ ۱۹۵۲ء	انجمن ترقی اردو ہند دہلی
۱۵۶	روحِ اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	سنہ ۱۹۶۴ء	مکتبہ جامعہ اردو دہلی
۱۵۷	روحِ صحافت	امداد صابری	سنہ ۱۹۶۸ء	چوڑیوں والان دہلی
۱۵۸	ریاست ٹونک اور اردو شاعری	مختار شمیم	سنہ ۱۹۷۶ء	نسیم بکڈپو لکھنؤ
۱۵۹	ریختی کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی	سنہ ۱۹۶۷ء	نسیم بکڈپو لکھنؤ

نمبر	کتاب	مصنف	سنہ	ناشر
۱۶۰	ریاست میسور میں اردو کی نشوونما	ڈاکٹر حبیب النساء	سنہ ۱۹۶۲ء	ترقی اردو پریس بنگلور
۱۶۱	زبان اور علم زبان (بار دوم)	پروفیسر عبدالقادر سروری	سنہ ۱۹۵۵ء	انجمن ترقی اردو حیدرآباد
۱۶۲	سب رس	ملا وجہی مرتبہ مولوی عبدالحق	سنہ ۱۹۲۹ء	انجمن ترقی اردو حیدرآباد
۱۶۳	سخنوران گجرات	ڈاکٹر ظہیر مدنی	سنہ ۱۹۸۱ء	انجمن ترقی اردو بورڈ دہلی
۱۶۴	سفرنامہ روم و مصر	مولانا شبلی نعمانی	—	دارالمصنفین اعظم گڑھ
۱۶۵	سودا	شیخ چاند	سنہ ۱۹۳۶ء	انجمن ترقی اردو ہند دہلی
۱۶۶	سیر المصنفین حصہ اول	مولوی محمد یحییٰ تنہا	سنہ ۱۹۲۳ء	دارالاشاعت [illegible] آباد
۱۶۷	سیر المصنفین (حصہ دوم)	مولوی یحییٰ	سنہ ۱۹۲۹ء	مکتبہ جامعہ دہلی
۱۶۸	شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ	ڈاکٹر نعیم احمد	سنہ ۱۹۷۹ء	شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
۱۶۹	شہر آشوب آغاز و ارتقاء اہمیت	ڈاکٹر سعد اللہ	سنہ ۱۹۸۵ء	مجلہ گاؤں جابود
۱۷۰	شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری	ڈاکٹر سید عبداللہ	سنہ ۱۹۵۲ء	مکتبہ جدید لاہور پاکستان
۱۷۱	شعر الہند اول (بار دوم)	مولانا عبدالسلام ندوی	سنہ ۱۹۲۶ء	حیدرآباد سندھ
۱۷۲	شعر الہند (—)	مولانا عبدالسلام ندوی	سنہ ۱۹۲۲ء	دارالمصنفین اعظم گڑھ
۱۷۳	شعر العجم پانچ جلدیں	مولانا شبلی نعمانی	سنہ ۱۹۰۸ء	دارالمصنفین اعظم گڑھ
۱۷۴	شعرائے پنجاب	باقر نسیم رضوانی	سنہ ۱۹۳۳ء	پنجاب یونیورسٹی پریس پنجاب
۱۷۵	شعر جزیرے دیگر ست	عتیق حنفی	سنہ ۱۹۷۷ء	مکتبہ جامعہ اردو دہلی
۱۷۶	شعرائے اردو کے تذکرے	ڈاکٹر حنیف نقوی	سنہ ۱۹۷۲ء	مکتبہ جامعہ اردو دہلی
۱۷۷	طنزیات و مضحکات	رشید احمد صدیقی	سنہ ۱۹۷۳ء	شعبہ اردو علی گڑھ
۱۷۸	طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور	سنہ ۹۸۲ء	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس بمبئی
۱۷۹	عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	سنہ ۱۹۳۵ء	اسٹیم اعظم حیدرآباد
۱۸۰	علیگڑھ تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر آل احمد سرور	سنہ ۱۹۶۲ء	شعبہ اردو علیگڑھ
۱۸۱	علی گڑھ تحریک	نسیم قریشی	سنہ ۱۹۶۰ء	مسلم [illegible]
۱۸۲	غرۃ الکمال	امیر خسرو		شعبہ ادبیات [illegible] ایس ایس [illegible]

۱۸۳	غزل اور مطالعۂ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	سنہ ۱۹۷۸ء	مکتبہ جامعہ اردو دہلی
۱۸۴	غرائب اللغات	عبدالواسع ہانسوی		
۱۸۵	فکر و ریاض	علی جواد زیدی	سنہ ۱۹۷۵ء	مکتبہ جامعہ اردو دہلی
۱۸۶	فن افسانہ نگاری (بار دوم)	سید وقار عظیم	سنہ ۱۹۶۹ء	فروغ اردو لکھنؤ
۱۸۷	فن داستان گوئی	کلیم الدین احمد	سنہ ۱۹۴۳ء	فروغ ادب اردو لکھنؤ
۱۸۸	فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی	نادم سیتاپوری	سنہ ۱۹۵۹ء	لکھنؤ
۱۸۹	فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	ڈاکٹر عبیدہ خاتون		مکتبہ جامعہ اردو
۱۹۰	کامٹی میں اردو	شرف الدین ساحل	سنہ ۱۹۷۷ء	اردو پریس ناگپور
۱۹۱	کاشف الحقائق (دو جلدیں)	امداد اثر	سنہ ۱۹۵۶ء	مکتبہ جدید اردو ادب لاہور
۱۹۲	کتاب شناسی	ظ انصاری	سنہ ۱۹۸۱ء	مکتبہ جامعہ دہلی
۱۹۳	کتاب الہند	البیرونی ترجمہ عبدالحق	سنہ ۱۹۲۵ء	انجمن ترقی اردو ہند دہلی
۱۹۴	کیفیہ (بار سوم)	پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	سنہ ۱۹۶۷ء	دانشکدہ پبلیکیشن بمبئی
۱۹۵	کلیاتِ جعفر زٹلی	نعیم احمد		شعبۂ اردو علیگڑھ
۱۹۶	گلِ رعنا	مولانا عبدالحئی	سنہ ۱۹۲۸ء	دار المصنفین علیگڑھ
۱۹۷	لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	سنہ ۱۹۷۱ء	اردو مرکز لاہور پاکستان
۱۹۸	لکھنؤ کی لسانی خدمات	ڈاکٹر حامد اللہ ندوی	سنہ ۱۹۸۳ء	اردو پرچار مہا سبھا مہاراشٹر
۱۹۹	مآثر عالمگیری	مستعد خاں ساقی		
۲۰۰	مختصر تاریخ ادب اردو (بار سوم)	ڈاکٹر اعجاز حسین	سنہ ۱۹۶۵ء	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ
۲۰۱	مثنوی کا فن اور اردو مثنویاں	ڈاکٹر نجم ہدی	سنہ ۱۹۶۳ء	مکتبہ جامعہ دہلی
۲۰۲	مثنویات	سید امیر احمد علوی	سنہ ۱۹۲۶ء	یوسفی پریس لکھنؤ
۲۰۳	مرآۃ الشعراء جلد دوم (بار دوم)	مولوی عبدالرحمٰن	۱۹۳۹ء	انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد
۲۰۴	مرآۃ الشعراء جلد اول (بار اول)	مولوی عبدالرحمٰن	سنہ ۱۹۲۷ء	دہلی
۲۰۵	مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما	ڈاکٹر افضل الدین اقبال	سنہ ۱۹۵۸ء	مدراس یونیورسٹی پریس

۲۰۶	مدراس میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	سنہ ۱۹۳۳ء	ادارہ ادبیات حیدرآباد
۲۰۷	معراج العاشقین	خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (مرتبہ حفیظ قتیل)	سنہ ۱۹۶۸ء	حیدرآباد دکن
۲۰۸	مقالاتِ شیرانی (دو جلدیں)	محمود شیرانی	سنہ ۱۹۶۶ء	مجلس ترقی ادب لاہور
۲۰۹	مقالاتِ ہاشمی	نصیر الدین ہاشمی	سنہ ۱۹۳۹	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد
۲۱۰	مقدمہ تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	سنہ ۱۹۶۵ء	سرسید بک ڈپو علیگڑھ
۲۱۱	مقدمہ شعر و شاعری	مولانا الطاف حسین حالی	سنہ ۱۹۶۹ء	مکتبہ جامعہ اردو دہلی
۲۱۲	مغلِ اردو	نصیر الدین خاں خیال	سنہ ۱۹۲۳ء	شائق عثمان پریس حیدرآباد
۲۱۳	مغربی بنگال کے اردو شعراء	مشتاق احمد		کلکتہ
۲۱۴	مرآۃ احمدی (جلد اول)	مرزا محمد حسن علی تصحیح نواب علی	سنہ ۱۹۳۰ء	اسٹیٹ دانش پریس کلکتہ
۲۱۵	ناٹک ساگر	نور الٰہی محمد عمر	سنہ ۱۹۲۴ء	دہلی
۲۱۶	ناول کی تاریخ و تنقید	علی عباس حسینی	سنہ ۱۹۴۴ء	فروغ ادب لکھنؤ
۲۱۷	نوادر الالفاظ	سراج الدین علی خاں، ڈاکٹر سید عبداللہ	سنہ ۱۹۵۱ء	انجمن ترقی اردو حیدرآباد
۲۱۸	نکات الشعراء	میر تقی میر، عبدالحق	سنہ ۱۹۵۰ء	انجمن ترقی اردو حیدرآباد
۲۱۹	نقوشِ سلیمانی (بار دوم)	سید سلیمان ندوی	سنہ ۱۹۵۱ء	کلیم پریس کراچی
۲۲۰	نئی شعری روایت	ڈاکٹر شمیم حنفی	سنہ ۱۹۷۸ء	مکتبہ جامعہ دہلی
۲۲۱	نئی علامت نگاری	ڈاکٹر سید عقیل	سنہ ۱۹۷۵ء	انجمن ہندیہ پبلیکیشنز الہ آباد
۲۲۲	نئے ادبی رجحانات	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	سنہ ۱۹۵۲ء	کتابستان الہ آباد
۲۲۳	نظم آزاد	محمد حسین آزاد، محمد ابراہیم	سنہ ۱۹۰۹ء	نول کشور پرنٹنگ لاہور
۲۲۴	وضاحتی کتابیات (جلد اول)	مظفر حنفی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	سنہ ۱۹۷۴ء	انجمن ترقی اردو بیورو دہلی
۲۲۵	ہماری داستانیں (بار دوم)	سید وقار عظیم	سنہ ۱۹۶۴ء	آزاد کتاب گھر دہلی
۲۲۶	ہماری شاعری	سید مسعود حسن رضوی ادیب	سنہ ۱۹۶۱ء	نظامی پریس لکھنؤ
۲۲۷	ہندو ادیب	ناظر کاکوروی	سنہ ۱۹۳۹ء	حیدرآباد
۲۲۸	ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	احتشام حسین	سنہ ۱۹۶۴ء	انجمن ترقی اردو ہند دہلی

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	سنہ	ناشر / مقام
۲۲۹	ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	سنہ ۱۹۶۲ء	مکتبہ جامعہ دہلی
۲۳۰	یادگار شعراء	ڈاکٹر اسپرنگر	سنہ ۱۹۴۳ء	لکھنؤ
۲۳۱	خزائن رحمت اللہ	شاہ بہاء الدین باجنؒ		پنجاب یونیورسٹی لائبریری
۲۳۲	دیوان فائز	امیر الدولہ		امیر الدولہ لائبریری
۲۳۳	دیوان کمال			رام پور لائبریری
۲۳۴	دیوان نوازش			خدابخش لائبریری
۲۳۵	کلیات جرأت	مسلم یونیورسٹی		علی گڑھ
۲۳۶	کلیات ممنون			کلکتہ لائبریری
۲۳۷	اردو رباعیات	ڈاکٹر امین چند شرما		
۲۳۸	اردو میں سلام نگاری	سید تقی حیدر		
۲۳۹	اردو میں خاکہ نگاری	سید فاروق حسین		
۲۴۰	ادبی اور قومی تذکرے	پنڈت کشن پرشاد کول		
۲۴۱	بہار سخن	محمد شرف الدین یکتا	سنہ ۱۹۶۲ء	ادارہ محبوب پریس حیدرآباد
۲۴۲	تحریک گولڈن جوبلی نمبر		سنہ ۱۹۶۲ء	دہلی
۲۴۳	تذکرۂ اختر	واجد علی شاہ		
۲۴۴	تحفۃ الشعراء	افضل بیگ قاقشال / عبدالحق	سنہ ۱۹۴۲ء	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد
۲۴۵	تذکرۂ حیرت	حیرت		
۲۴۶	تذکرۂ شورش	غلام حسین شورش		
۲۴۷	تذکرہ دولت شاہ سمرقندی	شاہ سمرقندی		
۲۴۸	تذکرۂ شعرائے دکن (دو جلدیں)	عبدالجبار صوفی ملکاپوری	سنہ ۱۳۲۹ھ	رحمانی پریس حیدرآباد
۲۴۹	تذکرۂ ہندی گویاں	غلام ہمدانی مصحفی / عبدالحق	سنہ ۱۹۳۳ء	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد
۲۵۰	تذکرۂ قائم	قدرت اللہ قائم		
۲۵۱	تذکرہ شعرائے اردو	میر حسن، تصحیح و تنقید مولانا حبیب الرحمٰن	سنہ ۱۹۴۰ء	انجمن ترقی اردو ہند دہلی

۲۵۲	تذکرہ گلشن گفتار	حمید اورنگ آبادی ایم کے قاطمی	سنہ ۱۹۶۳ء	مکتبہ دین وادب لکھنؤ
۲۵۳	تذکرہ بہارِ بے خزاں	احمد حسین سحر، تصحیح ڈاکٹر نعیم	سنہ ۱۹۶۸ء	نول کشور کوہ نور پرنٹنگ پریس
۲۵۴	تذکرہ ریختہ گویاں	فتح علی گردیزی	سنہ ۱۹۰۷ء	نول کشور پرنٹنگ ورکس لاہور
۲۵۵	تذکرہ ریاض الفصحاء	غلام ہمدانی مصحفی، عبدالحق	سنہ ۱۹۳۴ء	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد
۲۵۶	چمنستانِ شعراء	رائے لچھمی نرائن شفیق، مولوی عبدالحق	سنہ ۱۹۲۸ء	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد
۲۵۷	خطبات دتاسی (دو جلدیں)	گارساں دتاسی	سنہ ۱۹۷۷ء	نول کشور پریس لکھنؤ
۲۵۸	خزانۂ عامرہ	آزاد بلگرامی	سنہ ۱۹۰۱	نول کشور پریس لکھنؤ
۲۵۹	رسالۂ اردو		جولائی سنہ ۱۹۲۳	انجمن ترقی اردو ہند
۲۶۰	رسالۂ اردو		جولائی سنہ ۱۹۲۶	انجمن ترقی اردو ہند کراچی
۲۶۱	رسالۂ اردو		جولائی سنہ ۱۹۲۸	" کراچی
۲۶۲	رسالۂ سلطان جہاں		جنوری سنہ ۱۹۲۳ء	دار المصنفین اعظم گڑھ
۲۶۳	رسالۂ اردو		ستمبر سنہ ۱۹۳۳ء	اورنگ آباد
۲۶۴	رسالۂ اردو		جولائی سنہ ۱۹۳۴ء	"
۲۶۵	رسالۂ اردو		جنوری سنہ ۱۹۳۱ء	"
۲۶۶	رسالۂ اردو		اپریل سنہ ۱۹۳۱ء	
۲۶۷	رسالۂ اردو		اپریل سنہ ۱۹۴۶ء	"
۲۶۸	سخن الشعراء	عبدالغفور خاں نساخ	سنہ ۱۲۵۱ھ	نول کشور پریس لکھنؤ
۲۶۹	شب خون		مارچ سنہ ۱۹۹۱ء	الہ آباد
۲۷۰	شب خون (جولائی تا ستمبر)		سنہ ۱۹۹۵ء	الہ آباد
۲۷۱	شاعر نثری غزل نمبر		سنہ ۱۹۶۵ء	بمبئی
۲۷۲	شمیم سخن	صفا بدایونی۔ عبدالحی رئیس بدایونی	سنہ ۱۹۹۱	نول کشور پریس لکھنؤ
۲۷۳	عقدِ ثریا	غلام ہمدانی مصحفی	سنہ ۱۹۳۰	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد
۲۷۴	گلستانِ سخن مرزا قادر بخش	مولوی عبدالحق دہلوی		نول کشور پریس لکھنؤ

۲۷۵	گلشن ہند	مرزا علی لطف	سنہ ۱۹۰۶ء	رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور
۲۷۶	گلشن بے خار	نواب مصطفیٰ خان شیفتہ	سنہ ۱۸۷۴ء	نول کشور پریس لکھنؤ
۲۷۷	گلزار ابراہیم	ابراہیم خاں ڈاکٹر محی الدین قادری زور		ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد
۲۷۸	معارف		جولائی سنہ ۱۹۳۳ء	دار المصنفین اعظم گڑھ
۲۷۹	ماہِ نو		اپریل سنہ ۱۹۵۶ء	کراچی پاکستان
۲۸۰	نگار		فروری سنہ ۱۹۲۶ء	لکھنؤ
۲۸۱	نگار		اپریل سنہ ۱۹۵۱ء	کراچی پاکستان
۲۸۲	نوائے ادب		ستمبر سنہ ۱۹۵۵ء	انجمن ریسرچ بمبئی
۲۸۳	نیا دور مرثیہ نمبر		سنہ ۱۹۶۴ء	بنگلور
۲۸۴	نگار		جولائی سنہ ۱۹۵۶ء	پاکستان
۲۸۵	نکات الشعراء	میر تقی میر عبدالحق	سنہ ۱۹۳۵ء	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد
۲۸۶	ہماری زبان		اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء	علیگڑھ

فہرست ابواب

باب اوّل:- صفحات

(۱) اردو کی ابتدا و ارتقا کے نظریات کا جائزہ ۱۱ تا ۲۱

(۲) تذکرہ نویسی کی روایت کا جائزہ اور مقاصد ۲۲ تا ۳۹

(۳) آب حیات (محمد حسین آزاد) ایک جائزہ ۴۰ تا ۴۸

باب دوم:-

(۱) ابتدائی تاریخ کی کتب پر تنقیدی تبصرہ ۴۹ تا ۶۵

باب سوم

- ادبی تاریخوں کا نصب العین ۶۷ تا ۹۴
- تاریخ نگاری کا مقصد
- ہماری ادبی تاریخیں اصول و ضوابط کی روشنی میں
- تبصرہ

باب چہارم:-

(الف) ادبی تاریخوں پر تنقیدی تبصرہ ۹۵ تا ۱۹۶

(ب) لسانی تاریخوں پر تنقیدی تبصرہ ۱۹۷ تا ۲۲۳

(ج) ادبی تاریخوں میں علاقائی رجحان عمومی تبصرہ ۲۲۴ تا ۳۰۵
اور علاقائی تاریخوں پر تنقیدی تبصرہ

(د) ہماری تدریسی تاریخیں تنقیدی تبصرہ ۳۰۶ تا ۳۴۹

(ھ) ہمارا دبستانی ادب اور دبستانی کتب پر تبصرہ ۳۵۰ تا ۳۸۸

باب پنجم:- اردو ادب کی تحریکات ۳۸۹ تا ۴۲۴

(۱) اردو میں وہابی تحریک پر عمومی تبصرہ

(۲) اردو میں علی گڑھ تحریک یا سرسید تحریک پر عمومی تبصرہ

(۳) اردو میں رومانوی تحریک پر عمومی تبصرہ
(۴) جدیدیت کے رجحان پر عمومی تبصرہ (متعلقہ کتب پر تنقیدی تبصرے)

باب ششم اصناف ادب کی تاریخیں اور متعلقہ کتب پر تنقیدی تبصرہ ۶۲۵ تا ۶۷۱

(۱) نظم پر عمومی تبصرہ
(۲) غزل پر عمومی تبصرہ
(۳) مثنوی پر عمومی تبصرہ
(۴) ریختی پر تبصرہ
(۵) شہر آشوب پر تبصرہ
(۶) رباعی پر تبصرہ
(۷) قصیدہ نگاری پر تبصرہ
(۸) مرثیہ نگاری پر تبصرہ
(۹) سلام پر تبصرہ
(۱۰) گیت پر تبصرہ
(۱۱) سانیٹ پر تبصرہ
(۱) مختلف اصنافِ نظم پر سرسری تبصرے
(الف) واسوخت
(ب) ساقی نامہ
(ج) نوحہ
(د) قطعہ
(ہ) مسمط
(ل) حمد و ثنا
(م) نعت و دعا
(ن) مستزاد

(۲) نثری اصناف
(۱) داستان
(۲) ناول
(۳) افسانہ
(۴) ڈراما
(۵) تنقید
(۶) طنز و مزاح
(۷) سوانح نگاری
(۸) صحافت
(۹) تبصرہ نگاری
(۱۰) انشائیہ
(۱۱) رپورتاژ نگاری
(۱۲) خاکہ نگاری
(۱۳) خطوط نگاری
(۱۴) تقریظ
متعلقہ کتب پر تبصرہ

باب ہفتم
کتابیات ۶۲۲ تا ۶۳۶

باب سوم میں اصول و ضوابط کی روشنی میں ادبی تاریخ کا نصب العین خوب سے خوب تر ہے۔ باب چہارم میں لسانی تدریسی، تاریخی، علامتی اور ادبی کتب کے تبصرے ہیں۔ باب پنجم میں تحریکات اور باب ششم میں اصناف سخن کو تفصیل سے پیش کر کے طلبہ کے لئے ادبی اور تحقیقی راہیں کھول دی ہیں۔ باب ہفتم میں ۲۸۶ مستند، بیش بہا اور کمیاب کتب، رسائل، مضامین، مخطوطات، مقالات اور تذکرے تحریر ہیں جن کی روشنی میں ۱۱۰۹ صفحات پر یہ مقالہ تحریر کیا گیا۔

ڈاکٹر غلام رسول ساجد صاحب کا یہ مقالہ اب کتابی شکل میں عنقریب قارئین کرام کے سامنے آرہا ہے۔ جو دنیائے ادب میں گراں قدر سرمایہ ثابت ہوگا۔ آپ واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اور امید ہے کہ آپ کی یہ ادبی تحقیقی کاوش قارئین ادب پسند فرمائیں گے۔

آدم شیخ

ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ۔

۲۱ جنوری ۱۹۹۷ء

تحقیق بذات خود ایک دقت طلب کام ہے اور جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ یہ فن فرہاد قلم سے کوہ کنی کا تقاضا کرتا ہے۔ لہٰذا اس کٹھن سفر میں رہنما بھی بڑے دل گردے والا چاہیے۔ غلام رسول ساجد صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ جن کو ڈاکٹر خورشید نعمانی جیسے سنجیدہ، متین، پُر فکر نگراں میسر آیا۔

ساجد صاحب نے تحقیق کیلیے جو عنوان منتخب کیا ہے وہ خود اپنی جگر کاری چاہتا تھا۔ "اردو کی منتخب ادبی تاریخوں کا تنقیدی جائزہ" ادبی تاریخوں کی اہمیت مسلم ہے اس لئے کہ ان کے بغیر کسی زبان کے ادب، اس کے مزاج اور اس مزاج کی بدلتی ہوئی کروٹوں کو سمجھا نہیں جاسکتا۔ پھر اردو ایک ایسی زبان ہے جس نے بدلتے ہوئے موسموں کا ذائقہ نہ صرف چکھا ہے بلکہ اسے اپنے چاہنے والوں میں بانٹا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس کے ادب میں مختلف دبستان وجود میں آگئے ہیں کئی تحریکیں اسمیں جذب ہو گئی ہیں۔ کئی اسالیب، کئی انداز، کئی اصناف اس ادب میں بنتی بگڑتی، مٹتی، ابھرتی اور پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ غلام رسول ساجد نے اردو کی ادبی تاریخوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ان کا ایک تفصیلی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ یوں اردو کی ادبی تاریخوں کی ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ جو زبان کے آغاز وارتقاء کے ساتھ ساتھ اردو کے ابتدائی تذکروں سے لے کر ۱۹۸۳ء تک کی ڈھیر ساری ادبی تاریخوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اسمیں وہ ابتدائی تاریخیں بھی ہیں جو محض اردو زبان وادب کا ایک اشاریہ کہی جاسکتی ہیں۔ اور وہ ادبی تاریخیں بھی جو لسانیات کے موضوع کو لے کر لکھی گئیں۔ وہ علاقائی تاریخیں بھی جو مخصوص جغرافیائی خطوں اور علاقوں میں اردو کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کرتی ہیں۔ نیز وہ تدریسی اور تنقیدی ادبی تاریخیں بھی جن کا مطالعہ ادب کے طالبعلم کیلیے ضروری ہے۔ اردو کے مختلف ادبی تحریکوں سے متعلق جو تاریخیں لکھی گئیں ان کا بھی ایک الگ باب میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اصناف ادب اور اسالیب نظم ونثر سے متعلق ادبی تاریخوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

میں ڈاکٹر خورشید نعمانی اور غلام رسول ساجد دونوں ہی کو اس وقیع تحقیق پر مبارکباد دیتی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ اس قسم کے تنقیدی کام ہماری یونیورسٹیوں سے آگے بھی ہوتے رہیں گے۔

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی
(صدر شعبہ اردو صداشو کالج)